معاصر

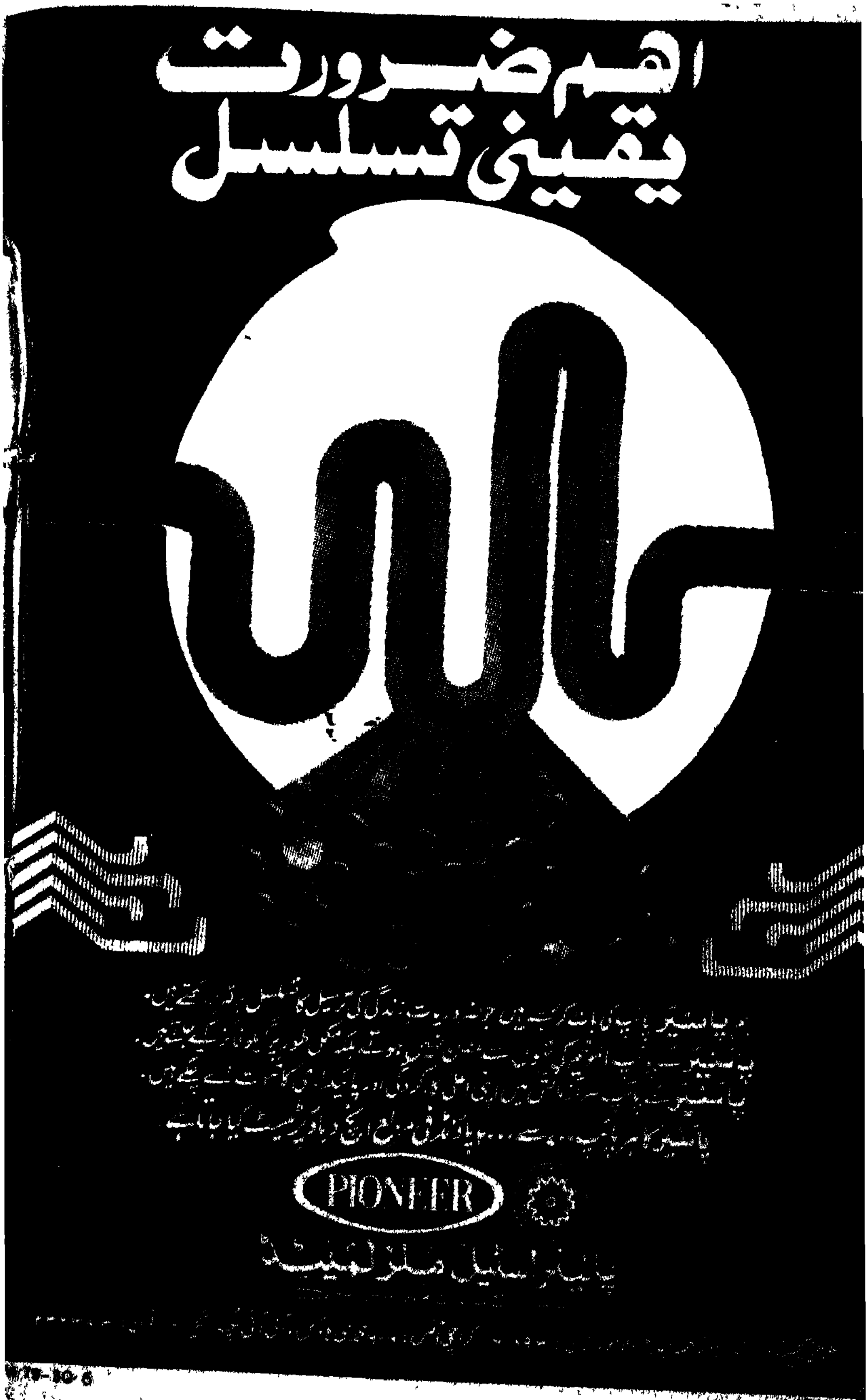
شامِ شہرِ ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تو

عطاء الحق قاسمی

[illegible]



quality and economy go together with
Champion
PAINTS
Plastic Emulsion ◀ ▶ Synthetic Enamel
Magic Emulsion ◀ ▶ Car Finish
Champion Paint Industries Limited
MULTAN ROAD LAHORE P.O. Box 1038 PHONE 431361


اہم ضرورت
یقینی تسلسل
PIONEER
پاینیر اسٹیل ملز لمیٹڈ

غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل مجموعۂ نظم و نثر

معاصر

مدیرِ مسئول — حبیب اللہ خاں

مدیرانِ اعزازی: عطاء الحق قاسمی

سراج منیر

ملنے کا پتہ

مکتبہ معاصر ۴-۳۰، الفیصل پلازہ، شاہراہِ قائدِ اعظم لاہور

قیمت: چالیس روپے

حبیب اللہ خاں نے فرزن پریس رائل پارک لاہور سے چھپوا کر مکتبہ معاصر ۴-۳۰ الفیصل پلازہ شاہراہ قائد اعظم لاہور سے شائع کیا

مخدوم و محترم [illegible] صاحب

محبت کے ساتھ!

عطاء الحق قاسمی

۱۴ اپریل ۸۰ء

انتساب

پاشا رحمان کے نام

فروغِ اسمِ محمدؐ ہو بستیوں میں منیرؔ
قدیم یاد نئے مسکنوں سے پیدا ہو

منیرؔ نیازی

فہرست

تنقید

تحقیق

نظمیں

غزلیں

الشیخ عبدالواحد یحییٰ (رینے گینوں)

محمد خالد اختر

سرورق : انیس یعقوب

موت العالم موت العالم

"معاصر" پریس میں جا چکا تھا کہ "مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔ مولانا اس صدی کی بہت بڑی علمی شخصیت تھے چنانچہ جہاں ان کے معترضین بھی ہمارے ہاں موجود ہیں، وہاں عالمِ اسلام میں ان کے معترفین بھی بہت بھاری تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے

حرفِ آغاز

"معاصر" پیشِ خدمت ہے۔

یہ مجموعۂ نظم و نثر مدیر کہلانے کے شوق میں مرتب نہیں کیا گیا بلکہ اپنے نظریات کو
لی شکل میں دیکھنے کی خواہش اس کا محرک بنی ہے۔ دراصل ہم بھی انہی لوگوں میں سے
یں جو ادب کو کوکاکولا کی طرح محض فرحت بخش نہیں سمجھتے بلکہ اسے، اس کے سوا بھی
سمجھتے ہیں۔ تاہم ہمارے نزدیک ادب کو نظریئے کا تابع تو ہونا چاہیئے، لیکن اسے "تابعدار"
عال نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک نظریہ میاں خوجی کی قرولی ہے، جسے وہ
ت بات پر نیام سے نکالنے لگتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ رویّہ بھی درست نہیں، ہم سمجھتے
یں کہ ادب میں نظریہ صحیح راستے سے داخل ہونا چاہیئے کیونکہ بصورت دیگر جو ادب تخلیق ہو گا۔
"خلافِ وضعِ فطری" ادب ہی کے زمرے میں شمار ہوگا، اسے نظریاتی ادب قرار دینا ادب
ر نظریئے دونوں کے ساتھ زیادتی ہو گی!

"معاصر" کے ان صفحات میں آپ کو کئی لہریں بیک وقت نظر آئیں گی، یہ لہریں پاکستانیت،
شی و معاشرتی عدل و انصاف اور بین الاقوامی بھائی چارے سے مرکب ہیں۔ ہمارے نزدیک ہمارے
گرد کی سب سے بڑی حقیقت پاکستان کا وجود ہے؛ چنانچہ وہ تمام فلسفے اور تمام نظریئے ہمارے
چیلنج ہیں جو اس حقیقت کو ماند کرنے کے لیے سامنے آتے ہیں؛ لہذا ہم اس ضمن میں دائیں
بائیں کی تفریق کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ ہمیں وہ "اسلام پسند" زہر لگتے ہیں جو اپنے "اکابر" کے
لے سے اس سرزمین کی نفی کرتے ہیں اور ہمیں ان "ترقی پسندوں" سے بھی نفرت ہے جو اس
بنیادوں میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں۔ ہمیں یہ دونوں گروہ ان بین الاقوامی غنڈوں کے کارندے
ہیں جو برصغیر کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کی اس آخری پناہ گاہ کو مسمار کرنا چاہتے ہیں۔
ستان ہمارا ایمان ہے۔ ہم اسے اور اس کی بنیادی نظریاتی اساس اسلام کو عزیز رکھتے ہیں۔
نانچہ ہمارا اتحاد بھی (لیفٹ رائٹ کی تفریق کے بغیر) ان ادیبوں سے ہے جو اس زمین، اس زمین
بسنے والے عوام اور ان عوام کے عقیدوں اور آدرشوں کو عزیز رکھتے ہیں۔

"پاکستانیت" کے ضمن میں ارضی اور آسمانی رشتوں کے علاوہ معاشی و معاشرتی عدل و انصاف

کو بھی ہم ایک بنیادی شرط سمجھتے ہیں، اگر یہ شرط پوری نہیں ہوتی تو اسلامیانِ ہند کا وہ خواب ادھورا رہ جاتا ہے جو انہوں نے قیامِ پاکستان کی صورت میں دیکھا تھا۔ ہماری منزل عدل و انصاف کی منزل ہے اور پاکستانی قوم کو اس منزل تک پہنچنے کے لیے اس طوطے کی گردن مروڑنا ہوگی جس میں اس سفید دیو کی جان ہے جو ان کے چہروں پر مسکراہٹیں نہیں کھلنے دیتا!

اور ہمارے نزدیک "پاکستانیت" کسی محدود تناظر کا نام نہیں کہ ہمارے دل سرحدوں کے اندر اور سرحدوں کے باہر حق و انصاف کی خاطر لڑنے والی قوتوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ ہمیں اپنی سلامتی بھی عزیز ہے اور ان کی سلامتی بھی جو دنیا کے لیے سلامتی چاہتے ہیں۔ ہم اُس وطن پرستی کو انسانیت کے لیے مہلک سمجھتے ہیں جو حیلے بہانوں سے ایک خطے کے انسانوں کو دوسرے خطے کے انسانوں کے خلاف صف آراء کر دے، تاہم خیر کے لئے لڑی جانے والی جنگ، امن قائم کرتی ہے اور شر کے لیے قائم کیا گیا امن جنگ کے شعلوں کو بیدار کرتا ہے؛ چنانچہ ہم دنیا بھر میں خیر کے لیے لڑنے والی قوتوں کے ہم نوا ہیں اور شر کی خاطر قائم ہونے والے امن کے لیے بددعا کرتے ہیں!

"معاصر" ہماری دعا بھی ہے اور بددعا بھی! خدا کرے کہ یہ رائیگاں نہ جائے!

عطاء الحق قاسمی ۲ر اکتوبر ۷۹ء

اظہارِ تشکر

زیرِ نظر مجموعۂ نظم و نثر کی ترتیب و تدوین میں صاحبزادہ اکرام چغتائی اور جنابہ گلزار وفا چودھری نے جس گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے لیے ہم دل کی گہرائیوں سے ان کے ممنون ہیں۔ انہوں نے اپنا بہت سا قیمتی وقت "معاصر" کی نذر کیا ہے۔ اسی طرح احمد حسن حامد، مسعود محمد ملک، ابنِ سعید، تحسین فراقی، انعام الحق جاوید، محمد سہیل عمر اور دیگر دوستوں کے پُرخلوص تعاون کے لیے ہم تہِ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم آرٹ ایڈیٹر محمد اقبال صاحب کے بھی ممنون ہیں کہ اگر وہ بروقت ہمارے ساتھ تعاون نہ کرتے تو پرچہ مزید تاخیر کا شکار ہو جاتا۔ ہمیں خصوصی طور پر ادارہ اطہر ... کے دیگر خوشنویس دوستوں کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ اتنی ضخیم ادبی دستاویز کی تکمیل کے لیے انہوں نے جس مستعدی اور محنت سے کام کیا اس کی مثال موجودہ مادی دور میں کم کم نظر آتی ہے۔

صادق نسیم

نعت

وہ اِک بشر تھا مگر جہاں میں خدا کی پہچان بن کے آیا
وہ جس پہ قرآں ہوا تھا نازل وہ خود بھی قرآن بن کے آیا
وہ جس کی انگشت کے اشارے سے چاند دو نیم ہو گیا تھا
وہ دستِ اقدس پہ آ کے جس کے درود پڑھتا تھا ذرہ ذرہ
زمیں پہ تھا تو زمیں فلک تھی فلک پہ ہے تو فلک ہے نازاں
وہ جس کے تلووں کو اپنی آنکھوں سے چھو کے جبریل تک تھے نازاں
نمودِ صبحِ ازل سے پہلے کا نور ہے نورِ اولیں ہے!
عدو بھی یہ اعتراف کرتے تھے کہ صادق ہے اور امیں ہے
جو خارزاروں کو گل کدوں میں بدل گیا تھا عجب صبا تھا
تھے عرش و کرسی پہ جس کے پاؤں یہاں وہ کانٹوں پہ چل رہا تھا
جو سرکشوں کو اماں دیتا۔ جو دشمنوں کو دعائیں دیتا
جو اُس کو پتھر بھی مارتے برملا انہیں بھی دعائیں دیتا
وہ جس کی ہیبت سے قیصر و کیقباد کے قصر تھر تھرائیں
اُسی کی رحمت کے سایے میں بے نوا بھی آ کر سکون پائیں
وہی شہنشاہِ ہر زماں ہے کہ وجہِ تخلیقِ دو جہاں ہے
وہ جسمِ کون و مکاں کے سینے میں اب بھی مثلِ نفس رواں ہے
وہی ہے کشتی وہی ہے ساحل وہ نور کا بحرِ بے کراں بھی
وہی ہے خورشیدِ صبحِ اوّل وہی مہ آخر الزماں بھی
وہ خود بھی ہے شہرِ علم پرتو سے جس کے دِل بن گیا مدینہ
اُسی کی کرنوں کی جگمگاہٹ سے منبعٔ نور میرا سینہ
اگر کوئی اُس کی اِک کرن میرے دل سے اُٹھ کر ثریّا تک جائے
تو مہر و مہتاب ماند پڑ جائیں شمعِ کونین جھلملا جائے

حفیظ الرحمٰن احسنؔ

ہدیۂ نعت بحضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

ہے یہ بزم اُنؐ کی، صبا اُنؐ کی، چراغاں اُنؐ کا
ضو فشاں دہر میں ہے نیّرِ تاباں اُنؐ کا

ذکر اُن کا تھا سکونِ دلِ مضطر کل بھی
نام ہے آج بھی آرامِ دل و جاں اُنؐ کا

لب بہ ہر گُل کے تبسم ہے انہی کی خاطر
ہے صبا ان کی، بہار ان کی، گلستاں اُنؐ کا

وحی و الہام کے ہر نقش میں وہ جلوہ نُما
ہے حدیث ان کی، ہر اک پارۂ قرآں اُنؐ کا

رحمتِ ربِّ دو عالم، وہ دو عالم کے لیے
از ازل تا بہ ابد سایۂ احساں اُنؐ کا

وہ کہ ہیں خیرِ بشر، فخرِ رُسل، سرِ اُمم
نازشِ نوعِ بشر حلقۂ یاراں اُنؐ کا

منبعِ لطف و کرم طبعِ مبارک اُن کی
غم نصیبوں کی پنہ، گوشۂ داماں اُنؐ کا

چشمۂ جُود و سخا، ابرِ وہی دستِ کرم
عام ہے سب کے لیے لطفِ فراواں اُنؐ کا

آیۂ مہر و وفا ذاتِ گرامی ان کی
غم مٹاتا رہا کیا کیا رُخِ تاباں اُنؐ کا

پرتوِ لُطفِ خدا، چشمِ عنایت ان کی
سایۂ ربِّ جہاں، سایۂ داماں اُنؐ کا

مصدرِ خیر ابد تک ہے ہر اک قول و عمل
کس طرح کوئی چکا سکتا ہے احساں اُنؐ کا

آئے وہ خلعتِ قرآں میں ملبوس آخر
منتظر صدیوں رہا دیدۂ امکاں اُنؐ کا

ضو فشاں ان کی تجلّی سے ہوا طاقِ حرم
آیۂ نور تھا اک پیکرِ تاباں اُنؐ کا

ان کے جلووں کی تمنائی ہر اک آنکھ یہاں
چاہ ان کی ہے ہر اک دل میں تو ارماں اُنؐ کا

گلشنِ روح کا وہ دورِ خزاں بیت چکا
ہے ہمیشہ کے لیے عہدِ بہاراں اُنؐ کا

علم و حکمت کا فروغ ان کی توجہ کا ثمر
کتنا ممنونِ کرم آج ہے انساں اُنؐ کا

کی عطا فکر کو تطہیر، عمل کو تہذیب
درس آموزِ تمدّن ہے دبستاں اُنؐ کا

ہے مفاہیم کا ملبوس ہر اک قولِ جمیل
ہے معانی کی قبا نُطقِ درخشاں اُنؐ کا

دل دھڑکتے ہیں اسی نام پہ اب بھی احسنؔ
اب بھی قائم ہے ہر اک رُوح سے پیماں اُنؐ کا

منیر نیازی

وصالِ سر سبز

پھول اک گلاب کا
مضمحل خراب سا
اس خراب پھول پر
تیتری کے پنکھ ہیں
چادریں حجاب کی
محرم حجاب پر
دیرپا وصال کے
دور تک کے خواب کی
جس کی شش جہات سے
پھوٹتی ہیں پتیاں
اک نئے گلاب کی

عزیز انجم حیدر

میرا ہر بیان ادھورا رہ جاتا ہے

(نذرِ منیر)

شہر کے باغات میں
جب نئے موسموں کی خوشبوئیں
صبح کو اور شام کو اڑتی ہیں
میں انہیں بیان کرنا چاہتی ہوں

شہر کے مضافات میں
کم آباد محلوں سے گزرتے ہوئے
جب شہر بدر حقیقتیں مجھ پر منکشف ہوتی ہیں۔
میں انہیں بیان کرنا چاہتی ہوں

بدلے ہوئے حالات میں
اُس سے دوبارہ ملنے کی مسرتیں جو میرے دل میں ہیں
میں انہیں بیان کرنا چاہتی ہوں۔

ننده بس سروس

قدرت اللہ شہاب

جموں میں پلیگ کے کیس دن بدن بڑھتے جا رہے تھے۔ اس لئے گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ بچوں کو موت کے منہ سے محفوظ رکھنے کے لئے کچھ عرصے کے لئے سرینگر بھیج دیا جائے۔

سرینگر کے لئے ہم ننده بس سروس کی لاری میں سوار ہوئے۔ اس کے اندر اور باہر چاروں طرف موٹے موٹے حروف میں "ننده ہاؤس بزازی سستی" کے اشتہار ہی اشتہار تھے۔ ننده ہاؤس جموں شہر میں کپڑے کی سب سے بڑی اور کشادہ دکان تھی۔ اس میں آٹھ دس کارندے ہر وقت کام میں مصروف رہتے تھے لیکن دکان کے مالک ننده صاحب خود بھی بہ نفسِ نفیس صبح سے شام تک بڑے انہماک سے کام کیا کرتے تھے۔ وہ فربہ تن و توش کے بے حد لحیم شحیم آدمی تھے اور اپنا وزن قابو میں رکھنے کے لئے ہر روز علی الصبح باقاعدگی سے ورزش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ سڑک پر ایک دو فرلانگ لشتم پشتم چہل قدمی کیا کرتے تھے جس طرح بادبانی جہاز سطحِ آب پر ہچکولے کھاتا ہے اور پھر لکڑی کی دو ڈھائی فٹ اونچی چوکی پر کھڑے ہو کر برسرِ عام دس بارہ چھلانگیں لگایا کرتے تھے۔ حفظانِ صحت کے ان تقاضوں کو پورا کر کے ننده صاحب اپنی دکان کے فرش پر ٹانگیں پسار کر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھ جاتے تھے۔ اور اپنے ڈھول جیسے گول پیٹ کو زانوؤں پر رکھ کے کاروبار میں مصروف ہو جاتے تھے۔ گاہک چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب، ہزاروں کے مال کا خریدار ہو یا دو تین گز ململ کا طلبگار، ننده صاحب سب کے ساتھ یکساں اخلاق، انہماک اور خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ ان کے کارندے گاہکوں کے سامنے کپڑوں کے تھان پر تھان کھول کھول کر ڈھیر لگاتے جاتے تھے اور چھوٹے سے چھوٹا گاہک بھی وہاں سے عزتِ نفس کا ایسا احساس لے کر اٹھتا تھا کہ پھر عمر بھر اس کے لئے کسی اور دکان کا منہ دیکھنا دشوار ہو جاتا تھا۔ یوں بھی تھان میں سے کپڑا پھاڑتے وقت ننده صاحب ایک دو انگل کپڑا گاہک کے حصے میں بڑھا دیتے تھے اور قیمت کے مول تول میں کچھ ایسا ہنس مکھ رویہ اختیار کرتے تھے گویا ان کا اصل مقصد منافع کمانا نہیں بلکہ خریدار کا دل خوش کرنا ہے۔

کاروبار کی اس خوش کاری کے ساتھ ساتھ ننده صاحب کو اشتہار بازی کے فن میں بھی ید طولےٰ حاصل تھا۔ شہر ر گاؤں کے در و دیوار ہوں یا جنگل میں درختوں کے تنے، دور دراز ویرانوں میں پتھریلی چٹانیں ہوں یا آبادیوں ں بجلی کے کھمبے، ہر جگہ کونے کونے اور گوشے گوشے میں "ننده ہاؤس بزازی سستی" کا کتبہ موٹے موٹے حروف میں

نگاہوں کا تعاقب کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نندہ صاحب کے کاروبار کو چار چاند لگ گئے۔ بزازی کی دکان نو دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ اب انہوں نے لاہور سے جموں اور جموں سے سرینگر تک ایک منظم بس اور ٹیکسی سروس بھی شروع کر دی۔ ساتھ ہی جموں میں پہلا سینما ہال بنانے اور چلانے کا سہرا بھی انہیں کے سر رہا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی خوشامد میں انہوں نے اس کا نام "ہری تھیٹر" رکھا۔

چاپلوسی اور خوشامد کے فن میں بھی نندہ صاحب بڑے اہل کمال تھے۔ عام خریداروں سے لے کر والیان ریاست کی خوشنودی حاصل کرنا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن دائیں ہاتھ سے وہ اپنے بھگوان کو راضی رکھنے کے لئے بھی بڑے جتن کرتے تھے۔ ان کی فیاضی اور داد و دہش کے عجیب و غریب قصے مشہور تھے یہ بات زبان زد خاص و عام تھی کہ شام کو دکان بڑھا کر وہ بہت سی ہندو بیواؤں، یتیموں اور محتاجوں کے ہاں بذات خود جاتے تھے اور ایک مقررہ رقم کا "گپت دان" ان میں تقسیم کرنے کے بعد اپنے گھر میں پاؤں رکھتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا، بارش ہو یا آندھی، کاروبار میں نفع ہو یا نقصان، خفیہ اور خاموش خیرات کے اس تسلسل میں ناغہ نہ پڑتا تھا۔

جس پابندی سے نندہ صاحب مایا دھرم کا پالن کرتے تھے، اسی طرح وہ ہندو جاتی کی سیاسی برتری قائم رکھنے کے لئے بھی خفیہ طور پر مسلسل جد و جہد کرتے رہتے تھے۔ شہر کی بہت سی ہندو تنظیمیں ان کی مالی اعانت کی مرہون منت تھیں خاص طور پر ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ کے تربیتی اداروں پر ان کی بڑی نظر عنایت تھی۔ ان اکھاڑوں میں ہندو نوجوانوں کو جنگی کرتب سکھائے جاتے تھے تاکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ ہمیشہ ان پر غالب آئیں۔ ایک خفیہ کلب میں خصوصی ٹریننگ دے کر ہندو نوجوانوں کا ہراول دستہ تیار کیا جاتا تھا کہ جب مسلمان عید میلادالنبی کا جلوس نکالیں تو اس پر حملہ کر کے اسے درہم برہم کر دیا جائے۔ نندہ صاحب ان تمام انتظامات کی بڑی خاموشی اور خوشدلی سے سرپرستی فرماتے تھے اس کے ساتھ ساتھ عید میلادالنبی اور محرم کے جلوسوں کے لئے پانی کی کچھ سبیلیں بھی وہ بڑی باقاعدگی سے لگایا کرتے تھے۔

نندہ بس سروس کی جس لاری میں ہم سوار ہوئے اس میں پندرہ مسافر اور بھی تھے۔ ایک پرنس آف ویلز کالج کا لمبا سا پنڈت پروفیسر تھا جو اپنی پنڈتانی کے ساتھ گرمی کی تعطیلات گزارنے سرینگر جا رہا تھا۔ اس شدت کی گرمی میں پنڈتانی نے اچھی سے اونی فرن پہن رکھا تھا اور سر سے پاؤں تک پشمینے کی گرم چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پان کی گڈی تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک کانگڑی تھی۔ کانگڑی نصف سے قریب راکھ سے بھری ہوئی تھی تاکہ بیچ در بیچ پہاڑی سڑک کے موڑوں پر جب پنڈتانی کا جی متلائے تو وہ بے تکلفی سے اس میں قے بھی کر لی جائے۔

ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر کی گوری چٹی، بھاری بھرکم عورت چنار کے درخت کی طرح پھیلی ہوئی تھی جس پر خزاں کے موسم میں پت جھڑ کا عمل تیزی سے جاری ہو چکا تھا۔ اس کا آدمی اس کے عین پیچھے

والی سیٹ پر براجمان تھا۔ اس نے گیبرڈین کی برجیس اور بند گلے کا چست کوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر سلیٹی رنگ کی ترچھی فیلٹ ہیٹ تھی جس میں مور کے کئی پَر اڑسے ہوئے تھے آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی سیاہ عینک تھی۔ کندھے سے براؤن چرمی تھیلا لٹک رہا تھا جس میں کیمرہ، دوربین اور ٹافیاں اور شراب کی ایک لمبی سی بوتل بھی تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ اس بوتل سے چسکی لگا کر تھیلے سے کیمرہ، دوربین اور ٹافیاں برآمد کرتا تھا۔ اور اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی ایک چھریری سی خوبصورت پارسی لڑکی کو کھلونوں کی طرح دکھاتا تھا۔ بس میں داخل ہوتے ہی اس شخص نے جملہ مسافروں کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ بمبئی کے ایک بہت بڑے آغا ہیں۔ ہر سال گرمیوں میں شکار کھیلنے کشمیر آتے ہیں اور مہاراج ادھیراج کے مہمان ہونے کا شرف پاتے ہیں۔ اس بار بھی جب وہ سری نگر پہنچیں گے تو امید واثق ہے کہ خبر پاتے ہی ہز ہائی نس انہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور شاہی مہمان خانے کی زینت بنائیں گے۔ مسافروں میں کون ایسا کافر تھا جو اس امید کے بر آنے پر فی الفور ایمان نہ لے آتا۔ کیونکہ جو نسیم بہار ایسے غنچۂ امید کو وا کرتی ہے اسے آغا صاحب احتیاطاً بمبئی ہی سے پارسی لڑکی کے روپ میں اپنے ساتھ لیتے آئے تھے۔ اور وہ تاج محل کے لئے پروانۂ راہداری کی طرح ان کے پہلو میں بیٹھی مزے مزے سے ٹافیاں کھا رہی تھی۔

آغا صاحب کی تقریر دلپذیر کا مسافروں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور وہ اپنی اپنی سیٹ پر اور بھی زیادہ دبک کر سکڑ گئے۔ سکھ ڈرائیور بھی مرعوب نظر آتا تھا۔ اس نے کلینر کو ڈانٹا کہ وہ وقت ضائع نہ کرے اور گاڑی کو فوراً سٹارٹ کرے۔ کلینر نے اچھل اچھل کر زور زور سے ہینڈل گھمایا۔ انجن نے دو چار احتجاجی سسکیاں لیں اور پھر کڑک کر چالو ہو گیا۔ بس کے پہیوں نے حرکت کی، تو گرم شال میں لپٹی ہوئی پنڈتانی نے بھی آغاز سفر کا شگون لیا اور دعا وُعا کر کے کانگڑی میں اپنی پہلی قے کر ڈالی۔

شہر سے نکل کر رام نگر سے گزرے تو مہاراجہ اور مہارانی کے محلات آئے۔ آغا صاحب پارسی لڑکی کے سر سے سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور سرگوشیوں میں اسے تاج محل کی داستان الف لیلے مزے لے لے کر سنانے لگے۔ فرنٹ سیٹ پر چھائی ہوئی خزاں دیدہ بیگم کو یہ بات ناگوار گزری اور اس نے اپنے نازک سے صندلی پنکھے کی ڈنڈی گھما کر آغا صاحب کا منہ پارسی لڑکی کے کانوں سے اس طرح الگ کر دیا جیسے بلی کے منہ سے چھچھڑا کھینچ لیا جاتا ہے آغا صاحب نے اپنے چقندر جیسے چہرے پر بھڑوں کے چھتے کی طرح لٹکی ہوئی مونچھوں کو دونوں ہاتھوں سے مروڑا اور حقارت سے پنڈتانی کو گھورا جو کانگڑی میں منہ دیئے بڑی پابندی سے اپنا فریضۂ استفراغ ادا کر رہی تھی۔

"یہ بس ہے یا چمار خانہ؟" آغا صاحب گرجے۔ "چاروں طرف بدبو ہی بدبو پھیلا رکھی ہے، توبہ توبہ ناک میں دم آگیا ہے۔"

آغا صاحب کی ناراضگی بھانپ کر کلینر اپنی جگہ سے اٹھا اور پنڈت اور پنڈتانی کو دھکیل دھکال کر سب سے الگ تھلگ بس کے آخری کونے میں بٹھا دیا۔ پنڈتانی کو تو خیر آرام ہو گیا، کہ وہ جب جی چاہے کھل کر بے روک ٹوک قے کرتی جائے۔ لیکن کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب کا نخل تمنا برباد ہو گیا جب سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ آغا صاحب

کے مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ ذاتی مراسم ہیں انہوں نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ اس وسیلہ کو اپنے مقصد براری کے لئے ضرور کام میں لائیں گے۔ یہ ویفسر صاحب کئی برس سے تگ و دو کر رہے تھے کہ کسی طرح ان کا تبادلہ پرنس آف ویلز کالج جموں سے سری پرتاپ کالج سری نگر میں ہو جائے۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی تھی اب بس میں آغا صاحب کو ہمسفر دیکھ کر انہیں خیال آیا کہ شاید یہ فرشتۂ رحمت ان کی حاجت روائی کے لئے ہی غیب سے نازل ہوا ہو۔ چنانچہ وہ بڑی محنت سے کھسک کھسک کر آغا صاحب کی سیٹ کے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ سری نگر تک پہنچتے پہنچتے وہ پارسی لڑکی سیٹ آغا صاحب کو شیشے میں اتار بھی لیتے کیونکہ کشمیری پنڈت کی شان یہ ہے کہ اسے کسی دفتر کی ادنٰے سے ادنٰے آسامی پر تعینات کر دیا جائے تو وہ دیمک کی طرح سارے عملے کو اندر ہی اندر چاٹ کر اوپر والی کرسی پر سر نکالتا ہے۔ لیکن کلینر نے انہیں پیچھے دھکیل کر سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا۔ اب پنڈتانی تو بڑے اطمینان سے کانگڑی میں منہ ٹھونسے بیٹھی تھی اور پروفیسر صاحب بصد حسرت و یاس ان خوش قسمت مسافروں کا منہ تک رہے تھے جنہیں اب بھی آغا صاحب کی سیٹ کا قرب حاصل تھا۔

رام نگر سے ذرا آگے سکھ ڈرائیور نے بس کی رفتار احتراماً ہلکی کر دی۔ کیونکہ یہاں پر نشیب میں درختوں کے ایک جھنڈ کے درمیان "پنج پیر" کی کہنہ اور بوسیدہ سی قبریں تھیں۔ کچھ مسافروں نے گردن جھکا کر "پنج پیر" کو سلام کیا۔ اب پہاڑی رستہ شروع ہونے والا تھا۔ بس گھاؤں گھاؤں کرتی پیچ در پیچ سڑک پر چلنے لگی جو بھورے پہاڑ اور سبز درختوں کے ساتھ کالے ربن کی طرح لپٹی ہوئی کبھی اوپر اٹھتی تھی، کبھی نیچے لڑھکتی تھی۔ اور کبھی بڑے بڑے بیضوی دائرے کاٹ کر نظر سے اوجھل ہو جاتی۔ ایک طرف سنگلاخ چٹانیں ہی چٹانیں تھیں۔ دوسری طرف پُر ہیبت گہرائی ہی گہرائی۔ جگہ جگہ پہاڑی جھرنوں کا پانی چھوٹی چھوٹی شفاف چادریں بن کر چٹانوں کے اوپر بہتا تھا۔ سڑک کے کنارے پکے پیوزرے اور حوض بنے ہوئے تھے اور جھرنوں کا پانی لوہے کے نل کے ذریعے چوبیس گھنٹے ان میں گرتا رہتا تھا۔ ہندو ڈوگرے ان نلوں کے نیچے کھڑے ہو کر نہاتے بھی تھے، کپڑے بھی دھوتے تھے، پانی بھی پیتے تھے مسلمانوں کو ان جوہڑوں کے پاس تک جھٹکنے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ ان کے چھونے سے چشمے کا صاف پانی ناپاک ہو کر بھرشٹ ہو جاتا تھا۔ جو بچا کھچا مستعمل پانی جوہڑوں سے بہہ کر نکلتا تھا اس کی نکاس سڑک کے دوسری جانب نشیب کی طرف تھی۔ یہاں سے وہ از سر نو ایک بیمار سی آبجو بن کر نیچے کی طرف رواں ہو جاتا تھا۔ اس سیکنڈ ہینڈ پانی کو اپنے استعمال میں لانے کے لئے مسلمانوں کو کھلی چھٹی تھی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ڈرائیور نے بس کا پانی بدلنے کے لئے ایک چشمہ کے پاس ٹھہراؤ کیا اور مسافروں کو وارننگ دی کہ یہاں سے چل کر اب وہ ادھم پور پہنچ کر رکے گا۔ اس لئے جس نے کچھ کھانا پینا ہو وہ یہیں سے کھا پی کر بیٹھے۔ سڑک کے کنارے ایک چھپر میں حلوائی اور سوڈا واٹر کی دکان تھی۔ ایک تھال میں باسی پکوڑے تھے جن پر کچھ مکھیاں سبے دلی سے منڈلا رہی تھیں۔ دوسرے تھال میں لڈو تھے جن پر سری نگر بانہال روڈ کی گرد اس قدر تہہ در تہہ

جمی ہوئی تھی کہ ان پر مکھیوں نے بھنبھنانا چھوڑ دیا تھا۔ لکڑی کے برادے میں لت پت برف کی سِل ایک میلے سے ٹاٹ میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے پاس لیمونیڈ کی بہت سی بوتلیں بے ترتیبی سے الٹی سیدھی پڑی تھیں۔

سب سے پہلے دکاندار نے پتوں کے دونے میں پکوڑیاں اور لڈو ڈال کر لیمونیڈ کی ایک ایک بوتل کے ساتھ بس کے ڈرائیور اور کلینر کو نذرانہ دیا۔ آغا صاحب اپنی بیگم اور پارسی لڑکی کو لے کر سامنے میں ایک چٹان پر بیٹھ گئے اور تھرموس، شراب، گلاس اور سینڈوچ نکال کر پکنک منانے لگے۔ باقی مسافروں نے لیمونیڈ کی بوتلوں پر یورش کی۔ دکاندار نے چار چار لڈو اور کچھ پکوڑے ڈال کر بہت سے دونے تیار کر رکھے تھے جو مسافر لیمونیڈ طلب کرتا اسے مٹھائی کا ایک دونا بھی زبردستی خریدنا پڑتا تھا۔ باقی سب مسافر تو جیسا ہی اپنی بوتل اور گلاس اور برف لے کر چھاؤں میں بیٹھ گئے لیکن سات آٹھ مسلمان پسنجروں کو لیمونیڈ پینے میں بڑی دیر لگی۔ دکان سے باہر کونے میں ایک ٹوکری لٹک رہی تھی۔ اس میں کانچ کا ایک میلا سا گلاس اوندھا پڑا تھا۔ مسلمان خریدار اس گلاس کو اٹھا کر فقیروں کی طرح ہاتھ پھیلائے دکاندار کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔ دکان والا دور ہی دور سے اس میں برف کی ڈلی چھناک سے پھینکتا تھا۔ اور پھر بوتل کھول کر ڈیڑھ دو فٹ کی بلندی سے گلاس میں لیمونیڈ انڈیل دیتا تھا۔ کچھ جھاگ خریدار کے ہاتھ پر پڑتی تھی۔ کچھ چھینٹے اس کے کپڑوں پر اڑتے تھے اور دو تین گھونٹ بوتل میں بچے رہتے تھے۔ جسے منہ لگا کر دکاندار مار مار کر حلوائی خود ہضم کر لیتا تھا۔ لیمونیڈ پی کر ہر مسلمان اپنا گلاس دھو کر دوسرے خریدار کے لئے باہر ٹوکری میں لٹکا دیتا تھا۔ بس کا ڈرائیور زور زور سے ہارن بجا کر جلدی مچا رہا تھا۔ کلینر بھی بے صبری سے آوازیں دے رہا تھا۔ آغا صاحب الگ ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ البتہ کشمیری پنڈت پروفیسر مطمئن بیٹھے تھے۔ انہوں نے حلوائی کی دکان سے پنڈتانی کی کانگڑی میں نئی راکھ مفت بھر لی تھی۔ کلینر سے ساز باز کر کے انہوں نے اپنی جگہ بدل لی تھی۔ اور پنڈتانی کو پچھلی سیٹ پر اکیلے چھوڑ کر اب وہ آغا صاحب کے بالکل قریب آ بیٹھے تھے اور موقع پا کر ان کے ساتھ اپنی گفتگو کی تمہید بھی باندھ لی تھی۔

بس دوبارہ روانہ ہوئی تو تازہ دم تھی۔ لیکن ڈرائیور کا موڈ بہت جلد خراب ہو گیا۔ سڑک پر تا حدِ نظر بتر بتر انسانوں کا ہجوم ہی ہجوم پھیلا ہوا تھا۔ میلے میلے، بھورے بھورے، پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس خمیدہ کمر رگ دو دو، تین تین من وزن پیٹھ پر اٹھائے رینگ رینگ کر چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ جیسے دیوار پر چیونٹیوں کی بے ترتیب قطاریں چل رہی ہوں۔ انہوں نے خشک گھاس کے بنے ہوئے چپل پہنے ہوئے تھے، اور ان کے تمتماتے ہوئے چہرے پسینے میں شرابور تھے۔ یہ کشمیری مسلمانوں کی قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ کے نمائندے تھے جنہیں عرفِ عام میں "ہاتو" کہا جاتا تھا۔ موسم سرما کے شروع ہوتے ہی وہ اپنا فردوس بر روئے زمین چھوڑ کر پا پیادہ قافلہ در قافلہ پنجاب کے میدانوں میں اتر گئے تھے۔ ان کی مائیں بہنیں اور بیٹیاں تو اپنے برف سے گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے چوبی گھروں میں ساری ساری رات کڑوا تیل جلا کر قالین بنتی تھیں، یا شال اور غالیچے کاڑھتی تھیں یا پھولدار نمدے بناتی تھیں یا اخروٹ کی لکڑی تراش تراش کر نازک نازک سگرٹ کیس، تپائیاں اور پھولدانوں

پر نقش و نگار کھودتی تھیں جنہیں مقامی ساہوکار اونے پونے داموں خرید کر سیاحوں کے ہاتھ بڑی بڑی قیمت پر بیچ ڈالتا تھا۔ سنسان راتوں میں برفانی ہوا کے جھکڑ درختوں اور دیواروں اور چٹانوں سے ٹکرا کر خوفناک چیخیں مارتے تھے۔ وقتاً فوقتاً برف کے بڑے بڑے تودے چھتوں سے گر کر سناٹے میں زلزلوں کا ارتعاش پیدا کرتے تھے تیل کے چراغ گل ہو جاتے تھے۔ کانگڑیوں کی آگ سلگ سلگ کر راکھ ہو جاتی تھی۔ لیکن لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کابکوں میں محبوس بوڑھی اور جوان عورتوں کی فنکار انگلیاں اپنے کام میں لگاتار مصروف رہتی تھیں۔ دھڑکتے ہوئے دلوں سے وہ کبھی حضرت شاہ ہمدان رح کی حکایات میں مگن ہو جاتی تھیں، جنہوں نے وادی کشمیر میں اسلام کی شمع روشن کی تھی۔ کبھی وہ للّہ عارفہ کے گیتوں میں صبر و قرار کا سہارا ڈھونڈتی تھیں۔

صبر، بیٹا، صبر
صبر تو ایک سنہری پیالہ ہے
یہ اتنا بیش قیمت ہے کہ اسے خریدنے کا ہر کسی کو یارا نہیں۔
صبر، بیٹا، صبر۔
صبر تو نمک، مرچ اور زیرہ کا نیز مرکب ہے۔
یہ اسا تلخ ہے کہ اسے چکھنے کی ہر کسی کو تاب نہیں۔

جب کبھی برف و باراں کا طوفان تنہائی کی اداس راتوں کو اور بھی تاریک اور طویل کر دیتا تھا۔ تو ان کے شوق کی گہرائیوں سے حبّہ خاتون کے درد و فراق، انتظار و اضطراب کے نغمے لہرانے لگتے تھے۔

دلو میانہ پوشے مدنو

- - - - - - - - - - - - - -

میں سب راہگزاروں پر پھولوں ہی پھولوں کی سیج بچھا دونگی
اے میرے پھولوں سے پیار کرنے والے محبوب، آ جاؤ۔
آؤ کہ ہم مرغزاروں میں یاسمین اور نسرین اور گلاب کے پھول چنیں
آؤ کہ ہم دونوں کنارِ دریا چلیں
ساری دنیا نیند کی آغوش میں بے ہوش پڑی ہے
میں تیرے لئے سراپا انتظار بیٹھی ہوں
اے میرے پھولوں سے پیار کرنے والے محبوب آ جاؤ
دلو میانہ پوشے مدنو ....

حضرت آدمؑ تو دانۂ گندم کی پاداش میں خلد سے نکلے تھے لیکن ڈوگرہ راج میں کشمیری مسلمان دانۂ گندم کی تلاش میں اپنی جنت ارضی سے نکلنے پر مجبور تھا۔ سردیاں آتے ہی وہ گلمرگ، گاندربل، اچھابل، تنلاگ بل

Date ......

باندی پورہ، بانپور کے کوہساروں اور مرغزاروں سے نکل کر پنجاب کی دور دراز منڈیوں میں پھیل جاتے تھے۔ دن بھر غلے اور لوہے اور کپڑے کی بار برداری کرتے تھے۔ بسوں اور تانگوں کے اڈوں پر سامان ڈھوتے تھے۔ لکڑی کے ٹالوں پر لکڑیاں پھاڑتے اور شام کو مرغی کے بچوں کی طرح چھوٹے چھوٹے گروہوں میں اکٹھے بیٹھ کر کچھ چاول ابال لیتے تھے خشکہ رات کو کھا کر کھلے آسمان تلے سو رہتے تھے اور صبح اٹھ کر رات کی بچی ہوئی بھچھ میں نمک ملا کر دن کا کھانا بنا لیتے تھے اس طرح خون پسینہ ایک کر کے گرمیوں میں جب وہ کچھ نقدی بچا کر اور دو ڈھائی من سامان پیٹھ پر لاد کر اپنی جنت گم گشتہ کی طرف واپس لوٹتے تھے تو کہیں کسٹم والے ان کا مال لوٹتے تھے۔ کہیں کوئی ڈوگرا سردار برسرِ عام ڈرا دھمکا کر ان کی پونجی ہتھیا لیتا تھا۔ کہیں پولیس اور محکمہ مال کے اہلکار انہیں سرِ راہ پکڑ کر کئی کئی دن، کئی کئی ہفتے مفت کی بیگار میں لگائے رکھتے تھے۔ یوں بھی کشمیری مسلمان کا بال بال ڈوگرا حکومت کے لاتعداد ٹیکسوں کے شکنجے میں جکڑا رہتا تھا۔ پھولوں پر ٹیکس، سبزی پر ٹیکس، بھیڑ، بکری اور گائے پر ٹیکس، چولہا ٹیکس، کھڑکی ٹیکس، اون ٹیکس، شال ٹیکس نجار اور خیاط پر ٹیکس، مزدور اور معمار پر ٹیکس، ملاح اور لوہار پر ٹیکس۔ ارباب نشاط پہ ٹیکس، بس فقط ایک حجام کی ذات تھی جو کسی وجہ سے ٹیکسوں کے چنگل میں گرفتار نہ تھی۔

کشمیری مسلمان کا مال و متاع تو ہر وقت ریاست کے اہلکاروں، خفیہ نویسوں، رئیسوں اور جاگیرداروں کے رحم و کرم پر رہتا ہی تھا، اس غریب کی جان بھی اپنی سرزمین میں بے حد ارزاں تھی۔ ایک زمانے میں کشمیری مسلمان کی زندگی کی قانونی قیمت مبلغ دو روپے تھی۔ اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کو جان سے مار ڈالتا تھا تو عدالت قاتل پر سولہ سے بیس روپے تک جرمانہ عائد کر سکتی تھی۔ دو روپے مقتول کے لواحقین کو عطا ہوتے تھے اور باقی رقم خزانہ عامرہ میں داخل ہو جاتی تھی جس وقت انگریزوں نے اس جنت ارضی کو ڈوگروں کے ہاتھ فروخت کیا تو یہ نرخ ذرا بالا ہو گیا۔ کشمیر کا سودا ۷۵ لاکھ روپے پر طے ہوا تھا۔ اس وقت کی آبادی کے حساب سے باشندوں کی قیمت سات روپے فی کس کے قریب پڑی۔ ڈوگرہ راج میں کسی وقت مسلمانوں کی زندگی ایک گائے کا درجہ بھی نہ پا سکی۔ شروع شروع میں گاؤ کشی کی سزا موت تھی۔ ملزم کو رسیوں سے باندھ کر سڑکوں پر گھسیٹا جاتا تھا اور پھر برسرِ عام پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ یا زندہ جلا دیا جاتا تھا لیکن بعد میں بھی گائے ذبح کرنے کی سزا دس سال قید بامشقت ہمیشہ رہی۔ کئی جگہ عید الاضحیٰ کے موقعہ پر بھی بھیڑ یا بکری قربان کرنے کے لئے حکومت کی اجازت حاصل کرنا پڑتی تھی، جو کبھی ملتی تھی، کبھی نامنظور ہو جاتی تھی ۔۔۔ ان سب دشواریوں، رکاوٹوں، پابندیوں اور لوٹ مار کے باوجود کشمیری "ہاتو" اپنی سرزمین کے ساتھ والہانہ طور پر وابستہ تھا۔ پنجاب کے میدانوں اور منڈیوں میں اسے اجرت بھی زیادہ ملتی تھی۔ بیگار بھی کوئی نہ لیتا تھا۔ اور بڑا اگر گوشت کھانے پر نہ قید کی سزا تھی نہ موت کی لیکن گرمیاں آتے ہی وہ رسے تڑا کر بھاگ اٹھتا تھا اور اپنا مال و متاع پیٹھ پر لاد کر پاپیادہ کشاں کشاں اپنی دور افتادہ وادیوں کی راہ لیتا تھا۔

بانہال سرینگر روڈ پر جابجا ان کے قافلے اپنی جنت گم گشتہ کی طرف رواں تھے۔ ان کو دیکھ کر پہلے تو ہماری بس کے ڈرائیور کی رگِ ظرافت پھڑکی۔ ایک موڑ پر بھاری بھرکم بوجھ تلے دبے ہوئے چند خمیدہ کمر کشمیری سڑک

کے بیچ آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ ڈرائیور نے عین ان کے پیچھے پہنچ کر زور سے ہارن بجا دیا۔ وہ خوف سے کانپ اٹھے اور بدحواس ہو کر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ کوئی لڑھک کر گھٹنوں کے بل گرا کوئی بس کے مڈگارڈ سے ٹکرایا۔ کسی نے لجاجت سے ہاتھ باندھ کر ڈرائیور کی منت کی۔ کچھ مسافر کھسیانی سی ہنسی ہنسے۔ آغا صاحب نے زوردار قہقہے بلند کئے۔ نوجوان پارسی لڑکی اس نظارے سے خاص طور پر محظوظ ہوئی۔ اس نے جھٹ پٹ آغا صاحب کا کیمرہ لیا اور سڑک پر گرتے پڑتے بدحواس لوگوں کی تصویریں اتارنے لگی۔ فوکس ٹھیک کرنے کے لئے آغا صاحب نے لڑکی کا سر اپنے سینے سے لگا کر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ان کی بیگم نے صندلی پنکھے کی ڈنڈی ان کے کان میں چبھو کر اس بند و بست میں رخنہ ڈالا۔ اور بس شاداں و فرحاں گھاؤں گھاؤں کرتی اگلے موڑ پہ پہنچی۔ یہاں بھی وہی تماشہ ہوا۔ پھر اس سے اگلے موڑ پر .... پھر اس سے بھی اگلے موڑ پر .... تین چار موڑوں کے بعد سب کی طبیعت اس دلپسند مشغلے سے سیر ہو گئی۔ اب اگر کوئی کشمیری سڑک کے درمیان نظر آتا تو ڈرائیور کے مزاج کا پارہ چڑھ جاتا اور وہ سیاہ چشمان کشمیر کی آل اولاد کو کئی پشت تک بڑی غلیظ گالیاں دیتا۔ کلینر بھی ایک موٹا سا سونٹا لے کر بس کے دروازے میں کھڑا ہو گیا اور اسے گھما گھما کر راستہ صاف کرنے میں معروف ہو گیا۔ اپنے بوجھ کے تلے دبے ہوئے کشمیری بے بسی سے پریشان ہو کر ادھر ادھر بھاگتے تھے اور پہاڑی ڈھلوانوں پر سایہ دار درختوں کے نیچے پکے چبوتروں پر بیٹھے ہوئے ڈوگروں کے لئے بڑی ضیافت طبع کا سامان فراہم کرتے تھے۔

لانبے لانبے کرتوں اور چوڑی دار پاجاموں میں ملبوس بڑی بڑی مونچھوں والے ڈوگرے ریاست میں شاہی اولاد کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے پاس وسیع جنگلات ہوں یا ایک دو ایکڑ اراضی، وہ اپنے نام کے ساتھ راجہ یا ٹھاکر یا دیوان کا دُم چھلا ضرور لگاتے تھے، اور چھاتی نکال کر ایسے دم خم سے چلتے پھرتے تھے جیسے وہ ابھی ابھی راج محل کے پنگوڑے سے انگوٹھا چوستے ہوئے برآمد ہوئے ہوں۔ ان کی اراضیاں مسلمان مزارع کاشت کرتے تھے۔ ان کے مویشی مسلمان بچے جنگلاتی چراگاہوں میں چراتے تھے اور وہ خود آلتی پالتی مار کر بیٹھے چلم پیا کرتے تھے۔ چلم پینے کے علاوہ اپنے گھٹے ہوئے سر پر سرِ عام تیل کی مالش کرانا بھی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ مالش کے بعد وہ اپنی چندیا پر لہراتی ہوئی سات آٹھ انچ لمبی "بودی" کو مونچھوں کی طرح تاؤ دیتے تھے، اور دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رسی کی طرح مروڑ کر پیچ در پیچ کارک سکرو کی مانند اینٹھ لیتے تھے۔ ان عجیب الخلقت ڈوگروں کے آس پاس شیشم اور چیار اور پاچیڑھ کے درختوں کے نیچے اگر کوئی بانکی ترچھی ڈوگری سر پر پیتل کی دمکتی ہوئی گاگر اٹھائے مٹکتی مٹکتی گزر جاتی تھی تو پہاڑ کی پگڈنڈیوں پر گوکھرو اور کناری اور گوٹے کی جھالریں ہی جھالریں پھیل جاتی تھیں اور سڑک پر چلتی ہوئی بسوں کے ڈرائیور منہ اٹھا کر اس نظارے میں ایسے محو ہو جاتے تھے کہ گاڑیاں کھڈ میں گرنے سے بال بال بچتی تھیں۔

ہماری بس بھی کئی بار کھڈ میں گرتے گرتے بچی۔ آغا صاحب تو بڑے خوش تھے کیونکہ ہر بار پارسی لڑکی خوف سے چیخ مار کر ان کے ساتھ لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ لیکن ان کی بیگم نے ڈرائیور کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ ایک سخت نادر بے نظیر کے بعد انہوں نے سکھ ڈرائیور کو ایک ایسی طویل اور پیچیدہ گالی دی کہ اس فن میں مشاق ہونے کے باوجود

وہ ہکا بکا رہ گیا اور شرم سے اس کے کان سرخ ہو گئے۔

" ہماری خانم دراصل ملکۂ دشنام ہیں۔" آغا صاحب نے پنڈت پروفیسر کو مخاطب کرکے سب مسافروں کو مطلع کیا کہ" بڑے بڑے راجے مہاراجے اور نواب اس کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔ ایک بار سری مہاراجہ بہادر نے چشمہ شاہی پر گالی گلوچ کا بڑا شاندار ٹورنامنٹ منعقد کیا تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ الور، نواب آف پالن پور، مہارانا جھالاوار سب موجود تھے۔ گالیوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ سب نے اپنے اپنے کمال کے جوہر دکھائے۔ لیکن ٹرافی ہماری خانم نے ہی جیتی۔"

کشمیری پنڈت پروفیسر نے گھگیا گھگیا کر اپنے گلے سے کچھ آوازیں برآمد کرکے حسب توفیق داد دی۔

" جانتے ہو خانم کی گالی کتنی طویل تھی؟" آغا صاحب نے ڈانٹ کر پوچھا۔

پنڈت صاحب خوشامدانہ حیرت و استعجاب سے جبڑے لٹکا کر بیٹھ گئے جیسے بکری کا میمنہ گھاس وصول کرنے کے لئے تھوتھنی کھولتا ہے۔

" خانم کی گالی ڈیڑھ منٹ دراز تھی۔ پوری ڈیڑھ منٹ۔" آغا صاحب نے اعلان فرمایا۔

پنڈت جی ایک بار پھر تازہ حقے کی طرح گڑگڑائے اور آغا صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے فن دشنام طرازی کے حق میں ایک عالمانہ تقریر جھاڑنے کے لئے پر تولنے لگے لیکن ڈرائیور نے انہیں مہلت نہ دی۔ ادھم پور آگیا تھا، اور بس لاریوں کے اڈے پر جا رکی۔

ادھم پور کے اڈے پر بڑی ریل پیل تھی۔ بس رکتے ہی پولیس کے کچھ سپاہیوں نے اسے گھیرے میں لے لیا، اور یہ خوشخبری سنائی کہ سرینگر میں ہیضہ کی وبا پھوٹی ہوئی ہے۔ اس لئے انا کولیشن سرٹیفکیٹ حاصل کئے بغیر کوئی شخص آگے سفر نہیں کرسکتا۔

ادھم پور کی فرض شناس میونسپلٹی نے انا کولیشن کا بندوبست بھی اڈے ہی پر کر رکھا تھا۔ ایک کھلی جگہ ایک چھولداری نصب تھی جس کے باہر بورڈ پر جلی حروف میں یہ تحریر تھا:

ویلکم

خوش آمدید - جی آیاں نوں

ہیضے کا ٹیکہ یہاں لگوائیے

از طرف

خادم سیاحاں میونسپل کمیٹی ادھم پور

اندر ٹیکہ لگانے کا تو کوئی سامان نہ تھا۔ البتہ ایک بابو بہت سے خالی فارم اور ہیلتھ آفیسر کی مہر لئے ضرور بیٹھا تھا۔ ہر مسافر سے وہ تین روپیہ نذرانہ وصول کرتا تھا۔ اور فارم پر کرکے اور ان پر مہر لگا کے ان کے حوالے کر دیتا تھا۔ باہر ایک روپیہ پولیس ڈالا لیتا تھا۔ آٹھ آنے کلینر مانگتا تھا۔ اور اس طرح ساڑھے چار روپے میں

وبائے ہیضہ کا انسداد کرنے کے بعد مسافر کو بس میں دوبارہ داخلہ نصیب ہو جاتا تھا۔ ہم اس سعادت سے محروم رہے کیونکہ ہم تو پلیگ سے بچنے کے لئے جموں سے نکلے تھے۔ ہیضے میں مبتلا ہونے کے لئے سرینگر نہیں جا رہے تھے اس لئے ہم بس سے اتر گئے اور اگلے روز ایک دوسری لاری سے جموں واپس لوٹ آئے۔

(زیر تصنیف "شہاب نامہ" کا ایک باب)

سفرنامہ

سفر در سفر

اشفاق احمد

دلتو ملنگ کے واقعہ نے ہم سب کو تھوڑی دیر کے لیے خاموش کر دیا۔ اصل میں واقعہ نہ بھی بیان ہوتا تو بھی ہمیں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ضرور ہو جانا تھا۔ گفتگو کے بعد خاموشی آپ ہی در آتی ہے۔ جنگوں میں بھی جب دونوں طرف سے شدید گولہ باری ہوا کرتی ہے تو ایک وقفہ خاموشی کا آجاتا ہے۔ کہہ سن کر یا وقت مقررہ پر نہیں۔ بس یونہی بغیر سوچے سمجھے۔ بغیر جھنڈی ہلائے کسی کاشن یا آرڈر کے بغیر بنا سوچے سمجھے۔ طوائف اور تماش بین کے درمیان بھی خاموشی کا ایک طویل لمحہ آجاتا ہے۔ بہتے ہوئے پُرشور پانیوں میں بھی اچانک سکوت آجاتا ہے۔ شاید آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ایک ساتھ چلتی ہوئی بہت سی مشینیں بھی ایک وقت خاموش ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ وہ چل رہی ہوتی ہیں، لیکن آپ کو ان کا شعور نہیں ہوتا۔

ہم چلے جا رہے تھے اور خاموش تھے۔ جیسے نوجوانوں گایوں کے گلے میں اونچی کوہان اور مضبوط پٹھے والا سانڈ چلا کرتا ہے اور اس کے گلے کی جھالریں آدھے پونے جھونے سے پڑا کرتے ہیں۔

اچانک ایک مضبوط، دل دار، سرسبز اور وزنی پتہ لیڈر کی گردن پر آگرا۔ وہ تڑپ کر اچھلا اور اس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی۔

ہمارا لیڈر بھی دوسرے لیڈروں کی طرح بزدل اور ظالم ہے۔ وہ اندر سے مسلسل لرزتا رہتا ہے اور باہر سے ہر ایک کی سرزنش کیا کرتا ہے۔ اس کا قد چھوٹا، بدن مضبوط اور آنکھیں تیز ہیں۔ وہ سختی اور ڈسپلن کا قائل ہے اور اس کے ہاتھ کی چھڑی کبھی بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ ہم نے متفقہ رائے سے اس کو اپنا لیڈر چنا ہے اور اگر ہم اسے اتفاق رائے سے نہ بھی چنتے تو بھی وہ ہمارا لیڈر ہوتا، کیونکہ اس میں ایک اچھے لیڈر کے سب خصائص موجود ہیں اور ایسے خصائص والا آدمی لیڈر بنے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مسعود نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا لیڈر، کیا ہوا؟"

تو لیڈر نے اپنی گدی پر ہاتھ رکھے رکھے اسے یوں گھور کر دیکھا جیسے لیڈر غصے کے وقت دیکھا کرتے ہیں۔

"کچھ تھا۔ بہت وزنی" اس نے آہستہ سے کہا "جیسے کوئی پنجہ ہو"۔

"لو جناب یہ پنجہ ملاحظہ فرماؤ" اعظمی نے جھک کر زمین سے وہ پتا اٹھایا اور ہم سب کی نظروں کے سامنے گھمادیا "دیکھا آپ نے یہ فولادی پنجہ۔ گریباں گیر، جو ہماری قیادت کی گردن سے چمٹ گیا تھا"

"اور قیادت یوں اچھلی تھی جیسے سانپ کی دم پر پیر آگیا تھا" مسعود نے ہنس کر کہا۔

عماد نے وہ پتہ اعظمی کے ہاتھ سے لے کر بغور دیکھا اور پھر مفتی کو دیتے ہوئے بولا "ہوسکتا ہے مفتی جی یہ دلیسا ہی پتا ہو دتو ملنگ والا۔

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں" مفتی بولا "ہر پتے کی ایک اپنی مگنیٹک فیلڈ ہوتی ہے"۔

عماد نے ہنس کر کہا "آپ کے خیال میں یہ پتا ریڈیو ایکٹو ہے"۔

"جی جناب" اعظمی سنجیدگی سے بولا "اگر یہ پتا جادو چڑھا نہ ہوتا تو لیڈر اس طرح سے کیوں اچھلتا بھلا — نباتات کی زندگی کے کچھ پہلو حیوانی زندگی سے بھی کڑے ہوتے ہیں"۔

"ہاں جی" مسعود نے کہا "اس کو معلوم ہے اچھی طرح سے۔ یہ خود بریسم کی سنڈی رہ چکا ہے۔ ریڈیو میں آنے سے پہلے"۔

کوہستانی نے حیرانی سے اعظمی کی طرف دیکھا۔ سارے سفر کے دوران میں اس کا یہی خیال تھا کہ اعظمی بھی ہماری طرح کا انسان ہے۔ لیکن مسعود کی بات سے وہ دبدھا میں پڑ گیا، اور آہستہ سے پوچھنے لگا۔ "کون؟ یہ صیب؟ عینک والے!"

"بالکل خان۔ یہی" مسعود نے جواب دیا "یہ پہلے سنڈی ہوتا تھا پیر کی دعا سے آدمی بن گیا"۔

"سبحان اللہ جی" کوہستانی نے اپنا ہاتھ چوم کر ماتھے پر رکھا اور سر ہلا کر کہا "وہ تو اللہ کے فضل سے جو چاہے کرسکتا ہے"۔

"یہ تو حیرکاس کرتے ہیں خان" اعظمی نے پتہ سونگھ کر کہا "لیکن درختوں میں اور پتوں میں اور بوٹوں میں بھی ہماری طرح سے جان ہوتی ہے"۔

"پہلے نہیں ہوتی تھی صیب" کوہستانی نے کہا "پرجب حضرت ذکریا علیہ السلام نے بھاگ کر درخت میں پناہ پکڑی اور ظالم کافروں نے تیسے کے ساتھ ان کو بھی چیر دیا تو اللہ تعالیٰ نے کہا صبر کرو۔۔۔۔ صبر کرو ذکریاؑ۔ اب نہیں بولنا۔ شور نہیں مچانا۔ اور حضرت ذکریاؑ نے صبر کیا جی، تو پھر سارے درختوں میں جان پڑ گئی۔ ان کا روح ہے جی، پیغمبر علیہ السلام کا ان میں"۔

"شاباش" اعظمی نے کہا "تم تو پیغمبروں کے راز سے بھی واقف ہو اور ان گدھوں کو دیکھو۔ سب پڑھ لکھ کر برباد کر دیا ہے"۔

مفتی نے کہا "دیکھو یار اس علاقے کی اکولوجی کس قدر مختلف ہے۔ کوہستانی بھی ایسے بول رہا ہے جیسے ڈاکٹر لوئنگ بات کر رہا ہو۔ بے ناپریوں کا اور طلسم کا راج اس علاقے میں"۔

ہم چل تو رہے تھے لیکن لیڈر بار بار اپنا ہاتھ گدی پہ لے جاتا تھا، حالانکہ پتا ابھی تک اعظمی کے ہاتھ میں تھا۔

"اس پتے میں" اعظمی نے کہا "بڑی سد ہے۔ ڈنڈی سے پکڑ کر مروڑی دو تو ایک آدھ پھیری سے زیادہ

نہیں گھومتا۔ واپس مڑتا ہے۔ بڑا ہٹ دھرم ہے۔"

"پھر"، عماد نے پوچھا۔

"پھر کیا" اعظمی بولا "دوسرے جانداروں کی طرح اپنی انفرادیت رکھتا ہے اور ابھی تک اس میں زندگی کی قوت باقی ہے۔"

"ساتھ جذبہ خودی بھی رکھتا ہے" میں نے کہا "زناری برگساں نہیں ہے۔"

"اب تم لوگوں کو تو مذاق سوجھ رہا ہے" اعظمی نے خشکی کے ساتھ کہا۔

"یہ محسوس کرنے والی مخلوق ہے، تمہارے جیسی گھامڑ نہیں ہے۔"

مفتی نے کہا "اس معاملے میں اعظمی کے ساتھ بھڑنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ اس کی فیلڈ ہے۔"

"اور اس میں یہ جب چاہے باؤنسر پھینک سکتا ہے۔" مسعود نے بات کاٹی اور سب ہنسنے لگے۔

پتا ابھی تک اعظمی کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس کو مروڑیاں دے رہا تھا۔

"یہ دیکھو مفتی .... یہ دیکھو۔" اس نے مفتی کو پتے کی سرتابی دکھائی اور مفتی یونہی اس کا دل رکھنے کو "ہاں ہاں کیوں نہیں کیوں نہیں کرنے لگا۔"

ہم چلے جا رہے تھے اور اعظمی کہہ رہا تھا "پودوں کی بھی اپنی پسند اور ناپسند ہوتی ہے۔ اس وقت اسے میں سخت ناپسند ہوں اور میرے جوہر حیات کی لہروں سے یہ پتا گھبرایا اور بھنایا ہوا ہے اور ابھی کوئی ہاتھ اسے تھام لے تو شاید اس کی بے چینی اور سرکشی دور ہو جائے۔"

"وہ ہاتھ پیچھے رہ گیا۔ بہت پیچھے۔ آبادی میں۔ ہمارے درمیان کوئی ایسا شخص نہیں جس سے اس کا دل مل جائے فی الحال یہ تمہارے پاس ہی ٹھیک ہے۔"

عماد نے کہا "مفتی صاحب اسے آپ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ آپ ہم سب میں زیادہ بزرگ اور حاجی ہیں۔"

"ناں ناں مفتی ناں" لیڈر چیخا۔ "تم اس کے نزدیک نہ جانا چپنڈ مارے گا۔"

مفتی نے ہنس کر کہا "کپاس چننے والی ہمیشہ عورتیں ہوتی ہیں ہمارے یہاں، ولایت میں، امریکہ میں کوئی مرد یہ کام نہیں کر سکتا۔ کپاس کا پھول مرد کا ہاتھ پسند نہیں کرتا۔"

مفتی رک گیا۔

"وجہ یہ ہے مفتی کہ مرد کے ہاتھ کی دلیو اور کپاس کے پھول کا جوہر حیات ایک دوسرے کے بالکل الٹ ہیں پھٹی کوسلے سے باہر نہیں نکلتی۔ زور لگاؤ تو آدھی کوئے میں چمٹی رہ جاتی ہے۔ کچھ زمین پر گر جاتی ہے۔ نکل آئے تو سوکھی شاخوں میں پھنس جاتی ہے۔ میں نے ملتان اور نواب شاہ کے کسانوں سے پوچھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ روئی کو خراب کرنا ہو تو مردوں کو پھٹی چننے کے لیے کھیت میں داخل کر دو۔"

"وہ تو اس لیے ہوتا ہے بھائی میرے" عماد نے کہا "کہ ایک تو عورتوں کے ہاتھ چھوٹے اور انگلیاں باریک

ہوتی ہیں۔ دوسرے انہیں اجرت کم دینی پڑتی ہے۔ تیسرے ملتان اور نواب شاہ کے مرد ویسے بھی سست ہیں۔"
مفتی نے کہا "یہ سب بکواسی لوگ ہیں اعظمی۔ تو مجھے بتا۔"
"اور اس میں ذرا نفسیاتی پخ لگا دینا" مسعود نے ہنس کر کہا "کچھ فرائیڈ کی تھیوری بھی لگا دینا کسی پودے کے سائے بدنظری اور بدفعلی کی۔"
"بالکل۔ اس میں کیا جھوٹ ہے" اعظمی نے کہا "گوئٹے اس بات کا ثبوت بہم کرتا تو ختم ہو گیا بیچارا۔"
"گوئٹے" میں نے حیرانی سے پوچھا "یہ ہمارا جرمنی والا۔ فاؤسٹ کا مصنف!"
"جناب" اعظمی نے چیخ کر کہا اور اس کی چیخ خاموشی میں خوف بن کر گونجی۔
"وہی۔ شاعر۔ ناول نگار فلسفی۔ آپ کی جرمنی والا ——— آپ ہی کے اٹلی میں جا کر دو سال رہا اور وہیں اس نے اعلان کیا کہ پودوں میں بھی نر مادہ ہے اور ان میں بھی سھوگ ہوتا ہے۔ لمبی ایستادہ ڈنڈی نر ہوتی ہے اور گھومتی بل کھاتی ڈنڈی مادہ ہوتی ہے۔ پودا ہماری دنیا میں زندگی کا واحد ترجمان ہے۔ جس کی مادہ اندھیرے میں بڑھتی پھلتی اور پھولتی ہے اور کشش ثقل کے خلاف چلتی ہے اور اس کا نر ہماری آپ کی اور دوسرے جانداروں کی طرح روشنی میں پلتا ہے اور کششِ ثقل کے مطابق چلتا ہے۔"
اعظمی کی یہ بات سن کر ہم سنجیدہ ہو گئے۔ کہنے لگا
"گوئٹے کو نیوٹن سے یہی تو شکایت ہے کہ اس نے گریویٹیشن کی بات تو کی لیکن لیویٹیشن کی بات نہ کر سکا۔"
"لیویٹیشن کیا!" ہم سب نے ایک ساتھ پوچھا۔
"کشش ثقل کے خلاف اٹھنا" مفتی نے کہا "جیسے یوگی بغیر کسی مادی مدد کے زمین سے اوپر اٹھ جاتے ہیں، جیسے اولیاء اللہ ہوا میں اڑ کر ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔"
اعظمی نے کہا "نیوٹن نے یہ تو دیکھ لیا کہ سیب اوپر سے نیچے کو گرا لیکن یہ نہ معلوم کر سکا کہ اوپر کیسے چلا گیا ——— درخت پر۔"
"ہے کہ نہیں گدھا" لیڈر نے کھیج کر کہا "سیب درخت کو نہ لگتا تو اور تیرے باپ کو لگتا۔"
مفتی نے کہا "تم آگے بات کرو اعظمی یہ بیوقوف لوگ ہیں ایسی باریک بات کو نہیں سمجھیں گے۔"
"دیکھیں مفتی جی" اعظمی نے کہا "جس طرح کشش ثقل کی فیلڈ سے دور رہنے پر آہستہ آہستہ اس کی کھینچ کم ہونے لگتی ہے اور وہ کم در ہو نے لگتی ہے۔ اسی طرح لیویٹی کی فیلڈ سے نکلنے پر اس کی اٹھانے کی طاقت کم ہونے لگتی ہے کشش کا مرکز اندر ہے۔ لیویٹی کا باہر یہی وجہ ہے کہ کشش کی وجہ سے چیزیں گرتی ہیں اور لیویٹی کی وجہ سے اٹھتی ہیں۔"
"کیسے کیسے کیسے" حماد نے پوچھا۔
"گویا گریویٹی کا مرکز زمین میں ہے" مفتی نے کہا "اور لیویٹی کا کاسمک ورلڈ میں۔"
"شاباش" اعظمی کا چہرہ فرطِ مسرت سے کھلکھلا اٹھا۔ اس نے مفتی کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا "دیکھو مفتی جی!

طوفان، بادل، باراں، سیلاب، گریوٹی کی وجہ سے زمین کی طرف کھینچتے ہیں اور آتش نشاں مادہ لیوٹی کے زور پر آدھا آسمان کی طرف پھٹتا ہے۔"

پتہ نہیں اعلٰی کی بات کہاں تک درست تھی اور اس نے پھول جمع کرتے کرتے یہ علم کدھر سے سیکھ لیا تھا ہم خاموش ہو گئے۔

عماد ابھی تک اس مسئلہ کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔ اس نے اپنی چھڑی اعلٰی کے کندھے پہ ماری اور کہا "تمہارا مطلب ہے لیوٹی کا مرکز ایتھر میں ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا،" اعلٰی نے کہا "لیکن اس قدر ضرور کہوں گا کہ جہاں گریوٹی کی پُل (PULL) کم ہونے لگتی ہے وہیں سے لیوٹی کی سرحد شروع ہونے لگتی ہے۔"

"یہ بھی آیا مفتی کی لائن پہ" مسعود نے ہنس کر کہا "پتہ نہیں لوگ آخری عمر میں مفتی کی نقل کیوں اتارنے لگ جاتے ہیں، حالانکہ ساری زندگی اس کا سارا زور جنس پر رہا ہے۔"

" اپنا نہیں" اعلٰی نے شرارت سے کہا "اس کے علم کا۔"

مفتی نے ایک لمبی سانس لی اور رک کر بولا "اب میں تم جیسے جاہل لوگوں کو کس طرح سے سمجھاؤں کہ یہ جنس، محبت معرفت، عبادت ایک ہی حقیقت کی مخصوص کڑیاں ہیں۔ کبھی ان کے درمیان خط کھینچ جاتا ہے کبھی نہیں کھنچتا کبھی کسی حصے سے ایک مخصوص خوشبو آنے لگتی ہے کبھی نہیں آتی۔ لیکن زیادہ کیفیت گھلی ملی سی رہتی ہے، جیسے گلاس کے اندر برف کی ڈلی۔ الگ بھی ہوتی ہے اور پانی کا ایک حصہ بھی۔ الگ سے دیکھو تو کنارہ رکھتی ہے۔ لیکن پانی میں چھوڑ دو تو کنارہ نظر نہیں آتا۔ جو پگھل رہا ہو وہ پانی ہے جو نظر آرہا ہے وہ ڈلی ہے۔ کچھ لوگ ڈلی کو جنس کہتے ہیں، عبادت کو پانی سمجھتے ہیں اور بھاپ کو معرفت تصور کرتے ہیں۔ لیکن ہے ایک ہی بات۔ سب شائیں سرکاری ہیں!

" کچھ ڈی ایچ لارنس کا سا فلسفہ ہے یہ۔"

"اوئے لارنس کے باپ کا ہے گدھے!" مفتی چڑ کر بولا "اس سے بہت پہلے دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف حصوں میں جنس کی اور فلیس کی پوجا ہوتی رہی ہے۔ آج بھی سارا یورپ تنترا کی طرف لوٹ رہا ہے۔"

"تنترا!" عماد نے حیرت سے پوچھا تو لیڈر کو غصہ آگیا۔ اس نے جھڑک کر کہا "جنتر منتر تنتر نہیں سنا؟ ہم نے ایک پروگرام نہیں کیا تھا اس پر!"

" یہ وہ تنتر نہیں کھوتے" مسعود نے کہا "یہ دوسرا تنتر ہے۔ مفتی والا۔"

"بھائی جی" مفتی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا "اگر جنسی اتصال کو پاکیزگی کے ساتھ اور تمام لوازمات تقدس کو ملحوظ رکھ کر عمل میں لایا جائے تو اس سے روحانی برقی قوت پیدا ہوتی ہے۔"

"کس میں؟" لیڈر نے بے چینی سے پوچھا۔

"کسی شخص میں نہیں" مفتی نے کہا "ماحول میں۔ گرد و پیش میں۔ تمام اجسام موجود میں۔ اس سے وہ

آلفا ریز معرض وجود میں آتی ہیں جو روح کی بالیدگی کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اگر انسان پورے بتیس منٹ اس حالت میں پُرسکون، خاموش، چپ چاپ اور بے حس و حرکت رہے تو اٹھائیسویں منٹ پر ایک نروانی کلک ہوتا ہے لیکن اس کے لیے لازم شرط پاکیزگی ہوگی اور ذریقین کا مطہر روح ہونا ضروری ہے۔ خدا جانے کہاں تک درست ہے لیکن میں نے پبلک لائبریری کی ایک کتاب میں دیکھا تھا، سن تینتالیس میں۔ مجھے اس کی تفصیلات اچھی طرح سے یاد تھیں لیکن ان دنوں لاہور میں بہت سے ٹامی لوگ تانگوں میں گھوما کرتے تھے۔ جن میں سے ایک کے ساتھ میری جھڑپ ہوگئی تھی اور اس نے میری ٹھوڑی پر زور کا مکہ مارا تھا۔"

"اور تو نے کچھ نہیں کیا" لیڈر نے غصے سے کہا۔

"انگریز کا زمانہ تھا۔ جنگ نئی نئی ختم ہوئی تھی اور پھر میں ان سے کمزور تھا۔"

یہ اس زمانے کی بات ہوگی جب مفتی قصور میں سکول ماسٹر تھا اور اس پر کئی مقدمات بنے ہوئے تھے اور اس کا اس بھری دنیا میں کوئی بھی دوست نہ تھا۔

اعظمی نے کہا۔ "مفتی! پودوں میں یہ اتصال بڑی پاکیزگی سے ہوتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے پھولوں اور پھلوں کی کثرت اور ان کے دانوں کا شمار دوسری ساری مخلوقات سے زیادہ ہے اور ہر طرح سے مفید ہے۔ پاکیزگی اپنے لیے بھی نعمت ہے اور ماحول کے لیے بھی خیر کثیر کا درجہ رکھتی ہے۔ انسان اور حیوان اس نعمت سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شریعتوں میں بعض جانوروں کو حرام قرار دیا گیا ہے اور بعض کو نجس۔"

عماد کو یہ بات درست معلوم ہوئی اور وہ بڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ اچانک کوہستانی ہماری ٹکڑی سے یوں پلٹا جیسے اس کو بارود لگ گئی ہو۔ اس نے سامنے کے دو تین بڑے پتھروں پر اپنے قدم جماتے اور پہاڑ پر پندرہ بیس فٹ اوپر چڑھ گیا۔ ایک چھوٹے سے نشان پر پانی رسنے کی وجہ سے کائی پیدا ہو چکی تھی اور وہاں گھونسے کی شکل نباتاتی چھتریاں سی کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک پھول تھا، جسے کوہستانی نے پہلے اونچی آواز میں السلام علیکم کہا، پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر کچھ دعا مانگی اور وہ پھول توڑ لیا۔ جس تیزی کے ساتھ وہ اونچائی پر چڑھا تھا۔ اسی سرعت سے واپس آگیا اور اپنی محبت اور عقیدت کا یہ تحفہ اعظمی کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ عجیب سا پھول تھا۔ لمبا ڈنٹھل، عام پنسل کے گھیر کا آگے ایک بیضوی سرسبز گانٹھ کس قدر ملائم، اس کے بعد سبزی مائل پیلے رنگ کی پتیوں کی ابتدا جو درمیان میں جا کر منتشر ہوگئی تھی اور آخر میں ان کی نوکیں ایک سیاہ گول کنارے کے ساتھ مل گئی تھیں۔ یہ سیاہ کنارہ کیسٹ کے ٹیپ جتنا چوڑا تھا اور کافی مضبوط نظر آتا تھا۔ اندر سیندھوری رنگ کا ایک چھوٹا سا انگشتانہ تھا، جس میں چھوٹے چھوٹے بے شمار سوراخ تھے۔ اعظمی نے اس پھول کو غور سے دیکھ کر کہا "فینا فلورہیر ٹیم اس ہے"۔ میرا مطلب ہے اس نے کچھ اس قسم کا نباتاتی نام لیا تھا اور ہم اس کے علم نباتات کے آگے خاموش رہنے پر مجبور تھے۔

کوہستانی نے کہا "اس کو بسم اللہ کر کے زور سے سونگھو صیب۔"

جب اعظمی سونگھنے لگا تو کوہستانی نے اس کا ہاتھ روک لیا اور پھر بولا۔

"سونگھتے وقت قل ہو اللہ شریف پڑھنی ہے اور ایک ہی سانس میں"۔

"اس کا کیا فائدہ" اعظمی نے زچ ہو کر پوچھا۔

"بس ہو گا ناں یار کوئی" مفتی نے کہا "جو وہ کہتا ہے کرو۔ اپنا علم ہر جگہ نہ اپلائی کیا کرو"۔

اعظمی نے وہ پھول مطابق ترکیب استعمال سونگھا اور پھول مسعود کو دے کر بولا "کچھ بھی نہیں۔ سالے میں رتی خوشبو ہی نہیں۔"

مسعود نے سونگھا تو اس نے بھی بے خوشبوئی کا اعلان کیا۔ پھر ہم سب نے باری باری سے اس کو سونگھا ور مفتی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس نے پھول ہاتھ میں لیے بغیر بڑی متانت سے کہا "اب میرے سونگھنے کی کیا ضرورت رہ گئی ہے۔ ٹھیک ہے۔ نہیں خوشبو تو نہ سہی"۔

پہلے اعظمی زمین پر بیٹھا۔ اس کے بعد مسعود اور پھر ہم سب۔ کوئی چوکڑی مار کر، کوئی ٹانگیں آگے پھیلا کر۔ کوئی پتھر سے ٹیک لگا کر۔ صرف مفتی اور کوہستانی کھڑے تھے اور ہمارے سامنے نیچے کی وادی ڈھائی تین ہزار فٹ نیچی، چھوٹے چھوٹے درختوں اور ننھے ننھے پہاڑی ٹیلوں والی، آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھی جیسے کمہار کا گھومتا ہوا چاک آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگے۔ وہ اوپر کو چڑھ رہی تھی اور جہاں ہم بیٹھے تھے وہ زمین نیچے کو جا رہی تھی جیسے اوپر کی منزل سے لفٹ نیچے کو جایا کرتی ہے، لیکن ان دونوں مخالف حرکات کے باوجود سارا منظر جوں کا توں ہمارے سامنے موجود تھا۔

اعظمی نے کہا "بارش آرہی ہے"۔

"ہاں آرہی ہے"۔ لیڈر نے جواب دیا۔

"کہاں؟" مسعود نے پوچھا۔

"وہ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ وہ نیچے"۔ اعظمی نے جواب دیا۔

عماد ہنسا اور سر جھٹک کر بولا "بیوقوف! بارش کبھی نیچے سے اوپر کو بھی ہوئی ہے"۔

لیڈر نے کہا "دیکھ لو تمہارے سامنے ہے کس قدر زبردست پھوار اٹھ رہی ہے اوپر کو"

اعظمی نے کہا "اولے بھی اچھل رہے ہیں کہیں کہیں"۔

عماد نے غور سے دیکھا تو کھسیانا ہو کر بولا "واقعی یار یہ عجیب منظر ہے۔ ہم اس کو جلد پکڑ لیں گے راستے میں"

"لیکن ہم تو اوپر جا رہے ہیں"۔ مسعود نے کہا۔

"اوپر نا" اعظمی حیرت سے بولا "اوپر تو ہمیں جانا تھا۔ تمہیں بھی تو جانا تھا عماد"۔

"میں کب کہتا ہوں کہ نہیں جانا تھا"۔ عماد نے کہا "لیکن اب ہم تھک کر خود ہی نیچے جا رہے ہیں۔ آپ سے آپ"۔

لیڈر اپنی دونوں ٹانگیں راستے میں پسار کر بیٹھا تھا اور اپنے بوٹ کی ٹو پر سوٹیاں مار رہا تھا۔

مجھے اتنا یاد ہے کہ ہم سب راستے میں بیٹھے تھے اور مفتی اور اس کا کوہستانی ہمارے سامنے کھڑے ہم کو

دیکھ رہے تھے۔ مفتی کچھ حیران اور کچھ متردد تھا اور کچھ خوش بھی تھا اور کوہستانی ہنس ہنس کر اسے کچھ بتا رہا تھا۔

مجھے صرف اس قدر یاد ہے کہ میں وہاں راستے میں بیٹھا تھا اور میرے ساتھ میری پارٹی کے دوسرے دوست بھی بیٹھے تھے، لیکن اس کے آگے پیچھے اور کچھ نہیں تھا۔ صرف بارہ مئی سن اکتالیس کی جالندھر چھاؤنی تھی اور اس کے اندر اٹھارہ بیس کنال کی ایک کوٹھی تھی اور اس کوٹھی کے سامنے والے لان پر ایک ڈنر تھا جو کرنل دیال نے اپنے ساتھی افسروں کو دیا تھا۔ ان افسروں میں میرا ڈاکٹر بہنوئی بھی تھا جو کرنل صاحب کے پرزور اصرار پر مجھے بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس سے پہلے کی کوئی زندگی نہ تھی۔ اس کے بعد کی کوئی زندگی نہ تھی۔ آس پاس کچھ نہیں تھا۔ بس جالندھر چھاؤنی تھی اور وہ شام تھی اور میرے سامنے دو آدمی کھڑے تھے ایک مفتی اور دوسرا کوہستانی جس کو ہم نے مفتی جی کے اٹھانے پر مامور کیا تھا۔

مجھے اپنی ساری زندگی یہ واقعہ کبھی یاد ہی نہ آیا تھا۔ جالندھر چھاؤنی تو ایک طرف، میرے ذہن سے سارا ہندوستان نکل چکا تھا اور اب وہاں ماضی کی کوئی چیز بھی محفوظ نہ تھی۔ نہ شعور میں، نہ لاشعور میں، نہ تحت الشعور میں، نہ بے شعور میں، نہ وقوف، نہ بے وقوف میں۔

اور اس وقت میرے سامنے کرنل دیال کے لان کے سارے تنکے اپنی اصلی حالت میں موجود تھے۔ سارے مہمانوں کے چہرے میرے سامنے تھے۔ مجھے آنندی کی پی کیپ کرسی کی بیک سے گر گئی تھی تو میجر نے اسے اٹھا کر جھاڑا تھا۔ تین مرتبہ زور سے پھونک ماری تھی اور پھر اس کو وہیں ٹانک دیا تھا جہاں سے گری تھی۔ ایک بیرے کے پاس شیشے کا جگ تھا۔ دوسرے کے پاس ٹام چینی کا۔ ٹام چینی کے جگ سے ایک چھوٹی سی چپڑ اتری ہوئی تھی اور اس نشان کی شکل چیچرے خرگوش کے منہ سے ملتی تھی۔ ایک افسر کی بیوی بہت کالی اور بہت موٹی تھی اور اس نے بینگنی رنگ کی ساڑھی باندھی ہوئی تھی اور اس کے بلاؤز پر جا بجا پسینے کی باؤلیاں تھیں۔

کوٹھی کے برآمدے میں کھپریل کی چھت کے نیچے ایک چھپکلی دیوار پر کیڑے مکوڑے بھنبھنے پکڑ رہی تھی اور اس کی دم کٹی ہوئی تھی۔ کرنل محی الدین بید والی لمبی آرام کرسی میں لیٹے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنی ایک ٹانگ کرسی کے بیٹے آرم پر رکھی ہوئی تھی۔ ان کے فل بوٹ کا چمڑا بہت سخت نظر آتا تھا اور ان کی اونچی ایڑیاں نئی اور ولایتی تھیں۔ کرنل محی الدین کی پتلون کی گدری بہت تنگ تھی اور وہ یوں لیٹے ہوئے تھے جیسے ان کی پتلون کی جیب کے آخری کونے میں صابن کی ایک ٹکیہ ہو۔

اتنے سالوں کے بعد آج اس وقت، سیف الملوک کے راستے میں زمین پر بیٹھے ہوئے مجھے کرنل دیال کی لڑکی اس ڈنر پارٹی میں ہر چیز سے حسین دکھائی دی۔ اس کی ماتا مر چکی تھی اور آج کے ڈنر کا سارا انتظام پرمیلا نے کیا تھا۔ پرمیلا نے نیلی زمین پر سفید ٹمکنوں والی قمیص پہن رکھی تھی اور اس کی آستین میں کھبی ہوئی تھیں۔ بائیں آستین کے باہر ڈیڑھ داغ چیچک کے ٹیکوں کا نظر آتا تھا۔ باقی کا ڈیڑھ آستین کے اندر تھا۔ پرمیلا

کا رنگ اپنے والد کی طرح صاف تھا کیونکہ وہ ایک کشمیری پنڈتانی کے بیٹے تھے۔ پرمیلا کے دونوں ابرو طوطوں کی طرح تھے۔ کیونکہ وہ کوہاٹ میں پیدا ہوئی تھی اور ان کا گھر مسجد کے بہت قریب تھا۔ اس کی کلائی پہ سونے کی ایک چھوٹی سی گھڑی تھی، کیونکہ وہ ایم بی بی ایس کے آخری سال میں پڑھتی تھی۔ اس کی آواز کے سارے سر گول تھے۔ کیونکہ وہ چھوٹی ہوتی زرداد خان کی بچیوں کے ساتھ مل کر نعتیں پڑھا کرتی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھی تھی اور میرے اس کی آنکھ کا ہر اشارہ سمجھ رہے تھے۔ اس کے پاؤں میں چمڑے کے بہت ہی پتلے تلے والی چپلیاں تھیں اور اس کے دونوں ٹخنوں پر دو چھوٹے چھوٹے پورے چاند طلوع ہو رہے تھے۔

اس وقت پورے پینتیس برس بعد مجھے اس کا نام بھی یاد آ گیا تھا۔ اس کا انداز نشست بھی سامنے تھا۔ اس کے فقرے بھی سنائی دے رہے تھے (کانوں میں گونج نہیں رہے تھے، سنائی دیتے تھے) اس کی کرسی کی پشت پر پیتل کی ایک چھوٹی سی ابھری ہوئی کیل بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس پیتل کلا تھ کا کلف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ جہاں میں نے پانی پی کر اپنا گلاس رکھا تھا۔

داری ابھی تک اس رفتار سے اوپر کو اٹھ رہی تھی لیکن ہم تک نہ پہنچ پائی تھی۔ ہم اس تیزی کے ساتھ لفٹ کے ذریعے نیچے کو اتر رہے تھے لیکن اتر نہ پائے تھے۔ دونوں شخص ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ ان میں ایک منشی تھا اور دوسرا کوہستانی جو ہم نے منشی کو اٹھانے کے لیے ہائر کیا تھا۔ لیڈر کی لیسری ہوئی ٹانگیں پہلے سے لمبی ہو گئی تھیں لیکن اس کی سوٹی اتنی ہی تھی اور اب وہ اپنے گھٹنوں پر سوٹیاں مار رہا تھا۔

میں باہر لان سے اٹھ کر کوٹھی کے برآمدے میں گیا، جس کے ایک کونے میں غسل خانہ تھا۔ تینوں کموڈوں کے ڈھکنے بند تھے اور پس پاٹ لبالب بھرا ہوا تھا۔ میں اسی طرح واپس آ گیا اور برآمدے کے دوسرے کونے سے کوٹھی کے پیچھے نکل گیا۔

پیچھے سرونٹ کوارٹرز کی ایک لمبی قطار تھی، جن کی چھتیں گر چکی تھیں اور دروازے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں مرمت شدہ کچن تھا۔ جس کے اندر بتی جل رہی تھی۔ اس کے پہلو سرونٹ کوارٹرز کے کھنڈرات کے پیچھے ایک ویران سا میدان تھا۔ جس میں رہٹ کی ایک بڑی آہنی چرخی پڑی تھی۔ اس کے قریب زنگ آلودہ ٹنڈوں کی مال کا ڈھیر تھا۔ جس کے اندر سے ہو کر لمبی لمبی گھاس اوپر نکل آئی تھی۔ قریب ہی ایک ٹوٹی گڈ پڑی تھی۔ جس کا ایک ہی پہیہ باقی رہ گیا تھا۔ کچھ پکی اینٹوں کے چٹے تھے۔ جن کے اردگرد سرکنڈے کے جھاڑ تھے۔ باوجود اس کے کہ چاند اپنی پوری تابانی سے چمک رہا تھا لیکن اس سے بہتر خلوت ساری چھاؤنی میں اور کہیں نہیں تھی۔ میں ابھی مناسب جگہ کا انتخاب کر ہی رہا تھا کہ مجھے پیچھے سے نبل نبل قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پرمیلا اپنے چھوٹے سے رومال سے ماتھا پونچھتی میری طرف چلی آ رہی تھی۔

"یہاں گھاس بہت ہے" اس نے رک کر کہا "اور جگہ بھی ڈھنڈ ہے"۔

"جی" میں نے ادب سے جواب دیا۔ کیونکہ میں عمر میں چھوٹا تھا اور تھرڈ ایر کا طالب علم تھا۔

"ہم میں سے ادھر کوئی کبھی نہیں آتا۔"

"جی"، میں نے اس سعادت مندی سے پھر کہا اور پرمیلا کی ذاتی خوشبو کا ایک ہلکا سا جھونکا میرے چہرے سے لپٹ گیا، جیسے شیشم اور شرینہہ کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو ہو۔

وہ ایک قدم اٹھا کر میرے اور قریب آگئی اور اپنی کنپٹیوں کا پسینہ رومال میں جذب کرنے لگی۔ اس کی اٹھی ہوئی کہنی کے نیچے سے ایک اور جھونکا آیا، جیسے شیشم اور شرینہہ کے جھنڈ میں سے کار گزر رہی ہو۔

میں نے پوری آنکھیں کھول کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کوہاٹ کے صحرائی حسن پر نور ہی نور تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ ناف پر باندھ لیے، اور میرا دل چاہا کہ میں بھی ایم بی بی ایس میں داخل ہو جاؤں یا مندر میں پوجا کرنے لگوں یا پھر میری بھی ماں مر جائے یا میں اپنی باقی زندگی کوہاٹ میں گزار دوں یا میں ابھی نماز پڑھنے لگوں یا ابھی لیٹ جاؤں۔ میں نے دیکھا سامنے ایک ٹوٹے ہوئے سرونٹ کوارٹر کے فرش پر پرالی بچھی تھی۔

اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور اس کے چہرے پر گہرے سیندوری رنگ کے شعلے بڑھنے لگے پرمیلا میں کچھ عجب طرح کی شفقت پیدا ہو گئی تھی۔ کامنا سے بھری ہوئی ہمدردی۔ شہوت سے لبریز پاکیزہ محبت میں ڈوبی ہوئی وہ ایک پاک دامن اور مخبوط الحواس طوائف نظر آ رہی تھی۔ جو ساری عمر ہر شخص کو دل و جان سے اپنا بھائی سمجھتی رہی ہو۔ پرمیلا کی آنکھوں میں حیا تھی۔ ہونٹوں پر جھجک تھی اور چہرہ لاج میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ محبت ہمدردی، پیاک اور انس کے کنارے پر کھڑی تھی اور اس کا ایک قدم اٹھا ہوا تھا۔

پرمیلا اپنے "ہونے" کی آگ میں سدھائے ہوئے سمندر کی طرح بیٹھی تھی اور پرسکون تھی اور اس کے ارد گرد لوتر تا تھی جیں گلاس میں پڑا ہوا برف کا ٹکڑا تھا۔ جس کے پگھلتے کناروں کو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کنارہ ہوں یا پانی! —— میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کہا "مجھ پر دیا کرو"۔ وہ ذرا مسکرائی اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں "اچھا" کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

اعظمی ایک زور کی تن مار کر رٹیں سے اٹھا اور سیاستدانوں کی طرح ہاتھ لہرا کر بولا "اٹھو یارو۔ شرم کرو۔ کیا راستے میں عورتوں کی طرح بیٹھ گئے ہو"۔ مسعود نے سر اٹھا کر اس کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر ہم پر نظر کی اس کے بعد اپنا جائزہ لیا اور ہنسا۔ پھر کہنے لگا "چلو یار جلدی کرو۔ جھیل پر بھی پہنچنا ہے اور پھر واپس بھی آنا ہے۔"

"کیوں صاحب" کوہستانی نے ہنس کر شفقت سے کہا "میں بولا نہیں تھا۔ آپ کو پورے پندرہ منٹ! چاہے گھڑی رکھ کر دیکھ لو۔ پورا ٹائم مقرر ہے اس پھول کا۔ نہ ایک منٹ زیادہ نہ ایک منٹ کم۔"

"اور اگر کوئی کمزور صحت والا ہو۔ بڑی عمر کا۔ میرے جیسے۔ پھر"

"چاہے سو سال کا پرانا آدمی ہو صاحب۔ چاہے پچیس سال کا جوان ہو۔ بڈھا ہو، کمزور ہو چاہے تگڑا ہو، سب کو پندرہ منٹ کے بعد ہوش آ جاتا ہے۔ بالکل پہلے کا مالک ہو جاتا ہے۔ ایک دم"

اب ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور آہستہ آہستہ پھر چلنے لگے تھے۔

افسانے

بجوتا

احمد ندیم قاسمی

کرموں ایک قوال پارٹی میں برسوں تک تالی بجا بجا کر تال دیتا رہا پھر آواز لگانا بھی سیکھ گیا۔ پیچھے سے آگے آگیا اور بڑے قوال کے گھٹنے سے گھٹنا ملا کر بیٹھنے لگا۔ تب بڑے قوال کو تشویش لاحق ہو گئی کہ کہیں وہ اس سے بھی آگے نہ نکل جائے چنانچہ اس نے کرموں کو چلتا کر دیا۔ کرموں کی آواز تو واجبی سی تھی مگر اس نے قوالی کے گر سیکھ لئے تھے اور ہارمونیم کی آواز میں اپنی آواز چھپا لینے کی مہارت حاصل کر چکا تھا اس نے اپنی قوالی پارٹی بنالی اور عرسوں، میلوں اور شادی بیاہ کے جھگڑوں میں گاتا رہا اور اپنے تینوں بچوں کو پڑھاتا رہا۔ دراصل بڑے قوال کے ساتھ اسے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں جانے کا موقع ملا تھا اور اس نے محسوس کیا تھا۔ کہ اگر اس نے اپنے بچوں کو تعلیم نہ دی تو وہ اس کی طرح اور اس کے باپ دادا کی طرح ڈھول شہنائی بجاتے یا قوالوں کے پیچھے بیٹھے تالیاں پیٹتے بھریں گے اور اسکی طرح اور اس کے باپ دادا کی طرح ان کی باچھیں بھی ہمیشہ ڈھیلی رہیں گی۔

جب اس نے تینوں بچوں کو گاؤں کے سکول میں داخل کرایا تھا تو سارا گاؤں جیسے سناٹے میں آگیا تھا لوگ کہتے تھے، حضرت آدمؑ کے آسمان سے زمین پر اترنے سے لے کر اب تک کے زمانے کا یہ پہلا میراثی ہے۔ جسے اپنے بچوں کو تعلیم دینے کی سوجھی ہے۔ چودھری نے اسے دارے پر بلایا اور ڈانٹا۔ "شرم کرو کرموں۔ میراثی ہو کر اپنے بچوں کو پڑھاتے ہو؟ کیا شادیوں میں لوگ ان سے ڈھول شہنائی کی بجائے کتابیں سنیں گے؟ کیوں بگاڑتے ہو انہیں؟ کیوں ناس مارتے ہو اپنے نسلی پیشے کا؟"

کرموں یہ سب سنتا رہا اور چپکا رہا۔ البتہ مسکراتا رہا۔ چودھری کی اس ڈانٹ پر کہ اب کچھ بکو بھی، اس نے کچھ کہا تو بس اتنا کہ ——— "اقبال قائم۔ عمر بھر دال ساگ کھانے والے کا بھی ایک آدھ بار مرغ بٹیر کا سالن چکھنے کو جی چاہتا ہی ہے!"

کرموں نے قوالی کے نام پر چیخیں مار مار کر پیسہ پیسہ جمع کیا اور بچوں کو یوں پڑھایا کہ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں آتے تھے تو میراثی کی اولاد لگتے ہی نہیں تھے۔ پھر وہ نہ جانے کیا پٹی پڑھ کر آتے تھے کہ میراثی کے بیٹے

ہونے سے شرماتے بھی نہیں تھے۔ کہتے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ ہم کرموں میراثی کے بیٹے ہیں مگر چودھری کی طرح ہماری پیڑھی بھی تو حضرت آدمؑ سے ہی ملتی ہے۔"

پھر یہ لڑکے ادھر لاہور، کالا شاہ کاکو اور فیصل آباد کی طرف ملوں میں ملازم ہو گئے اور باپ کو ہر مہینے اتنا بہت سا روپیہ بھیجنے لگے۔ کہ کرموں اپنی قوالی پارٹی توڑ کر اپنے گاؤں میں رہنے لگا اور صاف ستھرے کپڑے پہننے لگا۔ اور خیرات دینے لگا اور پھر ایک سال اس نے زکوٰۃ تک نکالی۔ چودھری نے یہ سنا تو اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا——"حرام کی اولاد"—— اس نے کہا۔

"اخلاکمینہ کہیں کا۔ دیکھ لینا لوگو سال دو سال میں خود زکوٰۃ مانگنے نکل کھڑا ہو گا اگر اس وقت تک قیامت نہ آگئی تو۔ ایک میراثی جب زکوٰۃ دینے لگے تو سمجھو، سورج سوا نیزے پر اترنے کو ہے"۔ اور چودھری پھر یوں ہنسنے لگا جیسے رونے لگا ہے۔

کسی نے کرموں کو چودھری کی یہ بات بتائی تو وہ بولا۔ "چودھری کیوں خفا ہو رہا ہے۔ میں نے اسے تو زکوٰۃ نہیں بھجوائی۔ اسے بھی دیتا مگر ابھی زکوٰۃ لینے کا حق نہیں بنتا اس کا۔ آہستہ آہستہ حق دار ہو جائے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے۔"

جن لوگوں نے کرموں کو چودھری کی بات بتائی تھی انہوں نے چودھری کو کرموں کی بات بتانا بھی ضروری سمجھا۔ اس وقت چودھری شربت پی رہا تھا۔ یہ بات سنی تو اسے اچھو ہو گیا اور شربت اس کی ناک سے بہنے لگا۔

پھر ایک روز کرموں گلی میں بیٹھا لوگوں سے گپ ہانک رہا تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا۔

"میں میراثی ہوں پر تین بابو لوگوں کا باپ بھی ہوں۔ اس لئے جی چاہتا ہے، یہاں گلی میں بیٹھنے کی بجائے ایک پکی بیٹھک بنواؤں۔ اس میں پلنگ اور مونڈھے بچھا دوں اور تم سب کے ساتھ بیٹھ کر دنیا جہان کی اچھی اچھی، پیاری پیاری، میٹھی میٹھی باتیں کروں۔ بیٹھنے کے لئے چودھری کا دارا تو ہے مگر میں وہاں بیٹھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے۔ جیسے سر کے بل کھڑا ہوں۔"

یہ بات کرکے وہ اپنے گھر گیا۔ حقہ تازہ کیا۔ چلم پہ آگ سجائی اور کش لگانے کے لئے چارپائی پر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ چودھری کی طرف سے اسے بلاوا آگیا۔ اس نے دارے پہ قدم رکھا ہی تھا کہ تین چار مسٹنڈوں نے اسے دبوچ لیا۔ اور چودھری کا پلا ہوا منشی اس کی پیٹھ پر جوتے برسانے لگا۔

ساتھ ساتھ چودھری اسے گالیاں دیتا رہا اور کہتا رہا۔ "بیٹھک بنوائے گا کمینہ؟ دارا لگائے گا میری

طرح ؟ چار پیسے کیا آگئے کہ اپنی اوقات ہی بھول گیا رذیل۔ لگاؤ۔ اور لگاؤ۔"

کرموں کو اتنے جوتے لگے کہ اگر کسی اور کو لگتے تو وہ گنتی بھول جاتا، مگر کرموں گنتا رہا۔

"میں تو گنتا رہا۔" اس نے اپنے ملنے والوں کو بتایا۔ "میں تو گنتا رہا تاکہ قیامت کے دن خدا کے سامنے جو توں کا حساب چکانے میں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ باسٹھ لگے تھے۔ باسٹھ پورے کروں گا۔ خدا کے حضور انشاءاللہ ایک کے ستر نہ سہی۔ چودھری کے لئے تو میرا ایک ہی جوتا بہت ہے سارے جہان کی مخلوق کے سامنے۔"

انہی دنوں ووٹ درج ہو رہے تھے۔ ووٹ درج کرنے والے اس گاؤں میں بھی آئے اور کرموں کا ووٹ بھی درج کرنے لگے۔ تب ان میں سے ایک بولا "بھئی تم اپنا نام کرما بتاتے ہو۔ مگر کرما کیا نام ہوا! کرم الٰہی ہوگا یا کرم علی یا کرم دین۔ کرما کوئی نام نہیں ہوتا۔ یہ تمہارے اصلی نام کا بگاڑ معلوم ہوتا ہے۔

کرموں بولا۔ "میں میراثی ہوں جی، اور میراثیوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میرے نام کا بگاڑ تو کرموں ہے جیسے میرے باپ کو لوگ گاموں کہتے تھے پر اس کا اصلی نام گاما تھا۔"

زچ ہو کر انہوں نے فہرست میں "کرما ولد گاما ذات میراثی پیشہ گداگری" کے الفاظ لکھے تو کرموں بگڑ گیا۔

"نہیں صاحب جی۔ میں گداگر نہیں ہوں۔ گدا کا ایک پیسہ بھی مجھ پر حرام ہے۔ میں تو عمر بھر اپنی محنت کی کمائی کھاتا رہا۔ میرے بچے پڑھ لکھ گئے تو یہ بھی تو میری محنت کی کمائی ہے۔ اب وہ محنت کرتے ہیں اور میری محنت کا بدلہ چکاتے ہیں۔ میں تو اب زکوٰۃ بھی نکالتا ہوں۔ پھر میں گداگر کیسے ہو گیا۔ گداگری اتنی سستی ہے تو چودھری کو گداگر لکھو کہ کسان محنت کرتا ہے اور چودھری کھاتا ہے۔"

چودھری کو خبر ملی کہ کرموں نے ووٹ درج کرنے والوں کے سامنے اسے گداگر کہا ہے۔ اسے فوراً ڈیرے پر بلایا گیا اور سب گاؤں والوں کے سامنے چودھری نے اپنے منشی سے اسے جوتے لگوائے۔ جوتے لگ رہے تھے۔ جب کرموں اچانک اٹھ بیٹھا اور منشی کی کلائی پکڑ کر بولا۔ "بس باسٹھ پورے ہو گئے۔ میرا کوٹہ مجھے مل گیا۔ زیادہ لگاؤ گے تو قیامت کے دن چودھری جی کو زیادہ تکلیف ہو گی۔"

"مجھے تکلیف ہوگی!" چودھری یوں حیران رہ گیا جیسے اس کے سر پر سورج گر پڑا ہے۔ "مجھے کیسے تکلیف ہوگی کمینے؟"

کرموں کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ بولا "چلئے آپ کو تکلیف نہیں ہوگی تو آپ کا حساب پورا کرنے والے فرشتے کو تکلیف ہوگی۔"

"میرا حساب؟" چودھری نے اس طرح پہلو بدلا جیسے پلنگ ہی پر کھڑا ہو جائے گا۔ "کیا بکتے ہو۔؟ میرا حساب کیسا؟"

"جی یہی، غریبوں کو جوتے لگوانے کا حساب۔ ایک کے ستر۔" کرموں مزید جوتوں کا انتظار کئے بغیر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور زمین پر سے اپنی پگڑی اٹھا کر اسے جھاڑ رہا تھا۔ "اب آپ خود حساب لگا لیجئے اقبال قائم، کہ باسٹھ یہ جوتے اور باسٹھ وہ پچھلے۔ کل ہوئے خدا آپ کا بھلا کرے۔ ایک سو چوبیس۔ قیامت کے دن اگر ایک کے ستر لگیں گے تو ایک سو چوبیس کے کتنے لگیں گے۔ منشی جی، حساب لگا کر بتا دو چودھری جی کو۔"

چودھری نے غصے میں اپنے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر جب دیکھا کہ دارے پر موجود بیشتر لوگ کرموں کی باتوں پر دانت نکالے کھڑے ہیں تو ہاتھ واپس لانے کی بجائے اس نے زمین پر سے ایک تنکا اٹھایا اور اسے اپنی پوروں میں یوں مسلا کہ وہ سفوف سا بن کر رہ گیا۔ گالیاں اس کے ہونٹوں پر کپکپاتی رہ گئیں۔

اس وقت پرندے واپس آشیانے کو جا رہے تھے۔ شام قریب تھی۔

چودھری اس واقعے کے بعد کرموں سے بہت سنبھل کر بات کرنے لگا۔ کرموں میراثی تو تھا مگر کھاتا پیتا میراثی تھا اور کھاتے پیتے لوگ کھاتے پیتے لوگوں سے بات ہمیشہ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ جیسے امریکہ روس سے اور روس امریکہ سے بات کرتا ہے۔ تاہم جب چودھری کے دارے پر سے فالتو لوگ اٹھ جاتے اور صرف اس کے قریبی لوگ باقی رہ جاتے تو وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا "اب یہ کمینہ کڑوی گولی کو تھوک دیتا ہے۔ اب میں اسے شکر چڑھی گولیاں کھلاؤں گا۔" پھر وہ حالات کے طویل تجزیے میں مصروف ہو جاتا۔ "لوگ کہتے ہیں شراب کا نشہ برا ہوتا ہے میں کہتا ہوں نودولتیوں کے لئے روپے کا نشہ اس سے بھی برا ہے۔ کرموں کو دیکھو۔ کہاں تو جب بھی مجھے یہ میراثی زادہ ملتا تھا، اقبال قائم اقبال قائم کی رٹ لگاتا ہوا رکوع میں چلا جاتا تھا اور کہاں یہ دن کہ کل کہنے لگا۔ میں ادھر لاہور فیصل آباد کی طرف جا رہا ہوں۔ کوئی چیز چاہئے تو لیتا آؤں کوئی چھڑی وڑی، کوئی جوتا ووتا! یہ سب روپیہ کا نشہ ہے۔" پھر چودھری نے گردن کو کھینچے کی حد تک کھینچ کر ادھر ادھر دیکھا اور بولا "کہیں وہ کسی کونے کھدرے میں بیٹھا تو نہیں ہے حرام کی اولاد۔ یاد ہے ایک بار میں یہیں دارے پر اس کی باتیں کر رہا تھا اور اندھیرے میں مجھے پتہ نہ چلا تھا کہ وہ کمینہ بھی ایک طرف بیٹھا ہے؟ میں نے اس نسلی کنگلے کے نئے ٹھاٹھ کی بات کرتے ہوئے کہہ دیا کہ کوا اگر مور کے پر سجا لے، تو بھی کوا ہی رہتا ہے۔ اس پر وہ میری چلمیں بھرنے والا میرے اصطبل صاف کرنے والا۔ بھرے دارے میں بولا "ویسے چودھری جی سیانوں سے سنا ہے کہ مور بھی کوے ہی کی نسل میں سے ہے۔ صرف رنگ دار پر نکال لئے ہیں اور ناچنا سیکھ گیا ہے۔ ا ـــــ مادہے دا ؟ روپے نے اتنے حوصلے بڑھا دیئے ہیں اس افلاطون کے پٹھے کے ورنہ یہاں میرے سامنے بلی کی طرح ممیاتا پھرتا تھا۔ روپے نے اس کی زبان کھینچ کر میرے جوتے بھر کی کر دی ہے۔ مگر مجھے بھی ایسے نودولتیوں کو تیرے میں رکھنے کے گر معلوم ہیں۔ جو سے بہ جاہے سہرا کام ہوا ہو۔ رہے گا تو وہ جوتا ہی اور پاؤں ہی میں پہنا جائے گا۔ اس میراثی کے بچے کو میرے گاؤں میں رہنا ہے تو میراثی بن کر رہنا ہوگا۔ دیکھ لینا۔"

سردیوں کے دن تھے۔ کرموں چند روز اپنے بیٹوں کے ہاں گزار کر واپس گاؤں آیا تو اس نے سنہرے رنگ کا ایک کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ لوگ اس کمبل کو چھوتے تو حیران رہ جاتے کہ کیا کسی بھیڑ کی اون اتنی نرم بھی ہو سکتی ہے!

کرموں کے ایک رشتہ دار نے اس کمبل کو چھوا تو بسم اللہ پڑھ کر کمبل کا ایک کونا منہ میں ڈال لیا اور بولا "سوجی کا حلوہ ہوتا ایسا ہو کہ جب جی چاہا اوڑھ لیا، جب جی چاہا کھا لیا۔"

خود کرموں ملنے والوں کو بتاتا رہا کہ پورے ایک سو کا ہے "اور پھر صرف خوبصورت ہی نہیں ہے اندر سے بھی بڑا گنی ہے۔ باہر برف گر رہی ہو تو کمبل میں انگیٹھی سی دہکتی رہتی ہے ــــ پوہ کی ٹھنڈ میں بھی پسینہ آنے لگتا ہے پنجتن پاک کی قسم!"

پوری بستی میں اس کمبل کے چرچے ہونے لگے۔ بات چودھری تک بھی پہنچی مگر یوں کہ کرموں کہہ رہا تھا ــــ "ایسا کمبل تو چودھری کو بھی نصیب نہیں ہوا ہو گا" ــــ اس پر چودھری یوں مسکرایا جیسے کسی نے خربوزے کا ایک سرا چھری سے چیر دیا ہے۔ کرموں کے رویے نے چودھری کو بیاست دان بنا دیا تھا۔

ایک دن کرموں یہ کمبل اوڑھے، چودھری کے دارے کی گلی میں سے گزرا تو چودھری اپنے آدمیوں کے ساتھ باہر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ کرموں کو بلایا اور اس کے کمبل پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"کہاں سے مارا؟"

کرموں پاس ہی ایک سل پر بیٹھ گیا۔ "میں نے تو ــــ اقبال قائم ــــ ساری عمر میں ایک بدّا تک نہیں مارا، کمبل کہاں سے ماروں گا۔ اور پھر کمبل بھی ایسا کہ آپ نے بھی چھوا تو میں نے آپ کے رونگٹے کھڑے ہوتے دیکھے۔"

چودھری کا چہرا کچھ یوں تن گیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔ خربوزے میں ایک اور چیر پڑا۔ اور چودھری بولا "چلو مارا نہیں تو لیا کہاں سے؟"

کرموں نے جواب میں لمحہ بھر دیر کی۔ اس کی آنکھیں جھکیں۔ اپنے بیٹوں کے ذکر پر ہمیشہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی پتلیوں میں رکھے ہوئے چراغوں کی لویں جل اٹھی ہیں۔ "کالا شاہ کاکو میں میرا بیٹا ہے نا سرفراز ــــ"

"ہاں ــــ وہ سرفا!" چودھری نے کرموں کی تصحیح کی۔

"جی ہاں۔ وہی سرفراز" کرموں نے اپنی غلطی کی تصحیح کو کوئی اہمیت نہ دی۔ "وہ کہنے لگا کہ بابا۔ اب کے یہاں سے ایک اچھا سا جوتا لے جاؤ۔ میں نے کہا بیٹے۔ جوتے اُدھر گاؤں میں بہت ہیں۔ کچھ اور لا دو۔ کوئی تحفہ چیز۔ وہ یہ کمبل لے آیا۔ ملیشیا میں اس کے کسی دوست کا ابا رہتا ہے۔ وہ یہ اپنے بیٹے کے لئے لایا۔ سرفراز نے اس سے اپنے ابا کے لئے خرید لیا۔"

چودھری بولا "دیکھو کرموں۔ اگر میں کہوں کہ مجھے یہ کمبل چاہیئے ــــ تو ــــ؟"

"تو لے لیجئے نا اقبال قائم۔" کرموں نے کھرج میں جواب دیا۔ "سرفراز پوچھے گا تو کہہ دوں گا کہ چور لے گئے۔"

چودھری نے کرموں کی بات زور کے ایک قہقہے میں اڑانے کی کوشش کی مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس قہقہے کا پھیپھڑوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔

"اس کا کیا لوگے ؟"

"کچھ بھی نہیں اقبال قائم"۔ کرموں کی آواز میں بڑی آسودگی اور بے نیازی تھی۔

"مگر میں مفت نہیں لوں گا" چودھری بولا۔ "یہ ہماری خاندانی عادت ہے کہ ہم مفت چیزیں دیتے ہیں ' لیتے نہیں ہیں۔ تم تو جانتے ہو۔ تمہیں تو عمر بھر کا تجربہ ہے"۔

"جی ہاں" کرموں نے کہا۔ "پر کبھی کبھی لینے والوں پر دینے کا وقت بھی آجاتا ہے۔ اقبال قائم۔ لے لیجئے نا سرفراز مجھے اور بھیج دے گا"۔

"نہیں کرموں۔" چودھری بولا۔ "تم ہمارے میراثی ہو۔ تمہارے باپ دادا نے ہمارے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ مانگو کیا مانگتے ہو اس کمبل کا۔ سرفے نے تمہیں بتایا تو ہوگا کہ اس کمبل کے کتنے روپے دیئے تھے"۔

"جی ہاں سرفراز نے بتایا تو تھا"۔ کرموں کی آواز میں منصوبہ سازی کی گہرائی تھی۔ پھر وہ جیسے ایک نتیجے پر پہنچ کر مسکرانے لگا اور بولا۔ "کمبل دوسرے ملک کا ہے نا جی۔ میں نے کہا بھی سرفراز سے کہ اتنی فضول خرچیاں مت کیا کرو۔ بولا کوئی بھی چیز ہمارے ابا کے آرام سے مہنگی نہیں ہے۔ آپ ٹھیک کہتے تھے۔ تعلیم نے لڑکوں کے دماغ بگاڑ دیئے ہیں۔ اقبال قائم ——— قیمت کچھ زیادہ ہی ہے۔

"یعنی اتنی زیادہ ہے کہ سرفا میراثی یہ قیمت ادا کرسکتا ہے اور میں نہیں کرسکتا ؟" ———

چودھری اپنے غصے کو چھپانے کی کوشش کے باوجود پوری طرح نہ چھپا سکا۔ "بتاؤ کتنے میں آیا ہے۔ پچاس۔ سو' دو سو۔ تین سو ——— کتنے میں ؟"

"تین سو تو خیر نہیں جی" کرموں نے چودھری کے منشی کی طرف یوں دیکھا جیسے جوتے لگانے سے پہلے منشی نے کرموں کو دیکھا تھا۔ کُل دو سو باسٹھ میں آیا ہے۔ اس نے حاضرین پر داد طلب نظریں ڈالیں۔

اور اتنی رقم تمہارے بیٹے نے ادا کردی ؟"

"کما تا کیا تا ہے تا اقبال قائم"۔

"تو تم مجھ سے دو سو باسٹھ روپے لوگے ؟"

آپ باسٹھ رہنے دیجئے ان کا حساب پھر ہوتا رہے گا۔ دو سو دے دیجئے۔"

دو سو باسٹھ میں باسٹھ اور ملا کر کیوں نہ دوں ؟ چودھری نے فاتحانہ انداز میں کہا۔" آخر تم ہمارے میراثی ہو"

"چلیئے زیادہ دے دیجئے اقبال قائم ——— تین سو پورے دے دیجئے۔

تمہیں تو دکانداروں کی طرح ٹھیک ٹھیک حساب کرنا بھی آگیا!" چودھری نے دل لگی کرنے کی کوشش کی۔ اور کرموں کمبل اتارتے ہوئے بولا میں تو اب بے حساب خرچ کرتا ہوں اقبال قائم۔ بس کچھ آتا ہے تو یہ باسٹھ کا حساب آتا ہے۔

چودھری نے کرموں کے چلائے ہوئے چابک سے بے نیاز ہو کر اپنے منشی سے کہا۔ "لو بھئی دے دو اسے تین سو چوبیس۔"

"روپے منشی جی۔ تین سو چوبیس روپے!" کرموں نے منشی کو تاکید کی۔

"روپے نہیں تو پیسے؟" منشی نے قمیص کے نیچے پہنی ہوئی واسکٹ کی اندرونی جیب میں سے نوٹوں کا ایک گٹھا نکالتے ہوئے پوچھا۔

"میرا مطلب تھا کہیں آپ تین سو چوبیس روپے دینے کی جگہ تین سو چوبیس جوتے لگانے نہ بیٹھ جائیں۔"

چودھری سمیت سب لوگ زور سے ہنسے مگر سب کی ہنسی کا مفہوم الگ الگ پہچانا جاسکتا تھا۔ چودھری تو یوں ہنسا جیسے اس کا سینہ ٹین کا ایک کنستر ہے اور کرموں نے اسے جھنجھوڑ کر اس میں پڑے ہوئے کنکر بجا دیئے ہیں۔

کرموں نے روپے لئے اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔

تب چودھری اپنے سامنے کمبل پھیلا کر مسکرایا۔ اسے خوب اچھی طرح جھاڑا دیا جیسے کمبل کا میراثی اپنا نکال رہا ہے۔ اسے تہ کر کے منشی کے حوالے کیا کہ گھر پہنچا دو۔ "کہنا اسے دن بھر دھوپ دکھائیں۔ اور پھر کسی پیٹی میں پھینک دیں۔" پھر وہ حاضرین سے مخاطب ہوا۔ "درجنوں پڑے ہیں اس طرح کے کمبل۔ مگر میں دو پیسے کے میراثی کو ڈھائی تین سو روپے کا کمبل اوڑھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جوتے کو پاؤں ہی میں رہنا چاہیئے!"

دھند

شفیق الرحمان

محبت کے معاملے میں مقصود گھوڑے کے ریکارڈ کو تسلی بخش تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن یہ NIL REPORT سے قدرے بہتر تھا۔

اس کا رومانی کیریئر کچھ یوں تھا ——————

جب وہ ایف ایس سی کے پہلے سال میں تھا تو غالباً محض تجسس کے سلسلے میں پہلی مرتبہ محبت سے آشنا ہوا۔ یا یہ کہ محبت اس سے آشنا ہوئی۔ جس لڑکی سے وہ ازحد مرعوب ہوا تھا اس کا نام عظمت جہاں تھا۔ دراصل وہ مرعوب زیادہ ہوا تھا اور عاشق کم۔

اپنے جیب خرچ سے روپے بچا کر لڑکی کے لیے رومالوں، جرابوں اور خوشبوؤں کا پیکٹ تیار کیا۔ اسے رنگین کاغذ میں لپیٹ کر چمکیلا ربن باندھا اور کئی دن یہی سوچتا رہا کہ پیکیٹ پر کیا لکھے۔ پھر لائبریری سے خط و کتابت کے فن پر پتہ نہیں کب کی چھپی ہوئی کتاب اٹھا لایا اور اس کا سرسری طور پر مطالعہ کر کے کچھ اس قسم کی عبارت لکھی۔

بے مایہ، ناچیز مقصود عفی عنہ کا تحفۂ حقیر، بصد عقیدت داخته ام بخدمت عظمت من

؎ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

لڑکی کانونٹ میں پڑھتی تھی۔ ایسا رنگ برنگا پیکٹ دیکھ کر پہلے تو اسے فادر کرسمس کا خیال آیا اور بہت خوش ہوئی لیکن کرسمس میں ابھی کئی مہینے رہتے تھے۔ جب عبارت پڑھنے کی کوشش کی تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ یہی اندازہ لگا سکی کہ یہ پیکٹ غلطی سے ادھر آگیا ہے اور غالباً پڑوس کے الحاج شیخ عظمت اللہ کمیشن ایجنٹ و جنرل مرچنٹ کے لیے ہوگا۔ چنانچہ ان کی دکان پر بھیج دیا۔ عظمت اللہ اس وقت مصروف تھے جلدی میں یہ سمجھے کہ کسی گاہک نے خریدی ہوئی چیزیں واپس کی ہیں اور رقم مانگی ہے، لہٰذا اپنے منیم کے حوالے کر دیا۔ منیم نے پیکٹ کے ساتھ وہی سلوک کیا جو منیم کیا کرتے ہیں۔

جب مقصود گھوڑے کو عرصے تک تحفے کی رسید نہ ملی تو وہ اداس و مایوس ہو گیا (خاموش تو وہ پہلے بھی تھا)۔ سیکنڈ ایئر میں پہنچ کر اسے ایک اور لڑکی سے دلچسپی ہوئی۔ اتفاق سے لڑکی کو موتیا اور چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو سے شدید الرجی ہو جاتی تھی۔ لیکن الرجی کا علم نہیں تھا۔ ادھر مقصود گھوڑا سر کے بال گھنے کرنے کے لیے روغن چنبیلی درجہ اوّل اور موتیا ہیئر آئل درجہ خاص (درجہ اوّل

اور درجہ خاص ہمیں پتہ نہیں کیا فرق ہوتا ہے) کی دبا دب مالش کیا کرتا۔ چنانچہ جب کبھی سرراہے ان کی ملاقات ہوتی تو لڑکی کا چھینک چھینک کر برا حال ہو جاتا۔ بار بار معاف کیجئے معاف کیجئے۔ الگ کہنا پڑتا اور بیشتر چھینکیں سیدھی مقصود گھوڑے کے اوپر آتیں۔ بعد میں وہ کئی دنوں تک کھانستی رہتی اور کبھی کبھی حرارت بھی ہو جاتی۔

شروع شروع میں محبت اور الرجی دونوں برابر برابر رہے۔ پھر الرجی نے محبت پر غلبہ پالیا اور آہستہ آہستہ ملاقاتیں ختم ہو گئیں۔ بی ایس سی میں داخل ہوتے ہی وہ ایک نئی لڑکی پر فریفتہ ہوا جو اسے کچھ زیادہ ہی حسین و جمیل معلوم ہوئی (اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ لڑکی کے چچا انگلینڈ میں تھے اور بھتیجی کے لیے میک اپ کا اعلیٰ ترین سامان بھیجا کرتے۔ لڑکی بھی مغربی ممالک کا چکر لگا چکی تھی، اس لیے اس کا رویہ مقصود گھوڑے یا کسی اور لڑکے کے لیے ——— گاؤ آمد و خر رفت ——— کی قسم کا تھا)

لمبی چھٹیاں تھیں اور مقصود گھوڑے کو فرصت ہی فرصت تھی لہذا اس مستعدی اور زندہی سے اس کا تعاقب کیا۔ کہ لڑکی کو مجبوراً ہیلز اپ کرنے پڑے اور اس کے کنبے والوں نے مقصود گھوڑے کو چائے کا دعوت نامہ بھیجا۔ ڈاکیہ وہ لفافہ اس کے کمرے میں پھینک گیا۔ لیکن اتفاق سے ان دنوں وہ کسی پیر صاحب کو تسخیر حُب کے سلسلے میں اکاون روپے، ایک تھان اور مٹھائی کی ٹوکری پیش کر کے ان کا آزمودہ تیر بہدف چلّہ کر رہا تھا۔ جب یہ طویل عمل ختم ہوا تو خطوط پڑھنے کی مہلت ملی۔

دعوت نامہ دیکھتے ہی اسی وقت لڑکی کے مکان کی طرف ایسا سرپٹ بھاگا کہ بڑی سڑک چھوڑ کر شارٹ کٹ کی تلاش میں ایک ایسی گلی میں ہو لیا جس میں مخالف سمت سے ایک جلوس آ رہا تھا۔ یہ احتجاجی جلوس اینٹوں پتھروں اور ریت کی قیمتوں کے کم ہو جانے یا شاید زیادہ ہو جانے پر نکلا تھا۔ حسب معمول اس میں زیادہ لوگ ایسے تھے جنہیں نہ احتجاج کی وجہ کا علم تھا اور نہ جلوس کے متعلق کوئی پتہ تھا کہ یہ سب کون ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ اور اگر وہاں پہنچ گئے تو کیا کریں گے؟ چونکہ سہ پہر کے بعد بیشتر لوگوں کو کوئی خاص کام نہیں ہوتا اور کھیلوں اور ورزش سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لہذا اسی کو تفریح سمجھ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔

مقصود گھوڑے کو زبردستی کے دھکوں اور دھینگا مشتی کی وجہ سے نہ صرف جلوس میں شامل ہونا پڑا بلکہ مجبوراً طرح طرح کے غیر فہم اور اوٹ پٹانگ نعرے بھی لگانے پڑے اور جیب کتروں کے ڈر سے دونوں ہاتھ اپنی جیبوں میں رکھنے پڑے۔ جلوس کسی رسمی سانپ کی طرح دیر تک دہنے بائیں آگے پیچھے ہر سمت میں رواں دواں رہا۔ لیکن جب نہ تو اتنا سا لاٹھی چارج ہوا، نہ کوئی اخبار والا کسی کا بیان لیتے دیکھا گیا۔ یہاں تک کہ فوٹو بھی نہیں اترے تو مایوس ہو کر پہلے اپنی رفتار آہستہ کی، پھر منتشر ہو گیا۔ نہ صرف رات کے دس بج چکے تھے بلکہ مقصود گھوڑے کی قمیض بھی پھٹ چکی تھی۔ اس لیے اسے واپس جانا پڑا (اتفاق سے اس روز تھانیدار صاحب کوئی خاص ہفتہ جو خوش لباسی، خوش فہمی یا شاید خوش خوراکی سے متعلق تھا منانے میں مصروف تھے ادھر اخباروں کے رپورٹر اور فوٹو گرافر ریلوے سٹیشن پر جمع تھے کیونکہ کسی مشہور ایکٹرس کی آمد آمد تھی جس کی ٹرین اس لیے لیٹ تھی کہ ریلوے میں بھی کوئی اسی قسم کا ہفتہ منایا جا رہا تھا) اگلے دن جو وہ ملاقات کے لیے پہنچا تو دیکھا کہ ہجوم کے جوش و خروش سے محبوبہ کے مکان کو کافی نقصان پہنچ چکا ہے۔ دروازوں کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے ہیں اور ہونے والے خسر کا موڈ بالکل آف ہے بلکہ انہیں کچھ شبہ سا بھی ہے کہ مقصود گھوڑا بھی اس پتھراؤ میں شامل تھا تبھی نقصان کا اندازہ لگانے کے لیے آیا ہے (اپنے سادے سے لباس میں مقصود گھوڑا کچھ کچھ پرولتاری سا لگتا تھا۔ ویسے وہ بالکل مرنجان و مرنج تھا اگرچہ اسے نہ مرنجان و مرنج کے معنی آتے

تھے نہ معنے معلوم تھے)

بی ایس سی پاس کر کے وہ پھر عاشق ہوا۔ محبوب نے مشرقی روایات کے مطابق حسب معمول ہدایت کی کہ مجھ سے اظہار محبت کرنے کی بجائے روئے سخن قبلہ والد صاحب کی جانب ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔

لڑکی مقامی ہوسٹل میں رہتی تھی لیکن اس کے والدین پانچ چھ سو میل دُور تھے وہ اس سلسلے میں کوئی پروگرام بنانے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ کہیں کسی ریاست کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔

مقصود گھوڑے کا جنرل نالج شروع سے کمزور رہا ہے۔ نہ اسے بین الاقوامی حالات کا زیادہ علم ہے نہ مقامی سیاست کا مثال کے طور پر جب وہ کسی حکومت کا تختہ الٹنے کے بارے میں سنتا ہے تو اس کے تخیل میں کچھ اس قسم کا نظارہ آتا ہے جیسے کوئی حکمران گرمیوں میں تہمد باندھے ہوئے بالٹی سے پانی ڈال ڈال کر مزے سے نہا رہا ہو کہ دفعتاً کوئی حریف اس کے پاؤں تلے سے لکڑی کا تختہ کھینچ لے اور نہانے والا اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے۔

جیسے کہ دیکھنے میں آیا ہے تختہ کہیں الٹتا ہے اور ہڑتالیں کہیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس خبر سے بلا کسی وجہ کے ایک ہڑتال شروع ہوئی۔ پھر دوسری پھر تیسری۔ یہ سلسلہ ہفتوں جاری رہا۔ یہاں تک کہ جب ہڑتالوں کے ختم ہو جانے کا آفیشل اعلان ہوا، تب بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔

مقصود گھوڑے کو اخباروں کی ہڑتال پر خاص طور پر فرحت حاصل ہوتی (جب کبھی وہ خبر پڑھتا کہ چونکہ آج تعطیل ہے اس لیے کل اخبار نہیں چھپے گا۔ تو اس کا جی چاہتا کہ ایڈیٹر کو فوراً ٹیلیفون پر شاباش دے اور جب کسی احتجاج کے سلسلے میں اخبارات بند ہو جاتے تو اس کی یہ خواہش ہوتی کہ ساری ساری سب کو مبارکباد دے۔ ویسے بھی مقصود گھوڑا دوپہر سے پہلے کسی قسم کے اخبار کو پڑھنا تو ایک طرف اسے ہاتھ تک نہیں لگاتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر کوئی نہایت اہم خبر ہوئی تو کہیں نہ کہیں سے اس تک زبانی بھی پتہ چل جائے گی۔ لہذا علی الصبح جب چمکیلا اور امید افزا دن طلوع ہوتا ہے تو اخبار خرید کر اور اسے پڑھ کر خواہ مخواہ اسا ماتم اور سوگ منانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ کبھی دوپہر یا سہ پہر کے بعد وہ اخبار کھولتا پہلے کرکٹ کا اسکور، ہاکی، فٹبال کے گول، باکسنگ اور ریسلنگ کی ہار جیت پڑھتا۔ اس کے بعد سینما کے اشتہار دیکھتا اور پھر جلدی سے پہلے اور آخری صفحوں کی سرخیاں دیکھ کر اخبار بند کر دیتا اور اگر دوپہر سے پہلے کوئی زبردستی اسے اخبار پڑھنے کو کہتا تو اس کا پہلا سوال یہ ہوتا کہ سب سے بھیانک خبر کونسی ہے؟ اور دوسرا یہ کہ چیدہ چیدہ بری خبریں تم ہی کیوں نہیں سنا دیتے؟)

مقصود گھوڑے کی یہ خوشی عارضی تھی کیونکہ جب ریلوے، ٹیلیفون، ٹیلی گراف، بسوں وغیرہ کی ہڑتالیں شروع ہوئیں تو وہ دو چار دن گھبرایا اور پھر بمشکل سنبھل سکا۔

اس کی محبوبہ بھی روتی رہی۔ لوگ پریشان ہو گئے اور جب گرمی بڑھی تو اپنی کاروں میں پہاڑ پر چلے گئے، مقصود گھوڑے کو بتائے بغیر۔ مہینوں سے ہڑتالیں مکمل طور پر زائل ہونے تک وہ ایم ایس سی میں داخل ہو چکا تھا اور سینئر ہو کر بی ایس سی کے زمانے کی لڑکی کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

لیکن اس مرتبہ کسی رستے ان بے وفا سے چاہ کیے جا رہا ہوں میں۔ اور یونہی خواہ مخواہ کیے جا رہا ہوں میں، کسی قسم کا عشق

مسلط ہوگیا کیونکہ لڑکی نے بعد از اوّل سے کسی قسم کے بھی مدارات سے قطعاً انکار کر دیا تھا۔ اچانک انفلوئنزا پھیل گیا۔ لڑکی بیمار ہوئی پھر اس کے کنبے والے یہاں تک کہ پڑوسی تک صاحب داش (صاحب فراش ہے جو کچھ معنے بھی ہوتے ہیں) ہو گئے۔ مقصود گھوڑا اس مرتبہ نہایت سنجیدہ تھا اور لڑکی کے بزرگوں پہ ڈورے ڈالنے پر تلا ہوا تھا کسی نے ڈرا دیا کہ انفلوئنزا کھانسنے چھینکنے یہاں تک کہ باتیں کرنے سے بھی فوراً لگ جاتا ہے۔

چند مہینے کے بعد جب وہ فائنل امتحان کی تیاری کر رہا تھا تو لڑکی کے دل میں (غالباً انفلوئنزا کے مضر اثرات کی وجہ سے) ترس پیدا ہوا اور وہ خود ملتفت ہوئی۔ مگر تب تک مقصود گھوڑا بدک چکا تھا۔ چنانچہ اس کے رومانی کیریئر میں یہ پہلا موقعہ تھا جب اس کا سکور ONE ALL (۱-۱) رہا۔

ایم ایس سی پاس کر کے اسے نوکری تلاش کرنی پڑی، جو اس نے اپنے مخصوص انداز میں کی۔ یعنی اس طرح جیسے ڈر رہا ہو کہ کہیں سچ مچ ملازمت نہ کرنی پڑ جائے۔ ساتھ ساتھ وہ ایک نئی لڑکی کے متعلق بھی سوچ رہا تھا۔

پھر جیسے کہ بار بار ہوتا ہے کہ پہلے تو خشک سالی کے ڈر سے بارش کا بے صبری سے انتظار کیا جاتا ہے بارش کے لیے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ پھر دھا دھم وہ مینہ برستا ہے کہ چاروں طرف جل تھل ہو جاتا ہے دریاؤں میں ایسا سیلاب آتا ہے جو ختم ہی نہیں ہوتا اور دافع سیلاب دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ چنانچہ ان دنوں ہر ایک کی توجہ طغیانی کی طرف تھی اسی لیے مقصود گھوڑے کے رومانی پروگرام کا کوئی نوٹس نہ لیا گیا اس کے بعد ایک طویل وقفہ آیا جس میں اسے بار بار یہ کہتے سنا گیا کہ جب کبھی ایسی لڑکی سے ملاقات ہوتی ہے جو اچھی بیوی بن سکے۔ تو اتفاق سے وہ پہلے ہی سے بیوی ہوتی ہے۔

جب گھر والوں نے ڈانٹ ڈپٹ کی تو مجبوراً ملازمت کرنی پڑی۔

جہاں پہلی پوسٹنگ ہوئی وہاں ایک غیر ملکی دوشیزہ پہ (جو اس قدر تندرست و توانا تھی کہ مقصود گھوڑے کے ساتھی اسے چہار شیزہ کہا کرتے) فریفتہ ہوا۔ لڑکی کا رویّہ بالکل غیر ملکیوں والا تھا۔ یعنی نہ تو اسے مقصود گھوڑے کا کوئی خاص اشتیاق تھا اور نہ اس سے ملنے میں کوئی خاص اعتراض۔ لیکن مقصود گھوڑا اس پر لٹّو ہو چکا تھا۔ فوراً شادی کی اجازت کے لیے اپنے گھر کچھ ایسا قطعی اور ارجنٹ خط لکھا۔ جیسے سپورٹس گراؤنڈ میں لاؤڈ سپیکر پہ ـــــــــ سو میٹر کی دوڑ کی تھرڈ اینڈ فائنل سا سا CALL ـــــ کا کرخت نعرہ۔

پیشتر اس کے کہ گھر سے جواب موصول ہوتا ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جب وہ غیر ملکی لڑکی کو موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بٹھا کر پندرہ بیس میل دور ایک مشہور غیر ملکی فلم دکھانے لے جا رہا تھا تو روانہ ہونے سے پہلے اس نے لڑکی کے خوشنما لباس، سہانی خوشبو اور نفیس میک اپ کی تعریف کی۔ وقت تھوڑا تھا اس لیے موٹر سائیکل تیز چلانی پڑی۔

راستہ طے کر کے سینما پہنچا تو دیکھتا کیا ہے کہ پچھلی سیٹ خالی تھی۔

پہلے تو اسے حیرت ہوئی کہ لڑکی بغیر اجازت کے کیوں اتر گئی۔ پھر اس حرکت کو بے مروّتی سے منسوب کیا۔ وہ راستہ بالکل ناہموار اور پیچیدہ تھا۔ تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ لیکن پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی کس جگہ یوں چپ چاپ اتر گئی؟ اس کے لیے یہ راز ہی رہا۔

وہ مزید چیکنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دوسرے یا تیسرے دن اس کا فوری تبادلہ ہو گیا۔

اب تک جو کچھ ہوا تھا وہ میدانی علاقوں میں پیش آیا تھا۔

پھر دفعتاً سمندر پار سے تقریباً پانچ ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر مقصود گھوڑے نے نحیفہ کو دیکھا اور نحیفہ نے مقصود گھوڑے کو۔

چونکہ سہروردی مقصود گھوڑے اور راولپنڈی مقصود گھوڑے کی صورت میں انہیں میں کا بھی فرق نہیں ہوتا لہذا یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ وہ نحیفہ کو دیکھ کر خوش ہوا یا نہیں۔ البتہ یہ آمنا سامنا ساجس ماحول میں ہوا وہ کچھ ایسا تھا کہ اگر مقصود گھوڑے کی مونچھیں ہوتیں تو وہ ضرور انہیں تاؤ دیتا۔

نحیفہ کا اصلی نام حنیفہ یا کچھ اسی قسم کا تھا لیکن دھان پان ہونے کی وجہ سے سب نحیفہ کہتے۔ اس کا چہرہ چھوٹا سا تھا۔ لیکن خدو خال کافی بڑے بڑے تھے۔

اس اجاڑ کیمپ کی تنہائی اور کیمپ والوں کی سنورتی کے باوجود اسے چوبیس پچیس سے زیادہ نمبر نہیں مل سکتے تھے، یعنی رو پیٹ کر پاس ہونے والے تینتیس فیصد سے بھی کم۔

سنا تھا کہ وہ کسی کو بھلانے کے سلسلے میں اپنے عزیزوں کے ساتھ پہاڑ پر آئی تھی اور اس بے وفا کو بھلانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ بلکہ اوروں کو بھی بھلانے میں منہمک تھی۔ یہ بھی سنا تھا کہ ایم اے لٹریچر میں اس کا کیا رزلٹ آیا، تھا اور وہ اپنے سے کہیں زیادہ دلی کتابیں ساتھ لائی تھی۔ اس نے یہ بھی مشہور کر رکھا تھا کہ لٹریچر کی خدمت اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ لیکن شیطان کا خیال تھا کہ وہ لٹریچر کی سب سے زیادہ خدمت اس طرح کر سکتی ہے کہ لٹریچر کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔

ویسے جتنے لڑکے وہاں موجود تھے ان میں سے نحیفہ نے صرف مقصود گھوڑے کا نوٹس لیا۔ شاید اس کے چہرے کے اظہار کی وجہ سے۔ کیونکہ کافی دنوں سے وہ ایسی پُرسکون، خاموش اور جامد زندگی گزار رہا تھا۔ جیسے کہ چڑیا گھر میں تنہا اُود بلاؤ یا اکیلا ریچھ۔

(شفیق الرحمٰن کی زیرِ ترتیب طویل مختصر کہانی دھند کا ایک اقتباس

خواب اور تقدیر

انتظار حسین

ناقوں پہ سوار چپ سادھے، سانس روکے ہم دیر تک اس راہ چلتے رہے حتیٰ کہ آگے آگے رہبر کے طور چلتے ہوئے ابوطاہر نے اپنے ناقے کی نکیل کھینچی اور اطمینان بھرے لہجہ میں اعلان کیا کہ "ہم نکل آئے ہیں۔"

"نکل آئے ہیں؟" ہم تینوں نے استعجاب اور بے یقینی سے ابوطاہر کو دیکھا "رفیق، کیا ہم تیرے کہنے پر اعتبار کریں؟"

ابوطاہر نے اعتماد سے جواب دیا "قسم ہے اس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ ہم شہر بیوفا سے نکل آئے ہیں۔"

پھر بھی ہم نے تامل کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اردگرد دیکھا۔ گرد و پیش کا پورا جائزہ لیا۔ کوفے کے جانے پہچانے در و دیوار واقعی نظروں سے اوجھل تھے۔ یہ گرد و پیش ہی اور تھا۔ تب ہمیں باور آیا کہ ہم نکل آئے ہیں۔ بس ترت اپنے ناقوں سے اترے اور بے اختیار سجدے میں گر پڑے، اپنے پیدا کرنے والے کا شکر ادا کیا۔ پھر راہ کے کنارے کھجوروں کے سائے میں بیٹھ کر اپنے توشے کو کھولا، ایک ایک مٹھی ستو پھانکے اور ٹھنڈا پانی پیا اس ساعت میں ٹھنڈا پانی ہمیں کتنا ٹھنڈا اور میٹھا لگا، لگا کہ ہم پیاسوں نے آج زمانے کے بعد پانی پیا ہے۔ خدا کی قسم اس آفت زدہ شہر میں تو غذائیں اپنا ذائقہ کھو بیٹھی تھیں اور ٹھنڈے میٹھے کنوئیں یکقلم کھاری ہو گئے تھے۔ یا شاید ہم اتنے بے مزہ ہو گئے تھے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی نعمتیں ہمارے لیے بے لذت ہو گئی تھیں۔

یہ سب کچھ اس شخص کے وارد ہونے کے بعد ہوا۔ وہ شخص بالا قد گھوڑے پہ سوار سیاہ عمامہ پہنے منہ پر ڈھاٹا باندھے ڈھال تلوار زیب کمر کئے شہر میں داخل ہوا۔ ہم سمجھے کہ امام زماں کا ورود ہوا۔ نجات دہندہ کا ظہور ہوا۔ گلی گلی کوچہ کوچہ یہ خبر پھیلی۔ لوگ مسرور ہوئے، نجات کے تصور سے مسحور ہوئے۔ مرحبا کہتے گھروں سے نکلے اور گرد اس کے اکٹھے ہوئے۔ کس شان سے سواری قصر الامارہ کی سمت چلی۔ لگتا تھا کہ پورا شہر امڈا ہوا ہے۔

قصر الامارہ کے اونچے دروازے پر پہنچ کر اس نے گھوڑے کی باگ کھینچی اور مجمع کی طرف رخ کیا۔ رخ کرتے کرتے دفعتاً ڈھاٹا کھولا۔ خونخوار صورت، کف در دہان، نیام سے شمشیر نکالی اور کڑک کر کہا کہ "اے لوگو! تم میں سے جو جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں آ گیا ہوں۔" سب سناٹے میں آ گئے، وہ بھی جنہوں نے دیکھا اور جانا کہ کون ہے جو آ گیا ہے اور وہ بھی جنہوں نے دیکھا مگر نہ جانا کہ کون ہے جو آ گیا ہے

اس نے اپنا اعلان کیا اور قصر الامارہ کے اندر چلا گیا۔ لوگ دیر تک ساکت کھڑے رہے۔ آخر کو الوالمنذر نے مہر سکوت توڑی۔ افسوس بھرے لہجہ میں بولا "کوفے پر خدا کی رحمت ہو، انتظار اس نے کس کے لیے کھینچا اور وارد کون ہوا؟"
"کیا واقعی یہ وہ نہیں ہے جس کے لیے ہم انتظار کھینچ رہے تھے؟"

ابوالمنذر نے اس سوال پر ٹھنڈا سانس کھینچا "اے لوگو! تف ہے تم پر کہ ابھی تک تم نے نہیں پہچانا کہ یہ کس باپ کا بیٹا ہے۔" رکا، پھر کہا "اس باپ کا جس کا باپ نہیں تھا اور جسے لونڈی نے جنا تھا۔"

"زیاد کا بیٹا؟" بے اختیار کئی زبانوں سے نکلا

ایک دفعہ پھر سب سناٹے میں آ گئے اور اس مرتبہ سناٹا زیادہ دیر تک طاری رہا۔

اس کے آنے کی خبر شہر میں آگ کی طرح پھیلی۔ میں منصور بن نعمان الحدیدی بھرے کوچوں سے گزر کر قصر الامارہ تک پہنچا اور خالی خیابانوں اور ہو حق کرتے کوچوں سے گزر کر واپس گھر پہنچا اور جب اس بے آرام رات کے بعد صبح ہونے پر میں گھر سے نکلا تو دیکھا کہ شہر بدل چکا ہے خدا کی قسم کل میں نے اس شہر کو بھٹی پہ چڑھے کڑھاؤ کی مثال ابلتے دیکھا تھا۔ آج میں اسے سینۂ اہلِ ہوس کی صورت ٹھنڈا دیکھ رہا تھا اور میں رو دیا کہ شہر کس شور سے سر اٹھاتے ہیں اور کتنی سرعت سے ڈھے جاتے ہیں۔

میں گرفتہ دل اپنے رفیق دیرینہ مصعب ابن بشیر کے پاس پہنچا۔ گلوگیر ہو کر کہا کہ "اے مصعب تو نے دیکھا کہ کوفے کا رنگ رات رات میں کیا سے کیا ہو گیا۔"

مصعب نے مجھے ناآشنایانہ نظروں سے دیکھا اور بولا "تعجب مت کر اور آہستہ بول۔"

میں نے اسے تعجب سے دیکھا "رفیق، کیا تو وہ نہیں ہے جو کل اونچی آواز سے بول رہا تھا"

"کل سب سے اونچی آواز میں الوالمنذر بولا تھا اور آج وہ قصر الامارہ کی دیوار تلے ٹھنڈا پڑا ہے۔"

یہ کہہ کے وہ عزیز شتابی سے مجھ سے جدا ہوا اور قصر الامارہ کی طرف چلا گیا۔

تب میں نے جانا کہ کوفہ واقعی بدل چکا ہے اور واقعی مجھے آہستہ بولنا چاہیئے، بلکہ نہیں بولنا چاہیئے۔ قیس بن مسہر کو میں نے دیکھا کہ وہ اونچی آواز میں بولا اور ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا اس بے باپ کے بیٹے کے بیٹے کے آدمی اسے پکڑ کر قصر الامارہ کی چھت پر لے گئے پھر کہا کہ بول قیس اس قصرِ بلند کی چھت پر کھڑے ہو کر اونچی آواز میں بولا کہ اس خاموش شہر کے ہر گھر میں اس کی آواز سنی گئی۔ دوسرے ہی لمحے اسے اس اونچی چھت سے نیچے دھکیل دیا گیا۔ قصر الامارہ کی دیوار تلے کتنی دیر وہ سسکتا رہا دیر بعد اس کا رفیق دیرینہ عبدالمومن بن عمیر اس راہ سے گزرا اسے سسکتا دیکھ کر خنجر کمر سے کھولا اور اس کے گلے پر پھیر دیا۔ ایک بوڑھے نے یہ منظر دیکھا اور قریب آکر سرگوشی میں کہا کہ تو نے خوب حقِ رفاقت ادا کیا اور عبدالمومن نے جواب دیا کہ میں اپنے رفیق کو سسکتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں یہ نقشہ دیکھ وہاں سے پلٹا اور خیابان خیابان پریشان پھرتا پھرا اور میں نے جانا کہ میں کوفہ میں نہیں ہوں، خوف کے صحرا میں بھٹک رہا ہوں۔

خوف کے صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے میری مڈھ بھیڑ ابو طاہر سے ہوئی اور ابو طاہر نے مجھے جعفر ربعی اور ہارون ابن سہل سے

ملایا۔ کتنے دنوں تک ہم گونگے بہرے بنے اس خوف کے صحرا میں پھرتے پھرے۔ آخر کے تیئں صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹا، سر جوڑ کر بیٹھے اور مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے۔ سوچا کہ کسی صورت اس شہر خراب سے نکل چلئے۔

اس تجویز پہ جعفر ربیعی رو پڑا "میں کوفے کی مٹی ہوں اس مٹی کو کیسے چھوڑ دوں۔"

ہارون ابن سہیل جعفر ربیعی کی بات سن کر آبدیدہ ہوا، کہنے لگا "ہر چند کہ میں مدینے کی مٹی ہوں مگر پالنے والے کی قسم اس قریے سے مفارقت مجھے بھی رلائے گی کہ میں نے اپنی جوانی کے ایام اسی کے کوچوں میں گذارے ہیں۔"

تب ابوطاہر نے کہ ہم میں بڑا تھا میری طرف دیکھا "اے منصور تو اس باب میں کیا کہتا ہے۔"

میں نے عرض کیا "رفیقو! حضور کی حدیث یاد کرو کہ جب تمہارا شہر تم پر تنگ ہو جائے تو وہاں سے ہجرت کر جاؤ۔

یہ کلام سن سب رفیق قائل ہوئے اور نکل چلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

ہم نے شہر سے نکلنا کتنا آسان جانا تھا، مگر کتنا مشکل نکلا۔ شہر کے دروازوں پر پہرہ تھا، آنے جانے والوں پر روک ٹوک تھی۔ کتنی مرتبہ ہم شہر کی حد تک گئے اور پہرے داروں کو چوکنا دیکھ کر پلٹ آئے۔ کوفہ ہم پر تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ تنگ ہوتے ہوتے وہ چوہے دان کی مثال بن گیا۔ اس کے اندر ہم ایسے تھے جیسے چوہے دان میں چوہے کہ چکر کاٹیں اور نکلنے کی راہ نہ پائیں۔

نکلنے کی کوئی صورت نہ دیکھ کر ہم جی جان سے بیزار ہوئے۔ ہارون ابن سہیل نے لمبی آہ کھینچی "کاش ہماری مائیں بانجھ ہو جاتیں اور ہمارے باپوں کے نطفے ضائع ہو جاتے کہ نہ ہم پیدا ہوتے نہ یہ سیاہ دن ہمیں دیکھنے پڑتے۔"

جعفر ربیعی رو دیا اور بولا "وائے ہو مجھ پر کہ میں اپنے ہی قریے میں رنج اسیری کھینچتا ہوں۔ وائے ہو اس قریے پر کہ وہ اپنے بیٹوں کے لیے سوتیلی ماں بن گیا۔"

یاس کی اس انتہا پر پہنچ کر ہم جری بن گئے۔ مرتا کیا نہ کرتا، بس ہم کمر ہمت باندھ چل کھڑے ہوئے کہ جو ہو سو ہو، یہاں سے نکلو۔

ہم نے تو اپنے آپ کو داؤں پر لگا دیا تھا۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ہمت مرداں مدد خدا تو بس سمجھ لو کہ وہ تائید ایزدی تھی کہ پہرے داروں کی نظروں میں ہم نہیں آ سکے بس ان کی آنکھوں پہ پردے پڑ گئے اور اب ہم شہر سے باہر تھے اور آزاد فضا میں سانس لے رہے تھے۔

شام کے سائے بڑھتے جا رہے تھے اور ہوا گرم سے ٹھنڈی ہونے لگی تھی۔

"ہم نفسو! رات کالی ہے اور سفر لمبا ہے قدم آگے اٹھانے سے پہلے سوچ لو۔"

"اے اخی! کیا یہ رات کوفے کے دنوں سے زیادہ سیاہ ہے؟"

یہ دلیل سب کو قائل کر گئی۔ ہم اس دمبدم کالی ہوتی رات میں سفر کرنے کے لیے کمریں کس کر تیار ہو گئے۔

"مگر جانا کہاں ہے؟"

اس سوال نے ہمیں چونکایا۔ ہم تو بس نکل کھڑے ہوئے تھے۔ یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے۔

ابوطاہر نے تامل کیا، پھر کہا "مدینے، اور کہاں؟"

میں اور جعفر ربیعی اس تجویز کے مؤید ہوئے مگر ہارون بن سہیل سوچ میں پڑ گیا۔ دبے لہجے میں بولا "اگر مدینہ بھی کوفہ بن چکا ہو تو؟"

ہم سب نے اسے برہمی سے دیکھا۔

"اے رفیق" جعفر ربیعی بولا "تو اس منور شہر کے بارے میں جبکہ تو خود وہاں کی مٹی ہے ایسا سوچتا ہے"۔

ہارون بن سہیل رکا۔ پھر بولا "ہم نفسو! بے شک اس شہر مبارک کی زمین آسمان ہے۔ وہاں کی مٹی معتبر اور پانی مصفا ہے مگر میں اس شہر کی سمت سے آنے والوں سے ملا ہوں۔ میں نے انہیں پریشان پایا"۔

اس پر ہم چپ ہو گئے۔ کسی سے کوئی جواب نہ بن پڑا مگر ہارون بن سہیل ابھی چپ نہیں ہوا تھا۔ سوچتے سوچتے بولا "ہم نفسو! میں سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ نورِ حق سے منور ہونے والے شہر کتنی جلدی منقلب ہو گئے کتنی جلدی ان کے دن پراگندہ اور راتیں پریشان ہو گئیں"۔

ابوطاہر نے اسے برہمی سے دیکھا "اے سہیل کے ناخلف بیٹے، تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے کیا تو اسلام کی حقانیت سے انکار کرے گا؟"

ہارون بن سہیل بولا "بزرگ! میں پناہ مانگتا ہوں اس دن سے کہ میں خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت میں شک کروں اور اسلام کی حقانیت سے انکار کروں مگر یہ کہ کوفہ ۔ ۔ ۔ ۔"

ابوطاہر نے غصے سے اس کی بات کاٹی "کوفہ کیا؟ کیا کہنا چاہتا ہے تو؟"

"ہاں یہی میں سوچتا ہوں کہ کوفہ کیا اور کیوں؟ بار بار اس خیال کو دفع کرتا ہوں اور بار بار یہ خیال میرا دامنگیر ہوتا ہے کہ مبارک قریوں کے بیچ کوفہ کیسے نمودار ہو گیا اور کتنی جلدی نمودار ہوا۔ ہجرت کو ابھی ایسا کون سا زمانہ گذر گیا ہے"۔

میں نے دیکھا کہ ابوطاہر کے مزاج کی درہمی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے بات بیچ میں کاٹی اور کہا کہ "رفیقو! میری تجویز یہ ہے کہ اس شہر میں جسے حق تعالے نے شہرِ امن قرار دیا ہے بیشک دنیا ظالموں سے بھر جائے اور زمین فساد سے تہہ و بالا ہو جائے مگر مکہ کے مبارک شہر کے امن میں خلل نہیں آئے گا"۔

سب رفیقوں نے میری اس تجویز پر صاد کیا اور ہم فوراً ہی ناقوں پر سوار ہو گئے۔

تاریکی بہت تھی کہ یہ چاند کے تہ درع کی راتوں میں سے ایک رات تھی مگر ہمارا جذبہ ہمیں کھینچے لئے جا رہا تھا۔ اب رات بھیگ چکی تھی اور آسمان سے اترتی خنکی نے ہمارے دلوں میں ایک ترنگ پیدا کر دی تھی۔ شہرِ امن کے تصور میں مگن، رہائی کے نشے سے سرشار ہم بڑھے چلے جا رہے تھے۔ ناقے پر بیٹھے بیٹھے مجھے اونگھ آ گئی۔ میں نے کیا سہانا خواب دیکھا کہ میں شہرِ امن میں ہوں۔ نیک پاک بزرگوں کے بیچ بیٹھا شہرِ ظلم کا حال سناتا ہوں۔ اچانک کان میں ایک آواز آئی "یہ تو ہم پھر وہیں آ گئے" اور میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ اب تڑکا ہو چکا تھا۔ پھیلتے اجالے میں سامنے کوفے کے در و دیوار نظر آ رہے تھے۔

"یہ تو ہم پھر وہیں آ گئے" جعفر ربیعی کہہ رہا تھا۔

ابوطاہر نے، ہارون بن سہیل نے، میں نے حیرت و دہشت سے ان در و دیوار کو دیکھا۔

"مگر کیسے ؟" میرے منہ سے نکلا۔

ابوطاہر نے تامل کیا۔ پھر کہا " رفیق، رات بہت کالی تھی۔ ہم نے راہ پر دھیان نہیں دیا۔ جس رستے آئے تھے الٹے اسی راستے چل پڑے۔"

" اب کیا کریں۔" جعفر ربیعی نے سوال کیا۔

ہم سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ابوطاہر نے بعد تامل کے کہا " رفیقو' واپسی اب محال ہے کہ پہرے والوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔" رکا۔ پھر یاس سے کہا " شاید قدرت کو ہمارا اس شہر خراب سے نکلنا منظور نہیں۔"

ہارون بن سہیل نے اس پر ٹھنڈی آہ کھینچی " بزرگ تو نے بجا کہا۔ کوفہ ہماری تقدیر ہے۔"

میں منصور بن نعمان الحدیدی بصد حسرت و یاس یوں بولا " ہاں مکہ ہمارا خواب ہے۔ تقدیر ہماری کوفہ ہے۔"

اور ہم خراب و خستہ ہو کر پھر کوفے میں آ گئے اور پھر چوہے دان کے اندر چکر کاٹنے لگے۔

تیرھواں آدمی

رضیہ فصیح احمد

یقین آنے والی بات نہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک زمانے میں اس شہر گمنام کی بسوں میں ایک آدمی بھی کھڑا نہ ہوتا تھا۔ سب بیٹھ کر سفر کرتے تھے۔ مسافروں میں کبھی دنگا فساد نہ ہوا تھا۔ مسافروں اور کنڈکٹر میں کبھی تو تو میں میں نہ ہوئی تھی۔ مسافروں، ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں کا رشتہ ایسا تھا جیسا کہ ایک اچھے شہر میں شہریوں کا ہونا چاہیئے۔

مگر پھر یہ ہوا کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے اس شہر میں رفتہ رفتہ بسیں کم ہوتی گئیں، مسافر بڑھنے لگے اور سواریوں کی کمی کا مسئلہ شروع ہوا۔ لوگ دفتروں سے دس پندرہ منٹ لیٹ ہونے لگے تو تشویش کا آغاز ہوا۔ شہریوں کی زبانوں پر عام شکایات، اخباروں میں خطوط اور محکمے کے نام آنے والی عرضیوں کے بعد ایک بلند سطح کی کانفرنس بٹھائی گئی جس میں بسوں کی کمی اور مسافروں کی تکالیف کا مسئلہ سامنے لایا گیا۔ عام خیال تھا کہ ضرورت واقعی ہے، مسئلہ سنگین ہے اور اس کا فوری حل ہر حال میں دریافت ہونا چاہیئے۔ چنانچہ نئی سو بسوں کی درآمد کی تجویز فوری طور پر منظور ہونے ہی والی تھی کہ ایک ماہرِ حسابیات جو آدھے زمین سے اوپر اور آدھے اندر تھے بول اٹھے۔

”صاحب! اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کردوں۔“

”فرمائیے۔“ صاحبِ صدر نے کہا۔

”جناب والا! حساب کی رو سے جتنے لوگ بسوں میں سفر کرتے ہیں اور بسیں اتنی ہیں۔ چنانچہ اگر ہر بس میں فقط آٹھ آدمیوں کو کھڑے ہونے کی اجازت دے دی جائے تو بات بن سکتی ہے۔ ہر پندرہ منٹ بعد ایک بس چلتی ہے اور ہر بس میں آٹھ آدمی زیادہ سفر کرسکتے ہیں تو حساب کی رو سے کوئی بھی آدمی بس اسٹینڈ پر انتظار نہ کرے گا اور اس طرح ہمارا . . . . . زرِمبادلہ . . . . . قیمتی زرِمبادلہ جو کسی پیداواری قوت میں اضافہ کرنے والی مشین پر خرچ کیا جاسکتا ہے بچ جائے گا. . . . یہ میری چھوٹی سی ذاتی رائے ہے۔“ ”واہ، واہ، تو آپ پہلے کیوں نہ بولے۔ اس میں تو کچھ جان نظر آتی ہے۔“ [illegible]

ہر کسی کو یہ حسن بھی زرِمبادلہ بچانا یا صرف اس کی ذات پر خرچ ہونا ہو حکومت کے سرافسر کو بڑی جاندار نظر آتی ہے۔

جب اس تجویز کو دوبارہ صاحبِ کرسی نے اپنے الفاظ میں کمیٹی کے سامنے پیش کیا تو جن لوگوں کو پہلے یہ مردہ نظر آئی تھی انہیں بھی اس میں جان پڑتی نظر آئی اور تھوڑی ہی دیر کی بحث و تمحیص کے بعد مردہ زندہ ہوگیا۔

سب نے اس تجویز پر صاد کردیا۔ زرِمبادلہ کی بچت کی فوری خوشی میں بھاری چائے پی گئی اور ضروری کارروائی کے بعد یہ حکم نامہ جاری کردیا گیا کہ بحکم سرکار شہر گمنام کی ہر بس میں آٹھ آدمیوں کو کھڑے ہونے کی اجازت ہے۔ کنڈکٹر کا فرض ہے کہ وہ آٹھ سے زیادہ آدمی بس میں کھڑے نہ ہونے دے کہ وہ امنِ عامہ کے لیے خطرہ اور حادثے کا سبب ہوسکتے ہیں۔

دوسرا دن وہ پہلا تاریخی دن تھا جس میں شہر گمنام میں لوگ بسوں میں کھڑے ہوئے اور جب بھی کنڈکٹر نے گنا وہ آٹھ سے زیادہ تھے۔ نو . . . . . دس . . . . . گیارہ یا بارہ۔ اور جب کنڈکٹر نے آخری آدمی سے اترنے کی درخواست کی تو کوئی بھی نہ اترا۔ کسی نے کہا کہ وہ پہلے چڑھا تھا آخری آدمی کوئی اور تھا۔ کسی نے کہا کہ وہ بوڑھا اور کمزور ہے اس لیے اسے پہلے جانے دینے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ نوجوان نے جواب میں کہا تو کیا وہ اپنی جوانی کی سزا بھگتے اور بس اسٹینڈ پر کھڑا کھڑا بوڑھا ہو جائے۔ پہلے ہی دن آخری آدمی کی تلاش نہ ہو سکی نہ یہ طے پا سکا کہ کس عمر اور سائز کا بچہ آٹھواں آدمی شمار کیا جا سکے گا۔ یہ وہ پہلا دن تھا جب بوڑھوں نے جوانوں کے سر سے شفقت کا ہاتھ اٹھایا اور جوانوں کے دلوں میں بوڑھوں کا لحاظ ختم ہوا۔ مسافروں کی آنکھوں سے ایک دوسرے کی مروّت اٹھ گئی۔

اس دن تقریباً ہر اخبار میں بسوں میں کھڑے ہونے والوں کی تصویریں شائع ہوئیں اور یہ خبر چھپی کہ شہر گمنام میں ہر جگہ آٹھ سے زیادہ آدمی کھڑے ہوئے جس پر آپس میں جھگڑا ہوا۔ تب کانفرنس دوبارہ طلب کی گئی اور بڑے صاحب نے کہا کہ مسئلہ حل تو ہوا مگر پوری طرح حل نہیں ہوا۔ تب اس ماہر حسابیات نے کہ آدھا زمین کے اوپر اور آدھا زمین کے اندر تھا کہا۔

"آپ نے غور کیا کہ ہر جگہ کھڑے ہونے والوں کی تعداد گیارہ اور بارہ کے درمیان تھی۔ چار ہی مسافروں کی تو بات ہے۔ اگر ان چار مسافروں کو کھڑے ہونے کی اجازت دے دی جائے تو مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔"

چنانچہ دوسرے دن سے بارہ مسافروں کو کھڑے ہونے کی اجازت دے دی گئی اور تاحال اس شہر گمنام میں ایک بس میں بارہ مسافروں کو کھڑے ہونے کی اجازت ہے۔ تیرھواں آدمی وہ آخری آدمی ہے جسے بس میں گھسنے کی اجازت نہیں ہے مگر اس کی تلاش آج تک نہ ہو سکی۔ تیرھواں آدمی قانوناً مجرم ہے اور کنڈکٹر کو حق ہے کہ گردن پکڑ کر اسے نیچے اتار دے مگر ہر شخص کہتا ہے کہ وہ تیرھواں آدمی نہیں ہے اور اب تو مدّت ہوئی یہ پوچھنا اور دیکھنا بھی چھوڑ دیا گیا ہے کہ تیرھواں آدمی کبھی کوئی تھا بھی۔ بس میں جو آدمی مسافروں کی تعداد چیک کرنے آتا ہے اسے بس میں گھسنے تک کی جگہ نہیں ملتی اور ویسے بھی اب کھڑے ہونے والوں کی تعداد گن لینا آسان بات نہیں ہے۔ اس لیے چیکنگ کرنے والا باہر ہی سے لوٹ جاتا ہے جیسے تیرھواں آدمی وہ خود ہی ہو۔

اپنا نذرانہ وہ باہر ہی سے لے لیتا ہے اور حکومت سے اس کی تنخواہ ماہ بماہ آج بھی مل رہی ہے۔ اب شہر گمنام میں نئی بسوں کی درآمد کا سوال کبھی نہیں اٹھتا۔ جب اٹھتا ہے یہی سوال اٹھتا ہے کہ آیا مسافروں کو بس کی چھت، اس کے بریک، ونڈ اسکرین یا اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھنے یا کھڑے ہونے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

جوگ کی رات

جمیلہ ہاشمی

آفندی کو راتوں اور اندھیروں کے اسرار پر بڑا یقین ہے۔ سایوں اور خاموشیوں کا جادو اسے بڑا دلکش لگتا ہے۔ گفتگو کرتے کرتے یکایک خاموش ہو جانا اور ہمہ تن گوش ہو کر دور کی آوازوں کو سننے کی کوشش کرنا اس کا مشغلہ ہے۔ موسیقی کے لمبی تانوں والے راگ اسے بہت بے چین کر دیتے ہیں عجیب طمانیت بھری اداسی اس کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اور اسی لیے ایسی محفلیں بپا کرنے میں اس کا ذوق بھی الگ تھلگ سا ہے۔ دوسروں سے قطعی مختلف۔ وہ ایسی شاموں کا انتخاب کرتا ہے جب ہوا رک رک کر مگر دیوانی ہو کر چلتی ہو ستارے گھنیرے بادلوں میں چھپے ہوں چاند نہ ہو اور کوئل رہ رہ کر کوکتی ہو جیسے یادوں کی دیئے جلا کر ہول کے سامنے رکھ رہی ہے۔ خواب و خیال کی یہ داستان طراز شبانہ محفلیں اور پھر موسیقار کا اہتمام بھی یوں کہ اس نے اس سے پہلے کسی اور محفل میں نہ گایا ہو۔ خود آفندی نے اسے کبھی نہ سنا ہو اور وہ بھی باقی لوگوں کے ساتھ دھڑکتے دل کے ساتھ نغمے کا منتظر ہو۔ ممتا کو آفندی کی اس مشکل پسندی سے چڑ ہے۔ اس کے نزدیک موسیقی سننے کے لیے اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے بھلا جیسے گھور گھپاؤں میں آدمی کرنوں کی کھوج میں جاتا ہے۔

"آفندی کی بات تو ٹھیک ہی ہے۔" میں اس سے کہتا ہوں۔

"میں کب کہتا ہوں کہ بھابی غلط کہتی ہیں مگر اپنی اپنی طبیعت کے تقاضے ہیں۔ مجھے خاموش اور زرد رو عورتیں پسند ہیں۔ سہاگنیں جن کی ناک میں کیل ہو لمبی چوٹی پشت پر لہراتی ہوئی تھوڑی تھوڑی بنی سنوری ہوئیں جو جگمگاہٹ پیدا نہ کریں صرف روشنی ہوں۔ تم سمجھتے ہو زین مجھے ممتا بھابی بھی بھلی لگتی ہیں مگر" اس نے بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔

"بھئی بات تو موسیقی کی ہو رہی تھی میں نے تمہاری ناپسند اور پسند کا کب پوچھا تھا؟"

"بات ایک ہی ہے۔ عورتیں راگنیاں ہی تو ہیں مجسم گیت" وہ پھر چپ ہو گیا۔

ہم جانے کہاں جا رہے تھے نہیں بلکہ آفندی ہی مجھے لیے جاتا تھا۔ بارونق بازار اور بڑی شاہراہیں چھوڑ کر ہم پرپیچ راستوں سے نہایت اونچی تاریک عمارتوں کے سایوں میں چھپے موہوم سے گلیاروں میں داخل ہوئے راستے جو بند گلیوں کی طرح کہیں جاتے نہیں لگتے۔ اور پھر بھی کہیں نہ کہیں جا نکلتے ہیں۔ پرانی حویلیوں کے تقریباً گرتے ہوئے پھاٹکوں کی درزوں میں اُگے تناور درختوں کے تاریک سائے جو کمزور بلبوں کی روشنی میں تیرے ساز ،

کے ایمن اور ڈراؤنے لگتے تھے۔ سوت کی الجھی ہوئی انٹی سے نکلتی ناگوں کی سی گلیاں جب موٹر ان میں داخل ہوتی تو میں سوچتا بس اب آگے جانے کی راہ نہیں ہوگی مگر راہیں خود بخود کشادہ ہوجاتیں۔ کھلے دروازوں میں پتیاں بنی بکھری اور سمٹی ہوئی روشنی اور چبوتروں پر نہایت سکون سے بیٹھے ہوئے بوڑھے اور جوان حقے پیتے ہوئے لکڑی کے نفیس کام کے ڈیوڑھیوں پر جھکے چھجوں کے ساتھ کنوئیں جس کی منڈیر پر عورتیں پانی کے گھڑوں کو تھامے دکھ درد اور ہنسی مذاق کرتی ہیں۔ موٹر کو دیکھ کر اجنبیوں سے منہ چھپانے کی کوشش آڑے ترچھے زاویے بناتے ہوئے آنگنوں میں کودتے ہوئے بچے یہ جمی جمائی صدیوں سے اپنے آپ کی حفاظت کرتی ہوئی زندگی جس پر باہر کے فیصلوں اور پالیسیوں کا اثر تقریباً نہیں پڑتا۔

آنندی جیسے مسلسل مراقبے میں ہو پائپ کے دھوئیں میں لپٹا ہوا اس جادوئی ماحول میں کھویا ہوا تھا مگر پُرپیچ راستوں سے گھبرا کر میں سوچ رہا تھا کیا ہی اچھا ہوتا، میں ممتا کا کہنا مان کر اس کے دور پار کے رشتہ داروں کے ہاں جاتا اور تیز گرم کافی پیتے ہوئے پہاڑی کے پھولوں کے بھرے کنج سے نیچے تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھتا۔ ہم تو شاید راہ بھول گئے تھے کیونکہ آنندی نے کئی بار باہر جھانکا تھا۔ موٹر کو ٹھہرا کر موڑ تک دیکھا تھا جانے ہمیں کہاں جانا تھا؟

دھوئیں سے کلسائی ہوئی دیواروں اور بند دریچوں والے بازار میں اتر کر ہم جھانکتے رہے۔ میں ایک خاموش تماشائی کی طرح آنندی کے پیچھے تھا۔ ہوا چلتی تھی تو تنگ گلیاں اپنے اونچے مکانوں سمیت کسی قبائلی گیت کی دھن سے یوں پُر ہو جاتیں جیسے راگ سے باجا۔ ہم تقریباً ناامید ہو چلے تھے۔ جب کالی کھڑکیوں کے نیچے ہمیں تہہ خانے کا وہ راستہ دکھائی دیا جو ہماری منزل تھا۔

ہمیں روک کر ایک بدخو بڈھے نے تقریباً غرا کر کہا "کس سے ملنا ہے"۔

آنندی نے جانے کیا کہا کہ اس نے کھڑکی نما دروازہ کھول دیا اور ایک طرف ہو کر ہمارے لیے رستہ بنا دیا۔

اندر روشنی اتنی کم تھی کہ چہرے گڈمڈ تھے۔ ایک بیمار بلب ذرا سی روشنی کو بھی مسلسل جلتے ہوئے چھننے نہیں دیتا تھا اور اندھیرے کو اور بھی گہرا کر رہا تھا۔ یہ دھندلکا تھا جس میں ہیولے تھے اور اس کے باوجود قریب ہونے پر بھی قریب نہ تھے۔ اداس اور غیر مرئی صداؤں سے بھری فضا تھی جو خواب میں دیکھی لگتی تھی۔ سرگوشیوں میں گونج نہ تھی جیسے لفظ سینوں میں گھٹ رہے ہوں "عجیب عجیب لوگ جمع ہوتے ہیں یہاں" آنندی نے زیر لب کہا۔

"یہاں روشنی بہت ہی کم ہے"۔ میں نے بھی اسی طرح کہا۔

"آنکھیں کم روشنی میں دیکھنے کی عادی ہو جایا کرتی ہیں"۔ کسی نے پاس سے کہا۔

ہم دونوں نے مڑ کر دیکھا۔

"آپ لوگ الاول سے ملنے آئے ہیں۔ وہ یہیں کہیں ہوں گے" بولنے والے نے ہمارے لیے راستہ بنایا۔ ہوا بوجھل ذائقوں سے بھری تھی جس میں سگریٹ کے دھوئیں پر تیرتی جنگ کی تصویروں سے بھری دیواریں جھکی ہوئی چھت کے نیچے ہر گھڑی سر پر گرتی ہوئی جان پڑتی تھیں۔ یہاں نہ دن لگتا تھا اور نہ رات ایک بھیڑ تھی جو جھکی ہوئی بے ڈھنگے پیروں اور نہایت کھردرے بینچوں پر جمی تھی اور کسی نہ کسی کام میں مشغول تھی۔ کسی نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا تک نہیں گویا ہم کسی کو دکھائی ہی نہ دے رہے ہوں یا پھر ان کی اپنی قسم قسم کی شخصیتوں کا پرتو ہوں "مانوس" چہرے جن کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی نہ ہو۔

کتوں اور کتوں کے مالکوں کا داخلہ بند ہے۔ ایک نوٹس چھت کے ساتھ آویزاں تھا۔

"پتہ نہیں کون یہاں آنا پسند کرتا ہوگا۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"بہرحال ہم نے یہ نوٹس صرف اس لیے لٹکایا ہے کہ ہم ان کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔"

میں نے گھوم کر دیکھا۔ ہسپانوی لباس میں ملبوس ایک لڑکی اپنے جوتے کے تسموں کو کس رہی تھی۔ وہ بڑے اپنے پن سے ہنسی۔

"آپ لوگ بہت پہلے آ گئے ہیں۔ محفل میں تو ابھی وقت لگے گا۔ مگر بیٹھیں۔ تسکین" اس نے کسی کو کہا "الاول کو جگا دو نا" وہ یوں بات کر رہی تھی جیسے یہاں زور سے بات کرنا گناہ ہو۔

"آیئے آیئے آفندی بھائی خوب کیا جو ذرا پہلے آ گئے" کونے میں سے کسی نے کہا پھر ہاتھ ہوا میں پھیلایا اپنے سامنے ٹٹولا بنچ خالی کی "یہاں بیٹھ جایئے"

ان آنکھوں کی جگہ خالی گڑھے کسی لاش کے سے لگتے تھے اور چمکتی ہوئی پیشانی کے نیچے اور بھی ڈراؤنے تھے۔

"زین کو بھی لایا ہوں یہ میرے دوست ہیں" آفندی کی طرح میں نے بھی ہاتھ بڑھا کر الاول کے ہاتھ کو پکڑا اور ماتھے سے چھوا لیا۔

اور اس کی ہنسی اس نیچی چھت والے لمبے تہہ خانے میں ٹائپ رائٹروں کے شور کے اوپر اونچے سروں کی طرح ذرا سا گونج کر صدائے بازگشت کی طرح سنائی دیتی رہی۔

الاول بھائی زین کو گٹار بجانے کا شوق ہے موسیقی میں بھی دلچسپی لیتے ہیں اور ایسے بہت سے شوق جن کو زمانہ بھلانے پر تلا ہوا ہے کم از کم نئی نسل تو ان کے لیے فرصت ہی نہیں پاتی۔

"نئی نسل کو اپنے سبق اپنے طور پر سیکھنے ہیں اور انھیں فرصت نہیں ہے مگر خیر آپ کو کب سے گٹار بجانے کا شوق ہے" الاول بھائی کی آواز ڈری ہوئی جیسے اسے بیک وقت مایوسی اور خوشی ہوئی ہو جیسے اسے میرے اصل ہونے میں کچھ شک ہو اور پھر بھی وہ میرا دل نہ توڑنا چاہتا ہو۔

"آپ چاہیں تو کبھی میرا امتحان لے لیجیے گا" میں نے خوش دلی سے ہنس کر کہا۔

"امتحان" الاول نے بہت سہم کر کہا "زندگی کے عذابوں اور امتحانوں سے آدمی جانے کیسے نکلتا ہے رہ مزید امتحان کی فرصت کسے ہے" اور پھر آہستہ سے اس نے کہا۔

"شکیبین، کیا قہوہ مل سکے گا؟"

"کیوں نہیں" احمد نے ہتھیلیوں میں کاغذ ٹھونستے ہوئے جواب دیا۔

"جاگ گئے الاول بھائی" کسی نے ہمارے درمیان کھڑے ہو کر کہا۔

حسنات تم ٹھیک تو ہو نا۔ ان سے ملو یہ زین اور آفندی ہیں" ہم نے باری باری اس سے ہاتھ ملایا آج کی محفل کے لیے میں نے انھیں بطور خاص بلایا ہے۔"

حسنات نے ہم دونوں کو اپنی چمکتی ہوئی آنکھیں خوب کھول کر غور سے دیکھا۔ وہ دیکھنے میں بہت مضبوط اور بے حد جذباتی لگتا تھا۔ جیسے طوفانوں اور مخالف ہواؤں کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔ ہم دونوں سے نکلتے قد کا یہ سیاہ بالوں سے بھرا سر کو اپنے مضبوط کندھوں پر ٹکائے وہ بیک وقت مجھے بہت تند مزاج لگا اور بہت معصوم بھی۔

"یہ یہاں فلسفے کے طالب علم ہیں" الاول نے بات ختم نہیں کی تھی کہ حسنات نے کہا "اور میری سب سے بڑی خوبی الاول بھائی کے نزدیک یہ ہے کہ میں خالی پستول سے نشانہ لگانے کی مشق کیا کرتا ہوں۔"

"پتہ نہیں میں انہیں یہ کہتا کہ نہیں مگر اب کہ انہیں معلوم ہو ہی چکا ہے تم انہیں اپنا پستول دکھا کیوں نہیں دیتے۔" الاول نے ہنس کر کہا۔

"ڈر جائیں گے۔" حسنات نے ہنستے ہوئے اپنی پیٹی میں سے پستول نکال لیا۔

"ہر وقت خالی نہیں ہوتا الاول بھائی یہ گمان آپ کو کیوں رہتا ہے کہ یہ خالی ہوگا؟"

"اس لیے کہ جب چیزوں کی واضح صورت آپ کے سامنے نہ ہو تو نشانہ کس کو بنائیں گے۔" الاول نے اسی سرگوشی میں جواب دیا۔

"لیلیٰ کہاں جا رہی ہو" الاول نے اپنے قریب آتے جوتوں کی چاپ سے اندازہ لگایا ہوگا۔

"میں وقت پر لوٹ آؤں گی۔ آپ فکرمند نہ ہوں" لیلیٰ نے سکارف کو سر پر درست باندھا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"میں بھی تمہارے ساتھ آرہا ہوں" حسنات نے سیڑھیوں پر اسے جا لیا پھر ان میں کچھ باتیں ہوئیں اور وہ لوٹ کر الاول کے پاس ٹک گیا۔

"الاول بھائی مل کر دیکھے گئے اجتماعی خواب بہت ضروری ہیں تاکہ جاگتے میں آدمی ان کی تعبیر پانے میں سرگرداں رہے" اور اس نے پستول کو پیٹی میں پھر سے ٹھیک کیا۔

"اجتماعی خوابوں کے ٹوٹنے سے جو اجتماعی اداسی پیدا ہوتی ہے اس کا اثر کیا ہوگا حسنات" الاول نے بنچ پر پہلو بدلا۔ "خواب بھی گیت کی طرح ہے کہ اس کی لے کو ڈھونڈنے میں آدمی اپنا تن من لگا دیتا ہے وہ لے جو ہاتھ نہیں آتی بس خوابوں میں دیکھی صورتوں کی طرح سمجھ میں نہ آنے والی صدا کی طرح آس پاس سے گزر جاتی ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ اپنے دل میں گھومتے سارے گیت گا سکوں مگر نہ لے اور نہ ہی لفظ اسے پکڑ نہیں پاتے پکڑ نہیں سکتے۔"

"یہ عمل نہیں محض خیالوں کی جنگ ہوتی ہے جس میں نہ کچھ کھونے کے لیے ہے اور نہ پانے کے لیے" احمد بے نے کہا۔

"لیلیٰ واپس آئے گی تو محفل شروع ہوگی"، تسکین نے اپنے گرد اگرد دیکھا اور پوچھا۔

"نہیں محفل کے لیے لیلیٰ کی واپسی کی کوئی شرط نہیں البتہ اونٹوں کے رواں قافلوں کو روک لو کہ خالی محمل ناقہ کے لیے بھاری بوجھ نہ بن رہا ہو۔" حسنات کی بات سن کر سب لوگ ایک دم ہنسے فضا اچانک نہایت خوشگوار ہو گئی اور تسکین نے سر جھکا کر اپنے کام میں زیادہ انہماک دکھایا جیسے اسے نہ اس ہنسی کی پرواہ ہو اور نہ ہی ڈر کہ لوگ کیا کہیں گے

"اصل میں یہ سارا منصوبہ لیلیٰ کا ہے اس نے اس پروگرام کو آخری شکل دینی ہے کہ سارے بے خانماں جمع ہوں اور لوگوں کو اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کریں۔" الاول نے آفندی کو مخاطب کیا۔

"مجھے اسی بات سے اختلاف ہے ہم لوگ کبھی پُرامن طریقے سے کسی کو بھی اپنا موقف سمجھا نہیں سکتے یہ میرا دعویٰ ہے اور میں اسے بحث کے علاوہ سب طریقوں سے ثابت کر سکتا ہوں۔"

"جھوٹا ثابت کرو گے" تسکین نے نہایت ہولے سے کہا۔

" یہ نظریاتی بحث ہے بھائی اس میں مت الجھو" احمد بے نے بے رنگ پیالیوں میں سیاہ کافی ہمیں تھما دی

"اس میں تکرار نہیں ہوگی کیونکہ اس کی فراہمی لیلیٰ کے سپرد ہے" حسنات نے بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

پھر سیڑھیوں پر محتاط قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"یہ ایک طرح کی ریہرسل ہے۔" حسنات نے میرے کان میں کہا "اگر یہاں پر یہ تجربہ کامیاب رہا تو ہم لوگ کسی بڑے ہال کا بندوبست کریں گے اور ہو سکتا ہے طالب علم ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی کے اہل ہمت لوگ ہماری مدد کرنے پر تیار ہوں۔ یہ سب تو اپنی جگہ ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ عمل اور صرف عمل بیماریوں کا حل ہے۔ بھلا سٹیج پر واویلا کرنے سے کبھی کوئی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔"

میں چونکہ سارے پس منظر سے قطعی ناآشنا تھا اس لیے سر ہلا کر رہ گیا۔ میں کیا جواب دیتا۔

اور پھر یہ تنظیمیں تقریباً خفیہ ہیں کبھی کوئی کام عوام سے مل کر نہیں کر سکتے۔ ان میں نہ ذاتی سوچ ہوتی ہے اور نہ سلیقہ۔ وہ تو بھیڑوں کی طرح صرف پیچھے چلنے کے لیے ہوتے ہیں۔ چند ذہنوں کو خدا اور ائی قوتیں عطا کرتا ہے۔ کرتا ہے نا؟ آپ یہ تو تسلیم کریں گے۔" میں نے سر ہلا دیا۔

لیلیٰ کا جوش وخروش اور اس کا ہیجان دنیا کو گرمانے کا بہت اچھا ہے مگر اس کے لیے بھی چند لوگوں کو مل کر کام کرنا ہوگا۔ دیکھ لیجیئے گا آخر میں وہ بھی اس بات کو مان ہی لے گی۔ جس انگلی میں درد ہوتا ہے۔ تکلیف تو اسی میں زیادہ ہوتی ہے بھلا کوئی کسی دوسرے کے لیے کہاں تک درد میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ ہمدردیاں سارے جہاں سے سمیٹ لیجیے مگر تو آپ کو اپنی ہی استعمال کرنی پڑے گی۔"

"بڑے بھائی اگر آپ کوئی گیت گانے والے ہیں تو میری پسند کا ہو۔" حسنات نے التجا کی۔

"بچوں کی سی ضد ہے۔" شکیبن نے کہا "لیلیٰ کو آنے دو اسے کم از کم اندازہ تو ہو جائے کہ آغاز کیا ہونا چاہیئے۔"

"لیلیٰ کے آنے تک وقت گزاری کے لیے ہی سہی الادل بھائی مجھے وہ گیت سنا ہی دیں مجھے آپ کے وہاں کی ندیوں کے نام بہت اچھے لگتے ہیں۔"

الادل نے ہنس کر اپنا ہاتھ گٹار کی طرف پھیلایا اور نوجوان سیڑھیوں سے اتر کر اندر داخل ہوئے۔ ہوا بوجھل سی ہو رہی تھی جیسے باہر سناٹا ہو حسنات اپنے ہاتھوں کو سینے پر باندھے آنکھیں بند کیے تھا۔

تاروں کے لرزنے سے وہ دھواں دھواں اندھیرا پہلے اور بھی گہرا ہوتا ہوا جان پڑا جیسے نغمے تاروں سے نکلنے کے لیے بیتاب ہوں جیسے یہ فضا جھنکاری کی منتظر ہو۔ دھواں دہکنے لگا ہو۔

ندیو، ہواؤ، آکاش، زمین سنو سنو
اے جل دھارا پدما اے سُرما اے میگھنا
اے پچھوا اے پروا اے اندھیارے اے طوفان
اے ندیو او ہواؤ سنو سنو
کیسی ندیاں ہو کہ تم میں آگ بہتی رہتی ہے۔
کیا کسی نے دیکھا کبھی پانی میں آگ لگتی ہے
اے ماں دھرتی اے آکاش سنو سنو سنو
تمہارے پانی میں بارود کی بو ہے
تمہارا سبزہ آگ سے دہکتا ہے
کتنے جادو جگانے والے کتنے آگ لگانے والے
کیا کیا کام کرتے ہیں
ہم بدنام ہوئے ہم مارے گئے

اب ہمارے پھول کبھی مہکیں گے کبھی یہ ندیاں کسی کھیت کو سینچیں گی
اے دھرتی ماں سنو سنو سنو
تیرے سینے سے لگ کر مجھے جلن کیوں لگتی ہے کیا تو بھی جل رہی ہے۔
ہاں تیرا آکاش تیرے اوپر اپنے پیار کی برکھا کیوں نہیں کرتا۔
کیا پیار کسی مول نہیں ملتا۔ جیون دے کر بھی نہیں۔
اے آکاش سنو سنو سنو
اپنے بادلوں سے کہہ وہ برسیں یہ دکھ یہ کرودھ یہ زخم زخم جسم
سب دھوڈالیں پھولوں اور باسوں اور سبزے کو نیا جیون دے
اے بھگوان کی ان دکھی شکستہ انسان پر رحم کرو
اے جل دھارا پدما اے سُرما اے میگھنا
اپنے پانیوں کو بارود کی بُو سے دھوکر پاک کرو
کہ زمین پر دھنک کے رنگوں کی بہار اترے
آدمی آدمی کے جلے ہوئے چہرے پر پیار کا مرہم رکھے
دکھتی انگاروں پہ جلتی دھرتی ماں کا سینہ ٹھنڈا ہو
اے پنچھوا اے پروا اپنا مان بڑھاؤ
ندیو، ہواؤ آکاش سنو سنو
اے جل دھارا پدما اے سُرما اے میگھنا

پھر گٹار کو اس نے ایک دم بنچ پر لڑھکا دیا اور خود دونوں ہاتھ سمیٹ کر چپ ہو گیا۔ حسنات آنکھیں بند کیے سر جھکائے اسی طرح بیٹھا رہا۔

سیڑھیوں پر سلیپر کے تیزی سے اترتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی جیسے وہ بھاگ آئی ہو "دیر تو نہیں ہو گئی نا" اس نے احمد بے سے پوچھا

"نہیں دیر نہیں ہوئی" احمد بے نے کہا۔ میں نے ملگجے اندھیرے میں اس کے گھیردار لباس کی سلوٹوں اور پھولوں کی بیلوں کی سی جھالروں کو دیکھا اور اس کے کندھے کے برابر دوسری لڑکی بھی تھی اور پھر ایک اور جیسے خدا کی مہربانیاں ہوں اور امید بھری زندگی کا نشان۔

"الادل بھائی اس کے بعد میری باری ہو گی" دوسری لڑکی نے ذرا زور سے کہا۔

"فاطمہ تم کب وطن سے لوٹی ہو"

"آج صبح میرا ہوائی جہاز تاخیر سے پہنچا مگر میں زیادہ لیٹ نہیں ہوئی"

پھر اس نے کہا "مجھے ذرا تھوڑی کھلی جگہ کی ضرورت ہوگی کیونکہ مجھے چلنا پھرنا بھی تو ہوگا"
ہم سب نے اپنی سیٹیں دیوار کے ساتھ لگالیں اور کھڑے ہو گئے۔ اس نے فرش کو سٹیج سمجھتے ہوئے اپنے بازو پھیلائے سر کو جھکایا اور اداس لے گونجی:

میں صدا ہوں میں ندا ہوں میں ہوا ہوں
ہاں گزرے زمانو! میں ہوں میں ہوں۔ تمہاری بازگشت

پھر اس نے بازو اپنے سینے پر باندھ لیے اور سر کو پیچھے پھینک کر کہا:

صحراؤں پر جیسے ابرِکرم برستا ہے
میں اب بھی بادل کا ٹکڑا بن کر الحمرا اور قرطبہ میں ہوں
ان اونچے ایوانوں کی چھت کے قریب جن کے بنانے والوں کے نشان تک نہ رہے
مسجد کے ان بے شمار ستونوں سے لپٹی جہاں چراغوں کا جشن ہوتا تھا
بادشاہ جہاں سجدہ ریز ہوتے تھے اور سونے چاندی کی چھتوں والے بتوں تلے
لرزاں رہتے تھے
اماموں کی خدا کے رعب سے گونجتی آوازیں جنھیں رلا دیتی تھیں
ہاں میں وہ آواز ہوں جو پکارتی ہے مگر بے خانماں ہے
کیسے کیسے کارواں اس زمین پر اترے اور مٹ گئے
مگر میں ہوں۔ ازل سے تا ابد
بے نوا بے نشان آوارہ
وہ مجھے مٹا نہ سکے وہ مجھے تباہ کرنے پر قادر نہ تھے
کوئی یہاں کسی شے پر قادر نہیں ہوتا
سوائے خدا کے جس کا نام میں ہوں
ہاں اے خدائے ذوالجلال میں تیرا نام ہوں جو گونجتا ہے
صدیوں سے میں ان پہاڑوں اور وادیوں میں ہوں
کلیسا کی گھنٹیاں اور ناقوس کی صدائیں مجھے ڈرا نہیں سکیں
جب رات آتی ہے اور مریم کا بت اپنے بچے کو بچانے کے لیے روشنی میں تیرتا لگتا ہے
تو میں مسجدِ قرطبہ کے دروازوں کو ہولے ہولے دھکیلتی ہوں مگر دروازے
نہیں کھلتے ہاں میں صدا ہوں۔ ندا ہوں ہوا ہوں
میں جو تیری اذان ہوں کیا تو مجھے یونہی بے خانماں رہنے دے گا

میں صدا ہوں میں ندا ہوں میں ہوا ہوں

پھر فاطمہ جھک گئی زمین پر گر گئی اور سسکیاں لیتی ہوئی وہیں لیٹی رہی۔ ہم لوگ تالی نہیں بجا سکے۔ میں نے آفندی کا ہاتھ زور سے تھام لیا۔ گیت کے ختم ہونے سے پہلے وہ ایک لکۂ ابر کی طرح ادھر سے ادھر رواں تھی۔ ذرا سی جگہ میں جو ہم نے خالی کی تھی اس کا وجود بجلی کے لہریے کی طرح یہاں وہاں کوندتا پھرتا تھا۔

یہ سیرالزادا کے خانہ بدوش قبائل کی لڑکی ہے۔ یہ لوگ سچ مچ بے گھر ہیں خیموں میں رہنے والے پہاڑوں اور وادیوں میں یہاں وہاں گزر کرنے والے یا اذان سے خالی میدانوں میں بے چین روحوں کی طرح پھرتے ہیں۔

"فاطمہ تم تھکی ہوئی ہو اس لیے بھرپور تاثر نہیں دے سکیں۔ دیکھو جب جھکتی اور سیدھی کھڑی ہوتی ہو یا سٹیج کے ایک کنارے سے دوسری طرف بھاگتی ہو تو تم کو ہوا کی طرح دیوانہ ہونا چاہیے۔"

"بیشک" فاطمہ نے لیلیٰ سے کہا "میں اپنے کمرے میں جا کر اس کو دو چار بار دہراؤں گی۔"

"ضرور ضرور اس لیے کہ ہمارے شو کو ہر لحاظ سے کامیاب ہونا چاہیے۔"

"اب کون بڑھے گا جواؤ" لیلیٰ نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو دیکھا۔ "فاطمہ نے ذرا جلدی کی ہے اس کی باری تو بہت بعد میں آتی"

"کل سہی کل میں اپنی باری کا انتظار کر لوں گی" اور فاطمہ نے اپنے لمبے سیاہ لباس پر کڑھے ہوئے رومال کو ٹھیک کیا پھر بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

لیلیٰ نے کہا "یہ تمام کھوئی اور گم شدہ یادوں کا نوحہ ہے۔ ان زمینوں کا جن کے خواب دیکھنے پر بھی پابندی ہے۔ ان بے گھروں کے لیے جنھیں کبھی اپنے گھروں میں جانا نصیب نہ ہوگا تاکہ وہ اپنی مٹی کی خوشبو کو پا سکیں۔ قوموں کے ان سارے المیوں کی داستان ہے جو یہاں وہاں مشرق اور مغرب میں ماضی اور حال میں ہو چکے یا ہو رہے ہیں۔ اس لیے گیت گانے والوں کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔ ماضی کو حال میں زندہ و تابندہ دکھانا کوئی معمولی بات نہیں۔ آپ لوگوں کو عبادت اور ریاضت سمجھ کر اس فرض کو نبھانا ہے میرا خیال ہے کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟"

"بالکل نہیں" ہر طرف سے آوازیں آئیں "ہم بہت زیادہ کوشش کریں گے۔"

"اب کسے سٹیج پر آنا ہے۔"

"ساربان۔ ساربان" سب نے پکارا۔

"یہ گیت عرب میں بنے آنے والے نوجوان نے نہایت شستہ انگریزی میں کہا۔

"اس کا ترجمہ لیلیٰ انگریزی میں کریں گی یا کسی اور زبان میں"

ان خالی بستیوں کے پاس رکو

اور ان کھنڈروں پر آنسو بہاؤ

ان سے ایک سوال بھی کرو
وہ پیارے کہاں گئے ہائے بندھی ہوئی ریت کے ٹیلوں پر بپا ان کے خیمے کیا ہوئے
ان کنواریوں کے جسموں کی خوشبو جو ہوا پر پانی کے بلبلے کی طرح اٹھتی تھی
ٹھنڈی ریت پر ان کے قدموں کے نشانوں پر گھسٹتے
لبادوں پر بہتی ہوئی چاندنی اب وہاں نوحہ خواں ہے
روؤ اور نوحہ خوانی کرو اس ویرانی پر
تقدیر کو پھیر دینے کا کوئی طریقہ ہمارے پاس نہیں تھا
ہائے ان ٹیلوں پر داستان طراز راتوں کا کیا قصور تھا
ہواؤں سے پوچھو وہ سب کیا ہوئے
وہ انھیں کہاں اڑا کر لے گئیں
وہ بھاری دل سے رات دن ان پر روتی ہیں
چاروں اطراف سے ہوائیں ان خالی لبستیوں پر روتی ہیں
جہاں اونٹوں کے قافلے اترتے تھے
اور چشموں کے کنارے قالینوں پر قصہ گو قہوے کے جام لنڈھاتے
اور سفر کے عجائبات کا ذکر کرتے تھے
ہائے وہ پیارے کہاں گئے
ان مکینوں کیلئے جی اداس ہے جو رونق زندگی تھے
ہائے ان نگاہوں کے لیے میرا جی کیسا کیسا روتا ہے
جو خیمے کے پردے کے پیچھے بجلی کی طرح لپکتی تھیں
گرم نگاہیں اور ٹھنڈی چاندنی کی پھیلی ہوئی چادر
وہ اب کہاں بے نوا پھرتے ہیں
وہ قافلے وہ حدی خواں وہ ساربان
محملوں کا خالی بوجھ لیے خالی دلوں کے ساتھ
خالی بستیوں کے پاس رکو
اور ان کھنڈروں پر آنسو بہاؤ
چاروں کونوں سے نکل کر جو لڑکیاں خالی جگہ کی طرف بڑھیں وہ
سبک رفتار اور خوش شکل تھیں

ہم نے تمھارے پیاروں کو ڈھونڈا
ان وادیوں میں جو کبھی اُن کا مسکن تھیں اُن صحراؤں میں
جہاں ان کے اونٹوں کے پاؤں کے نشانوں پر اب صرف سوکھی ہوئی
گندگی ہے اور ببول کی جھاڑیاں ہیں
ہم بے کفن لاشوں پر سے گزریں
جو سرحدوں سے دور ایسے ویرانوں میں ملے جہاں گھاس کی ایک پتی بھی نہیں اگتی
جہاں پانی کی بوند بھی نہیں ملتی
ان کا قصور کیا تھا
یہ مذاق ان کے ساتھ جنگ نے کیا
جنگ جو جسم کے ساتھ روح کو بھی سلب کر لیتی ہے
ہاں اس وادیٔ مقدس کے غاروں میں جہاں پیغمبروں کے خاکی جسم سوئے ہوئے ہیں
ہوا ان کے بالوں میں کنگھی کرتی ہے
ہم نے تمہارے پیاروں کو پایا
وہ بے نوا بھٹکتی روحوں کی طرح تھے
وطن میں بے وطن
تمہارے وطن کے باغوں میں بہار آتی ہے
مگر اس کے پھل دوسروں کے لیے ہیں
دعا کرو اپنے پیاروں کے لیے ہاتھ پھیلاؤ
شاید وہ سائبانوں تلے زندگی کرتے کرتے اس کے عادی ہو گئے ہیں
اور وہ بھول چکے ہیں کہ آزادی کا مزہ زبان پر کڑوا مگر حلق میں میٹھا ہوتا ہے
شاید وہ دعا کیلئے ہاتھ اٹھانا بھول چکے ہیں
ہاں یہ مذاق ان کے ساتھ جنگ نے کیا
اور ہم نے تمہارے پیاروں کو ڈھونڈا اور پایا مگر
ان کے لیے اپنی پہچان ہی گم ہو چکی ہے

"یوسف رالیے نہیں ہے کیا"؟ لیلیٰ نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔

"نہیں اور وہ آ بھی نہیں سکے گا۔ اقوام متحدہ کے باہر احتجاج کرنے والوں کے لئے اس کا نام بھی تجویز کیا گیا ہے اور وہ کل صبح ہی روانہ ہو گیا ہے"

"اوہ" لیلیٰ نے کہا "تو فی الحال ہم اس کا نام کاٹ دیتے ہیں مگر ازلیقہ کی نمائندگی کون کرے گا"
"مجھے ذرا سا وقت چاہیئے" اسی نوجوان نے کہا "کم از کم دو دن اور ذرا لے کا سکرپٹ تو میں کوشش کروں گا"
"ٹھیک" لیلیٰ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کاغذ پر کچھ لکھا "بہت سے لوگ غیر حاضر ہیں مگر خیر ابھی تو ایک ہفتہ باقی ہے۔ آخری گیت کے لیے تو بہرحال ریہرسل کی جا سکتی ہے" خالی جگہ پر ہو گئی۔ پیچھے سے نکل کر سب لڑکے اور لڑکیاں وہاں جمع ہو گئے۔ لیلیٰ نے اپنے لمبے سیاہ بالوں کو گلابی پوروں سے برابر کیا۔ الادل نے اپنا گٹار سنبھالا اور نہایت آہستگی سے نغمہ پڑھا پہلے صرف ساز کی آواز پھر لیلیٰ کی منجھی ہوئی اداس لے پھر دو اور پھر تین اور آخر میں سب نے مل کر گایا :

اے خدائے بحر و بر
اے خدائے خشک و تر
اے کائنات کے خالق اے دانا و بینا
پہاڑوں اور وادیوں پر تیری رحمت یکساں برستی ہے۔ امیر غریب تیرے بندے ہیں
ہمیں اپنی طاقت عطا کر اپنی محبت کی روشنی دے
تیری عطا ہماری دعا ہے
تیری یہ دنیا امن سے جگمگائے
ہمارے نوحے سن اور ان کو سازِ زندگی دے
ساز کو لے بخش اور نوا کو اثر دے نغمہ دے
اے خدائے بحر و بر۔ اے خدائے خشک و تر
تیری دنیا کے کناروں کناروں ہم سرگرداں ہیں
ہمارے اندھیروں کو دور کر ہمیں راہ دکھا
خونِ جگر کو قبول کر اور ہماری قربانیاں آسمان پر اٹھا
اے دانا و بینا زمین کی ساری پہنائیاں اور گہرائیاں جب تیری نگاہ میں ہیں
تو ہمیں دیکھ ہمارے درد دل کو سوز دے عطا دے
اے خدائے بحر و بر اے خدائے خشک و تر
تیری کائنات میں ہم بھی تیری طاقت ہیں تیرا نام لینے والے
ہواؤں اور بادلوں اور بجلیوں کی طرح ہمیں حوصلہ دے
بہنے والے پانی کی پُرشور لے اور زور ہمیں بھی بخش

ہمارے آنسوؤں کو قبول کر ہماری آوازوں کو سن
اکیلے پن میں تو ساتھ ہو اور ہماری طاقت ہو
اے خدائے کائنات اے خدائے عزوجل
اے خدائے مہربان اے خدائے خشک وتر

یہ ساز میں ملی آوازیں جیسے بلند ہوئی تھیں ویسے ہی دھیرے دھیرے کم ہوئیں گویا روشنیاں ایک کے بعد ایک بجھیں امنڈتے گرجتے دریا پرکشتیاں کنارے لگیں۔ محبت کا نغمہ ہر شے پر چھا جانے کے بعد زمین و آسمان کے درمیان وجد اور عرفان بن کر ڈولتا رہا اور ساز الاول کے ہاتھ میں ایک سسکی بھرنے والے کی طرح خاموش ہوگیا۔

"ہاں اے دنیا تیرے دیوانوں کی خیر"

کسی نے زور سے کہا۔ ہم نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا جہاں لمبے بالوں والا ایک نوجوان نہایت مضحکہ خیز لباس پہنے کتے کی زنجیر پکڑے کھڑا تھا اور وہ غرّا کر راستہ روکنے والا بڈھا چوکیدار اس کی پشت پر منتظر تھا۔

"فیاض میری واپس جاؤ" لیلیٰ نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا کہ "یہاں کتوں کا اور کتوں کے مالکوں کا داخلہ نہیں ہوسکتا۔"

"عجیب بات ہے یہ تم کہتی ہو" اس نے زیر لب کہا پھر ہم سب کی طرف غور سے دیکھا اور چوکیدار کو تقریباً دھکا دے کر باہر نکل گیا۔

"میں آپ سب سے شرمندہ ہوں" لیلیٰ نے کہا

"نہیں تم اپنا بھائی خود تو چننے پر قادر نہ تھیں" حسنات نے تسلی دی۔

شکیل نے بیجوں کو خالی جگہ پر رکھنا شروع کردیا اور محفل گویا برخاست ہوگئی۔

میں اور آفندی پچھلے سے اوپر گلی کے اندھیرے میں نکلے جہاں بادل ستاروں کے نیچے ہوا کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے تھے اور تنگ گلیاروں میں آندھی زخمی شیرنی کی طرح غرّاتی تھی۔

(جمیلہ ہاشمی کے زیر ترتیب ناول کا ایک باب)

بچھڑے کا گیت

مسعود اشعر

"یار۔ دیکھو تو ان حرام خوروں کو۔ کیسے ظالم ہیں سور کے بچے۔ اتنا بڑا درخت کاٹے ڈال رہے ہیں۔ کُتے کمینے کہتے ہیں ہائی ٹینشن پاور لائن ڈالنے کے لئے وہ درخت کاٹنا ضروری ہے۔"

اس کے سر پر لمبے لمبے کھچڑی بال اور بھی بکھر گئے تھے اور عینک کے موٹے شیشوں سے جھانکتی بڑی بڑی آنکھیں اور بھی بڑی ہو گئی تھیں۔ اور باہر ہواؤں نے سوکھے پتوں، ٹوٹی ٹہنیوں اور مردہ تنکوں کے ساتھ پرانے اخباروں اور نئی کتابوں کے پھٹے ورقوں کو بھی چکر پھیریاں دینا شروع کر دی تھیں۔

"درخت۔ ؟"۔ میں اس وقت کہیں اور تھا۔

"ہاں۔ درخت۔" اس کا غصہ اور بھی تیز ہو گیا۔ "میں نے درخت ہی کہا تھا۔ کوئی اور لفظ تو نہیں بولا تھا تمہیں کیا ہو گیا ہے؛ ان الو کے پٹھوں کی طرح تمہاری عقل بھی تو نہیں ماری گئی۔"

"یار۔ میں تو صرف پوچھ رہا تھا کہ کون سا درخت؟" مجھ سے ایک اور غلطی ہو گئی۔

"اچھا۔۔۔! تو تمہیں اب یہ بھی بتانا ہی پڑے گا کہ کون سا درخت۔؟! حرامزادے تمہیں نہیں معلوم میں کس درخت کا ذکر کر رہا ہوں؟ تم نہیں جانتے نہر کے کنارے کون سا سایہ دار درخت ہے؟"

وہ ٹھہر گیا۔ ہم میں سے ایک نے اپنا گلا صاف کیا تھا وہ یہ سمجھا کہ شاید وہ بھی بولنا چاہتا ہے حالانکہ اس شخص کا صرف یہ REFLEX ایکشن تھا کیونکہ غصے میں بولتے بولتے اس کا گلا بھرا سا گیا تھا۔

"میں نے کہا۔ اس درخت کو نہ کاٹو"۔ میں ہر ایک سے کہتا پھرا۔ "اس درخت کو قتل نہ کرو۔ یہ سایہ دیتا ہے۔ یہ ٹھنڈی ہوا لاتا ہے۔ تیز دھوپ سے بچاتا ہے اور پھر اس سے یہ بستی کتنی خوب صورت لگتی ہے۔ مگر وہ سب خالی خالی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے تھے۔ تمہاری طرح خالی کھوپڑی والے حرامزادے۔ جیسے میں کوئی اور زبان بول رہا ہوں۔ جیسے وہ میری زبان سمجھتے ہی نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔"

میں کھڑا ہو گیا اور دوسرے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ بھی پریشان تھا۔ اب ہمارا بولنا مناسب نہیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ دوسرے شخص کی آنکھوں نے میری تائید کی۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔

مگر اب جون بائیز بول رہی تھی۔ گلے میں گٹار ڈالے وہ اپنی پتلی پتلی انگلیاں تاروں پر مار رہی تھی۔ وہ گا رہی تھی۔

ڈونا ڈونا ڈونا۔۔۔۔۔ ڈونا۔۔۔۔۔۔

ڈونا ڈونا ڈونا ۔ ۔ ۔ ڈو ۔ ۔ ۔ نا
میں جانتی ہوں
بازار میں خریدنے کے لئے
گائے کا ایک بچھڑا ہے
سوگوار آنکھوں والا بچھڑا —— اور
اور آسمانوں کی بلندیوں میں
ابابیلیں اپنے پروں سے ہواؤں کو کاٹتی
اُڑی چلی جا رہی ہیں۔
ہوائیں قہقہے لگا رہی ہیں
زور زور سے ہنس رہی ہیں
وہ ہنستی رہتی ہیں۔
سارا سارا دن —— اور
گرمیوں کی آدھی آدھی رات تک
ڈونا ۔ ۔ ۔ ڈونا ۔ ۔ ۔ ۔ ڈونا

جون بائیز واشنگٹن کی سڑکوں پر پاگلوں کی طرح گھوم رہی تھی۔ اس نے ہزاروں کا مجمع لگایا تھا اور ہمارے سامنے اب ایک تصویر تھی۔ درخت کی تصویر اور اس بستی کی تصویر جس میں وہ درخت تھا اور جس کے ساتھ ٹھنڈے پانی کی نہر تھی۔ پھر اونچی اونچی سبز گھاس، راستے، بہت سے راستے۔ بستی کے اندر جاتے اور بستی کو باہر کی دنیا سے ملاتے راستے، مکان، دیواریں اور چھتیں، یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی۔

"دھوپ فطرت کا ننگا پن ہے اور کھلا میدان اس کا استعارہ" وہ پھر بول رہا تھا۔ "پھیلی چھتیں اور بے سہارا دیواریں اس ننگے پن کی شدت میں اضافہ کرتی ہیں۔ صرف درخت ہی ایک ایسا عنصر ہے جو ہماری بینائی کے ساتھ اس سارے منظر کی بھی حفاظت کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اور درخت کی گھنی شاخوں میں بیٹے کے جو بچے لٹک رہے ہیں ۔" ہم میں سے ایک نے اس پر رحم کھا کر اس کی تائید کی اور اسے سانس لینے کا موقع فراہم کیا۔ "بیٹے کے گھونسلے ۔ ان کا گھر ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو ——" وہ خاموش ہو گیا —— "درخت کی شاخیں بھی جانداروں کو پناہ دیتی ہیں۔ انہیں گھر مہیا کرتی ہیں اور وہ سالے، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درخت کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔ الو کے پٹھے، کتے کمینے ۔ ۔ ۔ ۔"

اب وہ اپنی کھینچی ہوئی تصویر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس پر پڑی خیالی گرد کو اپنے ہاتھوں سے صاف کر رہا تھا پھر اس نے آگے کو جھک کر اس پر پھونک ماری جیسے اسے پیار کر رہا ہو۔

" یہ سارا منظر بے معنی ہے، خالی، بالکل خالی۔ یہ درخت اس میں معنی پیدا کرتا ہے۔ اس کے خلا کو پُر کرتا ہے "۔۔۔ پھر وہ ہماری طرف مڑا لیکن اس طرح کہ اس کا دایاں ہاتھ تصویر پر ہی تھا ۔۔۔ " اب تم اس منظر میں اپنے آپ کو کھڑا کر کے دیکھو ۔۔۔"

وہ خاموش ہو گیا اور ہمیں اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس منظر سے واقعی ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے اور وہ اس سے ہمارا رشتہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں اس کا حصہ بنانا چاہتا ہے۔

میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

" اگر یہ درخت اس منظر میں نہ ہو تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا کہ تم اس میں اپنے آپ کو کہاں کھڑا کرو گے؟ یہ درخت تمہیں تمہارا مقام بتاتا ہے ۔۔۔ تمہیں مقام عطا کرتا ہے ۔۔۔۔"

" اچھی بات ہے۔" میرے منہ سے نکل گیا۔

" اچھی بات نہیں سچی بات ہے۔ پاور لائنیں تو پڑتی ہی رہتی ہیں اور اکھڑ بھی جاتی ہیں۔ درخت آسانی سے پیدا نہیں ہوتے۔ کئی نسلیں مل کر پانی دیتی ہیں اور دیکھ بھال کرتی ہیں جب کہیں جا کر ایک سایہ دار درخت بنتا ہے مگر ۔۔۔ وہ کمینے کتے کہاں سنتے ہیں۔ کہنے لگے۔ ہم کیا کریں جی، ہمیں تو یہی حکم ہے۔ میں نے کہا کس کا حکم ہے؟ کہنے لگے اُوپر سے حکم ہے۔ ہم مجبور ہیں۔ میں نے کہا کون ہے حکم دینے والا؟ کہنے لگے۔ وہ اوپر ہے جی اوپر ہمیں کیا پتہ کون ہے جی ۔۔۔۔"

" مگر یہ بھی تو دیکھو " میرے ذہن میں اس کی پہلی بات ہی آئی ہوئی تھی۔" جتنا زیادہ سایہ دار درخت ہوتا ہے۔ اس کے نیچے کی زمین اتنی ہی بنجر ہوتی ہے۔ کچھ بھی تو نہیں اُگتا سایہ کے نیچے ۔۔۔"

" کیا بک رہے ہو "۔ وہ غصے سے پلٹا۔" صرف اس لئے ایک بڑا سایہ دار درخت کاٹ ڈالا جائے کہ اس کے بعد وہاں گھاس پھوس اُگے گی؟ تمہاری کھوپڑی میں عقل بھی ہے یا یونہی بکواس کرتے رہتے ہو ۔۔۔"

" میں تو کہہ رہا تھا ۔۔۔" میں نے ڈرتے ڈرتے وضاحت کرنے کی کوشش کی مگر بات نہیں بن سکی اس لئے ٹھہر گیا۔

" کیا کہہ رہے تھے؟" مگر وہ چڑھ گیا تھا۔" بولو ۔۔۔ بکو نا کیا کہہ رہے تھے؟ ۔۔۔"

" یار تم میرے اوپر کیوں ناراض ہوتے ہو۔" مجھے بھی غصہ آگیا تھا "۔ میں تو نہیں کاٹ رہا ہوں وہ درخت۔"

" تم نہیں کاٹ رہے ہو تو وہ تمہارے ابا جان جو کاٹ رہے ہیں۔ وہ اپنی اماں کے خصم۔ وہ بھی تو تم میں سے ہی ہیں۔"

میں خاموشی سے اٹھ کر دروازے کی طرف چل دیا۔ بہت ہو گئی، اس سے زیادہ ہوئی تو پھر سنٹر ٹیبل اور شیشے کی ایش ٹرے کی شامت آ جائے گی۔

" کہاں جا رہے ہو ۔۔۔؟" وہ گرجا۔ پوری طاقت سے وہ بہن ۔۔۔ ۔۔۔ حرامزادے۔ جب عقل کی

بات کی جاتی ہے تو ناراض ہوجاتے ہیں۔ بڑے بنے پھرتے ہیں دماغ والے سالے۔ وہ حرامی بچے درخت کاٹ رہے ہیں تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ ہم ذرا سی بات کرتے ہیں تو مرچیں لگ جاتی ہیں ـــــ وہ غصے میں میری طرف بڑھ رہا تھا اور میں پیچھے ہٹ رہا تھا ـ" ادھر آؤ۔ یہاں آکر بیٹھو۔ دیکھو۔ اگر آج یہاں سے گئے تو پھر کبھی ادھر نہیں آسکوگے۔ بیٹھ جاؤ۔"

میں دروازے میں کھڑا تھا اور دوسرا شخص نظر جھکائے فرش پر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ جون بائمز اس تصویر کے ساتھ کھڑی تھی اور اپنی سوگوار آواز میں بین کر رہی تھی۔

روتے کیوں ہو۔
کسان نے کہا
کس نے کہا تھا تم گانے کا بچہ بنو،
ابابیل کی طرح تمہارے بھی پر کیوں نہیں ہیں ـــ کہ
تم بھی فخر سے سینہ پھیلائے
ہواؤں میں آزادانہ اڑتے پھرتے ـــ!
ہوائیں کیسے قہقہے لگا رہی ہیں۔
ہنس رہی ہیں زور زور سے
ڈونا ڈونا۔۔۔ ڈونا۔۔۔

"میں کارپوریشن گیا، میں نے کہا۔ بھائی، وہ درخت کیوں کاٹتے ہو؟ ـــ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ کہنے لگے یہ ہمارا محکمہ نہیں ہے، ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آگے جاؤ۔۔۔"

"آگے جاؤ۔۔۔؟" غصے کے باوجود میرے منہ سے نکل گیا۔

"ہاں۔ انہوں نے یہی کہا۔ جیسے میں ان سے بھیک مانگنے گیا تھا، مگر۔۔۔ میں ان سے بھیک ہی تو مانگنے گیا تھا۔ ایک درخت کی جان کی بھیک، اپنی جان کی بھیک، ساری بستی کی زندگی کی بھیک، مگر بھائی، اب تو شاید بھیک دینا بھی گناہ ہو گیا ہے۔۔۔۔؟"

"ہاں۔ یاد رلائی تو اسی طرح پڑتی ہے" ہم میں سے ایک نے کہا مگر اس نے شاید یہ بات نہیں سنی وہ بولے گیا۔

"درخت پناہ دیتے ہیں، انسان اور تمام جاندار اور ساری بستیاں درختوں کی پناہ میں ہوتی ہیں ـــــ"

"ہاں۔۔۔ مجھے یاد آیا۔۔۔" میں بولا۔ "درخت نے ہی تو حضرت زکریا کو پناہ دی تھی؟"

"مگر ان کمینوں کو یہ بات یاد نہیں۔" وہ اچھلا۔ یہ بات اسے اچھی لگی۔

"حضرت زکریا کو پناہ دی تھی۔ درخت نے،" میں نے پھر کہا۔ میں اسے خوش کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بات کے لئے مزید چند دلیلیں فراہم کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ خوش ہو گیا۔

اس نے ایک رات پہلے والے کاغذ کھلی الماری سے اٹھائے اور انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ ان کاغذوں پر بے شمار نقش اور گراف بنے ہوئے تھے۔ پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ پورا کھول کر کھلی ہتھیلی کاغذ کے ساتھ رکھی اور بہت غور سے دونوں کا مطالعہ کرنے لگا۔

ہم سب خاموش تھے حتیٰ کہ جون باٹیبز بھی۔ اس کا گٹار اس کے کاندھے سے لٹک رہا تھا۔ مگر وہ بھی خاموش تھا۔ جون باٹیبز کی ناک کی چونچ پر سرخ دھبے اور زیادہ لال ہو گئے تھے اور اس کے کھلے ہونٹوں سے اس کا ایک ٹیڑھا دانت نمایاں ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی نظریں اس کی طرف سے ہٹا لیں۔ اس وقت وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اپنے گندے کپڑوں اور گرد آلود پیروں کے ساتھ بہت اچھی لگ رہی تھی ۔۔۔ "

ویت نام میں پھر لڑائی چھڑ گئی ہے،، ہم میں سے ایک نے کہا۔ شاید وہ خاموشی توڑنا چاہتا تھا ۔۔۔" مگر اب کے حملہ مشرق کی طرف سے ہوا ہے۔ یا شمال کی طرف سے۔ وہ بھی اسے سبق سکھانا چاہتے ہیں۔"

"یہ تمہیں جون باٹیبز سے یاد آیا ہے؟"

"نہیں۔ جون باٹیبز۔ ویت نام کی وجہ سے یاد آئی ہے۔ یا پھر ۔۔۔۔۔،،

"دیکھو۔" وہ پھر بولا ۔" ان لائنوں کو غور سے دیکھو۔ ایک محدود رقبہ کو ایک لامحدود لکیر سے باندھا جا سکتا ہے۔ کیا سمجھے۔؟"

میں کچھ نہیں سمجھا۔ ہم میں سے کسی کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آئی۔ ہم خاموش رہے۔

"ایک ایسی چیز کو جس کی چاروں حدیں ہوں جب کسی لائن یا لکیر سے محصور کیا جائے گا تو وہ لکیر بھی محدود ہو جائے گی نا۔ کہیں نہ کہیں تو وہ لکیر ختم ہو گی۔؟"

"ہاں۔ خیال تو یہی ہے۔"

"مگر یہاں ایسا نہیں ہے۔ ایک ایسی لکیر جس کی کوئی حد۔ کوئی انتہا نہیں ہے ایک محدود چیز کو اپنے اندر بند کر لیتی ہے ۔۔۔۔ "

"جس کی کوئی انتہا نہیں ہے؟" مجھے نہ جانے کیوں شرارت سوجھی۔

"ہاں۔ جس کی کوئی انتہا نہیں ہے ۔۔۔۔ "

"یہ تو پھر شیولنگ والی بات ہوئی نا؟"

"بکواس نہیں کرتے کمینے۔ میں ایک علمی بات کر رہا ہوں۔"

"پھر دائرہ ہوا وہ جو گھومتا ہی جائے؟" ایک اور نے کہا۔

"یار ۔۔۔۔۔،، وہ جھنجلا گیا۔" تم لوگوں کی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ میں یہی تو کہتا ہوں ہمارے اندر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے ہم دماغ پر زور ڈالنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ پہلے سے جو بتا دیا

گیا ہے بس اسی کو کافی سمجھتے ہیں اور سر ہلاتے رہتے ہیں۔ اسی لئے تو ہمیں کوئی اچھی بات، یا کوئی خوب صورت چیز اچھی نہیں لگتی۔ ہمارے لئے سب سے زیادہ خوب صورتی اور سب سے بڑی مسرت کی بات کیا ہوتی ہے؟ بیویوں کے پیٹ پھلانا۔۔۔۔"

"کیا۔۔۔۔؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"بیوی کا پیٹ پھلانا۔ اور کیا۔"

"کس کی بیوی کا؟" دوسرے شخص نے سوال کیا اور میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ پاگل تو نہیں ہوگیا ہے!

"اپنی بیوی کا۔ اور۔۔۔۔۔ ۔ اور کس کی بیوی کا۔ ان سور کے بچوں میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ کسی اور طرف دیکھیں۔ ان کا سارا زور تو اپنی بیوی پر ہی چلتا ہے اور پھر اس کا بدلا وہ ہم سے لیتے ہیں۔۔۔۔۔"

"تمہیں پتہ ہے۔" میں نے مذاق کیا "عورت کا پیٹ پھولتا ہے تو اس کا سینہ بھی پھول جاتا ہے۔۔۔"

۔۔۔۔ ۔۔۔۔ حرامزادے۔ تمہارا بولنا بہت ضروری ہے۔ شرم نہیں آتی تمہیں ایسی بکواس کرتے۔" اسے سچ مچ غصہ آنے لگا تھا۔ وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "اب آپ تشریف لے جائیے۔ چلو اٹھو۔ نکلو یہاں سے۔ ہم سنجیدہ بات کر رہے ہیں اور یہ حرام خور غلاظت بک رہے ہیں۔"

اب میں پھر دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ وہ تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں درخت کا سایہ بستی پر طویل ہوتا جا رہا تھا اور جون بائیز کیپٹال ہل کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی

"سب حرام زادے الو کے پٹھے ہیں۔ انہوں نے مجھے ایک بہت اونچی عمارت کا پتہ بتا دیا کہ وہاں جاؤ وہی کچھ کر سکتے ہیں۔"

"اچھا ــــ؟"

"ہاں ۔۔۔ میں نے کہا پہلے یہ وعدہ کرو کہ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں تم درخت نہیں کاٹو گے۔ وہ سالے ہنس دیئے۔ میں نے کہا اس کا مطلب ہاں ہے یا نہیں؟ وہ مسکراتے رہے۔ میں نے سوچا۔ ان سے ہاں یا نہیں میں جواب لینے سے بہتر ہے کہ اس عمارت کی طرف ہی چلو۔۔۔ "

"اچھا۔۔۔۔ تو تم وہاں گئے؟"

"ہاں میں گیا۔ بتایا گیا تھا کہ سب سے اوپر والی منزل پر جانا پڑے گا۔ میں لفٹ کی طرف بھاگا کہ جلدی اوپر چلا جاؤں۔ مگر وہاں کوئی لفٹ بھی ٹھیک نہیں تھی۔ سب خراب تھیں۔ لوگ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا رہے تھے میں نے بھی جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں۔ مگر بہت سے لوگ میرے راستے میں تھے۔۔۔ "

"بہت لوگ تھے وہاں؟"

"ہاں بہت لوگ تھے۔ اور سب اوپر ہی جا رہے تھے۔

میں نے چلتے چلتے ایک آدمی سے پوچھا۔ یہ سب لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

میں نے سوچا۔ یہ سب بھی میری طرح اسی درخت کے لئے ہی اوپر جا رہے ہیں۔ مگر ان کی آنکھیں بجھی بجھی سی اور رفتار سست تھی۔ جیسے نہ جانے کب سے سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔ اور اب تھک گئے ہیں۔"

"اور وہ اوپر جا رہے تھے؟"

"ہاں بھئی۔ وہ اوپر ہی جا رہے تھے۔ میں نے ایک سیڑھی چھوڑ کر چڑھنا شروع کر دیا کہ کہیں میں بھی چڑھتے چڑھتے تھک نہ جاؤں۔ اور ان سے پیچھے رہ جاؤں۔ لیکن چند ہی سیڑھیاں چڑھ کر مجھے خیال آیا کہ اگر یہ سارے لوگ اس درخت کے لئے ہی اوپر جا رہے ہیں تو پھر وہ کون لوگ ہیں جو درخت کاٹنا چاہتے ہیں؟ یہ سوچ کر میری رفتار بھی سست پڑ گئی۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا۔ ۔ ۔ ۔؟ تو تمہاری رفتار بھی سست پڑ گئی؟"

"درخت کاٹنے کے خلاف احتجاج کرنے والے اتنے بہت سے لوگ تھے۔" اتنا بڑا سہارا تھا۔ پھر میں نے نیچے دیکھا اور جلدی سے نظریں اوپر کر لیں۔ نیچے بہت گہرائی تھی۔ اندھیرا غار۔ گویا ہم وہاں سے آ رہے تھے۔ میں ڈرا کہ کہیں پھر اس غار میں ہی نہ گر جاؤں۔ اس لئے میں نے آسمان کی طرف نظریں کر لیں کہ وہاں سے روشنی آ رہی تھی۔ پھر قدم بڑھاتے کہ ابھی یہ معلوم بھی کرنا تھا کہ کس سے ملنا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"یعنی۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کس سے ملنا ہے؟"

"کیسے معلوم ہوتا۔ وہ سب سالے تو اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔"

"اچھا ـــــ؟"

"میں سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے تھکنے سا لگا تو ایک جگہ ٹھہر کر ایک شخص سے پوچھا کہ ہم کس منزل پر ہیں۔ وہ شاید اوپر چڑھنے والوں میں سے نہیں تھا۔ کیونکہ آرام سے ایک سیڑھی پر بیٹھا سیٹی بجا رہا تھا۔ وہ میری بات سن کر ہنس دیا۔ ۔ ۔ ۔"

"ہنس دیا؟"

"ہاں ـــ وہ سالا ہنس دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہمارے پاس ہر سوال کا جواب ہنسی ہے۔ نہایت احمقوں اور جاہلوں والی ہنسی ـــــ"

"حرامزادے۔ جب کوئی بات نہیں سوجھتی تو ہنس دیتے ہیں۔ بلکہ ہر وقت ہنستے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اس طرح خوش نظر آتے ہیں۔ بہت مطمئن اور پُراعتماد۔ جیسے انہیں یقین ہے کہ وہ کامیاب ہو رہے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" ہم سب زور سے ہنس دیئے۔

"اب دیکھو تم کیسے ہنس رہے ہو۔ گدھوں کی طرح ـــ"۔

میں کہہ رہا ہوں وہ اتنا بڑا درخت کاٹ رہے ہیں۔ اور تم ہنس رہے ہو۔ کمینے کہیں کے۔ ۔ ۔ ۔"

"گدھوں کی طرح ـــــ؟"

"اور کیا۔ تم نے کبھی کسی گدھے کو افسردہ اور غمزدہ دیکھا ہے ؟"

وہ اٹھا اور غسل خانہ کی طرف چلا گیا۔ اب ہم تنہا تھے۔ اور باہر ہوا کا شور تھا۔ جون باعیز بھی کیپال ہل، بسلو نما ایلوتیوا اور لافیٹ پارک کے ہجوم میں کھو گئی تھی۔ چاروں طرف سے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ انسانی خون کی ارزانی کے خلاف احتجاج کرنے، وائٹ ہاؤس کی بدشکل عمارت کے گرد پہرہ اور بھی سخت ہو گیا تھا اور خاردار تاروں کی باڑھ اور اونچی کر دی گئی تھی۔

میں نے اس ہجوم میں اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور پھر لنکن میموریل کی طرف نکل گیا۔ میرے پاس گٹار نہیں تھا۔ اور نہ سوگوار آنکھوں والے بچھڑے کا گیت۔"

پھر میں نے پوری طاقت سے آواز لگائی۔ جو۔۔۔ ن۔ با۔۔۔ ئیز۔۔۔۔"

معلوم ہے ان لوگوں کو درخت کاٹتے دیکھ کر مجھے کیا یاد آتا ہے ؟"

"کیا یاد آتا ہے ؟"

"لکڑ بگا۔۔۔۔"

"لکڑ بگا ۔۔۔ ؟"

"ہاں ۔۔۔۔۔۔ "

"اچھا ۔ ہا ۔۔" اور ہم سب ہنسنے لگے۔ مگر اس نے اس ہنسی پر غور نہیں کیا۔

"اس کے منہ اور باچھوں سے خون ٹپکتا ہوتا ہے اور وہ ہنس رہا ہوتا ہے۔"

"اس کی آواز بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسے وہ قہقہے لگا رہا ہو۔" ہم میں سے ایک نے کہا۔

"انہیں دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے۔ ان کا منہ توڑ دوں۔ ان حرام خوروں کے منہ سے ان کا اپنا خون بھی تو نکلے۔"

وہ خاموش ہو گیا پھر تصویر دیکھنے لگا تھا۔

"تم اوپر جا رہے تھے اس سے ملنے۔ ؟" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں۔ میں گیا اوپر۔ بس وہاں۔ مگر ۔۔۔ وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔۔۔۔"

"کیا ۔۔ ؟ اوپر کوئی نہیں تھا ؟"

"ہاں ہاں ۔۔ اوپر بس ایک آری بیٹھا تھا۔ جو ہنس رہا تھا خود بخود اپنے آپ ہی۔ جیسے اس کے ہونٹوں پر کسی نے ہنسی کھود دی ہو کہنے لگا۔ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ میں نے کہا یہ سب سے اوپر کی منزل نہیں ہے ؟ کہنے لگا۔ ہاں یہ اوپر کی منزل ہے میں نے کہا پھر یہاں کون ہے ؟ کہنے لگا یہ تو خالی ہے۔۔۔۔"

"اچھا ۔۔ اوپر کی منزل خالی ہے ؟"

"ہاں ۔۔۔"

"جبھی تو وہ اتنا بڑا درخت کاٹ رہے ہیں !!!"

"ہوں ؟" اب وہ دیوار سے بیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ہم سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"اب کیا ہوگا ؟"

یہ سوال اس نے ہم سے نہیں کیا تھا۔ سوال جون بائیز سے کیا تھا۔ جو اپنے گلے میں گٹار لٹکائے پھر نمودار ہو گئی تھی۔ کیپٹال ہل، لنکن میموریل اور پنسلونیا ایونیو میں جمع ہونے والا مجمع اب کہیں اور اکٹھا ہو رہا تھا۔ اور جون بائیز کی آواز گونج رہی تھی۔

بچھڑے، کس آسانی سے پکڑ کر
ذبح کر دیئے جاتے ہیں۔
بغیر کوئی وجہ بتائے۔ کہ کیوں،
گائے کے بچے اپنی آزادی کی حفاظت
نہیں کر سکتے۔
وہ اپنے جسم پر ابابیل کے پر نہیں اگا سکتے۔
کہ آزادی سے اڑتے پھریں۔
ہوائیں قہقہے لگا رہی ہیں۔
ہنس رہی ہیں زور زور سے
ڈونا ڈونا ڈونا۔۔۔۔۔

"اس سالی کو ابھی تک یہ پتہ نہیں چلا کہ گائے کے بچے کیوں ذبح کر دیئے جاتے ہیں !" وہ جیسے سوتے سے جاگ گیا تھا۔ اب وہ ایک نئی آواز میں بول رہا تھا۔" اس لئے تو اس کے گلے میں ابھی تک گٹار لٹک رہا ہے۔ اور وہ کمینے حرام خور لکڑ بگھے، باچھوں سے خون ٹپکاتے ہنس رہے ہیں۔ قہقہے لگا رہے ہیں۔ وہ ۔۔۔۔ ۔۔۔ اتنا بڑا درخت کاٹ رہے ہیں ۔ ۔ ۔"

"مگر تم نے ایک اور بات پر بھی غور کیا ۔"
ہم میں سے ایک نے کہا۔

"ہوں ؟"

"جس درخت کے تنے میں حضرت زکریا نے پناہ لی تھی اسے بھی انہوں نے کاٹ دیا تھا۔ ۔ ۔"

"کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"۔ وہ یکلخت دہاڑا۔

"کیا بک رہے ہو تم ۔ ۔ ۔ ؟"

"ہاں۔ ان ظالموں نے آرے سے وہ تنا بھی کاٹ ڈالا تھا۔۔۔۔"

وہ یک دم چیتے کی طرح اچھلا اور دونوں ہاتھوں سے اس شخص کی گردن دبوچ لی ــ "حرام زادے ــ ۔۔۔۔ ۔۔۔۔کُتے کمینے۔ سُور کے بچے۔ نکل جاؤ یہاں سے ۔۔۔۔۔۔۔ فوراً چلے جاؤ یہاں سے ۔۔۔۔۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں کسی مادر ۔۔۔۔۔۔ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ تم سب چلے جاؤ۔ جاؤ۔۔۔۔۔۔۔"

مائی فُٹ

محمد منشا یاد

اگلے روز ہمیں واپس جانا تھا۔ اس لئے میں اس کے اصرار پر اُسے شام کو گھمانے لے گیا مگر دل میں شرمندہ ہو رہا تھا اُسے کہاں لے جاؤں؟ کیا دکھاؤں؟ ۔ اس نے میرے بچپن کے گاؤں کی خوبصورت اور رومانی باتیں میرے افسانوں میں پڑھی تھیں اور شاید تصوّر میں بھی بسا رکھی تھیں مجھے لگتا تھا جیسے اس کی خوبصورت آنکھیں ہر جگہ میرا بچپن تلاش کر رہی تھیں مگر ننگ دھڑنگ اور میلے کچیلے بچوں کو گلیوں میں بھاگتے دوڑتے اور جوہڑوں میں چھلانگیں لگاتے دیکھ کر مجھے خفت ہو رہی تھی اور اپنی بے پردگی کے احساس کی دھول سے میرا حلق بند ہو رہا تھا۔

گاؤں اب میرے خیال میں بہت بدل گیا تھا۔

گاؤں سے ملحقہ زمین میں سیم اور تھور کا کوڑھ دور تک پھیل گیا تھا گاؤں کا وہ اکلوتا باغ جہاں ہم آنکھ مچولی کھیلتے، جھولے جھولتے اور زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے تھے اجڑ چکا تھا۔ برگد کے نیچے جہاں دوپہروں کو محفلیں جمتی تھیں اور ہیر اور سیف الملوک گائی جاتی تھیں اب وہاں بھینسیں بندھی تھیں اور گوبر کا تعفن پھیلا ہوا تھا وہ میدان جہاں کبڈی اور کشتی کے مقابلے ہوتے تھے اور فصلوں کی کٹائی کے دنوں میں جہاں رہس دھاریئے سوانگ رچاتے اور کٹھ پتلیوں کے ناچ دکھاتے تھے۔ ایک غلیظ تالاب کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ آٹا پیسنے کی چکی کے گھگھو کی ٹوہ ٹوہ، کتوں کے بھونکنے، بلیوں کے لڑنے اور مویشیوں کے ڈکرانے کی آوازوں سے مل کر عجیب وحشت سی پھیلاتی رہتی۔ وہ نازونعم میں پلی مہذّب معاشروں میں رہ کر آئی تھی۔ میں اسے اپنا گاؤں دکھانے لایا تھا مگر اب اس کی موجودگی میں مجھے اپنا گاؤں اور بھی پسماندہ لگ رہا تھا۔ ویسے بھی موجودہ گاؤں میرے بچپن کے گاؤں سے اس قدر مختلف تھا کہ خود مجھے لگ رہا تھا میں کسی اجنبی جگہ پہ آگیا ہوں۔ لوگوں میں پہلی سی محبت نہیں رہی تھی ایک دوسرے کی۔ بجائے اب وہ شہر کے لوگوں کی طرح روپے پیسے سے محبت کرنے لگے تھے۔ غالباً اس نے میری پریشانی بھانپ لی تھی کہنے لگی۔

"یہ گاؤں بہت اچھا ہے میرے خیال میں لوگ اب زیادہ حقیقت پسند ہوتے جا رہے ہیں۔ موجودہ بحرانی دور کے بطن سے جلد ہی ایک نئے عہد کا آغاز ہوگا۔"

"خاک ہوگا" میں نے کہا "یہ سرد مہری تو ہمارا اجتماعی رویّہ بن چکی ہے ہم سب میلے پہ آئے ہوئے لوگ ہیں

ایک بے فکری قوم۔ آتش فشانوں کے دہانوں پر بیٹھ کر چین کی بانسری بجانے والے لوگ۔ اور یہ چھوٹا سا گاؤں بھی ہمارے اسی مجموعی رویے کا ایک حصہ ہے۔ تم دیکھ نہیں رہی ہو ہر شخص دوسرے سے کیسے الگ تھلگ سا ہے۔ ترقی یافتہ شہروں کی مشینی بے مروتی اور بے سکونی کا دھواں اور آپا دھاپی کی آنچ یہاں بھی پہنچ گئی ہے۔"

کہنے لگی " کچھ بھی ہو یہاں کی فضا میں مجھے آزادی اور وسعت کا احساس ہوا ہے ورنہ پچھلے کئی ماہ سے اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی اپنے ہونے نہ ہونے کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ میں تو یہاں آکر زمین و آسمان سے نئے رشتے استوار کر رہی ہوں۔"

اس کی ایسی ہی باتوں سے میری ڈھارس بندھی اور خفت کا احساس کم ہوا مگر اسی شام ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔

جب ہم گھر لوٹ رہے تھے گلی میں بسرانند سے ملاقات ہو گئی۔ گاؤں میں اسی کا ایک تانگہ تھا جو سواری ملنے کی صورت میں جوتا جاتا تھا۔ ہم نے اسے دو ایک روز پہلے ہی اپنے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ وہ جمعہ کی صبح کو کہیں اِدھر اُدھر نہ جائے اور ہمیں پکی سڑک پر بسوں کے اڈے پر پہنچا آئے۔ اسے اپنا منتظر پا کر ہمیں خیال آیا کہ وہ صبح کے پروگرام کے بارے میں اطمینان کرنے آیا ہو گا مگر اس نے ہمیں کوئی متبادل انتظام کرنے کا مشورہ دے کر پریشان کر دیا۔

"کیوں کیا ہوا۔ کیا گھوڑا بیمار ہو گیا؟"

"نہیں جی"۔ وہ کہنے لگا " ابھی ابھی چودھری حق نواز کا پیغام ملا ہے کہ صبح انہیں تحصیل جانا ہے۔"

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں" میں نے کہا " تم انہیں بھی ساتھ لے لینا"

"نہیں جی" وہ بولا " وہ بڑے آدمی ہیں سواریوں والے تانگے میں نہیں بیٹھیں گے"

"کیا ان کا قد بہت زیادہ ہے" وہ بولی " اور کیا ہم تمہیں بونے نظر آتے ہیں"

بسرانند نے خوفزدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا پھر بولا

" ان کے لئے ہمیشہ سالم تانگہ جاتا ہے"

" اگر ایسی بات ہے" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی " تو ہم نے تمہیں پہلے سے کہہ رکھا ہے۔ تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہو گا"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ شہر نہیں ہے جہاں سواریوں اور سیٹوں کی ریزرویشن اور ایڈوانس بکنگ ہو جاتی ہے یہ گاؤں ہے اور چودھری حق نواز اس کے دو تہائی حصے کا مالک ہے اور بسرانند اس کی حکم عدولی نہیں کر سکتا مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی کہنے لگی۔

" آپ خود چودھری سے بات کریں اور بتائیں کہ ہمارا پہنچنا ضروری ہے اور ہم نے تانگہ بک کر رکھا ہے"

"وہ بے حد مغرور اور اجڈ آدمی ہے۔ اسے اپنی ہتک سمجھے گا اور برا منائے گا"

"تو کیا آپ اس سے ڈرتے ہیں" وہ چمک کر بولی " میں خود اس سے بات کر سکتی ہوں"

"یہ مناسب نہیں ہوگا" میں نے کہا

"بی بی جی ۔ عزت دار آدمی کو ڈرنا ہی پڑتا ہے" پیراندتہ نے کہا

"کمال ہے" وہ غصے سے بولی " آدمی آدمی سے ڈرے ۔ کیسی عجیب بات ہے"

"سبھی آدمی ۔ آدمی نہیں ہوتے" میں نے اسے سمجھایا "آدمیوں کے روپ میں راکشش بھی ہوتے ہیں اور بعض اوقات اژدہے بھی انسانوں کی جون بدل لیتے ہیں بہر حال تم کسی فلمی کہانی کی ہیروئن نہ بنو اور پریشان نہ ہو۔ کوئی دوسرا انتظام ہو جائے گا"

"لیکن یہ ایک غلط اور اصول کے خلاف بات ہے"

"ہاں ہے ۔ لیکن بہت سی غیر اصولی باتیں ہمارے ارد گرد ہر لمحے ہوتی رہتی ہیں اور ہم چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ انسان بعض معاملات میں بے بس ہوتا ہے مگر تم اس معمولی سی بات پر جی ہلکا نہ کرو"

"عجیب بات ہے کہ ایک شخص دوسروں کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتا محض اس لئے کہ کاغذوں میں اس کی ضرورت سے زیادہ اراضی اس کے نام لکھی ہوئی ہے مگر اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کس دور میں رہتا ہے"

"وہ اپنے علاقے میں صاحب اقتدار ہے اور اپنے عہد میں رہتا ہے اس وقت میں اور تم بھی چودھری حق نواز کے عہد میں سانس لے رہے ہیں"

"میں جانتی ہوں۔ یہ لوگ اسی لئے دیہات کو پسماندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ سکول نہیں بنانے دیتے سڑکیں نہیں بننے دیتے۔ پکی سڑک کے ساتھ علم و آگہی کی روشنی پھیلتی ہے جس میں ان کے اصلی چہرے بے نقاب ہونے ہیں"

وہ دیر تک بولتی رہی اور میں چپ چاپ سنتا رہا مجھے معلوم تھا کہ اسے کلاس لئے ہوئے کئی روز ہو گئے ہیں۔ پیراندتہ چلا گیا تو میں اسے تسلی دیتا ہوا گھر سے آیا مجھے ڈر تھا کہ وہ رات بھر گھر والوں کا سفر چاٹتی رہے گی مگر تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پیراندتہ پھر آ گیا۔ کہنے لگا۔

"اجازت مل گئی ہے جی"

"وہ کیسے"؟

"میں نے انہیں بتایا کہ آجکل سڑک بہت خراب ہے جابجا گڑھے پڑے ہوئے ہیں اور گرد و غبار سے بڑے خراب ہو جاتے ہیں"

"پھر!"

"پھر انہوں نے کالو کو بلا کر صبح سویرے گھوڑے پر زین ڈالنے کا حکم دے دیا"

"کون سے گھوڑے پر!" وہ چونک کر بولی

"اپنے مشکی گھوڑے پر ۔ بڑی اچھی نسل کا ہے" پیراندتہ نے جواب دیا

میں نے پیرانند نہ کا شکریہ ادا کیا اور اسے صبح تانگہ لانے کی تاکید کر کے رخصت کر دیا مگر اس کے ماتھے پہ ابھی تک بل پڑے ہوئے تھے کہنے لگی۔

"وہ سواریوں والے تانگے میں نہیں بیٹھتا۔ ہونہہ ۔ ڈرٹی ارسٹوکریٹک اپٹ چوڈ"

میں نے اس کے کان میں کہا" اب غصہ تھوک دو۔ اس بے چارے نے تمہیں دیکھا نہیں ہے ورنہ سواریوں والے تانگے میں بیٹھنے کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا۔"

اس کا سارا غصہ کافور ہو گیا وہ مسکرانے لگی" مائی نٹ!"

اگلی صبح جب ہم تانگے میں سوار ہو کر تھوڑی دور پہنچے تو ہم نے دیکھا۔ سڑک پر چودھری حق نواز اپنے گھوڑے پہ سوار کلف دار طرۂ لہراتا بڑی شان سے آگے آگے جا رہا تھا۔ گھوڑے کے سموں سے اٹھنے والی گرد سے بے نیاز اس کا ملازم کالو پیچھے پیچھے بھاگتا جا رہا تھا جگہ جگہ ۔ راستہ چلتے اور کھیتوں میں کام کرتے لوگ اسے سلام کرتے۔ خیریت دریافت کرتے اور دعائیں دیتے۔ سورج نکلتے ہی خونخوار دھوپ چاروں طرف پھیل گئی تھی اور آنے والی تکہ دوپہر کے خوف سے چرند پرند سہمے ہوئے تھے۔ ہم دھوپ تیز ہونے سے پہلے اڈے پر پہنچ جانا چاہتے تھے مگر پیرانند نہ نے تانگے کی رفتار کم کر دی تھی۔ وہ چودھری سے آگے نکلنے کی گستاخی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کالو کو گھوڑے کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر ہمیں ترس آ رہا تھا مگر ہم چودھری کے کسی معاملے میں دخل دینا نہیں چاہتے تھے لیکن شکیلہ کے کہنے پہ پیرانند نہ نے کالو کو تانگے میں سوار ہونے کی آواز دے دی۔ چودھری نے مڑ کر خشمگیں نگاہوں سے تانگے کی طرف دیکھا پھر کالو کو تانگے میں سوار ہونے کی اجازت دے دی۔

نہر کے آخری پل پہ چودھری کسی راہگیر کے پاس رک کر باتیں کرنے لگا تو ہم رسمی علیک سلیک کے بعد اس کے قریب سے گزر گئے۔ وہ بولی

"دیکھنے میں تو خاصا مہذب اور باوقار لگتا ہے"

میں نے کالو کی موجودگی کا احساس دلا کر اسے خاموش رہنے کا مشورہ دیا تو وہ چپ ہو گئی مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ اندر ہی اندر کلاس لے رہی تھی۔

اڈے پر خلاف معمول بے حد رش تھا۔

تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد بس آتی مگر رکے بغیر نکل جاتی تھی۔ لوگ گرمی سے بے حال ہو رہے تھے اور ہر شخص جلد از جلد سوار ہو کر منزل پہ پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اب چودھری حق نواز بھی اڈے پہ پہنچ گیا تھا اور گھوڑے کی لگام کالو کے ہاتھ میں تھما کر بس کا انتظار کرنے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا تھا۔

کافی دیر کے اکتا دینے والے طویل انتظار کے بعد ایک بس آ کر رکی۔ سارے ہجوم نے ایک ساتھ ہلہ بول دیا۔ مگر کنڈکٹر نے سب کو پیچھے دھکیل دیا اور صرف دور کی سواریوں کو سوار ہونے کی اجازت دی۔ خوش قسمتی سے ہمیں دور جانا تھا اس لئے ہمیں سوار کرا لیا گیا اور نسبتاً قریب کی سواریاں جن میں چودھری حق نواز بھی شامل تھا

دروازے سے چمٹی چیختی، چلاتی اور منت سماجت کرتی رہیں۔ لوگ بار بار اندر گھسنے کی کوشش کرتے اور کنڈکٹر انہیں دھکے دے کر سوار ہونے سے روکتا رہا۔ اس دھکم پیل میں چودھری حق نواز کی طرے دار دستار سر سے اتر کر نیچے گر گئی اور گرد سے اٹ گئی۔ اس نے جلدی سے اسے اٹھایا اور جھاڑ پونچھ کر دوبارہ پہن لیا اور بس کے دروازے کی طرف لپکا۔

جب کنڈکٹر کو یقین ہو گیا کہ دور کی سب سواریاں سیٹوں پر بیٹھ گئی ہیں تو اس نے دوسری سواریوں کو بھی اندر آنے اور کھڑے ہو کر سفر کرنے کی اجازت دے دی۔

بس روانہ ہوئی تو میں نے دیکھا چودھری حق نواز نے اپنی دستار دونوں ہاتھوں سے تھامی ہوئی تھی اور دور اور نزدیک کی عام سواریوں کے درمیان پھنسا ہوا نیم ایستادہ تھا۔

اور شکیلہ کے گلاب ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کی چمک تھی!!

آدمی دریا

نجم الحسن رضوی

میں کیسے کہوں سائیں!

میں تو حکم کا بندہ ہوں۔ میرا باپ اور میرے باپ کا باپ سب حکم کے غلام تھے۔ ان کے ہاتھ اور پاؤں رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا اور اپنے باپ کے ساتھ سرخ بادبانی کشتی پہ اندھیرے جنگلوں سے لکڑیاں لانے جاتا تھا تب کبھی میرا باپ اس موضوع پہ زبان کھولتا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ اس کے بدن کے سیاہ کھنڈر میں بخار کی لو چلتی رہتی مگر وہ کشتی کے بادبان ٹھیک کئے جاتا اور پانی میں بھیگے رسوں کو اپنے بدن کے گرد لپیٹے جاتا۔ ہمیں کنارے تک جلدی پہنچنا ہے بیٹے یہ رئیس کا حکم ہے! اس وقت مجھے پتہ نہیں تھا کہ رئیس کون ہے اور وہ حکم کیسے دیتا ہے؛ میرا خیال تھا کہ وہ آگ کی بنی ہوئی کوئی مخلوق ہے جس کے ہاتھ میں آتشیں گرز تھا ہوگا لیکن جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو سخت مایوسی ہوئی، وہ تو ہم سب کی طرح چار ہاتھ پاؤں والا ایک آدمی تھا فرق صرف اتنا تھا کہ اس کا بدن میرے آبا کے بدن کی طرح سیاہ نہیں تھا اور اس کے سر پہ بڑی سی ریشمی پگڑی تھی اور ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی، جس کے سرخ نگینے سے چنگاریاں اڑتی تھیں۔ جب میں پہلی بار اس کے سامنے گیا تو مونچھ کا سبزہ سا رینگ کر میرے بالائی ہونٹ تک پہنچ چکا تھا اور بدن میں آتی جوانی کا سرخ بارماں تنا ہوا تھا رئیس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دلچسپی سے دیکھا اور میرے باپ سے مسکرا کے بولا بڑا اچھا دریہ ہے تمہاری جوانی کی غلطی، خوب ہے۔ تو سو اب یہ ہماری تحویل میں رہے گا اور ہمارے لیے کام کرے گا، تم اپنی کشتی چلاؤ یہ ہماری کشتی چلائے گا!

میرا باپ تو اس قدر خوش ہوا کہ اس نے مجھے کپڑوں کی گٹھڑی تھما کے فوراً ہی رئیس کی خدمت میں حاضری کا حکم دیا مگر میں نے پوچھا: میں تو پانی کا پرندہ ہوں، خشکی پہ کیسے گزر ہوگی؟ کشتی سے بچھڑنا مجھے پسند نہیں!

میرے باپ نے کہا" سو ہماری کوئی مرضی نہیں ہے دراصل یہ رئیس کے دیئے ہوئے پر ہیں جن سے تم اڑتے ہو، اب چونکہ اس نے تمہیں پسند کیا ہے اس لیے تمہیں اس کے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، مجھے یاد ہے کہ بڑے رئیس کی بھی یہی عادت تھی وہ جسے چاہتے اپنی خدمت میں طلب فرماتے اور جسے چاہتے دھتکار دیتے، بیٹے ہم سوال کرنے کے لیے نہیں جواب دینے کے لیے پیدا ہوئے ہیں!"

تو جب میں پسند کیا گیا اور رئیس کی خدمت میں حاضر ہوا تو یہ عقدہ کھلا کہ رئیس کا تو کام ہی پسند کرنا ہے۔ رئیس تو دریا تھا اور وہ ساری بستی کو سیراب کر رہا تھا۔

حویلی میں آنکھ کو حیران کرنے کے لیے بہت کچھ تھا، کمروں اور کوٹھڑیوں کی بھیڑ بھاڑ، منقش چھتیں، روغنی دروازے، تہہ خانے اور اندھیری غلام گردشیں جن میں رئیس کے منہ سے نکلے ہوئے لفظ سے روشنی ہوتی تھی۔ مجھے پانی کا پہریدار مقرر کیا گیا تھا۔ رئیس نے کہا، تمہارا کام یہ ہوگا کہ پانی کا دھیان رکھو۔ کھیتیوں کو سوکھنے نہ دو اور ندی کو سرکش مت ہونے دو!

مجھے پتہ تھا کہ ندی کو قابو میں رکھنا کیوں ضروری تھا۔ وہ جو حضرت سخی شاہ سبز پوش کا مزار تھا، عین دریا کے کنارے تو اس میں رئیسوں کا قبرستان بھی تھا۔ پتہ نہیں سبز پوش کا مزار دریا کے کنارے کیسے پہنچا۔ کہتے ہیں کہ پہلے تو دریا خاصا دور تھا مگر پھر وہ سبز پوش کی قدم بوسی کے لیے تڑپنے لگا۔ سیلاب کے دنوں میں دریا کا اضطراب دیکھنے کے قابل ہوتا۔ بالکل یوں لگتا جیسے وہ مزار کی دیوار پھلانگ کے سبز پوش کی قبر کے کنارے اب پہنچا کہ تب پہنچا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ان لوگوں کا جنہوں نے مل جل کے دریا کے کنارے ایک بند باندھ دیا تھا، مٹی کا اونچا سا بند، گویا دریا کو پا بہ زنجیر کر دیا گیا تھا۔ تو مجھے پتہ تھا کہ سبز پوش کے مزار کو پانی کے حملے سے محفوظ رکھنا ضروری تھا۔ سبز پوش رئیسوں کے جدِ امجد تھے اور ان کے نیک قدم یہاں آئے تھے تو یہ بستی آباد ہوئی تھی۔ تو جناب میں اپنا کام کرتا رہا اور رئیس اپنا، ہر سال جب بیگاری بنے سے پہرے حضرت سخی شاہ سبز پوش کے ہرے گنبد والے مزار پہ عرس کا ہنگامہ برپا ہوتا، بستی سے چراغوں کی برات گذرتی اور سبز پوش کے مزار پہ عقیدت مندوں کا ہجوم ہوتا، سبیلیں لگتیں اور ہا ؤ ہو کا شور مچتا تب رئیس کی سواری آتی اور وہ سینکڑوں لوگوں کے مجمع میں سبز پوش کے مزارِ اقدس پہ سنہرے تاروں سے کڑھی ہوئی سبز مخملیں چادر چڑھاتے اور بڑے علم کا پھریرا بدلتے۔ رئیس کی پگڑی کا شملہ دور سے جھلملاتا رہتا اور لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کے اسے دعائیں دیتے۔ رئیس اپنے بزرگوں کا نام روشن کر رہا تھا، وہ سارے بزرگ اور رئیس ابن رئیس، جو سبز پوش کے احاطے میں مدفون تھے۔ رئیس بڑی خوبی سے اپنا کردار نبھا رہا تھا۔ بے شک دریاؤں سے نہریں نکلتی ہیں اور زمینوں کو سیراب کرتی ہیں۔ ان سے تو دریاؤں کی نسل آگے بڑھتی ہے۔

حویلی میں دیواریں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھیں، ایک دیوار کے پیچھے دوسری دیوار اور اس کے عقب میں ایک اور دیوار! اور رئیس نے کہا تھا؛ دیواروں کا احترام تم پر فرض ہے اور جب تک تمہیں اس کا حکم نہ دیا جائے۔ انہیں کبھی پھلانگنے کی کوشش نہ کرنا! سو میں نے ہمیشہ دیواروں کا احترام کیا۔ دیواریں اونچی تھیں۔ کبھی کبھی دروازے بھی اندھے ملتے اور روشنیاں مدھم۔ ایسے میں غلام گردشوں میں سناٹا ہی اعلان کرتا پھرتا کہ کوئی آگے نہ جائے۔ رئیس محوِ خواب ہے۔ ایک بار جب میں حاضر تھا، رئیس نے کہا، میں تو جاگتے میں بھی خواب دیکھتا ہوں، مجھے دھیمی روشنیاں پسند ہیں اور موم بتیاں! وہ کہتا تھا، موم کا بدن پگھلتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے، موم کا اجلا بدن! موم بتیوں کے مدھم اجالے میں اس کی خواب گاہ میں لگی ہوئی تصویریں بڑی پراسرار لگتیں اور تصویریں بھی ایسی کہ آدمی

خود تصویر بن جائے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں دور ہی دور سے موم کے اُجلے بدن کو اپنی آنکھوں سے کتر رہا تھا کہ رئیس نے عین موقع پر پکڑ لیا، بولا، نہیں اچھی لگیں یہ تصویریں، یہ تصویر نہیں عورتیں ہیں عورتیں، ذرا غور سے دیکھو، میں شرمایا تو وہ ہنس کے بولا، ابھی تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا، جا اپنا کام کر!

تو میں اپنا کام کرتا رہا اور دریا بہتا رہا۔ بند کے پیچھے ایک خشک نہر تھی جس کے سرے پر آہنی دروازے تھے اگر بڑے بند کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا تو ان کے ذریعے پانی کا رُخ نہر کی طرف موڑا جا سکتا تھا اور یہ رئیسوں کے قبرستان کو محفوظ رکھنے کی ایک شکل تھی۔

ایک دن میں رئیس کی خدمت میں گیا تو دروازے اندھے تھے اور دیواریں چپ۔ میں اُلٹے قدموں واپس ہونے کو تھا کہ غلام گردش میں ایک تصویر ٹنگی نظر آئی۔ وہاں اچھا خاصا اندھیرا تھا لیکن میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ میں نے کہا، واہ رے رئیس کا شوق، اب تو غلام گردشوں میں بھی تصویریں ٹنگنے لگی ہیں۔ ویسے خوب تصویر تھی۔ میں اسے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا کہ وہ ہنس پڑی۔ بولی "کیسے آدمی ہو تم عورت اور تصویر میں تمیز نہیں کر سکتے؟"

میں نے کہا "کمال ہے تم اگر بول نہ پڑتیں تو میں تمہیں تصویر ہی سمجھتا، دراصل میں نے پہلے کبھی اتنے قریب سے کوئی تصویر دیکھی ہے نہ عورت!

وہ ہنس کے بولی "کچھ یقین نہیں آتا کہ رئیس کا خاص ملازم اور — !"

میں نے کہا۔ "میں تو بس ملازم ہوں، تصویروں کا شوق تو رئیس کو ہے!"

وہ بولی۔ "اچھا تو اب دیکھ لو" تاکہ تمہیں پتہ چلے کہ دریا سے باہر بھی کچھ چیزیں دیکھنے کی ہیں!

میں نے پوچھا۔ "تم تو ایسا کہہ رہی ہو جیسے مجھے جانتی ہو!"

اس نے جواب دیا۔ "میں تمہیں جاننا چاہتی ہوں!"

اور مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ مجھے کیوں جاننا چاہتی تھی۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ "تم دریا کا بہت ذکر کرتے ہو، بتاؤ تمہیں دریا کیوں پسند ہے؟"

میں نے کہا۔ "اس لیے کہ وہ اپنی مرضی کا مختار ہوتا ہے، آزاد اور سدا کا سیلانی!"

"بس —؟" وہ بولی۔

میں نے کہا۔ "بس اور کیا!"

اس نے کہا۔ "دریا مجھے بھی پسند ہے مگر اس لیے کہ اس میں طغیانی ہوتی ہے، تند و تیز اور ہلاکت خیز، اور تم بھی دریا ہو!"

میں ہنس پڑا۔ "میں اور دریا! کیسی باتیں کرتی ہو، دریا تو رئیس ہے، طاقتور اور سخی!"

ایک دن جو میں بند کی طرف گیا تو دیکھا کہ دریا کا اژدہا پھنکاریں مار رہا ہے۔ میں نے آ کے رئیس کو بتایا تو اس نے غضبناک ہو کے کہا۔ "اسے ہر صورت میں قابو میں رکھو اور اگر خطرے کی بات ہو تو سوکھی نہر کھول دینا!"

وہ مجھے ملی تو کہنے لگی ۔ دریا میں طغیانی آ گئی ہے، اف وہ کس قدر اچھا منظر ہو گا جب دریا اپنی کھردری زبان سے زمین کو چاٹتا ہے تو ۔۔۔!'

میں نے کہا ۔ 'تم اگر طغیانی دیکھنا چاہتی ہو تو میرے ساتھ چلو ۔۔!'

اس کی آنکھیں چمک سے اچانک بجھ گئیں ۔ 'کاش میں تمہارے ساتھ جا سکتی کاش ۔۔۔!'

میں نے پوچھا ۔ 'کیوں اس میں کیا حرج ہے؟'

اس نے کہا، 'تمہیں رئیس نے حکم دیا ہے کہ دریا کو قابو میں رکھو اور مجھ سے کہا ہے کہ اس کے پاس نہ جانا، ہم دونوں اس کے ملازم ہیں!'

میں نے کہا۔ 'اگر تم کہو تو میں رئیس سے اجازت لے لوں، وہ میرے اوپر بہت مہربان ہے!'

وہ اداسی سے مسکرائی، بولی ۔ 'وہ میرے اوپر بھی بہت مہربان ہے لیکن میں اس کی مہربانیوں کو بپھرتے دریا میں غرق کر دینا چاہتی ہوں، تمہیں کیا پتہ میں ان سب چیزوں سے کس قدر اکتا گئی ہوں، اندھے دروازے، سنہری روشنیاں اور آنکھوں کے حریص بھونرے!'

میں نے پوچھا ۔ 'اس کا مطلب؟'

اور وہ سسکیاں بھرتی میرے سینے سے آ لگی۔

میں نے کہا، 'سنو ادھر دریا میں طغیانی ہے اور ادھر میرے دل میں بھی طوفان آیا ہوا ہے، میں تمہاری خاطر ضرور رئیس کے پاس جاؤں گا، وہ میری بات مان لے گا، میں نے اس کی بہت خدمت کی ہے اور اس کے پاس عورتوں کی کیا کمی ہے!

اور واقعی رئیس میرے اوپر مہربان تھا۔ میرے سوال کے جواب میں وہ مسکرایا پھر جھولے سے اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلتا ہوا بولا ۔ 'تم ہمیں پسند ہو اس لیے کہ تم فرض شناس ہو اور بہادر، ہم تمہاری خواہش ٹالنا نہیں چاہتے مگر ۔۔۔!'

مگر ۔۔۔! میں نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

رئیس نے میرے بازو تھپتھپائے ۔ 'ہم تمہیں اپنا بھائی سمجھتے ہیں، بھلا ہم یہ کیسے گوارا کریں کہ تم جھوٹے برتنوں میں۔ سوچو وہ کتنے عرصے سے ہمارے ۔۔۔!'

میں نے انہیں جھکا کے کہا ۔ 'مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں!'

رئیس نے کہا ۔ 'سوچ لو ہم اپنے ادنیٰ ملازموں کو بھی باسی روٹی دینے کے حق میں نہیں اور تم تو ہمیں بہت عزیز ہو!'

اسی وقت میں نے اپنے اندر بپھرتی موجوں کی پھنکار سنی اور بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا، مجھے پتہ ہے وہ باسی روٹی نہیں ہے، وہ باسی روٹی نہیں ہے، مجھے پتہ ہے آپ کے کمرے میں عورتیں نہیں، سب تصویریں ہوتی ہیں، مگر اب وہ تصویر عورت بننا چاہتی ہے ۔۔۔!'

رئیس کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا اور اس کا دریا کی طرح چنگھاڑتا بدن ایکدم سے ڈھے گیا، ایک لمحے کے لیے وہ مجھے سوکھی نہر کی طرح ویران نظر آیا۔ پھر اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور وہ آنکھوں سے چنگاریاں برسا کے بولا ۔ 'مجھے

نہیں معلوم تھا کہ تیرے منہ میں سانپ ہے!' یہ کہہ کر اس نے آواز دی اور محافظ اندر داخل ہو گئے۔

اور وہ بھی بڑی طوفانی شام تھی۔ غصیلا دریا پشتے میں اپنے دانت گاڑ چکا تھا اور اس کی سرکش لہریں مٹی سے چھلنی نمائش رہی تھیں۔ دریا کے بڑھتے ہوئے شور میں، میں نے دیکھا کہ سبز پوش کے مزار کے احاطے والا پشتہ دریا کے جبڑے میں کانپ رہا تھا اور پانی کا دباؤ بہت شدید تھا۔ اس وقت میں اگر سوکھی نہر کے دروازے کھول دیتا تو پشتے پر پانی کا زور یقیناً ٹوٹ جاتا۔ ایک بار میں نے سوچا بھی کہ لپک کے جاؤں لیکن اسی لمحے میری نگاہ رئیسوں کے قبرستان کی طرف گئی تو یوں لگا کہ جیسے وہ بھی کوئی کھیت ہو۔ میں نے سوچا، سچ تو ہے اس میں کیسے کیسے دریا صفت لوگوں کی کاشت ہوئی ہے اور قدرت نے یہاں کیسی کیسی بے بہا شخصیتیں بو رکھی ہیں، کیا عجب ہے کہ یہ ہستیاں پھر سے پیدا ہوں۔ شاید یہ کھیت سیراب ہونے کا منتظر ہے! اور میں کھیتوں کو پیاسا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ سو میں بیٹھا رہا اور میری نظروں کے سامنے سیلابی پانی پشتے کو توڑتا ہوا، رئیسوں کے قبرستان میں جا گھسا اور سنسانے کتے کی طرح باری باری تمام قبروں کو سونگھتا پھرا۔ ان میں ایک تازہ قبر بھی تھی۔

جناب عالی!

میں اپنا سر اوپر اٹھاتا ہوں۔

وکیل کہتا ہے۔

جناب عالی! اس شخص کو نیم دیوانگی کی حالت میں، واردات کے ایک دن بعد اس جگہ پایا گیا جہاں بند میں شگاف پڑا تھا۔

میں دیکھتا ہوں۔ تماشائیوں کا ہجوم ہے جن کے چہروں پر سرور و انبساط کی تحریر ہے۔ وکیل کہتا ہے۔ اس شخص کے بیان سے واقعات پر سے پردہ اٹھ سکتا تھا لیکن افسوس کہ یہ بول نہیں سکتا کیونکہ اس کی زبان —!

میں اپنا سر ایک بار پھر اوپر اٹھاتا ہوں اور سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر نظریں جھکا لیتا ہوں۔

پتہ نہیں میں گونگا ہوں یا یہ تمام لوگ بہرے ہیں!

میں کیا ہوں؟

میں کیسے کہوں سائیں؟

سونے کی مہر

مرزا حامد بیگ

تمام شاموں میں شام آج ہی کی تھی اور تمام ناموں میں اس کا نام۔ وہ زردوں میں زرد تھا اور جوانوں میں فرد۔

وہ جب گھر سے نکلا ہے تو لمحہ بھر کو دہلیز پر رکا تھا۔ اس نے دروازے کو زنجیر کیا اور اپنی نئی دھلی ہوئی چادر کو اچھال کر دائیں کندھے پر جھلاتا ہوا چلا۔ اس نے اوپر نگاہ کی، اوپر بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں تھیں اور اس نے دیکھا کہ آسمان پر ایک طرف ساتوں رنگ یکجا ہو کر ایک قوس میں نیچے گر رہے تھے۔ پھر وہ سب سے بے پرواہ ہو کر چل نکلا، اسے تو ہر حال میں پہنچنا تھا۔

گلیوں میں ظہر کی اذان ٹھہری ہوئی تھی اور پھاگن کی نرم دھوپ ابھی کچھ دیر پہلے راہ کر گئی تھی۔ اس کے سامنے اور پیچھے دور دور تک کوئی نہیں تھا، ساری گلیاں ویران تھیں اور تمام دروازے برابر۔ وہ چلتا رہا۔

گلیوں میں ہر طرف کچھ ایسی خاموشی تھی کہ جس کا سامنا اسے پہلی بار ہوا تھا۔ اس نے آجڑیوں کے احاطے پر پہنچ کر اندر کی سن گن لی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے سوچا ابھی وقت ہے، کہیں رک جائے لیکن کہاں؟ گلیوں میں کوئی نہ تھا اور تمام دروازے برابر تھے۔ اس کا جی اونچی آواز میں گانے کو چاہا۔ لیکن وہ گلیوں میں سے گذر رہا تھا۔ اس نے سوچا اور سر جھکائے چلتا رہا۔ پھر اس نے اپنا دایاں بازو دھیرے دھیرے اوپر اٹھایا اور ہتھیلی کو کان کے گرد ٹھہرا کر اپنا منہ پوری طرح کھول دیا۔ وہ ایک لحظہ رکا کہ شاید کوئی دروازہ کھلے، لیکن کوئی نہ آیا۔ اس کے سامنے اور پیچھے دور دور تک نرم دھوپ راہ کر گئی تھی۔

اس نے اپنی ہتھیلی اسی طرح چہرے کے ایک طرف ٹھہرائے رکھی اور پوری شدت سے ماہیا چھیڑا کا پہلا ٹکڑا، پہلے دائیں اور پھر بائیں مڑ مڑ کر اور ایڑیوں پر گھوم گھوم کر الاپتا چلا گیا۔ گلیاں اسی طرح خاموش رہیں اور وہ اپنی لہر میں نکڑ والی ہٹی کے سامنے نہیں رکا۔ اسے تو پہنچنا تھا۔ باہر کھلے میں جہاں اس کی، سونے کی مہر چلتی ہوئی بس چلی آئے گی۔

سرخ پتھروں کی ڈھکی عبور کر کے وہ اس کچی راہ پر پڑ گیا۔ جس کے ایک طرف کیکروں کی قطار تھی اور دوسری جانب چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بارش کا ٹھہرا ہوا پانی۔ اس پانی کو ہوا بہت آہستگی سے چھو کر گذر رہی تھی اور وہ خود میں مگن جھومتا اور لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے کندھے سے ہوتی ہوئی چادر اس کے پیچھے اڑ رہی تھی اور بستی میں کوئی نہ تھا جو اسے آواز دیتا اسے پہنچنا تھا کہ اس کا کہا پتھر پہ لکیر تھا اور تمام ناموں میں اس کا نام۔ تمام شاموں میں شام آج ہی کی تھی اور اسے بستی سے دو کوس پرے کھلے میں نکل جانا تھا۔

وہ راستے میں ہی ہانپ گیا اور کھلے میں ایک جگہ رُکا اس کی دائیں ہتھیلی ابھی تک کان پہ جمی ہوئی تھی۔ اس نے گھوم کر چاروں طرف نگاہ کی۔ وہ اپنے دونوں پاؤں کی ایڑیوں پہ بار بار گھومتا، چند قدم چل کر رکتا اور آگے بڑھ جاتا۔ اس کی آنکھوں میں پتلیاں پھیل سکڑ رہی تھیں۔ وہ ایک جگہ چند ساعتوں کے لیے بیٹھ بھی گیا تھا۔

ہر طرف چپ چڑانگ تھی۔

کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ آج گھر سے نکلے ہی نہ۔

موسم نے بھی تو یکایک کروٹ لے لی ہے ساری گلیاں یک لخت خاموش ہو گئیں

اب وہ خاصا متفکر نظر آنے لگا تھا۔ اس نے بیٹھ کر دونوں ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں کے برابر زمیں پہ ٹیک دیں یہاں اُسے ہلکی ہلکی تھکاوٹ کا احساس پہلی بار ہوا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو جوانوں میں فرد تھا اور زورروں میں زور۔ معمول کے دنوں میں بستی سے نکل کر یہاں تک آنا، پھر دریا کا چوڑا پاٹ عبور کر کے پار نکل جانا اور دوسرے کنارے پر دونوں ہاتھوں سے سرکنڈوں میں نئے راستے بناتے ہوئے دائیں بائیں، من کی لہر پہ رقصاں رہنا اور رات گئے زقندیں بھرتے اور ماہیے کی تانیں سرکنڈوں کے سروں پہ بیٹتے ہوئے گاؤں واپس آنا اس کا معمول تھا۔

اسے کیا ہو گیا ہے؟

اس نے بیٹھے ہوئے دونوں ہاتھوں میں اپنے چہرے کو بھر لیا وہ جو جوانوں میں فرد تھا۔ اس نے تن کر کھڑا ہونا چاہا لیکن اسے سیدھے ہونے میں بہت وقت لگ گیا۔ وہ اپنے سامنے اور پیچھے لہراتی ہوئی چادر کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بمشکل تمام اپنے چہرے تک لانے میں کامیاب ہوا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے ماتھے، چہرے اور گردن کے پسینے میں چادر کی ایک طرف پوری طرح بھیگ گئی تھی۔

اب وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔

ممکن ہے وہ گھر سے اب نکلی ہو۔

اسے آنا تو ہے اس کا کہا پتھر پہ لکیر ہے۔

وہ گم سم سا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہر طرف ڈولتا رہا۔ دُور دُور تک کوئی شے حرکت میں نہ تھی اور کھلے نیلے آسمان پہ بادلوں کی متحرک آوارہ ٹکڑیوں کے پیچھے ستاروں کے لشکر بڑھے آتے تھے۔ وہ میدانوں میں دھیرے دھیرے گرتا چلا گیا، اس کے اعضا ڈھیلے پڑ رہے تھے۔ یکایک اس کے شانوں پہ دباؤ پڑا اور سامنے سے گر کر دو حنائی ہاتھوں نے اس کی آنکھوں کو پوری طرح ڈھانپ لیا۔ لیکن وہ تو بیٹھتا چلا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ اپنی ٹھوڑی اور کہنیوں کے سہارے ساکن ہو گیا اور اس نے بلبلا کر صرف اتنا پوچھا "کون؟"

جواب میں دور تک نکل گئے میدانوں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کلیاں چٹکیں ——— "بوجھو تو جانیں"

اس نے اپنے خالی سینے میں گہرا سانس بھرا اور ل گیا، ان کلیوں اور کہرے میں دبے چٹیل میدانوں میں پھول بن

کھلتے ہیں کیا۔

چاروں اور خود روکاسنی ہواؤں کے تھنوں پر ہوا سرسرائی ––" بوجھو نا"

اور خوشبوؤں نے اسے اپنی لپیٹ میں بھر لیا۔

" مجھے دیکھو، میں ہوں –– تیری سونے کی مہر"۔

آگے کو گرے ہوئے بازو اس کے ساتھ گھوم گئے۔ لیکن وہ اسی طرح ٹھوڑی اور کہنیوں کے بل جھکا رہا۔ پھر دیر بعد اس نے دھیرے دھیرے اوپر نگاہ کی۔ اوپر اس کی جھکی ہوئی پیشانی چاندنی کی تختی تھی۔

اس نے اوپر سے مزید جھکتے ہوئے کہا "اس پر میں تیرا نام کیسے لکھوں۔ مجھے لکھنا نہیں آتا۔ تو آپ اپنا انگوٹھا ہی لگا دے"۔ پھر وہ کھلکھلا کر ہنسی اور دوہری ہو ہو گئی۔

اب اس کے شانوں سے آگے کو گرتی ہوئی باریک گندھی ہوئی مینڈھیاں ایک ایک کر کے ظاہر ہو رہی تھیں۔

" دیر ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا تو خود انہیں ترتیب دے دے گا۔"

یہ کہہ کر وہ بیٹھ گئی اور اپنی اوڑھنی کو ایک جھٹکا دے کر سامنے سے آئی، بولی؛ "میرے بازو اور کان خالی ہیں۔ تو ان کی طرف نہ دیکھنا۔"

ٹھوڑی اور کہنیوں کے بل، اس نے اتنا سنا اور تڑپ کر اٹھا، بولا۔ "تجھے گہنوں کی حاجت نہیں، تو خود سونا ہے۔"

پھر وہ اٹھا ہے اور اس نے دونوں بازو آگے کو پھیلائے ہیں۔ تب وہ اپنی اوڑھنی، گہنوں اور شانوں پر جھولتی ہوئی مینڈھیوں کو بھول کر اس کے بازوؤں میں جھول گئی ہے۔

اور اس نے بازو اسی طرح ٹھہرائے رکھے ہیں اور چاندی کی تختی پر اپنا نام لکھنا بھول گیا ہے۔ پھر وہ سیدھا ہوا ہے اور اس نے جھولا جھلانے کے انداز میں دونوں بازو پیچھے کو لا کر آگے بڑھانا چاہے ہیں، اور ایسے میں ایک سفید براق گھوڑا اور اس پر آگے کو جھکا ہوا، واویلا کرتا ہوا سوار ایک تیر کی طرح ان کے قریب سے گزرے۔

" شڑاپ –– شڑاپ "

واویلا کرتے گھڑ سوار کے دائیں ہاتھ میں تھمی ہوئی چابک گھوڑے کے دونوں جانب لہرا رہی تھی۔ اڑتی بدلیوں کی اوٹ سے رہ رہ کر ستارے ٹوٹتے اور وسیع میدانوں پر اس گھڑ سوار کا پیچھا کرنے لگتے۔ گھڑ سوار کے شور سے میدان بھر گئے۔ ایسے میں پیچھے کو آئے ہوئے بازو زور سے اوپر اٹھے اور دوسرے لمحے وہ خالی ہاتھ تھا۔ اس کے بازوؤں سے نکل کر وہ پھولوں کی لچکتی ہوئی ڈال فضا میں حدِ نظر تک اوپر اٹھی اور لہراتی ہوئی دور نکل گئی۔

ستارے اپنے پیچھے روشنی کی لمبی لکیریں چھوڑتے ہوئے، واویلا کرتے گھڑ سوار کا پیچھا کر رہے تھے اور اس کے دونوں بازو اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور وہ خالی تھا۔ دوسرے لمحہ میں گھڑ سوار کی چوڑی چھاتی سے لپٹی اور اٹھے ہوئے شانوں سے لہراتی پھولوں کی ڈال اس کی نظروں میں ایک لحظہ کو ٹھہری، پھر ہوا ہو گئی۔

وہ جوانوں میں فرد اور زوروں میں زور جب گاؤں کی طرف نکل جانے والی بل کھاتی پگڈنڈی کو پلٹتا ہے تو وہ کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں اطراف میں ٹھہرے ہوئے پانی میں آپس میں الجھتی روشن لکیریں دیکھیں اور آنکھیں موند لیں۔ باہر کوٹ کی ڈھکی کے نکڑ پہ، مغلوں کے حجرے میں لوگ بیٹھے ہنسی ٹھٹھا کر رہے تھے۔ وہ چوروں کی طرح بگل مارے، لمبے ڈگ بھرتا اندر مڑ جانے والی گلی تک آیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ گلیوں میں بچے ابھی گھر کی دہلیزوں پہ بیٹھے ضد کر رہے تھے اور چادروں میں لپٹی، ہنہناتی بیاہتا عورتوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں عشاء کی نماز سے پہلے ایک ایک دروازہ جھانکتی پھر رہی تھیں سامنے سے آتے ہوئے ممدے بہشتی نے اس کا راستہ روک لیا۔

ممدے نے بتایا کہ عصر کی اذان سن کر وہ گھر سے نکلا تھا۔ جب اس نے دروازے کو زنجیر کیا ہے تو ممدے نے اپنے صحن سے اس کا نام لے کر دو بار پکارا تھا، لیکن وہ رکا نہیں۔

وہ تو آج بڑا لپک کر چلا تھا۔ سانگی استادوں کی طرح کان پہ ہاتھ دھرے، گاتے ہوئے اور اپنے دائیں بائیں گزرتی زنانیوں کا راستہ روکے ہوئے۔

اسے ہو کیا گیا ہے؟ ممدا بہشتی حیران ہو رہا تھا۔

اور جواب میں اس نے آنکھیں موندے رکھی تھیں اور تھر تھر کانپتا رہا تھا، اور دیر بعد اس کے ہونٹ رواں ہوئے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"یہ نیکے رات گئے، ضد کیوں کر رہے ہیں، ممدے ———

ممدے یار، میں نکلا تو اکیلا تھا لیکن میرے ساتھ ستاروں کی بارات ہولی اور تو نے دیکھا، میری سونے کی مہر———

پھر جانے کہاں سے واویلا کرتا ہوا گھڑ سوار آ گیا ہے اور ہر طرف بھگدڑ مچ گئی ہے۔ میرے باراتی اس کا پیچھا کر سکے

اور وہ جو زوروں میں زور تھا اور جوانوں میں فرد، ایک بار پھر گھر کی دہلیز سے چند قدم پہ گلی میں بیٹھتا چلا جا رہا تھا۔

ٹی۔ ٹو

مظفر اقبال

سردی اس قدر زیادہ تھی کہ اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ بالآخر بالکل ساکت ہو گئے۔ اس کا دھانہ ـــــ جو لفظ بولنے کے لئے کھلا تھا ـــــ کھلا ہی رہ گیا اور جبڑے کی ہڈیوں نے دھانے کو کسی پرکار کی طرح تھام لیا، کچھ دیر تک وہ اسی حالت میں چلتا رہا، پھر اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے کومل رخساروں کو رگڑا، اور اپنی بات کو ـــــ جو منجمد کر دینے والی سردی کی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی، یوں مکمل کیا

"ـــــ اور جب انہوں نے سمجھ لیا کہ اب میں ان کے دیئے ہوئے کھلونوں میں مگن ہو گیا ہوں، تو ان کی پہریدار آنکھیں تیز شراب میں ڈوب گئیں اور وہ نرم جیسے نرم جسموں میں دھنس کر اپنے بڑے بڑے نوکیلے دانتوں سے انہیں اس طرح کچکچانے لگ گئے جیسے کتے سوکھی ہڈیاں ـــــ تو ـــــ تو بس، اسی لمحے، میں نے جست لگائی اور نکل بھاگا"

وہ پانچ تھے، جو اس تاریک، سرد اور بے رحم رات میں چل رہے تھے، ان میں صرف ایک بات مشترک تھی وہ سب بچے تھے۔ چھوٹے چھوٹے، معصوم، کھرے، سنئے، پاکیزہ اور سادہ بچے!!

چلتے چلتے وہ ایک دفعہ پھر ٹھہرے، ان کے ہاتھ ہونٹوں تک گئے، ان کے دھانوں کے آگے چھوٹی چھوٹی کپیاں بن گئیں اور انہوں نے بیک آواز صدا لگائی۔

"ٹی ـــــ ٹو"

آواز سارے میں گونجا کی

"ٹی ـــــ ٹو"

اور پھر جس طرح بنجر پہاڑوں میں بکھری ہوئی آواز بار بار سر پھوڑتی ہے اور بالآخر تھک ہار کر انہی ہاڑوں میں کہیں گم ہو جاتی ہے، یہ آواز بھی گم ہو گئی، اور انہوں نے دائرے کے محیط کے ساتھ ساتھ پھر سے گھسٹنا شروع کر دیا کہ ان کے پاؤں اب اسی منجمد کر دینے والی سردی میں صرف گھسٹ ہی سکتے تھے۔

ان کے ارد گرد سناٹا بکھرا پڑا تھا۔ اور اس عمیق خاموشی میں ان کے گھسٹنے کی آواز "شڑڑ ـــــ شڑڑ" خود انہیں لرزہ بکیے رہتی تھی۔

ہوا جیسے جم گئی ہو، برف گر تو نہیں رہی تھی لیکن ہوا میں موجودگی کے سارے ذرات جہاں تھے وہیں منجمد ہو گئے تھے اور فضا میں جگہ جگہ ان منجمد ذرات سے چھوٹے چھوٹے گولے بن گئے تھے ان کی آنکھیں سردی سے سکڑ کر اور بھی چھوٹی ہو گئی تھیں، اور وہ اس تاریکی میں اپنی چھوٹی مگر چمکدار آنکھوں کی روشنی میں ہی سفر طے کر رہے تھے۔ ان کی شریانوں میں لہو آہستہ آہستہ جمتا جا رہا تھا اور جسم کے بہت سارے حصے بیک وقت سکڑ کر بے حس ہوتے جا رہے تھے۔

اب تیسرے بچے کی باری تھی، اس نے بات شروع کرنے کے لئے منہ کھولنا چاہا، لیکن اس کے ہونٹ بس ایک خفیف سی کپکپی کے بعد ساکت ہو گئے، اس نے بے بسی سے باقی چاروں کی طرف دیکھا، وہ سب منتظر تھے۔

اس نے جسم کی آخری حرارت کو مجتمع کیا اور اکھڑے اکھڑے انداز میں ٹوٹے ٹوٹے لفظ اس کے دہانے سے گرنے لگے۔

"وہ .. وہ ... میرے پاؤں میں آہنی زنجیریں پہنا گئے تھے، میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور .... اور ایک بہت بڑے کمرے میں ــــ ایک بہت مضبوط کھونٹے کے ساتھ میرے پاؤں کی زنجیریں باندھ دی گئی تھیں۔"

باقی چاروں نے ایک لمحے کے لئے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا، لیکن اب اس نے آنکھیں بھینچ لی تھیں اور جبر ہتھکڑی نے اس کے دونوں ہاتھوں کو جکڑ رکھا تھا، وہ بار بار اسے ہلا رہا تھا پانچوں پھر گھٹنے لگے۔ تیسرے بچے کے دہانے سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

"میں نے .... میں نے اپنے بندھے ہاتھوں کی آہنی ہتھکڑی سے ...." لفظ پھر ساکت ہو گئے۔

چاروں کے چہروں پر گہرا کرب ابھر آیا، انہوں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

ان کی نظریں جھکتے ہی ٹھٹھر گئیں۔

"ہاں ..." تیسرے بچے نے اپنی ٹانگوں پر جمی ہوئی آٹھ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا "ہاں ... میں نے اپنے بندھے ہاتھوں کی آہنی ہتھکڑی سے اپنے پاؤں کاٹ ڈالے .... اور بھاگ آیا!" ان کی ٹھٹھری ہوئی نظریں اس کی بن پاؤں ٹانگوں پر جمی تھیں۔ ٹخنوں کے نیچے دو چار ٹوٹی ہوئی نیلی سیاہ شریانیں تھیں اور جما ہوا نیلا خون اور اس سے لپٹی ہوئی مٹی !!

تب انہوں نے ایک دفعہ پھر اپنے دہانوں پر چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے کپیاں بنائیں اور بیک آواز صدا لگائی

"ہی ــــ لو"

آواز سارے میں گونج گئی

"ٹی ــــــ لَو"

اب اس منجمد کر دینے والے موسم نے ان کے جسموں سے حرارت کی آخری کلوری بھی چوس لی تھی۔ انہوں نے چلنا چاہا تو ایک ایک دو دو قدم اٹھا کر رہ گئے۔ جس بچے نے سب سے پہلے اپنی کہانی سنائی تھی اس نے دیکھا کہ وہ درمیان میں ہے اور اس کے آگے پیچھے دو دو بچے پتھر کے مجسموں کی طرح جم گئے ہیں اور ان کی آنکھیں اور چھوٹی ہو گئی ہیں، اور ان کے ہاتھ ابھی تک ڈھالوں پر ہی ٹکے ہوئے ہیں جیسے انہیں وہیں ویلڈ کر دیا گیا ہو۔

"ہمیں ذرا تیز چلنا چاہیئے۔ اور آواز بھی ذرا بلند ــــــ" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھی اس کی بات سننے سے قاصر ہیں۔

"میرا خیال ہے اب مجھے ــــــ" اس نے ایک دفعہ پھر بات ادھوری چھوڑی اور دوسرے ہی لمحے اس کا جسم دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔

آگ اس کے سر سے ہوتی ہوئی سارے جسم میں پھیل رہی تھی، خشک لکڑیوں کے جلنے کی طرح تڑ تڑ تڑخ کی آوازیں دور تک گونجنے لگیں۔ باقی چاروں کے منجمد جسموں میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اپنے ہاتھوں کی کپیوں کو دھڑا دھڑ جلتے ہوئے جسم کی آگ میں تاپنے لگے۔

پھر وہ گول دائرے کی صورت اس جسم کے گرد بیٹھ گئے جو اب صرف آگ تھا۔ اور شعلوں سے نکلنے والی حرارت سے اپنی رگوں میں منجمد ہوتے ہوئے لہو کو مائع کرنے لگے۔ ان کے چاروں طرف ہوا کے انجماد میں بھی حرکت پیدا ہونے لگی۔

آہستہ آہستہ بچے کا سارا جسم جل گیا۔ اس کے خوبصورت چہرے، گرم ملی ہاتھوں، سیاہ بالوں اور چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کی جگہ اب سلگتی ہوئی راکھ کا ایک ڈھیر زمین پر پڑا تھا اور اس راکھ کے اوپر اس کی آنکھیں دھری تھیں۔ جو اب غیر معمولی طور پر بڑی اور تیز ہو گئی تھیں۔ چاروں بچوں نے راکھ کے ڈھیر کے گرد سے اٹھتے ہوئے ان کھب جانے والی تیز بلوریں آنکھوں کو دیکھا، اپنے ہاتھ ڈھالوں پر رکھے اور بیک آواز صدا لگائی۔

"ٹی ــــــ لَو"

اب کے ان کی آواز میں بلا کی تیزی اور پکار تھی۔

انہوں نے پھر دائرے کے محیط کے گرد چلنا شروع کر دیا۔

"میری کہانی بھی تم سے کچھ مختلف نہیں ــــــ" چوتھے بچے نے اپنی بات شروع کی۔

تھوڑی دیر بعد انہیں پھر رک جانا پڑا۔ رکتے ہی ان کے ہاتھ ڈھالوں پر ٹک گئے اور منجمد ہوا میں ایک دفعہ پھر ارتعاش پیدا ہوا۔

"سٹ..... ی... ی..... ل و"

لیکن یخ کر دینے والا موسم ایک دفعہ پھر ان کے جسموں کو حرارت سے خالی کر چکا تھا۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر

دیکھا، دائرہ نصف سے ذرا اوپر مکمل ہو چکا تھا۔ اور اس کی قوس کے پار چاروں طرف دھند اور تاریکی تھی، جس محیط پر وہ سفر کر رہے تھے اسی پر دور کہیں دو چمکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں پڑی تھیں جو مسلسل انہیں دیکھے جا رہی تھیں۔

انہوں نے اپنے جسم کی رہی سہی قوت جمع کی اور ایک دفعہ پھر پکار ابھری ۔ "ٹ...ی....ی...ل...د"
اب کے آواز بہت کمزور تھی، لیکن اس دفعہ کہیں دور سے دو چار آوازیں جواب میں ابھریں۔ان کی بجھی ہوئی آنکھیں ایک لمحے کے لئے چندھیا گئیں۔ کچھ بچوں کی تیزی سے قریب آتی ہوئی آوازیں پھر ابھریں۔

" ٹی ــــــ لو "

چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ان کی رگوں میں خون پھر سے دوڑنے لگا۔ اور انہوں نے پھر سے محیط پر چلنا شروع کر دیا۔ لیکن موسم ایسا تھا کہ ذرا دیر چلنے کے بعد ہی ان کے جسموں کو مجسمے بنا گیا۔ اور ان کے اٹھے ہوئے قدم منجمد ہو گئے۔

دوسرا بچہ اب کے درمیان میں تھا۔ اور باقی تینوں مثلث کے تین نکتوں کی طرح اس کے گرد جمے ہوئے تھے۔ درمیان والے بچے نے ایک دفعہ پیچھے دیکھا، دور دو چمکتی ہوئی بلوریں آنکھیں اندھیرے میں روشن مرکری بلبوں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے اب مجھے ــــــ" اس نے بدستور ان مرکری بلبوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اور پھر اس کے جسم سے شعلے اٹھنے لگے۔ اور اس حرارت سے اس کے ساتھیوں کی رگوں میں منجمد ہوا لہو پھر سے سیال ہونے لگا۔

" ٹی ــــــ لو " وہ یک آواز دھاڑے

جواب میں اب کے بہت سی آوازیں ابھریں

" ٹی ــــــ لو "

اپنے ساتھی کی ساری حرارت سمیٹ کر، وہ پھر چلنے لگے!اب ان کے قدموں کی چاپ میں قریب آتی ہوئی بہت سی صدائیں شامل ہو رہی تھیں بہت سے قدموں کی چاپیں دھڑام دھڑام بجتے ہوئے ڈھول کی طرح، دور دور تک پھیلے ہوئے بنجر ویران اور چٹیل میدان میں ارتعاش برپا کرنے لگی تھیں۔

اب دائرہ مکمل ہونے ہی والا تھا۔مان کے دوسرے ساتھی کی آنکھیں بھی اس کی راکھ پر فروزاں ہو گئی تھیں۔

وقفے وقفے سے ان کی آواز کے جواب میں صدا ابھرتی۔

" ٹی ــــــ لو "

" ٹی ــــــ لو "

لیکن اس بے پناہ ٹھنڈ نے دائرہ مکمل نہ ہونے دیا۔ ان کی آوازیں نحیف ہوتی گئیں اور حرکت سست بالآخر بن پاؤں کے بچے نے ایک جگہ رک کر پیچھے دیکھا۔ چار بلوری آنکھیں اسے ہمت دلا رہی تھیں۔ اس نے اپنے بندھے ہاتھوں کی کپّی بنائی۔ نحیف آواز میں ٹی لو کہا اور ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر اس کے جسم سے شعلے اٹھنے لگے۔ باقی دونوں بچوں نے اس کی جسم کی ساری حرارت اپنے اندر بھر لی اور اس کی بے انتہا چمکیل شفاف آنکھوں کو راکھ کے ڈھیر پر چھوڑ کر ٹی لو ٹی لو پکارتے ہوئے تیزی سے محیط کے گرد چلنے لگے۔ اب دائرہ مکمل ہونے ہی والا تھا۔

اور ـــــ اور پھر دائرہ مکمل ہو گیا۔ اور دائرہ مکمل ہوتے ہی اس ٹھٹھری ہوئی فضا میں طوفان آ گیا۔ حرکت، تیزی، حرارت ـــــ حرکت، تیزی، حرارت، منجمد ہوا جیسے آندھی بن گئی ہو۔ شائیں شائیں، شائیں شائیں، درخت، پتھر، مٹی، سب جی اٹھے تھے۔ ان کے گرد پھیلی کہرے کی دبیز چادر ایسے تڑخ رہی تھی، جیسے زلزلہ آنے پر زمین میں دڑاڑیں پڑ جاتی ہیں چاروں طرف سے چھوٹے چھوٹے مگر والہانہ انداز میں دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپوں اور پکارتی ہوئی آوازوں کا طوفان امڈ رہا تھا۔

" ٹی لو ٹی لو ۔ ۔ ۔ دھڑام ـــــ دھڑام ۔ ۔ ۔ ٹی لو ـــــ ٹی لو " تیز پرجوش ہیجانی آوازیں!!

دائرے کے محیط سے ہزاروں لاکھوں پرجوش بچے ٹی لو ٹی لو، پکارتے ہوئے یوں دائرے میں داخل ہو رہے تھے جیسے کائنات میں کوئی نیا منظر رونما ہو رہا ہو۔ اندھیرے، کہرے اور چپ کی چادر کو توڑتے ہوئے، کان پھاڑ دینے والے شور کے ساتھ، دھڑام دھڑام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دائرہ پُر ہوتا جا رہا تھا، والہانہ انداز میں ٹی لو، ٹی لو پکارتے بچوں سے!!

اور ان بچوں کے روشن چہرے، تمتماتی ہوئی پیشانیاں، بوٹے قد، دمکتی ہوئی آنکھیں سب ایک جیسی تھیں۔ وہ سب ایک ہی مشین، ایک ہی سانچے سے نکلے ہوئے لگ رہے تھے، چھوٹے چھوٹے فرشتے۔ پاؤں تیزی سے رقص کناں، جسم کا رواں رواں متحرک، جذبے کی گہری آنچ سے دمکتے ہوئے، ہاتھوں میں ہاتھ دیئے زنجیر در زنجیر، ایک دوسرے کے لئے اجنبی لیکن ایک دوسرے کو جنم جنم سے جاننے والے اپنی ہستی کے یقین و اعتماد سے لبریز ہزاروں لاکھوں چھوٹے چھوٹے متحرک بونے!!

اور اب دائرہ یوں چمک رہا تھا جیسے آسمان پر پورا چاند ہو، اور اس چاند میں بے پناہ طاقت والے بونے جمع ہو گئے ہوں۔ ان کے چہروں پر بلا کا جلال تھا لیکن ان کی آنکھیں معصوم بچوں کی طرح ہی تھیں۔ بے ضرر اور محبت کے شیرے میں لپٹی ہوئی شفاف آنکھیں!!

اور وہ دیوانہ وار پکار رہے تھے

" ٹی لو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٹی لو "

اور سارے میں یہی پکار بکھر گئی تھی۔

"یہ...... یہ تمہارے سر کو کیا ہوا" اچانک چوتھے بچے نے پانچویں کی طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا (اب وہ دونوں لاکھوں بچوں کے درمیان کھڑے تھے)

"کیا ــــــ؟ کیا ہے ؟"

"یہ اچانک اسقدر بڑا کیسے ــــــ؟"

لیکن اس کی بات ہزاروں لاکھوں بچوں کی پکار میں دب گئی۔

اب یوں ہو گیا کہ اس چاند جیسے بڑے دائرے میں بے شمار چھوٹے چھوٹے دائرے بن گئے اور اس روشن چاند کے باہر کی ساری روشنی اس بڑے دائرے میں سمٹ آئی، آسمان جیسے سارے ستاروں سے خالی ہو کر سیاہ ہو گیا ہو، اور اس سیاہ تحت کے بیچ ایک بہت روشن دائرہ جگمگا رہا ہو اور باہر کی تاریکی سے کہرے کی لوٹتی ہوئی دبیر چادر سے منجمد کر دینے والی ہوا کے جھکڑ ان بچوں کے جسموں سے حرارت چھیننے کی کوشش میں مسلسل مگن تھے۔

لیکن اب اس بڑے دائرے کے بیچ بے شمار چھوٹے چھوٹے دائرے بن گئے تھے اور ان کے درمیان بے شمار بچے جلنے لگے تھے اور ان کے جسموں کی آگ ان کے چھوٹے چھوٹے دائروں کے گرد پھیلے بچوں کے لئے حرارت مہیا کرنے لگی تھی اور دور تک، یہاں وہاں، بلوریں آنکھوں کا انبار لگ گیا تھا۔

پھر آہستہ آہستہ وہ یخ ہوا بھی گرم ہونے لگی۔

اور پھر اس ہزاروں لاکھوں کے مجمع نے اپنے ہاتھ سروں سے بلند کر لیے اور ایک بہت بڑی چادر ان کے سروں پر تن گئی۔ ان میں سے ایک گروہ ایسے جسموں میں پارے جیسا متحرک خون لئے تاریکی میں اتر گیا اور ذرا دیر بعد باقی کے سروں پر تنی چادر میں مردہ بدبودار چیزوں کی بارش ہونے لگی۔

بندوقیں، لاٹھیاں، ترازو، گولیاں، آنسو گیس کے شیل، وردیاں، نیفے، سناٹے، بیکار بنجر لفظ، جھوٹے کھوکھلے وعدوں کے انبار، لمبی لمبی مکروہ زبانیں، کلف دار کالر، سور کی طرح پھولی ہوئی موٹی گردنیں ......

دھڑا دھڑ اسی چادر میں گر رہی تھیں، جیسے کوئی گلی سڑی سڑاند میں بسی ہوئی فصل کاٹی جا رہی ہو۔ اور جب ساری چیزیں چادر میں جمع ہو گئیں تو لاکھوں بچوں نے چادر کو تہہ کیا اور اپنے سروں پر یوں اٹھا لیا جیسے جنازہ اٹھایا جاتا ہے اور وہ اس جنازے کو لے کر چلنے لگے۔

اب لاکھوں بچے اپنے کندھے پر وہ لاش اٹھائے تیزی سے چلتے جا رہے تھے۔ اپنے چاند سے بہت دور جا کر انہوں نے ایک جگہ ایک بہت بڑی اور گہری قبر کھودی اور وہ لاش اس میں اتار دی۔

پھر ذرا ہی دیر میں قبر کو مٹی سے پُر کر دیا گیا۔

لاکھوں کا ہجوم اب قہقہے لگاتا فتح مندی کے احساس کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔ ان کے قدموں میں ان کے ساتھیوں کی شفاف آنکھیں مسلی جانے لگیں۔

لیکن اب وہ صرف ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"ٹھہرو ــــــ سنو"

پانچویں بچے نے خود کو کہتے سُنا۔

اس کا سر بہت بڑا ہو گیا تھا، اور اس کی ٹانگیں دو لمبے لمبے باریک بانسوں کی طرح اس کا دھڑ اٹھائے ہوئے تھیں۔ وہ ان بونوں کے ہجوم میں کھڑا، ڈیو لگ رہا تھا۔

"ٹھہرو...... سنو" وہ چلایا۔ اس کی آواز پورے چاند پر پھیل گئی۔ "اس طرح تو یہ بے فائدہ ہو گا" اس نے تیزی سے کہنا شروع کیا۔ اس کے کمزور جسم پر اس کا بہت بڑا سر عجیب انداز سے جھول رہا تھا اور الفاظ اس کے منہ سے تیز بارش کی طرح گر رہے تھے۔

"اب ہمیں پھر سے نئی لو ــــ نئی لو پکارنے کی ضرورت پیش نہیں آنی چاہیئے اور یہ ہزاروں آنکھیں زمین پر بکھری ہوئی ہیں یہ ــــــ"

لیکن اس کی بات کوئی نہیں سن رہا تھا۔ وہ تاریکی اور روشنی کی سرحد پر کسی پہریدار کی طرح اکیلا کھڑا رہ گیا تھا اور اس کے سامنے پھیلے ہوئے روشن چاند کی لو مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ میدان آہستہ آہستہ خالی ہوتا جا رہا تھا۔ سارے بچے پھر سے کہیں چھپتے جا رہے تھے۔

حرارت کم ہوتی گئی۔ اور روشنی بجھتی گئی اور آوازوں کا ہجوم تنہا تنہا ہو کر رہ گیا اور اس علاقے میں سردی بلا کی پڑتی تھی۔ میدان خالی ہوا تو پالا اور بھی خنک ہو گیا۔

"سب بیکار گیا.... سب..... سب" اکیلے پہریدار نے خود کو کہتے سُنا۔

ہوائیں سرد ہوتے ہوتے اسقدر یخ ہو گئیں کہ پھر سے منجمد ہو گئیں۔

- -

سردی اس قدر زیادہ تھی کہ اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ بالآخر بالکل ساکت ہو گئے، اس کا دہانہ جو بولنے کے لئے کھلا تھا ــــ کھلا ہی رہ گیا، اور جبڑے کی ہڈیوں نے دہانے کو کھلی پرکار کی طرح تھام لیا۔ دیر وہ اسی حالت میں چلتا رہا، پھر اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے کومل رخساروں کو رگڑا اور بات کو ــــ جو منجمد کر دینے والی سردی کی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی ــــ یوں مکمل کیا۔

" ــــ اور جب انہوں نے سمجھ لیا کہ اب میں ان کے دیئے ہوئے کھلونوں میں گم ہو گیا ہوں تو پہریدار آنکھیں تیز شراب میں ڈوب گئیں اور وہ نوم جیسے نرم جسموں میں دھنس کر اپنے بڑے بڑے نوکیلے دانتوں سے انہیں اس طرح کچکچانے لگ گئے جیسے کتے سوکھی ہڈیاں ــــ تو ــــ تو بس میں نے جست لگائی اور نکل بھاگا۔"

وہ چار تھے، جو اس تاریک، سرد، اور بے رحم رات میں چل رہے تھے ان میں صرف ایک بات مشترک

تھی وہ سب بچے تھے چھوٹے چھوٹے معصوم کھرے نئے پاکیزہ اور سادہ بچے !!

چلتے چلتے وہ ایک دفعہ پھر ٹھہرے۔ ان کے ہاتھ ہونٹوں تک گئے۔ ان کے دھانوں کے آگے چھوٹی چھوٹی کپیاں بن گئیں۔ اور انہوں نے بیک آواز صدا لگائی۔

"ٹی ڈ ـــــ لو"

اور سارے میں یہی پکار بکھر گئی۔

"ٹی ڈ ـــــ لو"

"یہ ..... یہ تمہارے سر کو کیا ہوا؟ اچانک تیسرے بچے نے چوتھے کی طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا (اب وہ دونوں لاکھوں بچوں کے درمیان کھڑے تھے)

"کیا ـــــ؟ کیا ہے؟"

یہ اچانک اس قدر بڑا کیسے ـــــ؟"

"اور ـــــ اور یہ تمہارا سر بھی پھیل رہا ہے" چوتھے بچے نے اطمینان سے تیسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ باقی سر ـــــ !!"

ایک کہانی

سراج منیر

دو پیراگراف لکھنے کے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے کہانی غلط جگہ سے شروع کر دی ہے اور اس وجہ سے سارے واقعات آپس میں گڈمڈ ہو کر رہ گئے۔

اصل میں ہوا یوں تھا کہ جب اس نے پہلے پہل ہوٹل کے کونے والی میز پر بیٹھ کر اپنی کہانی کا آغاز کیا تھا تو اس میں لڑکی کا کہیں وجود نہ تھا بلکہ وہ تو صرف یہ بتا رہا تھا کہ کس طرح ہوسٹل کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تاش کی آخری بازی پر جب اس کی جیت تقریباً دو سو انسٹھ روپے اٹھارہ پیسے بنتی تھی پہلی بار اسے متلی کی سی کیفیت کا احساس ہوا تھا اور ساتھ ہی اسے یکایک بازی میں شریک دوستوں سے ایک طرح کی کراہت محسوس ہونے لگی تھی۔ خصوصاً طارق سے جو ایک گندی مسکراہٹ اپنے چہرے پر چپکائے، ہونٹ کے ایک کونے میں سگرٹ دبائے ہوئے جو آدھا جل چکا تھا لیکن اس کا گل ابھی جھڑا نہ تھا بلکہ ایک ہلکا سا خم کھا کر سگریٹ کے اندر دبے ہوئے انگارے سے لگا ہوا تھا، تھکے تھکے انداز میں پتے پھینٹتا جا رہا تھا۔ پھینٹتا جا رہا تھا، پھینٹتا جا رہا تھا۔

یہ شخص میرے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے، اس نے پہلی بار سوچا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میں کب سے اس کھیل میں شریک ہوں اور طارق کب سے پتے پھینٹ رہا ہے اور اس کی سگریٹ کب سے اس کے ہونٹوں میں معلق ہے اور اس سگرٹ کا گل کب سے ایک ہلکا سا خم کھا کر لٹکا ہوا ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہی منظر دیکھ رہا ہوں۔ متلی۔ طارق نہایت تندہی سے پتے پھینٹ رہا تھا۔

یہاں تک لڑکی کا کوئی ذکر نہ تھا بلکہ لڑکی تو بہت سارے واقعات کے بعد بھی ظاہر نہ ہوئی تھی لیکن وہ کہانی غلط جگہ سے شروع کر بیٹھا تھا اور اسے اب خیال آ رہا تھا کہ ابتدا میں ہی لڑکی کا ذکر چھیڑ دینے سے سارے واقعات گڈمڈ ہو کر رہ گئے تھے اور اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کہانی میں واقعات اس ترتیب سے کیسے بیان کرے جس ترتیب سے اس نے ہوٹل کی کونے والی میز پر بیٹھ کر نہایت خاموشی سے یہ کہانی سنی تھی اور وہ لڑکا گویا کسی سے مخاطب نہ تھا بلکہ خود کلامی کی سی کیفیت میں تھا البتہ ہر دوسرے فقرے کے بعد پوچھ لیتا تھا "سمجھے ہو"

— سمجھے ہو، اس کے بعد میں کبھی ہوسٹل نہیں گیا، میں کالج بھی نہیں گیا، مجھے نہیں پتہ کہ طارق ابھی تک پتے پھینٹتا ہے یا نہیں، ممکن ہے وہ ابھی تک سگریٹ ہونٹوں میں دبائے —

میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا، مجھے متلی آنے لگتی ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ دو سو انسٹھ روپے اٹھارہ پیسے میں نے وہاں سے اٹھائے بھی تھے یا نہیں، اگر اٹھائے تھے تو کہاں گئے۔ سمجھے ہو، میں ہر وقت ایک عجیب کیفیت میں رہتا تھا، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں کوئی بڑی بات بھول گیا ہوں اور ہر وقت میں اپنے ذہن میں تلاش کرتا رہتا تھا کہ وہ بڑی بات کیا ہے، لیکن میں تم سے کیا بتاؤں، واقعات ایک ترتیب سے یاد آتے چلے جاتے تھے، ایک دو تین چار، پھر یوں ہوا، پھر یوں ہوا پھر یوں ــ اس سے آگے ایک عجیب کیفیت سی، اسے تم اندھیرا بھی نہیں کہہ سکتے، سمجھے ہو، یاد بھی کچھ نہیں آتا تھا لیکن اتنا معلوم تھا کہ کوئی بڑی چیز ہے جو میں بھول گیا ہوں، یہاں پہنچ کر میں ذہن پر زور لگاؤں تو مجھے زور کی ابکائی آتی تھی اور میں پھر واقعات کی ترتیب میں پہلے واقعے پر پہنچ جاتا تھا اور پھر ایک دو تین چار۔ میں ایک گھن چکر میں پھنس گیا تھا۔ جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ راؤنڈ اینڈ راؤنڈ اینڈ راؤنڈ، سمجھے ہو، تم کبھی ہنڈولے میں بیٹھے ہو، تیز تیز گھومنے کے بعد نیچے اترو، تو قدم زمین پر نہیں ٹکتے، ہلکا سا چکر آتا ہے اور متلی آتی ہے ــ

اسے کامل یقین تھا کہ یہاں تک لڑکی کا کوئی ذکر نہ تھا لیکن وہ کہانی کے پہلے ہی پیراگراف میں اس لڑکی کے چہرے کی پوری تفصیلات بیان کر چکا تھا اور وہ سب کچھ اس نے اپنی طرف سے تخلیق نہیں کیا تھا بلکہ اسی لڑکے نے ہوٹل کے کونے والی میز پر بیان کیا تھا کہ وہ کس طرح ہونٹ سکوڑے رہتی تھی اور بے نیازی اور غصے سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی حالانکہ اس نے شاید کبھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا، یا شاید کبھی دیکھا بھی ہو، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میں کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتا ــ

بہر حال یہ ساری باتیں اسی نے بیان کی تھیں لیکن اس کے بیان کرنے کی بے ترتیبی میں ایک خاص قسم کی ترتیب پائی جاتی تھی جس کا پورا سلسلہ گم ہو گیا تھا اور اس لئے وہ لڑکی کا ذکر پہلے ہی پیراگراف میں کر بیٹھا تھا اور اب واقعات کا پورا سلسلہ گڈمڈ ہو کر رہ گیا تھا۔ کہانی بالکل ہی غلط جگہ سے شروع ہو گئی تھی، اسے یاد تھا کہ ہنڈولے والی مثال تک ابھی لڑکی سامنے نہیں آئی تھی اور ــ

سمجھے ہو، وہ میری آوارہ گردی کی دوسری رات تھی، یا شاید پانچویں یا چھٹی، خیر پتہ نہیں وہ کون سی رات تھی، اس لئے کہ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے میں اسی طرح گھوم رہا ہوں، لیکن تم یہ نہ سمجھنا کہ میں بے مقصد گھوم رہا تھا، سمجھے ہو، مجھے کہیں نہ کہیں جانا ضرور تھا اور میں اسی تیزی سے، تندہی اور مستقل مزاجی سے قدم اٹھا رہا تھا جیسے وہ لوگ چلتے ہیں جو کہیں سے آ رہے ہوتے ہیں اور کہیں جا رہے ہوتے ہیں۔ میں بھی کہیں نہ کہیں سے تو آ رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ مجھے کہیں جانا ہے لیکن کہاں ؟ اس کا علم شاید مجھے نہیں تھا، یا شاید تھا بہر حال کچھ یقینی سی بات۔ میں بس چل رہا تھا اور چل رہا تھا۔ پھر میرے بدن میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ ہونے لگی تھی اور میں یہ یاد کرنے لگا کہ پھر کیا ہوا تھا، ایک دو تین چار، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے قے ہو جائے گی، لیکن قے ہوتی کیسے شاید میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ پیٹ بالکل خالی، بس ایک خشک متلی آ جاتی تھی۔

اسے گمان ہوا کہ شاید یہاں آ کر اس نے لڑکی کا ذکر کیا ہو گا لیکن کس کا ن ملسٹ میں! ممکن ہے یہیں اس نے ذکر کیا ہو۔

بلکہ حوالہ کیا تھا، باوجود ذہن پر زور دینے کے اسے یاد نہ آسکا، پھر اس کا گمان اسے کچا سا لگا، ہیں یہاں تک تو لڑکی کا ذکر ہی نہیں آیا تھا یہاں تک تو بس وہ لڑکا ہی ایک کردار تھا اور بس۔ ایک دائرے میں گھوم رہا تھا، اور اسے کوئی بات بھی ٹھیک سے یاد نہ تھی ہر بات کے بعد وہ کہاں بعض سے نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال اس حال کو مسترد کر دینے کے باوجود کہ لڑکی کا ذکر یہاں پر ہو گیا تھا اسے ایک سبہ تھا کہ شاید یہاں ذکر ہوا ہو بلکہ ضرور تھا کہ اس نے لڑکی کا ذکر غلط جگہ پر کر کے کہانی کے واقعاتی تسلسل کو بالکل برباد کر دیا تھا، وہ تو یہ بھی لکھ چکا تھا کہ وہ ایک صورت اس کے ذہن میں چپکی رہتی تھی، جہاں کہیں وہ ہوا اس کے ذہن سے چپکی رہتی، اسے حکم دیتی اور اس کے حکم کے مطابق وہ ایک معمول کی طرح حرکت کرتا تھا۔ اس صورت نے جس کے ہونٹ ذرا بھینچے ہوئے تھے اور جس کی آنکھوں کے گرد ہلکے ہلکے سکوڑ پڑے ہوئے تھے جو ہلکی سی ناراضگی کی وجہ سے بھی ہو سکتے تھے اور کسی دبی ہوئی مسرت کی وجہ سے بھی، اس کے ارادے کی جگہ لے لی تھی، بلکہ نہیں ارادہ تو اس کا اپنا ہی تھا وہ تو صرف اس کی طرف دیکھتا رہتا تھا، وہ ناراض ہے یا خوش لیکن کچھ یقین نہیں ہوتا تھا، وہ کبھی اس کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھی یا شاید دیکھتی ہو۔ لیکن ابتدا میں ہی یہ سب کچھ لکھ دینے کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے واقعات سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے اور اب ان کا تسلسل اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لڑکی کہانی میں تھی ضرور اور بہت اہم تھی لیکن وہ اس پوری کہانی میں کہاں پر سامنے آئی تھی۔ یہ بات وہ بھول گیا تھا اور اس نے ابتدا میں ہی لڑکی کے بارے میں وہ ساری تفصیلات بیان کر دی تھیں جو اسے اس لڑکے نے بتائی تھیں۔ واقعات جیسے جیسے ذہن میں آتے جاتے ہیں ویسے ویسے لکھ دیتا ہوں، پہلے لڑکی کا ذکر، پھر ایک، دو، تین چار ۔۔۔ لیکن یہ کیا شکل بنے گی، لڑکی کے ذکر کے بعد تو سارے واقعات بے معنی ہو گئے تھے اور میں نے اس کا ذکر سب سے پہلے کر دیا۔ کہانی کا فن تو مجھ سے بہتر اس لڑکے کو آتا تھا جس نے بہت دیر تک لڑکی کی ہوا بھی نہ لگنے دی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا واقعہ سناتے جا رہا تھا اور پھر نہ جانے کہانی میں لڑکی کہاں سے داخل ہو گئی تھی کہ یکایک پہلے اس کا ہلکا سا ذکر ہوا، پھر کسی اور واقعے میں اس کا ذکر آیا، پھر کسی اور میں پھر اور، یہاں تک کہ واقعات سارے کے سارے سکڑنے لگے، ان کی اہمیت کم ہوتی گئی، کم ہوتی گئی، پھر ایک ایک کر کے گم ہو گئے، پھر وہ لڑکا رہ گیا، واقعات ختم ہو گئے اور وہ لڑکی ہی کہانی بن گئی، پھر وہ لڑکا بھی پیچھے ہٹنے لگا اور پھر وہ کہانی بھی بن گئی اور کہانی سنانے والی بھی پھر ۔۔۔

کیسے ہو، تب مجھ سے شیخ نے فرمایا جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنی روح سے قوت دے کہ قبل پیدائش عالم حق تعالیٰ اپنی ذات میں موجود تھا اور موجودات اس میں فانی تھیں اور وجود کا کسی چیز میں ظہور نہ تھا۔ یہی کسر مُتی ہے کہ نہ اس کے اوپر ہوا ہے اور نہ نیچے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں شیخ سے یہ اسرار کی باتیں سنتا رہا کہ اس وقت میں تھا اور میرا شیخ تھا اور روزے رکھ رکھ کر میرا پیٹ میری پیٹھ سے جا لگا تھا اور جب میں ذکر کے بعد دعا میں گریہ کرتا تھا تو زمین دہل جاتی تھی اور آسمان مثل ایک پنکھ کے ہلنے لگتا تھا اور میرے پیر بھائی میری حالت پہ رشک کرتے تھے، اور میرے شیخ نے مجھ کو بہت فیض پہنچایا مگر مجھے یاد نہیں کہ میں شیخ تک کیسے پہنچا تھا اور جو راز کائنات کے مجھ پر ظاہر تھے وہ مجھے پہلے سے

معلوم تھے کہ شیخ نے مجھے بتائے تھے، شاید وہ مجھے پہلے سے آتے تھے، یا شاید میرے شیخ نے اللہ ان پر رحمت کرے اس علم سے میرے سینے کو بھر دیا تھا، کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا اور میں خدمت کرتا تھا خلق کی، وہ کون لوگ تھے مجھے معلوم نہیں ہے بس اتنا یاد ہے کہ روزوں کی کثرت سے میرا پیٹ بیٹھ سے جا لگا تھا اور میں گریہ کرتا تھا اور اس گریے کی آواز سے ادھر جو زندگی تھی وہ مجھے یاد نہ آتی تھی جب بھی میں یاد کرنے کی کوشش کرتا تو میرے اعصاب جھنجھنا اٹھتے اور مجھے زور کی متلی آتی۔ میں ذکر میں مصروف تھا اور مجھے یاد نہیں کہ میں کب سے ذکر کرتا تھا اور کب سے گریہ کرتا تھا کہ ذکر میرا رزق تھا اور گریہ میری دعا تھی اور میرے شیخ اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل کرے مجھ پہ بڑے مہربان تھے، سمجھے ہو۔

ظاہر ہے اس نے لڑکی کا ذکر یہاں تو نہیں کیا ہوگا اس لیے کہ اس زندگی میں جب وہ پوری دنیا سے کٹ چکا تھا اور روز و شب ایک عجیب عالم میں، عجیب کائناتوں میں بسر کرتا تھا۔ وہاں لڑکی کا کیا کام ہو سکتا تھا۔ لیکن بہر حال اس بات کا مجھے یقین تھا کہ لڑکی کا ذکر ہی کہانی کا اہم ترین حصہ تھا، بلکہ تھوڑی دور چل کر لڑکی ہی کہانی تھی اور اس کہانی کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں کے گرد ایک شکن تھی جو کہانی میں ایک طرح کی جھنجلاہٹ بھی پیدا کرتی تھی یا شاید یہ کوئی دبا ہوا تاثر تھا مسرت کا لیکن اصل سوال یہ تھا کہ یہ لڑکی کہانی میں داخل کہاں سے ہوئی تھی۔ کون کون سے واقعات اس سے پہلے تھے اور کون کون سے اس کے بعد اور میں ابتدائی پیراگرافوں میں لڑکی کا ذکر کر چکا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لڑکی کے آنے کے بعد سب واقعات سکڑنے لگے تھے اور اس کا چہرہ پھیلنے لگا تھا اور واقعات ختم ہو گئے تھے اور صرف اس کا چہرہ باقی رہ گیا تھا پھر اس کا ذکر کرنے والا بھی گم ہو گیا تھا اور وہ رہ گئی تھی اور اس کے چہرے پر ایک نقاب تھا جس کے ایک کنارے سے سورج طلوع ہوتا تھا اور دوسرے کنارے پر غائب ہوتا تھا اور واقعات سب ختم ہو گئے تھے اور مجھے یقین ہے کہ اس کا ذکر اتنا ہی اہم تھا، بلکہ وہی تھی اور کچھ نہ تھا اور میں اس کا ذکر ابتدا میں ہی کر چکا تھا ــــ

سمجھے ہو، اس دن میں نے بیان کیا کہ ابتدا اور انتہا اس زمانے کے لیے ہیں اور زمانہ پہلے نہیں تھا اور پھر ہوا اور پھر نہیں رہے گا اور دہر فانی نہیں ہے کہ صفات جلالیہ الٰہیہ میں سے ایک ہے اور بے شک زمانے کے چنگل سے تم نکل جاؤ تو تمہیں یاد بھی نہ ہوگا کہ تمہاری کوئی ابتدا تھی اور تم کہیں سے آئے تھے اور تم کہیں جا رہے ہو کہ تم ہمیشہ سے اس کے حضور موجود رہے مگر یہ کہ تم اپنے عین سے بے خبر تھے کہ تمہارا وجود اپنے ہونے کا ایک حصہ ہے اور یہ زمانے میں ہے اور اس کے نو حصے پنہاں ہیں اور پنہاں ظاہر ہو جائے، تو ظاہر فنا ہو جاتا ہے کہ جب چہرہ سامنے آ جائے تو جاننا چاہیئے کہ نقاب ہٹ چکا ہے اور جیسے جیسے چہرہ ظاہر ہوتا جاتا ہے حجاب ہٹتا جاتا ہے تا آنکہ عالم رہ جاتا ہے اور معلوم اس کے سامنے بے حجاب ہوتا ہے پھر عالم خود حجاب ہو جاتا ہے، پھر یہ حجاب بھی ہٹ جاتا ہے اور پھر نہ عالم رہتا ہے نہ معلوم رہتا ہے۔ العلم حجاب الاکبر ــــ

اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس نے لڑکے سے پوچھا تھا اس عمر میں تم ایسے اعلیٰ مقام پہ پہنچ گئے تھے۔ یہ سن کر وہ ہنسا تھا، نہیں آپ غلط سمجھے ہیں یہ کوئی بڑی اونچی باتیں نہیں ہیں، بس جو لوگ ان سے تعلق نہیں رکھتے ان کے لیے اجنبی سی ہیں۔ اسے اب بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ لڑکی کا ذکر کہانی میں کہاں سے شروع ہوا تھا۔ اس نے ایک بار پھر ان دو پیراگرافوں کو

پڑھا، لڑکی کا سراپا مکمل طور پہ بیان ہو چکا تھا، اس کی آنکھوں کے گرد شکن تھی اور اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے، اس کے ذہن میں شکل واضح ہونے لگی، پھر اسے شبہ سا ہوا، یہ تو دیکھی ہوئی صورت لگتی ہے یا شاید سنی ہوئی، کیا لڑکے نے اپنی گفتگو میں اسی تفصیل کے ساتھ اس کا حلیہ بیان کیا تھا، یا میں نے کبھی اسے غور سے دیکھا تھا۔ اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ اسے یقین تھا کہ ہوٹل کے کونے والی میز پہ بیٹھے ہوئے بہت توجہ سے اس لڑکے کی کہانی سنتے ہوئے ہی پہلی بار اس نے اس لڑکی کا ذکر سنا تھا، ایک ایک تفصیل سنی تھی، چہرے کے ایک ایک نقش کے بارے میں غور سے اس کی باتیں سنی تھیں، اتنے غور سے کہ اس کا چہرہ ذہن سے چپک گیا تھا اور وہ کہانی کے پہلے دو پیراگراف میں ہی اس لڑکی کا ذکر کر چکا تھا اور اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ کہانی غلط جگہ سے شروع ہو گئی ہے اور واقعات سب آپس میں گڈمڈ ہو کر رہ گئے ہیں۔ لیکن لڑکے کی گفتگو میں آنے والے ایک ایک واقعے کو ذہن میں کھنگالنے کے باوجود اسے یاد نہ آیا کہ لڑکی کا ذکر کہاں سے شروع ہوا تھا اور اس کے ذکر سے پہلے کے واقعات کیا تھے اور بعد کے کیا — اسے پھر ایک بار شبہ ہوا: ممکن ہے اس لڑکے نے اس کا ذکر ہی نہ کیا ہو۔" لیکن پھر یہ قصہ بیچ میں کہاں سے آ گیا"؟ اس کی کہانی کے دو پیراگراف سامنے ایک سفید کاغذ پہ لکھے ہوئے پڑے تھے، قلم اس کے ہاتھ میں تھا جس کی نب خشک ہو چکی تھی، لڑکی کے چہرے کی ساری تفصیلات لکھی جا چکی تھیں — اس کے منہ کا ذائقہ بگڑنے لگا اور پھر اسے ایک زور کی ابکائی آئی —

سچ ہے، وہ لڑکی کواڑ کی اوٹ میں کھڑی ہو کر ہمیشہ ہمارے شیخ کا وعظ سنتی تھی اور جب تک وہ کواڑ کی اوٹ میں رہتی میں بس لفظ سنتا تھا اور دل سے کواڑ کی اوٹ کی طرف متوجہ رہتا تھا اور پناہ مانگتا تھا شیطان کے شر سے جو کھلا دشمن ہے لیکن ہم میں سے سب نے بس کبھی اس کی نیلی اوڑھنی کی جھلک دیکھی ہو تو دیکھی ہو، اسے کوئی نہ دیکھ پایا اور جس دن وعظ ہوتا اس رات میرا گریہ اس شدت کا ہوتا کہ زمین دہل جاتی اور آسمان مثل ایک پنکھ کے ہلنے لگتا تھا۔ میں پناہ چاہتا تھا شیطان کے شر سے یا اس سے ملنا چاہتا تھا جس کی اوڑھنی کی ایک جھلک شاید میں نے دیکھی تھی یا شاید نہیں دیکھی تھی — کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا —

اسے بالآخر یہ یاد آ گیا کہ لڑکی کا ذکر کیسے ہوا تھا، لیکن اب وہ دوسری لڑکی کون تھی جس کے سراپے کو وہ بیان کر بیٹھا تھا اور کہانی غلط جگہ سے شروع ہو گئی تھی۔ یہ لڑکی کون ہے، ہونٹ بھینچے ہوئے، آنکھوں کے گرد ایک ہلکی سی شکن۔ لیکن اس کا ذکر کہیں نہ کہیں تھا ضرور۔ یہ کون تھی، ہوٹل کے کونے والی میز پہ بیٹھ کر جو کہانی اس نے سنی تھی اس میں یہ لڑکی کہاں سے آ ٹپکی تھی، اب اسے یاد آ گیا تھا کہ اس کہانی میں تو وہ لڑکی کواڑ کی اوٹ میں تھی اور اس کی اوڑھنی کی ایک جھلک —

تب شیخ نے فرمایا کہ ایک پرندہ اس شجر کی ڈالیوں پہ پھدکتا تھا اور چھوٹے چھوٹے پھل چن کر کھاتا تھا، جب اس کے حصے میں کوئی میٹھا پھل آتا تو وہ خوشی سے چہکتا اور جب اس کے حصے میں کڑوا پھل آتا تو وہ تلملا جاتا اور اس ڈال سے پھدک کر اوپر والی ڈال پہ جا بیٹھتا، ایک مرتبہ جو اس نے اوپر نظر اٹھائی تو اس نے دیکھا کہ درخت کی پھننگ پہ ایک سنہری کلغی والا عقاب آنکھیں موندے سکون کے عالم میں بیٹھا ہے۔ اس پرندے نے عقاب کے سکون

اور اس کی بے نیازی پر حیرت کی اور پھر ڈالی سے پھل چننے میں مصروف ہو گیا اور جب اس کی تقدیر میں کڑوا پھل آیا تو وہ پھدک کر اوپر والی ڈالی پر جا بیٹھا اور پھر اس نے سنہری کلغی والے عقاب کی طرف دیکھا اور حیرت کی۔ کافی دیر میں پھل چنتے چنتے اور عقاب کی بے نیازی پر حیرت کرتے وہ پھننگ کے قریب جا پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ گویا اس کا جسم ایک مدت سے پگھلتا ہے اور پھر اسے لگا کہ پھننگ پر بیٹھا ہوا عقاب شروع سے آخر تک وہ خود ہی تھا اور جو پرند پھل چنتا تھا اور حیرت کرتا تھا وہ بھی وہ خود ہی تھا۔ پھر اس پر کھلا کہ جس شجر پر وہ بیٹھا ہے وہ شجر بھی وہ خود ہی ہے۔ میں اس حکایت کی رمز اس وقت نہ سمجھا تھا کہ کواڑ کی اوٹ میں اوڑھنی کی جھلک ـــ

یہ درست ہے کہ ہوٹل کے کونے والی میز پر کہانی سنتے ہوئے، وہ کہانی کی بے ترتیبی سے کبھی بور بھی ہو جاتا تھا اور کبھی اسے اس پر رشک بھی آتا تھا کہ بے ترتیب واقعات میں کیسی اچھی ترتیب اس لڑکے نے پیدا کر دی تھی جیسے ایک ڈالی اور پھر دوسری۔ مگر یہ لڑکی کون ہے۔ کہانی غلط جگہ سے شروع ہو گئی ہے اور اب اسے یہ یاد بھی آ گیا کہ لڑکے نے تو صرف اوڑھنی کا ذکر کیا تھا۔

"یہ شخص مجھے پاگل لگتا ہے۔ بس گھورے جا رہا ہے"۔ لڑکی نے اپنی ساتھی سے کہا۔ وہ خوفزدہ سی ہو کر تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ اس نے ایک چست سا برقعہ پہن رکھا تھا جس کے نقاب سے اس کی آنکھیں اور آدھا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ساتھ والے شخص کے بھی قدم تیز ہو گئے۔ "ہوں پاگل۔ نہیں پاگل تو نہیں لگتا، مگر عجیب آدمی ہے۔" چند لمحے تیز تیز چلنے کے بعد اب لڑکی کی چال میں ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہو رہا تھا۔ جیسے اس نے اپنے خوف پر قابو پا لیا ہو، وہ پیچھے مڑی، اس نے ایک جھجکتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ اسے نہیں دیکھ رہی ہے۔ لڑکی کی آنکھ میں ناراضگی کی ایک ہلکی سی جھلک تھی، یا شاید مسرت کا کوئی تاثر ہو، اس کی آنکھ کے گرد ایک شکن سی پڑی ہوئی تھی۔ وہ اب بھی لڑکی کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا، پاگلوں کی طرح اسے گھورتا ہوا۔ وہ ایک لمحے کو رکی تو وہ بھی ٹھہر گیا۔ اس کی نگاہیں لڑکی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ ایک سفید بے داغ وسعت تھی اور اس وسعت پر دو آنکھیں جڑی تھیں پھر تاریکی چھٹنے لگی اور اس نے دیکھا کہ نقاب آہستہ آہستہ ـــ

سمجھے ہو، ایک دن میں نے دیکھا کہ کواڑ کی اوٹ سے اوڑھنی کا پلو ہوا سے ذرا سا ہلا اور اس کے ساتھ ہی جانو گویا میرا دل بھی ہلا۔ میں نے کہا ہجر کی آگ تیز تر ہوئی اور گریہ اسے سرد نہیں کر سکتا۔ تب میں نے ایک چیخ ماری۔ اور گریباں چاک کر دیا اور مجھے یاد نہیں کہ شیخ کی محفل سے میں کس عالم میں اٹھا اور کس سمت کو گیا۔ میں گریہ کرتا تھا اور کہتا تھا اے ہوا میں اڑنے والے اوڑھنی کے پلو تیرا علم میرے سینے حجاب بن گیا ہے اور میرا دن مجھ پہ تاریک ہو گیا ہے۔ پھر یہ تاریکی چھٹنے لگی اور میں نے دیکھا کہ نقاب آہستہ آہستہ سرکتا جاتا ہے اور اس کے [illegible] سے ایک چہرہ نمودار ہوتا جاتا ہے اور میں خود نقاب کے ساتھ ساتھ سرکتا جاتا ہوں۔

اسے خیال ہوا کہ وہ یہ صفحہ پھاڑ کر پھینک دے۔ اس نے ایک بار پھر اس بیان کو پڑھا پھر اس کاغذ کو پھاڑ دینے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ اٹھا اور چلنے لگا، پاگلوں کی طرح خلا میں گھورتا ہوا، پھر اسے یکایک معلوم ہوا کہ اسکے

قدموں تلے ریت ہے اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا "سے شیخ اس حیات کی حقیقت سے میرے سینے کو روشن فرما دیجیے" تو شیخ نے فرمایا لفظ اس کی تفسیر سے عاجز ہیں اور میرا حلق خشک ہوا جاتا ہے اسے کاش کہ تو کہیں سے پانی کی بھری چھاگل لا دیے۔

وہ پانی کی تلاش میں بھاگتا ہوا جا رہا تھا کہ یکایک اس کو ایک گاؤں کی حد دکھائی دی۔ وہ اس کی طرف بڑھا اور اس نے دروازے پر دستک دی تب کواڑ ہلکے سے وا ہوئے اور اس میں اوڑھنی کا ایک پلو نظر آیا۔ اس نے پلو کو دیکھا اور پھر ایک آواز سنی "کیا ہے" "پانی" اس کے اوسان دیر تک درڑتے رہنے کی وجہ سے جواب دے رہے تھے پھر اس نے ایک گورا ہاتھ آگے بڑھتا ہوا دیکھا جس میں ایک پیالہ تھا، پانی پی کر اس کے اوسان بجا ہوئے تو اس نے گورے ہاتھوں اور آسمانی اوڑھنی والی سے باتیں کرنی شروع کر دیں، اسے یاد بھی نہ رہا کہ وہ کس کام سے آیا ہے۔ پھر وہ باتیں کرتا رہا، کواڑ کھلا اور وا ہوئے اور وہ چوکھٹ پر بیٹھ گیا اور باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ اسی گھر کا ایک فرد سا بن گیا اور اس نیلی اوڑھنی والی سے اس نے نکاح کر لیا۔ کچھ عرصے کے بعد اسی گاؤں میں اس نے تھوڑی سی زمین خرید لی، اپنا گھر بنایا، اس عرصے میں اس کی بیوی نے ایک بچہ جنا، ہوتے ہوتے سات برس گزر گئے کہ ایک دن قریبی ندی کا بند ٹوٹا تو پانی گاؤں میں داخل ہو گیا۔ پہلے اس کے صحن کی کچی دیوار ڈھئی پھر اس نے اپنے بچے کو گود میں اٹھایا اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کر وہ گھر سے باہر نکلا کہ کسی اونچی جگہ پناہ لے۔ اس کی بیوی نے سیاہ رنگ کا نقاب پہن رکھا تھا اور خوفزدہ انداز میں تیزی سے چلی جا رہی تھی، اس کا آدھا چہرہ چھپا ہوا تھا، یکایک پانی کا ریلا جو آیا تو اس کی بیوی کو بہاتا ہوا لے گیا وہ اسے پکڑنے کے لئے لپکا تو بچہ گود سے نکل کر پانی کے تیز ریلے میں بہتا ہوا اس کی آنکھ سے اوجھل ہوا۔ یہ دیکھ کر اس نے گریہ کیا کہ زمین دہل گئی اور آسمان شق ہو کے پھٹنے لگا اور اس کے کاندھے پر ایک ہاتھ پڑا۔

"پانی نہیں لائے؟" شیخ نے پوچھا۔

سر پہ سورج چمک رہا تھا، پاؤں کے نیچے گرم بالو تھا اور پسینے میں شرابور تھا، اس کے ایک ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پہ دو پیراگراف لکھے ہوئے تھے اور دوسرے ہاتھ میں دو سو انسٹھ روپے اٹھارہ پیسے تھے۔

خاکے

بزرگوارم

محمد طفیل

میں جتنے متن شخصیت طرازی میں ثنا طرازی کے کرتا ہوں۔ اُتنے متن ثنا طرازی میں شخصیت طرازی کے نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں پشیمان اور میرے ممدوح پریشان ہو جاتے ہیں۔ یوں حیرت سامانی میرے حصے میں آتی ہے اور حیرانی میرے ممدوح کے حصے میں، ہم دونوں میں سے سچا کون ہوتا ہے۔ یہ آج تک کسی نے نہیں بتایا۔

یادش بخیر! میں آج مضمون حفیظ جالندھری[1] کے بارے میں لکھنے لگا ہوں جو شاعر ہیں۔ اس لیے میرے مضمون میں جہاں "شاعری" در آئے۔ اُسے میرا عجز جاننے کے ساتھ ساتھ، حفیظ صاحب کے کمالات کا پرتو بھی سمجھئے گا یوں تو میں نے اور شاعروں پر بھی مضمون لکھے۔ لیکن میں نے اُن میں شاعری کو کم سے کم داخل ہونے دیا۔ آج میری وہ اکڑ فوں بھی نکل جائے گی۔ اس لئے کہ حفیظ صاحب کی زندگی، جیسے ان کی شاعری سے ملوث ہے اور کسی شاعر کی نہیں۔

یہ وہی صاحب ہیں جن کے احترام میں پوری قوم کو کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ یعنی ان کا ترانہ! اگر کھڑے ہو کر نہ سنیں تو غیر مہذب کہلائیں۔ مارشل لا لگا ہوا ہو تو سزا ایک کا ٹھیں۔

ایک دن فرمانے لگے۔ "میں دو تین مرتبہ آیا۔ مگر تجھ سے ملاقات نہیں ہوئی"۔

"میں یہاں نہیں تھا۔ آپ کے سسرال گیا ہوا تھا۔"

"جالندھر"؟

"نہیں لندن"!

(ان کی ایک بیوی انگریز بھی تھیں۔ اس لئے میں نے لندن کو ان کا سسرال کہا)

"اچھا اچھا! — بتاؤ اب اُس قوم کا کیا حال ہے"؟

"آپ نے تو اُس قوم کو خوب ٹھونک بجا کے دیکھا ہے۔ اس لئے مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔"

"جب میں لندن گیا تھا۔ اُن دنوں وہ قوم صاحب کردار تھی۔ چار دانگ دھوم تھی۔ وہ محاورہ کہ اُن کی سلطنت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ سچ تھا مگر اب سنا ہے کہ وہ قوم حد درجہ تنزل کا شکار ہے۔ غنڈہ گردی، ہلڑ بازی ان کا شیوہ ہے۔ ہر

---

[1] پیدائش ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۰۰ء

اخلاقی گراوٹ آرٹ ہے۔ کیا یہ سچ ہے"؟

"سچ ہے"۔

"اگر یہ سچ ہے تو پھر کوئی اور بات کرو"۔

حفیظ صاحب نے اپنے حالات، اپنی مختلف کتابوں میں لکھے ہیں۔ جو باتیں لکھ چکے ہیں۔ انہیں دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تکرار میں کچھ لطف ہوتا تو بھی یہی فائدے نقصان کے چکر سے نکل جاتا۔ اس سوچ کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے مصداق ہی، لیکن کچھ نہ کچھ دہراؤں ضرور!

حفیظ صاحب کہتے ہیں کہ چند لڑکے بالے کرکٹ کھیل کر واپس آرہے تھے کہ ایک حویلی میں واہ وا سبحان اللہ کا شور سنا ہم بھی جا کے وہاں بیٹھ گئے۔ جب وہ کہتے۔ سبحان اللہ! ہم بھی کہتے۔ سبحان اللہ۔ جب وہ کہتے واہ وا، ہم بھی کہتے واہ وا ــــ اس صورتِ حال سے سامعین بدمزا ہوئے۔ انہوں نے ڈپٹ کر کہا۔ "نکل جاؤ۔ یہاں سے"۔ چونکہ بچپن میں پیار سے کہی ہوئی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ لیکن غصّے سے کہی ہوئی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس لیے ڈٹے رہے۔

جب انہوں نے دوبارہ کہا۔ "نکل جاؤ یہاں سے"۔ میں نے کہا۔ "نہیں جاتے"۔ اس پر انہوں نے ٹھکائی کر دی۔ سر پھٹ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جو شخص پگڑی باندھے شعر پڑھ رہا تھا۔ وہ مولانا گرامی تھے۔

میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ میں نے پہلا شعر جو لکھا تھا۔ وہ یہ تھا ؎

محمدؐ کی کشتی میں ہوں گا سوار   تو لگ جائے گا میرا بیڑا بھی پار

یہ بھی فرمایا کہ جب میں نے بارہ برس کی عمر میں پہلی غزل کہی تو دوستوں نے مشورہ دیا کہ کسی اُستاد کو بھی پکڑ لو۔ ورنہ شتر بے مہار ہو جاؤ گے۔ چنانچہ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق شیر شاہ اسد نامی ایک شخص سے غزل پر اصلاح لی۔ اُس نے میرے اشعار بے وزن کر دیئے۔ مجھے تاؤ آگیا تکرار بڑھی تو میں نے اس کی ہجو لکھ ڈالی جس کے دو تین مصرعے اب بھی یاد ہیں۔

یہ مہرباں کو محرباں بنا دیتے ہیں
ساتھ ہی وہ ہمہ داں ہونے کی کد کرتے ہیں
شیر شاہ نام، تخلص وہ اسد کرتے ہیں

لیجئے مُنا میں نے تکراری گناہ کا مرتکب ہونا تھا۔ ہو لیا۔ آیئے اب اپنے ڈھب سے باتیں کریں۔ اللہ توفیق دے تذکرہ شعرائے پنجاب میں اِن کا سن پیدائش ۱۸۹۶ء لکھا ہوا ہے۔ یہ خود ۱۹۰۰ء بتاتے ہیں۔ معلوم نہیں کم عمر بتانا حقۂ خواتین والی بات ہے یا یہ کہ پیدائش ہی ایک سال بعد کی ہے۔ بہرحال یہ ایک سال پہلے پیدا ہوئے ہوں یا بعد میں کوئی فرق نہ پڑے گا۔ پیچ سے چہرے پہ جھریوں کے آثار ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہہ دیں۔ "ابھی تو میں جوان ہوں" تو میں یا آپ کیا کر سکتے ہیں۔

سن پیدائش کے سلسلے میں مہینہ کا تعین یوں کرتے ہیں۔ "غالباً مہینہ رمضان ہی کا ہوگا۔ جبھی تو فاقے کر رہا ہوں"۔

میرا دل چاہتا ہے کہ فاقوں والی بات پر بھی چند جملے کہہ دوں۔ یہ بھی غالباً میری طرح کے لوگوں میں سے ہیں جو یہ کہتے رہتے

ہیں کہ مر گئے مر گئے۔ کچھ نہ ملا۔ یہ صحیح ہے کہ جملہ ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔ آسودگیاں منہ چھپائے پھرتی ہیں۔ اس کے باوجود کوئی "دشمن" یہ بھی کہہ سکتا ہے۔ مزے میں ہیں اور کیا چاہیئے؟ یہی میں حفیظ صاحب سے کہتا ہوں۔ جناب اور کیا چاہیئے؟

ایک دن حفیظ صاحب تشریف لائے تو میں اپنے ایک ضروری کام میں منہمک تھا۔ پہلے تو میں چپکے سے اپنا کام کرتا رہا۔ پھر سوچا۔ یہ زیادتی ہے۔ مخاطب کر کے پوچھا "اگر آپ اجازت دیں تو دو ایک منٹ میں اپنے اس کام سے نپٹ لوں"؟

"ضرور، میرا ابھی سانس پھولا ہوا ہے۔ بولنے کی سکت نہیں۔"

کام سے فارغ ہو کر پوچھا۔ "کیسے ہیں"؟

میرے استفسار پر بولے کچھ نہیں۔ انگلی سے سر کی طرف اشارہ کر کے کچھ سمجھانا چاہا مگر میرے پلے کچھ نہ پڑا۔

"کیا ہوا سر کو"؟

"یہ!"

"یہ کیا"؟

"یہ!"

"جناب یہ کیا"؟

"یہ سر ہے۔"

"جی ہاں سر ہے۔"

"یہ اب کام نہیں کرتا۔ یادداشت جاتی رہی ہے۔" [پھر انگلی کے اشارے کے ساتھ] ــ یہ ــ یہ ــ یہ بالکل کام نہیں کرتا۔" [پھر وہی استفہامیہ مسکراہٹ، جس میں چہرے پہ منہ کا بایاں حصہ نمایاں کردار ادا کرتا ہے]۔

حفیظ صاحب کی گفتگو کا ایک خاص انداز ہے جو انہی سے مخصوص ہے۔ مثال کے طور پر یہ ایک جملہ ادا کریں گے تو دوسرا جملہ کہنے کے درمیان اپنی ایک خاص مسلسل مسکراہٹ کو جاری کر دیں گے۔ اس کے ساتھ دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے ایک خاص قسم کا زاویہ بنائیں گے پھر انہیں ذرا ذرا سا ادھر اُدھر کر کے، ان سے وہ کام لیں گے کہ مخاطب پہ معاملے کی جملہ نزاکتیں واضح ہو جائیں گی بعض اوقات یہ ہوتا ہے وہ مسکرائیں گے مخاطب سمجھے گا کہ مسلسل مسکراتے رہیں گے مگر یہ چکمہ دے جائیں گے۔ ذرا سا ہنس کر ایک دم سنجیدہ ہو جائیں گے اتنا سنجیدہ کہ مخاطب ہکا بکا رہ جائے مطلب یہ کہ ان کی گفتگو میں الفاظ کا استعمال کم سے کم ہوتا ہے۔ منہ کا اور ہاتھ کا استعمال زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ ہر بات اسی ہے۔ جو میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ گفتگو فرما رہے ہیں اور گفتگو میں طوفان بنے ہوتے ہیں۔ یعنی جو کہنا چاہ رہے ہیں۔ کہہ نہیں پا رہے۔ ایسے میں ایک دم اٹھ کر کھڑے ہو جائیں گے اور کھڑے ہو کر اکڑ جائیں گے۔ اس کے بعد مخاطب سے آنکھیں چار کریں گے۔ پھر ایک دم چل دیں گے اور مجھ! یا غضب کا ہاں منہ کھڑا رہ جائے گا یعنی جب ہاتھ اور منہ سے تکلم کا کام نہ لیں گے تو پھر ہمارے ساتھ یہ سلوک کریں گے۔ یہ ادا وانداز بھی انہی کا حصہ ہے۔ انہی سے مخصوص!

ایک دن مسز نبیرہ، دو شیزہ مشی ہوا تھیں کہ یہ تشریف لے آئے۔ میں نے جلدی سے تعارف کرا دیا تا کہ کوئی ایسی بات نہ کریں

ا سے ایب ۔ صابو ۔۔۔

کہ بعد میں بیوی کو سمجھانا مشکل ہو جائے۔

"یہ میری بیوی ہیں ——— اور ——— یہ حفیظ جالندھری ہیں"

دونوں نے مسکرا کر، بغیر کچھ کہے، اپنی اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ مگر یہ جو مسکراتے پر آتے ہیں تو تواتر کے ساتھ ایسا جم کے مسکراتے ہیں کہ دوسرا بیچارہ بکارہ جاتا ہے۔ پہلے تو میری بیوی حفیظ صاحب کے منہ کی طرف دیکھتی رہیں جب ان کا مسکرانا ختم نہ ہوا تو میری طرف دیکھنے لگیں اور میں ان دونوں کی طرف دیکھ دیکھ کر کچھ لطف اندوز ہوتا رہا۔ کچھ جھینپتا رہا۔

اچھی خاصی لمبی مسکراہٹ کے بعد حفیظ صاحب نے اونچی آواز میں فرمایا۔ "بیٹی"!

"جی"!

"بے لی"!

"جی"!

"یہ طفیل بڑا بدمعاش ہے"

اب میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے، اس لئے کہ بیویاں تو اچھے بھلے شریف شوہروں کے بارے میں بھی طرح طرح کے وسوسوں میں گرفتار رہتی ہیں۔ پھر جب انہیں ایسی معتبر شہادت ملتی ہو تو وہ کیوں نہ معنی خیز انداز میں سر ہلائیں۔ چنانچہ سر ہلا اور میری جان گئی۔ سوچا، آج رات جنگ و جدل ہی میں گزرے گی۔ چنانچہ حواس بجا کر کے کہا۔ "حفیظ صاحب! میری بیوی، میری بدمعاشیوں کی تفصیلات جان کر خوش ہوں گی۔ بارے بیان ہو جائے گی"

"بیٹی اس جیسا مخلص آدمی میں نے نہیں دیکھا۔"

میری بیوی، میری تعریف سننے کے موڈ میں نہ تھیں۔ بلکہ معاملے کی کھوج کا موڈ وارد ہو چکا تھا۔ "یا کیا کرتے ہیں"؟

"بدمعاشی ایسے سلیقے سے کرتا ہے کہ سب واہ وا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"

"مثلاً"؟

"واہ وا"!

میری بیوی جلد سے جلد میرے لچھنوں سے آشنا ہونا چاہتی تھیں۔ جو کچھ حفیظ صاحب کے دل میں تھا۔ زبان پر نہیں آتا تھا۔ اسی لیے انہوں نے کچھ بے تابی ہی سے کہا۔ "کچھ بتاتے تو ہیں نہیں۔ خواہ مخواہ ———"

"واہ وا"

اب پھر میری بیوی نے، میری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ جیسے سمجھا رہی ہوں۔ "معاملہ تو ہے۔ ویسے ہی نہیں دوست ہیں۔ یعنی سمجھے"! تھوڑی دیر تذبذب میں گزری۔ اس کے بعد حفیظ صاحب نے فرمایا۔ "اس نے غزل نمبر چھاپا۔ اس میں اساتذہ کا کلام بھی چھاپا۔ تبدیلیوں کا کلام بھی چھاپا۔ سب کو ایک ساتھ کھڑا کر دیا۔ اب میں میر کے سامنے غزل پڑھ رہا ہوں میر میرے سامنے پڑھ رہا ہے۔ غالب مومن کے سامنے غزل پڑھ رہا ہے، مومن غالب کے سامنے پڑھ رہا ہے۔ اسی طرح سب کے سب ایک دوسرے کے سامنے پڑھ رہے ہیں۔ اب اس ایک نمبر کے ذریعہ سب کو اپنی اپنی قیمت معلوم ہو جاتی ہے۔ اب ان میں سے کوئی شاعر

خفیف ہو رہا ہے۔ کوئی خوشش ہو رہا ہے۔ کوئی تن رہا ہے۔ کوئی "مٹن" رہا ہے۔ یہ بدمعاشی نہیں تو اور کیا ہے" ؟

حفیظ صاحب کا ابتدا میں اٹھنا بیٹھنا عام لوگوں کے ساتھ ہی تھا۔ کسی پھل فروش کے ساتھ، کسی تندوریئے کے ساتھ، کسی حجام کے ساتھ، غرض زیادہ تر یاری نچلے طبقے کے ساتھ تھی اور یہ بات ان کے فن کے لیے مفید بھی ثابت ہوئی۔ انہوں نے زندگی کی عکاسی، عوامی سوچوں سے ہمکنار ہو کر کی اور عوام کے لیے کی۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے عوامی شاعر یہ ہیں۔ اُتنے فیض احمد فیض بھی نہیں۔ فیض بے شک عوام کے لیے لکھتے ہیں مگر ان کی شاعری عوام کے لیے نہیں ہے۔

حفیظ صاحب کے بچپن کے ساتھیوں میں، ایک پھل فروش، پچھلے دنوں تک، لاہور میں شملہ پہاڑی کے قریب پھل بیچا کرتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ فیجے کے (حفیظ کے) نانا مال دار تھے۔ انہوں نے فیجے کو متبنّٰی بنایا ہوا تھا اور فیجا کبھی کبھی نانا کی دولت پر ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ جو کچھ اس کے ہاتھ لگتا۔ لے آتا اور ہم سب مل کر گلچھرے اڑاتے۔

جب ایک موقع پر فیجے کے ہاتھ روپے لگے تو ہم سیر سپاٹے کی غرض سے لاہور کی طرف چل دیئے۔ ہم مال روڈ پر جا رہے تھے۔ دیکھا تو فیجا غائب، پیچھے لوٹے تو دیکھا کہ فیجا ایک جگہ بیٹھا رو رہا تھا۔

ہم نے پوچھا۔ "رو کیوں رہے ہو" ؟

فیجے نے کہا۔ "یہاں سے سڑک پار کرتے ہوئے، ایک موٹر سوار نے، موٹر میں سے پرے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "اندھے ہو" ؟

"جب سے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اندھا وہ تھا یا میں ہوں؟ وہ شاید آنکھوں والا اس لیے تھا کہ اس کے پاس موٹر تھی اور میں اندھا اس لئے ہوں کہ پیدل چل رہا ہوں"

ابتدائی زندگی میں، یعنی آوارہ گردی کے دور میں، انہوں نے کپور تھلہ میں ایک بیٹھک کرایہ پہ لے رکھی تھی۔ چند دوست اکٹھے ہو کر دھما چوکڑی مچایا کرتے تھے۔ خوب ہاہو ہوا کرتی تھی۔ گانے ہوتے تھے۔ گالی گلوچ ہوتی تھی۔ حقہ پینے والے حقہ پیا کرتے تھے۔

ان کی بیٹھک کے ساتھ سکھوں کا گھر تھا۔ وہ ہاہو تو برداشت کر رہے تھے مگر اُن سے اِن کا حقہ پینا برداشت نہ ہوا۔ انہوں نے شکایت کی۔ "مہاراج! گائیے۔ شور مچایئے مگر حقہ نہ پیجئے"۔

جب سردار صاحب نے چنڈال چوکڑی سے بات کی تھی۔ اُس وقت یہ موجود نہ تھے۔ انہوں نے سنا تو کہا کوئی بات نہیں ہم اس کا علاج کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک بانی لکھی اُسے اونچے سُروں میں گایا۔ پھر گایا۔ پھر گایا۔ نیچے لوگ اکٹھے ہو گئے جو محظوظ ہوتے۔ چنانچہ سردار صاحب دوبارہ ان کے پاس پہنچے اور کہا۔ "مہاراج ہم آپ کے ہمسائے ہیں۔ ہمارا بھی آپ پر کچھ حق ہے۔ مہاراج اور سب کچھ کیجئے بے شک حقہ بھی پیجئے مگر یہ بانی نہ گایئے"۔

وہ بانی یہ تھی:

نا تیا تجھ بن کون گرو
کون گرو بھئی ہولا یارہ

نا ئیا تجھ بن کون کرُو
لپ لپ جُوآں سر وِچ ساڑے
لیکھاں نے لکھ ہجار۔ تے نا ئیا تجھ بن
کون کرُو ہولا
اُسترے قینچیاں ، پاس نہ ساڑے
اچھا ادسے رب کرتار
نا ئیا دشدہ بن کون کرُو ہولا پار

ایک بانی اور بھی تھی۔ جو کہ حفیظ صاحب نے مجھے سنائی تھی۔ افسوس کہ میں اُسے نقل نہیں کر سکتا۔ تصور کر لیجئے کہ اس معاملے میں انہوں نے نظیر، جرأت، انشاء اور رنگین تک کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ سچ کہتا ہوں کہ یہ کسی معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں۔

میں نے ایک آپ بیتی نمبر بھی چھاپا ہے۔ اس کے لیے تمام نامور لکھنے والوں سے درخواست کی تھی کہ اپنی اپنی آپ بیتی سے نوازیں۔ خوب خوب آپ بیتیاں آئیں، جو جو جس نے چاہا۔ وہ وہ لکھا۔ ہاتھ کون روکتا۔ مگر حفیظ صاحب کی آپ بیتی سب سے مختلف تھی۔ اور دوں کی اپنی اپنی مدح میں، ان کی اپنی قدح میں، میں حیران، یہ حوصلہ!

حفیظ صاحب کا خیال ہے سوانح جمع ہے سانحہ کی، اس لیے سوانح لکھنے کی نوبت آئے تو صرف سانحات کا ذکر ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے آپ بیتی نمبر میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ جس کی تفصیل میں جانا مناسب نہ ہوگا۔ لیکن مختصراً ذکر بہر طور، اس ضمن میں لابدی ہے۔

دو بھائی جو ان کے کلاس فیلو تھے۔ اُن کی شادی ایک ہی دن ہونا قرار پائی تھی۔ وہ بھی ان کی دونوں خالہ زاد بہنوں سے، جس طرح بھائیوں کی عمروں میں ایک سال کا فرق تھا۔ اُسی طرح دلہنوں کی عمروں میں کم وبیش کچھ ایسا ہی فرق تھا۔ بھائیوں نے ان سے کلاس فیلگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارا سہرا لکھ دیجئے۔ جسے انہوں نے منظور کر لیا تھا۔ یہ بات اس دور کی ہے کہ جب حفیظ صاحب اچھے خاصے شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ بلکہ ایک رسالے (اعجاز) کے ایڈیٹر بھی تھے۔

ان کی نظر میں ذوق و غالب کے سہرے بھی تھے اور یہ اُن سے بڑھ کر سہرا لکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ختراع یہ کی کہ دونوں بھائیوں کا ایک سہرا لکھا۔" چونکہ دونوں کے چہروں پر چیچک کے بھرپور داغ، رخساروں کی بلند کی تہہ میں اندر دن تک معمور یا امور تھے۔ میں نے ان کو کھلے ادھ کھلے نمایاں پھول بنایا اور الف اور ب کی ت ث ان دیکھی دلہنوں کی تصوری گل رخساری کے عکس بنا کر اس ایک ہی سہرے میں پرو کر سجا دیا اور دونوں کی ناکیں اس سہرے کے چہرے پر شاہانہ گل تھیں اور دونوں دولہاؤں کے منہ ادھ کھلے گلابی غنچے وغیرہ وغیرہ!

مجھے یقین تھا اور میں الفاظ کو کاغذ پر لاتے ہوئے وجد میں تھا کہ سہرا نویسی کی تاریخ قدیم میں چیچک قسمے کی کھیل

اور غنچے پہلی مرتبہ میں نے ہی بنا ڈالے ہیں۔ ان دو سگے دو لہا بھائیوں اور دو سگی بہنوں کو جو آج کی رات سے بیویاں بن رہی تھیں۔ تادم سے اس دم تک کسی شاعر نے ایسا اکلوتا تحفہ پیش نہیں کیا ہوگا۔"

انہوں نے نہ صرف سہرا لکھنے پر پورا زور باندھا تھا۔ بلکہ خود بھی خوب بن ٹھن کے پہنچے تھے۔ جیسے آج دوستوں سے اپنی برطائیوں کا اقرار کرا کے ہی رہیں گے۔ اعلان ہوا۔ حفیظ بھائی سہرا پڑھیں گے۔

انہوں نے ایک شعر پڑھا۔ کسی نے نوٹس نہ لیا۔ دوسرا شعر پڑھا کسی نے نوٹس نہ لیا۔ تیسرا شعر پڑھا کسی نے نوٹس نہ لیا تو بڑے پریشان ہوئے۔ کیونکہ یہ تو مشاعروں میں واہ وا اور سبحان اللہ سننے کے عادی تھے۔ یہاں عالم ایسا تھا کہ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ شیخ برادری کے برائی جیسے ان کی آفاقی واردات پر ہکے بکے ان کا منہ تکنے کی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ بالآخر سکوت ٹوٹا۔ وہ اس طرح کہ ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ وہ آواز ایسی تھی کہ جیسے کوئی مرغی اپنے لیے ہوئے حلق سے قُٹ قُٹ، قُقُق قُٹ قُوقُو کر رہی ہو اور لوگ تھے کہ بے حال، اپنی ہنسی کو ضبط کرنے کے لیے، اپنے اپنے رومال منہ میں ٹھونس رہے تھے اور یہ تھے کہ سہرا پڑھ رہے تھے اور اُدھر قُٹ قُٹ قُقُق قُٹ !

کچی عمر میں انہوں نے بڑے دُکھ اٹھائے۔ مزدور بن کر مزدوری کی۔ درزی بن کر کپڑے بیئے۔ عطر فروش بن کر عطر بیچا۔

مزاج تو ان کا لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں سے عطر بکے کیسے؟ جب کہ خریدار کو "خود ہدیۃً" پیش کر دینے کی خواہش نے ان کا دیوالہ نکال رکھا ہو۔ یوں وہ ہزاروں روپوں کی رقم، جو ان کے نانا نے، ان کے لیے خرچ کر کے انہیں برسرِ روزگار کرنا چاہا تھا۔ وہ ان کی عاشقی کے ہاتھوں غارت ہو گئی۔ چنانچہ ایک دن، ان کے اور نانا کے درمیان حساب فہمی ہوئی۔

"میں نے جو تمہیں ہزاروں روپوں کا عطر ڈال کے دیا تھا۔ وہ کیا ہوا"؟

"بک گیا۔"

"پیسے کہاں ہیں"؟

"کسی نے دیئے نہیں۔"

"پیسے نہیں لیے تھیں"؟

"جی نہیں۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ تم لڑکیوں کو عطر خود ہی تحفتہً دیا کرتے تھے۔"

"میں ہر لڑکی کو تو نہیں دیتا تھا۔"

"کیسے"؟

"جسے جی چاہتا تھا۔"

یہ اچپل بھی بہت ہیں۔ زندگی کو سہانا پن دینے کے لیے، یہ ایسی شرارتوں سے بھی باز نہیں آسکتے۔ جن کا

ہ ان کی کتنی ہی شبیہ کیوں نہ ہو۔ ان کے ساتھیوں میں ہری چند اختر بھی ایسے ہی تھے۔ سلطان کھوسٹ تو شیطانوں کے امام تھے۔

ایک بار یہ ہوا کہ گرمیوں کی ایک دوپہر کو، یہ تینوں پھسکڑا مار کر، تپتی زمین پر بیٹھ گئے اوّل تو راہ گیر اسی بات پر حیران تھے کہ یہ کیسے لوگ ہیں۔ جو یوں چپ چاپ جلتی زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر گیان دھیان کے سے انداز میں، اپنی اپنی انگلیاں مُنہ پہ رکھے اور منہ اور انگلیوں کے رُخ کو آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے۔ محویت ایسی کہ جیسے یوں کرنا ان کی تپسیا کے لیے ضروری ہی ہو۔ جو بھی دیکھتا، حیران ہوتا اور حیران ہو کر کھڑا بھی ہو جاتا۔ ہوتے ہوتے سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے۔ سب ایک دوسرے سے سوال کرتے تھے۔ "یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کیا بات ہے"؟

جب انہوں نے دیکھا کہ بھیڑ کافی جمع ہو گئی ہے۔ یعنی بے وقوفوں کا مجمع کافی ہو گیا ہے تو یہ تینوں ایک دم ٹھٹھا مار کر اٹھے۔ ہنستے ہنستے بھاگ نکلے۔ یہ جا وہ جا! لوگ حیران و ششدر، لوگ کہیں ہم نے تین بے وقوفوں کو دیکھا۔ یہ کہیں ہم نے سینکڑوں بے وقوفوں کو دیکھا۔

ایسی ہی اچپلی میں، انہوں نے ایک بار، اپنے ایک دوست سے شرط یہ لگائی۔ اگر تم مجھے ایک سو روپیہ دو تو میں انار کلی بازار سے، تمام کپڑے اتار اور صرف ایک لنگوٹی لٹکا کر گزر جاؤں گا۔ بات پکی ہو گئی۔ اُدھر انہوں نے ایک روپیہ کا نوٹ بطور ضمانت دوسرے صاحب کو دے دیا۔ اِدھر انہوں نے کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔ انہوں نے کپڑے اتارے، اتنے ہی انہوں نے سو روپیہ کا نوٹ ان کے حوالے کر کے شرط ہار جانے کا اعلان کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہارنے والے دوست نے کہا۔ "مجھے اپنی شرط کے ہارنے کا افسوس نہیں۔ جتنا کہ اس امر پر کہ آپ تو عجیب آدمی ثابت ہوئے۔"

"میں عجیب نہیں۔ بلکہ تم بے وقوف ہو"۔

"وہ کیسے؟"

"میں تو تمہارے حُمق سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ سو وہ اٹھا لیا۔"

"کیسے"؟

"وہ ایسے کہ مجھے یقین تھا کہ تم میرے عمل کے ابتدائی مرحلے میں ہی میدان چھوڑ کے بھاگ جاؤ گے۔ سو دہی ہوا"

جب اچپلی ہی کے قصے چل نکلے ہیں تو ایک بات اور بھی سُن لیں۔ وہ یہ کہ اگر یہ کسی امیر آدمی کو دیکھتے تو یہ بھی ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیتے۔ وہ بھی یوں کہ پاؤں کے ساتھ پاؤں اور قدم کے ساتھ قدم ملا کر، یوں چند قدم آہستہ سے کان میں کہتے۔ "ابے آہستہ چل"!

وہ ان کے رویہ اور انداز تخاطب پر، پہلے تو خاموش زبان میں، صرف اپنے تیوروں ہی سے ناراض ہوتا۔ ان کا عمل اپنی جگہ جاری رہتا۔ پیچھے سے کہہ دیتے "ابے تجھے کہا ہے۔ آہستہ چل"!

جب وہ امارت کا مارا، جب اپنی یوں تذلیل ہوتے دیکھتا تو گالیوں پر اُتر آتا۔ تب یہ مطمئن ہوتے، جیسے مسئلہ

حل ہو گیا ہو۔ بازی جیت لی ہو۔

آپ کو مندرجہ بالا باتیں اتنی تقدس مآب شخصیت کے سلسلے میں عجیب سی معلوم ہوتی ہوں گی مگر مجھے یہ عجیب نہیں لگتیں۔ اوّل تو انسان جس چیز کا نام ہے۔ وہ اپنے ایسے ہلکے پھلکے تفریحی موڈوں سے بھی ہو ملا ہے۔ دوسرا جو ہمہ وقت بقراط بنا رہتا ہے۔ وہ اور تو سب کچھ ہوگا مگر وہ پورا شخص نہ ہوگا۔

ایک دن حفیظ صاحب تشریف لائے۔ دیکھا تو ان کی انگلی کٹی ہوئی تھی۔ ہم نے پوچھا۔ "خیریت"؟

کہنے لگے۔ "حجامت کرتے ہوئے کٹ گئی۔"

"اپنی یا دوسروں کی"؟

"اپنی"۔

"افسوس"!

افسوس والی کوئی بات نہیں شعر سنو ؎

حضرتِ حجام سب کا مونڈتے پھرتے تھے سر
آج اُس کو جے میں اُن کی بھی حجامت ہو گئی

حفیظ صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ آپ کے ہر سوال کے جواب میں ایک شعر پڑھ سکتے ہیں۔ اگر کسی کا یاد نہ آئے تو اپنا ہی شعر پڑھ دیں گے۔ زیادہ تر انہیں دوسروں کے اشعار یاد نہیں آتے۔ اس لیے اپنے ہی شعر پڑھتے ہیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مندرجہ بالا شعر ان کا نہیں۔

ہم ایک دن کھانا کھا رہے تھے کہ حفیظ صاحب تشریف لائے۔ فرمایا کہ "السلام علیکم کے بعد عرض یہ ہے بندہ نے بھی کھانا کھانا ہے"۔ ظاہر ہے کہ ہمارے لیے سعادت کی بات تھی۔ ہم نے کہا۔ "بسم اللہ!"

وہ دن گوشت کے ناغہ کا تھا اور میرے ایک نہایت ہی عزیز دوست کراچی سے آئے ہوئے تھے لئے دوست داری میں سوچا یہ تھا کہ محض دال روٹی سے، دوست کو ستانا یا ٹرخانا مناسب نہ ہوگا۔ اس لیے بازار سے چرغا بھی منگوا لیا تھا۔ تاکہ عزت اور امارت بھی بہم شیر و شکر ہوں۔ کیونکہ میرا دوست ایک ... تھا اور میں عزیباً متوسط کلاس سے چنانچہ حفیظ صاحب نے بیٹھتے ہی کہا۔ "اچھا چرغا بھی"؟

"جی!"

"کبھی تم نے اتنی انرجی ہے۔"

"جناب یہ تو تھوڑی کی انرجی ہے۔ اس لیے کہ آج گوشت کا ناغہ ہے۔"

"اچھا اچھا"۔

جب کھانا کھا چکے تو حفیظ صاحب نے جیب سے ٹوتھ برش نکالا۔ اس سے دانت صاف کیے ... نے کہا "اچھا ٹوتھ برش بھی جیب میں رکھتے ہیں"؟

"ہاں تاکہ منہ سے بدبُو نہ آئے"۔

"بدبُو کی شکایت تو آپ کی بیوی کو ہو سکتی ہے۔"

"آج کل میں اس کے بوسے نہیں لیتا۔"

"کیوں کیوں"؟

"آج کل ملک میں ہنگامی حالات ہیں۔"

"کیا کوئی اس ضمن میں بھی آرڈی ننس آگیا ہے"؟

"آرڈی ننس"؟

"جی"!

آرڈی ننس"؟

"جی!"

"سنو، میں آج کل ملکی کاموں میں بُری طرح اُلجھا ہوا ہوں۔ ادبی دفاعی محاذ کا صدر ہوں۔ بڑا کام کرنا پڑتا ہے
ں ریڈیو پہ، کبھی ٹیلی ویژن پہ، کبھی جلسوں میں، کبھی جلوسوں میں، ایک منٹ اپنا نہیں، سب کچھ قوم کی نذر کر دیا ہے
ب حفیظ صاحب یہ باتیں کر رہے تھے تو اُن کی صورت کی دقیق مسکینی سے ایسا نظر آ رہا تھا۔ جیسے وہ سمجھا رہے
ں کہ دیکھا سمجھے! میں نے قوم کی خاطر، کتنا کچھ دے دیا ہے۔

ہاں تو ٹوتھ برش سے یاد آیا کہ حفیظ صاحب کی زندگی اس لحاظ سے مجاہد کی زندگی ہے کہ
ہ اپنے بیگ اور جیبوں میں جملہ سامانِ ضرورت ہمہ وقت رکھتے ہیں۔ مثلاً ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ، تھوڑا
ت راشن، معجونیں اور بیاض، اور اگر سفر میں ہوں تو راشن کے ساتھ اسٹوو، چائے، پیالی، چمچہ، چھوٹی کیتلی، لہسن،
ز، حتیٰ کہ ایک چھوٹی سی چٹائی تک کمر پہ لادے پھرتے ہیں۔ جیسے ایک سپاہی، چونکہ یہ فوج میں رہے ہیں۔
، ایسے معرکے کے لیے اپنا "سامانِ حرب" ساتھ رکھتے ہیں۔

ایک دن میں نے پوچھا۔ "بندہ پرور چائے پیجیئے گا"؟

"نہیں برخوردار"

"کیوں جناب"؟

"چائے بنانا کسی کو نہیں آتا۔ حتیٰ کہ میری بیوی کو بھی نہیں آتا۔"

"پھر تو آپ بڑے عذاب میں ہوں گے۔"

لفظ عذاب کی ٹکور کو محسوس کر کے کہنے لگے "سمجھے! چائے بنانا تو تیری بیوی کو بھی نہیں آتی اور نہ ہی کبھی
نے کسی اور دوست کے ہاں اچھی چائے پی ہے"۔

"آخر اس نسوانی کوتاہی کا کوئی حل"؟

"ہے"
"کیا؟"
"میں"!
"یعنی؟"
"کسی دن تجھے میں چائے بنا کر پلاؤں گا۔"

معلوم ہوا کہ یہ نہ صرف خود چائے بنا کر پیتے ہیں بلکہ سالن تک خود پکا کر کھاتے اور کھلاتے ہیں۔ یعنی بیوی کے فرائض پچاس فیصد تو خود ہی ادا کر لیتے ہیں۔ باقی جو پچاس فیصد ادا نہیں کر سکتے اس کا افسوس ہوتا ہوگا۔ اس لیے کہ یہ مزاجاً کسی طرح بھی، کسی کے ممنونِ احسان ہونا نہیں چاہتے۔

جفاکشی میں بھی یہ فرد ہیں۔ اور شاعروں کی طرح نہیں ہیں کہ ستاروں پہ کمند ڈالتے ہوں اور خود اٹھ کر پانی تک نہ پی سکتے ہوں۔ ان کی زندگی پیہم جدوجہد اور سراسر جدوجہد کی رہینِ منت ہے۔ ایک شخص جو ناداری کی دہلیز سے اٹھ کر شہرت کی منزل تک جا پہنچا ہو۔ وہ قابلِ قدر ہی نہیں۔ قابلِ تعظیم بھی ہے۔

انہوں نے اپنے آپ کو سنوارنے کے لیے، اتنی تگ و دو کی کہ بالآخر یزداں کو بھی مائل بہ التفات کر لیا۔ ذرے کو آفتاب بننے کے لیے یا قطرے کو گہر ہونے تک، جن جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اُن اُن مراحل سے یہ بھی گزرے کیونکہ میری زندگی بھی، ایک چھوٹے پیمانے پر، کچھ ایسی ہی ناہمواریوں کی داستان ہے۔ اس لئے میں بھی جب انھیں دھیان میں لاتا ہوں تو مجھ پر کیکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔ قدرت مہربان ضرور ہے۔ مگر اس کا کم سوادوں سے کوئی رشتہ نہیں۔

جفاکشی ہی کی بدولت، انہوں نے قدرت کے حُسن کو بھی جس جس طرح لوٹا۔ وہ بھی انہی کا دل گردہ ہے اور کسی کا بوتا نہیں۔ گیارہ بار تو کشمیر گئے۔ ان گیارہ بار میں سے پانچ مرتبہ جموں سے پیدل سری نگر تک پہنچے۔ وہ بھی قدم قدم پر رُک اور ٹھہر کر، اگر یہ اتنے پُر دبارہ نہ ہوتے تو مناظرِ قدرت کی دولت سے اتنے مالا مال نہ ہوتے۔ اس ضمن میں جتنے مال دار یہ ہیں اور کوئی شاعر نہیں۔ باقی زیادہ تر لیسے ہیں جو دُور کے جلوؤں ہی کے گنہگار ہیں۔

ایک دن خبر آئی کہ ابوالاثر حفیظ جالندھری کو، فوج کے چند افسران نے ناراض ہو کر تالاب میں دھکا دے دیا۔ پتہ چلا کہ ان کے شعر ناپسندیدہ ٹھہرے۔

کچھ عرصہ پہلے میں نے پوچھا۔ "حفیظ صاحب وہ غسلِ صحت" والا قصہ کیا تھا"؟

"غسلِ صحت"؟

"جی ہاں! وہ جو آپ کو ایک مرتبہ تالاب میں گرا دیا گیا تھا۔"

"بھئی وہ قصہ یہ تھا کہ میرے ایک فوجی دوست کی شادی تھی۔ انہوں نے کہا۔ حفیظ صاحب میری شادی پہ ایک سہرا پڑھ دیجئے گا۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ جن کی شادی تھی۔ وہ زیادہ عمر کے تھے۔ جن سے شادی ہو رہی تھی وہ کم

کی تھیں۔ چونکہ میری ان سے دوستی تھی۔ اس لیے میں نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے چند چوٹیں بھی کر دی تھیں۔ جو ناگوار گزریں۔ یوں عزت مآبی کی نوبت آگئی"۔

اِس قصے کو شوکت صاحب تھانوی مرحوم نے بھی اپنے مخصوص انداز میں لکھا تھا وہ بھی سُن لیجئے:

" راولپنڈی سے کچھ خبریں تیر کر لاہور پہنچ رہی ہیں اور عجیب مدوجزر پیدا کر رہی ہیں۔ روایت ہے کہ شناور سخن کو واقعی آب بازی کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ آپ کا ایک شعر بلکہ مطلع اِس وقت بے ساختہ یاد آرہا ہے"

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں

وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

ڈوبے ہوئے پائے جانے کی اطلاع تو پہنچ گئی مگر قطرے کے لیے ترسنے کی اطلاع ہی نہ دی آپ نے، اپنوں سے یہ تکلف کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ جو واقعات یہاں تک روایت بن کر سیلابی صورت میں پہنچے ہیں۔ ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعی پانی سر سے گزر گیا ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ نیکی کر دریا میں ڈال مگر اب تو آپ اس حقیقت کی تہہ تک پہنچ گئے ہوں گے کہ ؎

ڈوبنے کے واسطے کافی ہے اِک ہلکی سی موج

ہاں اُبھرنے کے لیے موجوں میں طوفاں چاہیئے

سنا ہے کہ تشنگ سارانِ ساحل آب آب تھے اور آپ اس اطمینان سے تھپیڑے کھا رہے تھے گویا اس بحر میں بھی غزل کہہ سکتے ہیں۔"

یہ کمال شوکت تھانوی ہی کا ہے کہ اُس نے اس واقعہ کو بھی، اِس انداز میں رقم کر دیا کہ لُطف آجائے۔ حالانکہ اس میں لُطف اندوزی والا کوئی پہلو نہ تھا بلکہ۔۔۔

حفیظ صاحب بہ سلسلہ ملازمت راولپنڈی میں تھے۔ اُن دنوں نقوش کی کوئی تقریب تھی۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ راولپنڈی سے آئیں گے۔ دعوت نامہ نہ بھیجا۔ دیکھا تو تقریب میں موجود، میں نے سوچا دعوت نامہ پہنچا ہی ہوگا تو آئے ہیں۔ ملے تو حسبِ معمول مسکرا کے ملے۔ ہاتھ ملایا تو ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا: "صاحب میرا ہاتھ تو چھوڑیئے تاکہ کسی اور سے بھی ملا سکوں۔"

" یہ ہاتھ نہ چھوڑوں گا۔"

"کیوں؟"

"تم نے مجھے اِس تقریب کا دعوت نامہ کیوں نہیں بھیجا"؟

" بھیجا نہیں تو آپ آئے کیسے"؟

" وہ تو میں نے کہیں سے سُنا تھا۔ اس لیے آگیا ہوں۔"

" واقعی"؟

میرے لفظ واقعی پر ان کے آنسو نکل آتے۔ جتنی خوشی مجھے اُس تقریب کی تھی۔ اس سے زیادہ ندامت اس واقعہ پر ہوئی۔

آپ بیتی نمبر کی تقریب میں حفیظ (جالندھری) صاحب نے تقریر کرتے ہوئے اور باتوں کے ساتھ مجھے بھی جالندھر کا رہنے والا بتایا۔ کچھ لوگ حیران ہوئے اور کچھ کی معلومات میں "اضافہ" ہوا۔

تقریب کے بعد، میں نے کہا: "حفیظ صاحب میرا تو جالندھر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"لاہور کا"

"لاہور کا؟"

"جی ہاں!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جو اتنا محنتی ہو۔ جو اتنی لگن رکھتا ہو۔ وہ جالندھر کا رہنے والا نہ ہو۔"

"اب تو واقعہ یہی ہے۔"

"بھئی اسے میرا علاقائی تعصب کہہ لو یا کچھ، میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ جالندھر سے باہر کا آدمی بھی ایسا پارکھ ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ تھی کہ میں نے کہا۔" ایک آدمی سیالکوٹ نے پیدا کیا اور وہ اقبال ہے۔ دو آدمی جالندھر نے پیدا کئے۔ اُن میں ایک خاکسار ہے دوسرا طفیل"!

میں نے کہا۔" میرا نام تو بڑے آدمیوں کے زمرے سے نکال ہی دیں۔ اس لیے کہ "چہ نسبت خاک را با عالم پاک، یوں جانیں کہ جالندھر نے بس ایک ہی بڑے آدمی کو جنم دیا اور وہ حفیظ ہے۔"

"ہاں اب تو یونہی سوچنا پڑے گا۔"

"آج مجھے تیری کتاب "محترم" ملی ہے۔ بڑی اچھی ہے۔ مگر اس میں مجھے تیرا مضمون مصطفےٰ زیدی پر پسند نہیں آیا۔ کیونکہ تو اُسے زیادہ نہیں جانتا۔"

"یہ بات ٹھیک ہے۔ جتنا جانتا تھا، اُتنا بھی نہ لکھا۔"

"کیوں؟"

"وجہ یہ تھی کہ اُس پہ جنس اس بُری طرح سوار تھی کہ وہ اس ضمن میں تقریباً دیوانہ تھا۔"

"پھر یہ بات لکھی کیوں نہیں؟"

"اُس میں ہلکے ہلکے اشارے تو ہیں۔ لیکن میں نے تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔"

"اب تو شہناز گل والے قصے نے وہ سارے ہی حصار توڑ دیئے۔"

"جی ہاں!"

"بہرحال وہ جوش ملیح آبادی سے بڑا شاعر تھا۔"

"جی — ؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"حفیظ صاحب، میں آپ کی یہ بات کبھی نہ مانوں گا۔ اِس لیے کہ مجھے اس میں حُبِ علی نظر نہیں آتی۔"

"اچھا! بغضِ معاویہ تو ہے۔"

"جی ہاں وہ تو ہے۔"

"طفیل تجھے نہیں معلوم کہ بڑے لوگ بعض اوقات ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے ہیں کہ اُن کا سارا امیج متزلزل ہو جاتا ہے۔ مثلاً مجھے ایک بار سر محمد مزمل اللہ نے ایک رقعہ دیا کہ یہ ڈاکٹر اقبال کو دے دینا۔ وہ سے کر میں اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس میں لکھا تھا کہ سپرد (سرتیج بہادر) ہندوؤں کو ملا۔ اقبال مسلمانوں کو ا— یہ پڑھنے کے بعد جھٹ اقبال نے سپرو کو خط لکھا اور اس میں سر مزمل کا فقرہ نقل کرتے ہوئے بتایا۔ "اصل میں میں بھی سپرد ہی ہوں۔"

"اب بتاؤ اقبال کو یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی ؟"

"کیا جانوں"!

"بات یہ ہے کہ دُور کے ڈھول سہانے۔"

"کیا آپ جوش صاحب کے ساتھ، اقبال سے بھی ناراض ہو گئے "؟

"نہیں نہیں، میں تو اقبال کا عاشق ہوں۔ مگر یہ بات پھر کبھی ہو گی۔"

یہ حفیظ صاحب ہی ہیں۔ جن کے حصے میں، پاکستان کا ترانہ لکھنے کی بھی سعادت آئی۔ حکومت پاکستان نے ۱۹۵۲ء میں اعلان کیا کہ دُھن تیار ہے۔ اس پر ایک ترانہ فٹ کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا۔ جو ترانہ منظور ہو گا۔ اس کے خالق کو دس ہزار روپیہ دیا جائے گا۔ اب کیا تھا۔ شاعروں کے قلم چلنے لگے۔ بساط بھر سب نے کوشش کی۔ جو صاحب اثر تھے انہوں نے اپنا اپنا اثر بھی چلایا۔ مگر ترانہ کمیٹی نے حفیظ صاحب کے ترانے کو پسند کیا۔

ادھر یہ اعلان ہوا، اُدھر اخبارات میں شور اٹھا۔ حفیظ صاحب کا ترانہ کسی کام کا نہیں۔ اس میں ایک لفظ بھی اردو کا نہیں۔ اس سے تو فلاں فلاں شاعر کا ترانہ اچھا ہے۔ پھر وہ ترانے اخبارات میں چھاپے بھی گئے۔ مگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ کیونکہ ادھر بھی کوئی معمولی شاعر نہ تھا۔ انگریز کے زمانہ کا خان بہادر تھا۔ اور ملک وقت کے نزدیک فردوسی سلام!

ایک بار اس مسئلے پر حفیظ صاحب سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "مختصراً یہ ہے کہ اس شور وغوغا میں نمایاں آوازیں میرے ہی دوستوں کی تھیں۔ دل برداشتہ ہو کر انہی دنوں میں نے بھی ایک غزل کہی تھی۔ جس کا ایک شعر ہے ؎

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

اسی غزل کا ایک شعر اور ہے ؎

عرضِ ہنر وجہِ شکایات ہو گئی چھوٹا سا منہ تھا مجھ سے بڑی بات ہو گئی

پھر آخر میں حفیظ صاحب نے بڑے دکھ سے کہا کہ ترانہ لکھنے کی پاداش میں مجھے گالیاں تک دی گئیں۔ ایک دن میری بیٹیوں نے کہا۔ "ابا جان! ترانہ تو آپ نے لکھا ہے۔ لیکن گالیاں ہمیں دی جا رہی ہیں۔"

عرصے کی بات ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے کی منٹو پارک میں ایک بہت بڑی نمائش ہوئی تھی۔ یاروں نے اس میں ایک مشاعرہ بھی کر ڈالا۔ منتظمین ان کے پاس بھی پہنچے کہ شرکت فرمایئے۔ انہوں نے کہا۔ "میرا اصول ہے کہ میں نمائشی مشاعروں میں نہیں جاتا۔ کیونکہ وہاں ادبی ذوق رکھنے والے کم ہوتے ہیں۔ تماش بین زیادہ ہوتے ہیں۔"

منتظمین نے کہا۔ "اس میں بڑے بڑے شعرا شرکت کر رہے ہیں۔ لہٰذا۔"

"میری بلا سے۔"

"اس مشاعرے کی صدارت سر عبدالقادر کر رہے ہیں۔"

"مجھے کیا!"

"اوروں کو تو ہم پانچ سو روپوں سے زیادہ نہیں دے رہے۔ لیکن آپ کو آٹھ سو روپے دیں گے۔"

جناب آٹھ ہزار پر بھی نہ جاؤں گا۔"

چنانچہ وہ مشاعرہ میری شرکت کے بغیر ہوا اور اس میں خوب اودھم مچا۔ ہندو مسلمان اور سکھ سب شریک تھے۔ لہٰذا کوئی ایسا شاعر نہ تھا، جو اسلام کی بات کرنے والا تھا۔ جوش ملیح آبادی خوب چمکے۔ اس لیے کہ وہ مذہب کا تمسخر اڑاتے تھے۔ شراب و کباب کا ذکر کرتے تھے۔

اس مشاعرے کے دوسرے دن، میرے پاس ڈاکٹر اقبال نے علی بخش کو بھیجا کہ حفیظ کو بلا لاؤ۔ حاضر ہوا تو فرمایا کہ "کل مشاعرے میں کیوں نہ گئے"؟

"یہ بات آپ کیوں پوچھتے ہیں۔ جب کہ آپ خود مشاعروں کے خلاف ہیں۔"

"میری مخالفت کے باوجود تم جاتے تو ہو۔"

"جی ہاں!"

"پھر اس میں کیوں نہ گئے؟"

"بس ایک اصول کے ماتحت نہیں گیا میں نمائشی مشاعروں میں نہیں جاتا۔"

"برا ہوا۔"

"کیسے؟"

"وہاں بڑی خرافات پڑھی گئیں۔ مذہب پر حملے ہوئے۔ اگر جوش کا کوئی توڑ تھا۔ تو وہ حفیظ تھا۔"

اس بیان کے بعد، حفیظ صاحب کی آواز روہانسی ہو گئی۔ گلوگیر ہو گئے۔ کہنے لگے۔ یہ میرے لیے اتنا بڑا تمغہ تھا جو میں آج بھی اپنے سینے پر آویزاں سمجھتا ہوں۔"

شاعر سہرے کہتے ہیں۔ قصیدے پڑھتے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ کام کیے۔ حسب توفیق یہ کچھ سبھی کو کرنا پڑتا ہے۔

مگر انہوں نے ایک بار کمال کیا تھا۔ "پی۔ آئی۔ اے" پر بھی نظم فرمادی۔ پھر انہوں نے اپنے جہازوں کی پرواز کو رسول اللہ کے واقعۂ معراج سے بھی تشبیہ دے ڈالی۔ وہ بات مجھے بہت کھلی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس، اس کا جواز ہو مگر مجھے مولانا صلاح الدین احمد کا فقرہ نہیں بھولتا۔ "آج حفیظ صاحب نے ہوائی جہازوں پر نظم لکھی ہے۔ کل کو باٹا کے جوتوں پر نظم لکھیں گے۔" پھر انہوں نے یہ بھی فرمایا۔ "بڈھا پاگل ہوگیا ہے" میں اس بات کو نہیں مانتا۔ یہ کبھی پاگل نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کو پاگل نہ بنادیں۔ وہ جوہر نہیں۔ یہ جوہر ہے۔ ہاں زیادہ سے زیادہ خبطی کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ بات بھی دبی کہہ سکتا ہے۔ جو کم از کم میرے پائے کا خبطی ہو۔ یہ خبطی پن نہیں تو اور کیا ہے کہ جالندھر سے ایک بے یار و مددگار انسان اٹھا۔ اور اس نے اپنے شعری ریاض سے اُن تھک ریاض سے، دنیائے ادب سے اپنا لوہا منوا لیا ہو۔ یہ منت نہیں یہ زور ہے۔

یوں تو ان کے مشاعراتی معرکے، کئی شاعروں سے ہوتے۔ خوب خوب ٹھنی۔ مگر ان میں ایک معرکہ، تاجور نجیب آبادی کے ساتھ، خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

تاجور نجیب آبادی سے ان کی کبھی نہ بنی۔ صرف ٹھنی ہی ٹھنی، تاجور انہیں شاعر ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگر تیار تھے بھی تو ان کی شاعرانہ چودھراہٹ انہیں کھلتی تھی۔ چنانچہ رہی تو صرف تنا تنی ہی رہی۔ ادھر یہ تاجور کو شاعر کم، پہلوان زیادہ سمجھتے تھے۔ وہ انہیں شاعر کم لوگوں کا نیاد و گیتے تھے۔ ادھر اُدھر کے مشاعروں میں بھی چشمکیں ہوا کرتی تھیں مگر ایس پی ایس کے ہال والی جھپک تو حیران کن، دل خوش کن زیادہ تھی۔

جب حفیظ صاحب پڑھ کر اسٹیج سے اترے تو پروگرام کے مطابق تاجور یا رئی نے نازش رضوی کا نام پکارا، اوّل تو اتنے بڑے شاعر کے بعد، ان سے کم تر درجے کے شاعر کو بلانا، یوں بھی ان کی توہین تھی۔ صرف اسی پہ اکتفا نہ کیا گیا۔ دیکھا کہ اُس کمبخت کے اسٹیج پر آنے کے ساتھ ساتھ دو تین آدمی طبلے اور سارنگیاں لے کر بڑھے اور خود نازش ہارمونیم لے کر پہنچے اس سین کا دیکھنا تھا کہ لوگوں کا مارے ہنسی کے بُرا حال ہوگیا۔ قہقہے تھے کہ چھت پھاڑے دے رہا تھا۔ یہ دراصل اس امر کا اظہار تھا کہ جنابِ حفیظ اگر آپ گا کر مشاعرے پر چھا سکتے ہیں تو ہم بھی گا بجا کر مشاعرہ لوٹیں گے۔

یہ لطیفہ تو اپنی جگہ رہا۔ ویسے یہ ہے کہ حفیظ کے سامنے چراغ کم ہی شاعروں کے جلا کرتے تھے یہ جہاں تہاں چھائے ہی رہے۔ شاعری میں بھی جان تھی۔ آواز میں بھی لپک تھی۔

کہئے تو اور بھی کچھ باتیں سناؤں ؟

پنجاب میں، اگر حفیظ کا کوئی مدِمقابل تھا تو وہ صرف اختر شیرانی تھا۔ اختر کی رومانی نظموں کی وہ دھوم تھی کہ بایدو شاید، وہ بلاشبہ نوجوانوں کے دِلوں کی دھڑکن تھا۔ گلی گلی محلے محلے اس کے شعر گنگنائے جاتے تھے۔ مگر وہ صرف اخبارات ورسائل کی حد تک ہی لوجاتا تھا۔ کیونکہ بے تحاشا شراب پیتا تھا۔ مدہوش رہتا تھا۔ اسٹیج پر کھڑے ہو کر دو شعر بھی ڈھنگ سے نہیں پڑھ سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حفیظ اُسے بھی مات دے دیتا تھا۔

اختر شیرانی کی بات ہو رہی ہے تو ایک واقعہ اور عرض کر دوں جنگ یورپ کے زمانے میں لکھنؤ ریڈیو سے، جنگ ہی کے سلسلے میں ایک مشاعرہ ہوا۔ ہندوستان کے تمام چوٹی کے شاعر جمع تھے۔ خوب خوب شعر، تلوار کی کاٹ بن کر

نکلے۔ انہی شعرا میں اختر شیرانی بھی تھے۔ چونکہ یہ اُس وقت مدہوش تھے۔ اس لیے ریڈیو والوں نے مناسب سمجھا کہ اُن کی نظم ساغر نظامی سے پڑھوادیں۔ چنانچہ اختر کی نظم جب ساغر نے اپنی لَے میں پڑھی (اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا) تو وہ ایک سماں بندھ گیا۔ پھر تو سبھی کے چراغ گل ہوگئے حتیٰ کہ حفیظ صاحب کا بھی چراغ گل ہوگیا۔ بہرحال یہاں تو صرف یہی عرض کرنا ہے کہ کم ازکم مشاعروں کی حد تک تو اختر بھی، حفیظ کے سامنے نہیں ٹکتے تھے۔ یعنی شاعر جذبات بھی، اِس خانہ خراب کے سامنے نہیں ٹکتا تھا۔

ویسے تو یہ جناب شاعر تھے۔ مگر انہیں افسانہ نویسی کی بھی سوجھی ایک کتاب افسانوں (ہفت پیکر) کی لکھ ڈالی۔ ایک بار مجھ سے کہا :۔

قصہ یہ تھا کہ جب میں ہزار داستان کا مدیر ہوا تو لوگوں نے کہا۔ یہ تو شاعر ہے۔ اس لیے کسی افسانوی رسالے کا مدیر کیونکر ہوسکتا ہے۔ چنانچہ میری راجپوتی عزت نے کہا۔ اب لکھو افسانے، ورنہ چھوڑ دو ایڈیٹری، چنانچہ لکھے افسانے وہ پسند کیے گئے۔ میرے نزدیک ایک شعر نہ کہا۔ ایک افسانہ لکھ لیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ بعض اوقات ایک شعر میں پوری کہانی ہی نہیں ہوتی۔ صدیوں کی تاریخ کی بھی جھلملاہٹیں ہوتی ہیں۔

کبھی کبھی مجھے بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ میں بھی ایک رسالے کا مدیر ہوں اور یہ احساس جب وجود پہ چھاجاتا ہے تو دِل چھوسنے بھی لگتا ہے۔ فراواں احساسِ ذات بھی، کیا دولت ہوتی ہے۔ بشرطیکہ تصویر کا ابھی رُخ سامنے ہو، جو دھراہٹ کا، دوسرا رُخ سامنے نہ ہو، یعنی مآل کا، پھر میں تو ایک ہی رسالے کا مدیر تھا اور ہوں۔ لیکن انہوں نے تو کئی میدان مارے کئی اچھے رسالوں کے مدیر رہے۔ ان کی خوشی کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔ یہ جانیں!

جب یہ جالندھر میں تھے تو انہوں نے اعجاز نکالا۔ پانچ شمارے نکلے کہ بند ہوگیا۔ پھر انہوں نے سوچا کہ اداروں پہ چھاپا مارنا چاہیئے لیکن رسالوں کا مالک نہیں بننا چاہیئے۔ اس لیے کہ مالک بننے میں مالی مار پڑتی ہے اور صرف ایڈیٹری میں شان بڑھتی ہے۔ چنانچہ یہ اسی حکمتِ عملی کے تحت شبابِ اردو کے جائنٹ ایڈیٹر رہے۔ ہزار داستان، پھول، تہذیبِ نسواں اور مخزن کے مدیر رہے۔ یعنی دشتِ ادب میں خوب گھومے پھرے ہیں۔ ایسی "قلم نوردی" کو میں دشتِ ادب میں چہل قدمی ہی کہوں گا۔ گلشنِ ادب میں "قدم رنجی" نہ کہوں گا۔

حفیظ صاحب نے دیگر رسائل کی اداروں کا حال تو بتایا مگر یہ نہ بتایا کہ انہوں نے ایک ہفت روزہ اخبار کی بھی ایڈیٹری کی تھی۔ اور وہ اخبار حمایتِ اسلام تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں، ان سے استفسار کرنا بھی نہیں چاہیئے۔ کیونکہ میری معلومات یہ ہیں کہ یہ سرداری انہیں راس نہیں آئی تھی۔ ہفت روزہ اخبار کا کام، بہت زیادہ ہوتا ہے اور یہ شاعر، ایک ایک مصرع سوچ کر کہنے والے، وہ بھی موڈ ہوا تو شعر کہنے والے، چنانچہ ڈھیر ساری نثر ہی کے چکر نے انہیں بوکھلا کے رکھ دیا تھا۔ دوست بھی ان کی مدد کو پہنچے تھے۔ اس کے باوجود، اخبار کو سنبھال نہ سکے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان سے یہ کہہ دیا جاتا کہ آپ صرف شعروں ہی شعروں میں سارے پرچے کو ایڈٹ کیا کریں گے تو انہیں اتنی زیادہ پریشانی نہ ہوتی کہ وہاں سے سال کے اندر ہی اندر بھاگ نکلتے۔

آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ ایک ایسا مردِ میدان، جو بیسیوں رسالوں کا مدیر رہا ہو۔ وہ ایک ہفت روزہ اخبار کا مدیر بن کر آخر کیوں نہ اپنی اہمیت کو منوا سکا۔ اس ضمن میں میرا جواب صرف اتنا ہی ہے کہ یہ معاملہ سبج سبج کا نہ تھا۔ چونکہ ایک مصرع کہہ لینے کے بعد، دوسرا مصرع کہنے کے لیے تھوڑا سا وقت درکار ہوتا ہے۔ اس لیے اس آپا دھاپی میں "شعر موزوں" ہی نہ ہو سکے۔

اودھ پنچ ایک ایسا اخبار تھا۔ جسے پگڑیاں اچھالنے میں مزا آتا تھا۔ اس نے مولانا حالی کے خلاف محاذ بنایا۔ تو وہ مولانا حالی کو مولانا خالی لکھنے لگا۔ انہی دنوں ان کی ایک نظم چھپی تھی۔ جس کا نام تھا "فرصت کی تلاش" جو کچھ اس قسم کی تھی کہ

یوں وقت گزرتا ہے فرصت کی تمنا میں
جس طرح کوئی پتا بہتا ہوا دریا میں

اس نظم کا چھپنا تھا کہ اس نے انکی بھی دھجیاں اڑا ڈالی، خوب برا بھلا کہا۔ تان یہاں پہ توڑی۔ عجیب ہے تنکا شاعر

(ابو الاثر حفیظ جالندھری کے سوانح حیات پر مشتمل زیرِ ترتیب کتاب "بزرگوارم" کا ایک باب)

بادشاہ گر

ضمیر جعفری

۱۹۴۸ء کے وسط میں جب ہم اپنی فوجی ملازمت کے سلسلے میں ایبٹ آباد پہنچے تو وہاں ہمیں دو جرنیلوں کے ماتحت کام کرنا پڑا۔ دن کے وقت نویں فرنٹیئر ڈویژن کے ہیڈ کوارٹر میں جنرل نذیر احمد کے ماتحت، اور شام کو ایبٹ آباد کے ادبی ہیڈ کوارٹر میں جنرل شوکت واسطی کی کمان میں۔ شوکت، کچھ ہی پہلے، پشاور میں "اردو سبھا" کے محاذ پر ادب کی "WAR OF ROSES" لڑتے لڑتے ایبٹ آباد میں آکر قلعہ بند ہوا تھا۔ یہ اس سے ہماری پہلی ملاقات تھی۔ ہم جوان تھے اور وہ نوجوان مگر نوعمری کی شادی کے ثمرات کے طفیل "اولاد آلودہ" ہو چکا تھا۔ حالانکہ چہرے کی تازگی اور کمانڈر سے پن کی دوشیزگی سے وہ فی الحال خود اپنی اولاد معلوم ہوتا تھا نٹ کھٹ، چلبلا، سیماب طبع، سر سے پاؤں تک سوال ——— جنون صفت۔ اپنے مداحوں کی آنکھوں میں گھسا ہوا۔ بے تکان اتنا کہ پانی دودھ بن کر رہ گئے کامراں، شادماں، جوشاں، خنداں لگتا تھا کہ یہ شخص اپنی کوئی خوبی ——— اپنی کوئی حامی غیر مستعمل نہ رہنے دے گا۔

ایبٹ آباد آج بھی کوئی بڑا شہر نہیں ہے۔ تب بہت ہی چھوٹا تھا۔ آپ گھومنے نکلتے تو شہر کے تقریباً ہر صورت آشنا سے کسی نہ کسی موڑ پر مڈبھیڑ ہو جاتی۔ مجھے کوئی دن یاد نہیں جب میں بازار میں نکلا ہوں اور آگے سے خان بہادر جلال الدین خان (جلال بابا) یا خان فقیرا خان حدوں سے مل گئے ہوں۔ شوکت واسطی ان دنوں گورنمنٹ کالج میں لیکچرار تھے۔ ان کو ہم نے پہلے ہی دن، ان کے بار عار ایوب حسن کے تعارفی رقعے، سمیت کالج میں جا لیا۔ پہلے ہی دن یہ بات ہم پر آئینہ ہو گئی کہ ایبٹ آباد کی ادبی زندگی، اس کے گرد گھومتی تھی۔

کشمیر کی تحریک آزادی ——— آرمی اور ٹیٹوال اور پونچھ میں کھلی جنگ کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ جنگ کا ایک سرا، سری نگر میں بھارت کے لیفٹننٹ جنرل کلونت سنگھ کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا سرا ایبٹ آباد میں میجر جنرل نذیر احمد کی گرفت میں۔ درمیان میں، اُدھر، سر سے پاؤں تک زرہ بکتر میں ڈوبے ہوئے ڈوگرے، سکھ اور گورکھے تھے اور اِدھر ہمارے مجاہدین جن میں سے اکثر بے تیغ اور پا پیادہ ہونے کے علاوہ برہنہ پا بھی تھے۔ مجاہدین جنگ میں کود گئے تو قوم ان کے لئے کمبل، جوتے اور چائے ڈھونڈنے لگی۔ شوکت واسطی نے "کشمیر فنڈ"

کے لیے آل پاکستان مشاعرے کا ڈول ڈال دیا۔ حفیظ اثر، اور نصر من اللہ کے علاوہ، ایک نوخیز خوبرو لڑکا بھی ان کے معاونین خصوصی میں شامل تھا۔ جس کی شاعری کی مسیں اس کی اپنی مسوں کی طرح، ابھی تازہ تازہ بھیگ رہی تھیں آج اس ہونہار بروے کا شعر، اردو ادب کے ماتھے کا جھومر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نام پروفیسر محسن احسان ہے۔

ہم سے ملاقات ہوئی تو شوکت نے مشاعرے کی ایک نشست کو، دو نشستوں پر پھیلا کر، تقریب کو — "سول اینڈ ملٹری" — رنگ دینے کی پیش کش کردی۔ مگر اپنی شرائط یہ کہنے لگے — "ایک نشست کی صدارت تمہاری، دوسری نشست کی ہماری" — "تمہاری" سے مراد، جنرل نذیر احمد اور "ہماری" سے مراد، قائدِ ملت چودھری غلام عباس۔ کرسیاں تمہاری، شامیانہ ہمارا۔ سامعین تمہارے، شاعر ہمارے۔ چائے کی تقسیم تمہاری، شاعروں کی ترتیب ہماری۔ وہ خواہ ہم ابجد سے کریں یا ہوز سے، ناظم تمہارا، کالج ہمارا — سب سے مشکل شرط آنجناب نے یہ عائد کی کہ تمہارا صدر، صرف صدارت کرے گا۔ تقریر نہیں کرے گا۔ اور صدارت شیروانی میں کرے گا۔ کوٹ پتلون میں نہیں — ہم "باس" کے کپڑوں کی سلائی اور طبیعت کی گیرائی سے واقف تھے شوکت نے ہمارے سمجھانے بجھانے پر شیروانی تو اتار دی البتہ دوسرے مطالبے سے دستکش ہونے پر آمادہ نہ ہوا کہ اصولوں پر سودا بازی کرنا اس کی طینت کے خلاف تھا۔ میں خود بھی ایک سعادت مند ماتحت کی حیثیت سے اپنے "باس" کو اس آزمائش میں نہ ڈالنا چاہتا تھا کہ وہ اس کا محاذ چھوڑ کر غالب اور اقبال کے محاذ پر پنجہ آزمائی کرنے لگیں۔ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ برملا دشمن اور راست گو دوست کو پسند کرتے ہیں۔ تاہم شوکت کی شرط کو بے چون و چرا تسلیم کرنا بھی آئینِ جہانبانی کے خلاف تھا۔ میں نے کہا۔

"کیوں جی۔ وہ تقریر کیوں نہ کریں؟"

شوکت نے سیدھا اور مختصر جواب دیا۔

"اس لیے کہ وہ تقریر کر نہیں سکتے"

کچھ ردّ و قدح کے بعد، ہم نے پسپا ہوتے ہوئے عرض کیا۔

"مگر برادرم! ان کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟"

شوکت کڑک کر بولا۔

"ہم باندھیں گے"

اور یہ گھنٹی اس نے ہمارے سامنے باندھی۔ موصوف کو مشاعرے کی صدارت پیش کرتے ہوئے، چھوٹتے ہی فرمایا — "سر! آپ بس کرسی پر آکر بیٹھ جائیے گا باقی سب کچھ آپ کے اقبال سے ہوتا رہے گا۔

"باس" کو یہ تجویز پسند آئی۔ اس روز تو مجھے شوکت کی صاف گوئی اور بے تکلفی پر کچھ حیرت ہوئی لیکن اگلے دن جب اس نے ٹیلی فون پر خان بہادر سرور خان، ڈپٹی کمشنر ہزارہ کو جس لنگوٹیے بھیجے میں مشاعرے ہیں قالین بھجوانے کو کہا، مجھے چنداں حیرت نہ ہوئی۔ کیونکہ اس وقت تک شوکت کی شخصیت کے بعض نئے گوشے ہم پر منکشف ہو چکے

تھے۔ جن میں سے ایک گوشہ یہ تھا کہ وہ خود پیدائشی "پروجیکٹ ڈائریکٹر" پیدا ہوا تھا۔ میں مشاعرے میں اس کے برابر کا علمبردار تھا۔ مگر مجھے جلد ہی محسوس ہو گیا کہ مجھے اس کا "سیکنڈ اِن کمانڈ" (SECOND IN - COMMAND) بن کر کام کرنا ہو گا۔ مگر ساتھ ہی اس میں دل موہ لینے والی یہ خصوصیت بھی دیکھی کہ وہ دل و جان سے اطاعت بھی اس شخص کی کرتا ہے جس پر وہ حکم چلا سکے۔

ہمارے ملک ہی کی طرح ہمارے مشاعرے کو بھی کئی سنگین بحرانوں سے کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض مرحلوں میں یوں محسوس ہوا جیسے اس وسیع و عریض دنیا میں صرف حفیظ اثر، محسن احسان اور پاکستان ملٹری اکیڈیمی سے آئی ہوئی کرسیاں ہی ہمارے ساتھ رہ جائیں گی۔ مگر شوکت کی پیشانی پر کبھی پریشانی کی کوئی لکیر نہ دیکھی۔ راہ کو پُر خار دیکھ کر اُلٹا خوش ہوتا چہک کر کہتا

"ٹھیک ہے برادر !"

چہک کر نعرہ لگانا

"پریشم قلندر"

اور ہر نئی الجھن پر مشاعرے کا پاٹ پہلے سے زیادہ چوڑا اور چندہ، دو چند کر دیتا اگرچہ چندے کو اس نے کبھی ہاتھ نہ لگایا۔ یہ "آل پاکستان مشاعرہ" ۲۸ ستمبر کو، گورنمنٹ کالج کے کنارہ سبزہ زار میں برپا ہو، اور جو لوگ اس میں موجود تھے وہ گواہی دیں گے کہ اس "سکیل" (SCHLE) کا اتنا سکیل مشاعرہ، ایبٹ آباد میں اس کے بعد شاید ہی اس دھج کے ساتھ آراستہ ہوا ہو۔

شوکت واسطی تاریخ کا استاد تھا اسے اپنے مضمون سے عشق تھا ہم نے اس کو تاریخ پڑھاتے دیکھا ہے اس کی لکھی ہوئی تاریخ بھی پڑھی ہے وہ پڑھاتا تھا تو استاد نہ لگتا ——— مُحرک لگتا۔ وہ پڑھاتا نہیں تھا، اکساتا تھا۔ تاریخ لکھتا تو ظہیر الدین بابر میں محمد حسین آزاد کا لطف پیدا ہو جاتا۔ افسوس علم کی اتنی اتھاہ پیاس رکھنے والے استاد کو، زندگی اور علم کے درمیان ایک صبر آزما بحران میں سرگرداں رکھا گیا۔ جانداروں میں سے۔ انسان سے بدتر اپنی صفت کا کوئی دوسرا قاتل شاید ہی مل سکے۔

دوستداری اس کی وضع نہ تھی ایک محبت تھی۔ عمارتوں کی طرح دوستی بھی مرمت کی محتاج ہوتی ہے۔ شوکت کو دوستی کی مرمت میں ہمیشہ مستند دیکھا۔ دوستی اس کے نزدیک مارکیٹ کی جنس نہیں کہ ارزاں خرید کر مہنگے داموں بیچ دی جائے، غریب وہ نہیں جس کے پاس دولت نہ ہو، غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو۔ اس لحاظ سے شوکت دنیا کے دولتمند ترین لوگوں میں شمار ہو گا۔

یہ تھیں نوجوان شوکت واسطی کی چند جھلکیاں، اور گزشتہ تیس برس میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ اسی روشِ حیات پر کار بند چلا آ رہا ہے۔ اس کا جسم بدلا ہے، روح نہیں بدلی، وہ موٹا ہوا، مگر کھوٹا نہیں ہوا ——— عشق کب راستہ بدلتا ہے ؟

شوکت کی شخصیت کے جس پہلو نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا وہ اس کی "نارملیسی" (NORMALCY) ہے۔

وہ روزمرہ کا آدمی ہے۔ محاورے کا آدمی نہیں۔ نہ وہ اتنا نستعلیق ہے کہ ٹائم ٹیبل دیکھے بغیر، اسلام علیکم۔ کہہ سکے۔ نہ اتنا ازخود رفتہ کہ گھر سے آٹے کے لئے پیسے لے کر نکلے۔ اور ان پیسوں کے کباب کھا آئے۔ وہ معروف ہے مگر معروفیت کا غلام نہیں۔ طبیعت میں اتنی نادانی بھی ہے جتنی داناؤں میں ہوتی ہے۔ یا ہونی چاہیئے۔ وہ ان فلسفیوں میں سے نہیں کہ جن کے ہاں جب پہلا بچہ پیدا ہوتا ہے تو فلسفی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ شوکت جیسے شخص کو اپنے عہد کے زندہ کرداروں کا سچا نمائندہ کہنا چاہئے۔ اس کی اسی کشادگی، عمومیت، ہمہ ردی اور "نارمیلیٹی" نے اس کی شخصیت کو ایک ایسی کتاب بنا دیا ہے، جس کو بار بار پڑھنے سے اس کی کشش اور بڑھتی چلی جاتی ہے اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ غیر معمولی آدمی ہونے کے لئے ـــــ معمولی آدمی ہونا کتنا ضروری ہے۔

شوکت کی شاعری کو میں نے ابھی تک الگ باندھ کر رکھا ہوا تھا۔ شاعری شوکت کی ایک بنیادی حیثیت ہے۔ مگر اس کی زندگی کے مدار میں مختلف محبتوں کے اتنے بہت سے سیّارے گردش کر رہے تھے۔ کہ شاعری کا سیارہ کئی مرتبہ سیاروں کے اس ٹریفک میں "جام" ہو کر رہ گیا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں بھی ہوئیں کسی نے کہا یہ سیارہ مدار ہی سے کٹ گیا۔ کسی نے کہا "شاعری کا سیارہ" ـــــ "دوستی کے سیارے" سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو چکا۔ یاد رہے کہ ایک طویل مدت کے بعد، اس کے شعری مجموعے "کوئے تباں" کی اشاعت سے یہ ثابت ہوا کہ یہ سیارہ ثابت بھی تھا اور ثابت قدم بھی۔

ہمیں یاد ہے کہ نوجوان شوکت واسطی نے جب پہلے پہل اردو شاعری میں اپنی مستانہ لے اٹھائی تو اس نے دنیائے ادب کو چونکا دیا تھا۔ وہ ایک جھلملاتا ہوا ریشمی اسلوب لے کر ایوانِ ادب میں وارد ہوا۔ اردو کے کتنے ہی گونگے الفاظ نے اس کے شعر آبگینہ رنگ میں بولنا سیکھا۔ حتیٰ کہ افلاطون نے جس موسیقی کو صحت کے لئے مفید قرار دیا ہے۔ اس موسیقی کی لہریں بھی اس کے ترنم میں موجزن تھیں۔

ایک نوخیز شاعر کی حیثیت سے جتنی شہرت اور پذیرائی شوکت کو میسر آئی اس کے کم معاصرین کو نصیب ہوئی۔ مگر شوکت نے گھر آئی ہوئی شہرت کو گھر سے نکال دیا۔ وہ شاعری سے زیادہ "ساغرگری" پر توجہ دینے لگا۔ گزشتہ تیس برسوں میں صوبہ سرحد میں جس سلیقے اور جس آب و تاب کے جتنے مشاعرے، علمی سیمینار اور ادبی مذاکرے، شوکت واسطی کے ایثار و عمل سے منعقد ہوئے۔ ادب و تہذیب کی خدمت کا یہ ریکارڈ ـــــ بڑی بڑی سرکاری "گرانٹیں" کھانے والے بعض شکم سیر اداروں سے کہیں زیادہ جلیل و جمیل سمجھا جائے گا۔ شوکت کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو خط نہیں لکھتا۔ مشاعروں اور جلسوں کے دعوت نامے بھیجتا ہے۔ نہ جانے کتنے شعرا کی "حنا بندی" اس کے خونِ جگر اور "دستار بندی" اس کی دوستداری کے طفیل عمل میں آئی۔ اس لحاظ سے شوکت واسطی کو اگر صوبہ سرحد میں اردو شاعری کا ـــــ "بادشاہ گر" ـــــ کہا جائے۔ تو یہ کچھ غلط نہ ہوگا۔ اگرچہ فتوحات کے اس ریلے میں، بہت

سی اپنی زمین، بادشاہ سلامت کے پاؤں تلے سے نکل گئی۔ اس کا شمار موجودہ دور کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے لیکن اگر وہ اپنی بے پناہ شعری صلاحیت کی طرف یکسوئی سے متوجہ ہوتا۔ تو چکا چوند، کا عالم کچھ اور ہوتا۔

ممکن ہے یہ تنہا میرا احساس ہو ——

ہوسکتا ہے یہ تاثر غلط بھی ہو کر   انسان آخر ایک خواب ہی تو ہے۔ جس کے بعض اجزا رتعبیر ہو جاتے ہیں —— بعض نہیں ہوتے —— اور بعض نہ جانے کس وقت تعبیر کو پالیں۔ خوابوں کے تعبیر ہونے کی ایک رُت تو ہوتی ہے۔ میعاد کوئی نہیں ہوتی۔

اور صاحبو! میں اب بوڑھا بھی تو ہو چلا ہوں —— اور بوڑھے لوگ عموماً —— اعتراضات زیادہ کرتے ہیں —— سوالات زیادہ اٹھاتے ہیں —— مشورے زیادہ دیتے ہیں۔!!

طنز و مزاح

مکاتیبِ خضر

محمد خالد اختر

عطاء الحق قاسمی کے نام

مولوی ابن مولوی۔ ! الاماں ! الاماں ! ایک طریقہ بات کہنے کا جو تمہارے ہاتھ آ گیا ہے۔ تمہارے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے۔ زمین آسمان ایک کر رکھا ہے۔ اس طرزِ گفتار پر اتراتے پھرتے ہو اور میں نہیں کہتا کہ تمہارا اترانا بجا نہیں مگر میاں صاحب زادے ! ذرا غور کرو۔ یہ اسلوب اور ڈھنگ عبارت لکھنے کا انعام ایزدی ہے۔ تم گھر سے لے کر تھوڑا آئے تھے۔

برخوردار ! میں تمہارا مداح ہوں۔ تمہارا بھی اور تمہاری خوش گوئی اور رنگین ادائی کا بھی۔ رشک اسلیے نہیں کرتا کہ اب اس پایانِ عمر میں کہ عالم بے خودی و مدہوشی کے مزے لوٹتا ہوں اس کا خیال نہیں آتا۔ سوچتا ہوں کہ میدانِ ادب میں جو تیر مجھے مارنا تھے وہ سب مار چکا اب ترکش تیروں سے خالی ہے اور طبیعت کا وہ ولولہ اور جوش نہ رہا۔ جب کبھی بھولے سے دوات قلم لے کر کچھ لکھنے کو بیٹھتا ہوں تو مضامین اس پہلے کی سی تیزی اور روانی سے آپ ہی آپ نہیں اترتے چلے آتے اور اس پیرانہ سری کے عارضوں سے محنت پژوہی و جگر کاوی و کوہ کنی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ ذہن کہتا ہے میاں خضر اس عمر میں کیوں جھک مارتے ہو، کیوں اس کاوشِ بے مقصد سے جی ہلکان کرتے ہو۔ اس لکھنے لکھانے پر خاک ڈالو اور اللہ اللہ کرو کچھ عاقبت کا سامان بہم پہنچاؤ تاکہ آگے چل کر پچھتانا نہ پڑے۔ بھائی ان دنوں ایک صاحب خواجہ محمد اسلام صاحب کا رسالہ "حسن پرستوں کے انجام کا منظر" نظر سے گذرا۔ صاحب تصنیف نے مرنے کے بعد کے واقعات کا جو نقشہ کھینچا ہے اور حسن پرستوں کی ملائک کے ہاتھوں درگت اور پٹائی کا جو آنکھوں دیکھا حال بالتفصیل رقم کیا ہے۔ اسے پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دل ایسا دہلا ہے کہ حسین صورت کو دیکھتے ہی زہرہ آب ہوتا ہے اور دانت بجنے لگتے ہیں تم یہ کتاب پڑھو اور عبرت پکڑو۔ میرا دعویٰ ہے مولوی عطا طول عمرہ کی سب ترکی تمام ہو جاتے گی۔ اس سلطنت کے لاکھوں لوگوں نے اس کتابِ وحشت ناک کا بغور مطالعہ کیا ہے اور کانوں کو ہاتھ لگایا ہے۔ سنتے ہیں اسے جامعہ کے نصاب میں رکھنے کی سفارش چند اہلِ ایمان نے کی ہے اور حق بات یہ ہے کہ قوم کے بگڑوں اور بد اندیش لوگوں کو سدھارنے اور راہِ راست پر ڈالنے کے لیے اس کتاب سے بہتر انتخاب اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ میرا حال تو تم پر معلوم ہے۔ عالم شباب میں بھی اس کوچے کا رخ نہ کیا ساری عمر میں کسی ستم پیشہ سے واسطہ نہ پڑا۔ نہ کسی محبوبہ کی بے رخی اور بے مہری کے زخم کھاتے اور نہ کبھی کسی غارت گرِ ایمان سے نامہ و پیام کا رشتہ باندھا۔ اس لیے عاقبت میری بخیر ہو گی۔ ہاں ہفتہ عشرہ میں ایک آدھ بار یارانِ باصفا کی مجلس میں بیٹھ کر چند ایک جرعے انگریزی شراب کے پی لیتا تھا۔ ہم لوگ سرِ شام ایک رند

دوست کی بیٹھک میں فراہم ہوتے تھے۔ اختلاط و انبساط کی باتیں ہوتی تھیں۔ موسیقی، فلسفہ، نجوم اور ادب کے تذکرے ہوتے تھے اور طبیعت کی گرمی سے سب احباب ان فنون میں آسمان سے تارے توڑتے تھے۔ ان لمحوں میں زندگی کی تب و تاز کا احساس ہوتا تھا لیکن معصوموں کی اس محفل کو کسی کی نظر کھا گئی۔ بارہ ربیع الاول کو حاکم اکبر نے اس قلم رو میں نفاذ اسلام کا اعلان کیا۔ اس سے اگلے روز میں اپنے دوست کی بیٹھک پر گیا۔ احباب جمع تھے مگر افلاک کی سیر کا سامان نہیں تھا اور نہ باتوں اور مباحثوں میں وہ گرمی تھی۔ صاحب خانہ اور دوسروں کی باتیں مجھ کو اناپ شناپ، پھیکی اور بے مزہ سی لگیں وہ اپنے آپ میں نہ تھے۔ میں چند ساعت بیٹھ کر چلا آیا اور پھر نہیں گیا۔ تب سے شراب پینے سے توبہ کی ہے۔

کون اس پاداش میں اسّی کوڑے کھائے؟ کون اگلے جہان میں جہنم کی آگ میں تپنے کا خدشہ مول لے؟ آخر کو اہل ایمان کے نزدیک مے نوشی گناہ کبیرہ ہے۔ گو چند صوفیاء اور صاحبان معرفت کے نزدیک اصل گناہ کبیرہ جن پر پکڑ ہوگی تین ہیں۔ اول کسی کا دل دکھانا دوم عیاری اور کینہ خصلتی۔ سوم جہالت۔ ان تینوں گناہوں سے متصف انسانوں کا اس ملک میں ہجوم ہے۔ انہوں نے سب کا جینا دوبھر کر رکھا ہے اور ان کی کارفرمائیوں سے ملک تباہی اور بدحالی سے دوچار ہے۔ ان کے منہ کو کوئی نہیں آتا اور وہ اس دور میں خدائی فوجدار بنے پھرتے ہیں۔

ایک لطیفہ نشاط انگیز سنو! لوہاری دروازہ کے اندر میرے ایک رشتہ کے بھائی کا مطبع ہے۔ دو ہفتے ہوئے میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ باتوں باتوں میں نئے نصاب کی درسی کتابوں کا ذکر چلا۔ انہوں نے اطلاع دی کہ اردو کی دوسری یا تیسری کتاب میں محمد اسماعیل میرٹھی کی ایک نظم باری تعالیٰ کی حمد میں تھی۔ اس میں پہلا شعر تھا "رب کا شکر بجا لا بھائی۔ جس نے ہماری گائے بنائی" یہ شعر نیا نصاب بنانے والوں کو کھٹکا۔ انہوں نے اسے قابل اعتراض اور ملحدانہ گردانا اس واسطے کہ گائے اہل ہنود کو متبرک ہے اور وہ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ میرٹھ کے مولوی صاحب کا یہ سہو ان کی طبع متین پر گراں گزرا اور انہوں نے مولوی بے چارے کی ساری کی ساری نظم نصاب سے قلم زد کر دینے کا فیصلہ کیا حالانکہ قصور ایک شعر کا تھا۔ اسی عزیز نے بتایا کہ پہلے بچوں کے لیے لکھے گئے اردو قاعدے سارے کے سارے خلاف دین ہونے کی بنا پر موقوف ٹھہرے۔ مولوی عطا صاحب تم کو یاد ہوگا ہمارے زمانے میں الف آم۔ ب بلی۔ پ پنکھا۔ ز زرافہ وغیرہ سے قاعدے کی ابتدا ہوتی تھی اور اسکے ساتھ ان چیزوں جانوروں کی تصویریں بھی ہوتی تھیں جن سے بچے کا تخیل متحرک ہوتا تھا۔ نئے نصاب بنانے والوں نے سوچا کہ یہ سب لغو، لوچ اور بے معنی ہے۔ الحمد سکھلاتے ہوئے بھی لازم ہے کہ ایک ننھے سے ذہن میں مذہب اور ملت اور عقائد و شعائر کی باتیں اتارنے کی کوشش کی جائے۔ سنا ہے اب نئے نصاب کے قاعدے میں الف سے ایمان با اللہ ہوگا۔ ب سے بلی یا بکری نہیں ہوگا بلکہ بنی اسرائیل ہوگا۔ پ سے پاکیزگی اور ت سے تبلیغ بنیں گے۔ اس طرح گویا پہلی جماعت سے ہی بچے راسخ العقیدہ مسلمان اور بکے ! اخلاق بن کر آگے چلیں گے میاں لڑکے! بچوں کی اصلاح کرنے کو ان کو راہ ہدایت پر ڈالنے کے لیے ان نصاب بنانے والوں کا ذوق شوق اپنی جگہ پر مگر بچوں کے قاعدوں اور درسوں میں کچھ لطف طبع اور شادمانیٔ دل کا سامان بھی تو لازم ہے جسے پڑھ کر ان کا ننھا دل بہلے۔ تخیل کو جلا ملے اور قدرت کی چھوٹی بڑی مخلوقات سے محبت پیدا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں سے جو بچے کی نفسیات

نہیں جانتے صحیح کام کی توقع نہیں۔ بھائی یہ لوگ راہِ دین کے غول ہیں۔ اسلام کی روح سے انہیں کیا آشنائی۔ کائنات کے حسن سے کیا سروکار! ہائے ہائے! یہی اصحاب بے علم۔ نسک مایہ۔ عقل سلیم و طبع لطیف سے بے بہرہ۔ اس قلمرو کے ذرائع ابلاغ عامہ پر مسلط ہیں نتیجہ یہ کہ لوگ اب اہل ہنود کا امرتسر کا ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔ بھارت اور انگلستان کے ریڈیو کے پروگرام اور جے سی سنتے ہیں۔ سچ جانو اس شہر میں لاہور کا ٹیلی ویژن کوئی نہیں دیکھتا کوئی دیکھے بھی تو کیا۔ جب پروگراموں میں کیف نہیں۔ تفریح نہیں۔ تمثیلیں ہیں تو خشک موعظت و پند سے معمور۔ بچوں کے لیے پروگرام بیشتر لغو اور بے سرور جنہیں بچے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ بھائی عوام الناس پہلے ہی سے ایسی جانگداز بلاؤں میں مبتلا ہیں کہ کوئی کیا کہے۔ ان کو دن بھر کی بک بک جھک جھک کے بعد گھر لوٹنے پر کوئی تفریح چاہیے جو دل پذیر ہو ان کے آلام اور دکھوں کو کچھ دفت کے لیے ان کے ذہنوں سے بھلا دے۔ مگر ہمارے ٹیلی ویژن اور ریڈیو نے ہمہ وقت سوتے جاگتے، ہم بھٹکے ہوؤں کو رشد و ہدایت کی راہ پر ڈال لینے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ہمارے اخلاق سدھارنے کے پیچھے پڑے ہیں۔ کیوں صاحب! کیا ذوق بخشی و نشاط انگیزی ان ارباب ابلاغ کے نزدیک کفر اور خارج از اسلام ہے۔ کیا اس سے انہیں یہ خطرہ ہے کہ ہم راہِ ہدایت سے ہٹ جائیں گے اور عقبیٰ کی پرسش سے غافل ہو جائیں گے۔ مولوی! میری سمجھ میں یہ نہیں آتا اور امیدوار ہوں کہ آپ میرے دل نشیں کریں گے کہ جب ٹی وی کی ایک تمثیل میں اکٹھی چار پانچ جواں سال بیبیوں کو چہکتے ہنستے دکھانا مَردوں کے لیے مخرب اخلاق قرار پایا تو اس میں نامحرم خوش شکل جامہ زیب مردوں کو لے آنا کیوں گھر کی بیبیوں بیٹیوں کے لیے مخرب اخلاق نہیں ہوگا۔ توبہ توبہ یہ اصحاب جو ہم کو ان خوشیوں سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے اذہان تنگی اور پراگندگی سے اٹے ہیں۔ دوپٹے سے بے سر جس جوان عورت کو یہ دیکھتے ہیں ان کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔ سعدی کی چندی اب اور کیا کروں۔ تم خود اچھی طرح جانتے ہو کہ کیا کہہ رہا ہوں۔

میں ان دنوں بے حد خوش ہوں۔ بارہ ربیع الاول کو حسب الحکم حکام کوچہ و بازار میں روشنی بڑی اور عوام الناس کو مژدہ اسلام کے نفاذ کا سنایا گیا۔ سید الانبیا، ختم المرسلین کا فرمان ہے کہ اپنے پڑوسیوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے کرتے ہو۔ ٹیلی ویژن پر اس قول کی عبارت کو بار بار دکھاتے ہیں اور باور کرتا ہوں کہ جلد ہی اہل اسلام اس قول محمدی پر عمل پیرا ہونے لگیں گے اہل متمول اپنے ساز و سامان، ملبوسات، رنگین ٹی وی سیٹ، جاپانی موٹر کاریں، فرج کیسٹ ٹیپ ریکارڈر وغیرہ اپنے مسکین پڑوسیوں میں بانٹنے میں لگ جائیں گے۔ وہ اپنے چار چار کنال کے حسین و جمیل بنگلوں کے نصف حصوں میں آس پاس کے ان مساکین کو لا آباد کریں گے جن کے پاس رہنے کو گھر نہیں اور ان کو اپنے ساتھ، دسترخوان نعمت پر ساتھ بٹھا کر وہی مرغن اور لذیذ خوراک کھلائیں گے کہ جو ان کو خود کو مرغوب ہے۔ مولوی تو کہے گا یہ خضر کیسی کیسی شرارتیں کرتا ہے؟ اجی شرارت کیسی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ نبی آخر الزماں کے قول کی ہمارے دلوں میں کیا وقعت ہے تو یہ سب کچھ کرنا پڑے گا۔ ورنہ یہ سب خالی خولی باتیں ہیں۔

سنو صاحب! میں ہنسی نہیں کرتا۔ بارہ ربیع الاول کے بعد سے میں نے گمان کیا ہے۔ اس ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہے چوروں نے چوری سے توبہ کر لی۔ لوگوں نے بہتان طرازی۔ افترا پردازی سے منہ موڑا اور یک بہ یک فرشتہ خصلت بن

گئے۔ بیبیاں دوپٹے سے سر ڈھانپ کر اور برقع پہن کر نکلنے لگیں۔ مرد سڑکوں پر آنکھیں نیچی کر کے چلتے ہیں اس لیے کہ کسی مہ وش پر نظر پڑ جانے سے خیال فاسد دل میں جاگزیں نہ ہو۔ خواجے تاجر کم نہیں تولتے اور ہر چیز کے مقررہ دام لگاتے ہیں۔ میں دو تین ماہ سے صاحب فراش، ناتواں اور سست ہوں۔ کہیں آتا جاتا نہیں اس لیے کیونکر کہوں کہ میرا گمان واقع پر مدار ہوا۔ تم کو جو اپنے سکوٹر پر سب مقامات کی جہاں گردی کرتے ہو مگر درپیش کا حال معلوم ہوتا رہتا ہوگا۔ تم بتاؤ کیا وہی کچھ ہوا جو میرے گماں میں ہے۔

فاضل اجل زبدۃ العلماء المتبحرین حضرت مفتی محمود صاحب مدظلہ العالی صدر الصدور قومی اتحاد نے اخباروں میں اعلان کیا ہے کہ بارہ ربیع الاول کو نفاذ شریعت کے بعد مملکت پر اللہ کی رحمتوں کا نزول متواتر ہونا ہے گا اور جیسا کہ ملک عرب میں ہوا۔ زمین سونا اگلے گی۔ دولت کی ریل پیل ہوگی اور ہن برسنے لگے گا۔ میرے گمان میں ان کی پیش گوئی صحیح و صائب ثابت ہوئی اور ہن کو برستے ہم سب نے دیکھا۔ جس دن ان کا اعلان آیا اس سے اگلے روز ہی ٹیلی ویژن پر یہ مژدہ جاں فزا سنا کہ سرکار کینیڈا نے حکومت پاکستان کو کئی لاکھ پاؤنڈ کا قرضہ دیا ہے۔ اس لیے کہ کینیڈا سے ریل کے لیے ڈیزل انجن خریدے جا سکیں یہ خبر طرب انگیز سن کر کس کا سر فخر سے اونچا نہ ہوا ہوگا۔ نئے انجن آجانے سے ریل کی حالت سدھرے گی۔ کارپردازان ریلوے کی چاندی ہوگی اور کاروبار چمکے گا۔ امید کرنا چاہیے کہ گاڑیاں اپنے صحیح وقت پر منزل مقصود پر پہنچنے لگیں گی۔ درجہ اول اور درجہ دوم کے مسافر ریل کے ڈبوں کی کھڑکیوں میں سے اندر گھسنے کی بجائے دروازوں ہی سے داخل ہو سکیں گے۔ ریلوے کے منتظمین، ایئر کنڈیشنڈ ڈبوں میں اپنے لواحقین اور اقربا کو لاہور سے کراچی اور کراچی سے لاہور تک کی مفت سیر نہیں کرائیں گے

میرا حال سنو۔ بوڑھا ہونے کو آیا۔ روح سے جاں کو جو رشتہ ہے، وہ قائم ہے اور بس۔ آئندہ سال جنوری کی تیئس تاریخ کو پورے ساٹھ برس کا ہو جاؤں گا۔ دستور ملازمت سرکار ہے کہ جب کوئی ملازم ساٹھ سال تک پہنچ جاتا ہے، اسے فارغ خطی دے کر گھر بھیج دیتے ہیں۔ پنشن تین چار سال بعد منظور ہوتا ہے۔ اس کی خاطر مہینوں مہتمم خزانہ اور صاحب انکم ٹیکس افسر بہادر کے دفتروں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ وہ پیسے کے بغیر کام نہیں کرتے۔ میرے کئی دوست نیم آشنا جن میں کئی زبان آور اور چالاک ہیں فارغ ہونے کے سالوں بعد پنشن کے باب میں الجھے رہے۔ دو تین کو تو میں جانتا ہوں ان کو پنشن نہیں ملا اور وہ فوت ہو گئے۔ میں صرف آدمی سادہ آدمی اس لیے جانتا ہوں کہ مجھے پنشن نہیں ملے گا۔ پنشن کے روپیہ کے بغیر کیسے کھاؤں پیوں گا اور کیوں کر جیوں گا۔ یہ سوچا ہے کہ ملازمت سے فراغت کے بعد بہاولپور میں اپنی آبائی حویلی میں جو ڈھے رہی ہے منتقل ہو جاؤں گا۔ پنشن مل گیا تو وہاں بخوش و ناخوش گذارا ہو جاتے گا مگر لاہور کے احوال باصفا سے چھوٹ جانے کا خیال آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ تم کہتے ہوگے یہ خبطی خضر کیا رونا پیٹنا لے بیٹھا!

آپ کا مجھ سے اپنے مجلے "معاصر" کے لیے کہانی کی فرمائش کرنا ذرہ پروری اور درویش نوازی ہے۔ اردو اور انگریزی زبان کے ادب عالیہ سے لگاؤ رکھتا ہوں اور یہی میرے جینے کی توجیہہ ٹھہری۔ ایک زمانے میں اپنے دل افسردہ و رنجور کے بہلاوے اور وقت گذاری کی خاطر داستان گوئی کا آغاز کیا تھا اسے جاری نہ رکھ سکا اور جو کچھ اس صنف میں جھک ماری اس پر شرمسار ہوں۔ فن نظم گوئی میں ایام مکتب میں کچھ طبع آزمائی کی اور دیوان خضر مرتب ہو گیا۔ وہ دیوان کھو گیا۔ اس

کی حسرت ہے۔ محبی محمد کاظم سباک اور صوفی صلاح الدین محمود جیسے دردمند نواز دوست اور میری تحریروں کے جامع اس وقت میسر رہتے جو اسے سنبھال لیتے۔ ہائے کیا چیز تھی!

میرے دستخط خاص سے لکھی گئی یہ عبارت اگر تم سے نہ پڑھی گئی تو کاتب "فنون" حافظ عبدالحق اسے اپنے قلم سے کاغذ پر نقل کر دیں گے۔ وہ میرے خط کا بعض شناس اس شہر میں واحد شخص ہے جو مجھ بدنصیب کی تحریر کے رموز سے واقف ہے ورنہ سال گزشتہ کی لکھی ہوئی میری اپنی تحریر بہ مجھ سے نہیں پڑھی جاتیں۔ حافظ صاحب صاحب اعجاز ہیں۔

یہ خط تم کو بسبیل ڈاک برنگ پہنچے گا۔ تم اسے خود لینے آؤ گے تو مجھے گھر پر نہ پاؤ گے میں نے گھر کا دروازہ بند اور کہیں آنا جانا موقوف کر رکھا ہے۔ کوئی ملنے آتا ہے تو اسے کہلوا دیتا ہوں کہ میں گھر پر نہیں۔ لڑکے! بات یہ ہے کہ حواس بجا نہیں حافظہ رہا نہیں۔ مشکل سے آشنا لوگوں اور قرض خواہوں کو پہچانتا ہوں۔ گھر سے باہر تم مجھے اکثر نہیں پاؤ گے۔ کس واسطے کہ جہاں جاتا ہوں لوگ از راہ تعظیم و تکریم بابا جی۔ چاچا جی کہہ کر خطاب کرتے ہیں اس سے طبیعت بے حد بے مزہ ہو جاتی ہے۔ اپنے دل میں اس ناتوانی اور خرافت کے باوجود یہ سمجھے بیٹھا ہوں کہ میرے ابھی کھیلنے کھانے کے دن ہیں اور سن شعور آغاز نہیں ہوا۔

اس یاوہ گوئی کو اب ختم کرتا ہوں میرے مریدان خوش اعتقاد امجد اسلام امجد اور گلزار وفا چودھری اور احمد حسن حامد کو سلام مسنون اور دعائے افزائی زور قلم پہنچے۔ تم جیو اور اپنی تحریر دلپذیر سے مجھ شکستہ دل کو اس وقت تک شادمان رکھو جب تک کہ بلاوا نہیں آتا۔

محمد خالد خاں خضر

ڈاکٹر ناموس کے نام

استاد عالیشان، فاضل اجل، فریدون زمان حضرت ڈاکٹر شجاع منعمی ناموس صاحب کو شاگرد دیرینہ فقیر خضر کا سلام۔!

پرسوں دوشنبہ ۱۶ جولائی ۱۹۰۵ء کی بات تھی۔ سہ پہر دن چڑھے ایک رفیق کے ہمراہ اس کی مشینی شکرم میں کہ اس کو موٹر کار کہتے ہیں، پکی ٹھٹھی محمد سمن آباد جاتا تھا۔ حضرت کے دولت کدے کے سامنے سے گذر ہوا آپ کا وہاں سکونت پذیر ہونا اور مرکز علوم کل سے ضیائے پُر نور چار سو پھیلانا، مجھ پر معلوم نہ تھا۔ کتبے کہ لوح کہو، یہ بہت سارے تمہارے مسکن پر آویزاں نظر آئے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ نام آپ کا تھا۔ عقل البتہ ورطۂ حیرت میں ہوئی کہ ایک آدمی اکیلے دم اتنے سارے شعبے اور محکمے کیونکر چلاتا ہوگا۔ روحانیات و عملیات کے ساتھ ساتھ حکمت و کارخانہ درآمد و برآمد کیسے پورا ہوتا ہوگا۔ ایک تختہ بزبان انگریزی کاسموس سنٹر یعنی مرکز افلاکیات کا تھا۔ نیچے اس کی تعریف و وضاحت تھی۔ تحقیقات روحی میں اولے ترین کل عالمی محکمہ۔ ایک تختہ کل عالمی اقبال اکادمی کا تھا اور ایک قصر روحانیات، عالمی ادارہ برائے تحقیق و ترقی، علوم روحانی، پامسٹری، نجوم، عملیات ہپناٹزم، آدھ درجن تختے۔ کوئی عطاری کا کوئی تاجر درآمد و برآمد کا غرض الم غلم، مسکن کے سب کردن پر آویزاں تھے۔

اشتیاق دید نے بے قابو کیا۔ ذکاء الملک کے در دولت پر دستک دینے یا گھنٹی بجانے کا قصد کیا پھر میں

نے سوچا کہ حضرت کے مشاغل عالیہ میں مخل ہونا درست نہیں کیا پتہ، تفکر روحانیات میں بیٹھے عمل ہمزاد کا کرتے ہو۔ مراقبے میں گئے ہو یا مرکز افلاکیات کی چھت پر دوربین سے ہفت افلاک کی سیر میں ہو۔ ہو سکتا ہے کُل عالمی اقبال اکادمی میں اپنی اور اقبال لاہوری کی رنگین عکسی تصویر تیس پینتیس برس قبل کی حضرت کے دست مبارک سے کھینچی ہوئی، سامنے دھرے بیٹھے ہو اور دونوں کی صورتوں، وضع قطع کا موازنہ کرتے ہو۔ نہ فقیر خضر! اس عالی مقام بزرگ کے اوقات کا ہرج نہ کر! پھر ملنا۔ اب لوٹ جا۔ بن دید کی تڑپ دل میں لیے لوٹ آیا۔

ان دنوں آپ کی تصنیف کئے رسالہ "گلشنِ مشرق" کی عبارت کو پڑھتا ہوں اور وجد کرتا ہوں۔ آغاز میں مذکورہ تصویر تمہاری اور علامہ اقبالؒ کی درج ہے۔ ان سے پیام مشرق پر بحث کرتے ہو۔ وہ کھڑے کالر پر ٹائی باندھے آرام کرسی پر بیٹھے ہیں تم ایک سُرخ مجلّد کتاب کو کھولے، جھکے ہوئے کسی شعر کے غالباً معنی پوچھتے ہو وہ گھور کر حیرت سے تمہارے منہ کو تکتے ہیں کہ یہ شخص زبان فارسی سے اس درجہ آشنا ہے دونوں ارسطوان سخن کے نام مع القاب و خطابات و سندات تصویر کے تحت بزبانِ انگریزی چھاپے ہیں اور ماشاء اللہ چشم بد دور تمہارے خطابات اور اسناد علامہ اقبال کے مقابلے میں بے حد مستر اد ہیں یعنی آٹھ سطور میں آئے ہیں اور اقبال کے ہاں قصہ تین سطور میں تمام ہوا ہے۔ نائٹ سرکار برطانیہ کے وہ بے شک ہوئے لیکن حضرت بھی ذکاء الملک فریدونِ زمان، الحاج بنے۔ ماشاء اللہ اشرق و غرب کا کون سا جامعہ ہے جس نے آپ کو مختلف علوم میں سند سے نہیں نوازا۔ اُردو، فارسی، عربی، اسلامیات میں ایم اے طبیعات و کیمیا میں ایم ایس سی، پی ایچ ڈی، مولوی فاضل عربی۔ ایچ پی پشتو۔ ایم او ایل ادیب فاضل، مرتبہ اوّل تمغہ طلائی، ایم ڈی ہومیو۔ حج۔ ایم ایچ ایس ایس (امریکہ) ایم آر ایس ایل، اے آر پی ایس و علیٰ ہذا القیاس۔ حج کو بھی آپ نے اسناد میں شمار فرمایا ہے اور یہ امر علّت سے خالی نہیں خضر کہتا ہے حج بھی ایک سند ہے۔ جامعۂ ایزدی و بارگاہِ مصطفوی کی اور ہر کسی کو اس کا میسر آنا محال ہے۔ صاحب دولت و ثروت ہونا شرط ہے۔ فقیر خضر اور اس جیسوں کے نصیب میں یہ سند کہاں! میں گمان کرتا ہوں کہ جتنی اسنادِ فضیلت آپ نے جا بجا سے فراہم کی ہیں۔ پاپائے روم کے پاس بھی ان کا عشر عشیر نہیں۔ خدا ان میں اضافہ مزید کی توفیق حضرت کو عطا فرمائے کہ ہنوز کسر باقی ہے۔ میں نے جانا کہ بغیر کشف و معرفت کے مستحقوں کے اسماء کا کھوج نکالنا اور ان تک رسائی پانا امر محال ہے تم سچ مچ ولی اور عارف ہو۔ مانو نہ مانو میں مانتا ہوں۔

حضرت کی عالیہ شبیہہ جو کتاب میں مندرج ہے اس میں داڑھی رکھی ہے حالانکہ پہلے منڈواتے تھے اور صاحب فراش بلا ناغہ ہر صبح اس پر استرا پھیرنے آتا تھا۔ حضرت پہ پھندنے دار کلاہ، چکور، جبۂ علمیت زیب تن کرنے کا کیا موقع تھا۔ اچھے خاصے عجوبۂ روزگار لگتے ہو میں حرف نہیں رکھتا۔ اگلے ورق پر ان مقامات و شہروں کی فہرست ہے جہاں کی تم نے سیاحت کی۔ افغانستان، کابل، شملہ کا پہاڑی علاقہ، دہلی، لدھیانہ، علی گڑھ، موہنجو ڈارو، کالا شاہ کاکو میاں چنوں کا نواح۔ واہ واہ آپ تو جہانیاں جہاں گشت نکلے۔ دور دراز علاقوں کی خاک چھانی ہے۔ اس کے آگے آپ کی تصنیف کے رسائل کی فہرست ہے فوٹو گرافی سے لے کر بوعلی سینا تک کل بتیس تصانیف حضرت کے ذمے ہیں اقبال لاہوری نے نثر و نظم کے صرف چند رسالے لکھے و رسالہ و دستور ناموس" ایک قصیدہ، ایک شخص کسی ابوظفر ڈھکی

داس نے حضرت کی تہنیت میں نذر کیا ہے کتاب کا یہ آغاز آپ کی یاد دہانی کی خاطر درج ذیل کرتا ہوں۔

گلشن مشرقی

جستجو کا جام

جلوۂ گلفام کی آرزو میں محوِ گردشِ ایام
جب صبح و شام کے گلزارِ رنگ و بو کا اہتمام
سبو میں آتشِ سیال
تمثالِ امواجِ جمال میں بے خودی کا ردِ ئے اندمال
وغیرہ وغیرہ

واہ حضرت کیا گلفشانی و جوہر نگاری ہے۔ حق یہ ہے کہ الفاظ کا اعجاز اس کو کہتے ہیں۔ خواہ مطلب کچھ نہ ہو اور عوام الناس اس ڈھکوسلے میں راہ نہ پائیں۔ اردو زبان کو متقدمین کے بعد یہ پیرایہ اظہار بخشنا کچھ آپ کے سے ہی دل گردے والے کا کام تھا۔ ایک حکایت ایک عرب بدّو اور اس کے اونٹ کی زبان زد خاص و عام ہے۔ سب مدرسے کے لڑکے اس سے آشنا ہیں اور وہ یوں ہے کہ ایک بدّو صحرا میں اپنے خیمے کے اندر سوتا تھا۔ اس کا اونٹ باہر خیمے کی میخ سے بندھا تھا اونٹ کو سردی لگی اور اس نے اپنے مالک سے کہا "آقا سردی بہت ہے کہو تو گردن اندر کر لوں"۔ بدّو بولا "بھائی کر لو"۔ چنانچہ اونٹ نے گردن اندر کر لی۔ پھر اس ڈھنگ سے رفتہ رفتہ اپنی اگلی ٹانگیں خیمے کے اندر گھسیڑیں بعد ازاں سارے کا سارا اندر گھس آیا اور بیچارا بدّو اس کو جگہ دینے کے لیے سرکتا سرکتا خیمے سے باہر تھا۔ حضرت کے قلم سے یہ حکایت کس لطف سے ادا ہوئی ہے "مذموم عادات" کے عنوان سے مضمون کو یوں مانڈھلیے۔

"ایک تھا صحرا نوردِ اعرابی۔ ہر ذرّے کے دل میں ہرجائی کی بادۂ پیمائی سے بازیابی اور گرد باد میں اس کی نگاہ جہاں گرد سے شادابی۔ اس کا تھا اک رفیقِ طریق اور بے کنار ریگزار کا غمگسارِ شفیق۔ جملِ فرد، پیکرِ بے تابی، پھر چلے دونوں رو بصحرا جہاں نہ مسافر نہ بسیرا اور نہ رہبر کے گرد فریب کا پھیرا۔ رات آئی۔ تاریکی چھائی، ہوا لہرائی۔ اتفاق کی بات نہ فضا میں ابر کے نشانات نہ ہوا میں رطوبت کی علامات۔ مگر آگئی برسات، اونٹ کی فراست نے خوشامد کو فصاحت کا لباس پہنایا۔ بناوٹ کی لیاقت نے قصائد کو اجازت کا قرطاس بنایا۔ شہنشاہ کی حرم سرا، علما اور اولیا تجھ پر فدا، ایران اور افغان تجھ پر قربان۔ ذرا سر خیمے کے اندر کر لوں وغیرہ وغیرہ"

نتیجہ اس حکایت سے یہ نکالا ہے "کم ز دہمت اور کافورِ فطرت کے ساتھ دنیا یہی سلوک کرتی ہے"۔

حضرت کی قصہ کہانی کی ذوق بخشی اور نشاط انگیزی کا دل سے قائل ہوں۔ میں نے یہ قصہ آپ کا لکھا اپنے لڑکے کو پڑھ کر سنایا وہ بے بادہ مست اور محوِ خواب ہوا۔

ساری کتاب ان نظر افروز صنعتوں سے پُر ہے اور تمہاری تلقین آغاز میں دل کو لگی ہے "اس کتاب کو پڑھو۔ پھر پڑھو کئی دفعہ پڑھو۔ حتیٰ کہ اس کے پیچیدہ مسائل آپ کی ضمیر میں مستقل جگہ بنا لیں"۔

خوب حضرت کی بر جودتِ ذہنی' یہ دانشوری اصلاً آپ کی اسناد کے طفیل ہے۔ فقیر عرض گزار ہے کہ ارادتاً یا سہواً اپنے مفید رسالے میں اسناد کے حصول کا عمل گول کر گئے ہو یہ اس کے پڑھنے والوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ بُرا نہ مانیے گا۔

میرا ایک عم زاد کہ عربی زبان پر عبور رکھتا ہے چند دن ہوئے' بے اختیار شوق دیدار میں حضرت سے مدرسہ دارالعلوم میں ملا۔ وہ بھی ایک زمانہ میں تمہارا شاگرد رہ چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ تمہارے ہاتھ میں عربی کی پہلی کتاب تھی اور تم اس مدرسہ میں نوآموز کیطرح سبق پڑھنے آتے ہو۔ یقین مجھ کو نہ آیا۔ اور کیسے آتا۔ عربی زبان کے ایم اے تم۔ علامۂ اجلّ تم۔ اور زبان کی ابجد سے نا بلد! یہ نہیں ہو سکتا۔ اس امر کی تصدیق اس معلم سے ہوئی جس سے قاعدے کا درس لینے آتے ہو۔ قیاس کرتا ہوں کہ جو عربی بیس برس پہلے سیکھی تھی صاف ہوئی اور ذہن سے مٹی۔ اب نئے سرے سے اسے سیکھنے کا قصد کیا ہے۔ اگر معاملہ اس ڈھنگ پر ہے تو اسناد کی موجودگی میں عربی سیکھنے کی ضرورت کس لیے پیش آئی؟ تیس سال کا واقعہ ہے جب میں کالج میں پڑھتا تھا۔ عربی کے استاد مولانا شاکر محمد رحمتہ اللہ علیہ نے مجھ سے ذکر کیا کہ عربی میں تمہارا تھیسس انہوں نے لکھا تھا۔ اس پر فاضل اجل (ڈاکٹر) کی سند نائب ناظم جامعہ پنجاب نے تم کو پیش کی۔ مولانا شاکر محمد جھوٹ کیوں بولنے لگے۔

تمنا ہے جلد حضرت کے دیدار سے فیضیاب ہونے کی' ہاتھ دکھانے کو پیش کروں گا۔ اگرچہ جو کچھ میری قسمت میں لکھا گیا تھا وہ پیش آچکا ہے اور اب منزل کے قریب پہنچا چاہتا ہوں۔ ایک فہرست چار پانچ اوراق کی تصنیف کرتا ہوں۔ اس میں شرق و غرب کی سب جامعوں' درسگاہوں کی سندات درج ہوں گی۔ وہ ساتھ لیتا آؤں گا۔ آپ اپنے مطلب کی اسناد ان میں سے پسند کر لیجیے گا۔ میں آپ کو نہیں روکوں گا۔

خضر

روبرو

منیر نیازی سے مکالمہ

عطاءالحق قاسمی، سراج منیر، احمد حسن حامد

سوال: منیر آپ کا ایک شعر ہے۔

میرے پاس ایسا طلسم ہے جو کئی زمانوں کا اسم ہے
اسے جب بھی چاہا بلا لیا اسے جو بھی چاہا بنا دیا

تو یہ آپ کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے، اس کی نوعیت کیا ہے؟

جواب: اس کا جواب بہت چھوٹا سا بھی ہو سکتا ہے لیکن تم میری شاعری کے پڑھنے والے ہو۔ اس کا ابر یا تمہیں معلوم ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں کن زمانوں اور کن علاقوں میں گھومتا رہتا ہوں۔ ثروت حسین کراچی کا نیا شاعر ہے وہ کہتا ہے کہ میرے ایک شعر کی معرفت وہ بابل دنینوا کے کھنڈرات تک گھوم آیا ہے۔

ہے بابِ شہرِ مردہ گزرگاہِ بادِ شام
میں چپ ہوں اس جگہ کی گرانی کو دیکھ کر

تو میرے جو علاقے ہیں سوچ کے وہ تو میرا اندازہ ہے کہ تمہیں پتہ ہے لیکن میں اگر اس کی وضاحت کروں تو گراف کسی طرح سے بن سکتا ہے اور اس کی جہتیں بہت نکل سکتی ہیں۔

سوال: آپ نے بہت سے خواب دیکھے اور دکھائے اپنی شاعری میں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارے خواب ایک ہی خواب کے چھوٹے چھوٹے پرزے ہیں اور جو ایک بڑا خواب ہے ان سب کے پس منظر میں وہ ناگفتہ ہے ابھی تک۔ کیا حقیقی زندگی کے عمل میں یہ خواب حائل نہیں ہوتا۔

جواب: بالکل ٹھیک ہے، یہ بہت خوبصورت بات تم نے اپنے طور پر دریافت کی ہے۔ اصل بات تو اپنے خواب سے وابستگی ہے۔ اگر راستے کی چھوٹی چھوٹی رکاوٹیں مجھے اپنے ساتھ بہا کر لے جائیں تو پھر میں کمزور شاعر ہوں۔ میری جو اپنے آئیڈیل کے لیے لگن ہے۔ وہ سچی نہیں ہے۔ اگر اس بات کو مسابقت کے طور پر اور CONFRONTATION کے انداز میں بھی دیکھیں تو میری لڑائی ایک بہت بڑے جن سے ہے۔ چھوٹے چھوٹے جن مجھے راستے میں پریشان کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے۔ پھر میں ان کے ردِ عمل سے رہا ہو جاتا ہوں۔ یہ بڑے کوتاہ قامت جن ہیں۔

سوال: آپ کے ہاں کئی زمانوں میں ایک خواب کے ساتھ زندہ رہنے کا جو عمل ہے تو کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ خواب پاکستان تو نہیں ہے؟

جواب: یہی ہے۔ میں اس کو بہت بیان کر چکا ہوں کہ ہر اہلِ فکر کے پاس ایک اپنی بستی ہوتی ہے متفق لوگوں کی جس میں

وہ آسانی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ اچھے خوبصورت انسانی رابطے اور رشتوں کے ساتھ۔ تو ایک بستی تو ہمیں چاہیئے برصغیر کے مسلمانوں میں اپنے خیالوں کی ایک بستی بسانے کی تمنا کی کشش تھی اور اس علاقے میں آکر اکٹھے ہونے کی تمنا تھی۔ پہلا مرحلہ تھا۔ اب ظاہر ہے کہ وہ بستی پاکستان ہی ہے میری ساری شاعری کا سفر ایک شمالی پاکستان کی طرف ہے میرے سارے راستے اس شہر کی طرف لوٹ جاتے ہیں جس کو ہم شہر اسلام کہہ لیں۔ اس کا نام پاکستان رکھ لیں۔ اسے قریۂ محمد کہہ دیں۔ وہ ایک بستی ہے جس پر محمدؐ کی یاد کا سایہ ہے۔ یہ ہے کہیں دل میں۔ میری شاعری اس بستی کے مکینوں، اس کے مکانوں اس کے باغوں کے ساتھ ساتھ اس میں انسانی رشتوں کی نشاندہی کرتی ہے، اگر تم میری شاعری کو دیکھو گے تو اس میں تمہیں دروازے ملیں گے، مختلف۔ ایک دروازے میں جاؤ گے تو خوشبوئیں، ایک دروازے میں داخل ہو گے تو بھتنے بھی نظر آئیں گے جو ہر اعلیٰ چیز کی ضد میں پیدا ہوتے ہیں اس لیے کہ اصل کے ساتھ نقل کی ضد ہے یا اچھے معنوں میں یہ کہو کہ ہر علم کے ماہر خوف کا پہرہ سا ہوتا ہے۔

سوال: ۔ یہ تو بہت نظر آتا ہے اور اسی لیے کچھ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ منیر خوف کا شاعر ہے۔

جواب: ۔ یعنی جہاں جہاں وہ میری مذمت کر سکتے تھے۔ انہوں نے کر لی۔ میں نے کئی بار ان سے کہا کہ خوف تو میری خوراک ہے۔

سوال: ۔ اچھا شروع شروع میں آپ کی شاعری کی فضا دھندلی تھی اور نیم تاریک تھی اس کی لفظیات ہندی کی لفظیات تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس میں روشنی بڑھتی گئی اور وہ کھلے میدانوں میں اور روشن کائناتوں میں آتی گئی اور فارسی اور عربی کی لفظیات اس میں ظاہر ہوتی گئیں۔ تو یہ ذہنی سفر کیا تھا۔

جواب: ۔ یہی تو ہمارا سفر ہے۔ یہی تو وہ فکر ہے جس سے تاریخ مرتب ہوتی ہے، ایک تاریخ سیاست دانوں سے اور اخباروں سے مرتب ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ایک تخلیقی آدمی بھی تاریخ بیان کر رہا ہوتا ہے، ایک زیادہ گہری اور فکری سطح پر، اصل تاریخ وہی ہوتی ہے۔ جب پاکستان کا قیام ہوا تو ایک نسل تھی جو حدوں پر کھڑی تھی۔ اس کے سردار تھے کرشن اور منٹو اور یہ راشد اور میرا جی ہم سے ذرا پہلے کا اسٹیج گروپ تھا۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی معرفت ہمیں ایک موجود کی خبر ملتی ہے جس سے ایک ناموجود صحیح طریقے سے بھی قریب آتا ہے جو عہد ہم نے نہیں دیکھے وہ ہم نے پہلوں کی معرفت یا ان کے رویوں کی معرفت قبول کیے۔ اس میں بہت ساری غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ پتہ نہیں کتنی صدیوں پہلے کچھ غلط ہو گیا تھا یا وہ علم جس کو لے کر یہ لوگ اس سرزمین میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ اس میں کوئی کنفیوژن تھا۔ اگر وہ علم تھا تو ایسا علم کلی نہیں تھا جس سے آگے دریافت کی حدیں ختم ہو جائیں۔ مثال کے طور پر دو بڑے رویے جن کا ذکر بھی اب کلیشے بن گیا ہے کہ ہم نے ایک مارکسسٹ رویے کے ساتھ اور ایک فرائیڈین رویے کے ساتھ سفر شروع کیا تھا۔ ہم ان حکیموں کے مشکور ہیں کہ جس وقت لوگ دل تنگ تھے اس وقت اس ویژن کی معرفت انہیں ایک مخصوص عہد میں رہائی کا احساس ہوا۔ سوچنے والے لوگوں کے ساتھ ہم اختلاف کا ڈائیلاگ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اہل فکر کے طور پر ہم ان کی عزت کرتے ہیں کہ چاہے ان کا ویژن باطل تھا۔ لیکن اس کے ریفرنس سے حق کی دلیل تو مضبوط پیدا ہوئی۔

سوال :۔ لیکن بہت سے لوگ تو پھر اس کے اسیر ہو کر رہ گئے نا!

جواب :۔ وہی بات جو تم نے شروع میں کہی کہ اگر میں ایک چھوٹے ردِ عمل میں مبتلا ہو کر اپنے راستے سے بھٹک جاتا ہوں۔ تو پھر میری پہنچ ادھوری ہے، میری لگن ادھوری ہے۔ یوں نہیں ہوتا کہ بہت سارے لوگ رہائی کرتے ہوں بلکہ بعض اوقات صرف ایک آدمی بنیادی بندھن سے آزاد کرتا ہے اور باقی لوگ اس کا عکس ہوتے ہیں۔ جب ہم یہاں داخل ہوئے تھے تو ہمارا CLAIM یہ تھا کہ ہم نے وہ پیدا کرنا ہے وہ مثال بنانی ہے کہ جس کی کوئی نظیر نہیں ملے گی یہ بات ابھی تک میرے دل میں ہے اسی لیے میں کبھی سوچتا ہوں کہ یہ شاعری بھی جو میں کر رہا ہوں اگر کبھی اس کا ترجمہ ہو جائے۔ تو اس کی خوشبو بہت دور تک پھیلے گی۔ میں اپنی مثال سے پاکستان کو دیکھتا ہوں کہ ایک خطہ ارض حسین کی مثال کہیں نہ ملتی ہو، خوبصورت ہو، اس میں کشش ہو۔ اس میں ایک جمال کا جلال ہو — یہ ہے میرے دل میں۔

سوال :۔ یہ جو بعد میں آنے والے لوگ ہیں تو ان میں سے بہت اچھے لکھنے والے آپ کی بصیرت کی ایک روشنی لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ آپ ہی کے انداز میں خواب دیکھتے ہوئے چلتے ہیں۔ تو ان سے آپ میں ہم سفری کا کوئی احساس پیدا ہوتا ہے یا کیا شکل ہوتی ہے۔

جواب :۔ اس کے دو روپ ہیں۔ ایک تو ان کا منفی رول یہ ہے کہ انہوں نے میرا جو اصل اور خالص لہجہ تھا اس کو بگاڑ کر اس کی بگڑی ہوئی شکل پیش کی یا جیسے میرے سامنے اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے مجھ سے فرار کی کوشش میں مکروہ ہو گئے ہیں۔ ان کا یہ رخ ان کے لیے بھی مصیبت ہے اور میرے لیے بھی۔ دوسری طرف ان کا یہ رخ ہے کہ چلو مکمل بات نہ پہنچی تو اس کی کہیں سے خوشبو تو اڑتی ہوئی آئی ہے۔

پھر وہ کبھی مجھ سے طلب کبھی لکھوانے آجاتے ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں دیکھو تم خوفزدہ رہتے ہو کہ منیر نیازی سے INFLUENCE ہو گئے ہو۔ میں نے انڈیا میں بھی دیکھا ہے کہ علوی کہہ رہا ہے کہ شہریار منیر نیازی سے INFLUENCED ہے اور شہریار کہہ رہا ہے کہ علوی ہے۔ یہ ایک حد تک انا ہے۔ میں اس سے درگزر کرتا ہوں۔ یار تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ ایک نیا فکر پیدا ہو رہا ہے اور ہم اسے SHARE کر رہے ہیں یہی شاید اس سرزمین کی بھی بات ہے کہ ہم اس کو SHARE کر رہے ہیں۔

سوال :۔ نئے لوگوں اور نئے فکر کا آپ نے ذکر بہت کیا لیکن ایک عجیب بات آپ کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتی ہے کہ آپ انتہائی روایتی لفظیات اور امیجری بھی استعمال کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے مثلاً یہ کہ

قبائے زرد پہن کر وہ بزم میں آیا
گل حنا کو ہتھیلی میں تھام کر بیٹھا

جواب :۔ کئی دفعہ یوں ہوتا ہے کہ میں حدود زمانوں کی عبور کر جاتا ہوں۔ میرے لیے کئی دفعہ پرانے شہر ہمارے زندہ ہوتے ہیں۔ میں جب ان کی طرف نکل جاتا ہوں تو اسی طرح وہ میری پذیرائی کرتے ہیں۔ تو یہ غزل میں نے اس لکھنؤ میں بیٹھ کر لکھی جسے میں نے دیکھا نہیں ہے۔

سوال :۔ یہ تو ایک شکل ہوئی کہ آدمی اپنے خواب کی زمینوں میں گردش کرتا ہے۔ تاریخ اور ما قبل تاریخ سے بھی آگے کائناتوں میں۔ دوسری صورت جو نظر آتی ہے وہ ہے۔

ملتا ہوں روز اس سے اسی شہر میں منیرؔ
پر جانتا ہوں وہ بتِ زیبا بھی خواب ہے

تو یہ موجودہ حقیقت کا خواب بن جانا کیا تجربہ ہے۔

جواب :۔ اس میں میرا خیال ہے کہ خواب وژن کے معنوں میں آیا ہے اور ILLUSION کے معنوں میں بھی لیکن میں اپنی شاعری کا تجزیہ نہیں کرتا۔ ابھی چھ رنگین دروازے کے بارے میں ایک شخص احمد ظفر نے پوچھا کہ چھ کیوں؟ میں نے کہا مجھے پتہ نہیں ہو سکتا ہے اس کی کوئی POETIC LOGIC ہو۔ یا میں قرآن میں پڑھتا ہوں اصحاب کہف کے بارے میں کہ ان کے اتنے عدد تھے۔ یا سات زمینوں اور آسمانوں کا ریفرنس ہو یا چھ دنوں میں بنایا زمین و آسمان کو اور ساتویں دن عرش پر بیٹھا۔ ممکن ہے اس حوالے سے یہ عدد مجھ پر وارد ہوا ہو۔ ممکن ہے یہ شش جہات ہوں لیکن۔۔

سوال :۔ ایک تو خواب ہوا ناکہ آدمی پوری تاریخ کو اور پورے ماضی کو خواب کی طرح دیکھتا ہے، ایک بات یہ ہے کہ موجود کو خواب بنا دے۔

جواب :۔ صوفیہ کے رویے میں دیکھو کہ وہ ایک تلخ موجود کی تلخی کم کرنے کے لیے اس کی اذیت کم کرنے کے لیے اسے ایک خواب سا بنا دیتے ہیں۔ ان کا رویہ خوابناک رویہ بھی ہوتا ہے۔ وہ جو تلخ حقائق ہیں ان سے ایک طرف ہو جانا یا ایک عہد جب اتنا DEFORMED ہو جائے کہ اس میں رہنا عذاب ہو جائے تو پھر اس میں تھوڑا سا ہجرت کا عمل ہے اور یہ ضروری ہے۔ یہی ہے حقیقت کو فسانے کا رنگ دے دینا یہاں آکر مایا جیسے فلسفے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اصل میں ایک غلط موجود سے فرار ہے۔

سوال :۔ اب ہجرت کرنے کی بات آئی ہے تو آپ سے پوچھتا چلوں کہ ہجرت کا یہ مسئلہ آپ کے ہمعصروں کے ہاں طرح طرح سے آیا ہے۔ ایک تو انتظار کے ہاں کہ انتظار نے لکھا ہے کہ میں اور منیر نیازی ایک ہی وقت میں جنت سے نکالے گئے تھے۔ پھر ناصر کاظمی کے ہاں اور اسی کے ضمن و ذیل میں داخل ہے احمد مشتاق۔ آپ کے ہاں ہجرت کا تجربہ ان سے کس سطح پر الگ ہوتا ہے۔

جواب :۔ ایک سطح ہے NOSTALGIA کی، اداسی کی، اس میں ایک بنیادی بات تو یہ ہے کہ ہم چاروں ہی مہاجر ہیں۔ جو جدائیاں تھیں وہ ہم نے SHARE کیں۔ پھر اس سے ایک دوسرا عمل شروع ہوتا ہے کہ جس میں ایک رد عمل کا اظہار ہوتا چلا جاتا ہے۔ پرانے گھروں میں جو ایک BELONGING کا احساس تھا۔ ایک غیر محسوس رفاقت تھی، مزاروں کی معرفت اور ایک لمبی بود و باش کی معرفت اس سے کٹ جانا اور ایک نیا شہر جس میں ان کی امنگوں کی بازگشت ان کو دکھائی دے اس میں داخل ہونا پھر کوئی ایسا بھی نہ ملنا جو انہیں آگے سفر کرا سکے تو ایسی صورتِ حال میں ناسٹیلجیا غالب رہتا ہے۔ یہ اس درمیانی وقفے کی اداسی ہے۔ درمیانی وقفے کا المیہ ہے۔ جو اصل شاعر ہے اس کو

بچھڑنے کا ملال ہوتا ہے بعض تو صرف ملال میں کھو جاتے ہیں۔ یہ اپنی جگہ ایک قدر ہے۔ میں اس کی نفی نہیں کرتا ہوں اس سے دونوں ہی رویے پیدا ہو سکتے ہیں ایک شہر کو بالکل ملیامیٹ کر کے ایک نئے شہر بسانے کا یا پھر یہ بھی کہ دو شہروں کے درمیان ایک خوبصورت وداع کا ایک شہر آہستہ آہستہ دوسرے سے جدا ہوتا ہوا جیسے راگ سے راگ الگ ہوتا ہے۔

اک انعام کے کتنے نام ہیں

اِک پہچان کے کتنے اسم ہیں
اِک انعام کے کتنے نام ہیں
تیرا نام وہ بادل جس کا پیغمبر پہ دشت جبل میں سایہ ہے
تیرا نام وہ برکھا جس کا رم جھم پانی
وادی میں دریا کہلائے اور سمندر بنتا جائے
تیرا نام وہ سورج جس کا سونا سب کی ملکیت ہے
جس کا سِکہ ملکوں ملکوں جاری ہے
تیرا نام وہ حرف جسے امکان کی لوح پہ دیکھ کے میں نے
پیش و پس سے نقطہ نقطہ جوڑ لیا ہے
اسموں والے، حرفوں والے، ناموں والے
مجھ کو بھی اِک نام عطا کر
میری جھولی مدحت کرتی بوندوں، کرنوں، چمکیلے حرفوں سے بھر دے

اے میرے غم

جلتے مہر زحسک مہتاب کے رنگ سمجھتے، تار نظر کی گرہیں کھولتے،
ریشم بنتے عمر کٹی ہے
اے میرے غم! تیرے بدن کی عریانی کا، تری محرومی کا دکھ ہے

صبح دعا میں تیرا قاصد، تیرا موذن سب سے سچا
سب سے زیبا
شام دعا میں خالی لوٹتے ہر رہوار پہ تیری چادر
ہر چادر پر جتنا ہے خونناب تیرا ہے
حلقہ حلقہ کھلتے طوق پہ تیرے عجز کا اسم اعظم
اے میرے غم!
اے میرے غم! شہر ناقدراں کے بے افلاک ستارے!
آخر شب کی تاگا تاگا ٹوٹتی ضو میں
تیری محرومی کا دکھ ہے!

سولی سے عیسیٰ اترے تو...

راہبوں نے کہا "دگو! یہ شخص جس کے ہنر منداہتہ شبِ الزام خالی آسمان کی طناب سے باندھے گئے، اس کے اور زمین کے درمیان کوئی بھید تھا اور اب یہ زلزلے نہ رک سکیں گے اور منقسم آفاق سے تازہ تر ہجرتوں کے چاند پھر طلوع ہوں گے۔ دگر! اس نے بس اتنا ہی تو کہا تھا کہ مناجات کی رات اگر روشن الاؤ کے گرد سگِ آوارہ منڈلانے لگیں تو خشک لکڑی الاؤ پر پھینکنے کی بجائے بے ادب کتے پر پھینکو۔

سولی سے عیسیٰ اترے تو تیز ہوا زور تھے
قاتل ہاتھوں کا زخم بھرے
تخت سے عیسیٰ کب اترے گا
عہد ہمارا عہد ملامت، عہدِ خجالت
ایک اپاہج کی بیساکھی کتنے لنگڑوں کے کام آئے
ہم سب لنگڑے اور اپاہج، سب کے جسموں پر ناسور ہیں اور اُس کے اعجاز کا مرہم کم مقدار
کم مقدار، صبر طلب اور گراں ہے

مریم جس کے بال کُھلے ہیں
کب تک وہ بال اپنے پسر کے حرفِ دعا کا پیش عدالت وِرد کرے گی
سحرِ ملامت کب ٹوٹے گا
تخت سے عیسےٰ کب اترے گا

سولی سے عیسیٰ اترا تو گردن خم تھی
سولی سے عیسےٰ اترا تو اپنی خبر، اپنے الہام سے شرمندہ تھا

تیرا پار اترنا کیسا

بہتے دن کا گدلا پانی
کچھ آنکھوں میں
کچھ کانوں میں اور شکم میں ناآسودہ درد کی کائی
اس دریا میں لمحہ لمحہ ڈوبنے والے !
تیرا جینا مرنا کیسا
تیرا پار اترنا کیسا ؟
کون سفینہ سوچتی عمروں کے ساحل سے
تودہ تودہ گرتی شاموں کے پایاب سے تیری جانب آئے گا
ڈوبنے والے !
تیرا پار اترنا کیسا ؟

روشن بام ہے چاند اترا ہے

روشن بام ہے چاند اترا ہے
خنداں تارے، سُرخ رِدالوں والے لڑکے استقبالی محرابوں کے رستے پر صف بستہ ہیں

دف پہ ضربت، قصر میں نوبت
اور میدان میں جلتی گندھک کی چنگاری جب سمٹی تو گھر کی چوکھٹ کے سہرے کا پھول بنی ہے
ڈھولک پر اس ساعت کی انگشتِ حنائی جو فاتح ہے
ہمسائے میں چاند اترا ہے
اور ادھر اک لڑکی جس کا پہلی خواہش کی خوشبو سے مہکا آنگن
پچھلا بچپن
خالی باہنوں میں سپنوں کے بجتے کنگن
جلتا ہاتھ سرہانے رکھ کر اس امید جاگ رہی ہے
مہندی بانٹنے والی ہم سن یار سہیلی اس کے گھر بھی آئے گی

کیا زرد شجر کو خط بھیجیں

کیا زرد شجر کو خط بھیجیں
کیا اس موسم سے میل کریں
جس کے مہتاب تہِ دریا، جس کے سورج گرداب میں ہیں
جس کے انجم کشتی کشتی ساحل ساحل زنجیر ہوئے
دامانِ صبا، صد کار رفو
چشمِ سوزن میں جمع لہو سے تار نکالیں سِلوائیں
بخیہ بخیہ درہم ٹانکیں پیراہن جن کے رہن ہوئے
کیا ان شاخوں سے بات کریں
کیا میل کریں
کیا خط بھیجیں۔

ایذرا پاونڈ کی موت پر

تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں
تو جدا ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں
انتظارِ بہار بھی کرتے
دامنِ چاک سے اگر اپنے
کوئی پیمان پھول کا ہوتا
آ، تجھے تیرے سبز لفظوں میں
دفن کردیں کہ تیرے فن جیسی
دہر میں کوئی نوبہار نہیں

اسکول

اجلی دھوپ ہے
فرش گیہ پر
اجلی دھوپ میں فرش گیہ پر روشن اور درخشاں لمحوں کی شبنم ہے
سبز درختوں پر خنداں چہروں کی چاندی ہے
سونا ہے
ان لمحوں سے
ان پھولوں سے
سبز درختوں کے پتوں سے
جزدانوں کی جیبیں بھر لو
کل جب سورج زیست کی چھت پر برف کی صورت
جم جائے گا

کل جب راتیں
راکھ کی صورت بجھ جائیں گی
اس موسم کے سوکھے پتے
آتش دان کے کام آئیں گے۔

مقتل کی باز دید

بلا کی پیاس اس کی آنکھ میں ہے
حجاز کی سرزمیں پہ اس سال اس قدر بارشیں ہوئی ہیں کہ خشک تالاب
خون ناحق سے بھر گئے ہیں
لہو کی پیاس اس کی آنکھ میں ہے
نفس کی بارود جس کی قاتل صدا کا شعلہ
قدم قدم تہنیت کے رستے رواں ہوا تو وہ نخل جس کی جڑیں زمینوں کے درد میں تھیں
جھکا کچھ ایسے کہ جیسے حالِ رکوع میں ہو
اداس طائر جو شاخ پر تھے
جو گنبدوں کی پناہ میں تھے
جو جالیوں کے طواف میں تھے
ڈرے ہوئے آسمان ہجرت کی ٹہنیوں سے
نشیب میں اس زمین مقتل کو دیکھتے ہیں
جہاں وہ نخل اس طرح گرا ہے کہ جیسے حالِ سجود میں ہو
اک اور تالاب تازہ بارش سے بھر گیا ہے۔

اک ستارے میں ہے مکاں مرا

اک ستارے میں ہے مکان مرا

اس مکاں میں تمھارے نام کی ضو
رات دشمن مری سہی پھر بھی
مورچہ کوئی میری چھت پہ نہیں
میں نہیں خندقوں میں پوشیدہ

میں بروز وجود زندہ ہوں
کل جو لشکر یہاں تک آئیں گے
پوچھنا ان سے دشمنی کا سبب
آسماں وہ انہیں دکھا دینا
میں جسے معتبر سمجھتا ہوں
جس کے اندر خروج کا تارا
افق دوستی پہ روشن ہے
اس ستارے میں ہے مکاں مرا
اس مکاں میں تمھارے نام کی ضو

امتناع کا مہینہ

اس مہینے میں غارت گری منع تھی پیڑ کٹتے نہ تھے
تیر بکتے نہ تھے
ہر پرواز محفوظ تھے آسماں
بے خطر تھی زمیں مستقر کے لیے
اس مہینے میں غارت گری منع تھی یہ پرانے صحیفوں میں مذکور ہے
قاتلوں، رہزنوں میں یہ دستور تھا اس مہینے کی حرمت کے اعزاز میں
دوش پر گردنیں سلامت رہے
کربلاؤں میں اترے ہوئے کاروانوں کی مشکوں کا پانی امانت رہے

میری تقویم میں بھی مہینہ ہے یہ
اس مہینے کی تشنہ لب ساعتیں بے گناہی کے کتبے اٹھائے ہوئے
روز و شب بین کرتی ہیں دہلیز پر اور زنجیرِ در مجھ سے کھلتی نہیں
فرش ہموار پر پاؤں چلتا نہیں
دل دھڑکتا نہیں
اس مہینے میں گھر سے نکلتا نہیں

میں غیر محفوظ رات سے ڈرتا ہوں

رات کے فرش پر
موت کی آہٹیں ....
پھر کوئی در کھلا
کون اس گھر کے پہرے پر مامور تھا
کس کے بالوں کی لٹ
کس کانوں کے در
کس کے ہاتھوں کا زرِ سُرخ دہلیز پر قاصدوں کو ملا ؟
کوئی پہرے پہ ہو تو گواہی ملے
یہ شکستہ شجر
یہ شکستہ شجر جس کے پاؤں میں خود اپنے سائے کی موہوم زنجیر ہے
یہ شکستہ شجر تو محافظ نہیں
یہ شکستہ شجر تو سپاہی نہیں
شب سے ڈرتا ہوں میں
ایک تصویر بے رنگ ہے سامنے جس سے ڈرتا ہوں میں
ایک صورت کہ جس کے خد و خال کی مری صبحِ نہر سے شناسائی ہے
اس سے ڈرتا ہوں میں

ایک شعلہ کہ اب تک خس جاں میں تھا اس کا سرکش شرر
کاغذوں میں، مکانوں میں، باغوں میں ہے
اس کی مانوس حدت سے ڈرتا ہوں میں
ایک آواز کہسار تفریق پر جو صفت آ رہا ہیں وہ اپنے بھائی نہیں
اس صدا رو بصحرا سے ڈرتا ہوں میں
شب سے ڈرتا ہوں میں

صلاح الدین محمد

لا سے خلا تک

ابوجہل ان پڑھ کہاں تھا
کہ اَن پڑھ تو اپنے نبیؐ تھے
جنہیں لا پہ اصرار تھا
اور یہ بھی
کہ لا سے خلا تک
خلا سے پرے بھی
خدا کا جہاں تھا
کہ معراجِ آدم میں
تکریمِ آدم
خدا لامکاں تھا
ابوجہل — اپنے قبیلے میں
افضل تھا — عالم صفت تھا۔
کہ اجداد نے جن بتوں کو تراشا
ابوجہل نے اُن کو سجدہ کیا
لا کو جانا تماشا

عہدِ عقیدہ

اپنے عہدِ عقیدہ میں

ہر شے —
— اوپر سے اتری ہے ۔
حرفِ ہدایت
حرفِ ملامت
نافذ کو بھی نازل جانو
اپنے آفت کو پہچانو ۔

ناخدا

ناخدا کشتی کے بدلے
شہر میں رہنے لگے ہیں ۔
اسلحے پتوار ان کے
لوگ موجوں کی طرح ہیں
ضرب ان کے اسلحوں کی
لوگ پھر سہنے لگے ہیں
ناخدا کشتی کے بدلے شہر میں رہنے لگے ہیں

دشمن کون ؟

دشمن کون ہے ؟
بھوکے ۔ ننگے لوگ !
خلقِ خدا ہی دشمن ٹھہری !!
اعلیٰ نسل میں زر کا نطفہ
طاقت در باہر کا نطفہ

رامائن

یا رام کتھا میں
جھوٹ بہت
یا راون بھی سنیاسی تھا
کیا جانے
کیسا دشمن تھا
جانے کس جگ کا باسی تھا
بن قتل کیے بدنام ہوا۔

کیا سچ سچ
لہریں گنگا کی
رامائن کے اشلوک میں ہیں
راوی اپنا تو کوئی ہے
قصے
خنجر کی نوک میں ہیں
اور عدل اُسی کا نام ہوا۔

مافی الضمیر

ضمیرِ زر میں پنہاں
عافیت کوشی
کہ صحرائے عرب ہے
ہویدا
حرص کے دہکتے جہنم
ہوس کاری

فریبِ وصلِ رب ہے
شمارِ سبحہ
دینار و درم
غیرت سرِ امواج ڈوبی
شجاعت صرفِ شب خوابی
خرابی
فصاحت لافِ دانش۔ بحرِ خوبی۔
ضمیرِ زر
کہاں اللہ کا گھر

طوطا۔ مینا

راجہ نے پھر
طوطا پالا مینا پالی
شہرِ سخن ہے آرام زادے سے خالی
طوطا بولا
شک کرنے میں رکھا کیا ہے
مینا بولی
سب سے اچھی راج سبھا ہے
لیکن جس دم
بادل گرجے۔ بجلی چمکی
پھیل گئی خوشبو موسم کی
طوطا مینا کے دم پھولے
جادوگر بھی منتر بھولے

وقت کی بے سمت آنکھیں

پرندوں سے
فضا میں
جستجو کی آبرو مندی
ستاروں سے
خلا میں
بھٹکے قافلوں سے
رہگزاروں میں
افق پہ زندگی کے استعارے
پرندوں سے اگر
پرواز چھن جائے
ستاروں سے
خلا کا راز چھن جائے
بھٹکتے قافلوں سے
نقطۂ آغاز چھن جائے
تو پھر سے
وقت کی بے سمت آنکھیں
آئینہ بندی پہ خوش ہوں گی

کہ ان میں
عکس ہوگا
صدا کوئی نہ ہوگی
پرندے ہوں قفس میں
یا چمن میں
نوا کوئی نہ ہوگی

نفاق کے روپ ہوں گے
منافقوں نہ ہوگی —۔

اقلیم سخن

آگہی
بالانشینی کا نشہ
خود پرستی
خودنگر
خودکار سحرِ ذات ہے
عکسِ فردا،
قصرِ دیروز:
اندھی رات ہے
خودنگر بالانشیں
آرائشِ محفل پہ اکثر جان دے
قصرِ دانش قصرِ نمائش کر ہے؛
اقتدارِ وقت کی تشہیر کے عنوان دے

قصرِ دانش میں نشیمن ساز اقلیم سخن
دیکھتے ہی دیکھتے
اقتدارِ وقت کی آواز اقلیم سخن

یوں گلی کوچے میں بے چہرہ تکلم ہر طرف •
حبس سے بیزار دریا کا تلاطم ہر طرف
گفتگو کا جرم سرزد عام لوگوں سے ہوا

فکر و دانش کا بھی سارا کام لوگوں سے ہوا

سالٹ

نمک غارتگرِ زخمِ جگر ہے
کہ آبِ شورِ سیلِ آبِ زر ہے
توازن تابکاری سے عبارت
حرارت برف باری سے عبارت
مداوا قتل گاہِ رہبری میں
ہر اک فرعون اپنی برتری میں
نظر کم ظرف ۔ دل ویران ان کا
حصارِ علم کُش ایمان ان کا
بظاہر سلسلے ان کے الگ ہیں
مگر دیکھیں تو باہم نافِ سنگ ہیں

نوٹ :۔ سالٹ (SALT) عنوان ہے مارکاری کی
روک تھام کے لیے ۔ روس، امریکی معاہدے کا اور
مخفف ہے (STRATEGIC ARMS
LIMITATION TREATY) کا

امجد اسلام امجد

نعت

ابر، خورشید، قمر
روشنی، پھول، صدا
سب تھے موجود مگر
ان کا مفہوم نہ تھا
کوئی بھی چیز کوئی چیز نہ تھی
سرِ مخفی تھا خدا
کوئی تخلیق نہ تھی

حرفِ اقرار نہ تھا
مہرِ توثیق نہ تھی
سنگ اور گوہرِ نایاب میں تفریق نہ تھی
آپ نے سرد عناصر کو حرارت بخشی
آپ نے صلِّ علیٰ
ابر، خورشید، قمر
روشنی، پھول، صدا
سب کو مفہوم دیا
حاجتِ کون و مکاں، مقصدِ نوعِ بشر
مجھ پہ بھی ایک نظر
مجھ کو بھی دیکھیے کبھی

میرے سر ہونے کا پتا
یا نبیؐ صَلِّ عَلیٰ۔ یا نبیؐ صَلِّ عَلیٰ۔

اگر کوئی کہے

اگر کوئی کہے "میں نے ہوا کو مٹھیوں میں بند دیکھا ہے
زمیں ساکن ہے، دنیا اک مثلث کی طرح ہے
روشنی آنکھوں کا دھوکا ہے"
تو مت کہنا وہ جھوٹا ہے
اگر کوئی کہے یہ ابر کا ٹکڑا حقیقت میں تمنا کا ہیولیٰ ہے
یا اِک بھٹکا مسافر ہے
سمندر کی یہ پہنائی، تلاطم کی توانائی
فقط دو بوند پانی کی کہانی ہے، جو ہم تشنہ لبوں کی آنکھ کا
بے صرفہ جوہر ہے،
یہ سورج اصل میں ناکام امیدوں کا ملبا ہے
ستارے ان کہی باتوں کے سائے ہیں، چمکتا چاند
ٹوٹی آرزوؤں کا دھڑکا ہے
یہ پھولوں سے مہکتی شاخ قاتل کا ارادہ ہے
تو مت کہنا وہ جھوٹا ہے۔
اُسے تم کس طرح جھوٹا کہو گے، عین ممکن ہے
وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اُس پہ ہی ایمان رکھتا ہو۔
تمھیں معلوم ہے ایمان وہ واحد حقیقت ہے
کہ جس کے ضمن میں پانچوں حسیں بے کار ہوتی ہیں
تخیل کی اُڑانیں نقطۂ پرکار ہوتی ہیں
اسے دیکھو یہ میرا شہر ہے میرا ٹھکانہ ہے

یہاں وہ لوگ بستے ہیں جنہیں اپنی زمیں سے دوسروں کی باس آتی ہے
یہاں آزاد بندوں کو غلامی راس آتی ہے
یہاں بھوکے کبھی سعرے کبھی گولی سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں
یہاں ڈاکو سرِ بازار آزادانہ پھرتے ہیں، محافظ منہ پہ
ڈاٹے باندھ کر گھر سے نکلتے ہیں
یہاں رشتوں کے بندھن سُوت کے دھاگوں سے کچے ہیں،
کہ لوگوں نے تعلق کے چمکتے دودھ میں گندا لہو گھولا
خود اپنے جسم کے ٹکڑوں پہ بابِ دشمنی کھولا
جو حق کے واسطے بولا اُسے قدموں تلے رولا،
یہ جو چاروں طرف اک سحر کا سا کارخانہ ہے
اسے دیکھو یہ میرا شہر ہے میرا ٹھکانہ ہے
یہ وہ بستی ہے جس میں ظلم کو انصاف کا نعم البدل
اور راہزن کو راہبر تسلیم کرتے ہیں
وہ گلشن ہے جہاں چیخوں کا مطلب خوش نوائی ہے
پرندے سر نیہ صیاد کی تکریم کرتے ہیں
ہنرمندوں کا ثانی ڈھونڈنا ازبسکہ مشکل ہے
مگر اس شہر کی مشکل زمانے سے انوکھی ہے
یہاں تو بے ہنر لوگوں کا بھی ثانی نہیں ملتا

مجھے بھی دیکھنے میں یہ تماشا جھوٹ لگتا ہے
مگر یہ بے یقیں منظر
مرے ماحول اور تاریخ کا سب سے بڑا سچ ہے
یہ وہ سچ ہے کہ جس کا زہر میرے جسم میں دن رات پلتا ہے
ہواؤں کی طرح وحشت بدن میں رقص کرتا ہے

مجھے دیکھو میں ایسے شہر میں زندہ ہوں
جس میں زہر نے تریاق کا عہدہ سنبھالا ہے
میں اُس کو کس طرح جھوٹا کہوں
جس نے ہوا کو مٹھیوں میں بند دیکھا ہے

فرض کرو

فرض کرو ہم تارے ہوتے
اِک دُوجے کو دُور دُور سے دیکھ دیکھ کر جلتے بجھتے
اور پھر اِک دن
شاخِ فلک سے گرتے اور تاریک خلاؤں میں کھو جاتے!

دریا کے دو دھارے ہوتے،
اپنی اپنی موج میں بہتے
اور سمندر تک اس اندھی، وحشی اور منہ زور مسافت
کے جادو میں تنہا رہتے!
فرض کرو ہم بھور سمے کے پنچھی ہوتے،
اُڑتے اُڑتے اِک دوجے کو چھوتے — اور پھر
کُھلے گگن کی گہری اور بے حرف آنکھوں میں کھو جاتے!

ابرِ بہار کے جھونکے ہوتے،
موسم کے اِک بے نقشے خواب میں ملتے
ملتے اور جُدا ہو جاتے
خشک زمینوں کے ہاتھوں پہ سبز لکیریں کندہ کرتے
اور ان دیکھے سپنے بوتے

اپنے اپنے آنسو رو کر چین سے سوتے ،
فرض کرد ہم جو کچھ اب ہیں وہ ناں ہوتے —

رابطے

ہاں ابھی سوچ لے۔
فیصلوں کا سفر
لفظ کی رم بھاؤں میں کتنا نہیں ،
اور بس
فیصلوں کی مداست سے نکلنے وہ کوئی بھی دُکھ نہیں ،
جتنے خدشے مرے ساتھ چلتے رہے ہیں
اس دورا ہے پہ رُک
اور اُنہیں اپنی آنکھوں میں ترتیب دے
جان لے
وقت کے دشتِ بے برگ میں واپسی کے لیے کوئی رستہ نہیں ۔
(منظروں کا نیا پن پرانی رُتوں کے لیے موت ہے)
جو ہوا میرے جھُلے کے آغاز میں
تیرے بالوں کو چھُوتے ہوئے چل رہی تھی اُسی وقت سے
مر چکی ہے کہ اب
اُس کا ہونا نہ ہونا ترے واسطے ایک ہے
(اور تجھ کو پتہ ہے کسی چیز کی
زندگی اُس تعلق سے ہے جو کسی ذات کے رابطے سے بنے)
ہاں یہی وقت ہے
رابطے اور تعلق کے معنی سمجھ ،
جتنے خدشے مرے ساتھ چلتے رہے ہیں

اس دورا ہے پہ رک
اور انہیں اپنی آنکھوں میں ترتیب دے
کہ ابھی تیرے ہاتھوں کا ہر رابطہ
تیرے ہاتھوں میں ہے

ایک سوال

قریہ قریہ پوچھ رہی ہے خلقت ایک سوال!
کب ٹوٹے گا سر سے ہمارے لوہے کا یہ جال
لوہے کا یہ جال کہ جس میں
تیس برس سے قید ہیں اپنے سارے خواب خیال
بجز ماہ د سال
بجز ماہ د سال کہ جن کے
چہرے ہرے کچور ہیں لیکن آنکھیں لالو لال
آنکھیں لالو لال کہ جن میں
ہوے ہوے تیر رہے ہیں پیچھے زرد ملال
قریہ قریہ پوچھ رہی ہے خلقت ایک سوال
کب تک اس مٹی کے بیٹے ہوں گے یوں بے حال
کب تک ہم کو بننا ہوگا — نیلامی کا مال

میرے گھر میں روشن رکھنا یہ معصوم ہنسی

بیٹی کی گڑیا سی جب وہ
چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی
میری جانب آتی ہے، تو

اس کے لبوں پر ایک ستارا کھلتا ہے
'پاپا'
اللہ۔ اس آواز میں کتنی راحت ہے
کتنے ننھے ہاتھ بڑھا کر
جب وہ مجھ کو چھوتی ہے تو یوں لگتا ہے
جیسے میری روح کی ساری سچائی
اس کے لمس میں جاگ اُٹھی ہے
اے مالک، اے ارض و سما کو چٹکی میں بھر لینے والے
تیرے سب معمور خزانے
میری ایک طلب!
میرا سب کچھ مجھ سے لے لے
لیکن جب تک
اس کائنات کے ستارے جلتے بجھتے ہیں
اُسے کر کے زندہ رکھنا یہ معصوم ہنسی،
اے دنیا کے رب!
کیا ممکن ہے اس لمحے میں تیرے میرے بیچ
یہ سچ مجھ سے ہے
تیرے ان معمور خزانوں کی سب امانت گرد ہیں
ایک معصوم ہنسی سے زیادہ پیاری شے
کیا کوئی ہے؟

لفظِ پسِ لفظ

کس قدر لفظ ہیں
جو ہم بولتے ہیں، پڑھتے ہیں

کون سا لفظ ہے کھرے گا جو در معنی کا ،
اس کا پتہ کون کرے !
تم تو خوشبو ہو، ستاروں کی گزرگاہ ہو تم !
تم کہاں آؤ گے اس دشتِ پُراسرار کی پہنائی میں !
کیسے اُترو گے تمناؤں کی گہرائی میں !

رہ گیا میں — !
سو اے جانِ وفا
میں تو جو کچھ ہوں تمہارے ہی خمِ چشم سے ہوں
تم ہی جب لفظِ پسِ لفظ سے آگاہ نہیں
کس طرح سحرِ مفاہیم کا دروازہ کھلے
لفظ کی کوکھ میں تاثیر کہاں سے اُترے

تم مرے ساتھ ہو، ہمراہ نہیں !
کون سے خواب کے جگمگ میں مہاں ہیں ہم تم !
کیسے گردابِ تمنا میں رواں ہیں ہم تم !
لفظ کے پار جو دیکھیں تو کوئی راہ نہیں
اور تم لفظِ پسِ لفظ سے آگاہ نہیں

محبت کی ایک نظم

اگر کبھی میری یاد آئے
تو چاند راتوں کی نرم دل گیر روشنی میں
کسی ستارے کو دیکھ لینا۔
اگر وہ نخلِ فلک سے اُڑ کر تمہارے قدموں میں آگرے تو
یہ جان لینا، وہ استعارہ تھا میرے دل کا ،
اگر نہ آئے .....

مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ تم کسی پر نگاہ ڈالو
تو اُس کی دیوارِ جاں نہ ٹوٹے
وہ اپنی ہستی نہ بھول جائے!
اگر کبھی میری یاد آئے
گریز کرتی ہوا کی لہروں پہ ہاتھ رکھنا
میں خوشبوؤں میں تمھیں ملوں گا
مجھے گلابوں کی پتیوں میں تلاش کرنا
میں اوس قطروں کے آئینوں میں تمھیں ملوں گا۔
اگر ستاروں میں، اوس قطروں میں، خوشبوؤں میں، نہ پاؤ مجھ کو
تو اپنے قدموں میں دیکھ لینا
میں گرد ہوتی مسافتوں میں تمھیں ملوں گا
کہیں پہ روشن چراغ دیکھو تو سوچ لینا
کہ ہر پتنگے کے ساتھ میں بھی بکھر چکا ہوں
تم اپنے ہاتھوں سے ان پتنگوں کی خاک دریا میں ڈال دینا
میں خاک بن کر سمندروں میں سفر کروں گا
کسی نہ دیکھے ہوئے جزیرے پہ رُک کے تم کو صدائیں دوں گا
سمندروں کے سفر پہ نکلو تو اس جزیرے پہ بھی اترنا۔

ایک لڑکی

گلاب چہرے پہ مسکراہٹ
چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے
وہ جب بھی کالجوں کی سیڑھیوں سے
سہیلیوں کو لیے اُترتی
تو ایسے لگتا تھا جیسے دل میں اتر رہی ہو،

کچھ اس تیقن سے بات کرتی تھی جیسے دنیا
اسی کی آنکھوں سے دیکھتی ہو،
وہ اپنے رستے میں دل بچھاتی ہوئی نگاہوں سے ہنس کے کہتی،
" تمہارے جیسے بہت سے لڑکوں سے میں یہ باتیں
بہت سے برسوں سے سُن رہی ہوں!
میں ساحلوں کی ہوا ہوں نیلے سمندروں کے لیے بنی ہوں۔
وہ ساحلوں کی ہوا سی لڑکی
جو راہ چلتی تو ایسے لگتا تھا جیسے دل میں اُتر رہی ہو،
وہ کل ملی تو اسی طرح تھی
چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے، گلاب چہرے پہ مسکراہٹ
کہ جیسے چاندی پگھل رہی ہو،
مگر جو بولی تو اُس کے لہجے میں وہ تھکن تھی
کہ جیسے صدیوں سے دشتِ ظلمت میں چل رہی ہو۔

خالد احمد

پیش لفظ

نہیں کہ عشق کو رسوائیاں نہیں ملتیں — ہر ایک درد کو پرچھائیاں نہیں ملتیں
ہر ایک آنکھ پہ جالے نہیں تنا کرتے — ہر ایک جھیل پہ یہ کائیاں نہیں ملتیں
بس ایک کوچے کو دنیا سمجھ لیا تو نے — ہر ایک کنج میں تنہائیاں نہیں ملتیں
بس ایک لمحے کی صورت وہ سانس آتی ہے — ہر ایک سانس کو گہرائیاں نہیں ملتیں
گزر بھی جاؤ نوا کاریوں کی منزل سے — ہر ایک غم کو شناسائیاں نہیں ملتیں
بس ایک دھن میں پلٹتے چلو ورق پہ ورق
ہر ایک سطر میں دانائیاں نہیں ملتیں

پسِ الفاظ

بس اسا سوچ کر چپ ہیں
پس اظہار کیا ہوگا
کہ جب ہم دار پر ہوں گے
ترا کردار کیا ہوگا
اگر ہم!
حال بھی دے ڈالیں مستقبل بچانے کے لیے
.... تو؟
شمع گل کر دیں اگر سورج جلانے کے لیے

تو؟ ....

اپنی پہنائی کے ہاتھوں گھر سے بے گھر
ہو چکے ہیں
آسماں اب مل بھی جائے سر چھپانے کے لیے

تو؟ ....

زندگی کا زہر کب سے پی رہے ہیں
کون جانے کس طرح ہم جی رہے ہیں
کیا کہیں!
تب لوگ چپ رہتے نہ تھے
اب لوگ کچھ کہتے نہیں
یہ تو سمے کی بات ہے
دن ایک سے رہتے نہیں
کب؟
لوٹ آئیں وہ زمانے، کون جانے
کیا خبر پھر میرؔ بھی آہستہ بولیں
خود ہمارے ہی سرہانے، کون جانے!
اور ــــ کیا معلوم، خدّامِ ادب ہی
کب چلے آئیں جگانے، کون جانے!
پھر تراشیں کیا بہانے، کون جانے!
ہم بس اتنا جان کر خوش ہیں
سر گلزار کیا ہوگا
ہمارے خون سے بڑھ کر
تجھے درکار کیا ہوگا

امثال

یہ کس نے آبِ رواں چادروں میں باندھ لیا
زمیں پہ کس نے زمیں کی حدود ٹھہرا لیں
یہ کس نے مجھ پہ مرا خون تک انڈھیل دیا

وہ سُرخ رُو مرے غارتِ گرِ دل کے ساتھی ہیں
وہ جن کی داڑھیاں چھُری، دانت تیز تلواریں
کہ جن کی زر کی طلب، بے سزا، نہ چھوٹے گی

دل اپنے نقش پہ قادر نہ تھا، ہوا رُسوا
بھٹک گیا لبِ لعلیں کی حیا بوسی سے
کہ آفتیں تو بگولوں کی طرح آتی ہیں

مرے خدا! مرے پروردگار! مرے حفیظ
دروغ گو کی رسالت سبھوں سے دُور رہے
مزدوروں کے مطابق سبھوں کو روزی دے

کسی کا ہاتھ تو مجبور مفلسوں پہ بنے
نہ ایسے سیر کہ دو منکروں میں جا بیٹھیں
نہ کم نصیب کہ روٹی کے چور کہلائیں

حریفِ نورِ سحر، صادقوں کی راہیں تھیں
انہیں خبر تھی، ہوا مٹھیوں کی خاک نہیں
انہیں ملامتِ دانا تھی کان کا زیور

بس ایک تھوڑی سی نیند اور، ایک جھپکی اور
شعورِ عدل کے کسبیوں کی صحبت میں
غلاظتیں ہیں کہ جو دھوئے سے نہیں دھلتیں

لبوں کو کھولوں تو گونگوں کے واسطے کھولوں
وہ جن کی نرم زباں ہڈیوں کی آری ہے
کہ بےکسوں کی وکالت کسی پہ فرض نہیں

زبور

تمام نام ترے نام نے تراشے ہیں
دلوں کی تال، سبک جھانجھنوں کی جھنکاریں
تمام سحر، ترے اسم کے تماشے ہیں

کنارِ آبِ رواں اک درخت کے مانند
کھڑا ہوا ہوں خطاکار صادقوں کی طرح
مثالِ عدسۂ چشمِ حیا سجپ مجھ کو

مرے خدا! تری لاٹھی مری تسلّی ہے
مرے خدا! مرے آہنگ پہ توجہ دے
خیالِ مرگ کے پھاٹک سے اب اٹھا مجھ کو

چیخ اٹھے مرے لبِ خشک ٹھیکروں کی طرح
مرے خدا کوئی ایذا طلب نہ جان مجھے

مرے خدا! مرے ناحق لہو کی پرسش کر

مرے خدا! مری قوت، مری سپر تو ہے
اب ان سنی نہ کر ان بے ریا لبوں کی دعا
کہ چور چور ہوں میں آج، جام گل کی طرح

مرے خدا! مجھے یوں اپنے قہر میں نہ جھڑک
کہ میری روح مری ہڈیوں میں جلنے لگے
صداقتوں کے مطابق مری عدالت کر

ہر ایک پل کسی بے کس کی گھات میں ہیں عدو
بدی کے تیر ستم کی کمیں گاہوں سے
تمام راست دلوں پہ چلائے جاتے ہیں

عدو کا ظلم عدو کھوپڑی پہ نازل کر
کہ تیرے ہاتھ میں ہے تیرے صادقوں کی نجات
وہ جن کے ہاتھ لگی صرف مشتِ خاکِ حیات

مرے خدا! مرے پروردگار! قہر میں اٹھ
تری زمیں پہ فقط پاجیوں کی قدر ہو کیوں
مرے جمیل خدا! حسن کی وکالت کر

مری شراب میں پانی ملا دیا کس نے — یسعیاہ

مرسست ندا !

ترے دیں دار راست باز نہیں
مری صدا
مری آلودگی سے ملول ہے
مری دعا
مری بدکاریوں کی بدبُو ہے
مرے خُدا
ابھی سب حُجتیں تمام نہ کر
ہر ایک رات
نیا چاند سر پہ ہوتا ہے
ہر ایک صبح
نئی عید کا تقاضا ہے
ہر ایک سمت
ذبیحوں کے سوختہ تن ہیں
مرے حبیب
مرے ضبط سے کلام نہ کر
مری نگاہ
مری سرکشی پہ نالاں ہے
مرا عزدر
دلِ بے قرار کی دھج ہے
مرا پا:
شجر کے بار سے کج ہے
مری شراب میں پانی ملا دیا کس نے
بدن پہ
برف کی صورت سفید چادر دے
دلوں پہ

قفل کی صورت کلید سادر کر

لبوں پہ
حرف کی صورت، نوید کا در ہو
مرے خدا نے مرا انتقام کیوں نہ لیا

مرے خدا !
تری تیغیں ہلوں کے پھالے ہیں
مرے خدا
تری باتیں دلوں کے ہالے ہیں
مرے خدا !
ابھی کچھ حجتیں تمام نہ کر
تجھے قسم ہے مرے ؛ مزی گناہوں کی

سن اے زمیں !
سن اے آسماں ! سن اے دنیا
مرے خدا کو
مرے خون کی ضرورت تھی ؟
مرے خدا کو
غرض ہدیہ ہائے باطل سے ؟
شراب ناب میں پانی ملا دیا کس نے

آزادی

سبھی دُکھ ! تن پہ وارد ہو چکے ہیں، پیاس تک اپنی حقیقت کھو چکی ہے، بھوک عادت ہو چکی ہے، موت کی خواہش اکارت ہو چکی ہے، ایک نابینا مدوّر پتھر دل میں ٹوٹتی لے کی طرح یوں ڈگمگاتا جا رہا ہے، جس طرح، اِک نغمہ گر کچھ ٹوٹتی سانسوں کے بل پہ آخری بار اِک نیا جادو جگانے جا رہا ہو، زیست کا نغمہ سنانے جا رہا ہو، لوگ

کہتے ہیں کہ چکی کے مدوّر پاٹ بھی اس کی توانائی کی باہوں میں پگھل کر زم زم تو سیں ہو چکے ہیں ایک عورت کی طرح سب کھو چکے ہیں، اور اب گندم کے دانوں کی طرح اس کے توانا بازوؤں میں دو کنوارے پیکروں کی طرح ریزہ ریزہ ہو جانے کے خواہاں ہیں۔

وہ آئی ہے کہ دیکھے لوگ اب اس کے اسیرِ حسن کو کس رُخ سے اس کے پھول جیسے نام کی ضربیں لگاتے ہیں، وہ آئی ہے کہ دیکھے ایسے لمحوں میں وہ اس کی بے وفائی یاد رکھتا ہے کہ اس کی دلربائی یاد کرتا ہے، وہ آئی ہے کہ وہ اس پر کسی صورت بس اتنی بات جتلا دے کہ پتھر کی سلوں میں اور عورت میں کسی صورت اگر سوکن کا رشتہ بن بھی جائے تو کوئی پتھر کسی عورت کی آنکھوں سے زیادہ منتقم نفرت اگل سکنے سے قاصر ہے۔

مگر یہ منتقم آنکھیں وہ کیونکر دیکھ پائے گا کہ پورے دو برس گزرے نگاہوں کی جگہ کانوں نے لے لی تھی، مگر یہ منتقم آنکھیں فقط شاہِ فلسطیں دیکھ سکتے تھے کہ ان کو جُرم کی شدت کا کچھ اندازہ تھا، لیکن شہِ والا سرِ عشرت کدہ اِک تن کی آنکھیں ہی کھُلی رکھتے ہیں، اُن کے نرم بستر میں بدن باتیں کرے تو کان دھرتے ہیں کہ وہ عشرت کدے میں استادوں اور بیوی کا تفاوت بھول جاتے ہیں۔

وہ آئی تھی کہ دیکھے لوگ باگ اس کے اسیرِ حُسن کو، اس کے گرفتارِ محبت کو کہیں تاجِ فلسطیں کے اسیروں میں نہ گنتے ہوں، مگر بے نور آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ آج سب دُکھ دل پہ وارد ہو چکے ہیں، آخری تعزیر باقی ہے، اُسے شاہِ فلسطیں نے بلایا ہے، بھرے دربار میں بوڑھے گدھے کی کھوپڑی سے اٹھنے والے احمقانہ اور بھونڈے سے تمسخر کا نشانہ بنتا دیکھیں گے، سرِ دربار سب درباریوں کے ساتھ ہنس ہنس کر سرِ دربار خود اپنے ہی معیارِ تمسخر کا تمسخر خود اڑائیں گے

مگر وہ منتقم آنکھیں گدھے کی کھوپڑی پر تاج پہنے شاہِ والا دیکھ پائیں گے تو کچھ کہہ بھی نہ پائیں گے، سرِ دربار بیوی اور ادنیٰ داشتہ کے فرق کو ملحوظ رکھنے میں ہزاروں قہقہوں کے درمیاں سنگین دیواروں کے ملبے میں وہ آنکھیں مسکرائیں گی جنہوں نے زلزلہ آگیں توانائی کو پتھر کے ستونوں کی خبر دے کر کہا تھا:۔

"تم مرے قیدی ہو، میں آزاد کرتی ہوں"

اندوہ

وہ لڑکی صرف باتونی نہیں تھی، کچھ زیادہ تھی کہ اس کی نرم قوسیں نرم ہونٹوں
سے زیادہ گرم گفتاری کی عادی تھیں
مری آنکھیں گلابی جلد کی تہہ میں لہو کی تند آہٹ سن رہی تھیں، کان چمکیلے بدن میں سرسراتی
تیز، لرزہ خیز لہروں پر لگے تھے لب دہکتے تن کی لرزش پر جھکے تھے۔
لوگ کہتے ہیں: "تمھارے پاؤں سے بلی بندھی ہے، تم کہیں ٹک ہی نہیں سکتے!"
مجھے تکتے نہ تھکتی آنکھ روشندان میں سے جھانکتے سورج پہ تھی، بجھتے دیے کی ڈگمگاتی لو سے
کچھ بڑھ کر لرزتی پنڈلیاں بارِ تنِ عریاں اُٹھا سکنے سے عاجز تھیں، مگر، لرزاں لبوں پر روح کے
پاتال میں اِک زلزلے کی رَو پہ تنکے کی طرح بہہ جانے والے شہر کا نوحہ نہ تھا، بس آنے والے
مرحلوں کے گیت تھے، کچھ کوٹھیوں کے خواب تھے، کچھ زیوروں کے نام تھے۔
بے شک! مری جیب اور اس کے پرس میں ہوٹل کا بل پورا نہ تھا۔ لیکن، بس اِک اصرار تھا!
"— کل پھر ملیں گے!"

"ہاں۔"

"بہر صورت"
مرے بڑھتے ہوئے ہونٹوں پہ انگلی پھیر کر، منہ موڑ کر بس یہ کہا تھا "سچ بتانا! کیا تمھیں بھی!
اپنے استقبالیہ بوسے میں وہ اندوہ ملتا ہے جسے یہ موج میں گم الوداعی مخملیں بوسے کبھی چھو
تک نہیں سکتے!!!" مری آنکھیں گلابی جلد کی تہہ میں لہو کی نرم آہٹ سن رہی تھیں! کان چمکیلے
بدن میں گنگناتی نرم لہریں گن رہے تھے! لب چمکتے تن کی خواہش پر جھکے تھے کون کہتا ہے
مرے پیروں میں اک بلی بندھی ہے. میں کہیں ٹک ہی نہیں سکتا!

پروین شاکر

'وحی'

عجیب موسم تھا وہ بھی جب کہ
عبادتیں کور چشم تھیں
اور عقیدتیں اپنی ساری بینائی کھو چکی تھیں
خود اپنے ہاتھوں سے تراشے پتھر کو دیوتا کہہ کے
خیر و برکت کی نعمتیں لوگ مانگتے تھے!
مگر وہ اِک شخص
جو ابھی اپنے آپ پر بھی نہ منکشف تھا
عجیب اُلجھن میں مبتلا تھا
یہ وہ نہیں ہیں، وہ کون ہوگا کا کربِ بے نام جھیلتا رہا تھا!
سو اپنے ان نارسا دُکھوں کی صلیب اٹھائے
تموں کی نایافت شہریت کو تلاش کرتے
وہ شہرِ آزر سے دور
اپنے تمام لمحے
حرا کے غاروں کے خواب آسا سکوت کو سونپنے لگا تھا
یہ سوچ کا اعتکاف بھی تھا
اور ایک ان دیکھی روحِ کل کے وجود کا اعتراف بھی تھا!
وہ رات بھی ارتکاز کی ایک رات تھی
جب کہ لمحہ بھر کو

فضا پہ سناٹا چھا گیا
اور ہواؤں کی سانس رُک گئی تھی
ستارۂ شب کے دل کی دھڑکن ٹھہر گئی تھی
گریز پا ساعتیں تحیّر زدہ تھیں
جیسے وجود کی نبض تھم گئی ہو!
یکایک اک روشنی جمال و جلال کے سارے رنگ لے کر فضا میں گونجی
"پڑھو"!
"میں پڑھ نہیں سکوں گا"!"
"پڑھو"!
"مگر میں کیا پڑھوں؟"
"پڑھو — تم اپنے (عظیم) پروردگار کا نام لے کے
جو سب کو خلق کرتا ہے
جس نے انسان کو بنایا ہے منجمد خون سے
پڑھو (کہ) تمھارا پروردگار بے حد کریم ہے
(اور) جس نے تم کو قلم سے تعلیم دی
اُسی نے بتائیں انسان کو وہ باتیں
کہ جن کو وہ جانتا نہیں تھا........"
فضائے بے نطق جیسے اقرا کا ورد کرنے لگی تھی
وہ سارے لفظ جو
تیرگی کے سیلاب میں کہیں بہہ چکے تھے
پھر روشنی کی لہروں میں
واپسی کے سفر کا آغاز کر رہے تھے
دریچۂ بے خیال میں
آگہی کے سورج اتر رہے تھے
اُس ایک پل میں

وہ میرا اُمّی
مدینۃ العلم بن چکا تھا!

تقیہ

سو اب یہ شرطِ حیات ٹھہری
کہ شہر کے سب نجیب افراد
اپنے اپنے لہو کی حرمت سے منحرف ہو کے جینا سیکھیں
وہ سب عقیدے کہ ان گھرانوں میں
ان کی آنکھوں کی رنگتوں کی طرح تسلسل سے چل رہے تھے
سُنا ہے باطل قرار پائے
وہ سب وفاداریاں کہ جن پر لہو کے وعدے حلف ہوئے تھے
وہ آج سے مصلحت کی گھڑیاں شمار ہوں گی
بدن کی وابستگی کا کیا ذکر
رُوح کے عہد نامے تک فسخ مانے جائیں!
خموشی و مصلحت پسندی میں خیریت ہے
مگر مرے شہر منحرف میں
ابھی کچھ ایسے غیور صادق بقیدِ جاں ہیں
کہ حرفِ انکار جن کی قیمت نہیں بنا ہے
سو حاکمِ شہر جب بھی اپنے غلام زادے
انہیں گرفتار کرنے بھیجے
تو ساتھ میں ایک ایک کا شجرۂ نسب بھی روانہ کرنا
اور ان کے ہمراہ سرد پتھر میں چننے دینا
کہ آج سے جب
ہزار ہا سال بعد ہم بھی

کسی زمانے کے ٹیکسلا یا ہڑپہ بن کر تلاشے جائیں
تو اُس زمانے کے لوگ
ہم کو
کہیں بہت کم نسب نہ جانیں!

...... تو برمن بلا شدی"

کچے ذہن اور کچی عمر کی لڑکیاں
اپنی خوبی میں
مائع جیسی ہوتی ہیں
جس برتن میں ڈالی جائیں
اُسی شکل میں
کیسے مزے سے ڈھل جاتی ہیں
کیا چھلکنا، کیا اُبلنا اور کہاں کا اُڑنا!
اور اِک میں ہوں ـــــ پتھر اور شوریدہ مزاج
کاسۂ خالی میں بے وجہ سما جانے کی بجائے
اُس سے اِس قوت سے ٹکرانا چاہوں کہ،
ظرف تہی کی گونج سے اس کا بھرم کھل جائے!
میں نے آئینے کو کب جھٹلایا ہے
ہاں ـــ گہنے مجھ پر بھی اچھے لگتے ہیں
لیکن جب بھی مجھ کو ان کا مول کبھی یاد آتا ہے
کنگن بچھو بن جاتے ہیں
اور پازیبیں ناگ کی صورت،
میرے پاؤں جکڑ لیتی ہیں
بہت ہی میٹھے بولوں کا جز و اعظم،

جب حالتِ خام میں مجھ کو نظر آجاتا ہے
دہشت سے مری آنکھیں پھسلنے لگتی ہیں
اور اس خوف سے میری ریڑھ کی ہڈی جمنے لگتی ہے کہ
ان ہی مادر زاد منافق لوگوں میں
مجھکو ساری عُمر بسر کرنی ہے!
کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے
میں نے اپنا ہاتھ اچانک کسی اور کے ہاتھ میں پایا
لیکن جلد ہی میری مزدورت سے زائد بے رحم بصارت نے یہ دیکھ لیا ہے
یا تو میرے ساتھی کی پرچھائیں نہیں بنتی ہے
یا پھر مٹی پر
اُس کے پنجے اس کی ایڑی سے پہلے بن جاتے ہیں
انسانوں کی سایہ رکھنے والی نسل ناپید ہو ئی جاتی ہے
شام کے ڈھل جانے کے بعد
جب سایہ اور سایہ کناں دونوں بے معنی ہو جاتے ہیں
میں مکروہ ارادوں والی آنکھوں میں گھِر جاتی ہوں
اور اپنی چادر پہ تازہ دھبّے بنتے دیکھتی ہوں
کیونکہ مجھ کو ایک ہزار راتوں تک چلنے والی کہانی کہنا
نہیں آتی،
میں ـــ آقائے ولی نعمت کو
خود اپنی مرضی بھی بتانا چاہتی ہوں!

ظلِّ الٰہی کے پرابلمز

راج پاٹ کرنے والوں کی جان
ہتھیلی پر رہتی ہے

بے چاروں کے مسائل کیسے عجیب ہوتے ہیں
کبھی اس باجگزار ریاست کی شوریدہ سری
کبھی اُس زیرِ نگیں صوبے کی نافرمانی
کبھی خود دار الحکومت کے اندر غیر مناسب بیداری
کبھی سپہ سالارِ اعظم کا شوقِ لشکر آرائی
کبھی امیرِ مطبخ کی خاصے میں خاصی غیر ضروری دلچسپی
شہزادوں کی شورہ پشتی
حرم سرا میں پلنے والی چھوٹی بڑی سیاست
بالاعلان بغاوت، درپردہ سازش!
دشمن جلد ہی کھُل جاتے ہیں
ان سے نمٹنا اتنا مشکل کام نہیں
اُلجھارا تو پاؤں چومنے والوں سے پڑتا ہے
اور ان کی بھی دو قسمیں ہیں!
ایک تو کتے ــــ
اپنی دفاداری میں شہرۂ عالم رکھنے والے
جب تک جی چاہے پیروں میں لوٹتے ہیں
پھر اپنی اپنی ہڈی لے کر الگ ہو جاتے ہیں
دوسری قسم زیادہ مہلک ہے
یہ دو پیروں پر چلتی ہے
دیکھنے میں انسان مگر باطن کے ریچھ
تلوے چاٹتے چاٹتے اپنے پیارے آقا کو ایسا کر دیتے ہیں کہ
ایک سہانی صبح کو جب
اپنی کنیزِ خاص کی بھیرویں سُن کر آنکھیں کھولتے ہیں تو
ظلِ الٰہی
اپنے پاؤں ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں!

پا بہ گل سب ہیں، رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون

میرا سر حاضر ہے لیکن میرا منصف دیکھ لے
کر رہا ہے میری فردِ جرم کو تحریر کون

آج دروازوں پہ دستک جانی پہچانی سی ہے
آج میرے نام لاتا ہے مری تعزیر کون

کوئی مقتل کو گیا تھا مدتوں پہلے مگر
ہے درِ خیمہ پہ اب تک صورتِ تصویر کون

میری چادر تو چھنی تھی شام کی تنہائی میں
بے ردائی کو مری پھر دے گیا تشہیر کون

نیند جب خوابوں سے پیاری ہو تو ایسے عہد میں
خواب دیکھے کون اور خوابوں کو دے تعبیر کون

ریت ابھی پچھلے مکانوں کی نہ واپس آئی تھی
پھر لبِ ساحل گھروندہ کر گیا تعمیر کون

سارے رشتے ہجرتوں میں ساتھ دیتے ہیں تو پھر
شہر سے جاتے ہوئے ہوتا ہے دامن گیر کون

دشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں
دیکھنا ہے کھینچتا ہے مجھ پہ پہلا تیر کون!

بدن تک موجِ خواب آنے کو ہے پھر
یہ بستی زیرِ آب آنے کو ہے پھر

ہری ہونے لگی ہے شاخِ گریہ
سرِ مژگاں گلاب آنے کو ہے پھر

اچانک ریت سونا بن گئی ہے — کہیں آگے سراب آنے کو ہے پھر
زمیں انکار کے نشے میں گُم ہے — فلک سے اِک عذاب آنے کو ہے پھر
بشارت دے کوئی تو آسماں سے — کہ اِک تازہ کتاب آنے کو ہے پھر
کوئی دن اور شب کی حکمرانی — اُفق پر آفتاب آنے کو ہے پھر
دریچے میں نے بھی وا کر لیے ہیں — کہیں وہ ماہتاب آنے کو ہے پھر
جہاں حرفِ تعلق ہو اضافی — محبت میں وہ باب آنے کو ہے پھر
گھروں پر جبر یہ ہوگی سفیدی
کوئی عزت مآب آنے کو ہے پھر

سبھی گناہ دُھل گئے، جزا ہی اور ہوگئی — مرے وجود پر تری گواہی اور ہوگئی
رفوگرانِ شہر بھی کمال لوگ تھے مگر — ستارہ ساز ہاتھ میں قبا ہی اور ہوگئی
بہت سے لوگ شام تک کواڑ کھول کر رہے — گدائے شہر کی مگر صدا ہی اور ہوگئی
بہت سنبھل کے چلنے والی تھی پر اب کے بار تو — وہ گُل کھِلے کہ شوخیٔ صبا ہی اور ہوگئی
یہ میرے ہاتھ کی لکیریں کھُل رہی تھیں یا کہ پھر — شگن کی رات سُرخیٔ حنا ہی اور ہوگئی
اندھیرے میں تجھے جب تلک زمانہ سازگار تھا — چراغ کیا جلا دیا ہوا ہی اور ہوگئی
نجانے دشمنوں کی کون بات یاد آگئی
لبوں تک آتے آتے بد دعا ہی اور ہوگئی

شب وہی لیکن ستارہ اور ہے — اب سفر کا استعارہ اور ہے
ایک مُٹھی ریت میں کیسے رُکے — اس سمندر کا کنارہ اور ہے
موج کے مُڑنے میں کتنی دیر ہے — ناؤ ڈالی اور دھارا اور ہے

جنگ کا ہتھیار طے کچھ اور ہے
تیر سینے میں اُتارا اور ہے

متن میں تو جرم ثابت ہے مگر
حاشیہ سارے کا سارا اور ہے

دھوپ میں دیوار ہی کام آئے گی
تیز بارش کا سہارا اور ہے

دیر سے پلکیں نہیں جھپکیں مری
پیشِ جاں اب کے نظارا اور ہے

ساتھ تو میرا زمیں دیتی مگر
آسماں کا ہی اشارہ اور ہے

ہارنے میں اک انا کی بات تھی
جیت جانے میں خسارہ اور ہے

سکھ کے موسم انگلیوں پر گن لیے
فصلِ غم کا گوشوارہ اور ہے

اور کچھ پل اس کا رستہ دیکھ لوں
آسماں پر ایک تارہ اور ہے

حد چراغوں کی یہاں سے ختم ہے
آج سے رستہ ہمارا اور ہے

زمیں سے رہ گیا ہے دور آسمان کتنا
ستارہ اپنے سفر میں ہے خوش گمان کتنا

پرند پیکاں بدوش پرواز کر رہا ہے
رہا ہے اُس کو خیالِ صیادگان کتنا

ہوا کا رُخ دیکھ کر سمندر سے پوچھنا ہے
اٹھائیں ہم کشتیوں پہ اب بادبان کتنا

بہار میں خوشبوؤں کا نام و نسب تھا جن سے
وہی شجر آج ہو گیا بے نشان کتنا

گرے اگر آئینہ تو اک خاص زاویے سے
وگرنہ ہر عکس کو رہے خود پہ مان کتنا

بنا کسی آس کے اُسی طرح جی رہا ہے
بچھڑنے والوں میں تھا کوئی سخت جان کتنا

وہ لوگ کیا چل سکیں گے جو انگلیوں پہ سوچیں
سفر میں ہے دھوپ کس قدر، سائبان کتنا!

اختر امان

میرے خدایا!

کلیدِ اسمِ ازل سے یارب
نئے زمانوں میں
سب سوالوں کے بند دروازے کھول
مجھ پہ
مرے خدایا
وہ لوگ کیا تھے ؟
جو وقت کے گہرے پانیوں میں اُتر گئے ہیں
جو مجھ کو اپنی رہیں کی خوشبو کے خواب
دے کر
گذر گئے ہیں
مرے خدایا
سفر ہے کیسا
کہ راستوں میں یہ گرد کیسی اٹک گئی ہے
میں حال کے گدلے پانیوں میں اتر رہا ہوں
کہیں بھی
آبِ رواں کے شیشے میں
اپنی صورت نظر نہ آئے
کوئی بتائے

یہ اپنے ہونے کی خواہشوں کا ہے کرب
کیسا
یہ ذہن و دل میں ہے کشمکش کیا
یہ میرے چہرے پہ
سارے رستوں کی دھول کیسی
کہاں کہاں سے گذر رہا ہوں
میں جی رہا کہ مر رہا ہوں
کہ خود کو دریافت کر رہا ہوں ؟
مری صدائیں
ہوا کے گنبد میں
کس لیے پھڑپھڑا رہی ہیں
مری بصیرت کے آئینوں پہ
یہ دُھند کیسی
مرے خدایا
میں آنے والی تمام نسلوں کا
ایک نخلِ مراد ہوں یا
میں اپنے ماضی کے ایک بجھتے ہوئے دیا کا
فضا میں اڑتا ہوا دھواں ہوں

میں ایک مدت سے نوحہ خواں ہوں
مرے خدایا
تو لامکاں ہے
میں بے اماں ہوں
مرے خدایا
وہ دن ہوں کیسے ؟
جو وقت کی کوکھ سے ابھی تک
نہیں ہیں اُبھرے
وہ کیسی گھڑیاں ہوں
وہ ساعتیں جانے کیسی ہوں گی
وہ ساعتیں جو ابھی مہ و سال کے پنگوڑے میں
سو رہی ہیں
مجھے بتا دے
عروج کیا ہے
زوال کیا ہے
جو میرے آبا کے ذہن میں تھا
سوال کیا ہے
جو اُن کی آنکھوں نے
زندگی کی سیاہ راتوں میں خواب دیکھے
نئی زمیں کے
وہ خواب کیا ہیں
جو اُن کے فکر و خیال میں تھے
گلاب کیا ہیں
دل و نظر کے کھلے دریچوں میں
جو تھے ابھرے
وہ سورج کے آفتاب کیا ہیں
سوال کیا تھے ؟
جواب کیا ہیں ....!

کرب و بلا سے گذریں

اپنی سوچ کے بند دریچوں کو کھولیں
خوابوں کے بے نام جزیروں سے نکلیں
ائرکنڈیشنڈ کمروں کی باہنوں کا حلقہ توڑ کے
جلتی دوپہروں میں
تپتی ریت پہ پاؤں دھریں
تھرمس اپنے ہاتھ سے توڑیں
پیاس کے کانٹے
اپنے حلق
اپنے ہونٹوں پر اُگتے دیکھیں
پانی کی اک بوند کو ترسیں
کبھی کسی ہوٹل کی ٹیبل سے اٹھ کر
بے کار مباحث
بکھری سوچوں سے ہٹ کر
میدان میں اتریں
اپنے بچے اپنی آنکھ سے مرتے دیکھیں
موت کے گھاٹ اترتے دیکھیں
اپنے ہاتھوں کو
اپنے اوورکوٹ کی جیب سے باہر رکھ کر
ظلم کی ساری تفسیریں

اپنے نمک شلیقوں میں سجا کر
اپنے ہاتھ میں اپنی سوچ کا پرچم تھامے
موت کی وادی کی جانب ہم کوچ کریں
دشمن کے زہریلے خنجر
اپنے بدن کے پار اترتے دیکھیں
ہم بھی اِک دن بابِ وفا کو کھولیں
ہم بھی اِک دن شہرِ بقا سے گذریں
ہم بھی اِک دن کرب و بلا سے گذریں

مجھے بتاؤ

مجھے بتاؤ کہ مجھ کو آخر
یہ کس گنہ کی سزا ملی ہے
کہ میں تو اِس سرزمیں کا بیٹا ہوں
میری سانسوں میں
اس کی خوشبو رچی بسی ہے
ہوا مری ہے
زمیں کے سینے پہ اُگنے والی تمام فصلیں
مرے لہو اور مرے پسینے کا
سب ثمر ہیں
پہاڑ
دریا
مرے وطن کی فضا میں اڑتے ہوئے
پرندے
یہ سب مرے ہیں
کہ ابتدا بھی یہیں مری ہے
اور انتہا بھی یہیں مری ہے
کہ اس زمیں پر ہیں جس قدر بھی
وہ میرے گھر ہیں
مرے لیے تو ہے جو بھی کچھ
وہ مری زمیں ہے
مجھے بتاؤ کہ مجھ کو آخر
یہ کس گنہ کی سزا ملی ہے
میں موسمِ گل میں کیوں برہنہ ہر ایک
شاخِ گلاب دیکھوں
مری یہ آنکھیں کھلی بھی ہوں تو
میں کیوں بھیانک سے خواب دیکھوں
زمیں یہ سب کچھ مرا ہو پھر بھی
میں ابتدا سے عذاب دیکھوں

دشمنوں کے نام

میں جانتا ہوں
کہ میری دشمن ہوائیں
زہریلی ناگنوں کی طرح سے
پھنکارتی پھر رہی ہیں
میں جانتا ہوں
کہ میرے دشمن
نہ جانے کب سے
اٹھائے ہاتھوں میں بھاری پتھر

کھڑے ہوتے ہیں
وہ منتظر ہیں
کہ میرے پاؤں جو لڑکھڑائیں
تو پل پڑیں وہ
سجا کے ماتھوں پہ خون میرا
وہ فتح و نصرت کا دن منائیں
میں جانتا ہوں
کہ میرے دشمن
کمین گاہوں سے سب نکل کر
حصار باندھے کھڑے ہوئے ہیں
مگر

میں مثلِ شجر ہوں
جس کی جڑیں زمیں میں اتر چکی ہیں
ہوائیں گر
میرے سوکھے، بے جان زرد پتے
اُڑا بھی لے جائیں
تو بھی کیا ہے
بدلتے موسم کی زد میں رہ کر بھی
میں ہمیشہ ہرا رہا ہوں
مری جڑیں تو زمیں میں ہیں
جہاں پہ پہلے کھڑا ہوا تھا
وہیں پہ اب بھی کھڑا ہوا ہوں

نئی نسل کی دعا

میرے خوابوں کی تعبیر سے بھی حسیں
میرے آباؤ اجداد کی سرزمیں
مجھ کو ایسے لگا
جیسے میں تیرا بیٹا نہیں
وہ عمارات جو تیری عظمت کی اِک زندہ
تصویر تھیں
اب کھنڈر بن چکیں
ہر طرف خامشی اور مکڑی کے جالے
ہر اک شے پہ برسوں سے کائی کی تہ جم چکی ہے
عجب ایک پُر ہول سایہ سماں ہے
کہیں پر نہ اب ہیں نشاں پاؤں کے

جہاں سے کئی قافلے منزلیں مارتے
سنتے دور کے جو پیامی بنے تھے
مگر اب وہ رستے
زمانے کی اڑتی ہوئی گردمیں دب چکے ہیں
نہ اب یہ فضا
اُن کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہی گونجتی ہے
صدائیں
خلاؤں کے اندھے کنوئیں میں
کہیں گم ہوئی ہیں
کہ جیسے مرا اب کسی شے سے بھی کوئی رشتہ نہیں ہے
میں اُن کے لیے اجنبی ہوں
وہ میرے لیے اجنبی ہیں
میں فقط حال کے ایک بجرے میں بیٹھا
سمندر کی لہروں
ہواؤں کی سمتوں کے رحم و کرم پر
فضاؤں میں گویا معلق ہوا ہوں
کہیں دور تک پاؤں دھرنے کی خاطر زمیں ہی نہیں ہے
عجب زندگی ہے
اگرچہ ہوں زندہ
مگر زندہ رہنے کی خواہش نہیں ہے
اے زمیں
اے زمیں
مجھ پہ اپنے درخشندہ ماضی کے دروازے وا کر
مری خالی آنکھیں نئے خواب سے بھر
مجھے لذتِ حال سے آشنا کر

○

ہمارے شہر سلامت ہمارے گھر بھی رہیں
کھلی فضائیں رہیں گر شکستہ پر بھی رہیں

لبوں پہ حرفِ دعا اور چشمِ تر بھی رہیں
دلوں میں بیٹھے ہوئے راستوں کے ڈر بھی رہیں

مری نگاہ سے بنیاد کیسے اوجھل ہو
اُڑوں ہواؤں میں پاؤں زمیں پر بھی رہیں

کسے خبر وہ پلٹ آئے موسموں کی طرح
کھلے ہوئے مرے گھر کے تمام در بھی رہیں

یہ کیسا زہر فضاؤں میں گھُل گیا ہے اماں
ہم اپنے گھر میں رہیں اور دل میں ڈر بھی رہیں

دل کے کاغذ پہ کوئی نام نہ لکھا جائے
اب یہ سوچا ہے کسی کو بھی نہ چاہا جائے

کس قدر جلد بدل جاتے ہیں منظر سارے
جس کو چاہوں وہ جی بھر کے نہ دیکھا جائے

دِل مرا پاؤں کی زنجیر بنا ہے ورنہ
اُس کے گھر کو تو ہر اک شہر کا رستہ جائے

پھر کہاں ملتے ہیں دنیا میں بچھڑنے والے
جانے والے کو کسی طور تو روکا جائے

کتنی صدیوں سے رواں ہیں کہیں رُکتے ہی نہیں
اتنی خواہش ہے کہ پل بھر کہیں ٹھہرا جائے

اب کسی اور کو سینے سے لگا کر اخترؔ
خود کو یوں اِک نئے انداز سے چاہا جائے

یہاں موسم بھی بدلیں تو نظارے ایک جیسے ہیں
ہمارے روز و شب سارے کے سارے ایک جیسے ہیں

ہمیں ہر آنے والا زخم تازہ دے کے جاتا ہے
ہمارے چاند، سورج اور ستارے ایک جیسے ہیں

کہیں گر فرق نکلے گا تو بس شدت کا کچھ ورنہ
یہاں پر غم ہمارے اور تمھارے ایک جیسے ہیں

خدایا تیرے دم سے اپنا گھر اب تک سلامت ہے
دگرنہ دوست اور دشمن ہمارے ایک جیسے ہیں

ہمارا کس لیے احساسِ محرومی نہیں جاتا
کہ سب قسمت کے ماروں کے ستارے ایک جیسے ہیں

میں کس امید پر دامن کسی کا تھام لوں اختر
کہ سب سے دوستی میں اب خسارے ایک جیسے ہیں

چاند کی صورت میں شب کے ساتھ کیوں چلتا رہوں
تیرگی سے کیوں نہ سورج کی طرح لڑتا رہوں

چاند کو دیکھا تو وہ اس کی طرح پتھر کا تھا
دور سے اچھا لگے جو پاس اُس کے کیا رہوں

نقش جو بھی ہیں بنائے سب مٹا دے گی ہوا
ریت کی دیوار پر دل کا کہا، لکھتا رہوں

دور رہ کر بھی حرارت دے اُسے میرا وجود
یوں زمیں سے دور سورج کی طرح جلتا رہوں

آنے والے کل سے دل کو کیوں نہ میں روشن کروں
گذرے دن کی راکھ یوں ہاتھوں میں کیوں ملتا رہوں

مری ہر موسم میں ہی تعمیر نو ہوتی رہے
میں سدا اک جستجو میں ٹوٹتا بنتا رہوں

اتنا ہو کہ آنکھ میں پہچان کچھ باقی رہے
دل نہ چاہے پھر بھی اختر اُس سے میں ملتا رہوں

افتخار عارف

نعت

مرا شرف کہ تو مجھے جوازِ افتخار دے
فقیرِ شہرِ علم ہوں زکوٰۃِ اعتبار دے

میں جیسے تیسے ٹوٹے پھوٹے لفظ گھڑ کے آ گیا
کہ اب یہ تیرا کام ہے بگاڑ دے سنوار دے

مرے امین آنسوؤں کی نذر ہے قبول کر
مرے کریم اور کیا ترا گناہگار دے

ترے کرم کی بارشوں سے سارے باغ کھل اٹھیں
ہوائے مہر نفرتوں کا سارا زہر مار دے

قیامتیں گزر رہی ہیں کوئی شہسوار بھیج
وہ شہسوار جو لہو میں روشنی اتار دے

وہ آفتاب بھیج جس کی تابشیں ابد تلک
میں داد خواہِ اجر ہوں جزائے انتظار دے

جنوں کا رنگ بھی ہو شعلہ نمو کا بھی ہو
سکوتِ شب میں اِک انداز گفتگو کا بھی ہو
میں جس کو اپنی گواہی میں لے کے آیا ہوں
عجب نہیں کہ یہی آدمی عدو کا بھی ہو

وہ جس کے چاک گریباں پہ تہمتیں ہیں بہت
اُسی کے ہاتھ میں شاید ہنر رفو کا بھی ہو
ثبوت محکمیٔ جاں تھی جس کی بُرِشِ ناز
اُسی کی تیغ سے رشتہ رگِ گلو کا بھی ہو
وہ جس کے ڈوبتے ہی ناؤ ڈگمگانے لگے
کِسے خبر وہی تارا ستارہ جو کا بھی ہو
وفا کے باب میں کارِ سخن تمام ہوا
مرے وجود میں اِک معرکہ لہو کا بھی ہو
کوئی جزا تو ملے جان سے گذرنے کی
کوئی صِلہ تو گرفتارِ آرزو کا بھی ہو

فلک نے اِک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوکِ سناں پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
خاک اُڑانے والے لوگوں کی بستی میں
کوئی صورت گر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
اہلِ جنوں کو زنداں شائد راس آیا
دیواروں میں در نہیں دیکھا بہت دنوں سے
سچے سائیں ہمارے حضرت مہر علی شاہؒ
بابا! ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

بستی بھی سمندر بھی بیاباں بھی مرا ہے
آنکھیں بھی مری خواب پریشاں بھی مرا ہے

جو ڈوبتی جاتی ہے وہ کشتی بھی ہے میری
جو ٹوٹتا جاتا ہے وہ پیماں بھی مرا ہے

جو ہاتھ اُٹھے تھے وہ سبھی ہاتھ تھے میرے
جو چاک ہوا ہے وہ گریباں بھی مرا ہے

مٹی کی گواہی سے بڑی دل کی گواہی
یوں ہو تو یہ زنجیر یہ زنداں بھی مرا ہے

ویرانۂ مقتل پہ حجاب آیا تو اس بار
خود چیخ پڑا میں کہ یہ عنواں بھی مرا ہے

میں وارثِ گل ہوں کہ نہیں ہوں مگر اے جان
خمیازۂ توہینِ بہاراں بھی مرا ہے

وارفتگیٔ صبح بشارت کو خبر کیا
اندیشۂ صد شامِ غریباں بھی مرا ہے

تم گنگ تھے میں نے تمہیں گویائی عطا کی
اے خوش سخنو! تم پہ یہ احساں بھی مرا ہے

جس کی کوئی آواز نہ پہچان نہ منزل
وہ قافلۂ بے سر و ساماں بھی مرا ہے

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اثاثہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے

دریا پر قبضہ تھا جس کا اس کی پیاس عذاب
جس کی ڈھالیں چمک رہی تھیں وہی نشانہ ہے

کاسۂ شام میں سورج کا سر اور آوازِ اذان
اور آوازِ اذاں کہتی ہے فرض نبھانا ہے

ایک جزیرہ اس کے آگے پیچھے سات سمندر
سات سمندر پار سنا ہے ایک خزانہ ہے

سب کہتے ہیں اور کوئی دن یہ ہنگامۂ دہر
دل کہتا ہے ایک مسافر اور بھی آنا ہے

○

ہم جہاں ہیں وہاں ان دنوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے
کاروبارِ جنوں عام تو ہے مگر اک ذرا مختلف ہے

آج کی رات ننھی سی لو بھی اگر بچ رہے تو غنیمت
اے چراغِ سرِ کوچۂ باد! اب کے ہوا مختلف ہے

اب کے بالکل نئے رنگ سے لکھ رہے ہیں قصیدے سخن ور
حرف تو سب کے سب ہیں رجز کے مگر مدعا مختلف ہے

خیرۂ عافیت کی طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقتِ شہر
جاننا چاہتی ہے کہ منزل سے کیوں راستہ مختلف ہے

سب کے سب اپنے کاندھوں سے غیروں کا سر جوڑنے میں لگے ہیں
ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں کا خدا مختلف ہے

اب کے میں نے کتابِ مساوات ایک ایک ورق پڑھ کے دیکھی
متن میں جانے کیا کچھ لکھا ہے مگر حاشیہ مختلف ہے

شیشہ کاروں کے زعمِ ہنر آشنائی کا انجام معلوم
اب انہیں کون سمجھائے پتھر سے کیوں آئینہ مختلف ہے

شکستہ سر جنوں کو آزمائیں گے نہیں کیا
اڑانوں کے لیے پر پھڑپھڑائیں گے نہیں کیا

ہوائیں مہرباں تھیں منقسم کیوں ہو گئی ہیں
نگہ دارانِ ساحل کچھ بتائیں گے نہیں کیا

کوئی ہنستا ہوا سورج پسِ دیوار تاریک
فروزاں ہو تو دیواریں گرائیں گے نہیں کیا

وہی پہلی سی ارزانی سرِ بازار پندار
نظر آئے تو ہم قیمت بڑھائیں گے نہیں کیا

سوادِ تشنگی کے پار اک مواجِ دریا
غزل خواں ہو تو پھر تیشے اٹھائیں گے نہیں کیا

بدلتے موسموں کی دھول ہوتے راستوں کو
تھکے ہارے مسافر یاد آئیں گے نہیں کیا

○

عذابِ وحشتِ جاں کا صلہ نہ مانگے کوئی
نئے سفر کے لیے راستہ نہ مانگے کوئی

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دُعا نہ مانگے کوئی

تمام شہرِ مکرم بس ایک مجرم ہیں!
سو میرے بعد مرا خوں بہا نہ مانگے کوئی

کھُلا جو روزنِ زنداں تو تیر آنے لگے
اب ان فضاؤں میں تازہ ہوا نہ مانگے کوئی

کوئی تو شہرِ تذبذب کے ساکنوں سے کہے
نہ ہو یقین تو پھر معجزہ نہ مانگے کوئی

عذابِ گردِ خزاں بھی نہ ہو بہار بھی آئے
اس احتیاط سے اجرِ وفا نہ مانگے کوئی

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

اس ایک خواب کی حسرت میں جل بجھیں آنکھیں
وہ ایک خواب کہ اب تک نظر نہیں آیا

کریں تو کس سے کریں نارسائیوں کا گلہ
سفر تمام ہوا ہم سفر نہیں آیا

تباہ ہو گئے تعمیرِ آشیاں والے
خیالِ وحشتِ دیوار و در نہیں آیا

دلوں کی بات بدن کی زباں سے کہہ دیتے
یہ چاہتے تھے مگر دل ادھر نہیں آیا

عجیب ہی تھا مرے دورِ گمرہی کا رفیق
بچھڑ گیا تو کبھی لوٹ کر نہیں آیا

حریمِ لفظ و معانی سے نسبتیں بھی رہیں
مگر سلیقۂ عرضِ ہنر نہیں آیا

ذرا سی دیر کو آئے تھے خواب آنکھوں میں
پھر اس کے بعد مسلسل عذاب آنکھوں میں

وہ جس کے نام کی نسبت سے روشنی تھا وجود
کھٹک رہا ہے وہی آفتاب آنکھوں میں

جنہیں مقام دل و جاں سمجھ رہے تھے ہم
وہ آئینے بھی ہوئے بے حجاب آنکھوں میں

عجب طرح کا ہے موسم کہ خاک اڑتی ہے
وہ دن بھی تھے کہ کھلے تھے گلاب آنکھوں میں

مرے غزال تری وحشتوں کی خیر کہ ہے
بہت دنوں سے بہت اضطراب آنکھوں میں

نہ جانے کیسی قیامت کا پیش خیمہ ہیں
یہ الجھنیں تری بے انتساب آنکھوں میں

جواز کیا ہے مرے کم سخن بتا تو سہی
بنام خوش نگہی ہر جواب آنکھوں میں

لوگ پہچان نہیں پائیں گے چہرہ اپنا
اب نہ بدلے تو بدل جائے گا نقشہ اپنا

برق ایک ایک نشیمن کا پتہ جانتی ہے
اب کے پھر ڈھونڈ نکالے گی ٹھکانہ اپنا

طعنۂ در بدری دے مگر اتنا رہے دھیان
راستہ بھی تو بدل سکتے ہیں دریا اپنا

بول! اے بے سر و سامانیٔ گلشن کچھ بول!
خلقت شہر طلب کرتی ہے حصہ اپنا

یہ بھی کہتے تک کہ ہر آفت کا سبب ہے کوئی اور
منزلیں خود بھی تو گم کرتی ہیں رستہ اپنا

ہم کہاں اپنے سوا اور کو گردانتے ہیں
ہم نے لکھا بھی تو لکھیں گے قصیدہ اپنا

خورشید رضوی

پیشِ حضورؐ

شان اُنؐ کی سوچیے اور سوچ میں کھو جائیے
نعت کا دِل میں خیال آئے تو چُپ ہو جائیے
سونپ دیجیے دیدۂ تر کو زباں کی حسرتیں
اور اِس عالم میں جتنا بن پڑے رو جائیے
یا حصارِ لفظ سے باہر زمینِ شعر میں
ہو سکے تو سردِ آہوں کے شجر بو جائیے
اے زہے قسمت کسی دن خواب میں پیشِ حضورؐ
فرطِ شادی سے ہمیشہ کے لیے سو جائیے
اے زہے قسمت اگر دشتِ جہاں میں آپؐ کے
نقشِ پا پر چلتے چلتے نقشِ پا ہو جائیے

گھول جا دن بھر کا حاصل اِس دلِ بے تاب میں
ڈوب جا، اے ڈوبتے سورج مرے اعصاب میں
آنکھ میں ہر لحظہ تصویریں رواں رہنے لگیں
جم گیا ہے خواب سا اِک دیدۂ بے خواب میں

دِل ہمارا شاخساروں سے، گلوں سے کم نہیں
اے صبا کی موجِ لرزاں، کچھ ہمارے باب میں
ہاں اِسی تدبیر سے شاید بنے تصویرِ دل
رنگ ہم نے آج کچھ گھولے تو ہیں سیماب میں
دھیان بھی تیرا، تری موجودگی سے کم نہ تھا
کُنجِ خلوت میں بھی ہم جھجکے رہے آداب میں
دسترس ہے موج کی ساحل سے ساحل تک فقط
تہ کو جا پہنچے اگر اترے کوئی گرداب میں
پیشِ دل کچھ اور ہے، پیشِ نظر کچھ اور ہے
ہم کھُلی آنکھوں سے کیا کیا دیکھتے ہیں خواب میں

نام ایسا ہے ترا جب بھی زباں پر آئے
دل میں اِک خنجرِ تصدیق اُترتا جائے
زندگی دھوپ بڑھانے لگی آئینوں سے
میں چلا جب تری دیوار کے سائے سائے
اے صبا! میں تری تاثیرِ نفس تب جانوں
جب کسی دن مرے ماتھے کی گرہ کھُل جائے
میں زمیں پر ہی رہوں اور اُفق سے جھک کر
آسماں آپ مجھے ہاتھ لگانے آئے
غنچۂ خاموش تھا جب تک تو مہک اُس کی تھی
اب ہوا کی ہے جہاں چاہے وہاں پھیلائے
تھی یہاں تو دہی پانی کی تجارت اچھی
آنکھ سے کس نے کہا تھا کہ لہو برسائے

جمع احباب ہوئے وقت کو زنجیر کرو
عمر کٹ جائے یہ لمحہ نہ گزرنے پائے

بات وہ کہتا ہوں جو ہم رنگِ خاموشی رہے
درس وہ دیتا ہوں جو رہنِ فراموشی رہے
آدمی پر تلخ ہو جاتا ہے ظاہر کا سفر
راہ میں حائل اگر باطن کی سرگوشی رہے
اہلِ دل کے نام کیا شرطِ گراں لکھ دی گئی
دِل تبھی رہتا ہے جب ذوقِ زیاں کوشی رہے
نقشِ ماتم تا ابد نقشِ جبیں ہو یا نہ ہو
تا ابد لیکن طبیعت کی سیہ پوشی رہے
خواب کو تعبیر ملتی ہے غموں کو اعتدال
ہوش میں شامل اگر تھوڑی سی بے ہوشی رہے

ناحق ہوئے خراب اتر کر خزینے میں
وہ لعلِ شب چراغ کہاں اِس دفینے میں
اسے محوِ خواب غرفہ نشیں، جھانک کر تو دیکھ
کن سیڑھیوں پہ ہے کفِ سیلاب زینے میں
یاں بت شکن بہت ہیں، کوئی خود شکن نہیں
توڑے جو خود کو ڈوب کے اپنے پسینے میں
پھول اب بھی کھل رہے ہیں مگر وہ صبا کہاں
ہوتا ہے کتنا فرق مہینے مہینے میں
شاید کسی بھنور میں کھلے ناخدا کی آنکھ
ساحل کے خواب دیکھ رہا ہے سفینے میں
مدت ہوئی کہ دل سے ترا نقش اُڑ گیا
اب دیکھیں کس کا نام کُھدے اِس نگینے میں

ہ

سینوں میں تپش ہے کبھی شورش ہے سروں میں
کیا چیز بسا دی گئی مٹی کے گھروں میں
چلتا ہوں سدا ساتھ لیے اپنی فصیلیں
پہچان سکا کون مجھے ہم سفروں میں
اُڑنا ہے تو تہذیب کرو سوزِ دروں کی
یہ ورنہ کہیں آگ لگا دے نہ پروں میں
غیروں میں ہوئی عام تری دولتِ دیدار
اک گُلِ بصر تھا کہ لُٹا بے بصروں میں
دو گام پہ تم خود سے بچھڑ جاتے ہو خورشید
اور لوگ سمجھتے ہیں تمھیں راہبروں میں

مژہ سے اشک ڈھلیں، دل میں حسرتیں جاگیں
ادھر سے گزرو تو سوئی محبتیں جاگیں
شکستِ دل کی صدا پے بہ پے سُنائی دے
مٹی مٹی سی خیالوں میں صورتیں جاگیں
کتابِ درد کی گُم کردہ آیتیں اتریں
جہانِ شوق کی بھُولی روایتیں جاگیں
یہی ہے ترکِ محبت ؛ کہ ایک عمر کے بعد
ملے وہ اب بھی تو دل میں شکایتیں جاگیں
ہے تیری یاد وہ آئینہ رو بُرو جس کے
ہزار سال کی کھوئی رفاقتیں جاگیں

وہ سرکشیدہ چٹانیں وہ چاندنی وہ سکوت
کہ دل کی چاپ سے سینے میں ہیبتیں جاگیں
کبھی ملو تو چلیں پھر انھی پہاڑوں میں
کہ پتھروں پہ پرانی عبارتیں جاگیں

سارا جہان سرد و سیہ یاس کی طرح
دل اُس میں ٹمٹماتی ہوئی آس کی طرح
رُخ سے عیاں بھی ہے مرے دل میں نہاں بھی ہے
تیرا خیال شدّتِ احساس کی طرح
تجھ سے بچھڑ کے صحبتِ گل میں ملا قرار
اس میں بھی کچھ تو ہے تری بُو باس کی طرح
ترسے کسی کے بوسۂ پا کو بھی عمر بھر
سُنسان راستوں پہ اُگی گھاس کی طرح
کانوں میں پھول پہنے ہوئے، کنجِ دل میں آج
اترا ہے کون شاخِ املتاس کی طرح
یونہی کہیں کہیں تری یادوں کے پھول تھے
تھی ورنہ زندگی کسی بن باس کی طرح
خورشید اُس کی آنکھ کی تابانیاں نہ پوچھ
وہ زہر بھی ہے پارۂ الماس کی طرح

کھو گئی دُور کہیں بانگِ درا ڈھونڈ کے لائیں
دشتِ ماضی میں چلیں اپنا پتہ ڈھونڈ کے لائیں
اب بھی صحرا میں ہے شاید وہ امانت باقی
وہی گُم گشتہ نشانِ کفِ پا ڈھونڈ کے لائیں
میں اُسے روٹھ کے جانے تو دوں لیکن کیسے
جب ذرا اُٹھ کے چلا، دل نے کہا ڈھونڈ کے لائیں

ہاتھ ملتے ہوئے مٹی میں اَٹے لوٹ آئے
خاک ہی خاک ہے ، اِس خاک سے کیا ڈھونڈ کے لائیں
تو اگر شکر کا رب ہے تو پھر اے ربِّ کریم
کیا شکایت کو کوئی اور خدا ڈھونڈ کے لائیں
تپشِ دہر میں سایہ نہیں ملتا کوئی
پھر وہی دوشِ محمدؐ کی رِدا ڈھونڈ کے لائیں

مجیب احمد

نعت

اِک جرعۂ تسنیم سکوں ساقیِ کوثر
ہم عرصۂ محشر میں ہیں اے شافعِ محشر

دیکھا تجھے سورج نے بھی اندازِ دگر سے
آیا ترا سایہ نہ ترے قد کے برابر

دے ہم کو ستاروں کے شکنجے سے رہائی
ہاتھوں میں ترے ہے تری امّت کا مقدر

ہر ایک ہنرور ہے سخن ور تیرے دم سے
کب تیرے ثنا گر نہ رہے تیرے نواگر

پیرہن اڑ جائے گا رنگِ قبا رہ جائے گا
پھول کے تن پر فقط عکسِ ہوا رہ جائے گا

ہم تو سمجھے تھے کہ چاروں در مقفّل ہو چکے
کیا خبر تھی ایک دروازہ کھُلا رہ جائے گا

کرچیاں ہو جائیں گی آنکھیں بھی خوابوں کی طرح
آئینوں میں نقش سا تصویر کا رہ جائے گا

دیکھ لینا ان کہی باتیں سنیں گے ایک دن
سوچ لینا ہر فسانہ ان کہا رہ جائے گا

بات لب پر آ گئی تو کون روکے گا اُسے
اور تیرا ہاتھ ہونٹوں سے لگا رہ جائے گا

اے گنہ گاروں کے دشمن اے نکو کاروں کے یار
کون جانے کیا مٹے گا اور کیا رہ جائے گا
ہم بچھڑ جائیں گے شاخِ عمر سے گر کر نجیب
اک تنے پر نام دونوں کا لکھا رہ جائے گا

شب کے خلاف بر سرِ پیکار کب ہوئے
ہم لوگ روشنی کے طلب گار کب ہوئے
خوشبو کی گھات میں ہیں شکاری ہواؤں کے
جھونکے مگر کسی سے گرفتار کب ہوئے
تعبیر کی رتوں نے بدن زرد کر دیئے
پھر بھی یہ لوگ خواب سے بیدار کب ہوئے
تالے لگا لیئے ہیں خود اپنی زبان پر
کیا بات ہے تم اتنے سمجھدار کب ہوئے
یہ عہد اپنی روح میں عہدِ فراق ہے
ہم مطلعِ سخن پہ نمودار کب ہوئے
خلعت وصول کرتے ہوئے سر اٹھا لیا
رسوا نجیب ہم سرِ دربار کب ہوئے

زرد پتوں کو درختوں سے جدا ہونا ہی تھا
ہم کہ دریا ہیں سمندر کی غذا ہونا ہی تھا

اور کب تک بے ثمر رکھتی خزاں پیڑوں کے ہاتھ
رُت بدل جانا تھی یہ جنگل ہرا ہونا ہی تھا
روکنے سے کب ہوا کے نرم جھونکے رک سکے
بند دروازوں کو اِک دن نیم وا ہونا ہی تھا
دھول کب تک جھونکتے اِک دوسرے کی آنکھ میں
ایک دِن تو جھوٹ سچ کا فیصلہ ہونا ہی تھا
تیز دھاروں سے بچھڑ کر ان کناروں پر نجیبؔ
موجِ دریا کی طرح بے دست و پا ہونا ہی تھا

یہ سورج رُخ بدلتا جب رہا ہے — کہ خود انسان ڈھلتا جا رہا ہے
کھلنڈرا سا کوئی بچہ ہے دریا — سمندر تک اچھلتا جا رہا ہے
نہ کچھ کہتا نہ کچھ سنتا ہے کوئی — فقط پہلو بدلتا جا رہا ہے
ادھر ملتی نہیں سانسوں سے سانسیں — زمانہ ہے کہ چلتا جا رہا ہے
مکانوں میں نئے روزن بنے تو — ہوا کا رُخ بدلتا جا رہا ہے
نجیبؔ اب تو شرارِ بے حسی سے
ترا چہرہ پگھلتا جا رہا ہے

آسماں سورج ستارے بحر و بر کس کے لیے
یہ سفر کس کے لیے رختِ سفر کس کے لیے
وہ ہرے دن وہ بھرے موسم تو کب کے جا چکے
ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں اب شجر کس کے لیے

دن نکلتے ہی نکل آئے تھے کس کے کھوج میں
شام ڈھلتے ہی چلے آئے ہیں گھر کس کے لیے
تو کسی کا منتظر کب تھا مگر یہ تو بتا
عمر بھر دل کا کھلا رکھا ہے در کس کے لیے
کون دریاؤں کی ہیبت اوڑھ کر اترا نجیب
پیچ اٹھے ہیں سمندر میں بھنور کس کے لیے

موسم کے زرد چہرے پہ رعنائی آ گئی
ہر شاخ میں شجر کی توانائی آ گئی
کچھ ایسے قوس قوس اندھیروں میں تو ملا
دیکھا تو پور پور میں بینائی آ گئی
چپ چاپ آئے بزم میں چپ چاپ چل دیئے
تنہا ہوئے تو انجمن آرائی آ گئی
پتوں پہ رخصتی کی رسومات قرض تھیں
پاگل ہوا کے ہاتھ میں شہنائی آ گئی
یہ بھی کسی کے پیار کا اعجاز ہے نجیب
آواز میں سکوت کی گہرائی آ گئی

بدن سے جاں نکلنا چاہتی ہے — بلا اس گھر سے ٹلنا چاہتی ہے
یونہی آتش فشاں کب جاگتے ہیں — زمیں کروٹ بدلنا چاہتی ہے
حدودِ صحنِ گلشن سے نکل کر — صبا گلیوں میں چلنا چاہتی ہے

دھواں سا اٹھ رہا ہے چار جانب کوئی صورت نکلنا چاہتی ہے
ہواؤں میں نہیں قوت نمو کی مگر مٹی تو پھلنا چاہتی ہے
جو چہرہ ہے وہاں پھولی ہے سرسوں
زمیں سونا اگلنا چاہتی ہے

اے سادہ دلاں ہشیار جاں دینے کی رُت آئی
اس دور میں ہونٹوں کی کب ہوتی ہے شنوائی
چپ رہنا ہی بہتر ہے دکھ سہنا ہی بہتر ہے
اے حسرت یکجائی اے دعوئے یکتائی
کب درد امر ہوگا کب ختم سفر ہوگا
اس زخم مسلسل کی کب ہوگی پذیرائی
کیا تم کو بتائیں ہم کیا تم سے چھپائیں ہم
وہ بات ذرا سی تھی جو دار پہ لے آئی
ہم شوق کی شدت سے چہروں کو سجاتے ہیں
اشکوں سے سجاتے ہیں ہم شعلۂ بینائی

اڑنے کے ارادے ہیں تو پر ساتھ نہ رکھنا
تم شاخ شجر ہو تو ثمر ساتھ نہ رکھنا
پتھر کی یہ بوندیں ہیں کہ بارش کی لکیریں
اس جنگ میں تم شیشۂ سر ساتھ نہ رکھنا

جل بجھنا شراروں کی طرح قریۂ جاں میں
تم جاں سے گذرنے کا ہنر ساتھ نہ رکھنا

گھر لوٹ کے آنے کے لیے گھر سے نکلنا
کچھ اس کے سوا رختِ سفر ساتھ نہ رکھنا

مقتول ہو مٹی کا بدن لے کے چلے ہو
اس راہ میں برسات کا ڈر ساتھ نہ رکھنا

کس شہر سے کس شہر کی جانب نکل آئے
اے دیدہ ورو! دیدۂ تر ساتھ نہ رکھنا

نہیں کہ موت کے گرداب سے گزرنا ہے
مجھے تو زیست کے دریا کو پار کرنا ہے

سمندروں سے مجھے خوفِ مرگ ہو کیوں کر
کہ ایک روز کسی گھاٹ تو اترنا ہے

وہ جو گرفت میں آتا نہیں کسی صورت
اسی خیال کو لفظوں میں قید کرنا ہے

ابھی سمیٹ نہ مجھ کو خلا کے دامن میں
ابھی کچھ اور مری راکھ کو بکھرنا ہے

ابھی سے کیسے کہوں خود کو اشرف المخلوق
ابھی تو منزلِ تکمیل سے گزرنا ہے

ابھی رجائیؔ کی خواہش نہیں ہوئی پوری
ابھی تو مجھ کو رگِ حرف میں اترنا ہے

نجیبؔ سوچ کہ دل کس لیے سلامت ہے
ہر آئینے کو اگر ٹوٹ کر بکھرنا ہے

گلزار وفا چودھری

غزلیں

دھول نہ بننا، آئینوں پر بار نہ ہونا
بینائی کے رستے کی دیوار نہ ہونا

شہروں کا ورثہ ہیں جلتے بجھتے منظر
رہنا لیکن ہم رنگِ بازار نہ ہونا

زہر ہوائیں پُروا رنگوں میں چلتی ہیں
سادہ کلیو ان کے لیے گلنار نہ ہونا

ملنے کا، کھلنے کا موسم دُور نہیں ہے
نخلِ ماتم اے میرے اشجار نہ ہونا

میں نے چمن کی خاطر کون سے دُکھ جھیلے ہیں
شاخِ بہاراں میرے لیے گلبار نہ ہونا

تیز ہواؤ اب ڈرنا گھبرانا کیسا
چلنا ہی ٹھہرا تو شور مچانا کیسا

آنگن آنگن میں ویرانی ناچ رہی ہے
ساز اُٹھانا کیسا نغمہ گانا کیسا

شام ڈھلے سے آسیبوں کا ڈنکا باجے
پُورن ماشی میں بھی باہر آنا کیسا

اسے سیّاحو یہ تو دلدل کی وادی ہے
اس میں اُترے ہو تو جان بچانا کیسا

سارے موسم ایک تسلسل میں شامل ہیں
تیرا آنا کیسا تیرا جانا کیسا،

ان کی خاطر ہم کو سُورج بننا ہوگا
یخ شہروں کو آہوں سے پگھلانا ہوگیا

اُڑنا تو بہت اُڑنا افلاک پہ جا رہنا،
آنکھوں کو کھُلا رکھنا کس کے لیے آساں ہے
جو موجۂ باد آیا زردی کا پیمبر تھا،
باغوں میں خراماں تھی شہروں میں پریشاں ہے
مَیں ذات کے صحرا میں تا عمر نہ بھٹکوں گا

ہم نے کہاں سیکھا ہے زیرِ کفِ پا رہنا
یاں کس کو گوارا ہے آنکھوں کا کھُلا رہنا
اعجاز سے کیا کم ہے پیڑوں کا ہرا رہنا
خوشبو کو نہ راس آیا پابندِ ہَوا رہنا
اسے شہر کے دروازو میرے لیے وا رہنا

(نذرِ اقبال)

جاگتی گلیاں بھی خاموشی کا مسکن ہو گئیں،
ایسی بارش تھی کہ ساری بستیاں بن ہوگئیں

پہلے دروازوں کے باہر خوف کی آہٹ ہُوئی
پھر یہ گلیاں تھیں کہ سایوں کا نشیمن ہوگئیں

سامنے اندھی مسافت اور پیچھے موت تھی
گُل اُگلتی وادیاں وحشت بدامن ہوگئیں

بازوؤں میں آگیا جیسے سمندر کا خروش
اور آنکھیں تھیں کہ طوفانوں کا مخزن ہوگئیں

اپنے بازو چاند سورج ہیں تو میرے دوستو
"دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ روشن ہوگئیں"

پرانے پیڑ کو موسم نئی قبائیں دے — گلوں میں دفن کرے، ریشمی ردائیں دے
شبِ وصال بھی منزل ہے میرے ذوقِ سفر — مجھے وصال سے آگے کی انتہائیں دے
میں ایک دانۂ پامال تھا مگر اے خاک — اب اُگ رہا ہوں میرے تن کو بھی قبائیں دے
فصیلِ شہرِ ستم سُرخ ہوتی جاتی ہے — امیرِ شہر ہمیں شوق سے سزائیں دے

کریں مشاہدہ گلزار ایسی آنکھوں سے
نظر ہٹائیں تو منظر ہمیں صدائیں دے

تارے ہماری خاک میں بکھرے پڑے رہے
یہ کیا کہ تیرے نین فلک سے لڑے رہے

ہم تھے سفر نصیب سو منزل سے جا ملے
جو سنگِ میل تھے وہ زمیں میں گڑے رہے

لوگوں نے اینٹ اینٹ پہ قبضہ جما لیا
ہم دم بخود مکان سے باہر کھڑے رہے

ہم کو تو جھولنا ہی تھا انصاف کے لیے
یہ کیل کیوں صلیب میں ناحق جڑے رہے

رعنائی اپنی چھینتا ہے موسموں سے اب
ماضی میں جس درخت کے پتّے جھڑے رہے

جن کی جڑیں زمین کے اندر تھیں دُور تک،
وہ پیڑ آندھیوں کے مقابل اَڑے رہے

بوسیدہ عمارات کو مسمار کیا ہے،
ہم لوگوں نے ہر راہ کو ہموار کیا ہے

یُوں مرکزی کردار میں ہم ڈُوبے ہیں جیسے
خود ہم نے ڈرامے کا یہ کردار کیا ہے

دیوار کی ہر خشت پہ لکھے ہیں مطالب
یُوں شہر کو آئینۂ اظہار کیا ہے

بینائی مرے شہر میں اک جُرم ہے لیکن
ہر آنکھ کو رنگوں نے گرفتار کیا ہے

درپیش ابد تک کا سفر ہے تو بدن کو
کیوں بارکشِ سایۂ اشجار کیا ہے

مُنتشر ہو کر رہے یہ ایسا شیرازہ نہ تھا
خاک ہو جانا مرے ہونے کا خمیازہ نہ تھا

میں بطونِ ذات میں اور تُو خلا میں گُم رہا
خاک کے جوہر کا ہم دونوں کو اندازہ نہ تھا

آب پاشی سے رہے غافل شجر کاری کے بعد
اب جو دیکھا ایک پودا بھی تروتازہ نہ تھا

ہم میں جو آزاد تھا آزاد تر ہو کر رہا،
اب وہی بے گھر ہے جس کے گھر کا دروازہ نہ تھا

جبر کے احساس کی آواز تو پہلے بھی تھی
انقلابِ قسمتِ آدم کا آوازہ نہ تھا

کون سی منزل ہے جو بے خواب آنکھوں میں نہیں
ایک سورج ڈھونڈتا ہوں جو کہ سپنوں میں نہیں

دیکھتا رہتا ہوں مٹتے شہر کے نقش و نگار
آنکھ میں وہ صورتیں بھی ہیں کہ گلیوں میں نہیں

موسموں کا رُخ اُدھر کو ہے ہواؤں کا ادھر
جنگلوں میں بات کوئی ہے کہ شہروں میں نہیں

پیلی پیلی تتلیاں ہیں اور محرومی کا رقص
کون سا وہ ذائقہ ہوگا کہ پھولوں میں نہیں

یوں تو ہر جانب کھڑے ہیں یہ قطار اندر قطار
ایک ٹھنڈک ہے کہ ان پیڑوں کے سایوں میں نہیں

چاند تاروں کی ضیائیں، کہکشاؤں کے ہجوم
کون سا وہ آسماں ہے جو زمینوں میں نہیں

○

پھر وہی تاریک سائے دیکھنا
رات کی مُٹھی میں تارے دیکھنا

یہ ہَوا تیرے تعاقب میں نہ ہو
اے مُسافر رُخ بدل کے دیکھنا

آبیاری سے یہ غفلت ہے تو پھر
یہ ہرے اشجار سُوکھے دیکھنا

تھم گئیں جو آگہی کی ندّیاں ،
ذات کے اندر جزیرے دیکھنا

منفی و مثبت شُعاعوں کا تضاد
مٹ گیا تو یاں اندھیرے دیکھنا

اے صبا اِس آخری پت جھڑ کے بعد
شاخ کی باہوں میں گہنے دیکھنا

ناہید قاسمی

آپؐ سے ہے محبتوں کو ثبات

تلخ وہموں کے سخت پہرے میں
سوچ لے جائے ایسے جنگل میں
غم کی بیگار جس میں دل بھگتے
کچھ نہ سوجھے بسیط سائے میں
منزلیں چھوٹ جائیں رستے میں

پے بہ پے ٹھوکریں ہیں پازیبیں
گونج بن بن کے چوڑیاں کھنکیں
جھمکیوں کو طیور چھو کے اڑیں
پھیلے ہاتھوں پہ آگریں پتے
آہٹیں اجنبی درندوں کی
ضربِ تیشہ کی طرح دل پہ لگیں
اوڑھنی شاخ شاخ الجھائے
ذہن سوچے تو روح ڈر جائے

آپ سے ہے محبتوں کو ثبات
ایسے میں آپ ہی کا روشن ہاتھ
میری انگلی کو تھام لیتا ہے

کتنی شفقت سے، میرے کانوں میں
کوئی میرا ہی نام لیتا ہے
کرنیں رم جھم برسنے لگتی ہیں
منزلیں راستوں سے جھانکتی ہیں۔
حوصلے موربن کے ناچتے ہیں

دُعا

رنگ چرا کر قوسِ قزح سے
نئے گلاب اگاؤں
کلی کلی کا رس ٹپکا کر
خوشبوئیں بساؤں
جھلمل جھلمل تارے پکڑوں
نور کی نہر بہاؤں
بارش کی بوندوں کے موتی
صحرا میں بکھراؤں
کوئل کوئل نغمے چن کر
مرلی نئی بناؤں
دنیا کا سب حسن سمیٹوں
نیا خیال سجاؤں
ذہنوں سے ٹکرا کر پلٹوں
گونج بنوں اُڑ جاؤں

مرزا صاحباں

ہاں سن اے پیاری صاحباں !
اک عرض مری بھی سن
اب چہرے پر سے لٹیں ہٹا
اب سامنے میرے آ
میں روتا رہوں یا ہنسنے لگوں
کچھ مجھ کو بھی سمجھا
مری آنکھوں کی کٹیاؤں میں
آ، اپنے دیئے جلا
میرے لہو کا رنگ شفق سا ہے
آ، اپنی مانگ سجا
مرے ہاتھوں کی خالی جھولی ہیں
لا، اپنا ہاتھ گرا
ہو جس میں دنیا کا خون رواں
کوئی ایسا گیت سنا
میری ٹوٹی ہوئی کمان کے
اب ٹکڑوں کو تو نہ چن
مری ڈوبی ڈوبتی سانسوں میں
کوئی گنتی اور نہ گن
ہاں سن اے پیاری صاحباں
اک عرض مری بھی سن

(۲)

تو چھوڑ کے مرزے کو چلدی
اپنے ویروں کے ساتھ
میں ایک اکیلا رہ گیا
لوٹے تیروں کے پاس
مرا چہرہ سرسوں سرسوں ہے
اب یہاں گلاب کہاں
مری سوچیں ریزہ ریزہ ہیں
مرے ذہن میں خواب کہاں
مری آنکھوں میں جو تارے تھے
وہ کب کے ٹوٹ گئے
جو دامن تھے مرے ہاتھ میں
وہ چھٹ کر چھوٹ گئے
میرا ماتھا گرد سے اٹ گیا
اب اس کو اجالے کون
میرے بالوں میں تنکے ان گنت
اب ان کو نکالے کون

(۳)

اے میری مسافر صاحباں
اس طرح نہ اشک بہا
میرے کانٹا کانٹا جسم سے
دامن کو بچالے جا
یوں مڑ مڑ کے کیا دیکھنا
جب جانا ٹھہر گیا

اسے پار کنارے کام کیا
جو دریا تیر گیا
تو آگے بڑھے تو اوڑھنی
کیوں پیچھے کو لپکے
کیا آنکھ میں تنکا پڑ گیا
تو پلکیں کیوں جھپکے
یہ آنکھیں گہری جھیل سی
کیوں خالی خالی لگیں
ترے لب جو اتنے امیر تھے
کیوں آج سوالی لگیں
اے میری مسافر صاحباں
جا، والی ترا خدا
سورج میں بلا کی آگ ہے
ذرا دھوپ سے بچتی جا
جو سایہ ہے مجھ پہ پیڑ کا
تجھ تک کیسے پہنچاؤں
یہ سوچتے سوچتے تھک گیا
اب کیوں نہ ذرا سو جاؤں

چنگاری

جو جگنو کھو چکے، وہ کھو گئے
جو سو چکے، وہ سو گئے
ان کو جگاؤ گے تو وہ بھیگے ہوئے جنگل میں ہر سو آگ بن کے اڑتے جائیں گے
انہیں کیسے بجھاؤ گے؟
انہیں کیسے سلاؤ گے؟

عکس در عکس

نہ چاند ماتھا، نہ تارا ٹھوڑی
نہ جھیل آنکھیں، نہ پھول لب ہیں
نہ آبِ رخ عزم و یقیں کی دل ہیں
نقوشِ رخ اتنے مٹ گئے ہیں، نقوش کب ہیں

اے آئینے وقت کے! تجھے ایک بار بھی
اک حسین چہرہ نہ دے سکے ہم
مگر ہیں ہم اب بھی عکس تیرا
وہ عکس ہی تو ہمارا سچ ہے
ہماری آنکھیں بجھی ہوئی ہیں، مگر یہی تو ہیں تیری آنکھیں
ہمارے چہرے سُتے ہوئے ہیں مگر یہی تو ہے تیرا چہرہ
ہمارے آنسو ہیں تیرے آنسو، ہمارے دُکھ سارے تیرے دُکھ ہیں
کہ تو بھی سچ بولنے کا عادی ہے، ہم بھی عادی ہیں

ہم اپنے چہرے، ہم اپنے باطن سنوار لیں گے
ہماری آنکھوں میں دیکھ اپنے حسین فردا کا اک ہیولیٰ
کہ چاند ماتھا ہے، تارا ٹھوڑی ہے، جھیل آنکھیں ہیں، پھول لب ہیں
حسین ہیں ہم، حسین ہے تو، حسین سب ہیں

سُرخ نمو

کانٹو! تم کو جتنا چبھنا ہے، تم چبھ لو
اس کے بعد تو میری پوروں کی شاخوں پر
سُرخ گلاب کی کلیاں ناچ اٹھیں گی

اندر لوبی مشک مچایا....

لاکھ بہانے بنا۔ "یہ ساون رت ہے

بادل تو برسا کرتے ہیں برس گئے !'

لاکھ چھپا
لیکن ان آنکھوں میں اب جو قوسِ قزح سی ناچ اٹھی ہے
تو میں جان گئی ہوں۔ جان گئی ہوں
(کن کلیوں سے رنگ لیے ہیں تو نے ؟)
تیرے دل میں کتنے سوہنے سوہنے پھولوں کے گھر اگ آئے ہیں
جن میں تو نے خوشبوؤں کے دیے جلا رکھے ہیں۔ میرے لیے۔ بس میرے لیے

اب تو مجھ کو گہرے سمندر کی تہ میں سے سیپی ڈھونڈنے بھیجے گا۔
تو میں وہ سیپی لادوں گی
(اس سے تجھے کیا اُبھر ابھر کے ڈوبوں یا میں ڈوب ڈوب کے ابھروں)
تو مجھ کو صحرا کی تپتی ریت کے ذرّے گننے کو کہہ دے
تو میں وہ سارے ذرّے گن دوں گی
(چاہے میری انگلیاں سُرخ چنار کی شاخیں ہو جائیں)
یا تو مجھ کو (میری بے گنتی کے جرم میں) اِک تنہا اونچی چوٹی پر گاڑ آئے
تو میری آنکھ سے تیرے دکھ کے موتی نہیں گریں گے
حشر تلک محفوظ رہیں گے۔

ماں!

ماں!
تو پربت میں بہتی ندیا جیسی ہے
تجھ کو دیکھوں تو جی چاہے
سورج کی ست رنگی کرنوں کی پھیوں سے
میں تیرے آنچل پر قوسِ قزح کے رنگ اتاروں

تیرے نرم کناروں پر میں طرح طرح کے
نازک پھول اگا دوں
اور تیرے رستے میں جتنے کنکر کانٹے آئیں
ان کو اپنے ہاتھوں سے چُن لوں
اور تیری جھلمل جھلمل لہروں کی جھالر میں
ننھی منی جھنن جھنن جھن گھنگھریاں یوں ٹانکوں
جیسے فلک فلک پر تارے ٹانکے جاتے ہیں!
تب تو گیت بکھیرے، رنگ اڑائے، مہک لٹائے پربت پر بہتی ندیا سی
بہتی رہے اور بہتی رہے!
اور ہمارے پربت پر
گیتوں، رنگوں، خوشبوؤں، مسکانوں اور طلوعوں کی رت ٹھہرے
اور پھر ٹھہری رہے

کھلی آنکھیں

(۱)

درِ خفیہ قلعے کا
دشمن پہ وا کر کے
اِک چلچلاتی ہوئی دوپہر میں
محل کے بہت بھاری مخمل کے پردے ہٹا کر
وہ یہ دیکھتا تھا
(اگر نام صادق تھا اس کا
تو ناموں کا مفہوم کردار کی ایک پہچان کب بن سکا ہے!)
وہ یہ دیکھتا تھا
کہ ٹیپو کے ساتھی

وہ اونچی فصیلوں کے رکھوالے
حیران آنکھیں لیے
اپنی تیغیں سنبھالے ہوئے
ایک جانب لپکتے چلے جا رہے تھے
جہاں ان کے ٹیپو کے شعلہ سے چہرے کے گرد
اڑتی مٹی کے ذرّوں نے
ہالا چنا تھا
بہت گہری سنجیدہ آنکھوں سے چمکیلی کرنیں
فضاؤں کے سینے میں
نیزوں کی صورت
گڑی جا رہی تھیں
وہ سینہ تنا تھا کہ جس پر کوئی زرہ بکتر نہیں تھی
(لبادے پہ ہیرے ٹنکے تھے
اٹھی اور مضبوط گردن میں مالائیں جھلمل لرزتی تھیں)
دشمن کی ڈھالوں کو بھی چیر جاتی ہوئی اس کی شمشیر پیہم تڑپتی تھی، تڑپا رہی تھی
مگر پردۂ مخملیں کے ادھر
ایک غدار یہ سوچتا تھا
" خدایا! یہ اتنا جری اور سجیلا جواں
کیسے چھوٹا ہے دھرتی کی اس تشنہ لب کوکھ سے!"
اور اگلے ہی لمحے وہ پردے کی سلوٹ میں چہرہ چھپائے ہوئے رو رہا تھا
(مگر ساتھ ہی سوچتا تھا
کہ انگریز کہتا تھا
ٹیپو کی سانسوں کی چھن چھن چھنکتی ہوئی ڈور جب تک نہ ٹوٹے گی
ہم ہند کی فتح کے خواب کو
کوئی تعبیر کیسے مہیا کریں گے

تم ایسا کرو
تم ہمیں خوابِ فیروزمندی کی تعبیر دو
اور ہم سارے میسور کا سیم وزر اور لعل وجواہر تمہارے حوالے کریں گے)
اچانک وہ پلٹا
اور اپنے ہی دل کے اندھیرے سے
اکلوتے جذبے کی نازک کرن کو نکالا
اسے پردۂ مخملیں میں لپیٹا
معاً اپنی ناپاک خواہش کی وحشت کو دل میں جگایا
وہ جب باہر آیا
تو انسانیت اور وفا اور محبت کے جذبے وہیں چھوڑ آیا

(۲)

کسی اور نے تو نہ دیکھا
یہ سلطان ٹیپو نے دیکھا کہ دشمن کی صف میں وہ افراد بھی تھے
کہ میسور کے خوانِ نعمت کے جو ریزہ چیں رہ چکے تھے
کئی ہم وطن تھے، کئی ہم سفر تھے
اور اس پر ستم یہ کہ وہ جانتا تھا۔ جب انسان ڈستا ہے
پھر اس کے کاٹے کا آفاق بھر میں کہیں کوئی منتر نہیں ہے
اس نے کہا تھا کہ
"جس قوم کے لوگ غدّار ہوں اس کے فولادی قلعے بھی ریتیلے گھر بن کے رہ جائیں گے "
اپنے قلعے کی فولادی (اب ریگِ صحرا میں ڈھلتی) فصیلوں کے سائے میں
وہ سوچتا جا رہا تھا
مگر ساتھ ہی اپنے دشمن کے کشتوں کے پشتے لگاتا چلا جا رہا تھا
ہر اک وار بھرپور تھا
جیسے سیلاب کے سامنے بند دریا کے ٹوٹیں
(وہ بازو نہ تھے، تیز اور تند دھارے تھے)

ٹیپو کے ابرو کھنچے تھے
اور اس کی بہت گہری چمکیلی آنکھوں میں سورج جگے تھے
کہ جن کی تپش سے پگھلتی تھیں دشمن کی برفیلی برفیلی آنکھیں
یہ لمحہ تھا
تاریخ جب میرے ٹیپو کے ہونٹوں سے بولی کہ :
"گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے تو بہتر ہے اک روز کی زندگی شیر کی "
اور وہ شیر لڑتا رہا
زخم دیتا رہا، زخم کھاتا رہا، خون بہتا رہا ، خوں بہاتا رہا
دھوپ بجھتی رہی ، شام ڈھلتی رہی
رات کی تیرگی چال چلتی رہی

(۳)

رات آئی تو اس نے بھڑکتے ہوئے خون کی مشعلوں میں یہ دیکھا
کہ چاروں طرف گورے چہرے مگر کالے دل والے دشمن تھے
جو کہہ رہے تھے کہ ٹیپو کہیں بھاگ کر چھپ گیا ہے
مگر سب نے دیکھا
(یہ "سب" جس میں صادق بھی شامل ہے
ننھا سا اِک نام ہے اور کس درجہ سفاک ہے)
۔ ان گنت صف بہ صف نوجوانوں کے بے حس مگر کتنے پُر نور جسموں کا اِک ڈھیر تھا
اور شہیدوں کے انبوہ کو دیکھ کر
فیصلہ یہ سنایا گیا
اس جگہ ٹیپو سلطان کا کوئی مخفی خزانہ ہے
جس کے تحفظ کی خاطر یہ سب لوگ قربان ہوئے ہیں !
بڑھے مشعلوں کے پرے
اور شہیدوں کی لاشوں کی کتنی تہیں جب ہٹائی گئیں
تو یہ دنیا نے دیکھا

کہ وہ اِک خزانہ بچاتے ہوئے مر مٹے تھے
خزانہ جسے ٹیپو سلطان کہتے ہیں
ٹیپو نے جو زخم کھایا تھا، سینے پہ کھایا تھا
اِک ہاتھ میں اپنی شمشیر تھامے ہوئے تھا
مگر دوسرے ہاتھ سے اپنی دھرتی کو
(مہکے ہوئے سینچی سُرخ دھرتی کو)
جکڑے ہوئے سو گیا تھا
مگر اس کی چمکیلی آنکھیں کھلی تھیں
وہ آنکھیں ابھی تک کھلی ہیں!

معیارِ حُسن

آئینے نے مجھ سے سرگوشی میں ہمیشہ یہی کہا ہے
"صورت اتنی پیاری شاید نہیں تمہاری"
لیکن میرے پیارے بچے
میں نے تیری آنکھوں کے آئینوں میں
آج اپنے آپ کو بہت حسین پایا ہے!

جلیل عالی

اُس کی چاہت میں

اُس کی شوکت سے پگھلتی ہیں انائیں کیا کیا
اُس کی چاہت میں نکھرتی ہیں وفائیں کیا کیا
اُس کے سائے میں پلیں نخلِ سعادت کتنے
اُس کے قدموں میں ٹلیں سر سے بلائیں کیا کیا
اُس نے اِک لفظ کسی سے کبھی سیکھا نہ پڑھا
اُس کی باتیں مگر اسرار سجھائیں کیا کیا
وُہ کراں تا بہ کراں پھیلتے منظر کی طرح
اُس کو لفظوں کے دریچوں میں سجائیں کیا کیا

غزل

بستی میں کس عذاب کے ڈر جاگنے لگے
شب بھر پسِ فصیل بھی گھر جاگنے لگے

سوچیں جواں ہوئیں تو عقیدے تڑخ گئے
دریا چڑھے تو کتنے بھنور جاگنے لگے

ان بارشوں چھتیں تو ٹپکنے لگیں مگر
صحنوں میں سایہ دار شجر جاگنے لگے

مجھ سے جُدا ہوتے تو من و تو کے درمیاں
بے نام رابطوں کے سفر جا گنے لگے
اس رُت ملیں گی شوق نگاہوں کو ٹھنڈکیں
جب چاند صحبتوں کے نگر جا گنے لگے
عالیؔ طلوعِ فن کی نشانی یہی تو ہے
لفظوں میں اَن کہی کا اثر جاگنے لگے

عکسِ رُخِ محبوب بھی رُو پوش ہوا ہے
کیسا یہ دُھواں دِل کے الاؤ سے اٹھا ہے
لمحوں کے خم و پیچ میں اُلجھی ہوئی سانسو
وہ کون خطا تھی یہ جہاں جس کی سزا ہے
مجھ سے تو بہت بعد میں نکلا تھا سفر پر
اب منزلوں پیچھے جو مجھے چھوڑ گیا ہے
جانا ہے مجھے بھی اسی منزل پہ زمانے
لیکن مرا رستہ ترے رستے سے جُدا ہے
اک سحر ضیا میں ہیں سبھی کون یہ سوچے
ٹوٹا ہے جو تارا وہ کہاں جا کے گرا ہے

حرفِ تقدیر کو کس راہ سے سمجھا جائے
میں جو سوچوں وہ مرے ہاتھ پہ لکھا جائے
ذہن مانوس اشاروں کی فصیلیں کھینچے
دل مگر کوئی صدا چاپ سی سنتا جائے
جب صدا اپنی سماعت کو بھی چھونے سے رہی
پھر اُسے کیا کسی ٹیلے سے پکارا جائے

کٹ کے ندیوں سی بھریں سوچ انائیں کب تک
کوہساروں سے کسی جھیل میں اترا جائے
خیر دنیا سے سیاست سہی دنیا والی
خود سے جو عہد کیا وہ تو نبھایا جائے

پچھتایا ہوں سر کا بوجھ گرا کر بھی — حیراں ہیں آنکھیں دیوار ہٹا کر بھی
لوگوں کے گھیراؤ سے ڈر کر بھاگا تھا — کانپ گیا ہوں اپنے سامنے آکر بھی
اس دن ایسی سُرخی تھی اخباروں پر — گونگے ہو گئے شہر کے سارے ہاکر بھی
انگلی تھام کے چلنا بھی منظور نہ تھا — کھو گئے بھیڑ میں آگے آگے جا کر بھی

عالی سب انصاف ترازو ٹوٹ چکے
کیا پاؤ گے اب زنجیر ہلا کر بھی

(سقوطِ ڈھاکہ سے متاثر ہو کر کہی گئی)

لب اترے ہے آنکھوں میں انجام تماشہ
اس میلے کا ہر منظر دل تھام تماشہ
بوجھے کون سراب دریچوں چپ نہ پہیلی
کریں یہاں سب اپنا اپنا نام تماشہ
لوگ مداری بھید پٹاری کیا کھلواؤ
کوہوں اونچے دعوے تنکوں خام تماشہ
لب شاخوں سے دیکھ اڑا کر بات کبوتر
پل میں کیسے لگتا ہے الزام تماشہ

شہر میں میرے رستوں کی بے صوت صدا پر
کیا کیا چہروں سج کر نکلا بام تماشہ
آپ تماشائی تو اندھے شیشوں جھانکیں
مفت میں عاؔلی ہو جائے بدنام تماشہ

کیا کیا دلوں کا خوف چھپانا پڑا ہمیں
خود ڈر گئے تو سب کو ڈرانا پڑا ہمیں
اک دوسرے سے بچ کے نکلنا محال تھا
اک دوسرے کو روند کے جانا پڑا ہمیں
اپنے دیئے کو چاند بتانے کے واسطے
بستی کا ہر چراغ بجھانا پڑا ہمیں
شہر انا میں سانحے کیا کیا گزر گئے
کس کس کی سمت ہاتھ بڑھانا پڑا ہمیں
ذیلی حکایتوں میں سبھی لوگ کھو گئے
قصہ تمام پھر سے سنانا پڑا ہمیں

یہ دیوارِ انا اِک دن گرا کر دیکھ لیں گے
تمھارے دِل میں کیا بستے ہیں منظر دیکھ لیں گے
ابھی تو خود بھی اپنے آپ سے ہٹ کر کھڑے ہو
بٹھاتے ہو کسے کس کے برابر دیکھ لیں گے
زمیں پر رینگنے والے قطاروں میں کھڑے ہیں
کسے ملتے ہیں اڑنے کے لیے پر دیکھ لیں گے
پسِ پردہ وہ بھی جو ہر شکل کو پہچانتے ہیں
وہ آئینے کبھی رستوں کے پتھر دیکھ لیں گے
میں دیواروں پہ تصویریں سجانے میں مگن تھا
خبر کیا تھی کہ ویرانے مرا گھر دیکھ لیں گے

○

صدا لگائی جو دل نے دف کے ٹیلوں سے
ورائے دشت گئی درد کے وسیلوں سے

بدل رہا ہے وہ ہر گام راستے پھر بھی
میں اس کے ساتھ چلا آ رہا ہوں میلوں سے

لہو لہو کو بھی پہچاننے سے قاصر ہے
کہ جیسے بھائی بھی ہوں مختلف قبیلوں سے

میں بے جوازِ محبت پہ جان دیتا ہوں
مرے خلوص کو گھائل نہ کر دلیلوں سے

مرے بھی لب پہ تھرکنے لگی ہے سچائی
مرے بھی جسم کی سولی سجاؤ کیلوں سے

اسی گناہ نے رکھا مری قبا کا بھرم
کہ میں نے جس کو چھپایا ہزار حیلوں سے

میں لڑ رہا تھا بڑے اہتمام سے پہلے
بساط اُلٹ گئی عین اختتام سے پہلے

پھر اک جہان ہو چکا ہے مرے تعاقب میں
ملے رہائی مجھے اپنے دام سے پہلے

رموزِ خیمہ زنی یاد تھے تو پھر کیسے
اکھڑ گئی ہیں طنابیں قیام سے پہلے

اسی کے دوش پہ آئے گا سینکڑوں کا لہو
کہ جس نے تیغ نکالی، نیام سے پہلے

یہ کہہ کے پھینک دیئے اہلِ کارواں نے چراغ
ہمیں تو شہر میں ہونا ہے شام سے پہلے

ستار سید

رحمتِ دو جہاں

فنا پذیر زمانے میں زندگی کا نشاں
ترے جمال سے مربوط فکر کا امکاں
ہمیں حصارِ تشدد سے اب رہائی دلا
اے عالمین کے آقا، اے رحمتِ دو جہاں
ترے خیال کے پرتو سے شاد فکرِ رسا
ترے جمال کی حیرت سے آنکھ ہے ترساں
ہمیں بھی تیرے توسط سے ہوں نصیب وہ دن
جب عہدِ جبر میں گونجے محبتوں کی اذاں
خدا کرے تری سنت کی پیروی ہو شعار
خدا کرے کہ ہوں سب مشکلیں ہمیں آساں

کشف اک بن چکا ہے لمحے کا روگ بنا ہے عمروں کا
لوٹ کے اپنی سمت آئے تو، بھید کھلا ہے عمروں کا
لا حاصل مصروفیت میں، کھوئے ہوئے لمحوں میں گم تھے
ختم ہوئی بے سمت مسافت کھوج ملا ہے عمروں کا
نفس نفس بنتی دنیا میں، جگمگ جگمگ مٹتی تہذیبیں
اک بے انت مسلسل لے میں راگ چھڑا ہے عمروں کا

اِک لاحاصل سُکھ کے لوبھ میں، اِک اَن دیکھے سچ کی خاطر
نگر نگر بیکل رُوحوں نے کشٹ سہا ہے عمروں کا
بیتی ہوئی سانسوں کو گِن کر، اپنی عمریں ناپ رہے ہو
یہ جو اپنا جیون ہے نا، پچھتاوا ہے عمروں کا

جگ مگ کرتے دوست رویے ظاہر میں
چھپے ہوئے دشمن عندیے تیور میں
چمک اٹھا صادق صبحوں کا اُجلا پن
گھول دیا سورج نے سونا منظر میں
چڑھی ہوئی موجوں میں تیتے جسموں کے
روگی رُوح کے ڈوبتے غول سمندر میں
سمتوں میں ضم ہوتی سمتوں کے منظر
واپس آتے دائرے اپنے محور میں
کھوجی آنکھ میں عکس نئی دنیاؤں کے
جیسے ہلچل کرتی موجیں ساگر میں

تکتا ہے ہجوم مہ و اختر مری جانب
کھلنے کو ہیں اسرار کے کچھ در مری جانب
الفاظ میں ڈھلنے کی تمناؤں سے مخمور
نگراں ہوئے سب بکھرے منظر مری جانب

سنگساری کا باعث ہوئی بارآوری میری
آتے ہیں ہر اک سمت سے پتھر مری جانب

ماپی نہ گئی اُن سے مرے درد کی وسعت
تکتے ہیں خجل ہو کے سمندر مری جانب

جلوے ہیں اُسی عکسِ منوّر کے فضا میں
دیکھا ہی نہیں جس نے مکرّر مری جانب

اک عرصہ ہوا اُن کو مقفّل ہوتے سیدّ
کھلتے تھے دریچے وہ جو اکثر مری جانب

یہ گنبدِ دل، موردِ دستک ہوا کیسے
اس سمت گزر تیرا اچانک ہوا کیسے

عاری ہوئے مفہوم سے سب رنگ دفا کے
یہ چہرۂ معصوم بھیانک ہوا کیسے

بنجر ہوئے اذہان بھی کھیتوں کیطرح کیوں
اس قحط کا پھیلاؤ وہاں تک ہوا کیسے

وابستۂ امید تھے وحشت زدگی میں
پیدا سرِ آفاقِ یقیں شک ہوا کیسے

رگ رگ میں اترتا ہوا خوں جذبۂ صادق
اک پائے شکستہ تھا میں انتھک ہوا کیسے

تو نے تو کبھی بھول کے سچ بات نہ کی تھی
سچ بولنا یک دم ترا مسلک ہوا کیسے

تکتا ہے مری سمت عجب دُکھ بھری نظریں
مانوس مرے غم سے یہ بالک ہوا کیسے

قحطِ آواز میں میٹھی باتوں کا رس، کان میں گھولیئے
شہرِ لب بستہ ہے منتظر آپ کا، بولیئے! بولیئے!

اپنے اپنے گھروں میں مقفل مکیں، گھٹ کے مرنے لگے
ہر طرف سے ہوا دستکیں دے رہی ہے کہ در کھولیے
تیرے وعدوں کے موسم، رہیں نہ رہیں، اب ہمیں اس سے کیا
چند موہوم خوشیوں کی ترغیب نے درد بھی کھو لیے
اے مرے جسم کے رنگِ خاکستری! اب کے تو بھی اتر
دیکھ! بارش میں پھولوں کی افواج نے جسم بھی دھو لیے
یہ دیارِ تہی دامناں ہے، یہاں اپنی مرضی کہاں
جس طرف بے ارادہ ہوا چل پڑی، اس طرف ہو لیے

کنواری خوشبو ہے میرے لفظوں کے آنگنوں میں
سلگ رہا ہوں مثالِ صندل، بجھے دلوں میں
کوئی شجر جھومنا نہ چاہے، عجیب رُت ہے
ہوائیں نوحہ کناں ہیں سنسان بستیوں میں
نگاہ رنگوں کو، ذہن خوشبو کو ڈھونڈتا ہے
گھرا ہوا ہوں عجیب منحوس موسموں میں
زمیں پہ پانی نہیں ہے، آتش برس رہی ہے
دُبک کے بیٹھے ہوئے ہو کیوں اپنے مسکنوں میں؟
تمھاری آنکھوں میں رتجگوں کے گلاب منتظر!
مقام کتنا کڑا ہے میری مسافتوں میں
کھڑا ہوں تنہا، خزاں زدہ پیڑ کی طرح میں
کوئی بھی پتہ نہ پورا اترا رفاقتوں میں
جو تیرے ہمراہ خواب بنتے ہوئے کٹی تھیں
میں جی رہا ہوں انہیں دلآویز ساعتوں میں

○

ڈوب گئے ہیں شام کی دُھند میں مسکن میرے
سُونے ہو گئے دِل کی صورت، آنگن میرے

میری سمت ہمکتے بادل، رو کنے والو!
پھوٹ گئے مری آنکھوں ہی سے ساون میرے

مٹی پاؤں سے چمٹے منظر رستہ روکیں
میری مسافت میں حائل ہیں بندھن میرے

تم بن اچھی رُتوں نے بھی مُنہ پھیر لیا ہے
خوشبوؤں رنگوں کو ترسیں گُلشن میرے

میرے کھوج میں آنے والو! بھُول نہ جانا
پیاسی آنکھ کے صحراؤں میں مسکن میرے

بادل بادل پیاس بجھانے نکلا ہوں میں
کہاں کہاں مرا کھوج لگائیں ساجن میرے

پھول کو ترسیلِ خوشبو کی صلاحیت ملے
لفظ کو آواز میں ڈھلنے کی تربیت ملے

ہم فروزاں ہوں سرِ عرشِ وفا جیب تم اُٹھو
شب کی پہنائی میں تم کو دِن سی کیفیت ملے

خوشبوؤں، رنگوں میں ڈھل جائیں ہواؤں میں اُڑیں
آنکھ کو ٹھہرے ہوئے پانی کی محویت ملے

کب کھُلیں پیہم سکوں کے امن کے آنکھوں کی اور
کب ہمیں منظر کی ٹوٹ ریزی سے بریت ملے

کر لیا حائل زمانہ رابطوں کے درمیاں
کس طرح اِک دوسرے کی خیر و عافیت ملے
بر سرِ پیکار ہیں دونوں محاذوں پہ ہمیں
چاہتے ہیں دونوں جانب خیر و عافیت سے ملے

بامِ فلک پر صبح ہنسی اور آنگن جاگے
جیسے تیرے دھیان کی شکتی سے مَن جاگے
رُت بدلی اور مہک اُٹھے آموں کے سائے
جیسے ہریالی کی اوٹ سے ساون جاگے
جوشِ نمو سے بانجھ زمین نے لی انگڑائی
جیسے آنکھ میں سپنے لے کر "دلہن" جاگے
رستہ تکتے آنکھیں ہار گئیں تو کیا
سوئے ہوئے جسموں میں دِل کی دھڑکن جاگے
موسمِ گل میں اذنِ نمو دے ، پیڑوں کو
خوشبو پھیلے ، پنچھی چہکیں ، گلشن جاگے
گلی گلی زنجیریں چھنکیں پاؤں کی
لیے ہوئے متغیر چہرے ، روزن جاگے

تنقید

عسکری اور حالی

سلیم احمد

اُردو ادب حالی کے وقت سے "پیروئی مغربی" کی راہ میں پاکوبی کر رہا ہے۔ خود عسکری صاحب نے اپنے سفر کا آغاز ایک ایسے وقت میں کیا تھا جب ہمارا ادب اس کی راہ کی کئی منزلیں طے کر چکا تھا۔ وہ ایک ایسی ادبی تحریک سے وابستہ تھے جو اُردو میں ایک ایسا ادب پیدا کرنے کے درپے تھی جس کا ہمارے پرانے ادب کی روایت سے کوئی تعلق نہ ہو اور جو ہر طرح مغربی ادب کے نمونے کے مطابق ہو۔ عسکری صاحب نہ صرف اس تحریک میں شامل تھے بلکہ اس کے اماموں میں شمار ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ عسکری صاحب کی ایک اور حیثیت بھی ہے۔ وہ کہنے کو تو سب کے ساتھ چلے تھے مگر اپنے ابتدائی سفر ہی میں دوسروں سے اتنے آگے تھے کہ ان کے ساتھ کسی دوسرے کا نام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ بعد میں تو وہ پیشقدمی کر کے اتنی دور نکل گئے کہ اردو ادب کو ان کے نقش قدم گننے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں رہا۔ اس لئے پیروئ مغربی کے بارے میں عسکری صاحب کی رائے کسی ساحل کے تماشائی کی رائے نہیں بلکہ ایک ایسے تیرنے والے کی جو مغرب کی تہہ کا حال سب سے زیادہ جانتا ہے۔

لیکن پیروئ مغربی کا مسئلہ صرف ادب کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم زندگی میں بھی اسی راستے پر چل رہے ہیں اس لئے عسکری صاحب کے سفر کی معنویت صرف ادبی نہیں ہے، وہ ہمیں زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں عسکری صاحب کے سفر کو سمجھنے کی ذمہ داری صرف ادیبوں پر نہیں ہے بلکہ حکمران، سیاستدان، مذہبی رہنما اور سماجی مصلحین سب کو اس سفر کے معنیٰ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ عسکری صاحب کو سمجھے بغیر ہم ادب تو کیا زندگی میں بھی ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں گے۔

میں نے اپنی بات کا آغاز مولانا حالی کے ذکر سے کیا ہے۔ مولانا حالی کے معنیٰ ہیں سرسید تحریک۔ یہ تحریک ہماری تاریخ میں ایک نیا عہد نامہ لے کر پیدا ہوئی، وہ عہد نامہ جو ہمیں مذہب، اخلاق، سیاست، معاشرت، غرضیکہ پوری زندگی میں ایک انقلاب عظیم کی بشارت دیتا ہے، سو سال

سے ہم اسی عہد نامہ کی روشنی میں زندہ رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم یہ پوری صداقت نہیں۔ پوری صداقت کے لئے ہمیں یہ بات بھی کہنی پڑے گی کہ ہماری تاریخ میں ایسی قوتوں کا عمل بھی جاری ہے جو ہمارے اس سفر کی راہ کھوٹی کرتی رہتی ہیں جیلہ وہ ہمیں اندر اور باہر سے پوری طرح مغربی ہونے سے روکتی ہیں۔ ان دو قوتوں کے تصادم سے ہم ایک کھینچا تانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ہم سے پیچھے لوٹا جاتا ہے نہ آگے بڑھا جاتا ہے۔ بقول غالب "کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے"۔ اور کعبہ اور کلیسا کی اس جنگ میں نہ پورے مغربی بن پاتے ہیں نہ پورے مشرقی۔ بالفرض ہمیں مغرب کی طرف بڑھنا ہی ہے تب بھی ہمیں اس کشمکش کو سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے بغیر ہم پیروئی مغربی کی راہ پر بھی نہیں چل سکتے۔ عسکری صاحب کا سفرنامہ اسی منزل پر ہمارے کام آتا ہے۔

جو قوتیں ہمیں روکنے کی کوشش کرتی ہیں ان میں غالباً مذہب سرفہرست ہے۔ لیکن یہ بات بھی اختلاف سے خالی نہیں۔ کیونکہ سر سید کے بعد سے جو مذہب پیدا ہوا ہے وہ تو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ مذہب نہ صرف تبدیلی سے روکتا نہیں بلکہ تبدیلی کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اس لئے ہمیں یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ جب ہم مذہب کہتے ہیں تو اس سے ہماری کیا مراد ہوتی ہے وہ مذہب جو غلط یا صحیح سر سید سے پہلے موجود تھا یا وہ مذہب جو سر سید کے بعد پیدا ہوا۔ یہی سوال زندگی کے سارے تصورات کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ کچھ تصورات ہمیں روکنے والے ہیں کچھ آگے بڑھانے والے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ہم کن تصورات کے ساتھ ہیں اور دونوں میں کیا فرق ہے۔ عسکری صاحب نے ان سب مسائل پر روشنی ڈالی ہے مگر ان کا بنیادی حوالہ ادب ہے، اس لئے ہم ان کی مدد سے یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ مشرق و مغرب کی اس آویزش میں ہمارے ادب پر کیا گزری ہے اور اب کیا گزرنے والی ہے۔

"مشرق و مغرب کی آویزش اردو ادب میں" کے عنوان سے مضمون لکھتے ہوئے عسکری صاحب ہمیں بتاتے ہیں کہ مشرق و مغرب کی کشمکش نے ہمارے ہاں تین گروہ پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک گروہ دل و جان سے پیروئی مغربی کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا گروہ مشرقی ادب کی روح کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ تیسرا گروہ نہ یہ چاہتا ہے نہ وہ بلکہ دونوں کے امتزاج کا قائل ہے۔ آپ چاہیں تو ان تینوں گروہوں کا نقطہ نظر زندگی کے مختلف شعبوں میں بھی تلاش کر سکتے ہیں ہمارے ہاں وہ لوگ بھی ہیں جو پوری طرح مغربی بن جانا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو قدیم مشرقی روش پر قائم رہنا چاہتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان وہ بھی جو نہ کعبہ کی طرف جانا چاہتے ہیں نہ کلیسا کی طرف بلکہ دونوں کے ملاپ کا خواب دیکھتے ہیں یہ تیسرا گروہ وہ ہے

جس کا نعرہ بقول عسکری صاحب یہ ہے " نہ مشرق کو سمجھو نہ مغرب کو۔ بس کھسکے چلو"۔ اب ادب اور زندگی میں تین گروہ ہو گئے۔ ایک مغرب کی طرف بھاگنے والے۔ دوسرے مغرب سے رکنے والے۔ تیسرے بھاگنے والے نہ رکنے والے بس کھسکنے والے۔ ہم جیسے لوگوں کا شمار اسی تیسرے گروہ میں ہوتا ہے۔

اب ان تینوں گروہوں کے پیش نظر سوال کی صورت یہ بنتی ہے۔

کیا ہمارے لئے پورا مغربی بن جانا ممکن ہے۔

کیا ہمارے لئے پوری مشرقیت پر قائم رہنا ممکن ہے۔

کیا مشرقیت و مغربیت کا امتزاج ممکن ہے۔

عسکری صاحب کا مضمون چونکہ ادب سے تعلق رکھتا ہے اس لئے یہ سوال اس طرح بھی کئے جا سکتے ہیں۔

کیا ہم مکمل طور پر مغربی ادب پیدا کر سکتے ہیں۔

کیا ہم مکمل طور پر مشرقی ادب کی روح کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔

کیا مشرق اور مغرب کے امتزاج سے کسی طرح کا ادب پیدا کیا جا سکتا ہے۔

عسکری صاحب نے اپنے مضمون میں ان تینوں سوالوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ایسی باتیں کہی ہیں جو صرف عسکری صاحب ہی کہہ سکتے تھے۔ پہلے امتزاج کی بات کو لیجئے عسکری صاحب کہتے ہیں کہ امتزاج کی بات ہی مہمل ہے کیونکہ امتزاج دو ایسی چیزوں کا ہو سکتا ہے جن میں چند بنیادی باتیں مشترک ہوں، لیکن حقیقت کا مشرقی تصور اور مغربی تصور اتنی متضاد چیزیں ہیں کہ اگر مشرقی تصور صحیح ہے تو مغربی بالکل غلط ہے اور مغربی تصور درست ہے تو مشرقی بالکل غلط ہے۔ اس لئے ان دونوں میں سے ایک وقت میں صرف ایک ہی تصور اختیار کیا جا سکتا ہے۔ عسکری صاحب کی یہ بات اتنی قطعی اور دو ٹوک ہے کہ اس کے بعد کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ ادب میں تو جو کچھ ہو رہا ہے ہو رہا ہے زندگی میں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں مغربیت جتنی زیادہ آتی جاتی ہے مشرقیت غائب ہوتی جاتی ہے۔ یعنی ہم بھاگ کر نہ سہی کھسکنے میں بھی آہستہ آہستہ مغرب ہی کی طرف کھسکتے ہیں۔ اب دوسرا سوال یہ ہے کہ جب کھسک کھسک کر بھی ادھر ہی جانا ہے تو بھاگ کر کیوں نہ چلے جائیں۔ عسکری صاحب کا جواب یہ ہے کہ "اگر ہم نے مغربی ادب کے موجودہ اور غالب رجحانات کی پیروی کی تو ہم زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکیں گے کہ مغرب جیسا ادب پیدا کر چکا ہے اس کی ایک نقل ہم بھی تیار کر دیں"۔ کچھ نہ کرنے سے نقل نویسی بہتر ہے۔ اس لئے اس میں بھی کیا حرج ہے۔ مگر عسکری صاحب اگلی بات کہہ کر قصہ پاک کر دیتے ہیں۔ وہ اگلی بات یہ ہے "جب مغربی ادب اپنی فطری موت مرے تو اس کے تھوڑے دن بعد ہمارا ادب بھی مر جائے"۔ اب اس بات کو زندگی پر منطبق کریں تو اس کے اور بھیانک نتائج

برآمد ہوتے ہیں۔ ہم مغرب کی طرف نئی زندگی کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ لیکن مغرب خود موت کے گرداب میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جوں جوں مغربیت میں مبتلا ہوتے جائیں گے توں توں ہمارے اندر وہ سارے امراض سرایت کرتے جائیں گے جنہوں نے مغرب کو نیم جان کر رکھا ہے۔ اور انجام یہ نکلے گا کہ مولانا حالیؔ کی توقع کے برعکس ہم مغرب سے نئی زندگی حاصل کرنے کے بجائے اس کے ساتھ ہی فنا ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ انجام کسی کو بھی قبول نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آیئے تیسرے امکان پر غور کریں کیا ہم ادب میں مشرقی روح کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ عسکری صاحب کہتے ہیں کہ ہاں یہ ممکن ہے۔ "لیکن اس کے لئے آپ کو ان تمام چیزوں سے کنارہ کش ہونا پڑے گا جنہیں مغرب کی ترقی کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔" اس جملے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہمیں وہ تمام باتیں چھوڑنی پڑیں گی جو پیروی مغربی کے ذریعے ہمارے اندر داخل ہوئی ہیں آپ جانتے ہیں کہ زندگی میں ان چیزوں کے کیا معنی ہیں، سائنس ٹیکنالوجی، نئی تعلیم، نئے سیاسی اور سماجی ادارے۔ یعنی ہر وہ چیز جو پیروی مغربی کے بعد ہمارے معاشرے میں آئی ہے۔

آپ کہیں گے عسکری صاحب نے تو ڈرا دیا۔

لیکن اگر ڈرنا ورنا چھوڑ کر آنکھیں کھول کر دیکھیں تو عسکری صاحب کے تصورات اتنے نئے بھی نہیں ہیں۔ جہاں تک مغرب کی موت کا تعلق ہے مغرب والے خود اس کا روز اعلان کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اقبال کہہ چکے ہیں۔ فرنگ رہ گزر سیل بے پناہ میں ہے۔ بلکہ اب تو اخبار نویس تک روز مغرب کی موت کی پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ اب رہ گئی مغرب کی ہر چیز کو رد کرنے کی بات تو یہ بھی پرانی بات ہے۔ سرسید تحریک میں جب پیروی مغرب کا چکر چلا اس وقت مسلمانوں کا عام رویہ یہی تھا کہ مغرب کی کسی چیز کو قبول نہیں کرنا چاہئے اور ایسے طاقتور اور با اثر علمائے کرام بھی موجود تھے جو مذہبی بنیاد پر مغرب کی ہر چیز کو رد کرنا چاہتے تھے اب بھی ایسے عالمان دین موجود ہیں جو اس نقطۂ نظر پر قائم ہیں۔ البتہ عسکری صاحب نے تیسری بات ایسی کہہ دی ہے جس سے ہمیں صدمہ پہنچ سکتا ہے۔ حالیؔ نے کہا تھا کہ جو اچھی چیز جہاں سے ملے لے لو۔ اس اصول پر ہم نے مشرق اور مغرب کی اچھی اچھی باتیں بزعم خود جمع کر لی ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ اب اس امتزاج کے ذریعے ہماری مشرقیت بھی محفوظ ہے اور ہم مغرب سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ عسکری صاحب جب امتزاج کی بات کو رد کرتے ہیں تو حالی سے غلام احمد پرویز تک سب کی جڑ کٹ جاتی ہے اور ساتھ ہی ہماری بھی۔ ہماری عافیت کے قلعے پر حملہ کر کے عسکری صاحب ہمیں نہتا چھوڑ دیتے ہیں۔

اچھا تو اب ہماری مجموعی صورت حال یہ ہے۔

ہم مغربی نہیں اور مغربی ادب پیدا کریں تو انجام موت

ہم مذکورہ صورت حال کی روشنی میں مشرقی رہنا چاہیں اور مشرقی ادب پیدا کریں تو ناممکن ہم مغرب کو رد کر کے اس مشرق کی طرف لوٹنا چاہیں جو پیروی مغرب سے پہلے تھا تو راستہ بند یا اللہ پھر کیا کریں ؟

میں نے یہ سوال عسکری صاحب کی زندگی میں ان سے پوچھا تھا۔ زبانی بھی اور تحریری بھی۔ تحریری کا تو انہوں نے جواب نہیں دیا۔ لیکن زبانی کہا تھا " نماز پڑھو " مغرب نے ہمارے عقیدے خراب کر دیئے، مغرب نے ہمارا اخلاق خراب کر دیا۔ مغرب نے ہماری معاشرت خراب کر دی۔ معلوم نہیں اتنی بہت سی خرابیوں میں ہماری نماز بھی ٹھیک ہوتی ہے یا نہیں ؟

دیکھئے وہ سوال جو ادب سے شروع ہوا تھا وہ اب کہاں پہونچا ؟

عسکری صاحب نے یوں تو زندگی بھر سوال اٹھائے تھے مگر آخر میں ایک سوال ایسا اٹھا دیا جس کا جواب خود ان کے پاس نہ تھا۔ شائد کسی کے پاس بھی نہیں ! لیکن ٹھہریئے اس نتیجے پر پہنچنے سے پہلے عسکری صاحب کے تصور روایت کو ایک نظر دیکھ لیجئے۔

محمد حسن عسکری کا تصورِ روایت

سلیم احمد

مشرق اور مغرب کی بحث میں عسکری صاحب ایک لفظ بار بار استعمال کرتے ہیں۔ روایت۔ چونکہ یہ لفظ دوسرے لوگ بھی استعمال کرتے ہیں اس لئے یہ دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ کس جگہ یہ لفظ کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ جہاں تک دوسروں کے ہاں اس کے لفظ کے استعمال کا تعلق ہے بقول عسکری صاحب وہ اسے ایک طرح کی عادت کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں یعنی کوئی ایسا کام جسے کوئی گروہ سو دو سو سال سے کرتا آیا ہو بلکہ بعض جگہ تو سو دو سو سال کی بات بھی ضروری نہیں رہتی۔ پندرہ پندرہ بیس بیس سال میں بھی روایتیں بنتی اور بگڑتی ہیں اور ہم جدت کی روایت، بغاوت کی روایت، یہاں تک کہ روایت کی نفی کی روایت جیسے جملے بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان معنوں میں روایتیں ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد بھی ہو سکتی ہیں اور نئی اور پرانی بھی۔ پھر روایت کا لفظ زندگی کی مختلف سرگرمیوں کے بارے میں الگ الگ استعمال ہوتا ہے مثلاً ادب کی روایت، فن کی روایت وغیرہ۔ اور ان کے درمیان لازمی طور پر کوئی بات مشترک نہیں ہوتی۔ سب روایتیں ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ وجود رکھتی ہیں اور ایک کا دوسرے سے کوئی لازمی تعلق نہیں ہوتا۔ عسکری صاحب روایت کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں کرتے۔ ان کے ہاں روایت کے معنی عادت نہیں بلکہ وہ چیز جس کا تعلق مابعد الطبیعاتی اصولوں سے ہو۔ ان مابعد الطبیعاتی اصولوں سے حقیقت کا ایک مخصوص تصور وابستہ ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ حقیقت کا یہ تصور چونکہ ہر جگہ ایک ہے اس لئے اصلی اور بنیادی روایت بھی ایک ہے۔ اس میں نہ اختلاف ہو سکتا ہے نہ تضاد نہ وہ نئی ہو سکتی ہے نہ پرانی۔ البتہ حقیقت کا یہ تصور چونکہ مختلف زمانوں اور مقامات پر انسانی ضروریات کے تحت مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے ایک اضافی معنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ روایت کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں اسی طرح انسانی سرگرمیوں کے نقطہ نظر سے بنیادی اور مرکزی روایت مختلف کاموں میں مختلف طور پہ ظاہر ہوتی ہے اس لئے یہاں بھی اضافی طور پہ ادب کی روایت یا فن کی روایت کہا جا سکتا ہے لیکن چونکہ یہ روایتیں ایک ہی بنیادی روایت کا حصہ ہوتی ہیں اور اسی کے ذریعے وجود میں آتی ہیں اس لئے اس مرکزی روایت سے سوا کسی اور طرح کی روایت کا تصور

نہیں کیا جا سکتا۔ اب عسکری صاحب کے نزدیک حقیقت کا وہ تصور جو روایت کی بنیاد ہے ہر روایتی تہذیب میں موجود ہوتا ہے، حقیقت کا یہ تصور کیا ہے، عسکری صاحب نے اسے کسی قدر مکمل وضاحت سے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس تصور کے مطابق حقیقت کے کئی درجے ہیں لیکن یہ تمام درجے ایک بنیادی حقیقت کے اندر سے نکلے ہیں اور اسی کی بدولت وجود رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دراصل حقیقت وہی ایک ہے باقی سب اس کے ظہور کی مختلف شکلیں ہیں اب یہ بنیادی حقیقت ہر قسم کے تعینات سے ماوراء ہے۔ ظہور کے دائرے سے بھی ارپہ ہے اس لئے الفاظ میں اس کا بیان بھی نہیں ہو سکتا۔ ظہور کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اس حقیقت کے چار درجے ہیں۔ ایک تو وہ درجہ ہے جسے منفی طریقۂ کار کے علاوہ کسی طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ منفی طریقۂ کار کے معنی یہ ہیں کہ تعینات کے بارے میں ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں اس میں "نہیں" لگاتے چلے جائیں۔ یہ درجہ لاہوت کا ہے۔ اس کے بعد ظہور کا وہ درجہ ہے جس میں ہیت یا شکل کوئی نہیں ہوتی لیکن ہم تعینات کے قریب آنے لگتے ہیں۔ یہ عالم جبروت ہوا۔ اس کے بعد سب کا نمبر آتا ہے جس کے دو درجے ہیں ایک تو ظہور لطیف ہے یعنی عالم ملکوت۔ اور پھر ظہور کثیف یعنی عالم ناسوت۔ عسکری صاحب کہتے ہیں کہ حقیقت کے ان درجات کو سمجھانے کے لئے مشرق کی سب تہذیبوں میں ایک اقلیدسی شکل اختیار کی گئی ہے، پہلے تو ایک بڑا دائرہ ہے۔ اس کے اندر ایک چھوٹا دائرہ۔ اس کے اندر ایک چھوٹا دائرہ۔ یہاں تک کہ مرکز کا ایک نقطہ باقی رہ جاتا ہے۔ یہ نقطہ اور سب سے بڑا دائرہ دونوں ایک ہی چیز ہیں ایک طرف تو یہ سارے دائرے بڑے دائرے کے اندر محدود ہیں دوسری طرف مرکز کے بغیر دائرے وجود میں نہیں آ سکتے تھے اس سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ہم حقیقت کو دائروں اور درجوں میں تو بانٹ سکتے ہیں لیکن فی الاصل حقیقت ایک ہے۔ تمام روایتی تہذیبوں میں حقیقت کا یہ تصور قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے عسکری صاحب نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے نزدیک روایتی تہذیبیں کون کون سی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ کی عظیم ترین اور مکمل ترین روایتی تہذیبیں تین ہیں، چینی، ہندو اور اسلامی۔ یونانی، یہودی اور ازمنہ وسطیٰ کی عیسوی تہذیبیں روائتی تہذیبیں تو ہیں مگر یا مکمل ان تمام تہذیبوں میں حقیقت کا تصور ایک ہے۔ اور مشترک طور پر سب میں موجود ہے۔ لیکن ان تہذیبوں میں ایک فرق بھی ہے۔ اس فرق کو سمجھنے کے لئے ہمیں روایت اور مذہب کے فرق کو سمجھنا پڑے گا۔

روایت کیا ہے اس کی تعریف ہم نے کر دی۔ اب ضروری ہے کہ مذہب کی بھی تعریف کی جائے۔
عسکری صاحب کہتے ہیں "اگر ہم مذہب کے لفظ کو مبہم معنوں میں یا حالی فضا پیدا کرنے کے لئے استعمال کریں بلکہ اسے ٹھوس معنی دیں تو وہ تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اعتقادات، اخلاقیات اور ان سب میں جذبہ کی آمیزش اب ان معنوں میں مذہب نہ تو چینیوں کے ہاں وجود رکھتا ہے نہ ہندوؤں کے یہاں۔ البتہ اسلام اور عیسائیت مذہب

کے دائرے میں آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روایت مذہبی بھی ہوتی اور غیر مذہبی بھی۔ چینیوں اور ہندوؤں میں روایت ہے مگر مذہب نہیں ہے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں روایت مذہب کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس بات سے ان تمام روایتی تہذیبوں کے بارے میں بڑے بڑے نتائج پیدا ہوتے ہیں جن میں سے کئی عسکری صاحب کے مضامین میں زیر بحث آئے ہیں لیکن ہم چونکہ روایت کے نقطۂ نظر سے مشرق و مغرب کے فرق پر غور کر رہے ہیں اس لئے ان مسائل کو چھیڑنے کے بجائے اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ وضاحت کیا ہے۔ مشرق کی کون کون سی تہذیبیں مکمل طور پر روایتی ہیں اور کون کون سی روایتی تو ہیں مگر نامکمل۔ اور روایتی ہونے کے باوجود ان میں کیا فرق ہے اسے ہم نے مختصر طور پر بیان کر دیا ہے۔ اب ان تمام روایتی تہذیبوں کے مقابلہ پر مغرب کی موجودہ تہذیب مکمل طور پر غیر روایتی تہذیب ہے کیونکہ اس کا تعلق حقیقت کے روایتی تصور سے نہیں ہے یہ تہذیب کیسے پیدا ہوئی اور اپنی پیدائش سے اب تک کن مراحل سے گذری عسکری صاحب نے اس پر بھی کچھ روشنی ڈالی ہے۔ ان کا کہنا ہے ازمنۂ وسطیٰ میں حقیقت کے متعلق مغرب کا تصور بھی وہی تھا جو مشرق کا۔ لیکن مغرب کے لوگ ازمنۂ وسطیٰ میں بھی اس تصور کو پوری وضاحت کے ساتھ نہیں سمجھ سکتے۔ دوسرا فرق یہ تھا کہ مشرق میں حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے عقل محض۔ اور مغرب پر جذبہ حاوی تھا۔ لیکن اس فرق کے باوجود ان کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف نہیں تھا۔ بنیادی اختلاف اس وقت پیدا ہوا۔ جب مغرب نے نشاۃ ثانیہ کے دور میں حقیقت کے مشرقی تصور کو چھوڑنا شروع کیا۔ عسکری صاحب کہتے ہیں کہ نشاۃ ثانیہ کے دور میں نہ صرف یورپ بلکہ انسانیت کی تاریخ میں جو بالکل نئی بات رونما ہوئی وہ یہ تھی کہ حقیقت کا دائرہ صرف مادی دنیا تک محدود کر دیا گیا، پہلے تو لوگوں نے صرف اتنا کیا کہ مادی دنیا سے آگے بھی اگر کوئی حقیقت ہے تو اس کے بارے میں پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ انیسویں صدی سے مغرب نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مادی دنیا سے آگے کوئی حقیقت ہوتی ہی نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرا خیال یہ پیدا ہوا کہ ہمیں ہر بات پر صرف انسان کے نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیے۔ خدا کے نقطۂ نظر سے نہیں۔ نتیجہ عسکری صاحب کے الفاظ میں یہ نکلا کہ "مادی دنیا اور انسان کو آخری یا اہم ترین حقیقت سمجھنے کی وجہ سے مغربی تہذیب مدارج حقیقت کے اعتبار سے نیچے ہی اترتی چلی گئی اور غیر انسانی مادہ تک پہنچ کر اپنے روح، خدا، انسان اور حیات کو بھی رد کر رہی ہے"۔ مشرق اور مغرب کے اس فرق کی روشنی میں مشرق اور مغرب کی آویزش دراصل روایت اور غیر روایت کی آویزش ہے۔

اب جیسا کہ عسکری صاحب نے کہا ہے یہ صورت حال پوری انسانی تاریخ میں ایک نئی صورت حال ہے۔ روایتی تہذیبیں پوری انسانی تاریخ میں ایک طرف ہیں، موجودہ مغربی تہذیب دوسری طرف۔ جس کے معنی یہ نکلے ہیں کہ موجودہ مغربی تہذیب انسانی تاریخ میں ایک ایسی چیز ہے جس کا تاریخ کے کسی اور دور

سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے مشرق اور مغرب کے اختلافات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے ہم پوری انسانی تاریخ کو لے کر یہ دیکھیں کہ مغرب میں جو صورت حال پیدا ہوئی اس کی وجہ کیا ہے اور پوری انسانی تاریخ کے پس منظر میں اس کے کیا معنی ہیں۔

ہم نے اپنے پچھلے مضمون میں تین سوال اٹھائے تھے۔

کیا مشرق کو قائم رکھا جا سکتا ہے۔

کیا مغرب کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

کیا دونوں کا امتزاج ممکن ہے۔

تاریخ کے نقطۂ نظر سے یہ تینوں سوال ایک سوال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ روایتی تہذیبیں تاریخ کا کیا تصور رکھتی ہیں۔ اور تاریخ کے اس تصور کی روشنی میں موجودہ مغربی تہذیب کے کیا معنی ہیں؟

افسوس کہ عسکری صاحب نے اپنے مضامین میں اس سوال پر کوئی روشنی نہیں ڈالی لیکن عسکری صاحب کے شیخ عبدالواحد یحییٰ (رینے گینوں) نے اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور دراصل عسکری صاحب کے خیالات کو سمجھنے کے لئے رینے گینوں کے ان تصورات کا مطالعہ کرنا از بس ضروری ہے۔ چنانچہ آیئے رینے گینوں کی روشنی میں تاریخ کے اس مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

حقیقت کا تصور ایک ہونے کی وجہ سے روایتی تہذیبوں میں تاریخ کا تصور بھی مختلف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کوئی حرج نہیں ہے اگر ہم اس مسئلہ کو کسی بھی روایتی تہذیب کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کریں۔ رینے گینوں نے یہ کام ہند و تہذیب کے ذریعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہند و ظہور کے ایک مکمل دائرہ کو جسے وہ من ونترا کہتے ہیں چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ست یگ، پرا پت یگ، دوراپت یگ اور کل یگ، ست یگ سب سے پہلے آتا ہے اور یہ سب سے اچھا زمانہ ہوتا ہے کیونکہ اس میں حقیقت کا عرفان سب کو مکمل طور پر حاصل ہوتا ہے۔ پرایت یگ میں حقیقت پوشیدہ ہونا شروع ہو جاتی ہے اور اس کا عرفان ہر ایک کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ دوارپت یگ میں حقیقت اور زیادہ چھپ جاتی ہے۔ اور اس کا عرفان مشکل تر ہو جاتا ہے۔ آخر میں کل یگ آجاتا ہے جب حقیقت کا عرفان بہت ہی زیادہ دشوار ہو جاتا ہے اور آخر میں بالکل ہی غائب ہو جاتا ہے۔ حقیقت کے عرفان کے ساتھ لوگوں کے اعمال میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور ست یگ کا خیر محض کل یگ کے شر محض میں بدل جاتا ہے۔ یہ چاروں دور ظہور کے دائرہ کی تکمیل کے ضروری اجزا ہیں۔ پھر جب ایک دائرہ مکمل ہو جاتا ہے۔ تو کل یگ کے بعد جو حقیقت بالکل چھپ گئی تھی ایک بار پھر ظاہر ہو جاتی ہے اور ظہور کا دوسرا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ اب رینے گینوں کے مطابق

مغرب کی موجودہ تہذیب کل یگ کے آخری دور کی تہذیب ہے۔ ساری روایتی تہذیبیں ایک ایسے وقت کی پیش گوئی کرتی ہیں جب دنیا سے روشنی بالکل غائب ہو جائے گی اور صرف اندھیرا باقی رہ جائے گا۔ موجودہ مغربی تہذیب اس اندھیرے کی تہذیب ہے اور علامتی طور پر مشرق کے مقابلہ پر اس سمت کو ظاہر کرتی ہے جس سمت میں سورج غروب ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ کے اس تصور کے مطابق مغربی تہذیب کی پیدائش تاریخ کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اور اسے کسی طرح روکا نہیں جا سکتا۔ اس کا ظہور اسی طرح ضروری ہے جس طرح ست یگ کا ظہور۔ اب سوال یہ ہے کہ جب یہ صورت حال لازمی ہے تو اس کے بارے میں ہمارا رویہ کیا ہو؟ رینے گینوں کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب سے لڑنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ جو کام ہم کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ مشرق اور مغرب اور روایت اور غیر روایت کے فرق کو سمجھ لیں اور حقیقت کے روایتی تصور کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنے کی کوشش کریں۔ یہ کوشش ایک خاص وجہ سے بہت ضروری ہے۔ رینے گینوں کا کہنا ہے کہ غیر روایت اتنی کمزور چیز ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس وقت تک قائم نہیں رکھ سکتی جب تک روایت کے کچھ اجزا اپنے اندر شامل نہ کرے۔ مذہبی انداز میں یوں کہنا چاہیئے کہ غیر روایت باطل ہے۔ اور روایت حق۔ باطل کی حقیقت باطل ہے اس لئے باطل باطل کی حیثیت سے کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ باطل کا قائم رہنا صرف اس وقت ممکن ہے جب اس میں حق کی تھوڑی بہت آمیزش کی گئی ہو چنانچہ باطل اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لئے حق کا سہارا لیتا ہے اب رینے گینوں کے نزدیک باطل کو شکست دینے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ حق کو باطل سے الگ کر دیا جائے۔ کل یگ کے آخری دور میں سب سے بڑا انسانی فریضہ حق و باطل کے التباس کو دور کرنا ہے۔ رینے گینوں کہتے ہیں کہ مشرق و مغرب کو اس طرح سمجھ کر ہم اس وقت کی تیاری کر سکتے ہیں جب کل یگ ختم ہو کر ظہور کا نیا دائرہ شروع ہوگا۔ اب ہمارے تینوں سوالوں کا جواب ایک ہے۔ مغرب کو اختیار کرنا باطل کو اختیار کرنا ہے۔ دونوں کی آمیزش کے معنی حق اور باطل کو ملانا ہے جو باطل کا کام ہے۔ مشرق کو قائم رکھنے کے معنی حق کو حق سمجھنا اور باطل کو باطل سمجھنا اور دونوں کے التباس کو دور کرنا ہے۔ عسکری صاحب کو رینے گینوں کا یہ جواب معلوم تھا اس لئے عسکری صاحب کے اس دور کا مقدمہ صرف اتنا ہے۔ حق اور باطل کے امتزاج کی ہر شکل کو رد کرنا۔ عسکری صاحب کے آخری دور کے تمام مضامین کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔[1]

---

[1] اردو کی ادبی روایت سے متعلق ان کا مضمون اور ان کے دو آخری مضامین جو تبصروں کی شکل میں شائع ہوئے اسی کام کا آغاز تھے۔

اقبال اور سرزمین پاکستان

فتح محمد ملک

وطنی قومیت کے سیاسی تصور کی تردید کو حبِ وطن کی نفی اور ہندی مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطۂ زمین کے حصول کی تمنا کو "زمین کی تذلیل" قرار دینا اقبالیات کے باب میں خطرناک ترین فکری مغالطہ ہے۔ فکرِ اقبال کے عملی امکانات سے خائف حلقوں میں تصوراتِ اقبال کی من مانی تعبیر تو کوئی نئی بات نہیں مگر سلیم احمد ایسے پرستارانِ اقبال کا اس غلط فکری میں مبتلا ہو جانا ایک تہذیبی المیے سے کم نہیں۔ اقبال کے ہاں شاہین کے تصور پر خیال انگیز بحث کے دوران سلیم احمد نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ:[1]

"زمین سے عدم وابستگی اقبال کے یہاں کیا معنی رکھتی ہے؟ زمین سے وابستگی ایک سیاسی تصور بھی ہے اور یہ تصور سیاست میں "قوم پرستی" کا نظریہ پیدا کرتا ہے۔ اقبال قوم پرستی کے خلاف ہیں اور اس لیے زمین سے وابستگی کو تسلیم نہیں کرتے اس سے ان کا اسلام کی آفاقیت کا وہ نظریہ پیدا ہوا ہے جس کے وہ ایک انتھک مبلغ اور مفسر ہیں۔ بعض سیاسی حالات کی وجہ سے اس نظریے کو برصغیر کے مسلمانوں میں بڑا فروغ ملا لیکن کیا اسلام قوم کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا؟ اقبال کی مولانا حسین احمد مدنی سے ایک بحث اس موضوع پر خاصی روشنی ڈالتی ہے۔ مولانا مدنی نے کہا تھا کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔ اقبال نے اس کے جواب میں انہیں مقامِ محمدؐ عربی سے بے خبری کا طعنہ دیتے ہوئے الزام لگایا کہ وہ ملت کو وطن سے وابستہ قرار دیتے ہیں۔ اس بحث کا نتیجہ جو کچھ بھی ہوا ہو اور اس وقت کی فضا میں اس کے جو بھی معنی نکلتے ہوں لیکن ایک بات ہر دیکھنے والے کو نظر آئی کہ اقبال کی نظر میں قوم اور ملت کا فرق واضح نہیں تھا۔

جہاں تک مولانا حسین احمد مدنی کی بات کا تعلق ہے، میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ برصغیر کی اس سیاسی فضا میں، جو اس وقت موجود تھی ان کی بات کے غلط معنی نکلتے تھے اور اقبال نے بہت اچھا کیا کہ انہیں ٹوکا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ قوم اور ملت کے فرق کو واضح طور پر سمجھے بغیر ہماری سیاسی اور تہذیبی زندگی کے بہت سے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اقبال اور مولانا مدنی کی بحث قیامِ پاکستان پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے کیونکہ ہمارے سامنے اس وقت بھی یہی مسئلہ ہے کہ ہم پاکستانی کی حیثیت سے پاکستان کی "زمین" سے وفادار ہیں یا نہیں؟"[2]

---

[1] سلیم احمد: "اقبال جبلت اور زمین دونوں کی تذلیل کرتے ہیں۔ دونوں ان کے نزدیک گراوٹ اور گرفتاری کی علامت ہیں"۔ "اقبال ۔ ایک شاعر" صفحہ ۱۱

۲۔ "اقبال، ایک شاعر" ۔ صفحات ۱۱۶، ۱۱۷ ۔ نقشِ اول کتاب گھر، لاہور، ۱۹۷۸ء

یہ پیچ در پیچ اور سوال اندر سوال استفہامیہ اقبال کے نظام فکر کے سیاسی رُخ سے سرسری شناسائی کا نتیجہ ہے۔ یہاں ذیل کے تین تصورات غلط طور پر اقبال سے منسوب کیے گئے ہیں۔

۱ - اقبال قوم پرستی کے خلاف ہیں۔

۲ - اقبال کے ہاں اسلام کی آفاقیت کا نظریہ قوم پرستی کی نفی سے پیدا ہوا ہے۔

۳ - قوم پرستی کی مخالفت اور اسلام کی آفاقیت کے نظریئے زمین سے عدم وابستگی کے فلسفے سے پھوٹے ہیں۔

یہ تینوں کے تینوں بیانات زیادہ سے زیادہ نیم صداقت کے زمرے میں آتے ہیں۔ نیم صداقت جھوٹ سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہے اس لیے آیئے پوری صداقت تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اقبال جہاں ایک خاص انداز کی قوم پرستی کے مخالف ہیں۔ وہاں ایک دوسرے طرز کی قومیت کے داعی بھی ہیں۔ وہ ہندوستانی قوم پرستی کے اس نظریے کے زبردست مخالف تھے انڈین نیشنل کانگرس جس کی علمبردار تھی اور مولانا مدنی جس کی تبلیغ میں سرگرم عمل تھے۔ اقبال متحدہ ہندوستانی قومیت کے نظریے کو ہندی مسلمانوں کی اجتماعی ہستی کے لیے زہر قاتل اور اسلام کے آفاقی نصب العین کے منافی سمجھتے تھے اور اس کے توڑ میں انہوں نے جداگانہ مسلمان قومیت کا نظریہ پیش کیا تھا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اقبال نے جہاں ہندوستانی نیشنلزم کی تردید اور نفی کی ہے وہاں وہ مسلم نیشنلزم کے علمبردار بھی ہیں۔ جو شخص قومیت کے جدید ترین تصورات کی روشنی میں ہندی مسلمانوں کو ہندوستان کے دوسرے باشندوں سے الگ قوم قرار دیتا ہو اور قوموں کے حق خود اختیاری کے اصول پر ہندی مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطہ زمین کے حصول کی جدوجہد کا نظریہ ساز بھی ہو اور باعمل سیاسی بھی وہ قومیت کا مخالف کیسے ہو سکتا ہے؟

اقبال کی طرف سے ہندوستانی قومیت سے انکار مگر مسلمان قومیت کے اثبات پر تاؤ کھا کر، پنڈت جواہر لعل نہرو نے ۱۹۳۵ء میں چند سوالات اٹھائے تھے۔ ان سوالات کے جواب میں اقبال نے اسلام اور قومیت کے موضوع پر اپنے نظریات کی وضاحت یوں فرمائی تھی۔

> "اگر قومیت کے معنی حُب الوطنی یا ناموس وطن کے لیے جان قربان کرنے کے ہیں، تو اسلام اس کے خلاف نہیں ہے۔ قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحاد انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعوی کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔"[1]

لیکن:

> "قومیت کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے صرف ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کے مغربی تصور کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی ہستی کو مٹا دیں۔ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں، اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ جن ممالک میں

---

[1] حرف اقبال ——— صفحہ ۱۰۳۔

مسلمان اکثریت میں ہیں مسلمانوں کی یہ کوشش کہ ایک تہذیبی وحدت کی حیثیت سے خود مختاری حاصل کی جائے حق بجانب ہوگی اور دونوں صورتیں اسلام کے بالکل مطابق ہوں گی۔[1]

گویا اقبال ناموس وطن پر کٹ مرنے کو تو برحق سمجھتے ہیں مگر وطن کو اتحاد انسانی کی اساس ماننے سے انکاری ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک انسانی اتحاد کی پائیدار بنیاد وطنی اشتراک کی بجائے نظریات وعقائد کی ہم آہنگی ہے مگر وہ حب وطن کو جزو ایمان مانتے ہیں۔ اپنی مشہور نظم "وطن" میں جہاں انہوں نے "وطن بحیثیت سیاسی تصور کے" کا ذیلی عنوان و اضافہ ضروری سمجھا ہے وہاں یہ وضاحت بھی کر دی ہے:

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

جہاں وطن سے محبت اور عقائد سے وفا میں کوئی تصادم نہ ہو وہاں اسلام اور وطنی قومیت عملاً ایک ہی چیز ہیں اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ اقبال کے ہاں اسلام کی آفاقیت کا نظریہ قوم پرستی کی نفی سے پیدا ہوا ہے۔ ان کے نزدیک اسلامی آفاقیت کی عملی شکل جمعیت اقوام ہے۔ "اسلام میں اصول حرکت" کے موضوع پر روشنی ڈالتے وقت اقبال مسلمانان عالم کو ترغیب دیتے ہیں کہ ہر مسلمان قوم اپنے وجود کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو جائے، اپنی نگاہوں کو عارضی طور پر صرف اپنے قومی وجود پر مرکوز کر کے اپنی اندرونی قوتوں کو بروئے کار لائے تاکہ آزاد اور طاقتور قوتوں کی ایک زندہ جمعیت وجود میں آسکے۔[2]

اقبال قومی وجود کو مٹانے کی بجائے اس کی بقا اور استحکام کے علمبردار ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی نیشنلزم کے مقابلے میں مسلمان نیشنلزم کا نظریہ ہندی مسلمانوں کے منفرد قومی وجود کی بقا، استحکام اور مسلسل نشوونما ہی کی خاطر پیش کیا تھا۔ ہندوستانی قوم پرستی کا تقاضا تھا کہ ہندی مسلمان برطانوی ہند کی مصنوعی جغرافیائی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے الگ قومی وجود کو مٹا دیں۔ اس کے جواب میں اقبال نے مسلمان قوم پرستی کا نظریہ پیش کیا۔ جس کی رو سے برصغیر کے مسلمانوں پر یہ لازم آتا ہے کہ جہاں جہاں بھی وہ اقلیت میں تھے وہاں سے ہجرت کر کے اس سرزمین سے وابستہ ہو جائیں۔ جہاں مسلمان اکثریت میں تھے اور جہاں ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ریاست کا قیام دائرہ امکان میں تھا۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔"

یہ الفاظ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الٰہ آباد سے لیے گئے ہیں۔ ان پر صرف سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ پاکستان کا تصور دراصل زمین سے وابستگی کا تصور ہے یہ ہندی مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطۂ زمین کے حصول کا تصور

---

[1] حرف اقبال، صفحہ ۱۲۳۔
[2] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (انگریزی) صفحہ ۱۵۹، مطبوعہ شیخ محمد اشرف

ہے۔ اس تصور کو اپنا کر اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں نے بے شک اس سرزمین سے رشتہ توڑا جہاں ان کا منفرد قومی و تہذیبی وجود فنا کے خطرات سے دوچار تھا مگر ہجرت کا یہ عمل ایک ایسی سرزمین سے وابستگی کا عمل تھا جسے تمام ہندی مسلمانوں کے لیے ایک مرکزِ محسوس کی مقدس حیثیت حاصل تھی۔ ہندی مسلمان یہ مرکزِ محسوس، مسلمان اکثریت کے علاقوں پر مشتمل اس خاص سرزمین میں قائم کرنا چاہتے تھے جسے آج پاکستان کہتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی اقبال اور مدنی کی مسلمان قومیت اور وطنی قومیت کی بحث ہمیشہ کے لیے یوں ختم ہو گئی کہ پاکستان مسلمان اکثریت کا ملک ہے اور بقول اقبال "جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں، اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہیں"۔ نتیجۃً پاکستانی قوم پرستی اور اسلام پرستی میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ سو سلیم احمد صاحب کو اب اس سوال سے پریشان نہیں ہونا چاہیئے کہ "ہم پاکستانی کی حیثیت سے پاکستان کی "زمین" سے وفادار رہیں یا نہیں؟" —— اگر ہم فکرِ اقبال سے روشنی لیں تو یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کے ہاں وطن سے وابستگی اور اسلام سے محبت میں جو تضاد تھا وہ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ اب سرزمینِ پاکستان سے محبت اور اسلام سے وفا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور ہماری جغرافیائی سرحدیں اور نظریاتی سرحدیں ایک ہو کر رہ گئیں ہیں۔

یہ محض اتفاق نہیں کہ ۱۹۳۰ء میں ہندی مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت کا تصور پیش کرنے کے بعد اقبال کی اس سرزمین سے وابستگی روز بروز زیادہ گہری ہوتی چلی گئی جہاں اس مملکت کا قیام مقدر ہو چکا ہے۔ وہ عملی سیاسی جدوجہد ہو یا مجاہدۂ فن —— ہر دو میدانوں میں اس وابستگی کے نقوش نمایاں ہیں۔ آیئے پہلے سیاست اور پھر شاعری میں سرزمینِ پاکستان کی جلوہ گری دیکھیں۔

۲

اقبال کا سیاسی مسلک ان کے اخلاقی نصب العین کے تابع تھا۔ اقبال کے نزدیک "سیاسیات کی جڑ انسان کی روحانی زندگی میں ہوتی ہے"[۱]۔ چنانچہ ان کی سیاست چند اعلیٰ انسانی [illegible] کے تحفظ اور فروغ سے عبارت تھی۔ اقبال کے ہاں سب سے بڑی سیاسی اور اخلاقی قدر ہندی مسلمانوں کی منفرد تہذیبی ہستی کی بقا اور ان کی قومی خود مختاری کا حصول تھی۔ اپنوں اور غیروں کی بے پناہ مخالفت کے مقابلے میں بے مثال جرأت اور استقلال کے ساتھ وہ عمر بھر اسی منزل کی طرف گامزن رہے۔ اقبال کی عملی سیاسی جدوجہد کا آغاز ۱۹۲۶ء میں ہوا۔ جب وہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوتے۔ ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک ان کی سیاست دو دائروں میں گردش کرتی رہی۔ ان میں سے پہلا دائرہ پنجاب تک محدود تھا تو دوسرا کل ہند سیاست پر محیط تھا۔ پہلے دائرے میں اگر انہوں نے ہر اس نظریے اور عمل کی پُرزور مخالفت کی جس کا مقصد پنجابی مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے ایک ظالمانہ اقتصادی نظام کو برقرار رکھنا تھا تو دوسرے دائرے میں ہر اس تجویز (مثلاً نہرو رپورٹ) کی زبردست مذمت کی جس کا مقصد ہندو مسلمان اتحاد کے نام پر ہندی مسلمانوں کی جداگانہ تہذیبی شناخت کو ختم کرنا تھا۔ اس سلسلے میں انہیں سب سے زیادہ خوفناک مخالفت کا سامنا یونینسٹ پارٹی کی طرف سے ہوا۔ یونینسٹ پارٹی پنجاب کے مسلمان

---

[۱] حرفِ اقبال — صفحہ ۵۷ —

ہندو اور سکھ جاگیرداروں کا ایک متحدہ محاذ تھا۔ اس پارٹی کا سیاسی مسلک سرکار برطانیہ کی کاسہ لیسی کے عوض جاگیرداروں کے مخصوص مفادات کا تحفظ تھا۔ پنجاب لجیسلیٹو اسمبلی کی رکنیت کے زمانے میں اقبال کو پنجاب کے عوام کی پسماندگی اور اس کے اسباب کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور انہوں نے خود کو جاگیرداروں کے بجائے غریب اور مظلوم عوام سے وابستہ کر لیا۔ ۱۹۳۰ء میں وابستگی کا یہ دائرہ اس سارے خطۂ ارض پر پھیل جاتا ہے جہاں آج پاکستان قائم ہے۔ کل ہند مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے اقبال سائمن رپورٹ کو یوں ہدف تنقید بناتے ہیں۔

"مسلمانانِ ہندوستان کو کسی ایسی تبدیلی سے بھی اتفاق نہیں ہو گا جس کے ماتحت سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ نہ کر دیا جائے یا شمال مغربی سرحدی صوبے کا سیاسی درجہ وہی نہ ہو جائے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا ہے۔ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک نیا صوبہ قائم کر دینا چاہیئے۔ احاطۂ بمبئی اور سندھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نہیں۔ ارکانِ کمیشن کو بھی اعتراف ہے کہ اہل سندھ کی زندگی اور ان کا تمدن عراق اور عرب سے مشابہ ہے نہ کہ ہندوستان سے۔ مشہور اسلامی جغرافیہ دان مسعودی نے آج سے بہت پہلے عرب اور سندھ کی اسی باہمی مشابہت کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ "سندھ وہ ملک ہے جو مملکت اسلامی سے قریب تر ہے"۔ سندھ کی پیٹھ ہندوستان کی طرف ہے اور منہ وسط ایشیا کی جانب۔ اس وقت بمبئی کا رویہ دوستانہ ہے لیکن ممکن ہے کہ کل ہی وہ اس کا حریف بن جائے .... رہا شمال مغربی سرحدی صوبہ، سو یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ ارکان کمیشن نے عملاً اس امر سے انکار کیا ہے کہ اس صوبے کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا حق حاصل ہے۔ افغانوں کا یہ پیدائشی حق کہ وہ سگریٹ روشن کر سکیں محض اس لیے سلب کر لیا گیا ہے کہ وہ ایک بارود خانے میں رہتے ہیں۔ ارکان کمیشن کی یہ دلیل کسی قدر بھی لطیف کیوں نہ ہو اس سے کسی جماعت کا اطمینان نہیں ہو سکتا۔ سیاسی اصلاحات کی مثال روشنی کی سی ہے نہ کہ آگ کی سی۔ ہمارا فرض ہے کہ تمام انسانوں کو یہ روشنی پہنچائیں خواہ وہ بارود خانہ میں رہتے ہوں یا کوئلے کی کان میں۔ افغان ایک بہادر اور ذہین قوم ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے لیے ہر قسم کی تکلیف برداشت کر سکتے ہیں۔ وہ ہر ایسی کوشش کی شدت سے مزاحمت کریں گے جو ان کو آزادانہ ترقی کے حق سے روک دے[1]۔"

دو برس بعد کل ہند مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں اقبال صوبہ سرحد کے عوام پر حکومت کے ظلم و ستم کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیری مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا پُر مسرت اظہار کرتے ہیں۔

"ایسی قوم کا دفعتاً جاگ اٹھنا جس میں شعلۂ خودی بجھ چکا ہو، غم اور مصائب کے باوجود ان لوگوں کے لیے مسرت کی بات ہے جو ایشیائی قوموں کی اندرونی کشمکش سے واقف ہیں۔ کشمیر کی تحریک انصاف پر مبنی ہے اور مجھے کوئی شبہ نہیں کہ ایک ذہین اور صناع قوم میں اپنی شخصیت کا احساس نہ صرف ریاست بلکہ تمام ہندوستان کے لیے طاقت کا باعث ہوگا[2]۔"

---

[1] حرفِ اقبال ـــــــ صفحات ۴۵، ۴۶، ۴۷
[2] حرفِ اقبال ـــــــ صفحات ۶۷، ۶۸

اقبال کا یہ خطبۂ صدارت اس اعتبار سے ایک تاریخ ساز سیاسی دستاویز ہے کہ اس میں اقبال نے مسلمانانِ ہند کے سامنے ایک قطعی، ٹھوس اور ہمہ جہت سیاسی لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ سن ۱۹۳۰ء اور سن ۱۹۳۲ء کے دوران، لندن میں ہونے والی دو گول میز کانفرنسوں کے نتائج و اثرات اور مسلمانانِ ہند کے اندرونی انتشار اور سیاسی بے راہ روی کے پیشِ نظر اقبال نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ دوسروں سے شعلۂ حیات مستعار لینے کے بجائے اسے خود اپنی روح کے اندر روشن کریں۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کے سیاسی رُخ کی بہترین جلوہ گری اگر نثر میں کہیں موجود ہے تو وہ اس خطبے میں ہے۔ اقبال نے مسلمانانِ ہند کو موجودہ خطرات اور آئندہ طوفانوں سے نجات کے لیے جس پانچ نکاتی پروگرام پر عمل پیرا ہونے کا درس دیا اس کا کلیدی نکتہ یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی صرف ایک سیاسی تنظیم ہو جو سیاسی اور تہذیبی ہر دو محاذوں پر پیہم مستعدی کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔ یہ تنظیم، جہاں ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تہذیبی محاذ پر ایسے کلچرل مراکز قائم کرے جو سیاست سے لاتعلق رہ کر نئی نسل کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کریں اور اسے اسلام کی گذشتہ فتوحات اور آئندہ امکانات کا زندہ شعور بخشیں، وہاں سیاسی محاذ پر اس مرکزی جماعت کے اختیار اور رہنمائی میں:

"نوجوان لیگیں اور والنٹیروں کے دستے قائم کیے جائیں جو اپنی تمام تر توجہ خدمتِ خلق اور قصبات و دیہات میں اقتصادی پراپیگنڈہ پر مرکوز کر دیں۔ ان چیزوں کی خصوصاً پنجاب کو سب سے زیادہ ضرورت ہے جہاں کا مسلمان زمیندار قرض کے بوجھ تلے دبا پڑا ہے۔ اب حالات سن ۲۵ء کے چین کی طرح ناگوار صورت اختیار کر چکے ہیں ... پنجاب میں یہ معاملہ نہایت نازک صورت اختیار کر چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ نوجوانوں کی جماعتیں اس سلسلے میں جو پراپیگنڈہ کریں اور زمینداروں کو موجودہ پھندوں سے نجات دلانے کی کوشش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کا انحصار پنجاب کے مسلمان کاشت کار کی آزادی پر ہے۔ پس چاہیئے کہ آتشِ شباب سوزِ یقین کے ساتھ مل کر زندگی کی شعاع کو تیز کرے اور آنے والی نسلوں کے لیے عمل کی نئی دنیا تخلیق کرے۔"[۱]

ہماری قومی تاریخ میں اقبال دوگونہ اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے تاریخ کے نازک ترین دور میں ہمیں ایک زندہ، توانا اور متحرک آئیڈیل بھی دیا اور اس آئیڈیل کو عملی زندگی کے قالب میں ڈھالنے کی جدّوجہد کی قیادت بھی کی۔ سن ۱۹۲۰ء سے سن ۱۹۳۴ء تک اقبال نے اسلامیانِ ہند کی سیاسی قیادت کے خلا کو ایک عمل مست مفکر کی حیثیت میں پُر کیے رکھا اور سن ۱۹۳۴ء میں جب قائد اعظم کل ہند مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے تو پھر ان کی قیادت میں ایک پُرجوش اور جانباز سپاہی کی طرح سرگرم عمل رہے۔ یہ اقبال ہی کی عملی سیاسی جدّوجہد کا کرشمہ تھا کہ پنجاب کے یونینسٹ جاگیردار اپنے سارے کبر و ناز کو بھول کر "سکندر جناح پیکٹ" پر مجبور ہوئے، پھر انہیں مسلم لیگ کے روز افزوں عوامی اثرات کے تدارک کی خاطر اپنی الگ زمیندارہ لیگ قائم کرنا پڑی اور بالآخر سن ۱۹۴۶ء میں انہیں مسلم لیگ کے عوامی سیلاب سے بچنے کے لیے کانگرس کے ساتھ متحدہ محاذ بنانا پڑا۔ اقبال کے سیاسی تدبّر کو اپنا کر ہی مسلم لیگ نے جاگیرداروں کی بجائے عوام پر بھروسہ کیا اور یوں سن ۱۹۴۶ء کے عام

۱؎ حرفِ اقبال ــــــ صفحہ ۱۷

انتخابات میں یونینسٹ پارٹی شکست فاش سے دوچار ہوئی۔ ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۳۸ء میں اپنی آخری سانس تک اقبال پنجاب مسلم لیگ کو ایک منظم، فعال اور عوامی تحریک میں ڈھالنے اور قائداعظم کو اپنا فکری ہمنوا بنانے کی جدوجہد میں مصروف رہے یہ زمانہ اقبال اور قائداعظم کی گہری سیاسی رفاقت کا زمانہ ہے۔ اس رفاقت کا بہترین ثمر قائداعظم کے نام اقبال کے وہ خطوط ہیں جن کی بدولت قائداعظم رفتہ رفتہ مسلمانانِ ہند کے لیے الگ اسلامی مملکت کے قیام کا نظریہ اپناتے ہیں۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو اقبال قائداعظم کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

"مجھے کامل یقین ہے کہ آپ کو اس صورت حال کی نزاکت کا پورا پورا احساس ہے جس کا تعلق مسلم ہندوستان سے ہے۔ لیگ کو بالآخر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ مسلمانوں کے محض اعلیٰ طبقے کی نمائندہ بنی رہے یا عام مسلمانوں کی نمائندگی کرے جو اب تک معقول وجوہات کی بنا پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جب تک عام مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کا وعدہ نہ کرے، عوام کو اپنی جانب متوجہ نہیں کر سکتی۔

"ہمارے سیاسی اداروں نے عام مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن ٹیڑھا ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں میں یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ گذشتہ دو سو سالوں میں وہ برابر تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ جواہر لعل کی لادین اشتراکیت مسلمانوں میں کبھی مقبول نہیں ہوگی۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کے مسئلے کو کس طرح حل کیا جائے؟ لیگ کا تمام مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک اس مسئلے کا حل نکالتی ہے۔ اگر لیگ نے اس سلسلے میں کوئی امید افزا قدم نہ اٹھایا تو مجھے یقین ہے کہ مسلمان عوام پہلے کی مانند لیگ سے لاتعلق رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اسلامی شریعت کے کسی موزوں شکل میں نفاذ سے اس مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی شریعت کے گہرے اور دقت نظر کے ساتھ مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس قانون کو اچھی طرح سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو کم از کم ہر شخص کے لیے روٹی روزگار کا حق محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس ملک میں جب تک ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں معرضِ وجود میں نہ آئیں۔ اسلامی شریعت کا نفاذ ممکن نہیں۔ سال ہا سال سے میرا یہی عقیدہ رہا ہے اور میں اب بھی اسی کو مسلمانوں کی روٹی کے مسئلے اور ہندوستان کے امن و امان کا بہترین حل سمجھتا ہوں اگر یہ بات ممکن نہیں تو ہندوستان کے لیے دوسرا راستہ محض خانہ جنگی ہی کا باقی رہ جاتا ہے جو کہ درحقیقت ہندو مسلم فسادات کی شکل میں کئی سالوں سے ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہندوستان کے کچھ حصوں مثلاً شمال مغربی ہندوستان میں فلسطین کی داستان دہرائی جائے گی۔

"اسلام کے لیے سوشل ڈیماکریسی کا کسی موزوں شکل میں اور شریعت کی روشنی میں اپنانا کوئی نئی بات یا انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی جانب رجوع ہوگا۔ مسائل حاضرہ کا حل مسلمانوں کے لیے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے لیکن جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، مسلم ہندوستان کے ان مسائل کا حل اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب کہ ملک کی ازسرنو تقسیم کی جائے گی اور ایک یا ایک سے زیادہ مسلم ریاستیں وجود میں لائی جائیں گی۔ کیا آپ کے خیال میں اس مطالبے کا وقت نہیں آن پہنچا؟"

قائداعظم نے تو مزید تین سال کے غور و تدبّر کے بعد بالآخر ۱۹۴۰ء میں یہ مطالبہ کیا مگر اقبال ۱۹۳۰ء میں ہی شمال مغربی ہندوستان میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کو اٹل حقیقت قرار دے چکے تھے۔ جوں جوں انہیں شمال مغربی ہندوستان یعنی آج کے پاکستان میں فلسطین کی داستان دہرائے جانے کا امکان شدید ہوتا نظر آیا توں توں اس خطۂ ارض کے ساتھ ان کی وابستگی مزید گہری ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ ۱۱ راگست ۱۹۳۷ء کو قائداعظم کے نام اپنے خط میں اقبال یہ مشورہ دیتے ہیں۔

"حالات نے یہ بات واشگاف طور پر واضح کر دی ہے کہ لیگ کو اپنی تمام توجہ اور سرگرمیوں کا مرکز شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بنانا چاہیے۔"

اب وہ ہر دم آج کے پاکستان کے مختلف علاقوں کی ترقی و خوشحالی کی فکر میں غلطاں رہنے لگے۔ سیّد نذیر نیازی "اقبال کے حضور" میں ۳۰ مارچ ۱۹۳۸ء کو بہاولپور کے سید عنایت حسین شاہ کے ساتھ اقبال کی گفتگو یوں درج کرتے ہیں۔

"ریاست اور اہلِ ریاست کی ترقی کے کیا امکانات ہیں؟ ہندوستان کے حالات نہایت تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ مسلمانوں کو بھی کچھ اپنی فکر ہے کہ نہیں؟ . . . . ریاست کا رقبہ نہایت وسیع ہے۔ چولستان آباد ہو جائے تو کیا خوب ہو۔ یہ بات کچھ مشکل تو نہیں، ہمت اور سمجھ کی ضرورت ہے . . . . مسلمانوں کا گزر اس وقت سیاست کے نہایت خطرناک مرحلے سے ہو رہا ہے مسلمانوں کو چاہیئے آنکھیں کھولیں۔ ریاست نہیں تو اہلِ ریاست میں دم پیدا کیجئے۔ یہ موقع کچھ کرنے کا ہے[1]۔"

اسی کتاب میں آگے چل کر سید نذیر نیازی لکھتے ہیں۔

"چولستان آباد نہیں ہو سکا۔ حضرت علامہ اس عظیم خطے کی طرف اشارا فرماتے۔ ارشاد ہوتا جغرافی، نسلی، تاریخی، تمدنی ہر لحاظ سے اس علاقے کا مطالعہ بغایت ضروری ہے[2]۔"

گویا اقبال اپنے آخری لمحات میں سرزمینِ پاکستان کے تمام تر خارجی اور باطنی حسن کو بے نقاب کرنے اور نئی نسل کے لیے اس سرزمین پر "عمل کی ایک نئی دنیا تخلیق کرنے" کی آرزو کو عام کرنے میں مصروف تھے۔ اسی آرزو کا پرتو اس دور کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔

۳

یہ اتفاق کتنا حسین ہے کہ ۱۹۳۰ء میں پاکستان کا تصور پیش کرنے کے بعد اقبال کی شاعری میں اس خطۂ ارض سے وابستگی کا عکس نمایاں ہو جاتا ہے۔ جہاں ہندی مسلمانوں کی مجوزہ مملکت نے بالآخر قائم ہونا تھا۔ اب وہ اس

---

[1] "اقبال کے حضور" ــــ مرتبہ سیّد نذیر نیازی صفحہ ۳۷۷

[2] اقبال کے حضور ــــ مرتبہ سیّد نذیر نیازی صفحہ ۳۸۴

خطۂ ارض کے مسلمانوں کو اپنی علاقائی تاریخ، منفرد اجتماعی نفسیات اور مخصوص نسلی میلانات کی روشنی میں درسِ خودی دیتے ہیں۔ اس سرزمین کے مسلمانوں کی تخلیقی اور تسخیری قوتوں کو بیدار اور سرگرم کار کرنے کی خاطر اقبال براہِ راست بیانیہ حکایاتی اور طنزیہ پیرایہ ہائے اظہار کو آزمانے کے ساتھ ساتھ اگر ایک طرف محراب گل افغان، بڈھے بلوچ اور ملّا زادہ ضیغم لولابی کے سے شعری کردار تخلیق کرتے ہیں تو دوسری طرف شرف النساء کی سی شخصیات کو تاریخ کی دھند سے نکال کر اساطیری دلکشی بخشتے ہیں۔ یہ شعری کردار اپنی ساخت میں علاقائی اور قومی ہیں مگر اپنی سرشت میں اسلامی اور آفاقی ہیں۔ یہ فرضی شخصیات اپنے علاقے کے مظلوم، پامال اور منتشر مسلمانوں کو آزاد، منظم اور سربلند کرنا چاہتی ہیں۔ یہ تمام کردار کسانوں اور محنت کشوں کو پیروں، سرداروں اور جاگیرداروں کے مادی استحصال اور ملّا، پیر اور میر واعظ کے روحانی استبداد سے نجات کے لیے خودشناسی اور خود انحصاری کی تلقین کرتے ہیں۔

بتا کیا تری زندگی کا ہے راز
ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز
اسی خاک میں دب گئی تیری آگ
سحر کی اذاں ہوگئی اب تو جاگ!
زمیں میں ہے گو خاکیوں کی برات
نہیں اس اندھیرے میں آبِ حیات!
زمانے میں جھوٹا ہے اس کا نگیں
جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں
بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ
رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ
یہی دینِ محکم، یہی فتح باب
کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

(پنجاب کے دہقان سے)

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان؟
اپنی خودی پہچان
او غافل انسان
ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ
اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان؟

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

(محراب گل افغان کے افکار)

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا
جس سمت بھی چاہے صفت سیل رواں چل
وادی یہ ہماری ہے، وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ
دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کو خسارہ

(بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو)

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ
کہہ رہا ہے داستاں بیدردیِ ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقان پیر

یہ راز ہم سے چھپایا ہے میر واعظ نے
کہ خود حرم ہے چراغ حرم کا پروانہ

ضربت پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بت سنگیں دل و آئینہ رُو

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

(ملا زادہ ضیغم لولابی کا بیاض)

اپنی شاعری کے اس دورِ آخر میں اقبال نے پنجابی مسلمان کی فطرت اور حالت کے حقیقت افروز تجزیے پر بطورِ خاص توجہ دی ہے۔ "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" کی چند نظموں میں اقبال نے تاریخی شعور اور نفسیاتی گہرائی کے ساتھ پنجابی مسلمان کے کردار کی خامیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں مولوی عبدالحق کے نام اقبال خطۂ پنجاب کی اہمیت یوں واضح کرتے ہیں۔

"مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے جو لڑائیاں آئندہ لڑنا پڑیں گی اس کا میدان پنجاب ہو گا۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی۔ کیونکہ اسلامی زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے[1]۔"

ایک طرف خطۂ پنجاب کی اس اہمیت کا احساس اور دوسری جانب پنجابی مسلمان کی کمزوریوں کا شعور۔ نتیجہ یہ کہ اقبال ایک نباض مسیحا کی مانند پنجابی مسلمان کی حالتِ زار کے ذمہ دار تین عناصر پر طنز کے نشتر چلاتے ہیں۔ یہ تین عناصر ہیں ـــــ جاہ مست سرکار پرست اور وطن فروش سیاست دان جو سامراجی سرپرستی میں پنجابی مسلمانوں کو شہری اور دیہاتی میں تقسیم کر کے فرقہ بندی اور ذات پات کی قوتوں کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔ پنجاب کے اربابِ نبوت جو اسلام کی کلیسائی توضیحات سے سکھی دز محکومی دنو میدی جاوید کا مسلک عام کر رہے ہیں اور پنجاب کے پیر اور سجادہ نشین جن کے کردار کو "بالِ جبریل" کی نظم "باغی مرید" میں یوں بے نقاب کیا گیا ہے۔

ہم کو تو میسّر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن

"بالِ جبریل" ہی کی ایک اور نظم "پنجاب کے پیرزادوں سے" اپنے حکایاتی پیرایۂ بیاں کے باعث طنز و تاثیر کی عجیب کیفیات کی حامل ہے۔ شاعر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر حاضر ہو کر التجا کرتا ہے کہ اسے بھی فقر کی دولت عطا ہو مگر اس کے جواب میں:

آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند   ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار

---

[1] اقبال نامہ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۹۰

عارف کا ٹھکانہ نہیں وہ خطہ کہ جس میں پیدا کلۂ فقر سے ہو طرۂ دستار

باقی کلۂ فقر سے تھا ولولۂ حق
طروں نے چڑھایا نشۂ خدمت سرکار

اہل نظر کشور پنجاب سے بے زار ہیں کہ یہاں ولولۂ حق کی جگہ خدمت سرکار نے لے لی۔ اور یوں سلسلۂ فقر بند ہو گیا۔ اس المیے سے نجات کی خاطر اقبال ہمیں پنجاب کی قدیم تاریخ سے سبق اندوز ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ ہمیں افلاک سے پرے جنت الفردوس لے چلتے ہیں جہاں مولانا رومی ہمارا تعارف شرف النساء سے کراتے ہیں۔

قلزم ما ایں چنیں گوہر نزاد | ہیچ مادر ایں چنیں دختر نزاد
خاک لاہور از مزارش آسماں | کس نداند راز او را در جہاں
آں سراپا ذوق و شوق و درد و داغ | حاکم پنجاب را چشم و چراغ
در کمر تیغ دو رو قرآں بدست | تن بدن ہوش و حواس اللہ مست
خلوت و شمشیر و قرآن و نماز | اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز

دمِ آخر شرف النساء نے وصیت کی کہ اس کی قبر پر نہ تو گنبد بنایا جائے نہ قندیل روشن کی جائے کہ اس کے لیے قرآن اور تلوار کافی ہیں۔ سو ایک زمانے تک شرف النساء کی تربت پر تلوار اور قرآن اہلِ حق کو یہ پیغام دیتے رہے کہ تلوار اور قرآن ایک دوسرے کے محافظ ہیں۔ پھر ہوا یوں کہ جو حق پرست تھا، باطل سے دبنے لگا۔ شیر لومڑی بن گیا، نتیجہ یہ کہ:

از دلش تاب و تب سیماب رفت | خود بدانی آنچہ بر پنجاب رفت
خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد | اندراں کشور مسلمانی بمرد

سکھ تلوار اور قرآن اٹھا کر لے گئے۔ سکھا شاہی کے بعد انگریز گردی کا زمانہ آیا۔ اور شیخِ کلیسا نواز نے جہاد کے خلاف فتویٰ دیتے ہوئے بتایا کہ تلوار کا زمانہ رخصت ہوا، اب قلم کا دور ہے۔ یوں اہلِ پنجاب قیادت کے اعلیٰ اوصاف سے عاری ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال قومی قیادت کے لیے سرزمین پاکستان کے کوہ و صحرا کی جانب امید اور رجائیت کے ساتھ دیکھتے ہیں جہاں فقرِ غیور اپنے چاک چاک پیرہن کو خلعتِ انگریز پر ترجیح دینے کا خوگر ہے۔ جہاں کبک بھی شاہین مزاج ہے اور جہاں آہو بھی شیروں سے خراج لیتا ہے مگر جو بے مرکزیت کے باعث آشفتہ روز ہے۔ اقبال کبھی تو خوشحال خان خٹک کی زبانی قبائل کو ملت کی وحدت میں گم ہونے کا درس دیتے ہیں، کبھی براہِ راست یا نیم اندازمیں افغانوں کو

خیبر از مردانِ حق بیگانہ نیست | در دلِ او صد ہزار افسانہ ایست
سر زمینے کبکِ او شاہین مزاج | آہوئے او گیرد از شیراں خراج
لیکن از بے مرکزی آشفتہ روز | بے نظام و ناتمام و نیم سوز

(مثنوی مسافر)

جمال الدین افغانی سے کسبِ نور کرنے کی تلقین کرتے ہیں:

در جہاں آوارۂ، بیچارۂ — وحدت گم کردۂ، صد پارۂ
بند غیر اللہ اندر پائے تست — داغم از داغے کہ در سیمائے تست
میرِ خیل، از مکرِ پنہانی بترس — از ضیاعِ روحِ افغانی بترس

(مثنوی مسافر)

اور کبھی محراب گل افغان سے قبائل کے باہم متصادم بتوں کو پاش پاش کراتے ہیں:

ہزار پارہ ہے کہسار کی مسلمانی — کہ ہر قبیلہ ہے اپنے بتوں کا زناری
وہی حرم ہے وہی اعتبارِ لات منات — خدا نصیب کرے تجھ کو ضربتِ کاری

یہاں مجھے قدرت اللہ فاطمی یاد آتے ہیں جنہوں نے محراب گل افغان کو پاکستان کے قومی کردار کا مثالی نمونہ قرار دیا ہے اور اس کے افکار میں پاکستان کے قومی مزاج کی صلابت، مساوات پسندی اور انقلابی روح کی دھڑکنیں سنی ہیں[1] ـــــ محراب گل افغان کا کردار پاکستان کے قومی کردار کا مثالی نمونہ ہو نہ ہو اتنی سی بات تو بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ محراب گل افغان کا سا شعری کردار تصورِ پاکستان اور سرزمینِ پاکستان کو ایک کر دینے سے ہی وجود میں آسکتا تھا۔ ایک اسلامی مملکت میں ملک اور دین کا فرق کیسے مٹ کر رہ جاتا ہے؟ ـــــ یہ بات خود اقبال ہمیں اپنے آخری مجموعۂ کلام "ارمغانِ حجاز" میں "پیامِ عمرؓ" کے زیرِ عنوان بتا گئے ہیں:

کسے کو داند اسرارِ یقیں را
یکے بیں می کند چشمِ دو بیں را
بیا میزند چوں نور دو قندیل
بیندیش افتراقِ ملک و دیں را

---

[1] پاکستانی قومیت، ـــــ صفحہ ۱۷۱

اسلامی ادب کے تنقیدی لوازمات

پروفیسر فرخ احمد

ادب خواہ حسن کلام ہو یا کلام حسین، اور حسن خواہ تناسب کا نام ہو یا محض ایک تجریدی تصوّر، لمبی سے لمبی بحث کو چند الفاظ میں یوں سمٹایا جا سکتا ہے کہ جو بات زیادہ سے زیادہ بھلے آدمیوں کو بھلی معلوم ہو، ادب ہے۔ اس کے بعد صرف اپنے اپنے ذوق اور ظرف اور اپنے اپنے انداز نظر کی بات رہ جاتی ہے۔ کبھی "خوں گرفتہ چینی" بھی تنابائی تمنّا کی دار رہتا ہے۔ کبھی "رسائی" پر بھی "مر جائے" کو جی چاہتا ہے۔ گویا ادب کی تخلیق اور تحسین دونوں کے لئے بلند ذوقی شرط ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہر ذوق کی تہہ میں کچھ نہ کچھ اور کسی نہ کسی قسم کی عصبیت ضرور کار فرما ہوتی ہے، خواہ وہ انفرادی ہو یا گروہی۔ اور عصبیت نام ہے کسی نہ کسی عقیدے سے گہری وابستگی کا۔ یہ وابستگی تقلیدی بھی ہو سکتی ہے اور اجتہادی بھی، اور جب عقیدے ٹکرائیں گے تو عصبیتیں بھی ٹکرائیں گی۔ اس باطنی ٹکراؤ کا اظہار ذوق کے ٹکراؤ کی صورت میں ہوتا ہے اور نمایاں ہوتا ہے اور یہی ذوق کا ٹکراؤ، لیکن فیض کی حمد کو ماہر سے داد نہ ملے یا نعیم کی "اگر میں چاہوں" کو احتشام حسین چنداں خاطر میں نہ لائیں تو ذوق کے اس ٹکراؤ کو محض "پسند اپنی اپنی" کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ یہ تو تیرتے ہوئے برف کے ٹکڑے کا محض اوپری حصہ ہے۔ زیر سطح حصے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کبھی بڑے معصومانہ انداز سے یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ نظریاتی اختلافات کے باوجود تمام ادیبوں کو ایک برادری کی شکل میں منظم کرنا چاہئے جس میں خالص کاروباری رواداری کا دور دورہ ہو اور حقوق سب کے بحق سرکار محفوظ رہیں۔ لیکن ادیبوں کے جس نظریاتی "مسئلہ اضافیت" کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اس کو اچھی طرح سمجھنا اور اس کے مناسب حل کی تدبیریں سوچنا بھی ضروری ہے۔ ورنہ "بقائے باہمی کا نعرہ" "ثقافتی انقلاب" کا پیش خیمہ ثابت ہو تو اس پر کسی کو تعجب نہ ہوگا۔

ہمیں ٹھنڈے دل سے اور حقیقت پسندی کے ساتھ اس پر غور کرنا ہے کہ آیا تعینات کے سارے پردے اٹھا دینا ممکن بھی ہے۔ تاکہ جوش و حفیظ، ندیم و نعیم سب کے سب گلے ملتے نظر آئیں۔ مشاعروں یا ضیافتوں میں کسی مقام پر سبھوں کا اکٹھے نظر آنا اور بات ہے۔ "ماسکو کو سلام" اور "سلام اے آمنہ کے لال" میں کسی

کی ادبی قیمت کیا ہے۔ اس پر جب بحث ہوگی تو گلے ملنے والے دست وگریباں دکھائی دیں گے۔ ایک کا دعویٰ دوسرے کے نزدیک مہمل قرار پائے گا۔ شیطان کو "موحدِ اعظم" قرار دینے والے سیمابی نکتہ آفرینی اور جوش کے کلمۂ "لاالہٰ الانسان" کی ندرت اور سنسنی خیزی اپنی اپنی جگہ مسلّم لیکن فرض کیجئے، کوئی دل جلا دنیا کے اندوہناک حالات سے متاثر ہو کر شیطان کو "احکم الحاکمین" قرار دے دے تو شیطان وابوجہل کی عظمت کی قسم "کھانے والے قبلۂ رندانِ جہاں" بھی سوچیں گے کہ شیطان بڑا یا انسان! عصبیت وہاں بھی آڑے آئے گی۔

دراصل ادب کی کسی ایک تعریف پر تمام ادیبوں کو متفق بنانے اور جہاں جہاں حسن نظر آئے اس کا سبھوں سے یکساں اعتراف کرانے کی اتنی ضرورت ہے بھی نہیں جتنی یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ فضا ایسی پیدا کی جائے جو عقل عام اور ذوقِ سلیم کیلئے زیادہ سے زیادہ سازگار ہو اور جس میں فکری تحکم اور ثقافتی استبداد کا عمل دخل نہ ہو۔ لہٰذا اپنی اپنی ایک دوسرے سے سوا لے کے بجائے جہاں اصولاً کوئی اختلاف نہ ہو بات وہاں سے شروع کی جائے۔ تاکہ ادب کی فنی حیثیت اور اس کے مقصدی منصب کو (خواہ وہ کچھ بھی ہو) ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی اپنی صوابدید کے مطابق ہر شخص کم از کم یہ کرنے کے لائق تو ہو کہ ادبی رجحانات کا جائزہ لیتے وقت کسی رجحان کو (خواہ وہ حالتِ جنین ہی میں کیوں نہ ہو) مستثنیٰ یا نظر انداز نہ کرے۔

ادب کی فنی حیثیت اور اس کے مقصدی منصب کے بارے میں اختلاف سہی لیکن تفصیلات کو مؤخر کرتے ہوئے اس کی اصولی شکل کو بلا اختلاف یوں مانا جا سکتا ہے کہ

(۱) اگر کوئی ادب پارہ فنی حیثیت سے انشائی کیفیت اور ہیئت کا قابل فہم اور خوش آئند نمونہ پیش کرتا ہے تو ہم اس کی فنی کامیابی کا اعتراف کریں گے (اسی اصولی عدل کے تحت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے امراء القیس کو "اشعر الشعراء" کہا تھا)

(۲) پھر ساتھ ہی یہ بھی دیکھیں گے کہ اس فن پارے نے اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے ہمارے شعور و جذبات اور فکر و عمل پر اثر انداز ہونے میں کیا حصہ لیا ہے۔ اس طرح اس کا مقصدی منصب ہمارے زیرِ نظر آنے کا (اس جہت سے حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امراء القیس کو "قائدہم الی النار" قرار دیا تھا)

اسی طرح سارے ادبی رجحانات کو خواہ وہ "برائے ادب" ہو یا "برائے زندگی"، "جدید" ہو یا "ترقی پسند"، رومانی ہو یا ماوراءِ حقیقت SUR REALISTIC قابل فہم ہو یا تجریدی، قومی ہو یا لادینی، اشتراکی ہو یا اسلامی، جہادی ہو یا بعد جہادی، پسند اور ناپسند سے قدرے بالاتر ہو کر بلا استثناء زیرِ جائزہ لایا جائے تو ایک اطمینان بخش منصفانہ فضا تیار ہو سکتی ہے۔ پسند اور ناپسند کے معاملے میں جہاں نظریاتی اضافیت

کار فرما ہو۔ ظاہر ہے کہ ایک مکتبِ فکر کے نزدیک جو تعمیر ہوگی وہی دوسرے کی نگاہ میں تخریب قرار پائے گی۔ یہ تو ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ لہٰذا تحکم کی بجائے استدلال پر اکتفا کرنا ہی کافی تصور کرنا چاہیئے۔ تنقید کا حق کسی سے چھینا نہیں جا سکتا، کیونکہ یہ خود ایک قسم کا تحکم یا استبداد ہوگا۔ البتہ کچھ ضروری حدود کو ملحوظ رکھا جائے تو نظریاتی عصبیت اور تنقید کی گرما گرمی کے باوجود ایسی فضا بن سکتی ہے کہ کہنے والے دوسروں کی بھی سنیں۔ نہ کوئی کسی کا منہ بند کرے نہ کوئی اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ صحافیوں کی طرح ادیبوں کو بھی ایک ضابطہ اخلاق کی ضرورت ہے۔ ہمیں لیسے "ایوان" کی ضرورت ہے جس میں ہم کچھ متفق علیہ "پارلیمانی آداب" کے پابند ہوں۔

جب اس قسم کی فضا ہوگی تو ادب کے مقصدی منصب سے اصولاً صرف اس گروہ کو انکار ہوگا۔ جسے عرفِ عام میں "ادب برائے ادب" کا علمبردار کہا جاتا ہے۔ لیکن ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ بھی بہرحال ایک مقصدیت کے حامل ہیں، خواہ وہ محض کاوشِ تخلیق ہی تک محدود ہو یا "یک گونہ بے خودی" سے سروکار رکھتی ہو۔ اسے آپ "محدود مقصدیت" کہہ سکتے ہیں، لیکن مقصدیت کی نفیِ لطیف سے کسی کو یکسر عاری قرار دے دینا اس کی بڑی توہین ہوگی، بلا تکلف مجوزہ بالا "ایوان" میں "ادب برائے ادب" والوں کو "آزاد" ارکان کی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔ ہاں ہمارے یہاں ایک اور ادبی رجحان کا چرچا ہونے لگا ہے جسے تجریدی ادب کا رجحان کہہ سکتے ہیں، یہ ماورا "حقیقی" سے مختلف ہے۔ دونوں میں وہی فرق ہے جو فرانس کے پکاسو اور اسپین کے ڈالی میں پایا جاتا ہے۔ "ماورار حقیقی" میں صرف تناسب کو بگاڑا جاتا ہے۔ لیکن تجریدیں کچھ کا کچھ کر دیا جاتا ہے۔ بقول کسے ؎

"ہم تو سمجھے تھے لہٰذا ناس وہ عورت نکلی"۔ غرض یہ کہ ہمارے یہاں ادب کا یہ جدید رجحان بھی (جدید ہمارے لئے) جسے تجریدی رجحان کہا جا سکتا ہے، خواہ ابھی حالتِ جنین میں ہو، نظر انداز کئے جانے کے لائق نہیں۔ اسے خسروی انمل کی تشکیلِ جدید کہنا مشکل ہوگا۔ کیونکہ خسروی انمل کوئی ایسا انمل تھا بھی نہیں، جتن سے کھیر پکانے، اس کے لئے چرخا تک جلا دینے۔ لیکن کتے کا آکر کھیر کھا جانا اور پھر اس پچھتی میں گرتوں بیٹھی ڈھول بجا" کافی جوڑ اور میل ہے اور مطلب کی بات یہ کہ "لا پانی پلا"۔ لیکن فرض کیجئے ———— لاہور کے عارف عبدالمتین سے معذرت کے ساتھ جو اس جدید رجحان کے علمبردار ہیں۔ اگر راقم الحروف یوں گہر افشانی کرے۔

"قلم اور مٹی اور لکڑی اور زخم اور کباب اور کپڑا کچھ بھی نہیں،
نہیں نہیں نہیں ہاں ہاں ہاں، اور میں نے اپنے ناخن کو
معاف فرمایئے گا میں سگریٹ سلگا رہا تھا دیاؤں کی آگ سے
نکال کر آسانی ہرپا لیوں؟ تربوز پہ ترانا چاہا۔ حالانکہ محبوب کا
کھوڑا دشمن کی رگوں میں گلاب کی طرح جھوم گیا"۔

تو ممکن ہے اکیسویں صدی کا "نیا انسان" اسے ادب العالیہ قرار دے۔ لیکن ابھی تو کھنے والے کے

تحتِ شعور کو جھانکنے کے لئے بھی قاری و ناقد زاویۂ نظر ہی کے انتخاب پر بحث کریں گے اور اس بحث میں ایسے الجھیں گے کہ موضوع بحث کا بھی کسی کو ہوش نہیں رہے گا۔ مدعا یہ ہے کہ جہاں جہاں جو ادبی رجحان بھی کام کر رہا ہو اور جو بھی اس کا علمبردار ہو ہمیں اس سے تجاہل نہیں برتنا چاہیئے۔ نہ مانتے ہوں تو نہ مانیے لیکن جانتے ہوئے بھی انجان بننا عافیت کوشی کی کوئی اچھی شکل نہیں ہے۔ اندر ہی اندر بڑھتی ہوئی بدگمانی کی فضا انجام کار سبھوں کی عافیت کو ختم کر دے گی صاف گوئی تلخ ہوتی ہے۔ لیکن سبھوں کی عافیت انجام کار اسی میں ہے۔ ادب برائے ادب اور ماوراء حقیقی اور تجریدی ادب کے بارے میں ہمارے جو بھی احساسات ہوں، تنقید کے ضروری آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے جب بھی ان کے بارے میں کوئی بات کہی گئی ہے اس کا اچھا اثر ہوا۔

رہ گیا ہمارا "سوادِ اعظم" جو "ادب برائے زندگی" پر ایمان رکھتا ہے یہ "بہتر فرقوں" میں اس لئے بٹا کہ اختلاف زندگی کا نظریہ متعین کرنے ہی میں پیدا ہوا۔ جب دو تصورات زندگی میں بعد المشرقین ہو تو "ادب برائے زندگی" کا محض اصولاً قائل ہونا ابہام و تفہیم کی مطلوبہ فضا پیدا کرنے کے لئے کافی تو ہیں ہے لیکن دوسروں کا منہ بند کرنے اور اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے کے تحکمانہ اور عاجزانہ دونوں طرز عمل میں جو ایک قسم کی گھبراہٹ سی پائی جاتی ہے وہ کسی فریق کو زیب نہیں دیتی، ایسے میں "ادب برائے ادب" کے علمبردار اپنی "محدود مقصدیت" کے باوجود ایوان کے آزاد ارکان کی طرح صحیح معنوں میں غیر جانبداری کا رول ادا کر رہے ہوتے تو حالات میں خوشگوار تبدیلی آ سکتی تھی۔ لیکن وہ بھی اپنی انفعالیت کے سبب، اس طرف پناہ لینے میں اپنی عافیت محسوس کرتے ہیں، جدھر زور و شور زیادہ دیکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلامی ادب کے علمبرداروں کو اس طرف سے کم ہی معاون یا اتحادی میسر آ سکے اور وہاں سے امداد ملی تو لادینی کیمپ ہی کو ملی۔ اس طرح عملاً ان سبھوں کے متحدہ محاذ کے مقابلے میں اسلامی ادب کے علمبردار تن تنہا رہ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ادب کی نظریاتی کشمکش میں قومی ادب کا نظریہ ایک بیچ کی راہ ہے، جس پر دینی اور لادینی دونوں ہی کاروان ادب دوش بدوش گامزن ہو سکتے ہیں، لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، اوّل تو ہمیں کسی سنگم کی تلاش سرے سے ہے ہی نہیں، دوسرے نسلی اور وطنی قومیت کے ڈانڈے لادینیت سے تو جا ملتے ہیں، اسلام یہاں مسجد حضرت بل یا مسجد تاشقند کی طرح تابع مہمل ہی بن کر رہ سکتا ہے۔ وطنی قومیت کا لادینی نظریہ صحرائے نوبیہ اور موہنجوڈارو کے قدیم ترین تہذیبی آثار سے اپنا رشتہ جوڑے بغیر نہیں رہتا۔ فرعون و ابولہب قومی ہیرو بن جاتے ہیں اور موسیٰؑ و محمدؐ صرف پرائیویٹ عقیدے تک باقی رہتے ہیں۔ لہذا یہ بات سمجھنی کچھ زیادہ مشکل نہیں کہ وطنی قومی ادب اگر دینی و لادینی ادب کے لئے ایک سنگم بن سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ دین تو چند ثقافتی نوادر کی شکل میں "محفوظ" رہ جائے اور حکمرانی لادینیت کی ہو۔

افسوس کہ پاکستان میں "ترقی پسند" کیمپ سے الگ ہو جانے والے کچھ بزرگوں نے حسن عسکری وغیرہ کی سرگردگی میں پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کو کچھ اس طرح گڈمڈ کیا کہ اسلامی ادب کے بارے میں پہلے سے جو غلط فہمی موجود تھی اس میں اور اضافہ ہوا، آپ دیکھیں گے کہ "نقوش" وغیرہ کے محاذ پر ایک عرصے تک جو گرما گرم

جھڑپ ہوتی رہی اس میں ایک طرف حسن عسکری اور ان کے ہمنوا دکھائی دیتے ہیں اور دوسری طرف فراق اور ان کے پاکستانی عقیدت مند نظر آتے ہیں، وہاں اسلامی ادب کو اسلامی ادب کی حیثیت سے تسلیم کرنے والوں میں ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نمایاں ہیں، لیکن چونکہ ان اسلام پسند دانشوروں نے غالباً اسے خلاف مصلحت تصور کیا کہ اسلامی ادب کے نام سے چلنے والی تحریک اس تحریک کے منشور، اور اس کے علمبرداروں کی تخلیقی کاموں کے حوالوں سے بات کی جائے، اس لیے ان مخلص بزرگوں کی زحمت فرمائی بھی کچھ مفید ثابت نہ ہوئی ایک نے تو تمام ترجمی شاعری کو مسلمانوں کا قیمتی سرمایہ قرار دیا تو دوسرے نے یہ فقرہ لکھ کر کہ ادب اسلامی تو ہو سکتا ہے لیکن اسے "مختون" نہ ہونا چاہیئے جہاں اپنی رُدتس بیانی کا ثبوت دیا، وہاں اس فقرے کا شاعرانہ ابہام بس بعض خوش مذاقوں کو صرف مراد دے گیا، اس سے کچھ زیادہ حاصل نہ ہوا

کہنا یہ ہے کہ اب گول مول انداز میں اور چبا چبا کر باتیں کہنے کا وقت گزر گیا. اب جس کے اندر ذرا بھی ذمہ داری کا احساس ہے اسے ہر قسم کی مصلحت اندیشی سے آزاد ہو کر حقائق کا سامنا کرنا ہے. اب اسلامی ادب کا منشور لے کر اٹھنے والوں کے حلقے سے باہر بہت سے ادیب اور فن کار اسلامی ادب کی حامی بھر رہے ہیں. یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے سنجیدہ اور وسیع النظر تنقید نگار نے بھی اسلامی ادب کے ضمن میں جیلانی کامران کے حوالہ ہی تک اپنے قلم کو محدود رکھنا قرین مصلحت تصور کیا ہے. لیکن "ادبی مسائل" والے ریاض احمد (سیارہ میں) اور اس سے پہلے (افکار کے ہماری ادب سے متعلق خاص نمبر میں) ارکان ادارہ "افکار" بعض ممتاز اسلام پسند فنکاروں کے ناموں اور کاموں کا تذکرہ کر چکے ہیں ماہ نو کی ایک اشاعت میں انور سدید نے اسلامی ادب کی تحریک کو ایک غیر ارضی اور ماورائی تحریک کہہ کر رد کرنے کے باوجود ادبی رجحانات میں اس کو نمایاں مقام دیا ہے. غرض یہ کہ تنقید نگاروں کا حجاب اٹھ رہا ہے دوسری طرف اب یہ بات بہت سے تغافل کیشوں کی سمجھ میں آنے لگی ہے کہ پاکستان کو بچانے کے لیے ہماری طاقت کا اصل منبع اسلام ہے. گندھارا اور ہڑپہ نہیں! اسلام اور صرف اسلام وہ جو بحر الکاہل سے ساحل اوقیانوس تک ہمیں ایک عالمی برادری کی مضبوط لڑی میں پرو سکتا ہے. عالمی نظریاتی کشمکش کے ایک نازک دور میں پاکستان وطنی قومیت کے محدود تخیل کے سہارے تو اپنا منفرد نظریاتی وجود برقرار رکھ سکتا ہے اور نہ اس لائق ہو سکتا ہے کہ اپنے مقصد وجود کو بروئے کار لا کر دنیائے انسانیت کی حقیقی فلاح کے لئے اپنا کچھ منفرد رول ادا کرے

اس وقت دنیا دراصل دو متحارب سامراجوں کی چکی میں پس رہی ہے۔ بقول

طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اور اس چلتی چکی کو دیکھ کر کتنے کبیرے رو رہے ہیں لیکن شور و غل میں کوئی کسی کی نہیں سنتا. مشینی قوت اور جوہری توانائی نے لوٹ کھسوٹ اور غارت گری کی وسعت اور رفتار کو ہزار گنا بڑھا دیا ہے. ایسے میں قدروں کی ابتری کو تسلیم کرنے والے دانشوروں کا دل بھی اندر سے گواہی دے رہا ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے نہیں ہونا چاہیئے امیر شکیب ارسلان سے لے کر سارتر تک اور آندرے ژید سے لے کر سید قطب اور احمد ندیم قاسمی تک، عراق میں

ہوں یا ویت نام و کشمیر، انسان کے ہاتھوں انسان کی تباہی اور ذلت و خواری پر دل ہی دل میں کڑھ رہے ہیں اسٹالین کے مجسمے گرائے جا رہے ہوں یا فرعون اور ابوسمبل کے بت نصب کئے جا رہے ہوں، ہزار سالہ مدفون تہذیبی آثار کی کھدائی ہو رہی ہو یا چاند پہ کمندیں ڈالی جا رہی ہوں، انسان آج اتنا دکھی ہے کہ ستر سال پہلے زار کے ستائے ہوئے روسی کسان بھی اتنے زار و نزار نہیں تھے۔ عہدِ جدید کی نقاب پوش قنوطیت کا یہ حال ہے کہ جب اخلاقی قدروں کی دہائی دی جاتی ہے تو جواب یہ ملتا ہے کہ قدریں بدل چکی ہیں لیکن کیا فطرت انسانی قدروں کے اس بحران پر مطمئن ہے؟ تو پھر چیخ و پکار کیسی اور واویلا کیوں؟ یہ ٹھیک ہے کہ بحران میں قدریں بھی بحران کا شکار ہو جاتی ہیں اور خیر و شر کا معیار بدل جاتا ہے، لیکن کیا فطرت انسانی بھی بدل جاتی ہے اور اخلاقی قدروں کی ابتری پہ مطمئن ہو جاتی ہے۔ عہدِ حاضر کے نقاب پوش قنوطی اس سوال کی تاب نہیں لا سکتے اور "رجعت پرستی" کی موٹی سی گالی کو سپر بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ زندگی کے تصورات میں اختلاف کے باوجود قدروں کی تبدیلی پر نہ فیض احمد فیض مطمئن ہیں نہ نعیم صدیقی، نہ معین احسن جذبی مطمئن ہیں نہ احسان دانش اور ان سبھوں کی بے اطمینانی یہی تقاضا کرتی ہے کہ ہیئت و ترتیب اور خوب و ناخوب کی ابتری باقی نہیں رہنا چاہئے تاکہ صحیح ہیئت و ترتیب اور خوب و ناخوب کا وہ معیار عملاً بحال اور کارفرما ہو جائے جس کے لئے روحِ انسانی بے چین ہے۔ اس وقت دراصل دو قسم کی رجعتوں میں سے ایک کو قبول کرنے اور دوسرے کو رد کرنے کا سوال درپیش ہے یا تو ہم رجعت قہقری کی حالت میں پڑے رہنے ہی پر صابر و شاکر رہیں یا رجعتِ معکوس کے لئے زور لگانے کے لئے مردانہ وار کھڑے ہوں۔ لیکن اوّل الذکر کو "ترقی" اور ثانی الذکر کو "رجعت" کا لقب دینے کا مطلب قدروں کی ابتری پر مہرِ توثیق ثبت کرنے کے سوا اور کیا ہے! یہ عجیب بات ہے کہ عہدِ عتیق کے کسی "مثالی" (غیر طبقاتی) معاشرے کو لوٹانا تو عین ترقی پسندی ہو لیکن اسلام کے فطری اصولوں کو لے کر مستقبل کی طرف آگے بڑھنا رجعت کہلائے جب کہ ایک طرح سے ہم سب کے سب احیائیت پسند اور رجعت پسند ہیں تو سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ماقبل تاریخ کے بارے میں ظن و قیاس کو علمی سند دے کر اس سے حیاتِ نو کی بنیاد فراہم کرنا معقولیت کا رویہ ہوگا یا معلوم اور متفق علیہ تاریخی ریکارڈ سے ہدایت کی روشنی حاصل کرکے، جدید ترین سازوسامان سے لیس، مستقبل کی طرف بڑھنے والے کاروانِ حیات کے لئے اسے مشعلِ ہدایت بنانا صحیح معنوں میں معقولیت کا رویہ ہوگا؟ اگر دنیا میں کوئی غیر جانب دار گروہ ہے تو ہم اس سوال کا جواب اس پر چھوڑتے ہیں۔

اس راز سے ادیبوں سے زیادہ کون آگاہ ہوگا کہ نظریات اور تحریکوں کی عملی دنیا میں طرزِ اسلوب بڑا کام کرتے ہیں۔ جب قیاس و تعبیر پر مبنی خیالات کو حسابی فارمولوں کے قالب میں ڈھال کر اور انہیں "خطوط خمدار" کی نمائش سے سرمایۂ علم و حکمت بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے تو ٹھوس تاریخی حقائق کو اس سے زیادہ مدلل اور مؤثر انداز میں عہدِ جدید کے انسان کی پرانی فطرت سے اپیل کرنے اور اس کے شعور و جذبات کو دعوتِ انقلاب دینے میں کونسی دشواری ہے جس پہ ہم قابو نہیں پا سکتے۔ ہم پر یہ جاہلانہ یا تجاہلانہ الزام کہ ہم مادہ ایئت کے شکار ہیں۔

ہمارے فکری موقف کو سمجھنے سے انکار کرنے یا خاطر میں نہ لانے کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا تصورِ آخرت اشتراکیت کے مابعد التاریخی اطوپیا سے زیادہ ارضیت کا حامل ہے۔ ہمارے نزدیک انقلاب کائنات کا دوسرا نام ہے اور کائنات سب سے بڑی ٹھوس مادی حقیقت ہے وسعت پذیر کائنات کا ایسا حرکی تصور جس میں ارتقائے کائنات کا آخری مفہوم شامل ہو اور جو انسان کو ایک ذمہ دار اور جواب دہ کارپرداز قرار دیتا ہو تاریخ کی اندھی جبریت کے تصور کو رد کرتا ہے اور انسان کو اس کے شایان شان باوقار منصب اختیار عطا کرتا ہے۔ اگر یہ تصور بدرجہ اتم ایک "پرانی" کتاب سے اخذ ہوتا ہے، جو طبقات الارض، علمی حقائق سے زیادہ پرانی بھی ہیں، بلکہ صرف چودہ سو سال پرانی ہے تو اس ہدایت یابی کو قدامت پسندی کہنے سے معنی یہ ہوں گے کہ ۱۹۱۷ء کو یاد کرنے کے مقابلے میں ۱۹۸۴ء کو یاد کرنا بھی قدامت پسندی ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے ع

الٹنے میں یہ اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے۔

وحی یا الہام کو ایک خاص ذریعہ علم ماننے اور نہ ماننے والے دونوں ہی اس پر متفق ہیں کہ قرآن ادب کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ دراصل تمام الہامی کتابیں ادب کا بہترین نمونہ ہیں اور دنیا کے اعلیٰ ادبی نمونے وہی ہوتے ہیں جن میں الہامی کتب و صحائف کی روح کارفرما رہی ہے۔

قرآن حکیم اور احادیث نبویؐ کا بڑا اعجاز یہ ہے کہ ان سے متمدن دنیا کو فکر و نظر اور طرز و اسلوب کی نئی نئی راہوں کا سراغ ملا، خود مسلمان آئمہ و علماء حکما و صوفیا اور شعراء و مصنفین نے علم و حکمت اور فکر و فن کا اتنا بڑا ذخیرہ پیدا کیا کہ صدیوں تک مشرق و مغرب میں اسکی دھوم مچتی رہی اور دنیا بھر کے اصحابِ فکر و نظر اور ارباب ذوق نے ان سے خوشہ چینی کرنے میں فخر محسوس کیا۔ اب کوشش یہی کی جا رہی ہے کہ اپنے منبع حیات سے ہمارا رشتہ استوار نہ ہونے پائے، ورنہ خطرہ یہ ہے کہ جدید ترین ساز و سامان سے لیس ہو کر اسلام اتنی قوت اور اتنی تیزی سے ابھرے گا کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے آگے ٹھہر نہ سکے گی۔ قرآن حکیم آج بھی وہی ہے، اس میں سرِ مو کے برابر بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے آج بھی اس سے حیات نو کے سوتے پھوٹنے کے لئے بے چین ہیں۔

صد جہانِ تازہ در آیاتِ او
عصرہا پیچیدہ در آناتِ او

ایسا معلوم ہوتا ہے وہ وقت آگیا ہے کہ "کنز مخفی" کا ظہور ہو۔ انسان کی روح کچھ طلب کر رہی ہے اور یہ طلب دنیا بھر کے اچھے اچھے ادبی نمونوں میں صاف جھلکتی دکھائی دیتی ہے اس طلب کے حامل ادب پاروں کی مقدار روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ اور کچھ عرصے کے بعد اس بات کا فیصلہ کرنا چنداں مشکل نہ رہے گا کہ اچھا ادب وہ ہے جو ہمیں حاضر و موجود اور قبیح و نامحمود سے بیزار کرے اور مطلوب و محمود کی سچی طلب ہمارے دلوں میں پیدا کرے۔ اگر یہ محض خواب ہے تو دنیا بھر کے دانشور یہی خواب دیکھ رہے ہیں اختلاف صرف خواب کی تعبیر میں ہے لیکن خواب ایک ہی ہے جب ایک خواب ساری دنیا کا خواب بن جائے تو یہ فطرت کا اشارہ

ہوتا ہے کہ کچھ ہو کر رہے گا گویا آمدِ سحر سے پہلے عہ

یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے۔

احمد ندیم قاسمی جیسے نسبتاً سلجھے ہوئے "ترقی پسندوں" کی یہ محض ایک جذباتی ترنگ نہیں کہ "جلال و جمال" کے دیباچے میں اسلامی ادب کے حق میں کچھ کلمۂ خیر آگیا۔ یا الجزائر کے مجاہدین کے جذبۂ جہادِ اسلامی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے میں انہوں نے اپنے ہم چشموں سے کوئی حجاب محسوس نہیں کیا، یا کشمیری مجاہدین کے جذبہ ایمانی کی تائید کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ؎

محمد عربی پر میرا یقین ہے ابھی

اسلامی ادب کے جدید رجحان کو سمجھنے کی خواہش جو کہ اب ان دلوں میں بھی پیدا ہو چلی ہے جن کو اب تک اس سے کوئی سروکار نہیں تھا، لہذا یہ ضروری ہے کہ تحریکِ ادبِ اسلامی کے قلم کار وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔

عام ادبی جائزوں کا مطالعہ کرتے وقت، خواہ وہ کسی مخصوص نقطۂ نظر ہی پر کیوں نہ مبنی ہوں، ایک غیر جانب دار قاری یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ لکھنے والے کا تنقیدی شعور زمانے کے مسلمہ تنقیدی اصولوں سے کہاں تک میل کھاتا ہے۔ تنقید اب ہمارے یہاں "معشوق کی کمر یا اقلیدس کا موہوم نقطہ" نہیں رہی۔ تاثراتی اور نفسیاتی تنقید سے قطع نظر عام طور پر تنقید کے کچھ اصولوں پر تمام مکاتبِ فکر کا اجماع ہو چکا ہے۔ موضوع و مواد، ہیئت و اسلوب، فکر و فن کے بارے میں اصولاً کچھ تنقیدی ضوابط اب متفق علیہ ہیں۔ اختلاف صرف عملی تفصیلات میں ہوتا ہے۔ لہذا یہ توقع غلط نہ ہوگی کہ زیرِ نظر کتاب کی طرح کوئی بھی کتاب کہاں تک اس تنقیدی شعور کا پتہ دیتی ہے جو زمانے کے لیے بالکل اجنبی نہ ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی مبصر کو تنقیدی روایات سے انحراف اور اپنے تنقیدی اجتہاد کا حق حاصل نہیں ہے۔ ہمیں ایسی سرخی کو سراہنا چاہیئے جس میں زمانے کی مزاج شناسی کے ساتھ ساتھ زمانے کو صحیح سمت میں موڑنے کا حوصلہ بھی کار فرما ہو۔ تنقید میں خلوص دراصل اسی جذبے سے پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ بات وہی ہوگی کہ ؎

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

کسی نظریاتی تنقید میں "لذتِ شوق" کی کمی نہیں ہوتی بلکہ اس کی فراوانی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ محض حسنِ کلام پر جان دیتے ہیں وہ ادب کی طرح ادبی تنقید میں بھی اس نظریاتی تڑپ کو ترچھی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ جو لذتِ شوق کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں ان لوگوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ان سے یہ عرض کر دینا چاہیئے کہ دوستو اور بزرگو "لذتِ شوق" کے مریض تو آپ بھی ہیں خواہ وہ زبان و بیان کے چٹخارے ہی تک کیوں نہ محدود رہو۔ بقول کیانی مرحوم فرق صرف یہ ہے کہ تم میں "رس" ہے ہم میں "ہائے"! لہذا غیریت کے پردے ایک نہ ایک دن اٹھ کر رہیں گے۔

اُردو کے تمام ادبی سرمایہ پر اسلام کی روشنی میں تنقیدی نظر ڈالنے کی خواہ جیسی کچھ بھی کوشش کی گئی ہو یہ خیال ضرور رکھنا پڑتا ہے کہ دوسرے نظریات اور مکاتبِ فکر کو پوری طرح سمجھ لیا گیا ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جس طرح انہوں نے "اسلامی ادب" پر "لوٹے اور استنجے کا ادب" یا "راہِ نجات" وغیرہ کی پھبتی کسی، اس کے جواب میں ان کو بھی اس طرح موٹی موٹی گالیاں دے کر انتقام لیا گیا ہے۔ آیا مخالف نظریات کی تشریح کرنے میں دیانتداری کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اور ان کے تخلیقی کارناموں پر نکتہ چینی کرنے کے ساتھ ساتھ ہنر شِ نیز نگوتِ کے عادلانہ اصول پر بھی عمل کیا گیا ہے۔ پسند کے باب میں "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" سے زیادہ آگے بات تو نہیں بڑھی۔ لب و لہجہ اگر تلخ ہو گیا ہے تو سچائی کی تلخی سے زیادہ تلخی تو نہیں آئی۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ پرکھنے کے لئے ایک کسوٹی (اپنا نظریہ) سامنے رکھنے کے بعد، آگے چل کر اس کا ہوش نہیں رہا کہیں دامن صبر ہاتھ سے چھوٹ گیا، کہیں حسن غارت گر رہزن تمکین و ہوش ثابت ہوا، کہیں رقیب بوالہوس سے الجھ کر "آبروئے شیوۂ اہلِ نظر" گنوا بیٹھے۔ اگر پورا سفر بسلامتی ہوش و حواس طے پایا ہے اور دامنِ احتیاط کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا تو سمجھنا چاہیئے کہ سفر کامیاب رہا۔

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

• اسلام کی روشنی میں عام ادب کا جائزہ اور اسلام کی روشنی میں اس ادب کا جائزہ جو "اسلامی" کہلاتا ہے ایک جائزے کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ عینک کا رنگ اگر؟ اتفاق سے پیش منظر کے ایک حصے میں پہلے سے موجود ہے تو اس حصے کو دیکھتے وقت مزید توجہ درکار ہوتی ہے اور خطائے نظر یا سہوِ نظر کا احتمال زیادہ تر اسی طرف ہوتا ہے ہمیں اس نا مطلوب حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہیئے رنگ کے استعارے سے اگر یہ اہم نکتہ اچھی طرح واضح نہیں ہوتا تو رنگ کی جگہ طاقت کہہ لیجئے۔ دور اور نزدیک کے مناظر کے لئے ایک ہی طاقت کی عینک بسا اوقات یکساں کام نہیں کرتی اب اگر عینک کی طاقت وہ ہے جو دور کی چیزوں میں اسلامی خصوصیات کو دیکھنے کے لئے موزوں ہے تو صرف اسلامی ادب چونکہ دیکھنے والے سے بالکل ہی قریب ہے اس لئے اس کا قریبی مشاہدہ ممکن ہے منظر کو دھندلا کر دے۔ اس لئے قریب کے پیش منظر کو اچھی طرح دیکھنے کے لئے یا تو فاصلہ درست کرنا چاہیئے یا تھوڑی دیر کے لئے عینک کی طاقت بدلنی چاہیئے۔ "نظریاتی اضافیت" کا مسئلہ کسی حد تک اس طرح حل ہو سکے گا اور یہ بہت زیادہ مشکل بھی نہیں۔ ایک اور مثال سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے۔ فرض کیجئے زید ایک شاعر ہے اور ساتھ ہی تنقید نگار بھی ہے۔ وہ دوسروں کی شاعری پر دل کھول کر تنقید کرتا ہے لیکن اس کے اپنے کئی اشعار بعض خامیوں کے باوجود اسے اتنے "پیارے" معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ ان کو اپنے مجموعہ سخن میں کمتر درجہ دینے کا روادار نہیں، لیکن سال دو سال کے بعد یا اسی مضمون کے حامل ان سے بہتر اشعار موزوں ہو جانے کے بعد (خواہ وہ فی الفور موزوں ہو گئے ہوں) جن اشعار کو کمتر درجہ دینا اس کے لئے مشکل تھا اب انہیں وہ بالکل خاطر میں نہ لائے گا۔ ایک اسلام پسند تنقید نگار جب اسلامی ادب کے شعری اور نثری سرمائے کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے تو اسے بھی اسی قسم کی آزمائش سے دوچار ہونا پڑتا ہے

فاصلہ یا عینک بدلنے کی مثیں پر قیاس کرکے وہ اگر اپنا جذباتی فاصلہ ذرا بدل لے یا تھوڑی دیر کے لئے بے لاگ فرض شناس کی عینک سے کام لے لے تو "عدل جہانگیری" کا ثبوت دے سکتا ہے۔ اس سلسلے میں تقابل کا طریقہ بھی کارگر ہوتا ہے۔ کسی فن پارے کے حسن وقبح کا تعین اسی نوعیت کے دوسرے فن پاروں کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ قطعیت کا حامل ہو سکتا ہے۔ میرا مدعا یہ ہے کہ اسلام پسند تنقید نگار کو اسلامی ادب پہ تنقید کرتے وقت نسبتاً زیادہ حزم واحتیاط، بلکہ سخت گیری سے کام لینا چاہیئے۔ گروہی اور نظریاتی عصبیت جہاں عام ہو اسلام پسند تنقید نگار اس معاملے میں اگر اپنی بے لاگ صداقت کا ثبوت دے جاتے ہیں تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ نظریاتی ادب کا خواہ وہ اشتراکی ہو یا اسلامی یا قومی تنقیدی جائزہ ایک لحاظ سے آسان بھی ہے اور وہ یوں کہ توجہ صرف اس پر مرکوز رکھی جائے کہ فنی حیثیت سے نظریاتی ادب کے ان نمونوں کا کیا مرتبہ ہے۔ تصور حیات، موضوعات، اور خیالات تو ایک طرح سے معلوم ہی ہیں کہ کس نے کیا پیش کیا ہے۔ البتہ ان کی فنی قدر وقیمت زبان وبیان اور اثر آفرینی کے اعتبار سے کس درجے کی ہے، نظریاتی اختلاف سے قدرے ہٹ کر، صرف یہ دیکھنا کافی ہو سکتا ہے۔

اس کے برخلاف غیر نظریاتی ادبی نمونوں کی فنی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ کرنے کے ساتھ ساتھ ناقد کو ان میں اپنے نظریہ کی تردید وتائید کے پہلو تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن اگر ناقد کا منصوبہ یہ ہو کہ زیر جائزہ مواد کے فنی حسن وقبح سے کم سروکار رکھتے ہوئے نظریاتی حیثیت سے ان کی افادیت یا مضرت کو واضح کرنے پر زیادہ زور صرف کرنا ہے تو اس صورت میں مضمون کا بہت سا حصہ نظریاتی بحث کی نذر ہو سکتا ہے۔

سرسید کا خواب؟

ڈاکٹر صفدر محمود

سرسید انگلستان گئے اور آپ نے مغربی اقوام کو زندگی کے ہر میدان میں تیزی سے آگے بڑھتے دیکھا، تو آپ کو اپنی قوم کی کمزوریوں اور اپنی قوم کے مستقبل کی فکر اور بھی شدت سے لاحق ہوئی۔ ایک مدت کے غور و فکر کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان قوم کی تمام بیماریوں کا علاج صرف جدید تعلیم ہے۔ آپ انگلستان سے لوٹے تو اس مصمم ارادے کے ساتھ کہ اپنی قوم کو جدید تعلیم سے آراستہ کریں گے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ جہالت تمام برائیوں اور عیوب کی جڑ ہے اور "مسلمان دنیا کے حالات سے بے خبر اور ترقی کی راہوں سے ناواقف ہیں" اس لئے تعلیم سب سے زیادہ اور اہم چیز ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا حصول صرف اس لئے ضروری نہیں تھا کہ زور بازو سے معاش پیدا کی جائے اور زیادہ سے زیادہ نوکریوں پر قبضہ کیا جائے بلکہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ ہندو اس میدان میں ترقی کر کے مسلمانوں سے آگے نکل گئے تھے اور اس وقت اگر ہندوستان میں کوئی بھی تحریک شروع کی جاتی، تو اس پر ہندوؤں کا اثر غالب ہوتا — سرسید نے ایک خط میں مولوی سید علی حسن خان کو بھی یہی لکھا کہ "انگریزی نہ جاننے کے سبب روز بروز مسلمان ہند ذلت و خواری میں پڑے جاتے ہیں۔ عہدہ ہائے سرکاری سے روز بروز خارج ہوتے جاتے ہیں۔ ہندو و بنگالی روز بروز ترقیاں پاتے ہیں اور مسلمان ہر رو میں ان کے مغلوب اور دست نگر ہوتے جاتے ہیں۔ پس مسلمانوں کو ہندوؤں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے انگریزی زبان کی تعلیم دینا ضروری ہے"۔ یہ صورت حال واقعی بڑی تکلیف دہ تھی۔ ہندوستان جیسے وسیع و عریض برصغیر میں ۱۸۵۷ میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد صرف بیس (۲۰) تھی جبکہ ہندو گریجویٹس کی تعداد ۸۴۷ تک پہنچ چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر سرسید اس وقت مسلمانوں کو نہ جھنجھوڑتے اور انہیں تعلیم کی طرف راغب نہ کرتے تو سرسید کی وفات کے بعد جس طرح ہندوستان کی سیاست نے پلٹا کھایا اور سیاسی سرگرمیوں کا دور شروع ہوا، اگر مسلمان تعلیم یافتہ نہ ہوتے تو سیاسی دوڑ میں وہ ہندوؤں سے کہیں دور پیچھے رہ جاتے اور نہ جانے ان کا مستقبل کیا ہوتا۔

یہ سمجھنا کہ سرسید احمد خاں جدید تعلیم کو پھیلانے کے لئے کوشاں تھے کہ اس طرح مسلمانوں کو ملازمتیں ملیں گی، ان میں بے روزگاری کم ہوگی اور اس کے نتیجے میں ان کے ذہنوں سے مایوسی کے سائے ہٹ جائیں گے، ایسا سوچنا اصل میں ان کے مشن کی اہمیت کو گھٹانا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ملازمتوں کا حصول بھی ان کے پیش نظر تھا، لیکن درحقیقت

سرسید احمد خان مسلمانوں کو اس لئے تجارت اور تعلیم کے میدان میں آگے بڑھانا چاہتے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ معاشی خوشحالی سیاسی آزادی کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ جدید تعلیم ہماری تہذیب و تمدن پہ اثر انداز ہوگی اور ہمارے انداز فکر کے دھارے بدل دے گی، وہ سمجھتے تھے کہ تعلیم کے حصول سے نہ صرف قوم کے ذہن کو جلا ملے گی اور ان کے دیرینہ تعصبات دور ہوں گے بلکہ تعلیم اپنے ساتھ جمہوری طرز فکر بھی لائے گی، آزادانہ خیالات بھی لائے گی، غلامی کے خلاف نفرت کے احساس کو بھی جنم دے گی اور قوم کے شاہین بچوں میں غیرت و حمیت کا احساس پیدا کر کے ان میں آزادی کی امنگ جگا دے گی بالآخر ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور وہی ہوا جو انہوں نے سوچا تھا۔ یہ سچ ہے کہ سرسید احمد خان نے ان خیالات کا اس طرح اظہار کبھی نہیں کیا لیکن اس وقت ان خیالات کا اظہار کا نہ موقع ہی تھا اور نہ مناسب وقت۔ اس وقت وہ مسلمان نوجوانوں کو ہنگاموں سے الگ تھلگ رہ کر تعلیم کے حصول کی تلقین کرتے رہے، انہیں سیاسیات سے الگ رہنے کی نصیحت کرتے رہے۔ اس لئے کہ ان حالات میں اپنے مشن کی کامیابی کے لئے سرسید احمد خان کو انگریز حکومت کی مدد کی ضرورت تھی اور وہ کسی طرح انگریزوں کو شبہے یا شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

سرسید احمد خان نے جب مغربی تعلیم کی ترویج کا بیڑا اٹھایا، تو انہیں سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ مسلمان انگریزوں سے سخت متنفر تھے اور انہیں انگریزی تعلیم بھی سخت ناپسند تھی۔ آپ نے سب سے پہلے فضا کو ہموار کرنے کے لئے "تہذیب الاخلاق" نکالنا شروع کیا۔ حالی کے الفاظ میں "قوم کو جگانے اور تعلیم کی طرف مائل کرنے کے لئے پرچہ "تہذیب الاخلاق" نکالا "اس کا نتیجہ کیا ہوا! مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "جوں جوں "تہذیب الاخلاق" مدرسۃ العلوم کی طرف لوگوں کو بلاتا تھا اور جس قدر انگریزی تعلیم کی ضرورتیں ان کے ذہن نشین کرتا تھا، اسی قدر مدارس اسلامیہ قائم کرنے کا شوق مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا، چنانچہ اس تحریک سے بے شمار اسلامی مدرسے ہندوستان میں قائم ہوگئے۔"

اس کے بعد سرسید نے علی گڑھ کالج کے قیام کا منصوبہ بنایا اور اس غرض کے لئے انہوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی تشکیل دی جس کا مقصد چندہ جمع کرنا تھا۔ چندہ جمع کرنے کے لئے سرسید نے کیا کچھ نہ کیا۔ انہیں سٹیج پہ ناچنا بھی پڑا تو انہوں نے دریغ نہ کیا انہیں بھیک بھی مانگنی پڑی تو انہوں نے جھجک محسوس نہ کی۔ وہ ایک دیوانے کی مانند اپنا دامن تار تار کئے میدان میں کود پڑے۔ اور دن رات اتنے خلوص سے کام کیا کہ لاکھوں روپے جمع ہوگئے اور آج ان کے دامن کا ایک ایک تار تاریکی میں ہماری راہوں پہ روشن مینار بن کر جگمگا رہا ہے اور ہمیں جرأت، حوصلہ، عظمت اور امید کا درس دیتا ہے۔ کیا قوم کے لئے ان کی یہ دیوانگی اور تعلیم کی ترویج کے لئے دن رات جدوجہد انگریزوں کی خوشنودی اور انعامات کے لئے تھی؟ علی گڑھ کالج کے قیام کے سلسلے میں ان پہ کیا گزری، خود ان کے قلم سے سنیئے! —

"میں نے کوئی پہلو نہ چھوڑا جس سے قوم کے بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے۔ کون ہے جو مجھ کو سٹیج پہ دیکھ کر حیران ہوتا! خود لوگوں سے بھیک مانگی، لیکن قلیل ملی، والنٹیئر بنانے چاہے مگر بہت کم بنے، جب ان سے کچھ بن نہ آئی پس میں سٹیج پہ آیا تاکہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لئے کچھ

کر سکوں ۔ میں نے کہا کہ مجھ کو اس کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت اور شفقت سے اپنے لئے گھر بنتے دیکھئے اور اس وجہ سے کہ اس کے بنانے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر مت ڈھائیے۔ اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں ۔ میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا مگر شکر ہے اپنے لئے نہیں قوم کے لئے ۔ ارے میاں اب ہم کوئی دن میں مر جائیں گے، پھر کون چندہ مانگے گا۔ ہمارا حال تو اس بڑھیا کا سا ہو گیا جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے، تو کہتی کیا آج بازار کے لونڈے مر گئے ہیں ۔"

علی گڑھ کالج کے قیام سے قبل ایک موقع پر آپ لکھتے ہیں کہ "جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، تو مجھ کو ہمیشہ اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں! جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قوم کی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔ سب سے اوّل یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لئے قوم ہی کے ہاتھوں سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے۔"
سرسید کی انتھک کوششوں اور دن رات کی محنت کے سبب علی گڑھ کالج قائم ہو گیا اور ۱۸۸۱ء تک بی۔اے اور ایم اے کے درجے تک ترقی کر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے علی گڑھ نے ایک علمی تحریک کی صورت اختیار کر لی جس سے سیاست کے ان گنت دھارے بہہ نکلے۔ یہی ندیاں جب مل کر طوفان بنیں تو ہندوستان کی سیاست کا نقشہ ہی بدل گیا۔ پوری مسلم قوم کا شعور بیدار ہو گیا اور آزادی کی امنگ ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئی۔ مسلمان قوم کے ولولے سرد پڑ گئے تھے لیکن علی گڑھ تحریک کے پیدا کردہ نوجوانوں نے مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی شمعیں روشن کر دیں۔ جب مسلم لیگ معرضِ وجود میں آئی تو اسے سب سے زیادہ مدد علی گڑھ کے تربیت یافتہ نوجوانوں سے ملی۔ جنگ آزادی کے بعد مسلمانانِ ہند کی زندگی میں جو سیاسی خلا پیدا ہو گیا تھا، علی گڑھ کی تحریک نے اسے پورا کر دیا اور ایک مختصر سے عرصے میں انگریزوں سے مسلمانوں کا وجود تسلیم کروا لیا۔ یہی دراصل اس کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ سرسید احمد خاں خود یہ سب کچھ نہ دیکھ سکے، لیکن انہوں نے اپنے ہاتھوں سے جو پودے لگائے تھے جب ان پر جوبن آیا، تو ان کی مہک سارے گلستان میں پھیل گئی اور انہوں نے سیاسی آزادی کے حصول کے لئے رات دن تگ و دو کر کے سرسید کی بے پایاں محنت کا حق ادا کر دیا۔

اگرچہ سرسید دن رات مسلمانوں میں تعلیم کی ترویج کے لئے کوشاں تھے، لیکن انہیں اس بات کا پورا احساس تھا کہ مسلمان زیادہ دیر تک غلامی کی زنجیروں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ انہیں اس امر کا علم تھا کہ کوئی بھی غیر قوم دوسری قوم کو زیادہ عرصے تک آزادی سے محروم نہیں رکھ سکتی اور وہ اس بات کے قائل تھے کہ ہندوستان کے مسلمان، جن کی رگوں میں عربوں کا خون دوڑ رہا ہے اور جو اس مذہب کے ماننے والے ہیں جو دنیا میں انسانی آزادی کا پیامبر بن کر آیا ہے، زیادہ عرصے تک غیر ملکی استعمار برداشت نہ کریں گے۔ ان کو جب بھی موقع ملے گا وہ غلامی کی

زنجیریں توڑ دیں گے۔ اپنی نئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیئے وہ مسلمان قوم کو تعلیم دے کر تیار کرنا چاہتے تھے۔ اسی دور کا سرسید احمد خاں کا لکھا ہوا ایک خط اس احساس کی غمازی کرتا ہے کہ وہ ذہنی اور قلبی طور پر اس حقیقت کے قائل تھے کہ مسلمان جلد یا بدیر بہرحال آزاد ہو کر رہیں گے اور انگریز کو بہرحال یہاں سے رخصت ہونا پڑے گا۔ یہ خط انہوں نے کسی معزز انگریز کے نام لکھا جس کا نام درج نہیں، لیکن اس خط کو پڑھنے سے یہ احساس ضرور ہوتا ہے لیکن سرسید نے صبح آزادی کی کرن کو اس کے اس پار طلوع ہونے دیکھ لیا تھا اور انہیں مسلمانوں کی سیاسی آزادی کا پورا شعور اور یقین تھا۔ وہ ہندوستان میں انگریزوں کے قیام کو ایک عارضی دور سمجھتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ یہ دور امن وامان سے گزر جائے ورنہ انگریز کا ہندوستان میں مستقل قیام سرسید کا مقصود ہرگز نہ تھا۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو صرف ایک ہی پیمانے سے ناپتے تھے اور وہ پیمانہ تھا قوم۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو صرف اس نگاہ سے دیکھتے تھے کہ یہ میری قوم کے لئے مفید ہے یا نہیں۔ وہ انگریزوں کی حکومت کے بھی خواہ صرف اس حد تک تھے جس حد تک وہ اسے اپنی قوم کے لئے فائدہ مند سمجھتے تھے۔ انہیں انگریز کی "خوشامد" صرف اس وقت تک گوارہ تھی جب تک وہ اسے قوم کے لئے ضروری سمجھتے تھے، ورنہ دنیا میں انہیں اپنی قوم سے بڑھ کر کوئی اور شئے زیادہ محبوب نہ تھی۔ اس خط میں سرسید نے نہ صرف اس راز سے پردہ اٹھایا ہے کہ مسلمان کسی غیر قوم کے تابع نہیں رہ سکتے، بلکہ خلیفہ کے انداز پر ایک منتخب صدر کا بھی تصور پیش کیا ہے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ "میں مسلمان ہوں۔ ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں۔ انہی دو باتوں سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب اور خون دونوں کے لحاظ سے میں سچا ریڈیکل ہوں، عرب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنے اوپر حکومت کریں کوئی اور ان پر حکومت کرے۔ وہ اپنی آزادی کو دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر جانتے ہیں۔ ابھی تک میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے اور میرا مذہب یعنی اسلام جس پر مجھے پورا اور پکا یقین ہے، وہ بھی ریڈیکل اصول کو سکھاتا ہے اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں اور نہ لیمیٹڈ مارکی کو مانتا ہے، بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہے ایک پریذیڈنٹ جس کو لوگ منتخب کریں اس کو اسلام پسند کرتا ہے۔" گویا اس خط میں سرسید نے یہ واضح کر دیا ہے کہ مسلمان آزادی کو تمام نعمتوں سے افضل سمجھتے ہیں اور انہیں موروثی حکومت یا لیمیٹڈ مارکی سخت ناپسند ہے۔ یہ اشارہ بادشاہت برطانیہ کی طرف تھا جہاں لیمیٹڈ مارکی عرصۂ دراز سے قائم ہے۔ "ایک صدر جسے لوگ منتخب کریں" سے مراد صدارتی طرز کی جمہوریت تھی۔

ایک تو وہ دور تھا جب سرسید احمد خاں انگریزی کے اقتدار کے استحکام کے لیئے کوشاں تھے، لیکن ایک دور وہ بھی آیا جب وہ انگریزوں سے مایوس تھے اور ان کے رویے پر کھلم کھلا تنقید کرتے تھے۔ انہیں توقع تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غیر ملکی حکومت کا رویہ مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو جائے گا لیکن جب ان کی توقع پوری نہ ہوئی تو انہوں نے بلا جھجک انگریزوں کے رویے کو غیر منصفانہ قرار دیا۔ سرسید کو انگریزوں کا غرور اور متکبرانہ رویہ سخت ناپسند تھا۔ ان کا ایک خط سید محمود کے ضمن میں اخبارات میں شائع ہوا جس میں انہوں نے لکھا کہ "ہمارے یورپین دوست

جو اس ملک کے فاتح ہیں اور نیچرل تفوق ان کو فتمندی کا ہے اور ہندوستانی جو مفتوح ہیں اور مفتوح ہونے کی نیچرل حقارت ان کو ملی ہے وہ دونوں ایک بیچ پر بیٹھ کر مساوی اعزاز اور افتخار کے ساتھ کام کر سکیں۔ اگر ہندوستانی اپنی سلف اور رسپکٹ کو جو مقتضائے شرافت اور ایمانداری ہے، قائم رکھے" تو دونوں کی زندگی تلخ رہتی ہے۔ ہاں اگر وہ اپنے آپ کو اپنے ہمسر کی مرضی کا، جس کے دل میں بہ سبب فاتح قوم کے ایک فرد ہونے کے ایک نیچرل تفوق سمایا ہوا ہے، تابع رکھے اور اس بے حمیت مسئلے پر کہ" وادھم ماکنت فی دارھم وادھم ماکنت فی ارضھم " پر عمل کرے، تو خوش رہتا ہے مگر جو شخص اپنے کانشنس (ضمیر) کا تابع رہنا چاہے اس سے تو یہ کام نہیں ہو سکتا۔ بات کچھ پوشیدہ نہیں کہ انگریزوں کا برتاؤ جو اپنی قوم کے ساتھ ہے اور جو دوسری قوم کے ساتھ ہے اس میں وہی نسبت ہے، جو سیاہ اور سفید میں ہے"۔

سر سید نے انگریز حکومت کے خلاف کھلم کھلا مایوسی کا اظہار ۱۸۸۴ء میں تقریر کرتے ہوئے کیا۔ آپ نے کہا" وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت قائم ہوئی، ایسا زمانہ تھا کہ ہماری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی اور اس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی۔ اس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تاکہ کاپیل کے عہد نامے کے مطابق وہ دونوں مل کر ایک تن ہوں، مگر اس پر کچھ کہنا ضروری نہیں کہ انگلش نیشن نے اس پاک وعدہ کو کہاں تک پورا کیا" گویا سر سید نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ زمانہ گزر چکا جب ہندوستان بیوہ تھی اور اسے خاوند کی ضرورت تھی۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کی مخالفت میں سر سید نے بڑے جذباتی مضمون لکھے جن کو پڑھنے کے بعد احساس ہوتا تھا کہ اب سر سید نے مسلمان قوم کو اپنے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد اور استقلال کا سبق دینا شروع کر دیا تھا۔ ان کے ایک مضمون کے چند جذباتی فقرے ملاحظہ کیجیے" ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ ہماری رائے میں اس کا جواب صاف ہے! استقلال استقلال، ہمت ہمت، کوشش، کوشش، ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہیئے اور اگر ہم میں سلف رسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے، تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیئے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے، مگر لوگوں کی رائے پر نہیں"۔ یہ عبارت نہ صرف حکومت سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے زور بازو استعمال کرنے کا درس دیتی ہے، بلکہ آزادی گفتار کا پروانہ بھی ہے اور اس دور میں یہ لکھنا کہ ہم کو حکومت کی کچھ پرواہ نہیں اور حکومت کو صرف جانوں پر اختیار حاصل ہے رائے پر نہیں، سر سید ہی کا کارنامہ تھا۔ ان خطوط کے ہر نقطے سے بیزاری ٹپکتی ہے اور جا بجا احساس ہوتا ہے کہ سر سید ہندوستان میں غیر ملکی استعمار کا خاتمہ چاہتے ہیں، لیکن ان حالات میں جب کہ انگریزی اقتدار کی جڑیں انتہائی مضبوط تھیں، وہ صحیح آزادی کا تصور پیش نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی تحریروں، تقریروں اور خطوط سے بے چینی اور اضطراب کا اظہار تو نمایاں طور پر ہوتا ہے، لیکن وہ خود بھی اپنے ذہن میں واضح نہیں تھے کہ آخر اس کشمکش کا حل کیا ہے؟ اس ضمن میں ان کی وہ تقریر بڑی معنی خیز ہے جو انہوں نے ۱۸۹۴ء میں جالندھر کے مقام پر کی تھی اور اس تقریر کے ہر فقرے میں آزادی کی امنگ دھڑکتی محسوس ہوتی ہے۔ اس تقریر میں سر سید نے بڑے اچھے انداز سے مسلمانوں کے مستقبل کی جھلک پیش کی اور مسلمانان ہند کو یہ امید دلائی کہ بہت جلد وہ

وقت آنے والا ہے جب ہمیں اپنے اوپر اختیار ہوگا اور ہم اپنے نظام تعلیم کو اپنی خواہشات کا آئینہ دار بنا سکوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں سرسید سیاسی آزادی کے سب سے پہلے علمبردار تھے اور وہ اکثر اس کا اظہار علمی انداز سے کرتے ہیں، نہ کہ سیاسی اور ہنگامہ خیز انداز سے۔ اس تقریر میں سرسید نے کہا:" دوستو! ہماری پوری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب ہماری تعلیم ہمارے ساتھ میں ہوگی، ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر" اس تقریر کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے وہ خواب دیکھ لیا تھا جو پاکستان کی صورت میں شرمندۂ تعبیر ہوا۔ آپ کے دل سے آزادی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور آپ مسلمانوں کو اس دور کا تصور پیش کر رہے تھے جب کلمہ شہادت کا تاج ان کے سر پر ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی پیشگوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی اور ہندوستان کی راکھ پر مسلمانوں کے لئے جو علیحدہ ریاست قائم ہوئی اس کی بنیادیں بھی لا الہ الا اللہ پر رکھی گئیں اور یہی کلمہ اس میں بسنے والے مسلمانوں کے سر کا تاج رہا۔

حقیقت تو یہ ہے مسلمان عوام ابھی تک تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے تھے، ان میں سیاسی شعور بھی بیدار نہیں ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے نتیجے کے طور پر ہر طرف خوف و ہراس کی چھاپ تھی، ان حالات میں سیاسی آزادی کے لئے کوئی راہ متعین کرنا ناممکن تھا۔ پھر سرسید نے ۱۸۵۷ء کے حالات اور مسلمانوں کا حشر خود دیکھا تھا وہ اتنی جلدی مسلمانوں کو سیاسی آزادی کے حصول کے لئے کسی سیاسی تحریک کو چلانے کا مشورہ نہیں دے سکتے تھے، مسلمان سیاسی طور پر منظم تھے نہ کوئی سیاسی پلیٹ فارم ہی موجود تھا۔ جہاں وہ سیاسی آزادی کا کوئی واضح تصور پیش کر سکے۔ اس وقت تک ایک ہی سیاسی جماعت معرضِ وجود میں آئی تھی اور وہ تھی کانگریس، لیکن سرسید کانگریس کے مخالف تھے، اور وہ ہمیشہ مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رہنے کی تلقین کرتے رہے اس کی ہرگز وجہ یہ نہیں کہ آپ کانگریس میں شمولیت سے اس لئے منع کرتے تھے کہ انگریز اس سے ناخوش ہوں گے۔ اب وہ دور گزر رہا تھا، اب تو سرسید خود بھی انگریز سے ناخوش تھے۔ ویسے کانگریس کے پس پردہ بھی انگریز تھے، اس لئے کانگریس میں شمولیت سے حکومت کی ناراضی کا خطرہ تو شاید نہیں تھا اور نہ سرسید سیاسی آزادی کے مخالف تھے۔ دراصل وہ سمجھتے تھے کہ کانگریس خالصتاً ہندوؤں کی جماعت ہے، اس لئے وہ کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت پسند نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سرسید ہندی اردو کشمکش کے موقع پر ہندوؤں سے بدظن ہوئے لیکن صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی سرسید یہی سمجھتے رہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کا تہذیب و تمدن، مذہب اور اندازِ فکر الگ الگ ہیں اس لئے یہ قومیں مل کر زیادہ دیر تک اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ ان کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ ہندو مسلمان ایک جھنڈے تلے جمع نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے بہت عرصہ پہلے یہ کہہ دیا تھا۔ "کہ یہ ناممکن ہے کہ ہندو یا مسلمان میں کوئی یہاں حاکم ہو اور امن و امان قائم رکھ سکے" اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ سرسید کو علم تھا کہ ہندو اور مسلمان کبھی متحد نہیں ہو سکتے اور ان کو ایک دوسرے سے بہرحال جدا ہونا ہے۔ دوسرے ان کو یہ بھی احساس تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان سے جانا ہے اور یہاں آزادی کا سورج طلوع ہونا ہے تو پھر آنے والوں کے ذہن میں اس

مسئلے کا کیا حل تھا! کیا یہی وہ بنیادیں تھیں جن پر ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوا۔

اگر سرسید جانتے تھے کہ ہندو مسلم اکٹھے نہیں رہ سکتے، اس کے باوجود آپ ہندی اُردو کشمکش سے قبل ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوششیں کرتے رہے۔ آپ نے ایک موقع پر کہا کہ "میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں، اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی۔" حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے اس اتحاد کا نعرہ سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر بلند کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفاق کی فضا پیدا کریں اور انگریز اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاسکیں۔ انگریزوں کی پالیسی تو یہی تھی کہ ان دونوں قوموں کو آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو۔ اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ لیکن جب، بقول مولانا عبدالحق" ہندوؤں کی طرف سے سرکاری دفتروں اور مدارس سے اردو کے خارج کرنے کی تحریک ہوئی، تو سرسید کے دل کو بڑی ٹھیس لگی۔" مولانا حالی لکھتے ہیں کہ انہی دنوں سرسید کی ملاقات مسٹر شیکسپیئر سے ہوئی جو اس وقت بنارس کے کمشنر تھے۔ وہ سرسید کی باتیں سن کر متعجب ہوئے اور کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال کرتے تھے۔ سرسید نے جواب دیا کہ "اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ اب تو بہت کم ہے، آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ بڑھتا نظر آتا ہے۔" سرسید کی یہ پیشین گوئی بالکل درست نکلی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے بعد بھی جب کبھی ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں کی گئیں، تو ہمیشہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ سرسید نے ایک اور خط میں بھی ہندی اردو تنازعہ کا ذکر کیا ہے۔ جس کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

"مسلمان ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار کیا، تو وہ اُردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ مسلمان علیحدہ ہو جائیں گے، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان ہندو سے علیحدہ ہو کر اپنا کاروبار کریں گے، تو مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوگا اور ہندو نقصان میں رہیں گے۔"

یہ خط سرسید کے جذبات کا صحیح آئینہ دار ہے اور اس امر کا شاہد ہے کہ سرسید مسلمانوں کی ہندوؤں سے علیحدگی کو مسلمانوں کے لئے فائدہ مند اور بہتر سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے سرسید کی پیشین گوئی بالکل درست نکلی۔ جوں جوں تعلیم یافتہ طبقے کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہندو مسلم نفاق بڑھتا گیا حتیٰ کہ مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ ہندو مسلمان ایک ہی ملک میں بحیثیت قوم اکٹھے نہیں رہ سکتے اور انہوں نے ایک الگ آزاد ریاست کا مطالبہ شروع کر دیا بقول مولانا عبدالحق" اگر سرسید کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ قصرِ پاکستان کی بنیادیں رکھنے میں سب سے پہلی اینٹ اسی مردِ پیر نے رکھی تھی۔"

یہ تھی وہ فضا اور سیاسی حالات جب ہندی اردو تنازعہ کی راکھ پر انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی۔ مولوی عبدالحق

کے الفاظ میں" عام طور پر سے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہندو مسلم تنازع سیاسی ہیں اور سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کر کے اس کی بنیاد ڈالی۔ یہ سراسر غلط ہے اس کی بنیاد اس وقت پڑی جب ہندوؤں نے اردو کو مٹانے کی کوششیں کیں" لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ہندو مسلم کبھی بھی متحد نہیں تھے' اگرچہ اکبر سے لے کر عصر حاضر تک اس مسئلے کو سلجھانے کی کوششیں کی جاتی رہیں' تاہم تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ سب محض سراب تھا اور ہندو مسلم اتحاد کی حیثیت ریت کی دیوار کی حیثیت سے زیادہ نہ تھی۔

کانگریس قائم ہوئی تو سرسید نے مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے سے روکا کیونکہ وہ اسے" مسلمانوں کے حق" میں نہایت مضر سمجھتے تھے۔ سب سے پہلے تو یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس بنیادی طور پر ہندوؤں کی جماعت ہے اور مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ سرسید نے ایک خط میں بھی یہی بات کہی، آپ نے لکھا" میں نے اپنے ملک اور اپنے لوگوں میں اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کو یہ صلاح دی کہ کانگریس کی خطرناک اور گمراہ کرنے والی تحریک سے الگ رہیں۔ باوجود اس کے کانگریس کی رپورٹوں میں مسلمان ممبروں کو بہت بڑھایا جاتا ہے۔ لیکن اگر غور سے امتحان کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ایک بھی بڑا یا معزز شخص مسلمانوں میں سے اس میں شریک نہیں ہوا اور کانگریس معقول طور پہ اپنے اس دعوے کو صحیح طور پر ثابت نہیں کر سکتی کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات اور آرا اور خواہشوں اور امیدوں کو ظاہر کرتی ہے۔" دوسرے سرسید کو کانگریس کے اس مطالبے سے بھی اختلاف تھا جو اس نے مقابلہ کے امتحان کے ضمن میں کیا۔ سرسید نے اس ضمن میں ایک تقریر میں کہا کہ" اس امتحان کے لئے ہمارا ملک تیار نہیں ہے۔ انگلستان میں مقابلے کا امتحان ہر شخص ڈیوک سے لے کر ادنیٰ درزی کے بیٹے تک دے سکتا ہے' اس لئے جو لوگ انگلستان سے حاکم مقرر ہو کر آتے ہیں وہ ہماری نظر سے اتنی دور ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کس لارڈ کے بیٹے ہیں یا درزی کے، مگر ہندوستان کا حال اس کے برخلاف ہے' ہندوستان کی شریف ترین ملک کے ایک ادنیٰ درجے کے شخص کو جس کی جڑ بنیاد سے واقف ہیں کبھی اپنی جان و مال پر حاکم ہونا پسند نہ کریں گے پھر تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ہندوستان کی حالت اس قدر مختلف متفاوت ہے کہ بہت سی قومیں جیسے مسلمان، راجپوت، سکھ، جاٹ وغیرہ موجودہ حالت میں کبھی مقابلے کے امتحان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔" جب انڈین نیشنل کانگریس نے یہ مطالبہ کیا کہ کونسل کے ممبران انتخاب سے مقرر ہوں تو سرسید نے کہا کہ اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح سے مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ہو سکتی کیونکہ ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں بمقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے۔ اس طریقے سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا، تو چار ہندو ہوں گے۔" اصل میں سرسید محسوس کرتے تھے کہ ان حالات میں جبکہ مسلمان تعلیم یافتہ نہیں اور نہ ہی ان میں منظم سیاسی شعور ہی موجود ہے' انہیں سیاست کی" خار دار جھاڑی" سے الجھنا نہیں چاہیئے مولانا حالی کے الفاظ میں" وہ خوب جانتے تھے کہ مسلمان اور ہندوستان کی اکثر قومیں عموماً تعلیم کے لحاظ سے نہایت پست حالات میں ہیں اور آزادی کے مفہوم اور برٹش حکومت کے اصول سے محض بے خبر۔ ان میں غالب حصہ ان لوگوں کا ہے جن کے نزدیک تمام ملک کا متفق ہو کر گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنا اور ایجی ٹیشن پھیلانا، بعینہٖ ایسا ہے جیسے سلطنت سے بغاوت اختیار کرنا۔ پس ان کی

اور مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ ایجی ٹیشن سے علیحدہ رہیں"۔ سرسید کے ذہن میں یہی خیال کارفرما تھا، اس لئے وہ مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ سرسید نے لکھنؤ میں بھی اپنی تقریر میں کہا تھا "کہ گورنمنٹ سے حقوق طلب کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اپنے تئیں ان حقوق کا مستحق بناؤ" اور اس مستحق بنانے سے ان کی مراد یہ تھی کہ مسلمان تعلیم حاصل کریں، اپنے آپ کو منظم کریں اور ہر لحاظ سے ہندوؤں کے برابر ہو جائیں ورنہ ان حالات میں آزادی کے معنی یہ ہوں گے کہ مسلمان انگریزوں کی غلامی سے نکل کر ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے اور ہندوؤں کی غلامی بہرحال انگریزوں کی غلامی سے بدتر ہے۔

کانگریس نے جب ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ کی تحریک شروع کی تو سرسید نے اس مطالبے کی بھی مخالفت کی تعلیم یافتہ طبقہ سرسید کی اس مخالفت کی وجہ سے کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ اخبارات نے بڑی تنقید کی اور بنگالی صحافت نے تو آپ کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ ہمیشہ ہر مطالبے اور ہر چیز کو صرف اسی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ کیا یہ میری قوم کے لئے بہتر ہے؟ آپ نے اس تحریک کی مخالفت بھی اسی بنا پر کی ورنہ آپ ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ کے مخالف نہیں تھے۔ آپ کو ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ پسند تھی۔ کونسل میں آپ نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ "میں خوش ہوں کہ میں اس عرصے تک زندہ رہا کہ میں نے اس دن کا آغاز دیکھ لیا جب کہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سلف ہیلپ اور سلف گورنمنٹ کے وہ اصول سیکھنے کو ہے جنہوں نے انگلستان میں ریپریزنٹیٹو انسٹی ٹیوشن پیدا کئے ہیں"۔ اس تقریر سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ آپ ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ کے حامی تھے، لیکن آپ نے اس کی مخالفت کیوں کی؟ اس کا جواب آپ کے ایک خط سے ملتا ہے جو آپ نے ایڈیٹر پائنیر، الہ آباد کے نام لکھا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ "میں نے اس مسئلے پر غور کیا تھا کہ آیا ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ ہندوستان کے مناسب حال ہے؟ اور جان اسٹورٹ مل کی آراء پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ چونکہ اوّل لازمی امر ایسے طریقۂ حکومت کے لئے، جس کا انتظام صرف کثرت رائے پر چلتا ہو، یہ ہے کہ ووٹروں میں ہم جنسیت ہو بلحاظ قوم کے اور مذہب کے، عادات و معاشرت کے، رسومات کے اور تمدنی حالات کے اور بلحاظ تاریخی و ملکی روایات کے۔ جب یہ باتیں موجود ہوں، تو یہ طریقۂ حکومت عمل میں آ سکتا ہے۔ ایسے ملک میں، جیسا کہ ہندوستان ہے، کہ جہاں کسی امر بالا میں ہم جنسیت نہیں، سوائے ملک کے امن اور بہبودی کو نقصان پہنچنے کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا۔" اسی خط میں سرسید نے کانگریس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا "اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ مسلمان اور مرہٹہ برہمن اور چھتری مدراسی اور پشاوری وغیرہ سے ایک قوم کی طرح برتاؤ کیا جا سکتا ہے اور ان کا مذہب، زبان، عادات، مراسم اور ملکی اور تاریخی روایات بالکل ایک ہیں۔ گویا وہ انسانوں کا ایک گلہ ہیں۔ میں اس خیال کو وہم سے کم نہیں سمجھتا کہ جمہوری طریقہ کل اقوام اور مذاہب اور ممالک ازمنہ کے لئے یکساں موزوں ہے۔ میری رائے میں یہ طریقہ عقلاً بھی نامکمل ہے کیونکہ کیا یہ ضروری بات ہے کہ انسان کی میجارٹی اس قابل ہے کہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ نارضامند منیارٹی پر بھی حکومت کی جائے۔ حالانکہ حقیقی امر یہ ہے، جیسا کہ مسٹر کارلائل نے بھی کہا ہے کہ کثرت انسان عقلمندی سے بہت دور ہے۔ یہ خیال نیا ممکن نہ ہو، مگر بدقسمتی سے ٹھیک ہے"۔ گویا سرسید ریپریزنٹیٹو حکومت کے

مطالبے کی مخالفت اس لئے کرتے تھے کہ ہندوستان میں کئی اقوام بستی ہیں جن کے مذاہب، تہذیب و تمدن اور روایات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لئے یہاں یہ طریقۂ حکومت کامیاب نہ ہو سکے گا کیونکہ اس طریقۂ حکومت کو اپنانے کے معنی یہ ہوں گے کہ یہاں کی حکومت اکثریت کی ہوگی اور وہ دوسری اقوام کو دبائے رکھے گی۔ اس ضمن میں سرسید نے آئرلینڈ کی بھی مثال دی جس کے لئے ہوم رول کا بل اس لئے نہ پاس ہو سکا کہ وہاں رومن کیتھولکس کی تعداد بمقابلہ پروٹسٹنٹ فرقہ کے زیادہ تھی، اس لئے مخالف پارٹی نے یہ اعتراض کیا کہ اس طرح پروٹسٹنٹوں کو نقصان پہنچے گا اور وہ اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ سرسید نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ "جب آئرلینڈ جیسے ملک میں جہاں نسلی اور مذہبی اختلافات یقیناً ہندوستان سے بہت کم ہیں ایک فرقے کی میجارٹی دوسرے فرقے کے حق میں اس قدر مضر خیال کی جاتی ہے تو ہندوستان میں جہاں برخلاف تمام دنیا کے مذہبی اور قومی تعصبات ترقی تعلیم کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں، ریپریزنٹیٹو اصول سے بھلائی کی امید کیا ہو سکتی ہے"۔

اس کے بعد اس حقیقت میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ سرسید احمد خان نے کانگریس کی مخالفت اس لئے کی کہ وہ ان مطالبات کو مسلمانوں کے حق میں بہتر نہیں سمجھتے تھے اور وہ ہندوؤں کی اکثریت سے بھی بہر حال خوفزدہ تھے، اس لئے سرسید بار بار یہ کہتے رہے کہ کانگریس ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے اور وہ مسلمانوں کے احساسات کی آئینہ دار نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ وقتی طور پر سرسید کے اعتراضات کو مطلق اہمیت نہیں دی گئی، لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ کانگریس مسلمانوں کی بھلائی کی ضامن نہیں ہو سکتی تھی اور اسی ردعمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں نے الگ سیاسی جماعت بنانے کی ضرورت محسوس کی اور اس ضرورت کو عملی جامہ پہنایا۔

سرسید احمد خاں کے نظریات اور ان کی سرگرمیوں پر نگاہ ڈالنے کے بعد ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ چاہتے کیا تھے؟ اول تو سرسید کو یقین تھا کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ان دونوں قوموں کا نفاق بڑھتا جائے گا۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اگر ان دونوں قوموں میں سے کوئی بھی حاکم ہو تو یہاں امن و امان قائم نہیں رہ سکتا، اس لئے ان کا الگ الگ ہو جانا ہی مفید اور بہتر رہے گا۔ دوم ان کو اس امر کا یقین تھا کہ مسلمان کبھی بھی کسی دوسری قوم کے غلام نہیں رہ سکتے۔ ان کو علم تھا کہ تعلیم کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ مسلمان آزادی کے لئے جد و جہد کریں گے۔ سوم ان کو یہ بھی احساس تھا کہ کوئی غیر قوم دوسری قوم کو زیادہ عرصے تک غلام نہیں رکھ سکتی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ آہستہ آہستہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بیزاری پھیل رہی تھی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انگریزوں کو یہاں سے جانا پڑے گا۔ علاوہ ازیں وہ کانگریس کے بھی مخالف تھے اور اس کے ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ کے مطالبے کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ گو سرسید سیاسی آزادی کے دلدادہ تھے، لیکن وہ یہ سمجھتے تھے ان حالات میں آزادی کا مطلب ہندوؤں کی آزادی اور مسلمانوں کی غلامی ہوگا۔ وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ ان حالات میں جمہوریت کا مطلب ہندو اکثریت کی حکومت کا ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر سرسید چاہتے کیا تھے؟ یقیناً سرسید یہ تو چاہتے تھے کہ ہندوستان کو سیاسی آزادی ملے، لیکن ہندو اور مسلمان الگ الگ ہوں۔ مسلمانوں کے پاس اپنا علیحدہ خطۂ زمین ہو جس میں وہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں اور وہ اپنے مذہب اور اپنی روایات کی روشنی میں اپنے لئے ایک الگ زندگی کا نقشہ مرتب کر سکیں۔ ان کا نظامِ تعلیم ان کے اسلامی نظریات کا آئینہ دار ہو۔ "ان کے ایک ہاتھ میں قرآن پاک ہو اور ان کے سر پر کلمہ لا الہ الا اللہ کا تاج ہو"۔ سرسید کی تحریروں اور تقریروں کے ان ٹکڑوں کو یکجا کرنے سے کیا یہی احساس نہیں ہوتا کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے نام سے جو عظیم اسلامی مملکت دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر ہوئی، سب سے پہلے اس کا خواب سرسید ہی نے دیکھا تھا؟

شخصی آزادی، سماجی ذمہ داری اور اقبال

ڈاکٹر سلیم اختر

آزادی اور شخصی آزادی میں خاصہ فرق ہے اسی لیے مختلف مذاہب میں آزادی کا تصور تو ملتا ہے لیکن شخصی آزادی کا پہلو جو کہ خالص مغربی طرزِ معاشرت بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ضمنی پیداوار ہے۔

جہاں تک آزادی کا تعلق ہے تو مذاہب عالم میں اس کی مختلف صورتیں ملیں گی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ صورتیں ملیں گی جن کے ذریعے آزادی کو پابند کر کے آزادی کے ایک خاص مفہوم کی تشکیل کر کے اسے ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں ذات پات کا کٹر نظام فرد کو خواہ مخواہ ایک دائرے میں محبوس کر دیتا ہے یوں ذات کی زنجیر سے بدھا ہندو ایک خاص حد سے آگے پرواز نہیں کر سکتا۔ بدھ مت میں آزادی نام ہے رداں کا جو جنموں کے چکر بھگتنے کے بعد کہیں جا کر نصیب ہوگی۔

انتھروپالاجی نے وحشی معاشروں کے بارے میں جو معلومات اور شواہد جمع کیے ہیں وہ ان کے نظام اخلاق کے بارے میں بھی کارآمد معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ ان معاشروں میں خدا کا تصور ہو یا نہ ہو، عقاید یا تصورات کی صورت میں مذہب کا کوئی مربوط اور واضح تصور ملے یا نہ ملے لیکن TABOOS کی صورت میں فرد تو وہاں بھی کسی نہ کسی لحاظ سے پابند نظر کیا جاتا ہے حتیٰ کہ خود لفظ TABOO بھی پولی نیسیاں کے جزائر میں بسنے والے قبائل کا عطیہ ہے۔ الغرض قدیم ترین عہد کے وحشی اور نیم متمدن سے لے کر آج کے مہذب اور تعلیم یافتہ افراد تک کسی کو بھی لے لیں سب میں آزادی کی اساس پابندیوں پر استوار نظر آئے گی بالفاظ دیگر منفی سے مثبت کا تصور ابھارا جاتا ہے۔

یہ منفی کیا ہے؟

معاشرہ ــــ یا ہر نوع کی قدغن جو معاشرہ اقدار کے نام پر عائد کرتا ہے اسی لیے تو فرد کو جو تھوڑی بہت آزادی حاصل ہوتی ہے وہ اسے کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ بلکہ بعض اوقات تو اسی تھوڑی سی آزادی کے حصول کے لیے وہ اور کئی امور کی صورت میں بھاری قیمت بھی ادا کرتا ہے اور یہ سب اس لیے کہ وہ معاشرہ سے خود کو منقطع بھی نہیں کر سکتا۔ معاشرہ بھی فرد کو بہت کچھ دیتا ہے لیکن ان سب سے تحفظ کا احساس اور شناخت بے حد اہم ہیں۔ تحفظ کا احساس فرد کی گروہی جبلت کی تسکین کرتا ہے تو شناخت IDENTITY اسے اپنے ہونے کا یقین دلاتی ہے۔ یہ شناخت جب شخصی سطح پر فرد پائے تو نرگسیت اور اس سے وابستہ دیگر نفسی میلانات ظہور پذیر ہوتے ہیں جب کہ اجتماعی سطح پر فرد کو معاشرہ

کی صورت میں ایک ایسا سیاق و سباق مل جاتا ہے جہاں دیگر افراد سے تقابل کے بعد وہ اپنی شناخت کرتا ہے۔ یہ نکتہ بے حد اہم ہے اور اجتماعی نفسیات کے کئی اہم مسائل اس سے وابستہ نظر آئیں گے۔

مختصر ترین الفاظ میں یہ ہے وہ تناظر جس میں فکر اقبال میں آزادی شخصی آزادی اور سماجی ذمہ داریوں ایسے اہم ترین مسائل کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

علامہ اقبال کے ضمن میں ایک بات تو طے ہے کہ اگرچہ ان کے فکری ماخذات میں خاصہ تنوع ملتا ہے لیکن اساسی ماخذ قرآن مجید ہے یا پھر مولانا روم — لیکن مولانا روم کی مثنوی کو تو خود "قرآن در زبان پہلوی" قرار دیا جاتا ہے[1]

علامہ اقبال کی عظمت اس امر میں ہے کہ انہوں نے تنگ نظر ملا کی مانند قرآن مجید کی "کوتاہ تعبیر" نہ کی بلکہ اس کے اساسی اصولوں کی روشنی میں اپنی فکر کے مختلف گوشوں کو منور کیا۔

اسلام دین فطرت ہے اسی لیے اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے انسانی جبلتوں کو کچلنے کی تلقین نہ کی بلکہ اس توانائی کی صداقت کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے وابستہ تقاضوں کی اہمیت سے انکار نہ کیا جس کا اظہار جنگ اور جنس کے ضمن میں دیئے گئے احکامات سے ہو سکتا ہے چنانچہ مسلمانوں کو نہ تو انفرادی سطح پر حضرت عیسیٰ کا آئیڈیل بنانے کی کوشش کی گئی یعنی ایک تھپڑ کھا کر دوسرا کھانے کے لیے گال آگے کر دو۔ اور نہ ہی اجتماعی سطح پر بدھ مت کی طرح قومی دفاع اور قومی بقا ایسے اہم معاملات پر نروان سے چکروں کو فوقیت دی۔ چنانچہ مسلم فرد کو اگر آنکھ کے بدلے میں آنکھ اور جان کے بدلے میں جان لینے کی اجازت دی تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں یا اجتماعی دشمن کے مقابلہ میں قوم کو سیسہ پلائی دیوار بننے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

سینٹ پال BETTER BURN THAN TO MARRY کا قائل تھا جبکہ اسلام نے نسل انسانی کے فروغ کو اسی اہم ترین جبلت کی شدت اور قوت کو تسلیم کرتے ہوئے مخصوص حالات کے مطابق چار تک بیویوں کی اجازت دے دی۔ لیکن شرائط و حقوق اور احکام و نواہی کی صورت میں خاوند کو پابند بھی کر دیا۔

اب تک فرد کی آزادی کو پابند کرنے والے جن امور کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب کے سب اپنے ماخذ سے قطع نظر — سماجی نوعیت کے ہیں اور ان کی نفسیت اور حقیقت انسانی شخصیت میں اثبات پیدا کرنے یا اسے مزید تقویت دینے کا ایک انداز ہیں لیکن تقدیر کی صورت میں انسان خود کو جس طرح پابند محسوس کرتا ہے وہ جداگانہ نوعیت کی بحث بن جاتی ہے۔ تقدیر آسانی ہے مگر زمین کے باشندوں کو متاثر کرتی ہے۔ انسانی زندگی میں بیشتر پابندیوں، محرومیوں اور حرماں نصیبیوں کا جواز تقدیر سے مہیا کیا جاتا ہے اس لیے تقدیر بھی تازیانہ عبرت

---

[1] "آپ اسلام اور اس کے حقائق کی لذت سے آشنا ہیں۔ مثنوی رومی کے پڑھنے سے اگر قلب میں گرمی شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہیئے۔ شوق خود مرشد ہے۔ میں ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کر چکا ہوں اگر کبھی کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن پاک یا مثنوی رومی"

علامہ اقبال بنام

حکیم محمد حسین عرشی

۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء

بنتی ہے تو کبھی زخموں کا پھاہا۔ کبھی اپنی عسرت کا مداوا تو کبھی دوسروں کی عشرت کا جواز، کسی کے لیے زہر بنی تو کسی کے لیے افیون!

علامہ اقبال تقدیر کے مضر نقصانات سے بخوبی آگاہ تھے وہ انفرادی اور اجتماعی ہر دو لحاظ سے قومی زندگی کے لیے اس کی مضرتوں سے آگاہ تھے۔ "پیر و مرید" میں مرید ہندی سوال کرتا ہے۔

اے شریک مستیٔ خاصانِ بدر۔ میں نہیں سمجھا حدیث جبر و قدر

اس پر پیر رومی یہ جواب دیتا ہے۔

بال یاراں را سوئے سلطان برد　　　بال زاغاں را بگورستان برد

"ضرب کلیم" کی ایک مختصر نظم "احکام الہیٰ" بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالتی ہے۔

پابندیٔ تقدیر کہ پابندیٔ احکام　　　یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خردمند

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر　　　ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات　　　مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

نباتات میں بھی انسانوں کی مانند نمو کی صلاحیت اور نشوونما ملتی ہے لیکن یہ نمو اور نشوونما خودکار اور فطرت کے خارجی نظام کی مرہون منت ہوتی ہے جب کہ انسان کی فعلیت اس کے خود مختار ارادہ سے جنم لیتی ہے یا اسے جنم لینا چاہیئے۔ بالفاظ دیگر جمادات کی یہ تقدیر ہے کہ وہ خود سے حرکت بھی نہیں کر سکتی اور دنیا کی ٹھوکروں پہ ہے۔ نباتات کا مقدر یہ ہے کہ وہ اپنی نشو و نما پر بھی قادر نہیں۔ زمین، ہوا، پانی جس طرح چاہیں ان کی پیکر تراشی کر دیں لیکن انسان اور بالخصوص مرد مومن جب جمادات اور نباتات کی زندگی کے بے جان اصولوں سے بلند ہوتا ہے تو خود بخود تقدیر کا بندھن ٹوٹ جاتا ہے تقدیر سے آزادی محدود قوت کا احساس پیدا کر سکتی ہے اس لیے اس کے ساتھ ہی احکام الٰہی کی پابندی سے تقدیر سے آزاد ہونے کی آزادی کو لامحدود آزادی میں تبدیل ہونے سے بچا لیا گیا یعنی آزادی سیلاب کی طرح بے لگام نہیں ہونے پاتی بلکہ احکام الٰہی کی صورت میں کناروں کی پابند ہو جاتی ہے آزاد وہ اب بھی ہے۔ لیکن اپنی حدود میں رہ کر۔ ورنہ یہ آزادی بھی کفر کفران بن سکتی ہے

علامہ انفرادی سطح پر فرد کی تقدیر اور اس سے جنم لینے والے اچھے برے حالات کو چنداں اہمیت نہیں دیتے اس لیے کہ ان کے سامنے جو مقاصد خاص تھے وہ قومی نوعیت کے تھے اور ان کا تعلق بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی سرفرازی اور بقا سے تھا چنانچہ "ضرب کلیم" کی ایک مختصر نظم "تقدیر" میں فرد اور قوم کے لیے شیوۂ تقدیر کو یوں اجاگر کرتے ہیں!

نا اہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت　　　ہے خوار زمانے میں کبھی جوہر ذاتی

شاید کوئی منطق ہو نہاں اس کے عمل میں　　　تقدیر نہیں تابع منطق نظر آتی

ہاں ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو　　　تاریخ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی

ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی　　　براں صفت تیغ دو پیکر نظر اس کی

علامہ نے خودی کی صورت میں جو تصور حیات پیش کیا، ناقدین اور شارحین نے اس کی تشریح و توضیح میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ اس ضمن میں مزید کہنا تشریح مکرر کے مترادف ہوگا۔ مختصراً اتنا کہا جا سکتا ہے کہ فکر اقبال میں خودی کو وہی مرکزی حیثیت حاصل ہے جو نظام شمسی میں سورج کو۔ جس طرح جملہ سیارگان اپنی آزاد رفتار بلکہ خودکار گردش کے باوجود سورج کی کشش کے تابع ہیں اس

حد تک کہ ان کی گردش کا مدار بھی اسی سے طے پاتا ہے تو اسی طرح علامہ اقبال کے بیشتر محبوب تصورات جیسے عشق، وجدان، مردِ مومن وغیرہ یہ سبھی اپنی اساس میں خودی کے مرکزی تصور سے روشنی اخذ کرتے ہیں۔ مختصر ترین الفاظ میں خودی، خودی شناسی ہے، یہ عرفانِ ذات بھی ہے اور شعورِ زیست بھی، اس کا بنیادی مقصد فرد کو اندیشۂ امروز و فردا اور بیم رد جاسے آزاد کرنا ہے علامہ اقبال نے خودی کے مقاصد خاص کو جس طرح اجاگر کیا اس سے یہ بے پناہ توانائی پیدا کرنے والی چیز بن جاتی ہے۔

دنیائے فکر میں خودی کی توانائی کی مانند دو اور تصورات بھی ملتے ہیں۔ برگساں کا قوت حیات (ELAN VITAL) اور دوسرا فرائڈ کا جنسی توانائی (LIBIDO) کا۔ لیکن یہ دونوں تصورات اقبال کی خودی کے مقابلہ میں یک رخے اور یک جہتی (ONE DIMENSIONAL) معلوم ہوتے ہیں۔ برگساں کی قوت حیات۔ ترتیب و تنظیم اور مقاصد اعلیٰ سے تہی اپنی منطقی انتہا میں ایک اندھی اور بے مہار قوت ہے۔ جبکہ لبیڈو جنس پر استوار ہے اور لاشعور کی بھول بھلیوں میں گم! خودی ان کے برعکس انسان کی اپنی ذات سے جنم لیتی ہے۔ مگر کچھ شرائط کے ساتھ اور یہ شرائط اسے پابند کر کے محض ELAN VITAL بننے سے بچاتی ہیں۔ علامہ کو بھی اس امر کا احساس تھا کہ خودی کی صورت میں جو قوت وہ انسان کو دے رہے ہیں وہ بھی اسے ضرورت سے زیادہ آزاد بنا سکتی ہے۔ اقبال فرد کو آزاد تو دیکھنا چاہتے ہیں مگر وہ اسے باغی نہیں بنانا چاہتے۔ اسی لیے مردِ مومن اور فوق البشر میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ اقبال کا مردِ مومن سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس دنیا میں خدا کی حاکمیت کا اعلان کرتے ہوئے بندگی کے آداب بجا لاتا ہے۔ جب کہ فوق البشر خدا کی موت سے اپنی آمد کا اعلان کرتا ہے۔ جب خدا ختم ہو گیا تو پھر اس کی صورت میں ایک لامحدود مثالی تصور بھی ختم ہو جاتا ہے جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان ہی فوق البشر بن کر خود خدا بن بیٹھتا ہے جب کہ مردِ مومن خدا کا نائب کہلوانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

اس سارے فکری پس منظر میں فرد کی آزادی اور اس سے وابستہ مسائل کے بارے میں علامہ اقبال کا رویہ بالکل واضح ہو جاتا ہے یعنی وہ انسان کو انسان کی صورت میں معراجِ کمال تک پہنچتا دیکھنے کے تو متمنی ہیں۔ لیکن جائز حدود کے اندر اور صرف مردِ مومن کی حد تک، وہ اسے خدا بننے کی آزادی دینے کو تیار نہیں۔ اس لیے نہیں کہ انسان کے خدا بننے سے خدا کا کچھ بگڑتا ہے بلکہ اس لیے کہ یوں وہ مکمل انسان بننے کی جدوجہد، کشاکشِ حیات اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی لذت سے محروم رہ جاتا ہے۔

ادب اور مسئلۂ خیر و شر

رؤف انجم

خیر و شر کا مسئلہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ اس کرۂ ارض پر انسان کا وجود اور جب سے انسان نے اپنے احساسات و خیالات کو اظہار کی شکل دینا سیکھا ہے۔ اسی وقت سے نیک و بد کا تصور مختلف اشکال میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ اس تصور میں مختلف شعور کارفرما نظر آتے ہیں۔ مثلاً انسان کا اجتماعی شعور اور معاشرے کے تقاضے، انسان کا مابعدالطبیعاتی اور روحانی تجربہ اور کسی فردِ واحد کا ذاتی نظریہ جو اجتماعی شعور کا حصہ نہ بن سکا ہو۔

اگر بنظرِ عمیق جانچا جائے تو ان سب میں ایک قدرِ مشترک پائی جاتی ہے۔ خیر و شر کا تصور ہر صورت میں کسی فردِ واحد کے ذاتی تجربات و مشاہدات یا روحانی انکشافات کی بنا پر پروان چڑھتا ہے۔ جب ان تجربوں اور مشاہدات سے معاشرے کے بیشتر افراد کو سابقہ پڑتا ہے اور وہ ایک ہی طرح کے نتائج پر پہنچتے ہیں تو یہ تصور ایک معیار اور نظریے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مگر زمانے کے ساتھ ساتھ تجربے اور مشاہدے کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے اور اسی طرح کچھ تبدیلیاں ان افراد میں بھی آجاتی ہیں جو نت نئے ماحول میں جنم لیتے ہیں اور بدلتی ہوئی ترقی پذیر یا روبہ زوال تہذیبوں سے منسلک رہتے ہیں۔ چنانچہ ان عوامل کے تحت خیر و شر کے نظریے میں بھی آہستہ آہستہ تغیر آتا رہتا ہے جس صورت حال کو ایک قدیم دور میں مستحسن سمجھا جاتا تھا لازم نہیں کہ وہی صورت آج بھی اچھی گردانی جائے اور اسی طرح بعض نظریات جو ادوارِ قدیم میں انفرادی یا اجتماعی زندگی میں برے سمجھے گئے وہ فکرِ جدید کی روشنی میں قابلِ قبول مانے گئے ہیں۔

ادب جو دراصل انسان کی فکری اور حسی تاریخ ہے ان بدلتے ہوئے نظریات کو ہر دور میں منعکس کرتا رہا ہے چونکہ ادب کا تعلق انسان اور اس کی زمینی زندگی سے ہے اس لئے اسے انسان کے ذہنی، فکری اور جمالیاتی عروج و زوال کی داستانوں کا مرقع کہنا بے محل نہ ہوگا۔ چنانچہ ادب کے مطالعے سے ہی ہم دور کے خیر اور شر کے ادبی نظریات سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔

قدیم یونانی ڈرامہ نگاروں کی تخلیقات ہمیں کچھ اس قسم کا احساس دیتی ہیں کہ مذہبی عقائد و نظریات کے باوجود خیر اور شر کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کی جا سکتی۔ یونانی معاشرے میں دیوتاؤں کو وہی حیثیت حاصل تھی جو بعد کے ادوار میں خدائے واحد کی ہے۔ یونانی دیوتا انسانوں کے لیے قوانین تو وضع کرتے تھے لیکن خود ان قوانین کے تابع نہ تھے۔ ان کے نافذ کردہ قوانین گو بظاہر انسانی معاشرے کو انتشار سے بچانے کے لیے تھے لیکن عملی طور پر ان سے کوئی مسئلہ بھی حل نہ ہو سکا۔

بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان دیومالائی قوانین کے اتباع میں انسان مزید الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار ہوگیا۔

ایسکائی لس (AESCHYLUS) کے عظیم المیوں میں اسی اہم امر کی طرف جھجکتے ہوئے اشارات ملتے ہیں۔ وہ ایک ایسے پس منظر میں ڈراموں کو پیش کرتا ہے جہاں دیومالائی قوانین کی حکمرانی ہے اور ان قوانین میں کچھ واضح اوامر و نواہی ملتے ہیں۔ دیوتاؤں کی تکفیر سب سے بڑا جرم ہے اور ان کی اطاعت اور احترام ایک عظیم کارِ خیر۔ خاندان کی بقا اور احساسِ یگانگت کے فروغ کے لئے کچھ ایسے قوانین ہیں جن سے انحراف کی کڑی سزا ہے اور اس ضمن میں سب سے بڑا جرم اعزا و اقربا کا خون کرنا ہے۔ جو اپنے خونی رشتے کا احترام نہیں کرتا اور بنیادی معاشرتی اکائی یعنی گھر میں قتل و غارت گری کا مجرم ہے اس کو مکافات سے کسی طور بچایا نہیں جا سکتا اور خود انسانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ مقتول کا قصاص لینا مقتول کے قریب ترین رشتے دار کا اولیں دینی فریضہ ہے۔ اسی طرح ایک تیسرا گناہِ کبیرہ مہمان یا صاحبِ خانہ کی بے حرمتی ہے۔ جو شخص اپنے مہمان یا کوئی مہمان اپنے میزبان سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے وہ دیوتاؤں کے عذاب سے بچ نہیں سکتا۔ ان جرائم کے ارتکاب میں جو بھی قصداً یا سہواً ملوث ہوا اسے پاپی اور گنہگار شمار کیا جاتا اور اہلِ خیر وہی سمجھے گئے جو ان جرائم سے دامن بچائے رکھے۔

قدیم یونانی معاشرہ عمومی طور پر ان دیومالائی قوانین کا معتقد تھا مگر یہ قوانین اور ضابطے انسان کو عدل کی طرف نہ لا سکے۔ ایک بیوی اگر اپنے خاوند کے خون سے ہاتھ رنگ لیتی تو وہ گناہِ کبیرہ کی مرتکب نہ سمجھی جاتی کیونکہ خاوند کے ساتھ بیوی کا کوئی نسبی یا خونی رشتہ نہیں ہوتا لیکن اگر مقتول خاوند صاحبِ اولاد ہوتا تو پھر بیٹے پر یہ دینی فریضہ عائد ہوتا کہ وہ مقتول کا قصاص لے چاہے قاتلہ اس کی اپنی ماں ہو۔ ایسکائی لس کے ڈرامے ایگامیمنون (AGAMEMNON) میں یہی مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ایگامیمنون دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی نوعمر بیٹی یعنی جنایا (IPHIGENIA) کی جان کو بھینٹ کرتے ہوئے اس گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے جس کی مناہی دیوتاؤں نے کی ہے۔ اپنی بیٹی کا قصاص لینے کے لیے ایگامیمنون کی بیوی کلیتم نسترا (CLYTEMNESTRA) اپنے خاوند کو قتل کرتی ہے اور بعد ازاں ایگامیمنون کا بیٹا جب سنِ شباب کو پہنچتا ہے تو اپنے باپ کے قتل کا انتقام اپنی والدہ کو قتل کرنے کی صورت میں لیتا ہے۔ اس ڈرامے میں ہر کردار خیر کے جذبے سے قتل کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ دیومالائی قانون میں کسی اور راہِ عمل کی گنجائش نہیں۔ ہر قاتل کو دیوتاؤں کی خوشی مقصود ہے مگر ہر قتل معاملے کو اور الجھا دیتا ہے اور دیومالائی ضوابطِ خیر و شر کے تحت یہ سلسلہ در سلسلہ قتل کہیں تھمنے کا نام نہیں لیتے۔ ان الجھے اور پیچیدہ معاملات میں ایسکائی لس واضح طور پر یہ تصور دیتا ہے کہ دیوتاؤں کا عطا کردہ نظامِ خیر و شر نامکمل ہے اور اسی ڈرامے کے تیسرے جزو میں عدل و انصاف کے تصور کے بارے میں کئی سوال اٹھائے جاتے ہیں جن کا تسلی بخش جواب خود دیوتاؤں کے پاس بھی نہیں۔ چنانچہ یہ مقدمہ ایتھنز میں انسانوں کی سب سے بڑی عدالت میں لایا جاتا ہے جہاں دیوتا اور ایگامیمنون کا بیٹا دو فریق ہیں اور انسانوں کی یہ عدالت معافی، روا داری اور فراخدلی کے تحت ایگامیمنون کے بیٹے کو معصوم اور گناہ سے پاک قرار دیتی ہے۔ اس طرح ایسکائی لس ایک نئی انسانی قدر کا مبلغ بن جاتا ہے کہ خیر یہ نہیں کہ خون کا بدلہ ہر حالت میں خون ہی ہو بلکہ خیر کا تصور معافی اور جاں بخشی میں ہے جو قدیم دیومالائی قوانین

کے تحت شر کے زمرے میں آتا تھا۔

یونانی ادب کی اہمیت انہی اقدار پر مشتمل ہے کہ اس میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اس ادب کے مطالعے سے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ تمام مابعدالطبعاتی تصورات جو راہبوں اور کاہنوں نے روحانی قوتوں کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے انسان پر جبراً نافذ کئے ہیں وہ انسان کو طمانیت قلب اور خوشی دینے سے قاصر ہیں۔ اصل راستہ یہی ہے کہ انسان اپنی منزل کو خود تلاش کرے۔ اس جستجو میں اسے لازماً کئی ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں اور ہر چند کہ وہ صحیح راستہ بھی تلاش نہیں کر سکتا تاہم یہ جستجو اور کوشش اسے ہر بار ایک نیا ولولہ اور عزم دیتی ہیں اور وہ اپنی عظمت کا ادراک کر سکتا ہے۔ وہ انسانی حوالے سے خیر اور شر کے تصورات قائم کر سکتا ہے جو اس کے اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں۔

اس انسانی تصورِ خیر و شر کی حیثیت مذہبی اقدار سے ہمیشہ مختلف رہی ہے۔ مذہب ایسے نظریات اور اوامر و نواہی کا مجموعہ ہے جن پر عقلی طور پر یا تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر بحث کی گنجائش نہیں۔ مذہبی نظریہ میں لچک اور ماحول کے ساتھ خود کو بدلنے کی صلاحیت نہیں چنانچہ مختلف مذاہب عالم جو شروع میں انسانی ضرورتوں کو پورا کرتے رہے بعد میں زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے سکے معدوم ہو گئے اور اگر ان کے پیروکار آج بھی نظر آتے ہیں تو وہ محض نام کے پیروکار ہیں عملی طور پر وہ ان قدیم مذہبی تصورات کو اپنی زندگیوں میں نافذ کرنے میں ہمیشہ ناکام نظر آئیں گے۔ کچھ ایسے ڈھیلے ڈھالے مذاہب بھی ہیں جنہوں نے خیر اور شر کے بارے میں کوئی سخت حتمی فیصلہ نہیں دیا اور انسان کو اس کی اپنی صوابدید پہ چھوڑ دیا ہے۔ ہندومت ایسا ہی مذہب ہے جس میں بت پرستی اور خدا پرستی، ہمسائے سے دشمنی اور رواداری، منہ میں رام رام اور بغل میں چھری غرض تمام تضادات کی گنجائش ہے اور اس کے ماننے والے ہر قسم کے اخلاقی اور غیر اخلاقی افعال کی سند اسی سے حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے کردار میں کسی طرح کی پابندی محسوس نہیں کر سکتے۔ ایسے مذاہب کا بیسویں صدی میں وجود دراصل اس امر کا غماز ہے کہ اصل فوقیت انسان کو ہی حاصل ہے اور وہ ڈھیلے ڈھالے مذہبی ضابطوں کو اپنے لئے مفید جانتے ہوئے انہیں اپنائے ہوئے ہے۔ اس کے برعکس الہامی مذاہب مثلاً عیسائیت، یہودیت اور اسلام میں خیر اور شر کی واضح حدود ہیں۔ اسلام میں جو خیر اور شر کے تصورات ہیں وہ ابدی اور ناقابلِ تغیر ہیں اور تا حال مسلمانوں کو ان کے بارے میں کوئی ذہنی خلجان سے سابقہ نہیں پڑا بلکہ ان تصورات کی آفاقیت اور ابدیت نے غیر مسلموں کا بھی اس کا قائل کر دیا ہے اور وہ اپنی اپنی طرزِ زندگی میں ان تصورات کو دیگر ناموں کے تحت نافذ کئے ہوئے ہیں۔

مذہبی شعور میں عقیدت، عشق اور جذبات کو بہت دخل ہے اور مذہبی صداقتیں اگرچہ عقلی طور پر بھی انسان کو قائل کرتی ہیں تاہم ان صداقتوں کا اعتراف اولاً جذباتی وابستگی سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ ادب میں ان صداقتوں اور وابستگیوں کا تذکرہ ناگزیر ہے کیونکہ جس طرح زندگی کے سفر میں انسان عقل و دلائل کی لاٹھی کے سہارے کا محتاج ہے اسی طرح مذہب کی قندیل سے بھی تاریکیوں میں روشنی کا طالب رہتا ہے۔ کسی منزل پر اسے یہ روشنی نظر نہیں آتی اور کسی مقام پر وہ بغیر لاٹھی کے راستہ ٹٹولتا رہتا ہے مگر یہ تمام صورتیں دراصل انسان کے وجود کی ہی صورتیں ہیں اور ان سب صورتوں کا عکس ہر اس

ادب میں ملے گا جو کسی بھی قوم یا معاشرے کا صحیح ادب ہے۔ ان مختلف النوع صورتوں کو تاریخی رشتے کے وسیلے سے دیکھنے کے بعد انسان کے سفر کا نقشہ تو کھینچ سکتا ہے مگر یہ کہنا ازحد مشکل ہے کہ جو سمت انسانیت نے اپنے لئے تجویز کی ہے وہ درست یا غلط ہے اور پھر یہ تو وثوق سے کبھی بھی نہیں کہا جا سکتا کہ جو مسلک بھی اختیار کیا گیا ہے وہ منزل کی طرف ضرور لے جائے گا کیونکہ اس سفر میں منزل کا تعین ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس شاہراہ پر ہر قدم ایک ان دیکھی منزل کی طرف بھی ہے اور بذاتِ خود منزل بھی ہے۔

لہذا خیر و شر کا معاملہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حل ادب میں تلاش کرنا مشکل ہے۔ ہر دور کے ادب میں انفرادی اور اجتماعی طور پر البتہ اس مسئلے کا ایسا حل ضرور موجود ہے جو وقتی تقاضوں اور ماحول کی ضروریات نیز لکھنے والوں کی شخصیت کے امتزاج سے متشکل ہوتا ہے یہ علیحدہ امر ہے کہ جس حل کی نشاندہی ادب نے کی ہو وہ مذہبی عقائد اور اخلاقی ضابطوں کے دائرہ کار سے باہر ہو۔ اگر کسی فن پارے میں مروجہ اخلاقی و مذہبی اصولوں اور نظریوں کے خلاف بغاوت کا تاثر ملے تو اس دور کے ادبا کو سماجی اور قانونی گرفت و احتساب کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن بسا اوقات وہی تحریریں جو پہلے دور کے قارئین کو چونکانے والی اور معاشرتی انتظامی مشینری کو حرکت میں لانے والی ہوتی ہیں آنے والے ادوار میں کلاسیک کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہیں کیونکہ آنے والے ادوار میں یا تو خیر و شر کے نظریات کے بارے میں تبدیلی رونما ہو چکی ہوتی ہے یا ان زمانوں میں اتنی لچک اور فراخدلی آ جاتی ہے کہ وہ تحریریں مروجہ اصولوں یا قدروں کے خلاف نہیں سمجھی جاتیں ایسکائی لس کے ڈرامے اسی زمرے میں آتے ہیں کیونکہ ان میں اپنے ہمعصروں کے عقائد کے متعلق تشکیک کا اظہار کیا گیا ہے اور دیو مالائی قوانین پر انسان کے اپنے ذہن کی برتری ظاہر کی گئی ہے۔

بہرحال یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زندہ ادب وہی ہے جو کسی نہ کسی رشتے سے ہر دور سے منسلک رہتا ہے۔ چاہے یہ رشتہ انسان کی جمالیاتی حس کی تسکین کا ہو یا نظریاتی اور اخلاقی قدروں کا رشتہ ہو۔ ادب کی اخلاقی قدروں میں زمان و مکان کی رعایت سے تھوڑی بہت تبدیلی اور تصادم سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر اعلیٰ ترین آفاقی اقدار وہی ہیں جو انسان کی فطرت سے ہم آہنگ ہوں اور یہ اقدار صرف ایک دینِ فطرت ہی دے سکتا ہے جو انسانوں کا وضع کردہ نہیں، بلکہ انسانوں کو تخلیق کرنے والے کا عطیہ ہے۔ تمام زندہ رہنے والے فن پاروں کی یہی خصوصیت ہوگی کہ جہاں وہ قارئین کی ادبی اور جمالیاتی حس کو تسکین بہم پہنچائیں وہیں وہ آفاقی اخلاقی قدروں کے معیار پر بھی پورے اتریں۔

اگر کسی ادب پارے میں ایسی اقدار کا سراغ ملتا ہو جو اجتماعی انسانی شعور کے تجربات و مشاہدات کے برعکس ہوں تو وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ادیب کے لئے یہ تو آسان امر ہے کہ وہ جزئیات میں اخلاقی قدروں کی ترجیحات سے اختلاف کرے مگر مسلمہ اخلاقی اصولوں سے یکسر روگردانی اس کی شہرت اور بقا کے لیے رکاوٹ ہوگی ویسے بھی جب تک ادیب اور قاری میں مشترک اقدار نہ ہوں ان کے درمیان رابطہ قائم نہیں رہ سکتا۔ جس طرح ایک غیر مروجہ اور متروک زبان کا استعمال ابلاغ میں سدِ راہ بن جاتا ہے اسی طرح ادیب کا مسلمہ اخلاقی اصولوں سے انحراف اس کی ادبی موت پر منتج ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ادیب خیر و شر کے انہی نظریات سے کلی طور پر متفق ہو جو مذہب یا

فلسفہ کے پیش کردہ ہیں کیونکہ اگر ایسا ہو تو ادب کے دائرہ کار سے وہ حصہ خارج ہو جائے گا جو انسانی شعور کو وسیع کرنے اور دامنِ آگہی کو پھیلانے سے متعلق ہو۔ ادیب کی ذاتی آزادی اس امر کی متقضی ہے کہ وہ مسلمہ اخلاقی اصولوں اور ضابطوں کو میدانِ عمل میں دیکھے اور تنقیدی نگاہ سے ان کے حسن و قبح کو پرکھے۔ ایسے آفاقی اخلاقی قدروں سے بنیادی طور پر اختلاف نہیں ہو سکتا مگر جس انداز میں یہ آفاقی اقدار معاشرے میں جاری و ساری ہوں اس انداز پر اُسے تنقید کرنے کا حق ہے۔ اب اس معاشرے کو سدھارنے کے لئے کوئی پیغمبر مبعوث نہ ہو گا اور اب کوئی نیا معیارِ خیر و شر نازل نہیں ہو گا۔ جو ہونا تھا سو ہو چکا اور دنیا کو ایک مکمل آئین دیا جا چکا ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی لیکن اس آئین کے نفاذ میں جس طرح علماءِ کرام اپنی تشریحات، تاویلات اور توجیہات کا سہارا لیں گے اسی طرح ادیب ان سے متفق ہوتے ہوئے بھی جزوی طور پر اختلاف کرتا رہے گا اور اپنی جاندار تحریروں سے ان پر واضح کرتا رہے گا کہ وہ خیر و شر کے بارے میں لچک پیدا کریں۔ اور اخلاقی اقدار کو فطرت سے ہم آہنگ کرتے رہیں۔ اس لحاظ سے ادیب بھی وہی معاشرتی فریضہ سرانجام دے گا جو مذہبی پیشواؤں اور فلسفیوں کا کام ہے اور یہ سب مل کر ایک بہتر انسانی معاشرے کے قیام میں ایک دوسرے کے مدد و معاون ہوں گے۔ اس پس منظر میں اگر کوئی شاعر کبھی یہ کہہ دے کہ حسن بری چیزوں سے بھی وابستہ ہے یا کوئی ڈرامہ نگار یہ ظاہر کرے کہ بالکل نیک لوگ سپاٹ اور غیر دلچسپ ہوتے ہیں اور کوئی ناول نویس اپنی کہانی میں شر کی طرفداری انسانی حوالے سے کرتا ہوا پایا جائے تو ان تمام پہلوؤں کو فراخدلی سے قبول کرنا ہو گا کیونکہ ادیبوں کی منزل وہی ہے جس کی طرف ہمارا آخری آئین ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ کوئی سیدھی راہ سے اور معروف طریقوں سے اس منزل کی طرف گامزن ہے اور کوئی راستے سے کبھی ہٹ کر پگڈنڈیوں اور نامعلوم رستوں سے جھاڑیوں اور خس و خاشاک کو صاف کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے مگر سب کی منزل ایک ہے۔

یہ ادب کی اپنی عظمت پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک روایت کی حدود میں رہتے ہوئے روایت سے انحراف کرتا ہے لیکن انسانی شعور میں وسعت پیدا کرنے کے لیے پٹی ہوئی شاہراہ کو چھوڑ کر نت نئے راستوں کی دریافت اور خار و خس کی صفائی بہت ہی اہم کام ہے جو صرف ادیب ہی کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں ابلیس کے کردار کے بارے میں مختلف نظریات اور تصورات کا ذکر شاید بیجا نہ ہو۔ مذہبی نقطہ نگاہ سے وہ مردود و ملعون ہے اور عام روایتی ادب میں اُسے شر کا نمائندہ سمجھا گیا ہے لیکن عظیم ادباء کے ہاں اُسے مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے۔ اقبال کے کلام میں وہ برائی کا سرچشمہ ہونے کے باوجود بعض اوقات خیر کا موجب بھی بن جاتا ہے۔ اقبال کے ہاں کوششِ پیہم، جدوجہد اور انسانی انا کو جو حیثیت دی گئی ہے۔ اس کا بہترین سمبل خود ابلیس ہے۔ وہ حرکت اور تغیر، نافرمانی اور سرکشی کا مظہر ہے اور بدترین حالات میں بھی اپنے مسلک پر سختی سے قائم رہتا ہے۔ اُسے کسی کی حاکمیت قبول نہیں اور وہ اطاعتِ خیر کو بھی اپنی آزادی پر قدغن تصور کرتا ہے۔ ایک لحاظ سے وہ ملائکہ اور ان انسانوں سے بھی بدرجہا بہتر ہے جو خیر کے حلقہ بگوش ہو کر گوشۂ عافیت میں شب و روز گذار دیتے ہیں اور جن کی زندگیوں میں کوئی ہنگامہ اور کوئی معرکہ نظر نہیں آتا۔ ابلیس کا یہ کردار اسے شر کے حلقے سے نکال کر اقبال کی نظر میں خیر کی طرف لے آتا ہے کیونکہ وہ جن اوصاف کا حامل ہے وہ انسانی معاشرے کو بعض اوقات غلامی کی

پستیوں سے نکال کر آزادی کی بلندیوں کی طرف لے جاتی ہیں۔

اقبال کے تصورِ ابلیس میں ہر چند کئی چونکا دینے والے پہلو ہیں لیکن اقبال کسی اخلاقی قدر سے بغاوت نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی المیہ نگار اپنے مرکزی کرداروں کے نقائص کے باوجود ان سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتے ہوئے کسی نظریہ شر کی تبلیغ کرتا ہے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ اچھا ادیب معاشرے کے بنائے ہوئے سانچوں میں کلی طور پر اپنے آپ کو ڈھال نہیں سکتا۔ اور نہ ہی مذہبی نقطۂ نگاہ سے وہ ان توجیہات و تشریحات کو مکمل طور پر قبول کر سکتا ہے جو علماء و فضلاء کی نظر میں ناقابلِ تغیر اخلاقی اقدار ہوتی ہیں۔ ادیب اور علماء دونوں ہی فطرت سے ہم آہنگی کے مدعی ہیں مگر ادیب کی وسیع نظر فطرت کو ماضی حال اور مستقبل کے حوالوں سے جانچتی ہے جبکہ علماء زمانۂ حال کے تقاضوں کے وقتی حل کو مستقبل کے لیے بھی اتنا ہی سود مند سمجھتے ہیں جتنا اپنے عہد کے لیے۔ علماء کے نقطۂ نظر میں وہ سختی ہوتی ہے جو انتہائی تیقن اور ایمان کا خاصہ ہے مگر ادیب کو ایمان کے ساتھ ساتھ شک و شبہ سے بھی سابقہ پڑتا ہے اور اسی باعث اس کے خیالات اور نظریات کو پذیرائی اس صورت میں نہیں ملتی جس طرح مبلغین اور مصلحانِ قوم کو ملتی ہے۔

خیر و شر کے نظریات کو راسخ کرنے میں جہاں انسانی تجربہ اور مشاہدہ شامل ہے وہیں اعتقادات، ایمان اور قلبی واردات کا بھی خاصہ حصہ ہے۔ مذہب اور فلسفہ دونوں نے ہی خیر و شر کو اپنا موضوع بنایا ہے اور ان کے ذریعے ہی انسان نے ایسے کچھ واضح اصول اپنائے ہیں اور معاشرے کو ایک مخصوص ڈھانچے پر استوار کیا ہے۔ ادیب خود بھی اس معاشرے کا ایک فرد ہے اور شعوری و لاشعوری طور پر وہ ان اصولوں سے کسی حد تک ہم آہنگ ہوتا ہے جو معاشرے کی روحِ رواں ہوتے ہیں۔ پھر لکھنے والوں کے قاری بھی وہی ہوتے ہیں جو ان ہمہ گیر اور آفاقی اصولوں کے ماحول کے پروردہ ہوتے ہیں۔ اس صورت میں اولاً تو یہ ممکن نہیں کہ ادب میں ایسے تصورات آئیں جو مروجہ مقبول نظریات سے یکسر مختلف ہوں اور اگر یہ باور کر لیا جائے کہ ان تمام شعوری اور لاشعوری اثرات کے باوجود کوئی لکھنے والا ایسا فلسفۂ اخلاق اور نظامِ حیات پیش کرتا ہے جو ہر صورت مسلمہ اقدارِ خیر و شر کے خلاف ہو تو پھر اس کی تحریر احاطۂ ادب میں شامل نہیں ہوگی اسے ہم دیگر کئی ناموں سے موسوم کر سکتے ہیں جن میں ایک نام فحاشیات بھی ہے۔

مذہب اور فلسفہ سے ادب اس لحاظ سے مختلف ہے کہ مذہب قلبی مکاشفات اور فلسفہ عقلی دلائل سے اپنے اصولوں کی ترویج کرتے ہیں مگر ادب براہ راست کسی نظریہ خیر و شر کی تبلیغ نہیں کرتا۔ ادب زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور زندگی کسی جامد شے کا نام نہیں۔ حرکت اور تغیر اس کا خاصہ ہیں اور زندہ ادب وہی ہے جو اس حرکت اور تغیر کے ساتھ نہ صرف خود چلے بلکہ وقتاً فوقتاً اس حرکت کی سمت کا تعین بھی کر سکے۔ اگر کسی دور میں خیر و شر کی آویزشوں سے چھٹکارا اور صحیح راہ کا تعین ممکن نہیں ہو سکتا تو ادبی فن پاروں میں بھی جھنجھلاہٹ اور راہ کی گم شدگی کے آثار ملتے ہیں یا پھر قنوطیت کا گمان ہوتا ہے مگر اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ ایسے فن پارے ادبی معیار پر پورے نہیں اترتے۔ قنوطیت، بے راہروی، قدروں کے فقدان کی تصویر کشی اور عکاسی اگر ادبی معیار کے مطابق کی جائے تو یہ خود عظیم ادب کا حصہ بن جاتی ہیں۔

ادب اپنی اخلاقی قدروں کے لیے کسی بھی صنفِ واحد مثلاً مذہب، تاریخ، فلسفہ یا سیاسیات کا محتاج نہیں۔ سیاست

چاہے میکاولی کی ہو یا حضرت عمرؓ کی دونوں کا ایک مخصوص نظریۂ خیر و شر ہے جو باہم ایک دوسرے سے متصادم ہے۔ مذہب چاہے الہامی ہو یا انسان کے تراشے ہوئے خداؤں کا یا کسی فردِ واحد کے ذہن کی پیداوار ہر صورت میں یہ حتمی ہونے کا دعویدار ہے مگر ادب میں ہر قسم کی سیاست اور مذہبی اقدار جگہ پاتی ہیں اور ادب سے جو نظریۂ خیر و شر ابھرتا ہے وہ ادب کا اپنا مخصوص نظریہ ہوتا ہے۔ یہ نظریہ مختلف مکاتبِ فکر سے بے شک ہم آہنگ ہو مگر کسی اور کا کلی ترجمان نہیں ہوتا۔ جب ایسے ادبی نظریات کو دیگر علوم کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے تو ادیب کو خطاوار ٹھہرایا جانا لازمی ہے اور ہر افلاطونی جمہوریت میں اس کے داخلے پہ پابندی لگا دی جاتی ہے۔ ان پابندیوں کے باوجود ادیب کی آواز کو کوئی بھی دبا نہیں سکا کیونکہ مذہبی، سائنسی اور فلسفیانہ حکومتیں دنیا کو وہ صحیح اصول نہیں دے سکیں جو ادب نے دیے ہیں جب تک ادب کا فطرت کی صداقتوں سے رشتہ قائم ہے اس کی حکمرانی ہر دور کے ذہن پہ قائم رہے گی۔

ہمارا ورثہ اور ماضی کا امکان

سعادت سعید

زبان کہ جو ادبی اظہار کا وسیلہ ہے۔ جذبے، خیال اور فکر کا وہ اُبلتا ہوا چشمہ ہے جو پیاسے انسانی شعور کو سیراب کرتا ہے۔ کسی تہذیب سے اس کا ادب خارج کر دیجئے۔ اس کی امکانی نسلوں کا شعور صفر رہ جائے گا۔ انہیں زندگی۔ بن پر انسانی نقطہ آغاز سے شروع کرنا ہوگی۔ دلوں کی داستانیں دلوں میں ناگفتہ ہی رہیں گی اور اکتساب کا عمل شدید ترین مشکلات سے دوچار ہوگا۔ ہر شے کے بارے میں ازسرنو جاننا پڑے گا۔ اور زندگی ایک ہیولائی صورت اختیار کر لے گی۔ اور اشیاء کیلئے اسم سازی کرتے کرتے عمریں بیت جائیں گی۔ سو زبان وہ قومی اوزار ہے جس کے ذریعے شعور سازی کا عمل سہولت سے ہوتا ہے۔ اس کے بطن میں انسانی نشو ونما، تہذیبی عروج و زوال اور سماجی جدلیات کی تاریخ موجود ہے۔ اجتماعی لاشعور، اخلاقی معیارات، خیالات کی بوقلمونی، افکار کی وسعت اور جذبات کی رونق کا مشاہدہ کرنا ہو تو الفاظ کی دستاویز پڑھیے، تجربات، تصورات اور ارادوں کی داستان جاننا ہو تو نثر اور شاعری کے مجموعوں کی زیارت کیجئے۔ اپنے وجود کی حقیقت کی شناخت مقصود ہو تو اپنے خیالات کی عمارت کی بنیادیں تلاشیئے۔ بچپن سے لے کر تادم مرگ زبان ہی وہ ساتھی ہے جو ہمارے لئے زندگی کرنے کی صورت حال سہل بناتی ہے۔ زبان نہ ہو تو ہم گونگے ہوتے ہیں۔ اور زبان فہمی نہ ہو تو بہرے! زبان دنیا میں ہماری موجودگی سے بنی ہے اس کی تخلیق ہمارے تجربات سے ہوئی ہے۔ ہمارے تجربات ابھی مکمل نہیں ہوئے اس لئے زبان بھی ابھی مکمل نہیں ہوئی نئی سماجی حاجتیں اور نئے انسانی تجربات زبان میں ناگزیر تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں۔ یہ انسانی تاریخ کی مجبوری ہے۔ اس لئے روائتی زبان پر قناعت کرنا نئے تجربات کو درگور کرنا ہے۔ اس حوالے سے روایت پرستی شعور کشی کے مترادف ہے زبان ماضی بھی رکھتی ہے، حال آشنا بھی ہے۔ اور امکان کی جویا بھی! زبان ہی کا صحیح تصور یہ ہے کہ ہم اس کے ماضی، حال اور امکان کو ایک بڑی وحدت کی صورت دیکھیں۔ زبان کا ماضی، حال اور امکان اپنے اپنے طور پر جزئی وحدتیں ہیں۔

وائٹ ہیڈ نے اپنی کتاب "فکر کی جہتیں" میں لکھا ہے کہ "ہمارا تمام تجربہ دوسری اشیاء کے ساتھ ہمارے رابطوں سے ظہور پاتا ہے۔ اور نئے رشتے بنانے کے لئے اشیاء کی تشکیل ہوتی ہے۔ حال ماضی کا استقبال کرتا ہے۔ اور مستقبل بناتا ہے" زبان کے مسئلے کو ہیڈ یگر نے ایک اور انداز سے فارمولیٹ کیا ہے۔ اس کے خیال میں انسان کو عطا کئے گئے اثاثوں میں سے "زبان سب سے زیادہ خطرناک ہے، تخلیق کرنے، مٹانے، تباہ کرنے اور ہمیشہ زندہ کی طرف لوٹنے کے لئے تاریخ کو ممکن کرنے کے لئے انسان کو زبان دی گئی ہے یا زبان تمام خطروں کا خطرہ ہے۔

کیونکہ یہ بنیادی طور پر ایک خطرے کے امکان کو تخلیق کرتی ہے۔ صرف جہاں زبان ہے وہاں دنیا ہے اور جہاں لفظ غلبہ پاتا ہے تاریخ ہے۔ ہیڈیگر کے یہ نظریات اس کے مضمون ہولڈرلین اور شاعری کا جوہر میں سے لیے گئے ہیں۔ اس مضمون میں ہیڈیگر نے زبان اور وجود شناسی کے مسئلے کو مربوط کیا ہے۔ اور زبان کو روایت اور امکان کے تناظر میں زندہ خطرناک حالت کا نام دیا ہے۔ شاعری اور نثر کی تفریق زبان کے استعمال کے طریق کار کی تفریق ہے۔ ہر دور میں زبان سازی کا عمل بھی مختلف ہے۔ شاعری تخیلاتی زبان کی متقاضی ہے۔ اور نثر منطقی زبان کی، شاعر علامتی اور استعاراتی پیرائے کی تخلیق کرتا ہے۔ نثار استدلالی پیرلیے کی۔ شاعری میں جذبہ امکان سے ہم آغوش ہوتا ہے، نثر میں فکر کے ریاضیاتی رابطے اظہار پاتے ہیں شاعرانہ اظہار کے بطن میں مخفی تاریخی، سماجی، اساطیری، اخلاقی اور ذاتی لہجے ہوتے ہیں۔ نثر میں واضح فکری، منطقی اور خیالی لہجے؛ نثر سپاٹ، پھیکی اور بے رنگ ہوتی ہے (شاعرانہ نثر اور معاملہ ہے) شاعری میں لفظ رنگ جگاتے ہیں۔ خوشبو بکھیرتے ہیں۔ تاثیر سے مالا مال ہوتے ہیں، زندہ ہوتے ہیں، تحریک دیتے ہیں اور آوازیں سناتے ہیں۔ سو نثر کے مقابلے میں شاعری میں زبان کا استعمال تخلیقی ہوتا ہے (شاعری میں استدلالی یا نثری آہنگ اور معاملہ ہے)

خالق اور تخلیق کا رشتہ فی الاصل وجود اور معاشرے کا رشتہ بھی ہے اور زمان و مکاں کی ہم آہنگی کا شارح بھی۔ خالق اپنی تخلیق میں نہ صرف اپنے وجود سے ہمکلام ہوتا ہے بلکہ اس حوالے سے اس نوع کے مسائل میں مبتلا قارئین کے احوال کا مادہ بھی بس بھی ٹھہرتا ہے۔ تقریر کی یہ لذت "اس کے کہ کو" دلوں کی واردات بناتی ہے۔ قاری کے شعور اور جذبے کو حرکت عطا کرتی ہے۔ خالق یہ ہمکلامی اور طرزِ تخاطب اپنے باطن میں کسی متعین مکان اور زمان سے مربوط بھی ہے اور بعض صورتوں میں ان کے ماضی اور مستقبل کے اشارہ کناں بھی! تخلیق کی زبان "تباہ بھی کرتی ہے، مٹاتی بھی ہے اور زندہ کی طرف لوٹتی بھی ہے"؛ اس میں دُنیا موجود ہوتی ہے، تاریخ دھڑکتی ہے۔ خالق اور تخلیق کو ایک کل میں دیکھنا حقیقت کی دریافت کا حقیقی طریقہ ہے۔ اشیاء اور انسان کو ایک کل میں دیکھنے کا اصول تعینات کے کئی پردے اٹھانے کا موجب ہے۔ یہ مابعد الطبیعاتی مسائل کے حل میں بھی معاون ہے اور مادی پیچیدگیوں کی گرہیں بھی کھولتا ہے۔ فرد از خود ایک کل ہے۔ خاندان اس پر مسلط ایک اور کل ہے، معاشرہ بھی ان جمع شدہ کلیتوں کا کل ہے۔ کئی معاشروں کی کلیتوں کا کل دنیا ہے۔ دنیا کی کلیت کائنات کی کلیت کا حصہ ہے۔ سو یہ جزئی کل کلی کلیتیں بناتے ہیں۔ کائنات کو دنیا سے جُدا ٹھہرانا۔ روح کو مادے سے علیحدہ پہچاننا، فرد کو سماج سے ماورا رکھنا، قوانین کو اشیاء سے باہر سمجھنا، زمان کو مکان سے بعید فرض کرنا، خالق فن کو فنی تخلیق سے لاتعلق جاننا، جذبے اور دانش کے غیر مختتم مغالطوں کی تدوین کرنا ہے! یہی وہ مقام ہے۔ جس پر عقلِ انسانی کا پاؤں پھسلا ہے۔ اور آج وہ منہ کے بل گری نظر آتی ہے۔ عقلی بازیگر اپنی اُلٹی زقندوں سے انسانی شعور کو کھلا دھوکا دینے میں کامیاب ہیں۔ مجید امجد نے سچے کی بات کہی ہے:۔

"سب سینوں میں یکساں بٹے ہوئے ہیں علم ایک دوسرے کے سب احوالوں کے
اور سب سینے خالی ہیں۔ ان دانستوں سے، جن میں یکجائی کی نشوونما ہوتی ہے۔

اپنی اپنی اناؤں کے ان پتے تسلیم ہشلوں میں سب الگ تھلگ ہیں۔ ان کے ملوں کی ڈالی پر استفہاموں کا میوہ نہیں لگتا۔"

(سب سینوں میں یکساں ..... از مجید امجد)

وحدانیت اور دوئی یا کلیت اور ثنویت دو متوازی رستے ہیں۔ ایک رستہ زمین پر چلنا سکھاتا ہے، دوسرا گڑھے میں گرا دیتا ہے۔ ایک حق کے سمندر کو شعور کے ظرف میں سمیٹتا ہے۔ دوسرا باطل کی دلدلوں میں اتارتا ہے۔ کلیت مابعد الطبیعات، تاریخ، صورتِ حال اور امکان کی تفہیم کی درست بنیادیں مہیا کرتی ہے اور ثنویت ان بنیادوں میں شگاف ڈالتی ہے یوں شعور، فکر اور جذبے کی موجود عمارتیں زمین بوس ہو جاتی ہیں، اور ممکنہ عمارتیں ہوائی پر تعمیر ہوتی ہیں۔ ثنویت کی منطق حصوں میں بانٹنے کی منطق ہے۔ ہیئت اور مواد کو الگ الگ پرکھتی ہے۔ ذات اور جسم میں بعد پیدا کرتی ہے۔ تاریخ اور سماج کو جدا جدا سمجھتی ہے۔ فنکار اور اس کی صورتِ حال میں متوازیت دیکھتی ہے۔ اور زمان و مکاں کو تہذیب پر، آئینے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ اور صورتیں غائب، کبھی ذرہ عظیم ٹھہرتا ہے اور کبھی صحرا، کبھی قطرہ قوی ہو جاتا ہے۔ اور کبھی دریا۔ جدید دور کے مفکرین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ تاریخ ہر قدم پر کلیتوں کی کلیت بناتی ہے۔ اس لئے اس کی فہم کے لئے شعور کو بھی کلیت شناس ہونا چاہیئے۔ سارتر کہ جو ثنویت زدہ مفکرین کا معتوب ہے، مابعد الطبیعات کے بارے میں بجا طور پر لکھتا ہے۔" یہ مجرد کلیوں کے بارے میں بنجر بحث نہیں ہے بلکہ انسانی حالت کی کلیت سے معانقہ کرنے کی زندہ کوشش ہے۔"

سارتر کا یہ بھی کہنا ہے "کسی شخص کا کتاب لکھنا اس کی مینی فیسٹیشن (MANIFESTATION) کی کلیت ہی کی وجہ سے ہے۔ اس کا ظاہری اس کا جوہر ہے" اسی قسم کی فارمولیشن ہیڈیگر نے بھی کرنے کی کوشش کی ہے اس کا توقف ہے " ہم نسلِ انسانی ایک مکالمہ ہیں، اور انسانوں کے وجود زبان میں دستیاب ہیں"۔ یوں ہم انسان کو خلا میں معلق مخلوق کا نام نہیں دے سکتے۔ یا دوسرے لفظوں میں خالق کو اس کی تخلیق سے جدا کرنا یا تخلیق کو خالق سے ماورا قرار دینا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔ خالق اور تخلیق تجزیے، تشریح اور تجربے سے ماورا حیثیت کے حامل نہیں ہیں۔ لیکن تنقیدی ضابطوں اور وطیروں کا ثنویت سے پاک ہونا لازمی شرط ہے ورنہ خالق اور مخلوق تو کجا ہم لفظوں کے ظاہری اور سطحی مفاہیم کا بھی صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ خالق کو گوشت پوست کی متحرک مشین سمجھنا اس کے عمل کے میدان کو محدود کرنا ہے۔ وہ ماضی، حال اور امکان کی کلیت ہے، تاریخ، معاشرت اور سیاست سے ماورا نہیں ہے اس کا شعور اردگرد کے ماحول سے بنتا ہے۔ اور وہ ماحول پر اپنے اثرات بھی ڈالتا ہے اس کے نفسیاتی مسائل بھی ہیں۔ اور جذباتی پیچیدگیاں بھی۔ وہ سماجی کل کا حصہ بھی ہے۔ اور از خود بھی ایک کل ہے۔ اس کی عمرانی اور فکری تاریخ بھی اس کی داخلیت کا حصہ ہے اور مذہبی تاریخ بھی؛ وہ مختلف سیاسی درجوں میں سے کسی ایک درجے کا رکن بھی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا نقطہ نظر ان علیحدہ کلیتوں کی کلیت ہی سے وجود میں آتا ہے۔

ادب کی بسیط و عریض کائنات میں انسانی تمنائیں، جذبوں، تجربوں، اور سوچوں کے وسیع علاقے مخفی ہیں۔ اس کی وجہ فقط یہی ہے کہ اس میں حسن زبان، جذبے اور شعور کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان کا حیات انسانی کے مسائل سے ناگزیر رابطہ ہے اگر ہم ادب کی تفہیم چاہتے ہیں تو ہمیں ادب پاروں کی تہہ میں چھپی حقیقتوں کو عریاں کرنا ہوگا۔ ادب میں مخفی حقیقتوں کو عریاں کرنے کا عمل شعور کو کلیت میں پہچانے بغیر ممکن نہیں۔ اس کے لئے شناخت کا ایسا طریق کار اپنانے کی ضرورت ہے جو موجود معروض کی داخلی حرکت کے اصول بھی وضع کر سکے۔ اور ان کے حوالے سے دماغوں میں ابھرنے استفہاموں کا جواب بھی دے سکے۔ یہ طریق کار جدلیاتی طریق کار ہے اس کے وسیلے سے تاریخ کی حقیقی حرکت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور انسانی وجود اور سماج کے رشتوں کی کلیت بھی سامنے آتی ہے۔ انسانی فکر اور سماج کی تاریخ کا مطالعہ اس امر کی شرح کرتا ہے کہ ہر کلیت اپنے داخل میں نفی کا جوہر رکھتی ہے اور نفی کی نفی یعنی اثبات ایک نئی کلیت کی تنزین ہے۔ ماضی، حال اور امکان ایک بڑے کل کے اجزا بھی ہیں اور جزدی اعتبار سے اپنا علیحدہ کل بھی ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی نفی بھی کرتے ہیں۔ اور اثبات بھی، جزدی کلیتوں اور کلی کلیتوں میں جدل بھی ہوتا ہے۔ اور سمجھوتہ بھی چنانچہ ادب یا تاریخ کو ٹکڑوں میں جاننے کی کوشش لاحاصلی کا پیش خیمہ ہے۔

ہماری فکر کا جدلیاتی وطیرہ ہی ہمیں ان سوالوں کے مکمل جواب فراہم کرے گا کہ جبر کے ادوار میں انسان کی جذباتی اور معاشرتی زندگی کی حقیقی حالت کس نوع کی ہوتی ہے؟ درجہ بند سماج میں انسان کی حیثیتیں اور مراتب کیا کیا روپ رکھتے ہیں؟ معاشی اور تہذیبی بحرانوں کا سامنا کرنے، ان میں زندہ رہنے اور ان سے آنکھیں چرانے کی معنویت کیا ہے؟ ان بحرانوں کا مقابلہ کیسے ممکن ہے؟ دلوں میں نفرتیں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ غصہ کیوں کر بیدار ہوتا ہے؟ غموں کے سرچشمے کہاں ہیں؟ کرب اور آشوب کے اظہار کی بے قراری کس کی نفسیات کا حصہ ہے؟ اپنے عہد کے نوحے رقم کرنے کا کیا جواز ہے؟ غلامی میں قفس شکنی کا حوصلہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟ ہجر و وصال کے قصے لکھنے میں کیا مصلحت ہے؟ حسن اور اس کے متعلقات کی وضاحت کے پس منظر میں کونسی کیفیات کار فرما ہوتی ہیں؟ شہر آشوب کیوں وجود میں آتے ہیں؟ رزمیے تخلیق کرنے سے وجود اور سماج میں کس انداز کا تحرک رونما ہوتا ہے؟ یہ سوالات صرف ادبی ہی نہیں ہیں۔ ان کے درست جوابات ہماری قومی اور تہذیبی شناخت کے لئے نہایت ضروری ہیں یعنی ان کی جزدی اور کلی کلیتوں کا مطالعہ ہی ہمیں ہمارے ٹھوس وجود کا احساس دلا سکتا ہے۔ فکری خلاؤں سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم پاکستانی ہونے کا مفہوم جان سکتے ہیں۔ ماضی کے اس امکانی تجزیے سے حال کے لئے بہتر معاشرتی نظام کی نشاندہی ممکن ہے!

اس تجزیاتی مقام پر ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ ہم روایت پرستی، روایت شناسی اور روایت کی از سر نو تخلیق میں حد تفریق قائم کریں۔ روایت پرستی کہنہ اور قدیم اسلوب زندگی یا اسلوب خیال کو بعینہٖ قبول کرنے کا نام ہے۔ یہ الٹی زقند کی وہ قسم ہے جس میں مقام زقند کو مستقل طور پر فراموش کر دیا جاتا ہے۔ قدامت پسندی کی راہ اختیار کی جاتی ہے۔ تاریخ کی ارتقائی حرکت سے چشم پوشی ہوتی ہے۔ قدیم اخلاقی اور سماجی معیارات میں

پناہ ڈھونڈھی جاتی ہے۔ یاد کے خارزاروں میں وجود کی پوشاک تارتار ہو جاتی ہے۔ حال عذاب محض ٹھہرتا ہے اور ماضی جائے اماں! گردش ایام کی گاڑی بیک گیئر میں چلانے کی کوشش ہوتی ہے۔ جدیدیت کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اور کہنہ معیارات پر آمنّا صدقنا کا داویلا ہوتا ہے۔ حال کے اسلوب زیست کی عطا کردہ مادی سہولتوں سے فیض بھی حاصل کیا جاتا ہے اور ماضی کے خیالات کی عظمتوں کے ترانے بھی گائے جاتے ہیں۔ روایت پرستی عمل اور نظریے، ہیئت اور خیال اور زمان اور مکاں کے مابین اس ثنویت سے معرض وجود میں آتی ہے۔ جس میں تاریخ کے باطن کی حرکت دانستہ نظر انداز کی جاتی ہے۔ روایت شناسی میں عہد جدید کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں روایت کو حال کے پس منظر کے طور پر استعمال کرنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ اس الٹی زقند میں مقام زقند کی جانب لوٹنا بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اعتدال کا راستہ ہے۔ تاریخ کی حرکت پہچاننے کا عمل ہے۔ نئے اخلاقی اور سماجی معیارات کے استحکام کے لئے ماضی کے متعلقہ حصّے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ صورت حال کو یاد پر فوقیت ملتی ہے۔ حال کو جائے اماں بنانے کی کوشش ہوتی ہے۔ گردش ایام کے رخش تیز پر سواری کا جتن کیا جاتا ہے۔ کہنہ معیارات پر تجزیاتی نظر ڈالی جاتی ہے۔ اور جدید تقاضوں کی تفہیم ہوتی ہے۔ کہنہ معیارات نئے کارخانوں میں خام مال کی صورت استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور ان کی مدد سے نیا نظریاتی ڈھانچہ بننے لگتا ہے۔ ماضی اور حال کی آمیزش سے صورت حال کا کل تشکیل پاتا ہے۔ روایت کی از سر نو تخلیق میں حال اور امکان کے رشتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ تمنا کا دوسرا قدم دریافت کرنے کی سعی ہے۔ اس میں زقند ایک سطح پر سیدھی ہوتی ہے۔ یعنی امکان کی جانب اور دوسری سطح پر الٹی یعنی امکان سے حال کی جانب! شلر (SCHELLER) کا کہنا تھا۔ "تمام عظیم فن اور انسانی نظام کہ جو روایت سے مستحکم ہے۔ انسان کے مختلف جوابات اور ان پر معروضی تجربے کے اثرات کے مابین بنیادی طور پر مسلّمہ پیغام رسانی پر منحصر ہے" اس کے برعکس کاف مان (KAUF MAN) اپنی کتاب "شیکسپیئر کی وجودیت" میں رقمطراز ہے کہ فن کار کی "ذمہ داری روایت کی بجائے تجربے کے استحکام میں ہے یا تمام عظیم شاعری اور فلسفہ گہرے طور پر روایت کا باغی ہے"۔ ہمارے خیال میں روایت سے بغاوت یا دوسرے لفظوں میں ایک موجود کل کی نفی کے لئے بھی اس کا اثبات ضروری ہے یعنی مسلّمہ پیغام رسانی کی شناخت کے بغیر نہ تو موجود پیغام رسانی ہی کی کوئی جہت واضح ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی امکانی پیغام رسانی کی کوئی صورت نظر آ سکتی ہے۔ سو ہمارے لئے لازمی ہے کہ ہم نئے ادب میں وجود کے معانی دریافت کرنے کے لئے اپنے کلاسیکی ادبی ورثہ کا بغور جائزہ لیں۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ زبان جو اظہار کا اہم وسیلہ ہے یہ ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان ایک رابطے کی صورت ہے۔ ادب میں ماضی کا حال پر اور حال کا مستقبل پر اثر انداز ہونا زبان ہی کی بدولت ہے۔ زبان ہی کی مدد سے ہم ان روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ جو نئے شعور کی ترقی میں ممکنہ ہیں۔ وہ نقاد جو روایتی ادبی ورثہ کو محض اس لئے رد کرتے ہیں کہ ماضی میں شعور دشمنی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے وہ بے بنیاد وجود کے قصیدہ خواں ہیں۔ ماضی کی جدوجہد اور تاریخ سازی کے بہت سے ایسے امکان ابھی تک ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ جنہوں نے خفیہ اطوار سے ہمارے شعور کی نئی رزم گاہوں میں ہمیں کمک پہنچائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں

بار بار اس فارمولیشن کی جانب توجہ دلانی چاہیئے کہ ادب کا جزوی کلیتوں اور کلی کلیتوں میں مطالعہ ہماری وجودی اور تہذیبی زندگی کی ٹھوس بنیادیں فراہم کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔

ادب کی اقلیم انسانی وجود کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ادب سے انسان اور اس کے جذبات کی کائنات خارج کر دیجئے، کھوکھلے، بے جان، جامد، لغاتی الفاظ کا ذخیرہ باقی رہ جائے گا۔ زندگی اور سماج کا تحرک غائب ہو جائے گا۔ جسم تو قائم رہے گا اس میں حرارت اور نمو کی قوت موجود نہیں رہے گی۔ فطرت کی نیرنگیاں، موسموں کی بوقلمونیاں، مجرد اخلاقی موشگافیاں، بے معنی ماورائی دستاویزیں اس کا کل باقیماندہ اثاثہ ٹھہریں گی۔ نصابی نقادوں کی پانچوں گھی میں! بے کار مباحثوں اور عقلی گورکھ دھندوں کا بازار سجے گا۔ منظر نگاریوں اور جمالیاتی پیرایوں کی تفصیلات مرتب کی جائیں گی۔ اشیاء کی فہرستیں گنوائی جائیں گی۔ ستارے ہوں گے۔ بادل ہوں گے۔ پھول پھل دکھائی دیں گے۔ دریا کی روانی اور پہاڑوں کے ٹھہراؤ کا تذکرہ ہوگا۔ پرندے اڑتے نظر آئیں گے۔ لیکن انسان کا ان موسموں، منظروں اور خلاؤں سے کیا تعلق ہوتا ہے اس کا ذکر عنقا ہوگا۔ خالص خیال، ناکارہ عقیدے، قدیمی سوچیں، ماورائی مابعدالطبیعاتی۔ بے بنیاد شعور اور فکر کی آسمانی جہتیں تنقید کی تحسین کا موضوع ٹھہریں گے۔ عمومی صفات کا استعمال اور خوب وزشت کے بندھے ٹکے معیارات مضمونوں کی آئینہ بندی کریں گے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سکھایا جانے والا تنقیدی نقطۂ نظر انسان اور اس کی سماجی زندگی، فن اور اس کی دیانتدارانہ پرکھ، خیال اور اس کی حقیقی بنیادوں، وجود اور اس کے واقعی مسائل، سماج اور اس کے تضادات اور شعور اور اس کے ارتقاء کی صورتِ حال سے کوئی زیادہ واسطہ نہیں رکھتا۔ تدریسی مقاصد کے لئے اوّل تو ایسا ادب منتخب کیا جاتا ہے۔ جو یا تو انسانی مسئلوں، سماجی بحرانوں، سیاسی چیرہ دستیوں، اقتصادی بدحالیوں اور اخلاقی زوالوں کے تصورات اور تاثرات سے عاری ہوتا ہے۔ یا اگر کسی شاعر یا نثار کی تخلیقات کا وہ حصہ جو مندرجہ بالا امور سے تعلق رکھتا ہے انتخاب کی غلطی سے شامل نصاب بھی ہو جائے۔ تو نصابی نقادوں کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے ایسے تجزیات اور تشریحات مرتب کی جائیں کہ اس کے اندر چھپا پیغام غیر مؤثر ہو کر رہ جائے اور انسان اور اس کی صورتِ حال قارئین سے مخفی رہے۔

عموماً شاعر اور ادیب ایسے خواب دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں جو آئندہ نسلوں کے شعور کو جلا بخش سکتے ہیں۔ ان کے خواب تہذیب اور زندگی کے دھارے کو ارتقاپذیر دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی ذات اور اپنے سماج کے ایسے غوطہ خور ہوتے ہیں جو نہ صرف اندرونی غلاظتوں کو بصارتوں کی رونق بناتے ہیں بلکہ ان کی سڑاند بھی دور کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ان کی موت کے بعد ان کے خواب لفظوں کے تہہ خانوں میں چھپ جاتے ہیں۔ ان خوابوں کو ہزاروں برس تک اساطیر کے روزنوں میں چھپایا جاتا ہے لیکن وہ نئے زمانے کے زائروں کے لئے راحتِ جاں بننے کا امکان بھی رکھتے ہیں۔ ماضی کا یہی امکان مستقبل سازی کے عمل میں ممد ہوتا ہے۔ ایسی ہی قدیم تخلیقات میں زندہ رہنے کی سکت ہوتی ہے۔ ان کے بطن میں دریائے تمنا موج مارتا ہے اور وہ پکارتے ہیں ؎

یارب کہیں سے گرمئی بازار بھیج دے
دل بیچتا ہوں کوئی خریدار بھیج دے (سودا)

خریدار آتے ہیں لیکن گورکنوں کی صورت ، مردہ شاعروں اور ادیبوں کے جسموں کے مجسمے بنتے ہیں ۔ ان کی قبروں پر شاندار کتبے لکھوائے جاتے ہیں ۔ اور بقول ن ۔ م ۔ راشد

آؤ اس مرنے والے کو پھر سے جلا دیں
مگر اس کے خوابوں کو نابود کر دیں

اسے رینگنے دیں،
اسے سال ہا سال تک رینگنے دیں ،
کہ اس کی نگاہوں میں پھر خواب بیدار نہ ہوں
اسے رینگنے دیں
اسے سال ہا سال تک رینگنے دیں
اور آئندہ نسلوں کی جانیں
غم آگہی سے بچا لیں !

(مری مورچال نظم از ن ۔ م ۔ راشد)

نصابی نقادوں کے پروردہ نقاد بھی یہی کام کرتے ہیں ۔ یعنی شاعروں اور ادیبوں کے خوابوں کو نابود کر دیتے ہیں اور نئی نسل کے شاعروں اور ادیبوں کو ادبی خوابوں ، سے ناواقف رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے یوں وہ غم آگہی ، سے محفوظ ہو جاتے ہیں ۔ نصابی نقاد اور ان کے مقلدین انسان کے خوابوں سے خائف ہیں ۔ یا یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ وہ انسان سے خائف ہیں ۔ انہیں اس کے ماحول سے گھن آتی ہے اس لئے کہ ادب میں انسان اور اس کے سماج کا اظہار ساتِ پردوں میں چھپے جسموں اور کفنائے دماغوں کو بیچ چوراہے ننگا کرتا ہے ۔ یقین نہ آئے تو انسانی دکھوں سے معمور غزلوں کا مطالعہ کیجئے ، شہر آشوبوں کی سطروں میں پوشیدہ معنویت کا جائزہ لیجئے ، ریختی میں سیاسی نامردی کی تاریخ پڑھیئے ، قصیدوں میں شاہی شان و شوکت کے پس منظر میں مجبور چیخوں کو سننے کی کوشش کیجئے ۔ مثنویوں کے مابعدالطبیعاتی کرداروں میں چھپے خیر و شر کو انسانی زندگی کے تناظر میں دیکھئے ۔ ان سب جزئی کیفیتوں کا نیظر اکبر آبادی کی نظموں کی کلیتوں میں ظہور دیکھئے ۔ دور جدید میں سعادت حسن منٹو کے افسانے پڑھیئے ، جارج آرول کے ناول اور بریخت کے ڈرامے ہڈیوں میں رچا بسے ۔ آپ کے روایتی ادبی تجزیئے اور فنی نزاکتوں کے معاملے از خود معدوم ہو جائیں گے ۔ نصابی نقادوں کے اعصاب انسانی کرب اور سماجی آشوب کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے ۔ ویسے بھی جبر نافذ کرنے والے نظاموں کے آقا انسان کو اس کے انسانی وجود کی کلیت سمیت قبول نہیں کرتے ۔ بلکہ اپنے وجود کا اظہار کرنے والے انسانوں سے نفرت کرتے ہیں ۔ وہ اسے اپنے دفتروں عدالتوں ، اور دانش گاہوں سے باہر ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں ۔ خصوصاً غلاظتوں کے ڈھیر پر ، یا بیمار بستیوں میں یا پھر

فٹ پاتھوں پر، ہسپتالوں میں، چنڈو خانوں میں، گداگروں کے حلقے میں، ذبیح خانوں میں یا سلاخوں کے پیچھے! ان کا تذکرہ کرنے والے مجرم قرار پاتے ہیں۔ ان کی بھلائی کا سوچنے والے باغی ہوتے ہیں۔ کبھی اس قسم کے موجود انسانوں کی داستان صیاد اور قفس کے استعاروں میں چھپا کر بیان کی جاتی ہے۔ اور کبھی ہجر و وصال کے پیرایے میں۔ کہیں پیروڈی کی نقشہ کشی ہوتی ہے۔ اور کہیں اس کے اندھے کنویں میں سسکتے انسانوں کا پورٹریٹ بنایا جاتا ہے۔ سو ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔ غالب نے اس مسئلے کی فارمولیشن کر دی اور دماغوں پر لگے قفل ابجد کو کھول دیا۔ نصابی نقاد نظام جبر کی اعانت کرتے ہیں اس کی متعین کردہ راہوں پر علم کے قافلوں کو گامزن کرنے کا فریضہ سنبھالتے ہیں۔ سراب کی چمک کو روشنی کا نام دیتے ہیں۔ یا روحوں کی پیاس بجھانے کے لیے پانی کا ایوں انسانی وجود صحرائی اندھیروں کی دبیز چادروں میں مکفون اپنی تشریح اور وضاحت کا طالب طاق نسیاں کی زینت ٹھہرتا ہے۔

ہمارے نصابی نقادوں کے لئے "ولی دکنی جمال پرست ہے۔ میر تقی میر حزن و یاس کا مجسمہ ہے۔ سودا ہنسی کا گول گپا ہے۔ درد صوفی ہے، مصحفی حواس خمسہ کا کمپیوٹر ہے، ناسخ پہلوان سخن ہے۔ آتش فصاحت و بلاغت کا خزینہ ہے، دبیر لکھنویت زدہ ہے، غالب مشکل پسند ہے، اقبال فلسفی بھی ہے اور شاعر بھی۔ میراجی ابہام کا شکار ہے۔ نئے شاعر ادب کی بنیادی ساکھ کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ وجودیت اور سماجی حقیقت نگاری کی تحریکیں غیر ملکی ہیں۔ لیکن ارسطو کی بوطیقا ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔" نصابی نقاد اپنی پسند کے اجزا منتخب کر لیتے ہیں۔ کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات اور زمان و مکان کے کل کو دانستہ نظر انداز کرتے ہیں۔ انسان اور انسانی مسائل کی کائنات کو آنکھ سے اوجھل کر دیا جاتا ہے۔ اپنی مجبوری یا کم علمی کا اعتراف کرنے کی بجائے یہ نقاد حتمی فتوے صادر کرنے کے شوقین ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ادب گرامر کی کتاب نہیں ہوتا نہ ہی محض علم بیان اور نہ ہی محض علم عروض، مجرد محاکمہ آرائی سے بھی اسے زیادہ شغف نہیں ہے۔ اس کی جڑیں انسان اور اس کے ماحول میں پیوست ہوتی ہیں۔ شاعر اور ادیب اپنے وجود اور اس کے متعلقات کی تشکیل اپنی تخلیقات میں کرتے ہیں۔ اپنے عہد کی سیاست، معیشت اور معاشرت سے ان کا گہرا رابطہ ہوتا ہے۔ ان کی بے اطمینانیوں، غمزدگیوں، یاس پرستیوں، نوحہ خوانیوں، مرثیہ نویسیوں، بے قراریوں، تکلیفوں، پریشانیوں، ضبطوں، نفس کشیوں، بے چارگیوں، تنازعوں، حوصلوں، خوابوں، اور خیالوں کی کائنات کے پس منظر میں ان کے عہد کی سیاست، معیشت اور معاشرت کے جلوے ہوتے ہیں۔ ان کے الفاظ زائرآگہی کے لئے نئی زیارتیں مہیا کرتے ہیں۔ تہذیبی صورت حال کی حیاتی اور تجرباتی کلیت کا سراغ ملتا ہے۔ قارئین کی سوچ کے منجمد جوہڑ نئے چشموں کے دہانے بن جاتے ہیں۔ نصابی نقاد شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات میں موجود اس لاوے کو روکنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ جو قارئین کے جذبوں میں داخل ہو کر انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اس سماج کو بدلنے کی جانب مائل ہوں جس میں انسان کم مایہ اور بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔

نصابی نقاد حقیقت کی ظاہری اور سطحی شکلوں پر توجہ دیتے ہیں تکنیک اور فن کے مسائل انہیں پریشان رکھتے ہیں۔ خیال اور جذبے پر اظہار خیال انہیں خیالی دنیاؤں میں لے جاتا ہے تجریدی گورکھ دھندوں میں الجھا دیتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں۔ "فلاں انشائیہ نگار ہے فلاں افسانہ نگار ہے۔ فلاں ڈرامہ نگار ہے لیکن فیصلہ کیسے ہو۔ پہلے تعریف متعین کی جائے۔

پھر ان کی تکنیکی تاریخ کا مطالعہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ پہلا انشائیہ کس نے لکھا؟ افسانے کا بانی کون تھا؟ ڈراما اور یونان کا کیا تعلق ہے؟ شیکسپیئر نے بھی بہت سے ڈرامے لکھے ہیں۔ اور آغا حشر نے بھی۔ نتیجہ یہ نکالیں گے کہ آغا حشر اردو کا شیکسپیئر ہے۔ اندر سبھا اردو کا پہلا ڈرامہ ہے۔ انار کلی کے بعد اردو ڈرامے کا زوال ہو گیا ہے" اردو ڈرامے کا زوال تو کیا ہونا تھا۔ اس قبیل کے تنقیدی جملے لکھنے والوں کی سوچ ضرور زوال کا شکار ہے۔ یہ نقاد اپنے ارد گرد موجود انسان اور اس کی سماجی تاریخ یا دوسرے لفظوں میں اس کے غیر دریافت شدہ ماضی کی فارمولیشن سے احتراز برتتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جاننا چاہتے کہ ملک کی موجودہ صورت حال کا پس منظر کیا ہے؟

معاشرتی درجہ بندی کی بنیادیں کہاں ہیں؟ ہم غلام کیوں ہوئے تھے؟ ہماری آزادی میں ادب اور ادیب نے کیا رول ادا کیا؟ سیاسی غلامی کے دوران ادبی احتجاج کی کیا کیا صورتیں تھیں؟ ہمارے ادب میں اخلاق، تصوف اور مذہب کے رچاؤ کے مابعد الطبیعاتی اور وجودیاتی تناظر کی کیا اہمیت تھی؟ ادیبوں اور شاعروں نے ان سے کیا کیا انسانی مفاہیم اخذ کئے؟ سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی جدوجہد آزادی کا ہمارے ادب پر کیا اثر مرتب ہوا؟

بادشاہوں، جاگیرداروں، منعموں، کوتوالوں، حملہ آوروں، ساہوکاروں، شاہی اداروں اور انگریزوں کے مظالم نے خالقوں اور تخلیقوں میں کیا کیا نفسیاتی کوائف داخل کئے؟ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد ادب نے ہماری قومی جدوجہد میں کیسے اپنا منصب ادا کیا؟ تحریک پاکستان میں ادب نے کیا معاونت کی؟ ۱۹۴۷ء کے بعد ہمارے ادیبوں نے قومی اور تہذیبی شعور میں اضافے کے لئے کن کوششوں کا سنگ بنیاد رکھا؟ موجودہ بین الاقوامی صورت حال میں پاکستانی ہونے کے کیا معنی ہیں؟ منصفانہ سماجی ماحول کا قیام کیسے ممکن ہے؟ ان سوالوں کے جواب تخلیقی نقاد تو دے سکتے ہیں۔ نصابی نقاد نہیں۔

ادب اور شاعر سماج اور ماحول کی تجربہ گاہ کا حصہ ہیں۔ ان کی داخلیت بھی اس خارجیت ہی کے حوالے سے تعبیر ہوتی ہے جس میں وہ اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ سماجی تبدیلیوں کا ان کی ذات اور تجربات پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ ان کی آنکھیں بھی کھلی ہوتی ہیں اور کان بھی۔ ان کے اعصاب جاگ رہے ہوتے ہیں۔ وہ تمنائیں بھی رکھتے ہیں۔ اور امیدیں بھی۔ وہ خواب بھی دیکھتے ہیں اور ان کی تعبیریں بھی حاصل کرتے ہیں۔ وہ کامیاب بھی ہوتے ہیں اور ناکام بھی، ان کے انفرادی دکھ بھی ہیں۔ اور اجتماعی بھی۔ ان کے سماج پر ان کی ذات کا اور ان کی ذات پر ان کے سماج

کا خصوصی حق ہے۔ وہ اپنے مسائل سے بے خبر نہیں ہوتے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لئے یا طامع ہو کر ان مسائل پر قلم آرائی نہ کریں۔ جن کی بدولت اجتماع کا بڑا حصہ مصائب کی آندھیوں میں گھرا ہوتا ہے۔ میری مراد یہاں ان ادیبوں اور شاعروں سے ہے جو دربار پرستی کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں۔ یہ قلم اور لفظ کی تقدیس کو فروخت کرتا ہے۔ اس معاملے میں تنقید کو احتیاط برتنا ہوگی۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کون سے ادیب اور شاعر ایسے ہیں جو اپنی معاشی مجبوریوں کی وجہ سے اظہارِ حقیقت سے خائف رہے؟ کون سے ایسے ہیں جو مال و اسباب اور عیش و نشاط کے نشے میں بدمست اپنے ضمیر کی شہ رگ پر کند چھری چلاتے رہے ہیں۔ اور کون سے ایسے ہیں جنہوں نے معاشی مجبوریوں کے باوجود سچے ضمیر اور صادق جذبوں کا اظہار کیا ہے۔ مذکورہ بالا سوالات کے درست جواب ثنویت زدہ تنقید کے بس میں نہیں۔ ثنویت زدہ تنقید روح کو مادے سے الگ کرتی ہے۔ فرد کو سماج سے علیحدہ پہچانتی ہے فن کے قوانین کو فن سے باہر تلاش کرتی ہے۔ زمان کو مکاں سے اور مکاں کو زمان سے علیحدہ رکھتی ہے۔ فنکار اور فنی تخلیق کو جداگانہ اکائیاں قرار دیتی ہے۔ تکنیک اور خیال کو ایک دوسرے کے متوازی ٹھہراتی ہے۔ ادب، سیاست، معیشت اور تہذیب کے مسائل کو خانوں میں بانٹتی ہے۔ ثنویت زدہ تنقید حقیقت میں منطقی مغالطوں کی تنقید ہے۔ یہ ادیبوں اور شاعروں کو خلائی مخلوق سمجھتی ہے!

تہذیبی پراگندگی اور ادیب

سراج منیر

ادیب کے فریضے یا ادب کے منصب کے بارے میں سوال پیدا ہونا اپنے طور پر ایک بہت خطرناک علامت ہے اس لیے کہ ادب کے منصب کا تعین کسی خارجی حوالے سے نہیں ہوا کرتا یعنی یہ کہ ادیب کے فریضے کے بارے میں لکھے ہوئے مضامین پڑھ کر کوئی ادیب اپنے طریقۂ کار کو متعین نہیں کرتا، بلکہ ادبی روایت خود مختلف ادوار میں ایک پورے تہذیبی منظرنامے میں اپنے مقام کا تعین کرتی ہے اور اسی لحاظ سے ادیب کا رول خود ادبی روایت میں بحیثیت امکان مضمر ہوتا ہے۔ ہم چونکہ موجودہ صورتِ حال میں گفتگو کر رہے ہیں اس لیے تہذیب میں ادب کے مقام اور اس کے منصب کے بارے میں کوئی مطلق بات نہیں کہہ سکتے جو ہر جگہ پر یکساں نافذ العمل ہو۔ فی الوقت ہر جگہ اور ہر سطح پر ادب کے رول کا تعین الگ الگ طور پر کرنا پڑے گا۔ اور یہ کوشش ایک خطرناک علامت اس لیے ہے کہ اس سوال کا پیدا ہونا ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ ادب کا کسی تہذیب میں جو رول ہونا ہے یا ہونا چاہیے اس کا تعین خود اس تہذیب کے بطن سے، یا یوں کہہ لیجیے کہ اس تہذیب میں تدبیرِ منزل کے اصول کے تحت نہیں ہو رہا۔ یہ تدبیرِ منزل سے میری مراد یہ ہے کہ ہر تہذیب اپنی حرکت کے لیے کچھ اصول اور اپنے سفر کے لیے ایک سمت متعین کرتی ہے اور انہیں تعینات کے لحاظ سے اس تہذیب میں مختلف ترجیحات وجود میں آتی ہیں۔ اشیاء کی اہمیت متعین ہوتی ہے، اداروں کے فریضے اور مناصب مقرر کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ کسی ادارے کے بارے میں جواز یا عدم جواز کا سوال پیدا ہونا، یا اس کے منصب کے بارے میں کسی پراگندگی کا جنم لینا اپنے طور پر چند امکانات رکھتا ہے، مثلاً یورپ کی مثال لے لیجیے۔ وہاں بار بار سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادب کا معاشرے میں کوئی جواز بھی ہے۔ نشاۃ ثانیہ کا برطانیہ میں آغاز ہی ادب کے جواز کو چیلنج کرنے سے ہوا۔ اس وقت سے لے کر ملٹن، شیلے، براؤننگ تک ہر آدمی نے بقدر ہمت ادب کا ایک منصب متعین کرنے کی کوشش کی ہے یہاں تک کہ میتھو آرنلڈ نے ایک فیصلہ کن بات کر دی کہ مغرب میں زوالِ مذہب سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ ادب پُر کرے گا۔ کسی تاریخِ فکر میں اس سوال کا بار بار نمودار ہونا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ اس تہذیب نے اپنی تدبیرِ منزل جس طور کی ہے اس سے ادب ہم آہنگ نہیں ہے۔ اب ان کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو ادب کے جوہر کو اور اس کے طریقِ کار کو تبدیل کر کے اسے پورے تہذیبی بہاؤ کے مطابق بنا لیا جائے یا پھر اس کا قضیہ ہی پاک کر دیا جائے۔ چنانچہ مغرب میں یہ دونوں کوششیں ہوئی ہیں اور دونوں میں انہیں کس قدر کامیابی بھی ہوئی ہے۔

ہمارے ہاں اس وقت اگر ادب کا کوئی غالب رجحان ہوتا، ادیبوں کے ذاتی طرزِ فکر کی کثرت کے بطن میں پوشیدہ کوئی ایک ایسا نقطۂ نظر ہوتا جسے ہم تہذیبی نقطۂ نظر قرار دے سکتے تو ہم اس نقطۂ نظر کے تجزیے سے ہی اس بات کا اندازہ لگا لیتے

کہ ہماری پوری صورتِ حال میں ادب اس وقت کس منصب پر ہے اور تہذیب کے اس پورے بہاؤ میں کیا رول ادا کر رہا ہے؟ لیکن ادب کا ہر قاری اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اس وقت ہمارے ہاں کوئی ایک طرزِ احساس تخلیق کو متعین نہیں کر رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادب کی حیثیت ہمارے ہاں طریقۂ کار کے نقطۂ نظر سے صرف ایک ہے یعنی ہر لکھنے والا ذاتی تاثرات سے ادب تخلیق کر رہا ہے۔ اس کے مواد میں اختلاف ہو سکتا ہے یعنی ایک ذاتی تاثر تاریخ کے بارے میں ہو سکتا ہے، معاشرے کے بارے میں ہو سکتا ہے۔ خود اپنی باطنی صورتحال کے بارے میں ہو سکتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انفرادیت کی تلاش کے لامتناہی سلسلے کے باوجود ہمیں ہر دوسرے برس یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ ادیبوں کی اکثریت ایک ہی نہج پر جا رہی ہے، ایک ہی طرح کے تجربے ہیں، ایک ہی قسم کی لفظیات ہے چنانچہ اس چکر کو ختم کرنے کے لیے کوئی مردِ مجاہد ایک ایسی تصویری داغ دیتا ہے جو پہلے ایک تہلکہ بپا کرتی ہے، مناظرے شروع ہوتے ہیں اور اسی دوران یہ علم ہوتا ہے کہ یہ بات بھی پرانی ہوئی، گویا ادب کا ہمارے ہاں عالم یہ ہے کہ : پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں۔

یہاں پر چند وضاحتیں ضروری ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہم یکساں طرزِ احساس کا تقاضا کرتے ہیں تو اس سے مقصد کسی ایک نظریے کی پیروی میں لکھنا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ تہذیبی طرزِ احساس کی جڑیں کسی نظریے کی پیروی سے کہیں زیادہ گہری ہوتی ہے اور انسان کے طریقہ ادراک تک میں پیوست ہوتی ہیں، بلکہ تحریکیں اور نظریے تو دراصل ایک تہذیبی بنیاد کے ساقط ہو جانے کا عملی اظہار ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرا بنیادی اعتراض انفرادیت پر نہیں ہے بلکہ انفرادیت کو ایک قدر بنا دینے پر ہے۔ چنانچہ آج مغربی ادب کا عالم یہ ہے کہ اگر ایک شخص دوسروں سے مختلف ہونے میں کامیاب ہو جائے تو یہ دیکھے بغیر کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، کس سطح سے کلام کر رہا ہے اس کی برتری تسلیم کر لی جاتی ہے۔ گالم گلوچ اور اعضائے تناسل کی بے معنی گردان کی بہتات کچھ سطریں نقل کرنے کی اجازت نہیں دیتی ورنہ امریکہ کے شعراء کے سرخیل گنزبرگ کی نظمیں مثال کے طور پر نقل کرتا جو لوگ محض انفرادیت کو قدر سمجھتے ہیں ان سے تو یہاں گفتگو ہی نہیں ہو رہی ہے اسی طرح جو لوگ محض مروّجہ خیالات کے اظہار کو ادب جانتے ہیں وہ بھی یہاں خارج از بحث ہیں اس لیے کہ ہر دو صورتوں میں ادب یا ادیب کے مقام اور منصب کا تعین حادثاتی عناصر کا مرہونِ منت ہو جاتا ہے اور ادب یا ادبی روایت کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہتا۔ ان ہی دو رجحانات کو بحیثیت قدر قبول کرنے کی وجہ سے پچھلے ایک عرصے سے ہمارے ہاں وہ خرابی پیدا ہوتی ہے جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں یعنی ادب انفرادیت اور یکسانیت کے درمیان جکڑ گیا ہے۔ ساری صورتِ حال کے اس اجمالی بیان کے بعد وہ سوال اٹھائے جا سکتے ہیں جو اس وقت خود ادب کی بقا، قاری اور ادیب کے رشتے کی نوعیت، ادب اور مذہب کے درمیان ربط کی صورت اور سب سے بڑھ کر ادب کے تہذیبی رول کے بارے میں سب بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ادب کے منصب کے بارے میں جن لوگوں نے مطلق بیان جاری کرنے کی کوشش کی ہے، یا اس کے منصب کو آفاقی سطح پر متعین کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے ایک بالکل ہی غلط طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ اس طرح کے عالمی فارمولیشن کرنے میں لطف بھی بہت آتا ہے اور آدمی کو نظریہ ساز کا لقب بھی مل جاتا ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس نظریہ سازی میں آدمی کی اپنی حدود، مختلف روایتوں کے فرق سے پیدا ہونے والی کمی بیشی اور مختلف تہذیبوں میں اداروں کی ترجیحات کے الگ الگ

نظام کا خیال نہیں رکھا جا سکتا چنانچہ اس کی وجہ سے قباحت یہ لازم آتی ہے کہ کوئی خاص نظریہ آفاقی ہونے کے چکر میں اپنی مخصوص اور محدود صورت حال کو سمجھنے اور اس سے پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دینے کے قابل بھی نہیں رہ جاتا۔ یہ سوال اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ ہماری موجودہ تہذیبی صورت حال ہے کیا؟ روایتی تہذیب سے کس طور مختلف ہے۔ پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ ادب کے رول کا تعین کس طرح ہو سکتا ہے۔

دنیا میں ہر تہذیب کی بنیاد مذہب پر ہوتی ہے اور تہذیب زمان میں روایت کے ایک مربوط تسلسل کے ذریعے سفر کرتی ہے اور مذہب کے حوالے سے اس کی حیثیت ایک میڈیم کی ہے کہ اگر افراد اور گروہوں کو اس میڈیم کی مختلف سطحوں سے گزار کر اس تصور کے مطابق ڈھالا جاتا ہے جو مذہب کے بطن میں فی الاصل مضمر ہوتا ہے یعنی اس بات کو یوں سمجھ لیجئے کہ مذہب انسان کا ایک مخصوص تصور پیش کرتا ہے اور تہذیب کے ذریعے فرد کی مختلف تہوں کو ایک تاریخی اور معاشرتی عمل سے گزارنے کے بعد ایک طرف تو اس کے روحانی اور جسمانی امکانات کو حقیقت میں تبدیل کرتا ہے۔ دوسری طرف وسیع تر تہذیبی سفر میں افراد کو اپنی تدبیر منزل کے وسیلے کے طور پر استعمال کرتا ہے اس طرح منزل کی دو سطحیں ہو گئیں ایک تو افراد کی منزل کہ جو ان کے امکانات کے حقائق میں تبدیل ہونے سے عبارت ہے اور دوسری تہذیب کی منزل جو ایک مخصوص سمت سفر سے عبارت ہے تہذیب کے نظام میں طریقہ کار، مواد، استعاروں کا ایک ایسا خزانہ موجود ہوتا ہے جس سے افراد کی مختلف انسانی سطحوں کو گزارا جاتا ہے اور اس عمل کے ذریعے ہر فرد کے امکانات اور استعداد کے لحاظ سے اس کی اس طرح قلب ماہیت کی جاتی ہے کہ بالآخر وہ اس تصور سے مطابقت پیدا کرے جو کسی تہذیب کے بطن میں موجود ہے۔ یہ تو ایک عام اصول ہوا۔ اب روایتی تہذیبوں میں اختلاف اس وقت ہوتا ہے جب ایک تہذیب کسی ایک امکان کی تحقیق کو دوسرے امکانات پر فوقیت دیتی ہے، مثلاً چینی تہذیب میں انسان کے معاشرتی وجود کی اہمیت اس کی انفرادی روحانی تربیت سے زیادہ ہے یا پھر عیسوی تہذیب جس میں انسان کے انفرادی الوہی عرفان کو دوسری باتوں پر فوقیت دی جاتی ہے جبکہ اسلامی تہذیب انفرادی الوہی عرفان کے بجائے انسان کے اجتماعی تصورات کی تربیت و تدوین پر نسبتاً زیادہ زور دیتی ہے۔ اس طرح روایتی تہذیبوں میں بنیادی فرق ہوا کرتا ہے چنانچہ تصور انسان کے خدوخال میں یہ فرق پھر تہذیبوں میں ترجیحات کے نظام میں ظاہر ہوا کرتا ہے اور ہر تہذیب ان اداروں اور عناصر کو زیادہ اہمیت دیتی ہے جو آدمی کو اس کے تصور انسان کے مطابق ڈھال سکیں۔ یہاں ایک ضروری وضاحت یہ ہے کہ روایتی تہذیبوں کا تصور انسان محض زمینی نہیں ہوتا بلکہ یہ تصور متعین ہوتا ہے دراصل انسان کی ابتدا اور اس کی تقدیر کے تصور سے لہٰذا ایک درجے میں انسان کی تربیت اور ایک مخصوص تصور انسان کے مطابق ڈھلنے میں نجات کا طریقہ کار بھی کارفرما ہوتا ہے۔ پھر دنیا کی ساری روایتوں میں کسی نہ کسی طور یہ بات پائی جاتی ہے کہ آدمؑ کو اللہ نے اپنی صورت پر بنایا۔ لہٰذا ہر تہذیب کا مخصوص تصور انسان ایک طور سے اس تہذیب کے بطن میں کارفرما تصور الٰہ کو بھی ظاہر کرتا ہے

روایتی تہذیبوں میں باہمی اثر و تاثر کا بھی ایک نظام کارفرما ہوتا ہے اور اپنے طور پر بہت نازک اور پیچیدہ نظام ہے بعض تہذیبیں ایسی ہوتی ہیں کہ اپنے امکانات کو دریافت کرتے ہوئے جب ایک خاص سطح پر پہنچتی ہیں تو کسی دوسری تہذیب سے کچھ عناصر مستعار لیتی ہیں اور اپنے مخصوص تصور حقیقت اور تصور انسان کے تابع پورے نظام میں اسے جذب کر لیتی ہیں۔ مثلاً

جس طرح مشرقِ بعید کی تہذیب نے بدھ مت کا طریقۂ کار لے کر اپنے مخصوص تصورِ انسان کی تکمیل کے لیے استعمال کیا یا جس طرح بعض سطحوں پر ازمنۂ متوسط کی عیسوی تہذیب نے ایک خاص سطح پر پہنچنے کے بعد اسلام سے بعض علوم اور طریقے سیکھے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ یہ سارا عمل حادثاتی نہیں ہوتا بلکہ ایک نظام کے تحت عمل میں آتا ہے اور اس میں اہم تر چیز اثر قبول کرنے والی تہذیب کی وجہ وہ منزل ہوتی ہے جس پر اثر قبول کرتے وقت وہ کھڑی ہو۔ یہ سارا مسئلہ اپنے طور پر ایک الگ بحث کی حیثیت رکھتا ہے اور چونکہ ہمارے موضوع سے تفصیلی طور پر متعلق نہیں ہے اس لیے ہم اسے یہاں چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں ——————— اب ہم نے روایتی تہذیب کے بارے میں چند بنیادی باتیں سمجھ لیں یعنی یہ کہ ان میں ہم آہنگی کی بنیاد کیا ہوتی ہے ان میں فرق کس طرح قائم ہوتا ہے اور ان میں باہمی رشتہ کس طور اور کس سطح پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کسی بھی تہذیب کے اندر موجود عناصر کے ذریعے ادارے کس طرح بنتے ہیں اور ان کی حیثیت کس طرح متعیّن ہوتی ہے۔ روایتی تہذیب کے پورے نظام میں کسی شے کی کوئی خاص اہمیت اس کے تصوّرِ انسان کے مطابق ہوتی ہے مثلاً چونکہ عیسوی تہذیب حضرت عیسٰی کی تاریخی شخصیت پر اپنی بنیاد رکھتی ہے اور نجات کا مدار ان کی تعلیمات کے بجائے ان کی ذات پر جاتی ہے لہذا اسی لیے قرونِ وسطیٰ کی عیسوی تہذیب کے فنون میں اکانوگرافی کو بنیادی حیثیت دی جاتی ہے اور علوم کی سطح پر عیسائیت کے مہمات مسائل کا تعلق انجیل کے بجائے حضرت عیسٰی کی شخصیت سے زیادہ ہے، جبکہ اس کے برعکس مثلاً تاؤمت میں شخصیت کا عنصر غایت ہو کر ہی رہ گیا ہے۔ بہرحال اسی طور اپنے بنیادی ڈھانچے کے لحاظ سے ہر تہذیب اپنے تمام عناصر کو ایک تدریج عطا کرتی ہے، لیکن اس میں ابھی ایک نزاکت اور ہے۔ یہ تدریج محض اہمیت کے لحاظ سے متعین نہیں ہوتی بلکہ تصوّرِ الٰہ سے جنم لیتی ہے اور تہذیب کے بڑے سے بڑے نظام سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے عنصر میں منعکس ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح روایتی تہذیب میں مختلف ادارے وجود کی مختلف سطحوں کی نمائندگی کرتے ہیں جن کا ایک رشتہ انسانی باطن سے اور دوسرا رشتہ تصوّرِ الٰہ سے ہوتا ہے۔ اب روایتی تہذیب کا پورا نظام ایک انعکاسی نظام بن گیا۔ یعنی ہر شے اپنے فوق کو منعکس کرتی ہے۔ اور اپنے تحت میں منعکس ہوتی ہے۔ ہومر کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے نقاد عموماً کہتے ہیں کہ ہومر کی کائنات "ایک ایسی کائنات ہے جس کے ذرّے ذرّے سے الوہی تقدس جھلکتا ہے تو اس میں بھی اصل بات یہی ہوتی ہے کہ انعکاسات کے ایک نظام کے ذریعے ادنیٰ ترین اشیاء بھی اعلیٰ ترین حقائق کی نمائندہ بن جاتی ہیں اور ہومر کے بارے میں یہ رائے دراصل سارے روایتی ادب کے بارے میں درست ہے۔ روایتی ادب کا یہ مخصوص انداز اور اس کا رول دونوں باہم جڑے ہوئے ہیں۔ روایتی تہذیب میں ادب بنیادی طور پر علامتی ہے اور اس کی علامتوں کی تخلیق "ذاتی تاثرات" کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ علامتوں کا یہ نظام بجائے خود ایک غیر شخصی روایت کے تابع ہے اور مختلف سطحوں پر ایک ہی حقیقت کے مظاہر اور ان سے انسانی رشتے کو بیان کرتا ہے۔ چنانچہ روایتی تہذیب میں ادب کا رول یہ ہے کہ افراد کے علامتی طرزِ احساس کی تربیت کرے تاکہ وہ عالم کی علامت کو سمجھنے کے قابل ہو سکے۔ دوسرے یہ کہ انفرادی متخیلہ کی صورتوں کو تدوین کر کے یا تو انہیں ان علامتوں کی غیر شخصی روایت کے تابع بنائے یا انہیں شامل کر لیا جائے۔ ان علامتوں کے ذخیرے میں معمولی مجلسی کنایوں سے لے کر کائناتی علامتوں تک شامل ہیں۔ اس طرح اپنی حیثیت میں

ادب انفرادی تجربے اور اجتماعی تاریخی تجربے کے درمیان رابطے کا کام بھی سرانجام دیتا ہے لیکن یہ تمام باتیں خود تہذیب کے پورے نظام میں ادب کے اس مخصوص منصب میں مضمر ہوتی ہیں جو ایک تصورِ انسان کے تحت اس کے لیے متعین کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ادب کے رول کے بارے میں، اس کے منصب اور مقام کے بارے میں کہیں کہیں معمولی اشارے مل جائیں تو طویل بحثیں نظر نہیں آتیں۔ ویسے بھی روایتی تہذیب میں ادب کبھی کبھی چند مقدس دانشوروں تک محدود نہیں رہا بلکہ ہمیشہ اس کی بنیاد مذہب کے دیئے ہوئے تصورِ انسان اور اس کی تحقیق (ACLUALISATION) کے سفر میں حاصل کیے ہوئے اجتماعی تاریخی تجربے پر رہی ہے اور اسی لیے اس تصورِ انسان سے منسلک ہر فرد اور اس تجربے میں شامل ہر شخص ادب کو پڑھنے سمجھنے اور تخلیق کرنے کا اہل سمجھا جاتا ہے چاہے وہ بالقوہ ہی کیوں نہ ہو۔

ماہمہ دراصل شاعر زادہ ایم

یا یہ کہ ؎

طبع موزوں حجت فرزندیٔ آدم بود

یہ تو چند اشارے تھے جن کے ذریعے میں نے روایتی تہذیب کی تشکیل کے اصول اور اس میں ادب کی حیثیت کا ایک خاکہ سا بنانے کی کوشش کی ہے۔ اب ہم اپنے اصل مقصد کی طرف آتے ہیں، یعنی یہ کہ موجودہ تہذیبی صورتحال کیا ہے اور اس میں ادب کی حیثیت کس حوالے سے متعین ہو سکتی ہے؟

روایتی تہذیبوں کے سلسلے میں ایک یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ بعض تہذیبیں ایک خاص وقت تک سفر کرنے کے بعد اپنے امکانات پورے کر لیتی ہیں اور یا تو متحجر ہو جاتی ہیں یا کسی ایسی روایتی تہذیب کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہیں جو اس سے آگے انسان کے امکانات کی تحقیق کرے، لیکن ہماری موجودہ صورتِ حال کو اس سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ہماری موجودہ تہذیبی صورتحال ۱۶ ویں صدی کے یورپ میں پیدا ہونے والے ایک عجیب احساس سے متعین ہوتی ہے۔ بحری جہازوں پر ڈاکے ڈالتے ڈالتے یکایک یورپ کے بعض علاقوں میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ مشرقی قومیں غیر مہذب اور وحشی ہیں اور یورپ کا یہ فرض ہے کہ ان تک تہذیب کی روشنی پہنچائے۔ چنانچہ اپنے اس ([illegible]) کی تکمیل کے لیے یورپ کی قومیں نکل کھڑی ہوئیں۔ بعض تہذیبیں تو اس حملے کی تاب نہ لا سکیں اور مکمل طور پر اس تاریخی دھارے میں داخل ہو گئیں جو اصل میں یورپ کی تاریخ تھی اور جس کے نتائج کو دنیا بھر کی تقدیر بنانے کی کوشش ہو رہی تھی۔ اس کی ایک بہت اہم مثال جاپان ہے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ دوسری جنگِ عظیم میں جو دراصل یورپ کے اپنے تاریخی جدل افکار کا ایک خارجی اظہار تھی۔ جاپان کی شمولیت اور پھر اس کا حشر محض ایک اتفاقی امر نہیں ہے، بلکہ جاپان کے اپنے تاریخی ارتداد کا شاخسانہ ہے۔ خیر اگر ہم بھی مکمل طور پر اسی تاریخی اور تہذیبی دھارے میں شامل ہو جاتے اور کلیتاً اپنی وہی منزلیں متعین کر لیتے جو یورپی تاریخ نے ۱۴ ویں صدی میں ہی متعین کر لی تھیں اور بعد ازاں مرحلہ وار اسی سمت میں سفر کر رہی تھیں، تو کم از کم ایک بات تو ہوتی کہ صورت حال جو کچھ بھی ہوتی واضح ہوتی، لیکن شومیٔ قسمت کے برعکس ہماری تہذیبی روایت اتفاق سے مربوط مسلسل اور زندہ

[redacted]

تھی. چنانچہ ہوا یہ کہ بعض سطحوں پر تو یورپی تاریخ کی رو ہماری تاریخ میں شامل ہوگئی اور بعض سطحیں اس سے بچی رہیں. یہ وہ عمل ہے جسے میں ایک تہذیبی پراگندگی کا نام دیتا ہوں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ دو تہذیبوں میں بلا کسی اصول کے ربط کا پیدا ہونا اور ان کی بعض سطحوں کا کسی جبر کے تحت یا کسی حادثے کے تحت باہم مخلوط ہو جانا۔ لہٰذا ہمیں موجودہ صورت حال میں مغرب سے ربط اور روایتی تہذیبوں کے درمیان ربط کی صورتوں میں ایک واضح فرق کرنا چاہیے۔ وہاں یہ ارتباط اصولی ہے۔ ایک آزاد روحانی فضا میں واقع ہوتا ہے اور ایک تہذیب اپنی ضرورتوں کے مطابق اور اپنے تصورِ انسان کی تکمیل کے لیے دوسری تہذیب سے اثر قبول کر سکتی ہے اور کرتی ہے۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ یہ سارا عمل ایک سیاسی جبر میں واقع ہوا ہے اور اس کی حیثیت تہذیبی ارتباط کی بجائے تہذیبی انہدام کی رہی ہے جو ایک سطح پر کامیاب ہوا اور دوسری سطح پر ناکام۔ اس طرح ایک ایسا معاشرتی منظر نامہ وجود میں آیا جس میں بیک وقت کئی تہذیبی رو میں حرکت پذیر ہیں۔ اب یہ بات ادیبوں کو زیب نہیں دیتی کہ وہ اس صورتِ حال پر بغلیں بجاتے پھریں کہ بہت اچھا ہے۔ بڑی ترقی ہو رہی ہے بلکہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ تہذیبی سطح پر ہمارے ساتھ ہو کیا رہا ہے اور اس کے کیا نتائج ظاہر ہو رہے ہیں اور آخر الامر کیا صورت نکلے گی۔ اس لیے کہ اگر کوئی معاشرہ بیک وقت کئی تمدنی دھاروں کی جدل کی آماجگاہ بن جائے تو ایسی صورت میں ادیب کی ذمہ داریوں کی نوعیت بدل جاتی ہے اور بعض صورتوں میں بڑی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔

اب ہم ایک نظر ان قباحتوں پر ڈالتے ہیں جو اس تہذیبی پراگندگی کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں۔ میں پہلے یہ عرض کر چکا ہوں کہ تہذیب دراصل ایک میڈیم ہے جس میں سے افراد کو گزار کر ایک مخصوص تصورِ انسان کے مطابق ڈھالا جاتا ہے۔ اب کئی تہذیبی رووں کے تصادم میں کہ جن کا اختلاف فروعی نہیں بلکہ بنیادی ہے۔ صورت یہ پیدا ہوتی ہے کہ افراد کی بعض سطحیں ایسی ہیں جن کی تربیت کسی اور اصول کے ذریعے۔ معاملہ اس وقت اور تشویشناک ہو جاتا ہے جب یہ دونوں اصول ایک دوسرے سے قطبین کی نسبت رکھتے ہوں۔ اس طرح تہذیبی پراگندگی انسانی شخصیت کی پراگندگی بن جاتی ہے۔

سلیم احمد کا یہ نظریہ کہ روایتی تہذیب کے بعد ہمارے ہاں انسان کسر و رکسر کے عمل سے گزر رہا ہے دراصل محض انفرادی
اطلاق نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ تہذیب کا منظر جتنے مختلف دھارے اپنے اندر رکھے گا انسانی شخصیات کے اتنے ہی
... ہوں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ چلیے یہ ٹوٹ پھوٹ بھی ہو گئی، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہے۔ جو لوگ اب
اور تہذیب کو انسان کی شخصیت میں پیدا ہونے والے بے اصول تصادم کے اظہار کا میڈیم سمجھتے ہیں۔ ان سے میں
بحث نہیں کر رہا اور نہ ہی میں اس صورتِ حال کے معاشرتی اطلاقات پر گفتگو کروں گا کہ کس طرح اس سارے عمل
سے ذہنی سطح پر ایک منافقت پیدا ہوتی ہے۔ ادب کے سلسلے میں اس عمل کے جو فوری نتائج ہوتے ہیں ان کا عالم یہ ہے کہ
ادب سے انسانی ذات کا تصور مفقود ہو جاتا ہے، لہٰذا غیر شخصی روایت سے ربط استوار کرنے کا کوئی مرکز موجود نہیں رہتا
تہذیبی طرزِ احساس کے غائب ہو جانے کی وجہ سے فوری مسئلہ ابلاغ کا پیدا ہوتا ہے اس لیے کہ ادیب اور قاری کے درمیان
سفارت کے فرائض یہی تہذیبی طرزِ احساس ہی انجام دیتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ادب کے سلسلے میں معیار غائب

ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک تہذیبی فضا میں معیار یا تو ایک ہوتا ہے یا کوئی نہیں ہوتا۔ اس طرح ایسی صورتیں تک پیدا ہو جاتی ہیں جہاں کسی شے کے ادب یا غیر ادب ہونے کا فیصلہ صرف اس کی قبولیت کی بنیاد پر رہ جاتا ہے جو ظاہر ہے کہ کوئی بڑی بنیاد نہیں ہے۔ اس تمام پراگندگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادب پہلے اپنی پہچان کھو دیتا ہے، پھر اپنے منصب سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور بالآخر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ادب کے بغیر بھی تو ہم زندگی گزار سکتے ہیں پھر اس کی ضرورت کیا ہے۔ اس کے بعد ادب کی جواز جوئی شروع ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ مذہب کی جگہ لے گا کسی کا خیال ہے کہ ادب ایک نئی اخلاقیات کی داغ بیل ڈالے گا۔ کوئی ادیب کو غیر مستند قانون داں قرار دیتا ہے غرض کہ ہر کسے ہر حسب فہم گمانے دارد۔

تا آنکہ لوگ ادب سے دستکش ہو جاتے ہیں اور معاشیات کا مطالعہ کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت کی صورتحال دراصل یہی ہے کہ ادب ایک تہذیبی تصادم میں دونوں معیاروں کے تحت کام کرنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ اپنا جواز کھو رہا ہے اور ہم اس صورت حال کے بارے میں صرف یہ نہیں کہہ سکتے کہ لوگوں میں ادب کا ذوق ختم ہو رہا ہے

اب اس سارے مسئلہ پر دو طرح کے ردّعمل ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو کچھ ہو رہا ہے درست ہو رہا ہے اور ایک ازلی تقدیر کے مطابق ہو رہا ہے جیسا کہ ہندومت کا اصول ہے کہ منونتر کا آخری حصّہ یعنی کلجگ کسی کے روکے رک نہیں سکتا۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ تہذیبوں کے اس تصادم سے انسانی ذہن میں وسعت پیدا ہو رہی ہے اور یہ بالآخر ایک عالمگیر انسانی خیر پر منتج ہوگی یہ نقطۂ نظر بعینہٖ وہی ہے جو نشاۃ ثانیہ کے آغاز میں پیدا ہوئی تھی اور جس کے تحت یوٹوپیا کی روایت نے جنم لیا تھا۔ لیکن نتیجہ ہمارے سامنے ہے بیسویں صدی
بن کر سامنے آئی ہے۔ ہکسلے کی تحریریں دیکھ لیجئے یا پھر جارج آرویل کا ۱۹۸۴ء بھی ایک کافی شہادت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں راستے ادیب کے لیے بند ہیں۔ روایتی تہذیبوں کی ان کے تمام عناصر کے ساتھ نشاۃ ثانیہ کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے اور روایت کے بغیر ہم جی بھی نہیں سکتے اس لیے کہ افراد کو روایت کے ساتھ وہی نسبت ہے جو مچھلی کو پانی کے ساتھ۔ یہ ایک عجیب طرح کا گورکھ دھندا ہے۔ عالمی سطح کی بات کرنے کا نہ مجھ میں حوصلہ ہے نہ فی الوقت اس کی ضرورت۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ادیب کو جو تہذیبی طرزِ احساس کا معاشرتی قائم مقام ہوتا ہے۔ اس صورت حال کے بارے میں سوال ضرور اٹھانا چاہیے اور اپنی حیثیت کا تعیّن ضرور کرنا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں میرے اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ ہر ادیب کو خود سے یہ پوچھنا چاہیئے کہ وہ کیوں لکھ رہا ہے۔ اس لیے کہ یہی سوال خود اس کی اپنی نظر میں اپنے جواز کے لیے ضروری ہے۔ مختلف تحریکیں دراصل اسی سوال کے ناکام جوابات کے طور پر سامنے آتی ہیں۔

اس وقت یہ سوال اٹھانا دراصل ادیب کے تہذیبی منصب کے بارے میں سوال اٹھانے کے مترادف ہے۔ یہاں ایک اور بات ذہن میں آتی ہے کہ آخر اس بات کا تقاضہ صرف ادیب سے کیوں کیا جائے آخر معاشرے کے دوسرے افراد بھی تو ہیں، یہ تقاضہ معیشت والوں سے سیاست والوں سے اور اس طرح کے دوسرے لوگوں سے بھی تو کیا جا سکتا ہے۔ ایک درجے میں یہ بات درست بھی ہے اور یہ تقاضہ ہونا بھی چاہیے، لیکن ادیب اور دوسرے شعبوں کے بارے میں ایک بنیادی

فرق ہے۔ دوسرے شعبے ہمہ وقت موجود صورت حال کے جبر میں رہتے ہیں جبکہ ادیب کے لیے ہر معاملے کے دو رُخ ہوتے ہیں ایک تو موجودہ صورت حال اور دوسرے وہ اجتماعی خواب جو اس کے وجود میں زندہ ہوتے ہیں، چنانچہ ادب کا اکثر عمل موجود صورت حال اور اجتماعی خواب کے مختلف تناسب سے آپس میں حل ہوتے جانے کا نام ہے۔ اس وقت کی تہذیبی پراگندگی کے عالم میں ادیب کے لیے اگر کوئی راستہ ہے تو اپنے اجتماعی خواب سے غیر مشروط وفاداری کا ہے نہ کہ ارتقا رپر بے جھجک ایمان کا۔ اس لیے کہ تہذیبوں کی تشکیل میں بھی اجتماعی خوابوں کا اہم حصہ ہوتا ہے اور عالم زوال میں یہی اجتماعی خواب تدبیرِ منزل کے اصول کا کام بھی دیتے ہیں اور اگر صورت حال اس سے مختلف ہے اور ادیب کے پاس سماجی جبر اور تہذیبی پراگندگی سے محفوظ رہنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، تو آیئے ہم سب مل کر ادب، تہذیب اور ادیب کے لیے دعائے مغفرت کریں اور اپنے آپ کو مغربی تاریخ کے بے جہت دھاروں کے سپرد کر دیں۔

اورتیگا وائی گیزے
ترجمہ: تحسین فراقی

اختصاص کا وحشی پن [1]

میرا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے تمدن نے خود بخود بے چہرہ اندھامی انسان MASS-MAN کو جنم دیا ہے۔ بہتر یہ رہے گا کہ کسی خاص صورت حال کے حوالے سے اس تمدن کی پیداوار (بے چہرہ اجتماعی انسان) کی میکانکیت کی عمومی تشریح کے ساتھ ہی ساتھ اس کا تجزیہ بھی پیش کیا جائے۔

انیسویں صدی کی تہذیب کا خلاصہ میرے خیال میں دو بڑے ابعاد کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے: رواداری جمہوریت اور تکنیکیت۔ آئیے پہلے مؤخرالذکر پر غور کریں۔ جدید تکنیکیت نے سرمایہ داری اور تجربی سائنس کے باہم اختلاط سے جنم لیا ہے لیکن واضح رہے کہ تمام تکنیکیت سائنسی نہیں۔ جس شخص نے شیلین عہد [2] (CHELIAN) میں پتھر کا کلہاڑا بنایا تھا وہ سائنس سے ناواقف تھا لیکن اس کے باوجود اس نے ایک تکنیک کو ضرور جنم دے ڈالا۔ چین تکنیکیت کی معراج پر پہنچ گیا تھا لیکن اسے اس گمان کا شائبہ تک نہ تھا کہ طبعیات وجود رکھتی ہے۔ جدید یورپی تکنیک کی ایک سائنسی بنیاد ہے اور اسی سائنسی اساس نے اسے ایک مخصوص مزاج عطا کیا ہے۔ بے حساب ترقی کے امکانات۔ اس کے علاوہ تمام دیگر تکنیکیں مثلاً عراقی، مصری، یونانی، رومی اور مشرقی، ارتقاء کے ایک نقطے پر پہنچ جاتی ہیں اور اس کے بعد ان کا سانس پھولنے لگتا ہے اور اس نقطے تک پہنچنے کے فوراً بعد ہی ان کا رجعت قہقہری کا افسوسناک سفر شروع ہو جاتا ہے۔

یہ معجز آثار مغربی تکنیکیت یورپی نسل کی بے پناہ افزائش اور وسعت کا باعث بنی ہے۔ اس نکتے کو ذہن میں لائیے جہاں سے اس مضمون نے ایک نئی جہت اختیار کی تھی اور جو جیسا کہ میں نے کہا، اپنی اصل میں زیر بحث تمام سوچ بچار کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ چھٹی صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی تک یورپ کی آبادی کبھی اٹھارہ کروڑ سے تجاوز نہ کر سکی۔ اٹھارویں صدی سے ۱۹۱۴ء تک یہی آبادی چھیالیس کروڑ سے بھی متجاوز کر جاتی ہے۔ ہماری تاریخ میں اتنی بڑی جست کی پہلے کہیں مثال نہیں ملتی۔ اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ صرف

---

[1] THE BARBARISM OF SPECIALIZATION

[2] نہایت قدیم سنگین تمدن، شیلے، پیرس کے نزدیک ایک مقام جہاں سے پتھر کی قدیم مصنوعات ملی ہیں:

ٹکنیکیت کا فیضان ہے جس نے روادار جمہوریت سے آمیخت ہو کر مقداری معنوں میں ازدحامی آدمی کو جنم دیا ہے لیکن ان صفحات میں یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی جائے گی کہ یہی ٹکنیکیت ازدحامی آدمی کے قابلِ نفرت اصطلاحی وجود کا موجب بھی بنی ہے!

ازدحام سے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، خاص طور پر صرف محنت کش ہی مراد نہ لئے جانے چاہییں یہ اصطلاح کسی سماجی گروہ کے اظہار کے لئے وضع نہیں کی گئی بلکہ ایک ایسے انسان کے لئے ڈھالی گئی ہے جو جدید عہد کی تمام معاشرتی جماعتوں میں ملتا ہے جو نتیجۃً ہمارے عہد کی نمائندگی کرتا ہے ـــــ ہمارا عہد جس پر آج وہ ایک مقتدر قوت کے طور پر چھایا ہوا ہے۔ آیئے اس معروضے کے لئے اب ہم کافی و شافی شواہد کی تلاش کریں۔

آخر کون ہے وہ جس کے ہاتھ میں آجکل سماجی اقتدار کی عنان ہے؟ کون ہے جو اپنے ذہنی تصرفات و اختراعات کو وقت پر ٹھونستا ہے؟ اس کا جواب بغیر کسی شک و شبہ کے یہ ہے کہ یہ متوسط طبقے کا فرد! اب سوال یہ ہے کہ خود متوسط طبقے کے اندر وہ کونسا گروہ ہے جسے برتر گروہ یا عہدِ موجود کی اشرافیہ کہا جا سکتا ہے؟ بغیر کسی ریب و شک کے اہلِ تکنیک، وانجنیئر، ڈاکٹر، سرمایہ کار اور معلم وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ خود اہلِ تکنیک میں سے کون ہے وہ فرد جو اس گروہ کی بہترین اور خالص ترین نمائندگی کرتا ہے؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ سائنس کا آدمی! اگر کسی سیارے کی مخلوق کو آج یورپ کی سیر کا موقع مل جائے اور اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کے لئے وہ یہ پوچھ بیٹھے کہ افراد کی کون سی قماش کو یورپ اپنی اطمینان بخش نمائندگی کے لئے پیش کرے گا تو لا ریب اپنے لئے مفید مطلب رائے کے حصول کے لئے یورپ اپنے سائنس کے آدمیوں کی طرف اشارہ کر دے گا۔ بعین واقعہ ہے کہ ہمارا یہ سیاروی مہمان فطین اور نابغہ افراد کے متعلق نہیں پوچھے گا بلکہ سائنس کے اس عمومی آدمی کے متعلق استفسار کرے گا جو آج یورپ کی انسانیت کا نقطۂ معراج متصور ہوتا ہے۔

اور گویا اب یہ کھلا کہ یہ نرا کھرا سائنس کا آدمی اصل میں آج کے ازدحامی آدمی ہی کی حقیقی قسم ہے۔ یہ صورتِ حال کسی اتفاقِ محض کا نتیجہ نہیں اور نہ ہی یہ سائنس کے کسی مخصوص آدمی کی انفرادی ناکامیوں کے باعث ہے بلکہ یہ سب کچھ سائنس کا کیا دھرا ہے ـــــ جو ہماری تہذیبِ حاضر کی اساس ہے ـــــ اور جو خود بخود سائنس کے آدمی کو ایک ازدحامی فرد میں تبدیل کر دیتی ہے ـــــ عہدِ عتیق کے غیر مہذب فرد میں ـــــ ایک جدید بربر میں۔ یہ حقیقت بڑی عام ہے اور یہ اپنے آپ کو بار بار دہرا چکی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی اصل معنویت اور واضح سنجیدگی یہ تمام و کمال اس وقت اجاگر ہوتی ہے جب اسے اس کے آج کے مرکزی نقطے سے باہم مربوط کیا جائے۔

تجربی سائنس کا آغاز سولھویں صدی کے اختتام کے قریب ہوا (گلیلیو) سترھویں صدی کے آخر تک اس کے حدود واضح طور پر متعین ہو گئے (نیوٹن) اور اٹھارھویں صدی کے وسط میں اس کے ارتقا کا آغاز ہوا۔ کسی چیز کی ترقی اور اس کی تشکیل میں فرق ہوتا ہے یہ بات مختلف تاملات کی محتاج ہے۔ چنانچہ طبیعیات کی تشکیل نو نے تو ـــــ جو تمام تجربی علوم کا مشترکہ نام ہے ـــــ تبادلہ و اتفاق کی کوشش کو لازمی قرار دے دیا۔ نیوٹن

اوراس کے عہد کے دوسرے لوگوں کی کوششیں اسی ذیل میں آتی ہیں. لیکن طبیعیات کی ترقی نے تطبیق و توفیق کے برعکس ایک نئی جہت دکھائی. ترقی کرنے کے لئے اب سائنس نے اختصاص کا مطالبہ کرڈالا اور یہ تخصیص خود سائنس کے اندر نہیں بلکہ سائنسدانوں کے مابین لازمی قرار پائی. سائنس کبھی متخصص نہیں ہوا کرتی. اگر ایسا ہوتا تو اس حقیقت کی روشنی میں سائنس باطل ٹھہرتی. اور تو اور تجربی سائنس بھی اپنی سالمیت اور وحدت کے حوالے سے ریاضیات، منطق اور فلسفے سے الگ ہوکر سراسر باطل ہو جاتی ہے لیکن اس کے برعکس سائنسی کام لازماً تخصیص کا مطالبہ کرتا ہے۔

یہ امر اگرچہ پہلی نظر میں شاید اتنا مفید معلوم نہ ہو مگر فی الاصل باعثِ دلچسپی بھی ہوگا اور مفید بھی کہ طبیعیاتی اور حیاتیاتی علوم کی باقاعدہ تاریخ مرتب کی جائے اور محققین کے بڑھتے ہوئے تخصیصی رجحانات کا جائزہ لیا جائے تب جاکر ہی یہ معلوم ہوگا کہ نسلاً بعد نسلاً سائنسدان بتدریج ذہنی مشغولیتوں کے تنگ سے تنگ دوائر میں محدود ہوتا جارہا ہے. لیکن مذکورہ بالا تاریخ کا یہ نکتہ زیادہ اہم نہیں ہوگا بلکہ اس کی معکوس صورتِ احوال -- یعنی یہ کہ کس طرح ہر عہد میں سائنسدان اپنے دائرہ کار کو محدود کرتے کرتے سائنس کی دوسری فروع سے اور کائنات کی اس مہتم بالشان توجیہہ و تعبیر سے جو تنہا سائنس، کلچر اور یورپی تمدن جیسے ناموں کی سزاوار ہے، بتدریج دور ہوتا چلا گیا۔

اختصاص کا آغاز بے کم و کاست اس عہد سے شروع ہوتا ہے جس نے مہذب انسان کو ہمہ جہت عالم کا خطاب دیا. انیسویں صدی کے سفر کا آغاز ان شخصیتوں کی راہنمائی میں شروع ہوا جنہوں نے علم کی تمام جہات میں زندگی بسر کی، اگرچہ ان کے نتائج کار میں کہیں کہیں تخصیص بھی نظر آتی ہے. اگلی نسل کے آتے ہی یہ توازن بگڑ گیا اور اختصاص نے بکھر کر بجو د مکتفی سائنسدان سے الگ کرنا شروع کردیا. جب ۱۸۹۰ کے لگ بھگ ایک تیسری نسل یورپ کی فکری قیادت اپنے ہاتھ میں لیتی ہے تو ہمارا سابقہ ایک ایسے سائنسدان سے پڑتا ہے جس کی نظیر پوری تاریخ میں نہیں ملتی. یہ ایک ایسی شخصیت ہے جو صرف ایک علم ہی سے واقف ہے حالانکہ صاحب الرائے ہونے کے لئے وسیع ذخیرہ علوم میں سے معقول حد تک کا علم بہت ضروری ہے، پھر یہ کہ وہ اس علم کے بھی صرف ایک حقیر کونے کھدرے سے شناسائی رکھتا ہے جس کا پرجوش محقق ہے. صرف یہی نہیں بلکہ وہ اس امر کا اعلان بھی اپنی پارسائی کے طور پر کرتا ہے کہ وہ اپنے نہایت محدود دائرہ کار سے باہر کی کسی چیز کا نوٹس تک نہیں لیتا اور علم کی عمومی تدبیرکاری میں کسی قسم کی دلچسپی دکھانے کو آمائی پن سے تعبیر کرتا ہے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ اپنے فکری میدان کے تنگ حدود میں محصور و محدود ہوکر بھی وہ نئے حقائق کی دریافت اور اس علم کو مزید ترقی دینے میں یقیناً کامیاب ہوجاتا ہے جسے وہ جانتا تک نہیں اور ساتھ ہی ساتھ حادثتہً ''فکر کے اس دائرۃ المعارف کو بھی ترقی دیتے ہیں جس سے وہ '' اصولی طور پر '' بے خبر رہتا ہے. یہ بات کس طرح ممکن رہی ہے اور اب بھی ہے؟ اس لئے کہ اس غیر معمولی مگر ناقابلِ تردید حقیقت پر اصرار کرنا ضروری ہے کہ تجربی سائنس کا ارتقاء بہت حد تک ایسے افراد کا مرہونِ احسان رہا ہے جو حیران کن حد تک اوسط قابلیت کے حامل تھے اور بعض صورتوں میں تو اوسط سے بھی کم درجہ! مطلب یہ کہ جدید سائنس جو ہمارے تمدن کی اصل و علامت کا حکم رکھتی ہے ذہنی طور پر اوسط قابلیت

کے لوگوں کے لئے جگہ نکالتی ہے اور وہاں انہیں کامیابی سے برسرِ کار رہنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس کا سبب وہ شے ہے جسے میکانکیت سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو بیک وقت آج کی جدید سائنس اور اس تہذیب کے لئے جس کی رہنمائی اور نمائندگی کی یہ ضامن ہے، بے حد استعداد کا باعث بھی ہے اور شدید ترین خطرے کا بھی! طبیعیات یا حیاتیات کی بیشتر مقدار ایسے ذہنی کام پر مشتمل ہے جو سراسر میکانکی ہے اور جسے کم و بیش ہر کوئی انجام دے سکتا ہے۔ بے شمار تحقیقات کرنے کے لئے سائنس کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ دینا اور خود کو ان میں سے کسی ایک میں مامور و محصور کر لینا اور باقی تمام کو ذہن بدر کر دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ اب طریقہ ہائے کار کی درست روی اور ٹھوس پن علم کی اس عارضی مگر خاصی حقیقی نامیاتی علیحدگی کی اجازت دے دیتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک طریقے کے استعمال سے کام بڑے میکانکی انداز میں مکمل ہو جاتا ہے اور وافر نتائج کے حصول کے لئے ان کے اصول و معانی جاننے کی چنداں کوشش اور فکر بھی ضروری نہیں ہوتی۔ جس طرح شہد کی مکھی چھتے کے کسی ایک خلیے میں محصور رہتی ہے یا کباب بھونے کی سیخوں کو بدلنے والے پہیے پر مامور چھوٹا سا کتا، اسی طرح ہمارے اکثر سائنسدان اپنے معمل میں محصور و مقید رہ کر سائنس کی عمومی ترقی کا باعث بنتے ہیں!

لیکن اس کے نتیجے میں ایک غیر معمولی طور پر عجیب و غریب فرد جنم لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسا محقق جس نے فطرت کی ایک نئی جہت کا کھوج لگایا ہو، لازماً قوت و قدرت اور اعتمادِ ذات کے احساس کا تجربہ کرتا ہے۔ چنانچہ اپنے آپ سے ایک کھلا اور واضح انصاف کرتے ہوئے وہ خود کو ایک ایسے شخص کے روپ میں دیکھتا ہے جو "علیم ہے"! حالانکہ امرِ واقعہ ہے کہ اس کے اندر ایک علیم شے کا صرف ایک جز موجود ہے جسے بعض ایسے دیگر اجزا سے مربوط و منضبط کر کے ہی جو ایک شخص کے باطن میں موجود نہیں ہیں، حقیقی علم وجود میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ ہے ایک متخصص کی سچی باطنی تصویر جو اس صدی کے پہلے چند سالوں میں مبالغے اور غلو کی انتہائی وحشت تک پہنچ گیا ہے۔ یہ متخصص اپنی کائنات کے ایک نہایت ننھے گوشے سے تو بخوبی واقف ہے لیکن باقی تمام جہات اور ابعاد سے یکسر بے خبر!

یہاں اس جدید عجیب و غریب انسان کی جامع مثال دی جاتی ہے جسے میں نے اس کے دونوں باہم متناقض رویوں کے حوالے سے واضح کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ یہ وہ انسانی پیداوار ہے جس کی تاریخِ عالم میں مثال نہیں ملتی۔ اس "جدید نسل" کی نمائندگی کے لئے ہم متخصص کو ایک جامع اور نہایت مقرون مثال کے طور پر پیش کر سکتے ہیں جس سے ہم پر جدت اور جدیدیت کی اساسی نوعیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ اس سے پہلے ہم افراد کو آسانی سے علماء اور جہلاء میں تقسیم کر سکتے تھے۔ جن میں سے کم و بیش کچھ کا ایک گروہ اور کچھ کا دوسرے گروہ سے تعلق ہوتا تھا لیکن تمہارے اس متخصص کو ان گروہوں میں سے کسی ایک کے تحت میں نہیں لایا جا سکتا۔ وہ عالم نہیں ہے اس لئے کہ وہ اپنے تخصیصی میدان سے باہر کی ہر چیز سے بے خبر ہے لیکن وہ جاہل بھی نہیں ہے اس لئے کہ وہ "سائنسدان" ہے اور کائنات کے متعلق اپنے نہایت چھوٹے سے حصے کا بخوبی "علم" رکھتا ہے۔ ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ وہ "عالم جاہل" ہے۔ اور ایسا ہونا باعثِ تشویش ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جاہل ہے مگر جاہل آدمی کی

نہیں بلکہ اس شخص کے طرز پر جو اپنے خاص میدان کا عالم تنک مایہ ہوتا ہے :

حقیقت میں ایک متخصص کا رویہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ادب، سیاست، سماجی برتاو اور دوسرے علوم کی ذیل میں اس کا رویہ ایک قدیم وحشی اور جاہل کا سا ہوگا لیکن وہ انہیں جبراً بخود کفایتی انداز میں اپنائے گا۔ اور اگر تول محال یہ اجازت دی جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ معاملات اور میدانوں میں کسی دوسرے متخصص کا دخل ہرگز برداشت نہیں کرے گا۔ تمدن نے اسے متخصص کر کے عہد وسطیٰ کے "توہمات" سے قریب کر دیا ہے اور اسے ایسے تنگ حدود میں خود اطمینانی دے ڈالی ہے لیکن برتری اور قدر و قیمت کا یہی باطنی احساس اسے اپنے تخصیصی میدان سے باہر دیگر میدانوں پر بھی حاوی ہونے کی ترغیب دے گا اس صورت حال کا بھی، یعنی انسان کی بیشتر صلاحیتوں کی نمائندگی کرتے ہوئے بحوالہ اپنی تخصیص کے جس کا ایک اندھا انسان سخت مخالف ہے، نتیجہ یہ نکلے گا کہ زندگی کے تمام میدانوں میں اس کا رویہ ایک ان پڑھ اندھا آدمی کا سا ہوگا۔

اسے صرف ایک بے پر کی بات پر محمول نہ کیا جائے۔ جو صاحب بھی اس کی تصدیق چاہتے ہیں وہ فکر، رائے اور عمل کی اس حماقت کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں جو آج کل سیاست، فنون، مذہب اور زندگی کے عام مسائل میں اہل سائنس اور ان کے اتباع میں ڈاکٹروں، انجینیروں، سرمایہ کاروں، معلموں اور بعض دیگر افراد میں پائی جاتی ہے۔ میں بارہا بیان کر چکا ہوں کہ سی اس سی کرے اور اپیل کی اعلیٰ عدالتوں سے رجوع نہ لانے کا رجحان اندھا انسان کی غالب خصوصیات ہیں اور یہی خصوصیات ان جزوی سند یافتہ اصحاب (جن کا ابھی ذکر ہوا) کے یہاں اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہیں۔ یہی لوگ عامۃ الناس کی حقیقی مملکت محروسہ کی نمائندگی کرتے ہیں اور بہت حد تک اس کی تشکیل کے ذمہ دار ہیں۔ ان لوگوں کی بربریت یورپ کے اخلاقی انحطاط کی فوری وجہ بنی ہے۔ مزید برآں یہ لوگ اس امر کا بھی واضح اور انکشاف انگیز ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ گزشتہ صدی کا تمدن کس طرح اپنے ہی ہاتھوں وحشی پن اور بربریت کے نئے جنم کا باعث بنا ہے۔

اس غیر متوازن اختصاص کا فوری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج جبکہ پہلے سے کہیں زیادہ سائنسداں موجود ہیں یہ حقیقت بڑی تلخ ہے کہ ۱۷۵۰ء کے زمانے کے مقابلے میں "مہذب انسان" خال خال ملتے ہیں اور بدترین واقعہ یہ ہے کہ سائنس کے یہ جزوی اور بے حد متکار خود سائنس کی حقیقی ترقی کی کوئی ضمانت مہیا نہیں کرتے یہ اس لئے کہ سائنس اپنی ترقی کے لئے وقتاً فوقتاً ایک ضروری ضابطہ کار در نگو لیٹر کے طور پر تشکیل نو کی کھنائیوں کا سامنا کرتی ہے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ کام ارتباط و انضباط کا مطالبہ کرتا ہے جو مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے کیونکہ اس کام میں علم کی دنیا کے وسیع سے وسیع تر ہوتے ہوئے دائرہ کا شمول ضروری ہے۔ نیوٹن اس قابل تھا کہ فلسفے کا وسیع علم نہ رکھنے کے باوجود طبیعیات کے ایک نظام کار (SYSTEM) کی بنا ڈال سکے لیکن آئن سٹائن کے لئے از بس لازمی تھا کہ اپنے متوازن امتزاج تک پہنچنے سے پہلے کانٹ اور ماخ (MACH) کی تفوقات علمی کا بالاستیعاب مطالعہ کرے۔ کانٹ اور ماخ — یہ نام تو اس عظیم فلسفیانہ اور نفسیاتی فکر کی دو علامتیں ہیں جنہوں

نے آئن شٹائن پر خاصا اثر ڈالا. اس کے ذہن کو آزادی سے ہمکنار کیا اور اس کی ایجاد و ابداع کیلئے راستہ نکالا. لیکن صرف آئن شٹائن ہی کافی نہیں طبیعیات اپنی تاریخ کے نہایت نازک دور میں داخل ہو رہی ہے جسے بچانے کے لئے کہیں زیادہ منظم "جدید تبحرِ علمی" کی ضرورت ہے.

پس اختصاص جس نے ایک صدی کے دوران تجربی سائنس کو ممکن بنایا ہے، اب ایک ایسے رُخ پر پہنچ رہا ہے جہاں یہ اس وقت تک مزید پیشقدمی نہیں کر سکتا جب تک کہ ایک نئی نسل اس کے لئے زیادہ قوی اور موثر خدمت گار مہیا کرنے کی ضمانت نہ دے دے.

لیکن اگر متخصص اپنی مخصوص سائنس کے باطنی فلسفے سے آگاہ نہیں تو وہ اس کے تسلسل کے لئے مطلوب تاریخی شرائط سے اس سے بھی زیادہ غافل ہوگا یعنی اسے علم نہ ہوگا کہ کس طرح معاشرے اور قلب انسانی کو باہم منظم کیا جائے کہ محققین کا تسلسل قائم رہ سکے.

گذشتہ چند سالوں سے سائنس کے میدانوں میں محسوس کی جانے والی کمی. جس کا میں نے پہلے کہیں حوالہ دیا ہے. اس شخص کے لئے پریشانی کی علامت ہے جسے صاف طور پر معلوم ہو کہ تمدن کیا ہوتا ہے اور جس کے واضح خدوخال سے ہمارا زیر بحث سائنس دان عموماً ناواقف رہتا ہے حالانکہ یہ سائنسدان ہمارے موجودہ تمدن کا نقطۂ معراج ہے. یہ اس بات کا بھی یقین کر بیٹھا ہے کہ تمدن بھی اس طرح وجود رکھتا ہے جس طرح قشرِ ارض یا بے عیب جنگل کا قدیم غیر مہذب باسی!

تحقیق

فتوحاتِ مکیہ

محمد اکرام چغتائی

ابن العربی (ولادت مرسیہ ۵۶۰ھ / ۱۱۶۵ء، وفات دمشق ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء)[1] جنہیں عرفِ عام میں "الشیخ الاکبر" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اسلام کی فکری تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ یوں تو انہوں نے اپنے دور کے متعدد علومِ متداولہ پر قلم اٹھایا ہے، لیکن اُن کی مقبولیتِ عامہ اور شہرتِ دوام کی اصل وجہ اُن کی وہ تالیفات ہیں جن میں صوفیانہ تصورات پر تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ ابن العربی کی ان تحریروں کے پیشِ نظر اُن کی متصوفیانہ فکر کا جو دائرہ بنتا ہے، اُس کا مرکزی نقطہ نظریۂ وحدت الوجود ہے، جس پر انہوں نے جابجا کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی طور پر بحث کی ہے اور جو اُن کے دیگر صوفیانہ افکار کے مقابلے میں زیادہ موضوعِ بحث بنا ہے۔ بالعموم ابن العربی کو اس نظریے کا بانی اور اُن کے پورے نظامِ فکر کا محور تصور کیا جاتا ہے، لیکن چند اربابِ نظر کے خیال میں انہوں نے اپنے فلسفیانہ اور صوفیانہ نظریات کو ایسے غیر مربوط اور ناقابلِ فہم انداز میں پیش کیا ہے کہ بعض مواقع پر وہ اسلام کے بنیادی عقائد سے متصادم نظر آتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ عہدِ حاضر کے بعض مفکرین اور محققین نے اپنی تمامتر علم و دانش کے باوجود واشگاف الفاظ میں اپنی بے بضاعتی کا اظہار کیا ہے اور ابن العربی کے نظریات کو کسی حد تک ناقابلِ توضیح قرار دیا ہے[2]۔ بظاہر یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر ابن العربی کی کتابوں بالخصوص "فصوص الحکم" کی عربی، فارسی، ترکی اور اردو زبانوں میں تحریر کردہ شروح کی کثیر تعداد کو دیکھا جائے، تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ابن العربی کے صوفیانہ خیالات کی صحیح تفہیم اتنی آسان بھی نہیں۔ جب اس معذوری کا اظہار کرنے والوں اور شارحوں میں بعض صفِ اول کے باعمل صوفیائے کرام کے نام آتے ہیں، تو ابن العربی کے فکری عدم تسلسل اور اُن کے پیرایۂ بیان کے بے ربط اور ادق ہونے کا احساس مزید بڑھ جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک متضاد اور متنازعہ شخصیت اختیار کر گئے اور مختلف مکاتیبِ فکر کے پیروکاروں کی جانب سے اُن پر اعتراضات کی بارش شروع ہو گئی۔ بالآخر اُن کی مخالفت یہاں تک بڑھ گئی کہ انہیں کافر، ملحد اور زندیق قرار دے دیا گیا اور مسلمانوں کے لیے اُن کی تحریروں کو پڑھنے کی ممانعت کر دی گئی لیکن اس شدید ردِعمل کے ساتھ ساتھ ایک مثبت ردِعمل کی لہر بھی جاری رہی اور علماء اور صوفیاء کی بہت بڑی تعداد نے اُن کے نظریات کے باطنی مفاہیم کو سراہا اور اُن کی وفات کے بعد مختلف ممالک میں ایک ایسا وسیع حلقہ پیدا ہو گیا، جس پر ابن العربی کی گہری چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے[3]۔

ابن العربی کی اس متنازعہ شخصیت اور اُن کے بارے میں دو متحارب گروہوں کی تشکیل باعثِ حیرت ہے، لیکن اگر

بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ ایک فطری سی بات معلوم ہوتی ہے اور اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ابن العربی نے چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں لکھی ہیں اور ایک کثیر التصانیف مؤلف ہونے کی حیثیت سے اُن میں موضوعات کی تکرار بھی ہے اور بعض مقامات پر اُن کے طرزِ بیان میں بے ربطی اور عدمِ یکسانیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے جو انداز اختیار کیا ہے، وہ کسی حد تک عام فہم سے بالاتر ہے۔ تیسرے ان کی مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر بہت سی ایسی کتابیں معرضِ وجود میں آئیں، جو ان کے نام منسوب کی گئیں یا ان کی مستند کتابوں کے بعض حصوں میں تحریف کر دی گئی۔ حالیہ تحقیقات کے مطابق ایسی الحاقی کتابوں اور ایسے تحریف شدہ حصوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی ہے اور ان کو پڑھتے ہوئے اصل ابن العربی کی شناخت کرنے میں کبھی کبھار دھوکا بھی ہو جاتا ہے۔ چوتھے انہوں نے جو روحانی تجربات و مشاہدات بیان کئے ہیں وہ ان کی اپنی ذات تک محدود ہیں۔ ان کی یہ ذہنی اور قلبی کیفیات کو کوئی صاحبِ حال فرد تو سمجھ سکتا ہے لیکن ایک عام شخص کے لئے ان کی تفہیم اور ان کی تشریح و توضیح ممکن نہیں۔

ابن العربی کے متعلق تضاد آراء کے ان اسباب و علل کے باوجود متذکرہ بالا دو طبقہ ہائے فکر کے علاوہ ایک ایسا طبقہ بھی معرضِ وجود میں آیا، جس نے ان کے نظریات پر کڑی تنقید کی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ تصوف کے سلسلہ میں ان کی خدمات کو تسلیم کیا۔ برصغیر پاک و ہند میں اس طبقۂ فکر کی نمایاں شخصیت شیخ احمد سرہندیؒ کی ہے جنہوں نے اپنے "مکتوبات" میں ابن العربی کے نظریات پر مدلل اعتراضات کئے، لیکن اپنے تمام تر علمی اختلافات کے باوجود انہوں نے ابن العربی کی عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے[۴]۔ ان کے بعد دوسری مثال مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ہے۔ انہوں نے ابن العربی کے متعلق ان دو متحارب طبقوں کو قریب لانے کی سعی کی اور شیخ اکبر کی تحریروں کی روشنی میں ان کے تصورات کی اس خوبصورت اور مربوط انداز سے وضاحت کی کہ ان کے متعلق صدیوں کے شکوک و شبہات دور ہو جاتے ہیں[۵]۔

ابن العربی کی اس قدر نزاعی شخصیت اور رموزِ تصوف کے مابین ان کے متصوفانہ تصورات کی عدمِ تفہیم کے احساس کے باوجود ان کے سوانح حیات اور نظریات کو مختلف زاویوں سے سمجھنے کی کوششیں جاری ہیں۔ ان مطالعات میں مسلمانوں کے بعض معروف اہلِ قلم کے علاوہ یورپ کے اصحابِ علم و دانش بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ ابن العربی کے مطالعہ کے سلسلہ میں جہاں ابوالعلاء عفیفی[۶]، سید حسین نصر، حسینی[۸] وغیرہ کے نام ملتے ہیں، وہاں اسین پلاسیوس[۹]، نکلسن، نائبرگ، ہنری کوربن، ہارٹ[۱۲]، شل و السابق[۱۳] اور جاپان کے ازتسو جیسے مفکرین اور محققین کے اسماء بھی ابن العربی کی حیات و افکار کے ماہرین کے طور پر نظر آتے ہیں[۱۵]۔

ابن العربی نے اپنی زندگی میں سیکڑوں کتابیں لکھی ہیں، جن میں اب الحاقی کتابوں کی بہت بڑی تعداد بھی شامل ہو گئی ہے۔ ان کی کتب کثیرہ کی فہرست سازی کا کام ان کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا اور ان کی تصنیفات کی پہلی فہرست ۶۲۷ھ/۱۲۳۰ء سے قبل تیار ہو گئی تھی۔ یہ فہرست نامکمل ہے، کیونکہ اس میں شیخ اکبر کی زندگی کے آخری گیارہ سالوں کی کتابیں درج نہیں۔ اس فہرست کے مؤلف ان کے خلیفہ صدرالدین قونوی ہیں اور اس کا

خطی نسخہ قونیہ کے کتب خانہ یوسف آغا (نمبر ۴۹۸۹، ص ۲۷۸ - ۲۸۹) میں محفوظ ہے[18]۔ دوسری فہرست ابن العربی کے تحریر کردہ اس "اجازۃ" میں شامل ہے، جو انہوں نے الوبی سلطان غازی بن الملک العادل کو ۶۳۲ھ/ ۱۲۳۴ء میں بھیجا تھا۔ اس میں کتابوں کی تعداد ۲۸۹ ہے[19]۔ تیسری فہرست کورکیس عواد کی مرتبہ ہے، جو کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد دکن) کے مخطوطے کے پیش نظر تیار کی گئی تھی۔ اس قلمی نسخے کا سنہ کتابت ۸۲۳ھ/ ۱۴۱۸ء - ۱۴۱۹ء ہے۔ دراصل یہ ایک اور قلمی نسخے (مکتوبہ ۶۳۹ھ/ ۱۲۴۱ - ۱۲۴۲ء) سے نقل کی گئی ہے[20]۔ اس میں کتابوں کی تعداد ۲۴۸ بیان کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ آٹھویں صدی ہجری کے ایک مؤلف نے اپنی کتاب "الدر الثمین فی مناقب محی الدین" میں شیخ اکبر کی تصانیف کی تعداد ۱۹۲ لکھی ہے[21]۔ ابن العربی پر اولیں انگریزی کتاب کے مصنف ابو العلا عفیفی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اپنی تیار کردہ فہرست میں ۲۵۱ کتابوں کے نام گنوائے ہیں[22]۔ اس تمام ذخیرے کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر عثمان یحیی نے ابن العربی کی جو فہرست دو جلدوں میں مرتب کی ہے، اس میں یہ تعداد بڑھ کر ۸۴۶ تک پہنچ گئی ہے[23]۔ بظاہر یہ تعداد ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے، کیونکہ سطورِ بالا میں جن ہمعصر اور قدیم منابع میں مؤلفات کی تعداد تین سو سے بھی کم ہے۔ ان میں مستند ترین تعداد (۲۸۹) ہے، جو انہوں نے ۶۳۲ھ میں خود درج کی ہے۔ ویسے بھی یہ باور کرنا دشوار ہے کہ ابن العربی (سنہ وفات ۶۳۸ھ) نے اپنی عمر کے آخری چھ سالوں میں اتنی کتابیں لکھی ہوں۔ درحقیقت عثمان یحیی نے ابن العربی کی مستند اور غیر مستند کتابوں میں فرق نہیں کیا اور تمام منتشر مواد کو یکجا کر دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے ان کی کتابوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے۔

ابن العربی کی مستند کتابوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے جو شہرت اور قبولِ عام کی سند "فصوص الحکم"[24] اور "فتوحات" کو عطا ہوئی، وہ ان کی کسی اور کتاب کے حصے میں نہیں آئی[25]، حالانکہ باقیماندہ غیر معروف یا کم معروف تصنیفات سے بھی ان کے افکار کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ اول الذکر کتاب ان کے صوفیانہ تصورات میں بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ اس میں حضرت آدمؑ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک اٹھائیس پیغمبروں کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے اور مؤلف کے اپنے قول کے مطابق رسول اکرمؐ نے انہیں خواب میں یہ کتاب نقل کرائی۔ اب تک دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ "فتوحات" کی طرح اس کا اندازِ بیان بھی خاصا مشکل ہے اور اسی وجہ سے مختلف زبانوں میں اس کی پچاس سے زیادہ شرحیں لکھی جا چکی ہیں، جن میں سے براکلمان نے ۳۵ کا حوالہ دیا ہے۔ اگر براکلمان کی اس تعداد میں ان عربی، فارسی اور اردو شرحوں کو شامل کر دیا جائے جو برصغیر پاک و ہند میں لکھی گئیں، تو یہ تعداد بہت بڑھ جاتی ہے[26]۔

"فصوص الحکم" کے بعد ابن العربی کی ضخیم اور فکری اعتبار سے مؤثر ترین کتاب "فتوحات مکیہ" ہے جسے "الفتح المکی"، "الفتوحات المکیۃ فی معرفۃ الاسرار المالکیہ والملکیۃ" اور "الفتوح المکیۃ" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی کل چھ فصلیں ہیں، جو ۵۶۰ ابواب میں منقسم ہیں۔ اس کی تالیف کا آغاز ۵۹۸ھ/ ۱۲۰۱ء میں ہوا جب مؤلف کو حج مبارک کی پہلی سعادت نصیب ہوئی اور یہ تقریباً ۳۱ سال کے طویل عرصے کے بعد ماہ صفر ۶۲۹ھ/ ۱۲۳۱ء[27]

میں اختتام کو پہنچی۔ اس کے دوسرے نسخے کی تیاری کا کام ۶۳۲ھ/ ۱۲۳۴ء میں شروع ہوا اور یہ ۶۳۶ھ/ ۱۲۳۸ء میں مکمل ہوا۔ اس کتاب کے آغاز میں ابن العربی نے جو مقدمہ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ضخیم کتاب کی ابتدا ایک مراسلے سے ہوئی، جو انہوں نے اپنے قیام مکہ کے دوران میں اپنے دوست عبدالعزیز المہدوی کو تحریر کیا تھا، لیکن رفتہ رفتہ شوق نے یہ بات کچھ ایسی بڑھا دی کہ یہی مراسلہ ایک دفتر کی صورت اختیار کر گیا اور اس کا شمار دنیا کی لافانی اور تصوف کی اہم ترین کتابوں میں ہونے لگا اور اسے بجا طور پر "تصوف اسلام کی انجیل" کہا جانے لگا۔[۲۷]

"فتوحات" میں موضوعاتی لحاظ سے تنوع پایا جاتا ہے اور اس میں بہت سے موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اس میں مابعدالطبیعیاتی مسائل، مختلف علوم مقدسہ اور مؤلف کے روحانی تجربات کو بالصراحت بیان کیا گیا ہے۔ اس کو اسلام کے علوم باطنیہ کا خلاصہ سمجھا جا سکتا ہے، جس کے موضوعات میں اتنی وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے، جو اس سے پہلے یا بعد کی لکھی ہوئی کسی کتاب میں نظر نہیں آتی۔ اگر اس کتاب کے موضوعات کے پھیلاؤ اور جامعیت کو مدنظر رکھا جائے، تو بظاہر یہ کسی عام انسانی ذہن کی تخلیق معلوم نہیں ہوتی۔ چنانچہ مؤلف نے خود ہی ذکر کیا ہے کہ اس کی تالیف میں ان کی کسی ذاتی کد و کاوش کا عمل دخل نہیں، بلکہ خدائے بزرگ و برتر نے اپنے فضل سے انہیں ان رموزِ مخفیہ کی حقیقت سے متعارف کرایا اور اسی کے بھیجے ہوئے فرشتے کے ذریعہ اس کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا گیا۔[۲۸]

"فتوحات" میں مسائل تصوف کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان میں متقدمین صوفیائے کرام کے اقوال اور حالاتِ زندگی، ہرمسی اور نوافلاطونی کونیاتی تصورات، علوم باطنیہ (علم جفر وغیرہ)، علم الکیمیا اور علم النجوم کے متعلق علامت نگاری شامل ہیں۔ یہ کتاب صدیوں تک اسلام کے مقدس علوم کا منبع رہی ہے۔ تمام علاقوں کے صوفیہ سالہا سال اس کے علوم و معارف اور سلوک و منازل پر غور کرتے رہے اور اس کی گتھیاں سلجھاتے رہے، جس کا ماحصل وہ رسائل اور شروح ہیں، جو انہوں نے اس کتاب کے مشکل معاملات کے حل یا وضاحت کے لئے تحریر کی ہیں۔

"فتوحات" کی اس قدر اہمیت کے باوجود یہ قلمی صورت میں دنیا کے مختلف کتب خانوں کی زینت بنی رہی۔ بالآخر اس کو پہلی بار چار ضخیم اور بڑی تقطیع کی جلدوں میں ۱۲۷۴ھ میں مصر سے شائع کیا گیا۔ ازاں بعد یہ کتاب گاہے بگاہے طبع ہوتی رہی اور اب بھی اس کا یہی ایڈیشن مستعمل ہے۔ یہ طویل چھ فصول اور ان کے ۵۶۰ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ فصل اول (المعرفۃ) کے ۷۳ باب، فصل دوم (المعاملات) کے ۱۱۶ باب، فصل سوم (الاحوال) کے ۸۰ باب، فصل چہارم (المنازل) کے ۱۱۴ باب، فصل پنجم (المنازلات) کے ۷۸ باب اور فصل ششم (المقامات) کے ۹۹ باب ہیں۔

حال ہی میں "فتوحات" کا ایک ایسا قلمی نسخہ سامنے آیا ہے، جو مروجہ مطبوعہ نسخے کے مقابلہ میں ضخیم اور مندرجات

کے اعتبار سے مختلف ہے۔ اس بیش بہا مخطوطے کی دریافت کا سہرا شام کے ایک محقق ڈاکٹر عثمان اسماعیل یحییٰ کے سر ہے۔ وہ اپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس کی سوربون یونیورسٹی گیا اور وہاں اسے ڈاکٹریٹ کے مقالے کے لیے ابن العربی کی مصدقہ اور غیر مصدقہ سبھی کتابوں کی ایک جامع فہرست کا کام سونپا گیا۔[29] چنانچہ اس نے ابن العربی اور ان کے مکتبۂ فکر کے صوفیہ کی تصانیف کی تلاش و جستجو کے لیے ترکیہ کے دورے کیے۔ اس نے پہلا دورہ مشہور فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینیوں[30] (م ۱۹۶۲ء) کی تجویز پر ۱۹۵۴ء میں کیا اور اس کا انتظام سی۔ این۔ آر۔ ایس[31] نے کیا۔ اس دورے میں اس نے استانبول کے کتب خانوں کے قلمی ذخائر کا بنظرِ غائر جائزہ لیا۔ اس کے دوسرے دورے کا انتظام یونیسکو نے کیا اور وہ ماسینیوں اور کرُبین کے کہنے پر ۱۹۵۶ء میں دوبارہ ترکیہ گیا۔ تیسری بار وہ متذکرہ بالا سنٹر کی جانب سے کرُبین کی تجویز پر ایک وفد کے ہمراہ ترکیہ کے کتب خانوں کو دیکھنے گیا (۱۹۶۱ء)۔ اس نے اپنے پہلے دو دوروں میں ترکیہ کے کتب خانوں میں تصوف پر جو اہم مخطوطات دیکھے، اُن پر ایک تفصیلی مقالہ لکھا[32]، جس میں "فتوحات" کے ایک ایسے نسخے کی نشاندہی کی گئی تھی، جو ۳۷ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ معاصر نسخہ ہے اور اس پر ابن العربی نے اپنے ہاتھ سے دستخط کیے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کو یہ نسخہ استانبول کے اوقاف میوزیم[33] سے دستیاب ہوا۔[34] یہ مخطوطہ ابن العربی کی وفات سے دو سال قبل یعنی ۶۳۶ھ میں مکمل ہوا۔ یہ ۷۱ سماع پر مشتمل ہے اور ک؛ اسی مقالے کا حصہ دوم) اور اس کی ابتدائی پندرہ جلدیں ابن العربی نے اپنے خلیفہ صدرالدین قونوی کے نام معنون کی ہیں۔ اِس خطی نسخہ کی چند نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

۱ چند سماع کے علاوہ تمام سماع کی تاریخ کتابت درج ہے اور کل ۷۱ سماع میں سے ۵۷ سماع ابن العربی کی زندگی میں لکھے گئے۔ سماع ۵۸ کے بعد سنۂ کتابت ۶۴۰ھ درج ہے، یعنی یہ مؤلف کی وفات سے تین سال بعد لکھے گئے۔

۲۔ سماع ۱ تا ۵ کی کتابت دمشق میں ابن العربی کے گھر پر ہوئی اور اس کے بعد کے سماع حلب میں ابن صودکین کی اقامت گاہ پر لکھے گئے۔

۳۔ سماع ۱ تا ۵ مؤلف کی نظر سے گذرے ہیں اور انہوں نے ان پر اپنے دستخط بھی کیے ہیں۔

۴۔ جب کسی سماع کی کتابت ہو جاتی تھی، تو وہ ایک باقاعدہ مجلس میں پڑھا جاتا تھا، جو خاص اسی مقصد کے لیے مؤلف ہی کے گھر پر منعقد کی جاتی تھی۔ اس مجلس میں مؤلف کی حیثیت سننے والے کی ہوتی تھی۔

۵۔ اس مجلس میں ہر سماع پڑھا جاتا تھا اور پڑھنے والا حاضرین میں سے کوئی شخص ہوتا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر سماع علی بن المظفر النشبی کے پڑھے ہوئے ہیں۔

۶۔ ہر سماع میں جو لوگ شامل ہوتے تھے، اُن کے ناموں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان سامعین میں ابن العربی کے قریبی حلقہ کے پیروکار شریک ہوتے تھے۔ ان سامعین میں مؤلف کے بیٹے بھی شامل ہیں

۷۔ چند سماع میں عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں، مثلاً سماع ۲۱ میں پڑھنے اور سننے والی اُمّ دلال نامی عورت ہے (نیز دیکھ، سماع ۳۸ و ۴۴)۔ سماع ۲۹ میں بھی خوانندہ اور سامع ام رسلان نام کی کوئی عورت ہے

۸۔ ہر سماع کے کاتب کا نام بھی دیا گیا ہے۔

جب مسلمانوں کی فکری تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ارباب تحقیق و تدقیق کو اس دریافت کا پتہ چلا اور انہیں اس کے خصائص کا علم ہوا، تو انہوں نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس کی فوری طباعت کے لیے اپنی کوشش تیز کر دیں، لیکن اس کے متن کی تدوین، اس کا دیگر ہمعصر یا قریب العصر نسخوں سے تقابل اور اس کے متن کی صحت و درستی کے لیے ترتیب متون کے جدید اصولوں اور تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھنا خاصا صبر آزما، کٹھن اور وقت طلب کام تھا۔ علاوہ ازیں اتنی جلدوں کی طباعت کا مسئلہ بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ ان تمام جلدوں کو شائع کرنے کے لیے خطیر رقم کی ضرورت تھی۔ ان موانع کے باعث اس نسخے کی اشاعت کچھ عرصے کے لیے معرض التوا میں پڑی رہی۔ بالآخر اس نسخے کے متن کی تیاری کا کام ڈاکٹر عثمان یحییٰ کو تفویض ہوا اور اس کی طباعت کی ذمہ داری مصر کے ایک سرکاری ادارے نے اٹھائی۔ قاہرہ کی امور علمیہ کی اعلیٰ کونسل نے اس نسخے کو چھاپنے کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لیے انہوں نے ڈاکٹر موصوف کی خدمات حاصل کیں؛ جو اس وقت سی۔ این۔ آر۔ ایس سے منسلک تھے۔ اُن کو یہ فریضہ ابن العربی کے مطالعات کا ماہر سمجھ کر سونپا گیا۔ مجوزہ پروگرام کے مطابق "فتوحات" کے اس نئے قلمی نسخے کی تدوین دس سال میں مکمل ہوگی اور یہ تمام قلمی ذخیرہ بیس جلدوں میں طبع ہوگا۔

ڈاکٹر عثمان اسماعیل یحییٰ نے ۱۹۷۲ء میں اس کی پہلی جلد شائع کر دی تھی اور اب تک اس کی پانچ جلدیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ ان مطبوعہ جلدوں کے سرسری مطالعے ہی سے مدون کی لگن، جانفشانی اور عرق ریزی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس نے عربی متن کی درستی کا خاص خیال رکھا ہے، اور بعض معتبر اور قابل اسناد مخطوطات کو سامنے رکھ کر متن کو ہر اعتبار سے مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو "فتوحات" کے بیسیوں نسخے مکمل اور نامکمل حالت میں دنیا کے مختلف کتب خانوں میں پڑے ہوئے ہیں، لیکن اُن سب کو مدنظر رکھتے ہوئے متن کی تدوین ممکن نہ تھی۔ چنانچہ مرتب نے محولہ بالا نسخے کے متن کو بنیاد بنایا، کیونکہ یہ معلوم نسخوں میں مستند ترین نسخہ ہے اور اس کے متن کی تصحیح مؤلف نے خود کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مرتب نے ترکیہ کے کتاب خانۂ فاتح اور کتاب خانۂ بایزید کے مخطوطات سے بھی مدد لی ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ابن العربی کی زندگی میں "فتوحات" کے دو نسخے تیار ہوئے تھے۔ ایک ۶۲۹ھ کو مکمل ہوا اور دوسرا ۶۳۶ھ کو اختتام پذیر ہوا۔ مرتب نے ترکیہ کے ان تینوں مخطوطات کے عمیق مطالعہ کے بعد ایسی اندرونی شہادتیں بہم پہنچائی ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فاتح اور بایزید کے نسخے ابتدائی ہیں اور اتاموبل کا زیر نظر نسخہ دوسرا ہے۔

عثمان یحییٰ نے متن کی تدوین میں پیراگرافوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ہر جلد کے ہمراہ مندرجہ ذیل گیارہ قسم کے اشاریے لگاتے ہیں:۔

۱۔ آیات

۲۔ احادیث

۳۔ الافکار الرئیسیہ
۴۔ تکنیکی الفاظ
۵۔ اشخاص، قبائل، اماکن
۶۔ اشعار
۷۔ کتب
۸۔ اقوال صوفیہ
۹۔ ضرب الامثال
۱۰۔ خود نوشت سوانح عمری
۱۱۔ بلاغات وسماعات

"فتوحات" کے اس نئے متن کی اشاعت کی سرپرستی مصر کی وہ کونسل کر رہی ہے، جو علوم وفنون کی ترویج میں معاونت کرتی ہے اور اس کی متن کی نگرانی عربی زبان کی اکادمی کے سربراہ ڈاکٹر ابراہیم بیومی مدکور کر رہے ہیں۔ اس نئے ایڈیشن کے طباعت کے بعد جہاں اس کو علمی حلقوں میں خراجِ تحسین پیش کیا جا رہا ہے، وہاں مصر کے بعض اخبارات میں اس کتاب اور اس کے حوالے سے ابن العربی کے افکار کے خلاف بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ روزنامہ "الجمہوریۃ" (بابت ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء) اور روزنامہ "الاخبار" (بابت ۱۴ ارنومبر ۱۹۷۵ء) میں ایک قانون دان نے وزارت اطلاعات وثقافت کی توجہ اس جانب منعطف کرائی ہے کہ اس کتاب میں مسلمانوں کے بنیادی عقائد پر زد پڑتی ہے، اس لیے اس کی اشاعت کو فوراً رد کا جائے۔ "الاخبار" (بابت ۵ مارچ ۱۹۷۶ء) میں بہت سے لوگوں نے مل کر اس کتاب کی اشاعت کے متعلق متذکرہ بالا وزارت سے احتجاج کیا۔ چنانچہ اسی اخبار کے شمارہ بابت ۸ مارچ ۱۹۷۶ء (بروز پیر) میں اس کے مدون ڈاکٹر عثمان یحییٰ نے معترضین کا مثبت انداز میں جواب دیا۔ اخبارات کے علاوہ بعض عربی رسائل مثلاً "لواء الاسلام" میں دو تین مقالات اس کتاب کی مخالفت میں لکھے گئے ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں ڈاکٹر عثمان یحییٰ کا نام بار بار آیا ہے، لیکن ہمارے ہاں ابن العربی کی حیات وافکار کے اس ماہر اور "فتوحات" کے نئے متن کے مرتب کا نام پردۂ گمنامی میں ہے اس لیے آئندہ سطور میں اُس کی زندگی اور اس کے اب تک کے تحقیقی کاموں کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف کا تعلق شام سے ہے۔ ان کے تحقیقی کام کا بیشتر حصہ عربی اور فرانسیسی میں طبع ہوا ہے اور وہ اب تک ان دونوں زبانوں میں متعدد مقالات اور کتابیں لکھ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے بعض نادر الوجود کتب کے تنقیدی متن (مع تعارف وحواشی) سے علمی دنیا کو پہلی بار روشناس کرایا ہے۔ نیز چند کتابوں کو عہدِ حاضر کے معروف مفکرین مثلاً ہانری کربین اور سید حسین نصر کے ساتھ مل کر لکھ چکے ہیں۔ ان کا یہ تحقیقی سرمایہ وقیع اور قابلِ ستائش ہے، چنانچہ ان کی مساعی کو نہ صرف مشرقِ وسطیٰ کے ممالک بلکہ مغرب کے علمی حلقوں میں بھی بنظرِ استحسان دیکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحقیقی سرگرمیوں کا آغاز سوربون یونیورسٹی سے کیا، جہاں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے گئے تھے۔ اس دانش گاہ میں انہیں بیک وقت دو موضوعات تفویض ہوئے۔ ایک تو ابن العربی کی تمام مستند اور الحاقی کتابوں کی جامع فہرست تیار کرنا تھا، جو بعد میں بصورت کتاب دو جلدوں میں دمشق سے شائع ہوئی تھی (۱۹۶۴ء)[۳۵]۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ابن العربی کی ایک اور تالیف "کتاب التجلیات الٰہیہ"[۳۶] کے متن کو تکمیلی مقالے کے طور پہ تیار کیا۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ کیا اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر کیا[۳۷]۔ اس نے اپنا یہ مقالہ سوربون میں ۱۲ دسمبر ۱۹۵۸ء کو پیش کیا اور اس کی تدوین اور ترجمہ پروفیسر بلاشیر[۳۸]، ماسینیوں اور برنشویگ[۳۹] کی نگرانی میں مکمل ہوا اور ماہرین کے فرائض ہانری لاؤسٹ[۴۰] اور واٹ[۴۱] نے انجام دیئے[۴۲]۔ عثمان یحییٰ کے اس فرانسیسی ترجمہ سے اس کے استاد اور ادارۂ مطالعات حاضرہ[۴۳] میں اس کے ہمکار کربین نے ابن العربی پر اپنی معروف کتاب میں استفادہ کیا ہے اور بعض تراجم کے ساتھ چند اقتباسات کا ترجمہ بھی دیا ہے[۴۴]۔ کربین نے اُسے نہ صرف اپنا شاگرد اور گہرا دوست رکھا تھا[۴۵]، بلکہ اس کے تعاون سے اسلامی فلسفہ کی تاریخ پر ایک اہم کتاب بھی لکھی گئی ہے، جس کی ابھی پہلی جلد طبع ہوئی ہے۔ اس میں ابتدا سے لے کر ابن رشد کی وفات (۵۹۵ھ / ۱۱۹۸ء) تک کے اسلامی فلسفہ کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے[۴۶]۔ اس کتاب کی تصنیف میں سید حسن نصر نے بھی معاونت کی ہے۔ اس کتاب کے علاوہ بعض دیگر کتابوں کے متون کی تدوین میں کربین کو عثمان یحییٰ کا تعاون حاصل رہا اور انہوں نے مل کر ایک ایرانی شیعی عالم اور ابن العربی کے دبستان فکر کے پیروکار سید حیدر آملی (سنہ ولادت ۷۲۰ھ) کی دو کتابوں "جامع الأسرار" اور "فی معرفۃ الوجود" کو مرتب کیا اور آملی کے سوانح حیات اور اس کے صوفیانہ تصورات پر تفصیلی تعارف لکھا[۴۷]۔ ان کتابوں کے علاوہ ان دونوں نے اسی شیعی مؤلف کی "فصوص الحکم" پر شرح (سنۂ تالیف ۷۸۰ھ) بعنوان "نص النصوص" کا متن تیار کیا، جو اس کے تین قلمی نسخوں (جاراللہ ۲
استانبول ۱۰۳۳؛ شہید علی پاشا، استانبول ۱۲۴۸؛ کتاب خانہ پارلیمنٹ، تہران ۱۷۱) پر مشتمل ہے۔ اس شرح کی جلد دوم زیر طبع ہے[۴۸]۔ آملی کی یہ تینوں کتابیں پہلی بار طبع ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر عثمان یحییٰ کا وہ کام، جس میں اس کا کوئی شریک کار نہیں، تیسری صدی ہجری کے ایک صوفی ابو عبداللہ محمد بن علی بن الحسن (الحسین) بن بشر الحکیم الترمذی (مابین ۲۵۵ھ-۳۲۰ھ؛ بحوالہ فان اِس کا مرقومۃ الذیل تبصرہ، ص ۱۵۹)[۴۹] کی ایک اہم کتاب "ختم الاولیاء" کی تدوین ہے۔ ابن العربی نے الترمذی کی تحریروں سے کسب فیض کیا ہے اور اس کے ایک حصے کی "فتوحات" میں شرح بھی لکھی ہے (بولاق، جلد دوم، ص ۳۹-۱۳۹)۔ عثمان یحییٰ نے پہلے الترمذی کی جملہ تصانیف پر ایک مقالہ سپرد قلم کیا تھا[۵۰] اور پھر اس کے قلمی نسخہ (مخزونہ کتاب خانۂ فاتح، نمبر ۵۳۲۲، ورق ۱۵۳ ب - ۱۶۸ ا، مکتوبہ ۷۴۹ھ) کی بنیاد پہ اس کا متن شائع کرایا تھا[۵۱]۔ ۱
بعد میں اسے الگ سے مقدمہ، حواشی اور شرح کے ساتھ طبع کرایا[۵۲]۔ اس پر جوزف فان اِس نے ایک تفصیلی تبصرہ لکھا ہے[۵۳]۔

ڈاکٹر عثمان یحییٰ نے ان گرانقدر تحقیقی کاموں کے علاوہ بہت سے عربی اور فارسی مقالات لکھے ہیں۔ ان میں

سے ایک دو کا ذکر "انڈکس اسلامیکس" کے ضمیموں میں موجود ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی ڈاکٹر موصوف کا تصنیفی سرمایہ موجود ہے اور ان کے بعض مقالات خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

زیر نظر مقالہ مندرجہ ذیل چار حصوں میں منقسم ہے :-

۱۔ اس میں "فتوحات" کی طبع جدید کی پہلی چار جلدوں کی فہرست مندرجات دی گئی ہے۔

۲۔ اس حصے میں ۱۷ سماع کو پوری تفصیل سے درج کیا گیا ہے۔ اس میں ہر سماع کا سنۂ کتابت، مقام کتابت اور مؤلف کے اصلاح شدہ نسخے کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیز مسمع، خواننده، سامعین اور کاتب کے نام لکھ دیئے گئے ہیں۔ اس حصے کی ترتیب میں عثمان یحییٰ کی کتاب "مؤلفات ابن العربی" (فرانسیسی ۲ جلد) سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۳۔ یہ حصہ "فتوحات" کے قلمی نسخوں، شرحوں، انتخابوں، طباعتوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔

۴۔ اس میں حواشی درج ہیں۔

(۱)

جلد اول : (۱۹۷۲ء، صفحات ۵۱۸)

الجزء الأول : خطبة الكتاب

الجزء الثاني : فهرست أبواب الكتاب

الجزء الثالث : مقدمة الكتاب

الجزء الرابع : الباب الأول : في معرفة الروح الذي أخذت من تفصيل نشأته

" " : الباب الثاني : في معرفة مراتب الحروف

الجزء الخامس والجزء السادس والجزء السابع : تابع الباب الثاني

جلد دوم : (۱۹۷۲ء، صفحات ۵۳۶)

الجزء الثامن : تابع الباب الثاني

: الفصل الثاني : في معرفة الحركات التي تتميز بها الكلمات

: الفصل الثالث : في العلم والعالم والمعلوم

الجزء التاسع : تابع الباب الثالث

: الباب الرابع : في سبب بدء العالم ومراتب الأسماء الحسنى

: الباب الخامس في معرفة أسرار البسملة والفاتحة

جلد چهارم: (۱۹۷۵ء، صفحات ۳۶۵) الفتوحات المکیة — السفر الرابع

الباب الستون : فی معرفۃ العناصر، وسلطان العالم العلوی علی العالم السفلی وفی أی دورۃ کان وجود ہذا العالم الإنسانی من دورات الفلک؟ وأی روحانیۃ لنا؟

الباب الحادی والستون : فی معرفۃ جہنم وأعظم المخلوقات فیہا عذابا ومعرفۃ بعض العالم العلوی

الباب الثانی والستون : فی مراتب أہل النار

الباب الثالث والستون : فی معرفۃ بقاء الناس فی البرزخ بین الدنیا والبعث

الجزء الثامن والعشرون

الباب الرابع والستون : فی معرفۃ القیامۃ ومنازلہا وکیفیۃ البعث

وصل : فی الحشر والنشر؛ اختلاف الناس فی الاعادۃ

وصل : المواطن السبعۃ ۵۶

(۲)

سماع ۱ : جلد اول، پہلا باب، مکتوبہ ۶۳۳ھ، مقام کتابت دمشق، ابن العربی کا تصحیح شدہ

مسمع : مصنف

خواندہ : علی بن المظفر بن القاسم النشبی

سامعین : عبدالعزیز بن عبدالقوی بن الجباب، ابو عبداللہ بن ابراہیم الاربلی، محمد بن یوسف البرزالی نصراللہ بن ابوالعز الصفار، محمد (ابن العربی کا بیٹا)، محمد (ابن العربی کا بیٹا)، عیسی بن اسحاق الہذبانی، یونس بن عثمان الدمشقی، ابن معاذ اوربی، احمد بن محمد بن ابراہیم، حسین بن محمد الموصلی، محمد بن ینکش العظمی، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، احمد بن محمد التحریتی، یوسف بن الحسین اللبنی عبداللہ بن عبدالوہاب بن شجاع الدمشقی، محمد بن علی بن الحسین الاخلاطی، ابوبکر بن سلیمان الحمادی اور اس کا لڑکا جمال الدین، محمد بن علی المطرزی

کاتب : ابراہیم بن عمر عبدالعزیز القرشی

سماع ۲ : رک : جلد اول، باب سوم، مکتوبہ ۶۳۳ھ، مقام کتابت دمشق، ابن العربی کا تصحیح شدہ

مسمع : مصنف

خواندہ : علی بن المظفر بن القاسم النشبی

سامعین : نصراللہ بن ابوالعز الصفار، حسین بن ابراہیم الاربلی، عبدالعزیز بن عبدالقوی بن الجباب السعدی، محمد بن یوسف البرزالی اور اس کا بیٹا احمد، ابوبکر بن سلیمان بن علی الحمادی، یوسف

بن عبداللطیف بن یوسف البغدادی، محمد اور محمد (ابن العربی کے دو بیٹے)، ابن معاذ بن
عبدالرحمن الوربی، احمد بن ابوفرج التکریتی، علی بن محمود الحنفی، مظفر بن محمود الحنفی،
عبداللہ بن محمد بن احمد الاندلسی، محمد بن برغش الحنظلی، عیسیٰ بن اسحٰق بن یوسف الہذبانی، حسن
بن محمد بن علی الموصلی، یونس بن عثمان الدمشقی، عبداللطیف بن دینار بغدادی، عبداللہ بن
عبدالوہاب بن شجاع الدمشقی، محمد بن احمد بن ابراہیم المعروف بہ ابوزرافہ،
محمد بن ابوبکر البلخی، محمد بن الحسین بن علی الاخلاطی، علی بن ابوالغنائم القسال یوسف بن
حسین النابلسی

کاتب : ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۳ : رک : ایضاً، مکتوبہ ۶۳۳ھ در دمشق۔ یہ حصہ ابن العربی کے اپنے گھر میں لکھا گیا اور اس کی اصلاح
بھی انہوں نے خود ہی کی ہے۔

مسمع : مصنف

خوانندہ : کمال الدین بن علی ابوالماجد الحریری

سامعین : نجم الدین بن عبدالسلام بن محمد، احمد بن محمد التکریتی

کاتب : کمال الدین بن علی بن ماجد الحریری

سماع ۴ : جلد اوّل، باب چہارم، سنۂ کتابت درج نہیں۔ اصلاح شدہ

مسمع : مصنف

خوانندہ : احمد العلوی

سامعین : محمد بن علی ابومحمد المطرزی، احمد بن ابوبکر الحمادی

کاتب : احمد بن ابوبکر الحمادی

سماع ۵ : ایضاً، بلا تاریخ، اصلاح شدہ

مسمع : مصنف

خوانندہ : احمد العلوی

سامع : ابراہیم النلال

کاتب : احمد العلوی

سماع ۶ : جلد اوّل کا باب پنجم، سنۂ کتابت ۶۳۳ھ۔ اس کی کتابت دمشق میں مصنف کے گھر پر ہوئی۔
اصلاح شدہ۔

مسمع : مصنف

خوانندہ: علی بن المنظفر ابوالقاسم النشی

سامعین: حسین بن ابراہیم الاربلی، نصر اللہ بن ابوالعز الصفار، ابوبکر بن سلیمان الحمادی، ابومعاذ الورنی
عبداللہ بن محمد الاندلسی، ابوبکر بن محمد البلخی، علی بن محمد بن ابوالرجا، مظفر بن محمد بن ابوالقاسم،
احمد بن محمد التکریتی، یوسف بن الحسن بن بدر النابلسی، محمد بن احمد بن ابراہیم المعروف ابوزادہ،
ابراہیم بن محمد الانصاری القرطبی، عبداللہ بن عبدالوہاب بن شجاع الدمشقی، محمد اور محمد (ابن العربی
کے دو بیٹے)، حسین بن محمد بن علی الموصلی، علی بن ابوالغنائم بن الغسال، عیسیٰ بن اسحاق
الہذبانی، یونس بن عثمان الدمشقی، احمد بن ابوالہیجا بن ابوالمعالی، ابراہیم بن جعفر بن یوسف،
یحییٰ بن اسمٰعیل بن محمد اللملی، راجح بن عبدالرزاق

کاتب: ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۷: جلد اوّل، باب ۶، بلاتاریخ، تصحیح شدہ

مسمع: مصنف

خوانندہ: محمود الریحانی (الزنجانی؟)

سامع: محمود الریحانی (الزنجانی؟)

سماع ۸: جلد اوّل، باب ۷، مکتوبہ ۶۲۵ھ دمشق میں مصنف کے گھر پر لکھا گیا۔ اصلاح شدہ

مسمع: مصنف

خوانندہ: احمد بن عبداللہ بن احمد العلوی

سامع: احمد بن عبداللہ بن احمد العلوی

سماع ۹: ایضاً، مکتوبہ ۶۲۳ھ، مقام کتابت مصنف کا گھر تصحیح شدہ

مسمع: مصنف

خوانندہ: علی بن المظفر النشی

سامعین: ابوبکر بن سلیمان الحمادی، عبدالعزیز بن عبدالقوی الجباب، حسین بن ابراہیم الاربلی، نصر
بن ابوالعز الصفار، یوسف بن عبداللطیف البغدادی، علی بن محمود بن ابوالرجا الحنفی، ابومعاذ
اوربی، احمد بن ابوالہیجا الدمشقی، عبداللہ بن احمد اللخمی، علی بن یوسف بن صدقہ المقدسی،
ابراہیم بن جعفر بن یوسف الدمشقی، یونس بن عثمان بن ابوالقاسم الدمشقی، عبداللہ بن محمد بن
عبدالرحمٰن، مظفر بن محمود بن ابوالقاسم، احمد بن محمد التکریتی، عبداللہ بن عبدالوہاب ابن شجاع،
ابراہیم بن محمد بن محمد القرطبی، محمد بن عزالدولہ بن موسےٰ الترکی، عمران بن حبیش بن علی الحرانی،
یوسف بن حسن بن بدر النابلسی، علی بن ابوالغنائم الغسال، عیسیٰ بن اسحاق الہذانی، ابوبکر

"بن محمد بن ابوبکر البلخی، محمد اور محمد (مصنف کے دو بیٹے)، یحییٰ بن اسمٰعیل بن محمد الملطی،
حسین بن محمد بن علی الموصلی، محمد بن ابراہیم بن خضر، ابوعز بن ابوالوحش الخزرجی، احمد
بن موسےٰ بن حسین الترکمانی، محمد بن یوسف البرزالی اور اس کا بیٹا احمد، محمد بن احمد
بن ابراہیم ابودرافہ

کاتب : ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۱۰ : ایضاً، سنۂ کتابت ۶۳۳ھ، مقام کتابت مصنف کا گھر (دمشق)۔ تصحیح شدہ

مسمع : مصنف

خوانندہ : احمد بن ابوبکر بن سلیمان الحمادی

سامع : محمد بن علی بن محمد المطرزی

کاتب : احمد بن ابوبکر بن سلیمان الحمادی

سماع ۱۱ : ایضاً، مکتوبہ ۶۳۶ھ، مقام کتابت دمشق میں مصنف کا گھر، تصحیح شدہ

مسمع : مصنف

خوانندہ : محمود بن عبداللہ بن احمد الزنجانی (الریحانی ؟)

سامع : محمود بن عبداللہ بن احمد الزنجانی (الریحانی؟)

کاتب : ایضاً

سماع ۱۲ : جلد دوم، باب ۸، مکتوبہ ۶۲۴ھ، دمشق میں مصنف کے گھر پر کتابت ہوئی۔ تصحیح شدہ

مسمع : مصنف

خوانندہ : آصف بن عبداللہ الملطی

سامعین : عفیف الدین سلیمان بن علی، ابراہیم بن ابوبکر الصنہاجی، محمد بن صدیق، محمد بن
حسن، ابوبکر مجدالدین بن بنداری التبریزی

کاتب : محمد بن اسحاق بن محمد

سماع ۱۳ : ایضاً، مکتوبہ ۶۳۴ھ تصحیح شدہ

مسمع : مصنف

خوانندہ : آصف بن عبداللہ الملطی

سامعین : حسن بن محمود المروزی، محمد بن ابوالقاسم الطبری

کاتب : محمد بن اسحاق بن محمد القونوی

سماع ۱۴ : جلد دوم، باب ۹، بلا تاریخ تصحیح شدہ

مسمع : مصنف

خوانندہ : احمد بن ابو بکر بن سلیمان الحمادی

سامعین: احمد العلوی، محمود الترکانی (الزنجانی؟)

سماع ۱۵:- ایضاً، سنۂ کتابت ۶۴۳ھ ، مقام کتابت دمشق، ایضاً

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- علی بن المظفر النشبی

سامعین :- حسین بن ابراہیم الاربلی، عبدالعزیز بن عبدالقوی الجباب ، نصراللہ بن ابوعز الصفار، ابوبکر بن سلیمان الحماوی، محمد بن یوسف البرزالی عبدالعزیز بن علی بن جعفر الموصلی احمد اور محمد (ابن العربی کے دو بیٹے) عمران بن جبیش الحرانی، رضوان بن ابوبکر بن عبدالواحد الدمشقی، ابومعاذ الوربی، احمد بن ابو الہیجا، علی بن یوسف، عمران بن محمد بن عمران، ابراہیم بن خضر بن یوسف الدمشقی اور اس کا فرزند محمد، علی بن محمود بن ابوالرجا، مظفر بن محمود بن ابوالقاسم، احمد بن محمد التکریتی، محمد بن علی بن محمد المارزی محمد بن برنکش المعظمی، عبداللہ بن محمد بن احمد الاندلسی، عبداللہ بن عبدالوہاب بن شجاع، محمد بن احمد بن ابراہیم بن زراف، حسین بن محمد بن علی الموصلی، یوسف بن حسن بن بدر النابلسی، ابوبکر بن محمد بن بکر البلخی، یحییٰ بن اسماعیل بن محمد الملطی، یونس بن عثمان بن ابوالقاسم الدمشقی، عیسیٰ بن اسحاق بن یوسف الہذبانی، ابوالعز بن ابوالوحش بن عبدالعزیز الخزرجی، علی بن ابوالغنایم الغسال، ابراہیم بن محمد بن محمد القرطبی

کاتب :- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی،

سماع :- ۱۶ جلد دوم ، باب ۱۱ ، بلا تاریخ ، ایضاً

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- احمد العلوی

سماع ۱۷:- ایضاً ، مکتوبہ ۶۴۳ھ ، دمشق میں مصنف کے گھر پر کتابت ہوئی ، ایضاً۔

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- علی بن المظفر النشبی

سامعین :- عبدالعزیز بن عبدالقوی الجباب حسین بن ابراہیم الاربلی ، ابوبکر بن سلیمان الحمادی ، نصراللہ بن ابوالعز بن ابوطالب الشیبانی ، محمد بن یوسف البرزالی ، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی ، محمد اور محمد (ابن العربی کے دو فرزند) یوسف بن عبداللطیف بن یوسف البغدادی ، احمد بن محمد التکریتی ، علی بن محمود بن ابوالرجا الحنفی ، عیسیٰ بن ابواسحٰق الہذبانی ، ابن معاذ الوربی ، یونس بن عثمان الدمشقی ، احمد بن ابوالہیجا ، محمد بن علی بن محمد الدمشقی ، ابراہیم بن محمد بن محمد القرطبی ، محمد بن علی بن حسین ، یحییٰ بن اسمٰعیل

بن محمد المسطی، حسین بن محمد الموصلی، محمد بن برنکش المعظمی، ابوالقاسم ابن ابوالفتح الدمشقی، احمد بن ابوبکر
بن سلیمان الحمادی، محمد بن احمد بن ابراہیم بن زرافہ، علی بن ابوالغنایم الغسال، بیان بن عمر بن محمد
الحنبلی، یوسف بن حسین بن بدر النابلسی، عبداللہ بن محمد بن احمد اندلسی

کاتب :- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۱۸ :- جلد دوم، باب ، بلا تاریخ، اصلاح شدہ

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- علی الحبشی

سامع : ایضاً

سماع ۱۹ : جلد دوم، باب ۱۲، مکتوبہ ۶۳۳ھ، دمشق میں مصنف کے گھر میں کتابت ہوئی۔ ایضاً

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- محمود بن عبداللہ الزنجانی (الریحانی ؟)

سامع :- ایضاً

سماع ۲۰ :- ایضاً، سنہ کتابت ۶۳۳ھ، دمشق میں مصنف کے گھر میں لکھا گیا۔ مصنف کا منظور کردہ خطی نسخہ

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- علی بن المظفر النشبی

سامعین :- حسین بن ابراہیم الاربلی، عبدالعزیز بن عبدالقوی بن الجباب، نصراللہ بن ابوالعز بن الصقا
ابوبکر بن سلیمان بن علی الحمادی، یوسف بن حسن بن بدر النابلسی، احمد اور محمد (ابن العربی کے دو فرزند)
احمد بن محمد بن ابوالفرج التکریتی، علی بن محمود بن ابوالرجا الحنفی، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، حسین بن
محمد بن علی الموصلی، ابن معاذ بن عبدالرحمن الوربی، محمد بن برنکش المعظمی، محمد بن علی بن الحسین، احمد بن
ابوالہیجا الدمشقی، محمد بن علی بن محمد الدمشقی، عیسیٰ بن اسحاق الہذبانی، یونس بن عثمان بن ابوالقاسم
الدمشقی، عبداللہ بن محمد بن احمد اللخمی، یحییٰ بن اسماعیل بن محمد الملطی، ابوالقاسم بن ابوالفتح بن ابراہیم
الدمشقی۔

کاتب : ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۲۱ - ایضاً، بلا تاریخ، مصنف کا منظور کردہ نسخہ

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- ام دلال بنت احمد بن مسعود بن شتلا المقری الموصلی

سامع :- ایضاً

سماع ۱۲۲:- جلد سوم، باب ۱۶، مکتوبہ ۳۴۳ھ دمشق میں مصنف کے گھر پر کتابت ہوئی۔ اصلاح شدہ

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- علی بن المظفر النشبی

سامعین :- حسین بن ابراہیم الاربلی، عبدالعزیز بن عبدالقوی الجباب، نصر اللہ بن ابوالعز بن الصفار، محمد بن یوسف البرزالی، ابوبکر بن سلیمان الحمادی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، یوسف بن حسین بن بدر النابلسی، محمد اور محمد (ابن عربی کے دو فرزند) احمد بن محمد التکریتی، علی بن محمود الحنفی، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، حسین بن محمد الموصلی، محمد بن برنکش المعلی، ابن معاذ الورنی، عیسیٰ بن اسحاق الہذبانی، یونس بن عثمان الدمشقی، عمر بن نصر اللہ بن ہلال، محمد بن علی بن حسین، احمد بن ابوالہیجا الدمشقی، ابوالقاسم بن ابوالفتح بن ابراہیم الدمشقی، محمد بن العلی بن محمد الدمشقی، احمد بن محمد بن سلیمان الدمشقی، احمد بن موسیٰ بن حسین الترکمانی، یحییٰ بن اسمٰعیل بن محمد المعلی، محمد بن احمد بن ابراہیم بن زرافہ، علی بن ابوالغنایم بن الغسال، عبداللہ بن محمد بن ابوالاندلسی۔

کاتب :- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۱۲۳:- جلد سوم، مکتبہ ۳۴۳ھ، دمشق میں مصنف کے گھر میں کتابت ہوئی، جس کو مصنف نے خود منظور کیا۔

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- علی بن المظفر النشبی

سامعین :- حسین بن ابراہیم الاربلی، نصر اللہ بن ابوالعز بن الصفار، عبدالعزیز بن عبدالقوی ابن الجباب، سلیمان الحمادی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، یوسف بن عبداللطیف البغدادی، محمد بن برنکش المعلی، یوسف بن حسن النابلسی، عمر بن نصر بن ہلال، ابن معاذ الورنی، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، عیسیٰ بن اسحاق الہذبانی، عبداللہ بن محمد بن احمد الاندلسی، عمران بن محمد بن عمران، محمد بن علی بن محمد المطرزی، احمد بن عبدالرحیم بن بناں، علی بن محمود بن ابوالرجا، احمد بن محمد بن ابوالفرج التکریتی الحنفی، محمد اور محمد (ابن العربی کے دو بیٹے)، محمد بن احمد بن زرافہ، احمد بن ابوالہیجا، ابوبکر بن یونس الخلال اور اس کا فرزند ابراہیم، محمد بن علی بن حسین، یحییٰ بن اسمٰعیل بن محمد المعلی، علی بن ابوالغنایم بن الغسال، حسین بن محمد الموصلی، احمد بن محمد بن سلیمان الحریری

کاتب :- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۱۲۴:- ایضاً، مکتوبہ ۳۴۶ھ، دمشق میں مصنف کے گھر پر کتابت ہوئی۔ مصنف کا منظور شدہ نسخہ

مسمع :- مصنف

خواننده :- محمود بن عبداللہ بن احمد الزنجانی (الریحانی ؟)

سامع :- الیفائی

سماع ۱۲۵ :- جلد چہارم، باب ۵۴، مکتوبہ ۶۴۳ھ، دمشق میں مصنف کے گھر پر کتابت ہوئی۔ منظور کردہ از مصنف

مسمع :- مصنف

خواننده :- علی بن المظفر النشبی

سامعین :- حسین بن ابراہیم الاربلی، ابوبکر بن سلیمان الحمادی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد،
عبدالعزیز بن عبدالقوی الجبّاب، یوسف بن عبداللطیف البغدادی، نصراللہ بن ابوالعز بن
الصفار، محمد بن برنکش المعظمی، ابوبکر محمد البلخی، اسمٰعیل بن صادقین النوری، ابن معاذ الوربی، عمر بن
نصراللہ ابن ہلال، عمران بن محمد بن عمران، علی بن عبدالعزیز بن ابراہیم، محمد بن علی المطرزی، علی بن
محمود بن ابوالرجا، احمد بن محمد التکریتی، احمد اور محمد (مصنف کے دو فرزند)، عبداللہ بن محمد بن احمد،
ابراہیم بن ابوالفتح الحریری، محمد بن احمد ابن زرافہ، احمد بن عبدالرحیم، عبدالرحمٰن بن سالم بن
نجا الحمادی، محمد بن علی بن الحسین، اسمٰعیل بن یحییٰ المعلی، عیسیٰ بن اسحاق الہذبانی، احمد بن ابوالہیجا
الدمشقی، ابراہیم بن محمد القرطبی، ابوبکر بن یونس الخلال اور اس کا بیٹا ابراہیم، یوسف بن حسن
النابلسی، محمد بن یوسف البرزالی اور اس کا بیٹا احمد، علی بن ابوالغنائم الغسال

کاتب :- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۱۲۶ :- جلد چہارم، باب ۲۸، مکتوبہ ۶۴۳ھ، دمشق میں ابن العربی کے گھر پر لکھا گیا اور انہوں نے خود ہی اسے منظور کیا

مسمع :- مصنف

خواننده :- علی بن المظفر النشبی

سامعین :- عبدالعزیز بن عبدالقوی بن الجبّاب، حسین بن ابراہیم الاربلی، ابوبکر بن سلیمان الحماوی اور اس کے
دو لڑکے عبدالواحد اور علی، محمد بن عبدالواحد، نصراللہ بن ابوالعز بن الصفار، محمد بن برنکش المعظمی،
اسمٰعیل بن صادقین، ابوبکر بن محمد البلخی، احمد بن محمد بن سلیمان، ابن معاذ الوربی، احمد بن ابوالہیجا
الدمشقی، علی بن یوسف بن صدقہ، علی بن ابوالغنائم بن الغسال، برکت بن حسن بن ملک ا
محمد بن علی المطرزی، عمران بن محمد بن عمران، ابراہیم بن خضر الدمشقی، علی بن محمود بن ابوا
مظفر بن محمود، احمد بن محمد التکریتی، عبداللہ بن محمد بن اللخمی، عمر بن نصراللہ بن بلال، ا
عبدالرحیم بن بنّان الدمشقی، محمد بن علی بن حسین، یحییٰ بن اسمٰعیل المعلی، عیسیٰ بن اسحٰق ا
ایوب بن ابراہیم بن حسن، حسین بن محمد الموصلی، ابراہیم بن محمد القرطبی، علی بن عبدالعزیز
احمد بن عبدالخالق بن عبداللہ الدمشقی، یوسف بن حسن النابلسی، ابراہیم بن ابوبکر الخلال، محمد

بن ابراہیم بن زرافہ، محمد اور محمد (ابن العربی کے دو بیٹے)

کاتب :- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۲۷:- جلد چہارم، باب ۲۹، سنۂ کتابت ۶۳۲ھ، دمشق میں ابن العربی کے گھر پر کتابت ہوئی اور یہ مصنف کا منظور کردہ نسخہ ہے

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- علی بن المظفر النشبی

سامعین :- محمد اور محمد (ابن العربی کے دو لڑکے)، اسمٰعیل بن صادقین، یوسف بن درباس بن یوسف الحمیدی، ابوبکر بن سلیمان الحماوی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد، عبدالعزیز بن عبدالقوی بن الجباب، حسین بن ابراہیم الاربلی، نصراللہ بن ابوالعز بن الصفار، یوسف بن عبداللطیف البغدادی، موسیٰ بن زید بن جابر، محمد بن یوسف البرزالی، ابن معاذ الوربی، محمد بن برنکش المعلی، محمد بن صدیق الاہدا، عمران بن محمد بن عمران، محمد بن علی المطرزی، علی بن محمود بن ابوالرجا، احمد بن محمد التکریتی، برکت بن حسن بن ملک الہلالی، علی بن ابراہیم الحمیری، عیسیٰ بن اسحٰق الہذبانی، یونس بن عثمان الدمشقی، یوسف بن حسن بن ہبۃ النابلسی، ابوبکر محمد بن ابوبکر البلخی، احمد بن محمد بن سلیمان الحریری، احمد بن عبدالرحیم بن بنان، علی بن احمد بن علی القرطبی، ابراہیم بن محمد القرطبی، عبداللہ بن محمد اللخمی، عمر بن نصراللہ بن ہلال، ابوالقاسم بن ابوالفتح الحریری، احمد بن موسیٰ الترکمانی، محمد بن احمد بن زرافہ، محمد بن علی، ابوزکریا یحییٰ بن اسماعیل المعلی، احمد بن ابوالہیجا الدمشقی، حسین بن محمد الموصلی، احمد بن ابوالطالب الدمشقی، ابراہیم بن علی بن احمد، ابراہیم بن ابوبکر بن الخلال، محمد بن محمد بن جمعۃ البلنسی

کاتب :- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۲۸:- ایضاً، مکتوبہ ۶۳۶ھ، دمشق میں ابن العربی کے گھر پر کتابت ہوئی اور انہوں نے اس نسخے کو منظور کیا۔

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- محمود بن عبداللہ بن احمد الزنجانی (الریحانی ؟)

سامع :- ایضاً

سماع ۲۹:- ایضاً، ۶۳۶ھ، مقام کتابت دمشق میں ابن العربی کا گھر، منظور کردہ از مصنف

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- ام رسلان بنت احمد بن مسعود بن شدّاد المقری الموصلی

سامع :- ایضاً

سماع ۳۰:- جلد پنجم، باب ۳۰، مکتوبہ ۶۳۳ھ، مقام کتابت دمشق میں ابن العربی کا گھر، ایضاً

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- علی بن المظفر النشبی

سامعین :- محمد اور محمد (ابن العربی کے دو بیٹے)، اسمٰعیل بن صادقین، ابوبکر بن سلیمان الحمادی اور اس دو بیٹے، اسمٰعیل بن صودکین، ابوبکر بن سلیمان الحمادی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، عبدالعزیز بن عبدالقوی بن الحباب، حسین بن ابراہیم الاربلی، نصر اللہ بن ابوالعز بن الصفار، یوسف بن عبداللطیف البغدادی، موسیٰ بن زید بن جابر الحرانی، محمد بن یوسف البرزالی، ابن معاذ الوربی، محمد بن برنکش المعظمی، محمد بن صدیق سہراب الاہدا، عمران بن احمد بن عمران، محمد بن علی المطرزی، علی بن محمود بن ابوالرجا، احمد بن محمد التکریتی، برکت بن حسن بن ملک الہلالی، علی بن عبدالعزیز بن یتیم، عیسیٰ بن اسحٰق الہذبانی، یونس بن عثمان الدمشقی، یوسف بن حسن النابلسی، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، احمد بن محمد بن سلیمان الحریری، احمد بن عبدالرحیم بن بنان، علی بن احمد القرطبی، عبداللہ بن محمد بن احمد اللخمی، محمد بن نصر اللہ بن بلال، ابوالقاسم محمد بن ابوالفتح الحریری، محمد بن احمد بن زرارہ، محمد بن علی، اسمٰعیل بن یحییٰ المعظمی، احمد بن ابوالہیجا الدمشقی، حسین بن محمد الموصلی، ابراہیم بن محمد القرطبی، احمد بن موسیٰ الترکمانی، احمد بن ابوالطالب الدمشقی، یوسف بن درباس بن یوسف الحمیدی، ابراہیم بن علی بن ابراہیم السجادی، ابراہیم بن ابوبکر الخلال، محمد بن محمد بن جمعۃ البلبلنی، علی بن ابوالغنایم بن الغسال

کاتب :- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی ،

سماع (۳۱) جلد پنجم، باب ۳۵، مکتوبہ ۶۳۷ھ، دمشق میں ابن العربی کے گھر پر کتابت ہوئی، ایضاً

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- محمود بن عبداللہ بن احمد الزنجانی (الریحانی ؟)

سامع :- محمد بن ابوالقاسم الاہوازی

سماع (۳۲) جلد ششم، مکتوبہ ۶۳۳ھ، مقام کتابت دمشق میں ابن العربی کا گھر، ایضاً

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- علی بن مظفر النشبی

سامعین :- محمد اور محمد (ابن العربی کے دو بیٹے)، اسمٰعیل بن صادقین بن عبداللہ النوری، محمد بن علی بن حسین، ابوبکر بن سلیمان الحمادی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد الحمادی، عبدالعزیز بن عبدالقوی الحباب، حسین بن ابراہیم الاربلی، ابوالفتح نصر اللہ بن ابوالعز

بن الصفار، موسیٰ بن زید الحرانی، ابوبکر بن محمد البلخی، محمد بن برنکش المعلی، ابراہیم بن ابوبکر الخلال، ابن معاذ الوربی، یونس بن عثمان الدمشقی، احمد بن ابو الہیجا الدمشقی، ابو القاسم بن ابو الفتح الحریری، محمد بن احمد بن زرافہ، عبدالسلام علی بن محمد بن ابو الرجا، مظفر بن محمود بن ابو القاسم، احمد بن محمد التکریتی، عمران بن محمد، محمد بن علی المطرزی، برکت بن حسن بن ملک، عیسیٰ بن اسحٰق الہذبانی، عبدالمنعم بن مظفر المصری، عبداللہ بن محمد بن احمد الاندلسی، یحییٰ بن اسمٰعیل المعلی، ابراہیم بن محمد بن محمد القرطبی، علی بن احمد القرطبی، احمد بن عبدالرحیم بن بنان، حسین بن علی الموصلی، ابراہیم بن ابوبکر الصنہاجی، عمر بن نصر بن ہلال، علی بن ابو الغنایم بن الغسال، محمد بن عق

کاتب :۔ علی بن المظفر النشبی

سماع :۔ ۴۳ :۔ ایضاً، سنہ کتابت ایضاً، تصحیح شدہ

مسمع :۔ مصنف

خوانندہ :۔ علی بن المظفر النشبی

سامعین :۔ ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی، عیسیٰ بن اسحٰق الہذبانی

کاتب :۔ علی بن المظفر النشبی

سماع :۔ ۴۴۔ ایضاً، مکتوبہ ۶۳۶ھ، مقام کتابت دمشق، ایضاً

مسمع :۔ مصنف

خوانندہ :۔ ام دلال بنت احمد بن مسعود بن شداد المقری (ابن العربی کے اساتذہ میں ایک تھے، رک :۔ فتوحات ۴ : ۹۰ھ)

سامع :۔ ایضاً

سماع :۔ ۴۵ ایضاً، مکتوبہ ۶۳۷ھ، دمشق میں ابن العربی کے گھر پر کتابت ہوئی، ایضاً۔

مسمع :۔ مصنف

خوانندہ :۔ محمود بن عبداللہ بن احمد الدنجانی (الریحانی ؟)

سامع :۔ ایضاً

سماع ۴۶ :۔ جلد ہشتم، باب ۵۴، مکتوبہ ۶۳۳ھ، دمشق میں ابن العربی کے گھر پر کتابت ہوئی مصنف نے اس مخطوطے کو منظور کیا۔

مسمع :۔ مصنف

خوانندہ :۔ علی بن المظفر النشبی

سامعین :۔ محمد اور محمد (ابن العربی کے دو بیٹے)، ابوبکر سلیمان الحماوی اور اس کے دو لڑکے عبدالواحد

اور احمد، محمد بن عبدالواحد بن سلیمان الحماوی، اسمٰعیل بن صادقین النوری، حسین بن ابراہیم الاربلی، نصراللہ بن ابوالعز بن الصفار، ابن معاذ الوربی، محمد بن برنکش المعظمی، محاسن بن علی السکری، عمران بن محمد بن عمران، برکت بن حسن بن ملک، محمد بن علی بن المطرزی، بیان بن عثمان الحنبلی، محمد بن سلامۃ بن عیاش، عبداللہ بن محمد بن احمد الاندلسی، علی بن محمود بن ابوالرجا احمد بن محمد بن ابوالفرج التکریتی، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، ابوالظاہر بن عبدالرحمٰن بن الربیع الدمشقی، احمد بن ابوالہیجا الدمشقی، ابوالقاسم بن ابوالفتح الحریری، محمود بن احمد بن حماد الدمشقی، احمد بن عبدالرحیم بن بنان، محمد بن علی بن حسین الاخلاطی، یحییٰ بن اسمٰعیل المعلی، عیسیٰ بن اسحاق الہذبانی، ابراہیم بن محمد القرطبی، حسین بن محمد الموصلی، محمد و محمد و محمد (عبدالقادر بن عبدالخالق الصایغ کے تین بیٹے)، عبدالغفار بن طائع الدمشقی، محمد بن عمر بن نصراللہ بن ہلال، علی بن ابوالغنایم الغسال، محمد بن احمد بن زرافہ، عبدالمنعم بن مظفر المصری

کاتب:- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع:- ۱۲۔ جلد ہفتم، مکتوبہ ۶۳۳ھ، دمشق میں ابن العربی کے گھر پر کتابت ہوئی۔ منظور کردہ از مصنف

مسمع:- مصنف

خوانندہ:- علی بن المظفر النشبی

سامعین:- ابوبکر بن سلیمان الحماوی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد الحماوی، اسمٰعیل بن صادقین، موسیٰ بن زید بن جابر، محمد بن برنکش المعظمی، حسین بن ابراہیم الاربلی، ابن معاذ الوربی، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، یونس بن عثمان الدمشقی، عمران بن محمد بن عمران، برکت بن حسن بن ملک، محمد بن علی المطرزی، محمود بن احمد بن حماد الدمشقی، محمد بن تمام بن یحییٰ، علی بن محمود بن ابوالرجا، احمد بن محمد بن الفرج التکریتی، مظفر بن محمود بن ابوالقاسم، احمد بن عبدالرحیم بن بنان، علی بن ابوالغنایم بن الغسال، ابوالفتح نصراللہ بن ابوالعز الصفار، محمد بن علی بن الحسین الاخلاطی، یحییٰ بن اسمٰعیل المعلی، عیسیٰ بن اسحاق الہذبانی، عبدالمنعم بن مظفر المصری، حسن بن احمد بن زرافہ، حسین بن محمد الموصلی، ابراہیم بن محمد بن محمد القرطبی، محمد و محمد و محمد (عبدالقادر کے تین بیٹے) ابوعبدالخالق الصایغ، عبداللہ بن محمد بن احمد الاندلسی، محمد اور محمد (ابن العربی کے دو بیٹے)، علی بن محمد بن علی القرطبی، احمد بن ابوالہیجا الدمشقی، ابوالقاسم بن ابوالفتح الحریری، حسن بن داجع بن عبدالرزاق القرطبی، ابراہیم بن ابوبکر الحلال، عبدالسلام بن ابوالفضل بن عبدالسلام

کاتب:- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۱۳۸:۔ ایضاً، مکتوبہ ۶۳۲ھ، مصنف کا منظور کردہ خطی نسخہ

مسمع :۔ مصنف

خوانندہ :۔ امّ دلال بنت احمد بن مسعود بن شداد المقری الموصلی (ابن العربی کے ایک استاد، دک: فتوحات ۴؍ ۹۰۔ ۴)

سامع :۔ ایضاً

سماع ۱۳۹:۔ ایضاً، مکتوبہ ۶۳۳ھ، دمشق میں ابن العربی کے گھر پر کتابت ہوئی اور انہوں نے خود اس کو منظور کیا

مسمع :۔ مصنف

خوانندہ :۔ محمود بن عبداللہ بن احمد الزنجانی (الریحانی ؟)

سامع :۔ ایضاً

سماع ۱۴۰:۔ جلد ہفتم، باب ۵۰، مکتوبہ ۶۳۳ھ، مقام کتابت دمشق میں ابن العربی کا گھر، مصنف کا منظور کردہ نسخہ

مسمع :۔ مصنف

خوانندہ :۔ علی بن المظفر النشبی

سامعین :۔ اسمٰعیل بن سعادہ دقین، حسین بن ابراہیم الاربیلی، ابوبکر بن سلیمان الحادی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد، نصر اللہ بن ابوالعز بن ابوالطالب الصفار، محمد بن علی بن حسین، محمد بن برنکش المغلی، ابن معاذ الوربی، یونس بن عثمان الدمشقی، محمد اور محمد (ابن العربی کے دو بیٹے)، برکت بن حسن بن ملک، محمد بن علی بن المطرزی، علی بن محمود بن ابوالرجا، احمد بن محمد التکریتی، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، احمد بن ابوالیحیٰ الدمشقی، عیسیٰ بن اسحاق البندبانی، علی بن ابوالغنایم بن الغسال، ابراہیم بن محمد القرطبی، حسین بن محمد الموصلی، عبدالمنعم بن منظفر المصری، محمد و محمد و محمد (عبدالقادر بن عبدالخالق کے تین لڑکے)، علی بن طلائی، محمود بن احمد بن حمّاد الدمشقی، احمد بن عبدالرحیم بن بنان الدمشقی۔

کاتب :۔ ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۱۴۱:۔ جلد ہفتم، باب ۵۲، مکتوبہ ۶۳۳ھ، دمشق میں ابن العربی کے گھر پر کتابت ہوئی۔ منظور کردہ از مصنف

مسمع :۔ مصنف

خوانندہ :۔ علی بن المظفر النشبی

سامعین :۔ ابوبکر بن سلیمان الحماوی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد، اسمٰعیل بن سعادہ دقین، حسین بن ابراہیم الاربیلی، محمد بن علی بن حسین، نصر اللہ بن ابوالعز بن الصقّار، یوسف بن عبداللطیف البغدادی، یحییٰ بن اسمٰعیل الملطی، محمد بن برنکش المغلی، ابن معاذ الوربی،

یونس بن عثمان الدمشقی، عمران بن محمد بن عمران، برکت بن حسن بن ملک، محمد بن علی المطرزی، محمود بن احمد بن حماد، علی بن محمود بن ابوالرجا، منظفر بن محمود بن ابوالقاسم، احمد بن محمد بن ابوالفرج الحنفی، علی بن احمد بن علی القرطبی، ابراہیم بن محمد القرطبی، حسین بن محمد الموصلی، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، ابراہیم بن ابوالفتح الحریری، عبداللہ بن محمد بن احمد الاندلسی، عبدالمنعم بن منظفر المصری، عیسیٰ بن اسحٰق الہذبانی، ابراہیم بن ابوبکر بن الحلال، احمد بن ابوالہیجا الدمشقی، احمد بن عبدالرحیم الدمشقی، عبدالواحد بن عبدالرحیم، عبداللہ بن عبدالوہاب بن شجاع، محمود محمد و محمد (عبدالقادر بن عبدالخالق الانصاری کے تین بیٹے)، عبدالغفار بن طلائی، علی بن ابوالقاسم بن الغسال۔

کاتب:۔ ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی،

سماع ۴۲:۔ جلد ہفتم، باب ۵، مکتوبہ ۶۲۳ھ، دمشق میں مصنف کے گھر پر کتابت ہوئی۔ ایضاً۔

مسمع:۔ مصنف

خواندہ:۔ علی بن المظفر النشبی

سامعین:۔ اسمٰعیل بن حامد تمیمی، محمد اور محمد (ابن العربی کے دو بیٹے)، ابوبکر بن سلیمان الحماوی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد، حسین بن ابراہیم الاربلی، نصراللہ بن ابوالعز بن الصفار، محمد بن برکش المظلی، ابن معاذ الوربی، یونس بن عثمان الدمشقی، محمد بن علی المطرزی، علی بن محمود بن ابوالرجا الحنفی، عبداللہ بن محمد بن احمد الاندلسی، محمود بن احمد بن حماد، احمد بن عبدالرحیم بن بنان، حسین بن محمد الموصلی، ابراہیم بن محمد بن محمد القرطبی، محمد بن علی بن حسین، یحییٰ بن اسمٰعیل بن محمد السلطی، ابوبکر بن محمد البلخی، عمران بن محمد بن عمران،

کاتب:۔ ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی،

سماع ۴۳:۔ ایضاً، مکتوبہ ۶۳۴ھ، دمشق میں ابن العربی کے گھر پر کتابت ہوئی۔ ایضاً

مسمع:۔ مصنف

خواندہ:۔ نامعلوم

سامعین:۔ عیسیٰ بن اسحاق الہذبانی، احمد بن محمد التکریتی

سماع ۴۴:۔ ایضاً، مکتوبہ ۶۳۷ھ، مقام کتابت دمشق، مصنف کا منظور کردہ مخطوطہ

مسمع:۔ مصنف

تحریر کنندہ:۔ نامعلوم

سامع:۔ ام الدلال بنت احمد بن مسعود بن شداد المقری الموصلی

سماع ۴۵:۔ ایضاً، مکتوبہ ۶۳۷ھ، دمشق میں مصنف کے گھر پر کتابت ہوئی، ایضاً۔

مسمع:۔ مصنف

خوانندہ:۔ محمود بن عبداللہ بن احمد الزنجانی (الریحانی ؟)

سامع:۔ ایضاً

سماع ۴۶:۔ جلد دہم، باب ۶۵، مکتوبہ ۶۳۳ھ، دمشق میں مصنف کے گھر پر کتابت ہوئی۔ مصنف نے اس نسخے کو خود منظور کیا

مسمع:۔ مصنف

خوانندہ:۔ علی بن المظفر النشبی

سامعین:۔ محمد اور محمد (ابن العربی کے دو بیٹے)، اسمٰعیل بن صودکین، محمد بن برنکش المغلی، حسین بن ابراہیم الاربیلی، ابوبکر بن سلیمان الحماوی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد، نصر بن ابوالعز الصفار، ابن معاذ الوربی، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، یونس بن عثمان الدمشقی، احمد بن ابوالہیجا الدمشقی، عمران بن محمد بن عمران، علی بن محمود بن ابوالرجا، احمد بن محمد بن ابوالفرج الحنفی، عبداللہ بن محمد بن احمد اللخمی، حسین بن محمود بن علی الموصلی، محمود بن احمد بن حماد الدمشقی، عبدالمنعم بن منظفر المصری، محمد بن احمد بن زرافہ، ابراہیم بن محمد بن محمد القرطبی، محمد و محمد و محمد (عبدالقادر بن عبدالخالق الصایغ کے تین لڑکے)، عبدالغفار بن طلائی، عیسیٰ بن اسحاق الہذبانی، ابوالقاسم بن ابوالفتح الحریری، محمد بن علی بن حسین الاخلاطی، یحییٰ بن اسمٰعیل بن محمد المسلی

کاتب:۔ ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۴۷:۔ جلد دہم، باب ۶۶، مکتوبہ ۶۳۳ھ دمشق میں ابن العربی کے گھر پر کتابت ہوئی۔ تصحیح شدہ

مسمع:۔ مصنف

خوانندہ:۔ علی بن منظفر النشبی

سامعین:۔ اسمٰعیل بن صادقین، محمد بن برنکش المغلی، حسین بن ابراہیم الاربیلی، نصر بن ابوالعز بن الصفار، ابن معاذ الوربی، یونس بن عثمان الدمشقی، عمران بن محمد بن عمران، برکت بن حسن بن ملک، علی بن محمود بن ابوالرجا، احمد بن ابوالفرج، منظفر بن محمود بن ابوالقاسم، عبداللہ بن عبدالوہاب، یحییٰ بن اسمٰعیل بن محمد المسلی، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، ابوبکر بن سلیمان الحماوی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد، حسین بن محمد بن علی الموصلی، ابراہیم بن محمد بن محمد القرطبی، علی بن احمد القرطبی، محمد و محمد و محمد (عبدالقادر بن عبدالخالق الصایغ کے تین بیٹے)، عبدالغفار، محمد و محمد (ابن العربی کے دو بیٹے)، عبدالمنعم بن منظفر المصری، عبداللہ بن محمد بن احمد الاندلسی، احمد بن ابوالہیجا الدمشقی

عیسیٰ بن اسحاق الہذبانی، علی بن ابوالغنائم بن الغسال، محمد بن علی بن حسین، محمد بن احمد بن زرافہ

کاتب :- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۴۸:- جلد دہم، باب ۷۰، مکتوبہ ۶۴۳ھ، مقام کتابت، دمشق میں مصنف کا گھر۔ ایضاً۔

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- علی بن المظفر النشبی

سامعین :- حسین بن ابراہیم الاربلی، ابوبکر بن سلیمان الحمادی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد، محمد بن برتکش المعظمی، نصر بن ابوالعز بن الصفار، ابن معاذ الوربی، یوسف بن عثمان الدمشقی، احمد بن ابوالہیجا الدمشقی، احمد بن عبدالرحیم الدمشقی، محمود بن احمد بن حماد الدمشقی، علی بن محمود بن ابوالرجا الحنفی، احمد بن محمد بن ابوالفرج التکریتی، برکت بن حسن بن ملک، محمد بن علی المطرزی، محمد بن علی بن حسین، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، یوسف بن عبداللطیف البغدادی، عیسیٰ بن اسحاق بن یوسف الہذبانی، محمد و محمد (ابن العربی کے دو بیٹے) علی بن احمد بن علی القرطبی، حسین بن محمد الموصلی، علی بن ابوالغنائم بن الغسال، محمد و محمد و محمد (عبدالقادر بن عبدالخالق کے تین بیٹے) عبدالغفار، محمد بن احمد بن زرافہ، عبدالمنعم بن مظفر المصری

کاتب :- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی۔

سماع ۴۹:- جلد گیارہ، باب ۷۵، مکتوبہ ۶۴۳ھ دمشق میں ابن العربی کے گھر پر کتابت ہوئی۔ ایضاً

مسمع :- مصنف

خوانندہ :- علی بن المظفر النشبی

سامعین :- یحییٰ بن محمد بن علی القرشی اور اس کا بیٹا موسیٰ، ابوبکر بن سلیمان الحمادی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد، محمد بن برتکش المعظمی، حسین بن ابراہیم الاربلی، نصر بن ابوالعز بن الصفار، ابن معاذ الوربی، یونس بن عثمان الدمشقی، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، احمد بن ابوالہیجا، عمران بن محمد بن عمران، محمد بن علی المطرزی، احمد بن محمود بن ابوالرجا، احمد بن محمد بن ابوالفرج التکریتی، احمد بن عبدالرحیم الدمشقی، عبداللہ بن محمد بن احمد الاندلسی، علی بن احمد بن علی القرطبی، محمد بن علی بن حسین، یحییٰ بن اسماعیل بن محمد السلمی، مذکور بن یحییٰ بن حسین الصلخدی، عیسیٰ بن اسحٰق بن یوسف الہذبانی، عبدالمنعم بن مظفر المصری، حسین بن محمد بن علی الموصلی، ابراہیم بن ابوبکر الخلال، محمد و محمد و محمد (عبدالقادر بن عبدالخالق کے تین بیٹے) عبدالغفار

کاتب :- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۵۰:- جلد گیارہ، باب ۷۵، مکتوبہ ۶۴۳ھ مقام کتابت دمشق میں ابن العربی کا گھر اور ان کا منظور کردہ نسخہ

مسمع :۔ مصنف

خوانندہ :۔ علی بن المظفر النشبی (الدمشقی)

سامعین :۔ یحیٰی بن محمد بن علی القرشی اور اس کا بیٹا موسےٰ، حسین بن ابراہیم الاربلی، ابوبکر بن سلیمان الحماوی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد، محمد بن برکش المعظمی، نصر بن ابوالعز الصفار، ابن معاذ الوربی، یونس بن عثمان الدمشقی، احمد بن ابوالہیجا الدمشقی، عبداللہ بن محمد بن احمد الاندلسی، محمد و محمد (ابن العربی کے دو بیٹے)، محمد بن علی المطرزی، عمران بن محمد بن عمران، عیسیٰ بن اسحٰق بن یوسف الہذبانی، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، محمد بن علی بن حسین، یحیٰی بن اسمٰعیل بن محمد الملطی، ابراہیم بن محمد بن محمد القرطبی، حسین بن محمد الموصلی، احمد بن عبدالرحیم بن بنان، ابوبکر بن یونس بن الخلال اور اس کا بیٹا ابراہیم، محمد و محمد و محمد (عبدالقادر بن عبدالخالق کے تین بیٹے)، عبدالغفار بن طلائع، محمد بن احمد بن زرافہ، علی بن ابوالغنایم بن الغسال

کاتب :۔ ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۵۱ :۔ جلد بارہ، باب ۸۲، مکتوبہ ۶۴۳ھ، ایضاً، ایضاً

مسمع :۔ مصنف

خوانندہ :۔ علی بن المظفر النشبی

سامعین :۔ یحیٰی بن محمد بن علی القرشی اور اس کا بیٹا موسےٰ، حسین بن ابراہیم الاربلی، محمد بن برکش، ابوبکر بن سلیمان الحماوی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد، نصر العد بن ابوالعز بن الصفار، ابوبکر محمد بن ابوبکر البلخی، محمد بن علی بن الحسین الاطلاطی، یحیٰی بن اسمٰعیل الملطی، عبداللہ بن محمد بن احمد الاندلسی، عمران بن محمد بن عمران، احمد بن ابوالہیجا، محمد بن علی بن محمد المطرزی، ابن معاذ الوربی، مظفر بن محمود بن ابوالقاسم، علی بن بنان النجار، علی بن ابوالغنایم بن الغسال، عبدالمنعم بن مظفر المصری، محمد و محمد (ابن العربی کے دو بیٹے)، محمد و محمد و محمد (عبدالقادر بن عبدالخالق کے تین بیٹے)، عبدالغفار، ابراہیم بن محمد بن محمد القرطبی، حسین بن محمد بن علی الموصلی، ابراہیم بن ابوبکر بن الخلال، ابوالحسن بن راجح

کاتب :۔ ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۵۲ :۔ جلد بارہ، باب ۸۵، مکتوبہ ۶۴۳ھ، ایضاً، ایضاً۔

مسمع :۔ مصنف

خوانندہ :۔ علی بن مظفر النشبی

سامعین :- حسین بن ابراہیم الاربیلی، محمد بن برنکش المعظمی، نصراللہ بن ابوالعز بن الصفار، ابوبکر بن سلیمان الحمادی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، یونس بن عثمان الدمشقی، احمد بن عبدالرحیم بن بنان، احمد بن ابوالہیجا الدمشقی، محمد بن علی بن الحسین، عبدالمنعم بن مظفر المصری، محمد و محمد و محمد (عبدالقادر بن عبدالخالق کے تین بیٹے) عبدالغفار، ابراہیم بن ابوبکر بن الخلال، عیسیٰ بن اسحٰق بن یوسف الہذبانی، محمد بن احمد بن زرافہ ابراہیم بن محمد بن محمد القرطبی، محمد و محمد (ابن العربی کے دو بیٹے)، موسیٰ بن یحییٰ بن محمد القرشی

کاتب :- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

ع ۵۴ :- جلد بارہ، باب ۸۸، مکتوبہ ۶۴۳ھ، ایضاً ایضاً

مسمع :- مصنف

خواندہ :- علی بن المظفر بن ابوالقاسم النشبی

سامعین :- یحییٰ بن علی القرشی اور اس کا بیٹا موسیٰ، حسین بن ابراہیم الاربیلی، ابوبکر بن سلیمان الحمادی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد، محمد بن برنکش المعظمی، نصراللہ بن ابوالعز بن الصفار، یوسف بن عبداللطیف البغدادی، ابوبکر بن محمد بن ابوبکر البلخی، ابن معاذ الوربی یونس بن عثمان الدمشقی، عمران بن محمد بن عمران، برکت بن حسن بن ملک، محمد بن علی المطرزی علی بن احمد بن علی القرطبی، عبداللہ بن محمد بن احمد الاندلسی، محمد و محمد و محمد (عبدالقادر بن عبدالخالق کے تین بیٹے) عبدالغفار، عبدالمنعم بن مظفر المصری، علی بن ابوالغنایم بن الغسال، محمد اور عمر (مصنف کے دو بیٹے)، ابراہیم بن ابوبکر بن الخلال، محمد بن احمد بن زرافہ، عیسیٰ بن اسحاق الہذبانی، احمد بن ابوالہیجا الدمشقی

کاتب :- ابراہیم بن عثمان بن عبدالعزیز القرشی

ع ۵۵ :- جلد بارہ، باب ۸۹، مکتوبہ ۶۴۳ھ، ایضاً ایضاً

مسمع :- مصنف

خواندہ :- علی بن المظفر النشبی

سامعین :- حسین بن ابراہیم الاربیلی، ابوبکر بن سلیمان الحمادی اور اس کے دو بیٹے عبدالواحد اور احمد، محمد بن عبدالواحد، یوسف بن عبداللطیف البغدادی، محمد بن برنکش المعظمی، نصراللہ بن ابوالعز بن الصفار، محمد بن علی بن حسین الاخلاطی، ابن معاذ الوربی، یونس بن عثمان الدمشقی، احمد بن ابوالہیجا الدمشقی، محمد بن علی المطرزی، علی بن ابوالغنایم بن الغسال، یحییٰ بن اسمٰعیل المعطی، علی بن محمود بن ابوالرجا، احمد بن محمد بن ابوالفرج التکریتی، عبداللہ بن محمد بن احمد الاندلسی

عیسیٰ بن اسحاق النہ بانی ۔ ابوبکر محمد بن ابوبکر البلخی ، محمد بن الحسین بن الخضر البصری ، عبدالمنعم بن مظفر المعری ، یوسف بن سعید بن رائق الجعفری ، محمد ، محمد و محمد (عبدالقادر بن عبدالخالق کے تین بیٹے) ، عبدالغفار ، عمران بن محمد بن عمران ، ابراہیم بن محمد بن محمد القرطبی ، موسیٰ بن یحییٰ بن محمد القرشی

کاتب :- ابراہیم بن عمر بن عبدالعزیز القرشی

سماع ۱۵۵ :- جلد ۳۲ ، باب ۵۵۸ ، مکتوبہ ۶۳۶ھ ، ایضاً ، ایضاً

مسمع :- مصنف

خواننده :- عیاس بن عمر بن یحییٰ بن سرور الانصاری الحنفی السراج

سامعین :- احمد بن عبداللہ بن احمد العلوی ، محمد بن عبدالعزیز بن عتی بن عبدالخالق الانصاری

کاتب :- محمد بن عبدالعزیز بن عبدالقادر بن عبدالخالق الانصاری

سماع ۱۵۶ :- جلد ۳۳ ، مکتوبہ ۶۳۶ھ ، ایضاً ، ایضاً

مسمع :- مصنف

خواننده :- عباس بن عمر بن یحییٰ بن سرور الانصاری

سامع :- احمد بن عبداللہ بن احمد العلوی

کاتب :- محمد بن عبدالقادر بن عبدالخالق الانصاری

سماع ۱۵۷ :- جلد ۳۴ ، باب ۵۵۹ ، مکتوبہ ۶۳۶ھ ایضاً ایضاً

مسمع :- مصنف

خواننده :- عباس بن عمر بن یحییٰ بن سرور الانصاری

سامعین :- محمد سعد الدین (ابن العربی کا بیٹا) ، احمد بن عبداللہ بن احمد العلوی

کاتب :- محمد بن عبدالقادر بن عبدالخالق الانصاری

سماع ۱۵۸ :- جلد بارہ ، باب ۸۹ ، مکتوبہ ۶۴۰ھ حلب میں ابن صادقین کے گھر پر کتابت ہوئی ۔

مسمع :- اسمٰعیل بن صودکین ؒ

خواننده :- محمد بن اسحٰق القونوی

سامع :- ابوبکر بن بندار التبریزی

سماع ۱۵۹ :- جلد چودہ ، باب ۱۰۶ ، مکتوبہ ۶۴۰ھ ، ایضاً

مسمع :- اسمٰعیل بن صادقین

خواننده :- ابن اسحٰق بن محمد القونوی

سامع :- ابوبکر بن بندار التبریزی

سماع ۱۶۰:- جلد پندرہ، باب ۱۱۳، مکتوبہ ۶۴۰ھ ایضاً

مسمع :- ابن صادقین

خوانندہ :- محمد بن اسحٰق بن محمد القونوی

سامع :- ابوبکر بن بندار التبریزی

سماع ۱۶۱:- جلد اٹھارہ، مکتوبہ ۶۴۰ھ، ایضاً

مسمع :- اسمٰعیل بن صادقین

خوانندہ :- محمد بن اسحٰق القونوی

سامع :- ابوبدر بن بندار التبریزی

سماع ۱۶۲:- جلد ۱۹، مکتوبہ ۶۴۰ھ ایضاً

مسمع :- اسمٰعیل بن صادقین

خوانندہ :- محمد بن اسحٰق القونوی

سامع :- ابوبکر بن بندار التبریزی

سماع ۱۶۳:- جلد بیس، باب ۲۸۹، مکتوبہ ۶۳۹ھ ایضاً

مسمع :- اسمٰعیل بن صادقین

خوانندہ :- محی الدین بن سراقہ

سامع :- ایضاً

سماع ۱۶۴:- جلد اکیس، باب ۳۰۶، مکتوبہ ۶۳۹ھ، ایضاً

خوانندہ :- محی الدین بن سراقہ

سامع :- ایضاً

سماع ۱۶۵:- جلد ۲۹، مقام کتابت حلب

مسمع :- محمد بن اسحٰق القونوی

خوانندہ :- ایضاً

سماع ۱۶۶:- جلد ۳۰، باب ۴۹۶،

مکتوبہ ۶۴۰ھ مقام کتابت حلب

- مسمع :- محمد بن اسحاق القونوی

خوانندہ : ایضاً

سامعین :- ابوبکر بن بندار التبریزی ، مجد الدین

سماع ۶۷ جلد ۳۱ ، باب ۴۹۷ ، مکتوبہ ۶۴۰ھ مقام کتابت حلب

مسمع :- محمد بن اسحٰق القونوی

خوانندہ :- ایضاً

سامع :- مجد الدین ابوبکر بن بندار التبریزی

سماع ۶۸ :- جلد ۳۲ ، مکتوبہ ۶۴۰ھ ، مقام کتابت حلب

مسمع :- محمد بن اسحٰق القونوی

خوانندہ :- ایضاً

سامع :- مجد الدین ابوبکر بن بندار التبریزی

سماع ۶۹ :- جلد ۳۳ ، باب ۵۴۰ ، مکتوبہ ۶۴۰ھ ، مقام کتابت حلب

مسمع :- اسمٰعیل بن صودکین

خوانندہ :- محمد بن اسحاق القونوی

سامع :- ابوبکر بن بندار التبریزی

سماع ۷۰ :- جلد ۳۴ ، باب ۵۵۹ ، مکتوبہ ۶۴۰ھ ، مقام کتابت حلب

مسمع :- اسمٰعیل بن صادقین

خوانندہ :- محمد بن اسحاق القونوی

سامع :- مجد الدین ابوبکر بن بندار التبریزی

سماع ۷۱ جلد ۳۵ ، مکتوبہ ۶۴۰ھ ، مقام کتابت حلب

مسمع :- اسمٰعیل بن صادقین

خوانندہ :- محمد بن اسحٰق القونوی

سامع :- مجد الدین بن بندار التبریزی

(۴)

مخطوطاتؔ

مردیہ ، منسہ ۱۰۴۸ ، ۱۰۴۹ ، ۱۰۵۰ ، ۱۰۵۱ ، ۱۰۵۳ ، ۱۰۵۳ ؛ دیٹی کن (۱۹۳۵ ، طبع عکسی ۱۹۶۸ء)

۴/۲۹۴ ، ۱۱۶۶ ، ۱۴۲۸ / ۲ ، ۱۴۳۱ / ۲ ، جلد دوم (۱۹۶۵ء) ۴۴۱۵ ، ۱۵ / ۱۷۱ (ورق ۱۷۸) ؛ ظاہر یہ ۷۰۳۸ ؛ وی آنا ۱۹۱۲ ؛ داماد ابراہیم پاشا ۷۴۹ (مکتوبہ ۶۴۸ھ ؛ مکمل نسخہ دریک جلد) ۷۵۰ - ۷۵۱ (مکمل نسخہ در دو جلد ، مکتوبہ ۱۰۳۷ھ) ؛

۱۴۶۹/ ۱-۱۷۰ (ناکمل نسخہ، مشتمل بر باب ۵۷-۶۰) ؛ ۱۷۴۱ (مکتوبہ ۹۹۰ھ، مشتمل بر آخری باب
شمارہ ۵۶۰)، ۲۷۴۱ (مکتوبہ ۹۲۹ھ، مشتمل بر باب ۲۶۹-۳۵۳، دوسرے نسخہ سے موازنہ بھی کیا گیا ہے)، ۱۴۹۵،
۲۷۴۳، ۳۶۹۲۰ ؛ اسعد افندی ۱۵۹۹-۱۶۰۲ (مکمل نسخہ در چار جلد، جلد اوّل مکتوبہ ۱۱۹۱ھ، جلد سوم مکتوبہ ۱۱۹۳ھ،
جلد چہارم مکتوبہ ۸۶۲ھ)، ۱۶۰۳-۱۶۰۵ ؛ ازمیرلی ۱۶۸-۱۷۱ (مکمل نسخہ در چار جلد) ؛ حکیم اوغلو ۴۸۸-۴۸۹ (سنہ تکمیل
۱۰۱۷ھ)، ۴۹۰-۴۹۲ (سنہ تکمیل ۱۰۳۴ھ) ؛ ایا صوفیہ ۳۱۰۷ (مکمل اور نظر ثانی شدہ نسخہ، سنہ کتابت درج نہیں لیکن قدیم
نسخہ معلوم ہوتا ہے)، ۳۱۷۲ (ناکمل، باب ۰-۱۵۸) ؛ احمد ثالث ۲۰۷۵ (مکمل اور قدیم نسخہ)، ۲۰۷۶ (ناکمل نسخہ، باب
۱-۲۸۰، اچھی حالت میں ہے) ؛ عاطف افندی ۱۴۶۸ (مکتوبہ ۸۸۳ھ، مکمل نسخہ) ؛ دانشگاہ استانبول ۲۷۰۲ (مکمل
نسخہ در دو جلد، مکتوبہ ۱۱۴۴ھ، اچھی حالت میں ہے)، ۵۴۵۰ (مکمل در دو جلد، سنہ کتابت ۱۲۶۱ھ، صاف نسخہ ہے) ؛
حسن حسنی پاشا ۵۷۴ ؛ Kasidecı zeda ۱۱۷ ؛ یوسف آغا ۱۵۵ (مکمل نسخہ)، ۱۵۶ (مکمل نسخہ) ؛ قونیہ
میوزیم ۱۵۵، ۱۵۶ (مکمل) ؛ احمدیہ ۸۵۳ (ناکمل، مشتمل بر باب شمارہ ۱۲۰) ؛ ۷۷۰-۷۷۳ (مکمل نسخہ در چار جلد، سنہ کتابت
۱۰۲۴ھ) ؛ عثمانیہ، حلب ۷۶۹ (سنہ تکمیل ۹۵۵ھ)، ۷۰۹ (ناکمل) ؛ اوقاف، حلب ۱۹۵۴ (مشتمل بر آخری باب)،
۲۱۷۵ (ناکمل)، ۲۱۴۵ (مشتمل بر باب ۱-۷۳)، ۲۱۵۳ (باب ۷۴-۱۶۰)، ۲۲۳۹، ۲۲۳۸ ؛ Bagdatlı
۵۳۷ (مکتوبہ ۶۹۹ھ) ؛ ازمیرلی ۱۴۷ /۳۱، ۱۴۸ /۳۱، ۱۴۹ /۳۱، ۱۵۰ /۳۱ ؛ خالد ۲۴۴، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۶۸، ۲۶۹؛
۲۶۸، ۲۶۹؛ اولو جامی ۱۴-۱۶۱۶ ؛ شہید علی ۱۲۹۳-۱۲۹۹، ۱۲۹۰ ؛ ترجان، سلیمانیہ ۱۸۷ ؛ نفیذ پاشا ۶۲۰-
۶۲۳ ؛ ZUHDU ۳۸۶ ؛ Muhtalıt ۱۳۳-۱۵۲ ؛ یحییٰ آفندی ۲۶۰۹ ؛ بشیر آغا ۳۱۱/
۱-۸۰۳ ؛ سلیم آغا ۳۱۷، ۳۳۴۵ ؛ حمیدیہ ۶۸۶ (مکتوبہ ۸۴۷ھ، مکمل نسخہ)، ۶۸۴-۶۸۵ (مکمل نسخہ در دو جلد، سنہ کتابت
۱۰۰۸ھ) ؛ ازہر (۲۶۷) ۹۳۵۱ ؛ CENEL ۱۱۰۶ ؛ حسین چلبی ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶ ؛ ارجین ۶۰۲، ۶۰۳،
۶۰۴، ۶۰۵ ؛ حراچی اوغلو ۷۸۹، ۷۹۰ ؛ ناتح ۲۷۴۵ (مشتمل بر تین ابواب از جلد اوّل، اوراق ۲۰۳)، ۲۷۴۶ (مشتمل
بر باب ۱-۱۶ از جلد اوّل، اوراق ۲۶۸)، ۲۷۴۷ (باب ۷۲-۱۱۸)، ۲۷۴۸ (باب ۷-۱۰، مکتوبہ ۷۸۰ھ)، ۲۷۴۹ (باب
۶۵، قدیم نسخہ)، ۲۷۵۰ (باب ۷۰، مکتوبہ ۸۲۱ھ)، ۲۷۵۰ (باب ۱۰، ۲۴) ؛ مراد ملا ۱۲۷۹ (مکمل نسخہ در یک جلد، مکتوبہ
۸۸۴ھ، اچھی حالت میں ہے)، ۱۲۸۰ (باب ۱-۶۹، مکتوبہ ۷۷۴ھ)، ۱۲۸۱ (باب ۷۰-۱۵۷، قدیم نسخہ)، ۱۲۸۲
(باب ۵۸-۹۳)، ۱۲۸۳ (باب ۶۲م، قدیم نسخہ)، ۱۲۸۴ (باب ۲م)، ۱۲۸۵ باب ۴-۲۶۱،
مکتوبہ ۹۵۹ھ) ؛ کوپریلو ۵۵۵ (باب ۱-۲، مکتوبہ ۱۰۱۹ھ)، ۵۵۶ (باب ۳-۲۸۰، مکتوبہ ۱۰۲۰ھ)، ۵۵۷ (باب ۲۸۱-۳۸۳،
مکتوبہ ۱۰۲۲ھ)، ۵۵۸ (باب ۳۸۴-۵۶۰، مکتوبہ ۱۰۲۳ھ)، ۵۵۹ (مکمل نسخہ در یک جلد)، ۷۶۰ (مکمل نسخہ در یک جلد،
قدیم) ؛ راغب پاشا ۷۰۴-۷۰۵ (مکمل نسخہ در ۲ جلد، جلد اول کی کتابت مختلف کاتبوں نے کی ہے، مکتوبہ ۱۱۵۰ھ) ؛
ولی الدین ۱۷۴۷ (مکمل نسخہ، مکتوبہ ۱۱۷۴ھ)، ۱۷۴۸ (مشتمل بر باب ۱-۷۷، نظر ثانی شدہ)، ۱۷۴۹ (باب ۷۷-۲۸۱،
اصلاح شدہ)، ۱۷۵۰ (باب ۲۸۲-۳۸۴، نظر ثانی شدہ)، ۱۷۵۱ (باب ۳۸۴، مکتوبہ ۱۰۲۱ھ)، ۱۷۵۲ (باب ۱-۶۱) ؛

نور عثمانیہ ۲۵۰۱ (سنہ تکمیل ۱۲۱۱ھ، اچھی حالت میں ہے)، ۲۵۰۲ (سنہ تکمیل ۹۹۲ھ، اچھی حالت میں ہے)، ۲۵۰۳ (مکمل اور نظر ثانی شدہ قدیم نسخہ)، ۲۵۰۴ (مکمل اور نظر ثانی شدہ نسخہ، مکتوبہ ۱۰۵۲ھ)، ۲۵۰۵ (مکمل مخطوطہ، سنہ کتابت ۹۹۸ھ، اچھی حالت میں ہے)، ۲۵۰۶ (مکمل نسخہ در دو جلد)؛ بایزید ۳۴۴۱ - ۳۴۴۳ (مکمل نسخہ، سنہ تکمیل ۱۲۶۶ در چار جلد)، ۳۷۴۳ (باب ۱-۴۲، قدیم)، ۳۷۴۴ (باب ۷۳-۲۹۴، مکتوبہ ۶۸۳ھ)، ۳۷۴۵ (باب ۲۹۴-۳۸۱)، ۳۷۴۶ (باب ۳۸۱)، ۳۷۴۷ (باب ۲۷۰، مکتوبہ ۹۶۰ھ)، ۳۷۴۸ (باب ۱-۲۷۰، مکتوبہ ۱۲۱۹ھ)، ۳۷۴۹ (باب ۲۷۰، مکتوبہ ۹۸۰ھ)، ۳۸۰۴ (باب ۱-۷۰، اصلاح شدہ)، ۳۸۰۵ (باب ۷۰-۱۹۸، نظر ثانی شدہ)، ۳۸۰۶ (باب ۱۹۸-۲۵۹، نظر ثانی شدہ)، ۳۸۰۷ (باب ۳۳۹-۴۶۰، نظر ثانی شدہ)، ۳۸۰۸ (باب ۴۶۰، اصلاح شدہ، مکتوبہ ۱۰۱۴ھ)؛ پیرس (ببلیوتیک ناسیونال) ۱۳۳۳-۱۳۳۶، ۴۸۰۰؛ مدرسہ جامع الباشا ۸۰ (بحوالہ مخطوطات موصل از داؤد چلبی)؛ برلین ۲۸۵۶/۳-۴؛ گوتا ۸۸۴ (دیگر مخطوطات کے حوالوں سمیت)؛ برٹش میوزیم، تکملہ ۲۳۱؛ Qawala ۱: ۲۵۵؛ پٹنہ ۱: ۱۳۹؛ لائیڈن ۲۲۹؛ پرنسٹن (اور ینٹیل میوزیم) ۴۴۳۴؛ فاس ۱۵۰۴-۱۵۰۷؛ قاہرہ ۲: ۹۹، ۳۲۷؛ موصل ۵۲؛ آصفیہ ۱: ۳۱ - ۳۴؛ رامپور ۱: ۳۵۴؛ پٹنہ ۱۳: ۸۶۵-۸۶۹؛ اوقات بغداد ۴۷۶۵، ۱۱۰۷، ۵۲۰۷، ۱۸۸۴/۱۵؛ مشہد ۴: ۲۱۲، ۲۱۳، نمبر ۹۰۸؛ بغداد (قومی کتب خانہ) ۱-۱: ۳۴۷، ۳۶۸؛ دانشگاہ یاردرڈ ۸۶؛

Djelfa, Bull de Corr Afr. 1884, 372/36.

شروح

۱۔ شرح فتوحات مکیہ (قلمی) دو جلد۔ شارح کا نام معلوم نہیں، مخطوطہ Dogmulu (سلیمانیہ کتاب خانہ، استانبول، غیر مطبوعہ) ۲۰۵

۲ شرح خطبۃ الفتوحات از محمد بن عربی المغربی الجزائری، مخطوطہ اسمٰعیل صائب کتاب خانہ (انقرہ، غیر مطبوعہ) جلد اول ۵۱۴۲/۱-۲۲، مصنف کا نام شہزادہ عبدالقادر کا قلمی نام معلوم ہوتا ہے، جو ۸۸۳ھ کو دمشق میں فوت ہوا۔

۳۔ حواشی بر فتوحات شیخ محی الدین ابن عربی از علاء الدولہ سمنانی (بحوالہ آثار شیخ علاء الدولہ سمنانی از سید مظفر صدر، تہران ۱۳۰۴ھ)

۴۔ بلا عنوان، شارح علی بن احمد بن محمد البعلی الاشعری (م - ۱۰۸۴ھ/ ۱۶۷۳ء) مخطوطہ برلین ۲۸۷۵ (بحوالہ براکلمان ۱: ۲: ۵۷۵)
"فتوحات" کے ابتدائیہ سے بعض اقتباسات کی شرح

(۵) بلا عنوان، شارح عبداللہ الصلاحی (م - ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۷ء) مخطوطہ سلیمیہ (کتاب خانہ ملت، استانبول، غیر مطبوعہ) ۴۳۰، ورق ۱۲۱ و - ۱۲۶ - "فتوحات" کے دیباچہ کے پہلے فقرے کی شرح۔

(۶) النفس الواردات از عبداللہ البسنوی (م - ۱۰۵۴ھ/ ۱۶۴۴ء)، مخطوطہ یحییٰ آفندی (کتاب خانہ سلیمانیہ، استانبول،

غیر مطبوعہ) ۲۸۶۴، ص ۳۸-۵۴؛ دانشگاہ استانبول ۳۱۴۴/۱۳ب؛ جار اللہ ۲۱۲۹/۴۰، (بدستخط شارح، مکتوبہ ۱۰۳۹ھ) "فتوحات" کے دیباچہ کے پہلے فقرے کی شرح

(۷) بلا عنوان، شارح نامعلوم، مخطوط اسد افندی (کتاب خانہ سلیمانیہ، استانبول، مطبوعہ) ۱۳۷۱/۳۸ب-۴۱ب۔ "فتوحات" کے مندرجہ ذیل ابتدائی دو اشعار کی شرح ہے۔

الرب حق والعبد حق — یا لیت شعری من المکلف

ان قلت عبد فذاک میت — أو قلت رب أنّی یکلف

(۸) رسالۃ الفتح المبین از احمد بن سلیمان الخالدی (م-۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء) مخطوط برلین ۲۹۸۹۔ متذکرہ بالا دو اشعار کی شرح۔

(۹) بلا عنوان، شارح محمد بن احمد بن محمد الخلوتی، جمال الدین (م ۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء)، مخطوط نفیذ پاشا (کتاب خانہ سلیمانیہ، استانبول، مطبوعہ) ۶۸۵/ص ۳۴۶-۳۵۴، مکتوبہ ۱۰۹۹ھ متذکرہ بالا دو اشعار کی شرح۔

(۱۰) رسالۃ حل المحل المقفل از عبد اللہ البسنوی (م-۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء) مخطوط دانشگاہ استانبول ۳۱۶۴/۱۷۴-۱۸۶ب (بعنوان کتاب المنتہی مصاعد الکلمات)؛ داماد ابراہیم (کتاب خانہ سلیمانیہ، استانبول، مطبوعہ) ۱۱۵۰/۲۲۵-۲۳۲ (بعنوان ایضاً) "فتوحات" کے چھٹے باب کی شرح۔

(۱۱) بلا عنوان، شارح نامعلوم۔ مخطوط ولی الدین (کتاب خانہ بایزید عمومی، استانبول، مطبوعہ) ۱۲۲۱/۵ "فتوحات" کے باب ۱۴۸ کی شرح

(۱۲) بلا عنوان، شارح نامعلوم مخطوط اسمٰعیل صائب ۱: ۱۶۰۱/۵۲-۷۶۔ "فتوحات" کے باب ۵۵۹ کے بعض حصوں کی شرح

(۱۳) بلا عنوان از ابراہیم بن حسن الکورانی الشہرزوری (م-۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء) مخطوط ولی الدین ۱۸۱۵/۵۵ب-۸۳ب، مکتوبہ ۱۱۴۸ھ۔ "فتوحات" کے بعض اقتباسات کی شرح

(۱۴) بلا عنوان، شارح نامعلوم، مخطوط ولی الدین ۱۸۲۱/۲۳۱ب-۲۳۵ب۔ "فتوحات" کے بعض حصوں کی شرح۔

(۱۵) شرح مشکلات الفتوحات از عبد الکریم الجیلی (م-۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء) مخطوطات: شہید علی (کتاب خانہ سلیمانیہ، استانبول، غیر مطبوعہ) ۱۷۱/۲/۴۸-۷۰ (سنہ کتابت ۷۷۹ھ، مقام کتابت مکہ)، احمدیہ (حلب) ۵۷۷/۱ (مکتوبہ ۱۰۴۸ھ)، اسکندریہ ۱۰۳۶، برلین ۲۸۷۴، مراد بخاری ۲۰۸/۳، خسرو پاشا ۱۸۱، ایا صوفیہ ۲۰۸۷/۵ (مکتوبہ ۹۸۰ھ)، خالد ۲۷۱/۳۰ب-۳۴ب، سلیمیہ ۶۰۲/۱۸، جار اللہ ۱۰۴۸، ازہر ۹۵۸ (حلیم) ۳۳۵۹۲، ہدیہ ۵۸۳، نفیذ پاشا ۱۳۲۱/۶۱-۶۴، دانشگاہ استانبول ۳۵۹۷/۱-۱۲ب، ۳۲۳۹/۱۹۴ب-۲۱۳۔ "فتوحات" کے باب ۵۵۹ کے بعض اقتباسات کی شرح۔ رک: براکلمان ۱: ۵۷۲، برلین، انڈیا آفس ۶۹۳، خالد، پٹنہ ۲: ۴۰۹، ۵۷۹، ذ ۱: ۷۹۲، ہائیڈل برگ ۲۲، برٹش میوزیم (تکملہ) ۲/۴۵۳۴، قاہرہ ۲: ۱۹۷: ۳۲۵ (۱)، داماد زادہ ۱۷۶، ۵۰۔

(۱۶) رسالہ فی الاطوار السبعہ از جیلی، مخطوطہ شہید علی ۱۳۹۶/۲۷ ا ب ۱۲۸۸ ا ۰ مکتوبہ ۱۰۶۲ ھ "فتوحات" کے باب ۵۵۹ کے بعض حصوں کی شرح

منتخبات

(۱) لواقح الانوار القدسیہ فی بیان قواعد الصوفیہ از عبد الوہاب الشعرانی (م ۹۷۳/ ۱۵۶۵ء) مخطوطہ برلین ۳۰۰۶ ۳ (بحوالہ براکلمان ۱ : ۵۷۲)، علی امیری (کتاب خانہ ملت استانبول، غیر مطبوعہ) ۵۷۵ ۱/ ۳۶۰ (مکتوبہ ۱۲۵۶ھ)، ۵۷۶ در ۳۴ اجزا شہید علی ۱۴۰۰ رک: براکلمان ۱: ۵۷۲، لائپشک ۲۲۹ (رک: گوتا ۸۸۵)، ذا : ۷۹۲/ ۱۱، نور عثمانیہ ۲۹۵۴-۹/
یہ کتاب الشعرانی کی ایک اور کتاب "لطائف المنن والاخلاق" (قاہرہ ۱۳۱۱ھ) کے حاشیہ پر بھی طبع ہوئی ہے

(۲) الکبریت الاحمر از الشعرانی۔ مخطوطہ اسعد افندی ۱۶۱۵، ۱۶۱۶، ۱۶۱۷؛ شہید علی ۱۳۷۹۔ رک: براکلمان ذا: ۷۹۲، ویٹی کن ۸ ۴ ۴۱، آصفیہ ۱: ۳۸۰، کشف الظنون ۴: ۵۵۵۔ مطبوعہ قاہرہ، ۱۲۷۷ھ

(۳) الیواقیت والجواہر از الشعرانی۔ مخطوطہ آصفیہ ۲۔ رک: نائبرگ (نوٹ نمبر ۱) شمارہ نمبر ۴، براکلمان ذا: ۷۹۲۔ مطبوعہ قاہرہ، ۱۲۷۷ھ، ۱۳۰۵ھ، ۱۳۲۲ھ۔

(۴) النفحات القدسیہ فی بیان قواعد الصوفیہ از الشعرانی، مخطوطہ لائپشک ۲۵۸ رک: براکلمان ذا: ۷۹۲

(۵) ما احتوان الرحمن بن صالح بن محمد البود عود یحیٰی مخطوطہ [illegible] ۴۳۴۴ (مکتوبہ ۱۱۶۶ھ) رک: براکلمان ذا: ۷۹۲

(۶) صفوۃ الفتوحات المکیہ فی بیان الحقائق الالٰہیہ ("کنز العلوم و بحر العلوم") از حسین حمدی الحنفی الرومی۔ مخطوطہ کتاب خانہ دانشگاہ استانبول ۳۱۷۳/ ۱-۳۰۹ بدستخط شارح، مکتوبہ ۱۲۵۷ھ

(۷) المنتخب من الفتوحات المکیہ از عبد المحسن بن محمد مخطوطہ ایا صوفیہ ۲۶۹۹/ ۱-۱۸۱

(۸) سواطع الانوار القدسیہ از عبد الغنی النابلسی (م ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۰ء) مخطوطہ قاہرہ (قومی کتاب خانہ) ۱: ۳۱۹، قدیم نسخہ۔ رک: عواد: فہرس، شمارہ ۴ نوٹ ۲۔

تراجم

۱۔ ترجمہ لب اللب مترجم نا معلوم۔ مخطوطہ یحییٰ افندی ۲۹۰۸۔ "فتوحات" کے ایک اقتباس کا ترکی ترجمہ۔

۲۔ معرفۃ الاسرار المکیہ از عمر الکوانی۔ مخطوطہ یحییٰ افندی ۳۰۱۰۔ "فتوحات" کے بعض حصوں کا فارسی ترجمہ۔

۳۔ مشل والساں (M. Valsan) نے "فتوحات" کے بعض حصوں کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا تھا رک:

Etude traditionelles (Oct.-Nov., 1953) pp. 302-11.

قبل ازیں اس زبان میں "فتوحات" کے بعض اجزاء کا ترجمہ ۱۹۲۷ء میں ہو چکا تھا

۴۔ "فتوحات" کے ایک حصے کا ہسپانوی ترجمہ نے ۱۹۲۴ء میں کیا تھا

۵۔ "فتوحات" کے بعض اجزا کا ترجمہ راولپنڈی سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا (صفحات ۶۹۴) اس کے علاوہ بعض حصوں

کا ایک اور اردو ترجمہ قلمی صورت میں انجمن ترقی اردو (کراچی) کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ "فتوحات" کے چند اجزا کا اردو ترجمہ حیدر آباد دکن سے بھی شائع ہوا تھا

طباعت

، در چار جلد، بولاق ۱۲۶۹ھ–۱۲۷۴ھ؛ قاہرہ ۱۲۹۰ھ، ۱۲۹۳ھ، ۱۳۲۶ھ، ۱۳۲۹ھ؛ طبع عکسی دار صادر، بیروت، بلا تاریخ

جلد اوّل (صفحات ۷۴۰)، جلد دوم (صفحات ۷۰۴)، جلد سوم (صفحات ۵۷۶)، جلد چہارم (صفحات ۵۷۱)

"فتوحات" ابن العربی کی نظر میں

فہرست (کتاب خانہ یوسف آغا) نمبر ۵۰؛ اجازہ (مذکورہ بالا) نمبر ۵۰؛ روح القدس (مخطوطہ دانشگاہ استانبول) ۹۷۹-۹۸ (رینز) اسی کتاب کا انگریزی ترجمہ بعنوان "The Sufis of Andalusia" از آسٹن (R W J Austin) مطبوعہ لندن ۱۹۷۱ء؛ فصوص الحکم والتعلیقات علیہ بقلم ابو العلا عفیفی بیروت ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۶ء، ص ۱۷۷، ۲۲۱، ۲۲۴؛ ایام الشان، ص ۱۸ (حیدر آباد دکن، ۱۹۴۸ء)؛ کتاب المیم والواو، ص ۲ (الف)؛ کتاب التجلیات، ص ۲ (ایضاً)؛ کتاب الفناء فی المشاہدۃ، ص ۹ (ایضاً)؛ کتاب النقبہ (دیباچہ)؛ کتاب الاعظم (دیباچہ)؛ کتاب الباء (آخری حصہ) جاذ، ورق ۵ ب۔

مطالعات

M. Asin Palacios El mistico murciano Abenarabi III
(Boletin de la Academie de la Histori LXXXVIII, 1926)

——— El Islam cristianizado,
Madrid 1931, pp. 107-10,450-518

Enrico Cerulli *Una parola cuscitica nelle F. al. M. d' Ibn Arabi.*
(Orientalia 4 (1935), pp. 341-3).

حواشی

۱۔ ابن العربی کی زندگی پر مستقل تصانیف اور مضامین کی صورت میں اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اسلامی تصوف پر جو بھی کتاب کسی زبان میں لکھی جاتی ہے، وہ اُن کے ذکر سے خالی نہیں۔ یہاں ان سب کا حوالہ دینا مشکل ہے، البتہ قارئین کی سہولت کے لیے چند ایسے مصادر کی فہرست درج کی جاتی ہے جو پاکستان کے کتب خانوں میں بآسانی دستیاب ہیں اور ان کے علاوہ اس موضوع پر دیگر کتب مراجع کی فہارس بھی شامل ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (طبع جدید)، جلد سوم (لائیڈن، ۱۹۷۱ء) ص ۷۰۷ - ۷۱۱ (مقالہ از احمد آتش۔ دراصل یہ مقالہ اسی مصنف کے طویل مقالے کا ملخص ترجمہ ہے، جو اسی انسائیکلوپیڈیا کے ترکی ترجمہ میں شائع ہوا تھا)؛ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد اول (لاہور، ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء) ص ۶۰۵-۶۱۲ (مقالہ از ابوالعلاء عفیفی)؛ کارل براکلمان: تاریخ ادب عربی (بزبان جرمنی) مطبوعہ لائیڈن، ۱: ۴۴۱ - ۴۴۸ (طبع ثانی ۱: ۵۷۱-۵۸۲)، ذیل ۱: ۷۹۰ - ۸۰۲؛ معجم المؤلفین۔ تالیف عمر رضا کحالہ (جزء ۱۱، دمشق، ۱۹۵۷ء - ۱۹۶۱ء) بذیل مادہ؛ الاعلام۔ تالیف خیر الدین الزرکلی، قاہرہ (طبع ثانی، جزء ۱۰، ۱۹۵۴ء - ۱۹۵۹ء) بذیل مادہ؛ معجم المطبوعات العربیۃ۔ تالیف سرکیس، قاہرہ ۱۹۲۸ء، ص ۱۷۸؛ Index Islamicus (مرتبہ پیئرسن) کی تمام جلدیں مع ضمیمہ جات (۱۹۰۶ء تا ۱۹۷۵ء)

ان کے علاوہ اس مقصد کے لیے ایسے اہلِ علم کی کتابوں وغیرہ سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے، جنہوں نے ابن العربی کے فکری پہلوؤں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ رک: نوٹ نمبر ۶ تا ۱۶۔

۲۔ A. Schimmel. Mystical Dimensions of Islam, University of North Carolina Press, Chapel Hill, 1975, p. 263.

۳۔ گذشتہ چند صدیوں میں ابن العربی کی حمایت اور مخالفت میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن کی ایک طویل فہرست ڈاکٹر عثمان یحییٰ نے درج کی ہے:

Osman Yahia: Histoire et classification de l'oeuvre d'Ibn Arabi. Etude critique, 2 vols., Damas 1964, vol.1, pp. 114-21.

۴۔ شیخ احمد سرہندیؒ اپنے ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں:

درین عرصہ شیخ است قدس سرہ کہ گاہی بادی جگست وگاہی مسلح اوست کہ سخن معرفت و عرفان را بنیاد نہادہ است وشرح و بسط دادہ اوست کہ از توحید و اتحاد بتفصیل سخن گفتہ است و منشاء تعدد وتکثر را بیان فرمودہ است و اوست کہ وجود را بالکل بحق دادہ است جل وعلا وعالم را موہوم و تخیل

ساختہ و اوست کہ تنزلات ۔۔۔۔۔ "

(مکتوبات امام ربانی، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ، بلا تاریخ، ۳: ۱۳۶۔
۱۳۷؛ اردو ترجمہ مع تصحیح و حواشی از محمد سعید احمد نقشبندی، دفتر دوم، حصہ سوئم، کراچی
۱۹۷۲ء، ص ۲۹؛ انگریزی ترجمہ از فرید بان، مرقومۃ الذیل، ص ۶۴۔ ۶۵)

نیز رک

Yohanan Friedmann Shaykh Ahmad Sirhindi. An outline of his thought and a study of his Image in the eyes of posterity. Montreal/London, 1971, pp. 62-8, etc.,

انتخابات مکتوبات شیخ احمد سرہندیؒ، ترتیب و مقدمہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن، کراچی ۱۹۶۸ء، انگریزی مقدمہ ص ۱۸۔ ۳۰۔

۵۔ رک: التنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربی، تھانہ بھون ۱۳۴۶ھ۔ مولانا تھانویؒ نے "فصوص الحکم" کے بعض مشکل مقامات کی شرح بعنوان "خصوص الکلم فی حل مشکلات فصوص الحکم" لکھی تھی (طبع عکسی، لاہور ۱۹۰۸ء)

۶. A.E Affifi The Mystical Philosophy of .. .Ibnul Arabi. Lahore, 1964 (Cambridge, 1939).

۷. S.H. Nasr Three Muslim Sages, Cambridge, Mass., 1964, Ch. 3.

(اردو ترجمہ بعنوان "تین مسلمان فیلسوف" از مرزا محمد منور، لاہور ۱۹۷۲ء)۔ اس کے علاوہ نصر کی اپنی دیگر کتابوں بالخصوص Sufi Essays لندن، ۱۹۷۲ء، ص ۹۰۔ ۱۰۳) میں ابن العربی کے فکری پہلوؤں پر تفصیلی مباحث موجود ہیں۔

۸۔ S.A.Q. Husaini Ibn al - Arabi, the great Muslim mystic and thinker, Lahore Ashraf

________ The Pantheistic Monism of Ibn al - Arabi, Lahore, 1970.

۹۔ M. Asin Palacios: Mohidin, In Homenage e Monendez y Pelayo, Madrid 1899, vol. 2, pp. 217-56

________ La Psicologia segun Mohidin Abenarabi, In. Actes du xiv congres inter. des Orientalistes, Alger 1905 (vol. 3, Paris 1907)

________ : La Psicologia del extasis en dos grandes misticos musulmanes: Algazel y Mohidin Abenarabi en cultura Espanola, Madrid 1906, pp. 209-35.

——— El Mistico murciano Abenarabi. In BRAH. Boletin de la Academia de la Histori.

Vol. 1 Autobiografia cronologica vol. LXXXVII, Madrid 1925, pp. 96-173.

Vol. 2 Noticias Autobiograficas de su "Risalat al cods". vol. LXXXVII, pp. 512-611

Vol. 3 Caracteres generales de su sistema. vol. LXXXVIII, 1926, pp. 582-637.

Vol. 4 Su teologia y sistema del cosmos. vol. XCII, 1928, pp. 654-751.

——— El Islam cristianizado, estudio del sufismo a traves las obras Abenarabi de Murcia, Madrid 1931.

۱۰- JRAS (1906), pp 797-824.

۱۱- H.S. Nyberg Kleinere Schriften des Ibn al Arabi, Leiden 1919.

عکسی طباعت از مکتبۃ المثنیٰ، بغداد، بلا تاریخ۔ اس کتاب میں ابن العربی کے تین عربی رسائل "انشاء الدوائر"، "عقلۃ المستوفز" اور "التدبیرات الالٰھیۃ فی اصلاح المملکۃ الانسانیۃ" کا عربی متن مع اختلافات نسخ شائع کیا گیا ہے اور ابتدا میں جرمن زبان میں ایک جامع مقدمہ اور شرح شامل ہے۔ ان رسائل کا متن UPSALA اور ریلن کے مخطوطات پر مبنی ہیں۔

۱۲- R. Landau The Philosophy of Ibn Arabi, London 1959.

۱۳- Henry Corbin Creative Imagination in the Sufism of Ibn Arabi. Translated from the French by Ralph Manheim, London 1970 (Fr. Paris, 1958).

۱۴- Titus Burckhardt Cle spirituelle de l'astrologie musulmane d'apres Mohyiddin ibn Arabi, Paris 1950.

اسی مصنف کی ایک اور کتاب Introduction to Sufi Doctrines. (لاہور، ۱۹۵۹ء) میں ابن العربی کے صوفیانہ تصورات کا عکس واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ برکہارٹ نے "فصوص الحکم" کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا تھا (پیرس، ۱۹۵۵ء)۔ حال ہی میں اسے فرانسیسی سے انگریزی میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ (مطبوعہ لندن)

۱۵- Michel Valsan, In Etudes traditionnelles (Paris) 67 (1966), pp. 206-17, 241-68, 69 (1968), pp. 243-50;

71 (1970), pp. 61-70, 400, pp. 54-64, ?, pp. 73-88, 401 (1967), pp. 113-7, 404, pp. 245-55.

۱۷۔ Toshihiko Izutsu A comparative study of the key philosophical concepts of Sufism and Taoism - Ibn Arabi and Lao - Tzu, Chuang - Tzu, 2 vols, Tokyo 19

اس میں مؤلف نے ابن العربی اور تاؤازم کے مماثل اور متخالف پہلوؤں کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ بعض ترکی اور مصری محققین ابن العربی پر خاصا کام کر رہے ہیں۔ بعض ترکی کتابوں کے حوالے احمد آتش نے اپنے مضمون کی فہرست کتب میں دیئے ہیں (رک : نوٹ نمبر ۱) مصر میں بیادِ ابن العربی کے زیرِ عنوان عربی اور فرانسیسی مقالات کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے (قاہرہ، ۱۹۶۹ء) یہ کتاب ابراہیم بیّومی مدکور کی زیرِ ادارت طبع ہوئی ہے۔ ابن العربی پر ایک اور کتاب عبدالباقی سرور نے لکھی تھی (قاہرہ، ۱۹۵۵ء)۔ اس کے علاوہ اسین پلاسیوس کی ابن العربی پر ہسپانوی کتاب (رک : نوٹ نمبر ۹) کا عربی ترجمہ بعنوان " ابن عربی حیاتہ ومذہبہ" بھی شائع ہوا ہے (قاہرہ، ۱۹۶۵ء) نیز رک

M A Ayni La quintessence de la philosophie de Ibn Arabi, Paris Geuthner, 1925

رک : انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ۳ : ۷۰۸

عبدالرحمٰن بدوی کا مقالہ بعنوان Autobibliografia de Ibn Arabi (Al-Andalus 20 (1955), pp. 107-28).

۱۸ فہرست مؤلفات محیی الدین عربی (مجلۃ المجمع العلمی العربی (دمشق) ۲۹ (۳ (۱۹۵۴ء)، ص ۳۴۴ - ۳۵۹، ۵۲۶ - ۵۴۲؛ ۳۰ (۱۹۵۵ء)، ص ۵۱-۷۰، ۲۴۸ء ۳۰۰ء ۳۹۵ - ۴۱۰م) دمشق کے اس رسالے کا فرانسیسی عنوان یہ ہے:

Revue de l'Academie Arabie de Damas (RAAD)

مطبوعہ بذیل عنوان " مناقب ابن عربی" تألیف الشیخ المرشد ابراہیم بن عبداللہ القاری البغدادی بتحقیق الدکتور صلاح الدین المنجد، بیروت ۱۹۵۹ء، ص ۴۶ - ۶۳۔ اس نادر کتاب کا مخطوطہ کتاب خانۂ بانکی پور (پٹنہ) میں موجود تھا اور مطبوعہ متن اسی نسخے کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔

فہرست مؤلفات ابن عربی (مجلۂ کلیۂ آداب دانشگاہ اسکندریہ) ۸ (۱۹۵۴ء) ص ۱۹۳ - ۲۰۷ (عربی متن) + ص ۱۰۹ - ۱۱۷ (انگریزی متن)

عثمان یحییٰ کی کتاب کے لیے رک : نوٹ ۳

استانبول کے حبی کتب خانے سے " فتوحات " کا زیرِ نظر نسخہ ملا ہے، اسی میں " فصوص " کا بھی ایک مخطوطہ موجود

ہے، جس کی کتابت ۶۳۰ھ/۲۳۲ا۔ ۱۲۳۳ء میں ہوئی۔ اسے ابن العربی کی موجودگی میں پڑھا گیا اور اس پر اُن کے دستخط موجود ہیں (نمبر۱۹۳۳)۔ رک: انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۳: ۷۰۹۔ اردو میں اس کا پہلا ترجمہ برکت اللہ فرنگی محلی نے کیا تھا، جو کچھ عرصہ قبل کراچی سے از سرِ نو طبع ہوا تھا۔ ایک اور ترجمہ جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) سے بھی شائع ہوا تھا۔ (از عبدالقدیر صدیقی، طبع عکسی، لاہور ۱۹۷۹ء)

Hans Kofler Das Buch der Siegelringstein der Weisheit, Graz 1970.

۲۵۔ مولانا جامی نے لکھا ہے کہ خواجہ برہان الدین ابو نصر پارسا اُن سے فرمایا کرتے تھے:

" والا مای فرمود کہ فصوص جان است و فتوحات دل"۔ (نفحات الانس، ص ۴۰۹)

۲۶۔ رک: الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، تالیف عبدالحی الحسنی، دمشق ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء، ص ۱۸۷ - ۱۸۸؛ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور ہندوستان (در "تاریخی مقالات" از پروفیسر خلیق احمد نظامی، دہلی ۱۹۶۶ء، ص ۱۔ ۳۸)؛ ڈاکٹر زبید احمد کی کتاب بعنوان

The Conribution of India to Arabic Literature, Allahabad 1945.

علاوہ اس کا اردو ترجمہ شائع کردہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور

۲۷۔ گرنیپ، رک: نوٹ نمبر ۳، ص ۴۔

۲۸۔ الشعرانی کتاب الیواقیت، قاہرہ ۱۳۰۵ھ، ۱: ۳۱ (باب ۸۹ اور ۳۴۸ کے مطابق)۔ نیز رک: گرنیپ، محولہ بالا، ص ۴۔

۲۹۔ رک: نوٹ نمبر ۳

۳۰۔ Louis Massignon

۳۱۔ (C.N.R.S) Centre National de la Recherche Scientifique.

۳۲۔ Mission en Turquie. Recherches sur les manuscrits du soufisme. (Revue de etudes islamiques 26 (1958), pp. 11-64). Cf. Les manuscrits arabes dans le monde.

Une bibliographie des catalogues par A.J.W. Huisman, Leiden 1967, p. 70.

۳۳۔ نمبر ۳۰۹ - ۳۲۵ (بحوالہ براکلمان ذیل ۱: ۷۹۲)؛ نمبر ۱۸۵۵ - ۱۸۸۱ (بحوالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۳: ۷۰۹)؛ موجودہ نمبر ۱۴۳۶ - ۱۴۶۲۔

۳۴۔ اسے Turk ve Islam Eserleri Muzesi بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں استامبول کے مختلف کتاب خانوں سے انتہائی نفیس اور نادر پانچ سو مخطوطات کو اکٹھا کیا گیا ہے، رک:

Fuat Sezgin: Geschichte des arabischen Schrifttums,
vol.1, Leiden 1967, p. 760.

۳۵۔ رک : نوٹ نمبر ۲

۳۶۔ بحوالہ ایضاً ، ۲ : ۴۸۸ - ۴۹۱ (نمبر ۳۸)

۳۷۔ مطبوعہ در : المشرق (بیروت) ۶۰ (۱۹۶۶ء) ص ۱۰۳ - ۱۱۹ ، ۲۰۶ - ۲۳۸ ، ۳۳۳ - ۳۷۰ ، ۴۱۹ - ۵۱۸ ، ۶۶۷ - ۷۰۴ ؛ ۶۱ (۱۹۶۷ء) ، ص ۳ - ۶۳ ، ۱۴۷ - ۲۲۷ ، ۲۷۹ - ۳۲۵ ، ۴۵۷ - ۵۳۶ -

۳۸۔ Regis Blachere

۳۹۔ R. Brunschvig

۴۰۔ Henri Laoust

۴۱۔ Georges Vajda

۴۲۔ رک : عثمان یحییٰ کی کتاب ، ذیلی نوٹ نمبر ۲ (جلد اول ، ص ۱۱ ، تحتی نوٹ)

۴۳۔ Ecole des Hautes Etudes

۴۴۔ کربن ، ذیلی نوٹ نمبر ۱۳ (ص ۱۴۲ - ۱۴۵ ، ۴۸۴ تحتی نوٹ ۲)

۴۵- J Berque et J - P Charnay (eds) Normes et valeurs dans l'Islam contemporain, Paris Payot, 1966, "Sur la notion de "Walayat" en Islam shi ite", par H Corbin, p 47

۴۶- Histoire de la philosophie musulmane,
Paris Gallimard, 1964 (paperback)

۴۷- Amoli La philosophie shi ite, 1 Sommes des doctrines esoteriques (جامع الاسرار) 2. Traite de la connaissance de l'etre (فی معرفۃ الوجود). Textes publies avec une double Introduction et Index. Teheran/Paris· Adrien-Maisonneuve, 1969—Bibliotheque iranienne No 16 pp 76,832.

عربی عنوان : " کتاب جامع الاسرار و منبع الانوار " بہ انضمام " رسالۃ نقد النقود فی معرفۃ الوجود " - اول الذکر کتاب کے تنقیدی مطالعہ کے لیے رک :

۴۸- Zur Theologie der Schi a. By Peter Antes,
Freiburg im Breisgau, 1971

Amoli· Le texte des textes (Nass al-nosus). Commentaire des "Fosus al-hikam" d'Ibn Arabi. Les "Prolegomenes". Publ. avec une double introduction et un quintuple index. Tome 1 Texte et double introduction. Teheran/Paris Adrien-Maisonneuve, 1975, pp. 80, 545, 32, 46-Bibliotheque iranienne, 22.1.

۴۹- ان کا سنۂ وفات متعین نہیں۔ ابن حجر العسقلانی نے لکھا ہے کہ وہ ۸۱۳ھ/۱۳۰۹ء میں زندہ تھے (لسان المیزان حیدر آباد دکن ، ۵ (۱۳۳۱ھ) : ۲۰۸ - ۲۱۰) اور الذہبی کے خیال میں ان کی وفات ۸۰ سال کی عمر میں ہوئی (تذکرۃ

الفاظ، ۴ جلد، حیدرآباد دکن ۱۹۵۵ء – ۱۹۵۸ء، جلد دوم، ص ۶۴۵) ۔ رک : ستیسنرگن (بحوالۂ نوٹ نمبر ۴۴) ۱ : ۶۵۳ – ۶۵۹؛ براکلمان ۱ : ۱۹۹ وذیل ؛ ماسینوں در : انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (طبع اول) ۴ : ۸۶۳؛ عثمان یحییٰ کا مقدمہ ذیل متن، ص ۱۳ – ۳۲۔

۵۰. L'oeuvre de Tirmidi, essai bibliographique.
(Melanges L. Massignon, vol 3, Damas 1957, pp. 411-78)

۵۱۔ المشرق (بیروت) ۵۲ (۱۹۶۰ء)، ص ۳۸۰ – ۴۰۰

۵۲۔ Al-Tirmidi Kitab Hatm al-auliya, edite par O Y
Beyrouth Imprimerie catholique 1965, pp. 8, 586-
Recherches publiees sousla direction de l'
Institute de Lettres Orientales de Beyrouth, Tome 19.

۵۳. Josef van Ess, in Der Islam (Berlin) 43/1-2 (1967), pp. 159-64.

۵۴ – Index Islamicus

۵۵ a) Aspects interieurs de l'Islam. (In Normes (see note 45), pp. 15-37)

مقالے کے آخر میں بعض اشعار کا فرانسیسی ترجمہ بھی دیا گیا ہے ۔

b) La condition humaine en Islam (Ibid , pp 48-67)

جابجا حلاج اور ابن العربی کے نظریات سے بحث کی گئی ہے ۔

c) Textes historiques concernant le monotheisme dans la pensee musulmane (In Arabic)

(In Memorial Ibn Arabi. Ed. Dr. Ibrahim Madkour, Cairo 1969, pp. 228-76).

d) الحکمۃ المتعالیۃ فی الاسلام (نصوص تاریخیۃ لم تنشر)

(Melanges I Madkour, vol 1, Cairo 1976, pp. 203-80)

۵۶۔ "فتوحات" کے اس ایڈیشن کی پانچویں جلد بھی شائع ہو گئی ہے (۱۹۷۷ء، صفحات ۴۵۹)۔ ابھی اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا، اس لیے اس کے مندرجات کو یہاں شامل نہیں کیا گیا۔

۵۷ [unclear]. Manfred Profitlich Die Terminologie Ibn Arabis im "Kitab wasa il as sa il" des Ibn Saudakin Text, Ubersetzung und Analyse Freiburg Verlag Klaus Schwarz, 1973 pp. 276

ابن سودکین کا سنۂ وفات ۶۴۶ھ ہے

۵۸۔ اس عنوان کے تحت زیادہ تر "فتوحات" کے ان قلمی نسخوں کے حوالے دیئے گئے ہیں، جو ترکیہ کے مختلف کتاب خانوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں بخوف طوالت اور بعض طباعتی دشواریوں کے باعث ان کتب خانوں (مطبوعہ، غیر مطبوعہ فہارس) کے مکمل حوالے درج نہیں کیے گئے، صرف کتب خانے کا نام اور مخطوطے کا نمبر لکھ دیا گیا ہے۔

طلائی تثلیث

رشید نثار

"طلائی تثلیث" کی یہ خوبصورت ترکیب جدید ناشرین، لاہور، نے ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" کے لئے بڑی خوبی سے استعمال کی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں جو تعارف لکھا گیا ہے۔ اس کے چند جملے یہ ہیں۔

"ڈاکٹر وزیر آغا برصغیر پاک و ہند کے ان چند گنے چنے قلمکاروں میں سے ہیں، جن کی تحریروں میں ہمیشہ تنقید، تحقیق اور تخلیق کا ایک دلآویز امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ موجودہ کتاب میں یہ طلائی تثلیث اسی بھرپور چمک دمک کے ساتھ نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنے اچھوتے موضوع سے انصاف برتنے کے لئے تاریخ، عمرانیات، فلسفہ، نفسیات، اور ادب کے بیکراں سمندروں کو کھنگالا ہے۔ ان کی تاریک تہوں میں غوطہ زنی کی ہے اور اپنے ذہن رسا کی جودت کے طفیل وہاں سے ایسے ایسے گوہروں کے حصول میں کامیاب ہوئے ہیں جن کے مشاہدے سے قارئین کی نگاہیں خیرہ ہوتی ہیں! ڈاکٹر وزیر آغا نے زیر نظر کتاب کے توسط سے اصول انتقادیات میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر میں مطالعہ کرنے کا رواج تو دیرینہ ہے مگر ڈاکٹر وزیر آغا نے پہلی مرتبہ شاعری کا ثقافتی اور تہذیبی پس منظر میں محاکمہ کرنے کا تجربہ کیا ہے یہ تجربہ جس حکیمانہ بصیرت اور دانشورانہ بے باکی سے کیا گیا ہے اس سے نہ صرف ہمارے موجودہ فن تنقید کا کئی جہتوں سے متاثر ہونا ناگزیر ہے بلکہ مستقبل کے ادبی ناقدین کے لئے بھی اس کا حوالہ دیئے بغیر آگے بڑھنا ناممکن ہو جائے گا۔"

اور کچھ ہی عرصہ بعد اس کتاب کے تبصروں پر مشتمل ایک اور کتاب "اردو شاعری کا مزاج۔ معاصرین کی نظر میں" منصۂ شہود پر آئی۔ یہ کتاب بھی ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب کی طرح خاصی دلچسپ ہے۔ اس کتاب کی دو خوبیاں منفرد ہیں۔ اول یہ کہ آج تک برصغیر پاک و ہند میں کوئی ایسی کتاب شاید ہی شائع ہوئی ہو جو کسی ایک کتاب کے تبصروں پر مشتمل ہو اور اصل کتاب سے اس طرح وابستہ ہو" جیسے ماں سے بچہ" دوم بدقسمتی سے اس کتاب کے تجزیہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے مقصود، اصل کتاب یعنی" اردو شاعری کا مزاج" اور اس کے مصنف کو نمایاں کرنا ہے کیونکہ جہاں بھی کسی اہل قلم نے" اردو شاعری کا مزاج" کے مصنف سے اختلاف کرنے کی کوشش کی ہے، تبصروں والی کتاب کے مولف نے اس کی خوب خبر لی ہے۔ یہاں تک کہ پڑھے لکھے لوگوں میں جو ایک حدِ ادب اور رکھ رکھاؤ ہوتا ہے

اس کو بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے[1] اور شاید اس خوف سے اس موضوع پر ایک سکوت سا طاری ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دوسری کتاب کے مؤلف سے صحت مند اختلاف کے راستے جبراً مسدود کرنے کی کوشش کی ہے جو نہ تو ناقدانہ روش ہے اور نہ ہی عالمانہ طریقِ کار۔

زیرِ نظر مضمون میں ڈاکٹر وزیر آغا کی مذکورہ تصنیف پر ایک نظر ڈالنا مقصود ہے۔ یوں تو کتاب کی سطر سطر "دعوتِ فکر و نظر" دیتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کے ہر چھوٹے بڑے بیان پر بحث شروع ہو جائے تو معاملہ بہت طول کھینچ جائے گا۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب میں پیش کردہ چند بنیادی نظریات پر ایک نگاہ ڈال لی جائے ان نظریات میں سے مندرجہ ذیل موضوعات خصوصاً اہم ہیں۔

۱۔ نظریۂ تکوینِ کائنات

۲۔ نظریۂ وقت

۳۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب، اس میں دراوڑی عناصر اور آریاؤں کے معاشرے اور مذہب پر ان کے اثرات، نیز وادیٔ سندھ میں مادری نظام کے شواہد۔

۴۔ بدھ ازم دراوڑی عناصر کے خلاف بطور ایک آریائی ردعمل کے۔

ان صفحات میں ہم انہی موضوعات کا ایک نہایت سرسری جائزہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

کتاب دل کی دھڑکن کے طبی عمل سے شروع ہوتی ہے۔ فاضل مصنف فرماتے ہیں:۔

"دل کی دھڑکن کو (جو بسط اور قبض کی حرکات پر مشتمل ہے) زندگی اور اس کے رکنے کے عمل کو موت کا نام دینے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن جس طرح حرکت ابدی نہیں، بالکل اسی طرح موت بھی دائمی نہیں۔ اس موت یا عدم سے دوبارہ حرکت جنم لیتی ہے جو پھیلنے اور سمٹنے کے بعد پھر عدم میں ضم ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ ازلی ابدی ہے۔" (ص ۱۱)

"کائنات کے بارے میں بھی سائنس کا جدید ترین نظریہ قریب قریب یہی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق کائنات کا آغاز ایک ایسے بے حد گنجان ذرے سے ہوا۔ جس میں کائنات کا مادہ یکجا تھا۔ یہ ذرہ جب پھٹا تو اس کے اجزا لاکھوں کہکشاؤں کی صورت میں منتشر ہو گئے اور باہر کی طرف تیزی سے دوڑنے لگے۔ یہ اجزا آج تک باہر کی طرف رواں ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات کی تخلیق کا عمل ابھی جاری ہے لیکن سائنس سیدھی لکیر کو ایک دائرہ قرار دیتی ہے جس سے یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے

---

[1] سجاد نقوی: اردو شاعری کا مزاج — معاصرین کی نظر میں"۔ جدید ناشرین۔ لاہور ۱۹۶۸ء/ص ۲۳، ۲۴، ۲۶، ۲۸، ۳۰، ۳۲، ۱۹۵ — ۱۹۹، ۲۰۶ — ۲۱۱ وغیرہ۔ ان صفحات پر حاشیہ میں درج عبارات انتہائی دلچسپ ہیں اور خصوصی توجہ کی مستحق۔

کہ پھیلاؤ کی یہ کیفیت سدا قائم نہیں رہے گی۔ بلکہ ایک معین عرصہ کے بعد جب دھچکے کا اثر زائل ہو جائے گا تو ابتدائی ذرے کے اجزا اصل کی طرف لوٹنے لگیں گے اور بالآخر سمٹ کر ابتدائی ذرے میں یکجا ہو جائیں گے۔ پھر عدم کا ایک طویل وقفہ آئے گا۔ جس کے بعد تخلیق کا دوسرا دھماکہ ہوگا اور یہ سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو جائے گا گویا جس طرح انسانی دل بسط اور قبض اور عدم کے پھیر میں گرفتار ہے، بالکل اسی طرح ساری کائنات ایک دائرے کے عمل میں مبتلا ہے۔" (ص ۱۲)

ان دونوں اقتباسات کا تقابل کائنات کے بارے میں ہندو نظریات سے کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ رادھا کمل مکرجی ایک جگہ کائنات کی تخلیق کے ہندو نظریات کو یوں پیش کرتے ہیں۔

"THE UNIVERSE IS NOT CREATED BUT THERE ARE PULSATIONS AT MANIFESTATIONS AND WITHDRAWALS, EVOLUTION AND INVOLUTION OF THE GREAT-BEING OF THE UNIVERSE IN THE ENDLESS SEARCHES OF TIME AND THE INFINITUDE OF SPACE"[۱]

اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کا مخصوص ماخذ باشم یوں رقمطراز ہے۔

"IN ALL INDIAN COSMOLOGIES THE UNIVERSE IS CYCLIC OVER AN ENORMOUS PERIOD OF TIME (MAHAKALPA) IT GOES THROUGH A PROCESS OF EVOLUTION AND DECLINE ONLY TO EVOLVE ONCE MORE"[۲]

یہ دو اقتباسات آئینے ہیں جن میں ڈاکٹر صاحب کی سوچ کی نہج کا تعین ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ جس نظریہ پر انہوں نے اپنے خیالات کی بنیاد رکھی ہے۔ اسے وہ سائنس کا جدید ترین "نظریہ" قرار دیتے ہیں اور ہمارے پیش کردہ اقتباسات پر مکمل مابعد الطبیعیاتی سوچ کا رنگ غالب ہے۔

اس بات سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندو مذہب (اگر اسے مذہب کہا جا سکتا ہے[۳]) دنیا کے قدیم ترین

ل R. MUKERJEE, THE CULTURE AND ART OF INDIA, ALLEN AND UNWIN, LONDON, 1959, p . 40

۲ BASHAM, THE WONDER THAT WAS INDIA, SIDGWICK AND JACKSON, LONDON, 1954, p.272.

۳ SEN, HINDUISM, PELICAN, LONDON, 1961, p.37
'IT IS THE RECOGNITION OF MANY PATHS, EACH VALID IN ITSELF BUT NONE ALONE COMPLETE, THAT GIVES HINDUISM ITS IMMENSE VARIETY. THE RELIGIOUS BELIEFS OF DIFFERENT SCHOOLS OF THOUGHT VARY AND THEIR RELIGIOUS PRACTICES ALSO DIFFER;

مذاہب میں سے ہے۔ اس مذہب کے ماننے والوں نے کائنات کے بارے میں زمانۂ قدیم میں ہی چند نظریات قائم کر لئے تھے اور ان میں ترمیم و تنسیخ کے بعد آج بھی ان کے ماننے والے موجود ہیں۔ لیکن یہ سوچ انسانی سوچ کی انتہا نہیں ہے۔ دنیا ان نظریات سے کہیں آگے بڑھ چکی ہے۔ انہی موضوعات پر خصوصاً سائنس کے میدان میں نئے مشاہدات کے پیش نظر نئے نظریات تخلیق ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کائنات کے اہم انکشافات میں شمار ہوتے ہیں۔

دھماکے کے نظریۂ تکوینِ کائنات کے ماننے والے صرف ڈاکٹر صاحب ہی نہیں ہیں بلکہ جب LEIMETRE اور GAMOW اس نظریہ کی ترتیب و اشاعت میں معروف تھے تو علمائے مذہب نے اس نظریہ کو خدا کی موجودگی کے ثبوت کے لئے ایک سائنسی شہادت خیال کیا تھا۔ یہاں تک کہ پوپ PIUSXII کے نزدیک یہ نظریہ انجیل مقدس کی صداقت کا ایک بیّن ثبوت تھا لیکن اس نظریہ کے بانیوں کے ذہن کے کسی گوشے میں خدا کے وجود یا عدم وجود کے بارے میں کوئی سوال نہیں تھا۔ چنانچہ دھماکے کا نظریہ تکوینِ کائنات، اس موضوع پر مذہبی نظریات کے زیادہ قریب ہے۔ اور اس کی مقبولیت کے عوامل میں سے ایک امر یہ بھی ہے۔ مزید برآں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر انسان اور پوری انسانیت اپنے مشاہدات کے زندان میں بند ہے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہر چیز کی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا ہے اور اس نظریہ میں دونوں چیزیں موجود نظر آتی ہیں۔ اس وجہ سے یہ عوام میں اور کسی حد تک خواص میں بھی مقبول ہے۔

لیکن کسی نظریہ کی مقبولیت ہی اس کی صداقت کی دلیل نہیں ہوتی۔ اس نظریہ کے علاوہ تکوینِ کائنات کے اور نظریات بھی ہیں۔ جن میں STEADY STATE کا نظریہ OSCILLATING UNIVERSE کا نظریہ اور ارضانیت کا نظریہ وغیرہ شامل ہیں اور پھر دھماکے والے نظریہ میں چند ایسی کمزوریاں پائی جاتی ہیں، جن کا تسلی بخش جواب اس کے وضع کرنے والے ابھی تک نہیں دے پائے باوجود اس امر کے کہ وہ وقتاً فوقتاً حسب ضرورت اس میں ضروری ترمیمات کرتے رہے ہیں۔ ان کمزوریوں یا خامیوں کا مختصر

THERE IS IN IT MONOISM, DUALISM, MONOTHEISM, POLYTHEISM, PANTHEISM AND INDEED A GREAT STORE HOUSE OF ALL KINDS OF RELIGIOUS EXPERIMENTS".

اسی ضمن میں مزید دیکھیں اسی کتاب کا ص ۱۴، چیمبرز انسائیکلوپیڈیا۔ بذیل مادہ۔ ہندوازم۔ جواہر لال نہرو۔ ڈسکوری آف انڈیا۔ ص ۴۰۵۔ داس گپتا۔ ہسٹری آف انڈین فلاسفی۔ کیمبرج۔ ص ۲۱۔

لے

(i) JAGJIT SINGH, MODERN COSMOLOGY, PELICAN, REPRINT 1971, p. 162-167.

(ii) TOULMAN & GOODFIELD, DISCOVERY OF TIME, PELICAN, 1967, p. 319.

احوال درج ذیل ہے۔

۱۔ جب اس نظریہ کی رو سے ہم عناصر یا دھاتوں کی ترکیب و تخلیق کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یہ نظریہ اس وقت تک تو ہمارا ساتھ دیتا ہے۔ جب ہم ان دھاتوں کو دیکھتے ہیں جن کا ATOMIC وزن ایک سے چار تک ہے لیکن ایسی دھاتوں کی تخلیق، جن کا جوہری وزن ۴ سے ۸ تک یا ان کے درمیان ہے[1] یہ نظریہ باوجود مختلف نزامیم کے اور ASTROPHYSICS کی مدد کے، کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا اور اس امر کا اعتراف اس نظریہ کے وضع کرنے والوں کو بھی ہے۔

۲۔ کائنات میں موجود ہیلم کے حجم اور مقدار کے بارے میں بھی یہ نظریہ کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیتا۔ اس نظریہ کے مطابق کائنات میں ہیلم کا وزن کمیت کے اعتبار سے ۲ سے ۳۰ فیصد ہے جو مشاہدات کے پیش نظر بہت زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ قدیم ستاروں کو سائنس دان POPULATION II ستارے کہتے ہیں اور یہ ہیلم سے مرکب مادہ کے انجماد سے وجود میں آئے۔ ان کی سطح پر کمیت کے اعتبار سے ہیلم صرف اتنا ۲ فیصد نظر آتی ہے۔ چنانچہ دھماکے والے نظریۂ تخلیق کائنات میں یہ بہت بڑا رخنہ ہے[2]۔

۳۔ اس نظریہ کی رو سے کائنات میں مادہ کی مقدار معین ہے اور یہ مادہ کبھی فنا نہیں ہوتا۔ یہ امر اس نظریہ کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ لیکن سائنس میں نظریاتی انقلاب کے بعد مادہ کا تصور بھی بدل گیا ہے اور آئن سٹائن نے جو انقلاب برپا کیا ہے اس کے پیش نظر مادہ کا یہ تصور بالکل باطل ہو جاتا ہے۔ آئن سٹائن نے ثابت کر دیا ہے کہ مادہ توانائی میں اور توانائی مادہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس خیال کی وضاحت کے لئے ان کی مندرجہ ذیل مساوات جدید سائنس کا بنیادی ستون بن چکی ہے۔

$E = MC^2$ جہاں E توانائی، M مادہ اور C روشنی کی رفتار کا ثابتہ ہیں۔ اس مساوات کا عملی مشاہدہ ہم ناگاساکی اور ہیروشیما میں کر چکے ہیں کہ مادہ ایک سیکنڈ میں تابکاری کی صورت میں توانائی اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس عمل یعنی توانائی کا مادہ میں تبدیل ہونا اتنی تعجیل سے وقوع پذیر نہیں ہو پاتا اس لئے مادہ کا ناقابلِ فنا ہونے کا مفروضہ ایک حد تک باطل ہو جاتا ہے مزید برآں مادہ کے بارے میں ہمارے تصورات آج وہ نہیں ہیں جو ایٹمیدوں اور پہلانوں کے زمانے میں تھے۔ آجکل مادہ یعنی MATTER کے تصور کے ساتھ ساتھ ANITMATTER کا تصور بھی معرض وجود میں آچکا ہے[3] اور الیکٹرون اور پروٹون کے فنا ہونے کے مواقع موجود دکھائی دیتے ہیں۔ ایڈنگٹن کے خیال

---

[1] جگجیت سنگھ محولہ بالا۔ ص ۱۶۳، ۳۰۶، ۳۰۷۔ اس نظریہ کو بچانے کی کوشش کے لئے دیکھیں اسی کتاب کا ص ۳۰۸

[2] جگجیت سنگھ، ص ۳۰۷۔ [3] ایضاً باب ۱۳۔

کے مطابق ان دونوں کے فنا ہونے سے جو توانائی حاصل ہوتی ہے، وہی ستاروں کی توانائی کا منبع ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس عمل سے مادہ فنا نہیں ہوتا بلکہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن توانائی کی CONSERVATION بھی تو ایک GENERALIZATION ہی ہے اور سو فیصد درست نہیں ہے[1] بحث کو اگر آگے بڑھائیں تو ڈاکٹر صاحب کی پیش کردہ ہندوؤں کے "پرش اور پراکرتی" کے تصورات کی دوئی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

۴۔ اس نظریہ کی رو سے جس کے ڈاکٹر صاحب موید ہیں۔ زمین کی عمر ۲ بلین سال مقرر ہوتی ہے۔ لیکن بعد کے مشاہدات کے پیش نظر خصوصاً علم الارض نے زمین کی عمر ۴ سے ۵ بلین سال معین کی ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کے اختراع کرنے والوں کو اپنے خیالات میں مناسب تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ آجکل نظریہ اضافیت کے تحت کائنات کی عمر دس سے تیرہ بلین سال فرض کی جاتی ہے اور ریڈیو ایکٹو RADIO ACTIVE عناصر کے لحاظ سے کائنات کی عمر سات سے پندرہ بلین سال بنتی ہے۔ اگرچہ یہ اندازہ اس بات پر منحصر ہے کہ یہ کائنات دھماکے سے وجود میں آئی یا یہ عناصر رفتہ رفتہ ASTROPHYSICAL[1] عمل کے تحت وجود میں آئے[2] چنانچہ ان مشاہدات کا کوئی خاطر خواہ جواب دھماکے والا نظریہ، جس پر ڈاکٹر صاحب اپنے خیالات کی بنیاد رکھتے ہیں، کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیتا۔

۵۔ اس نظریے کے علاوہ، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، تکوین کائنات کے اور بھی نظریات ہیں۔ مثلاً ہائل HOYLE اس بات کا داعی ہے کہ یہ کائنات ازلی ابدی ہے۔ اس کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ ہی انتہا۔ مادہ باقاعدگی سے فنا ہو رہا ہے اور اسی باقاعدگی سے تخلیق بھی ہو رہا ہے۔ اس نظریہ کی تائید کرنے والے بھی بہت سے سائنس دان ہیں۔ لیکن یہ نظریہ بھی تخلیق کائنات کے رازہائے سربستہ کے انکشافات سے اتنا ہی معذور ہے جتنا کہ ڈاکٹر صاحب کا دھماکے کا نظریہ[3]

۶۔ ان نظریات کے علاوہ KLIEN اور DIRAC نے مادہ کا نیا تصور پیش کیا ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق اس کائنات میں جتنی مقدار مادہ کی ہے اتنی ہی مقدار میں ANTI-MATTER بھی موجود ہے۔ ان دونوں کے ملنے سے مادہ توانائی میں تبدیل ہو کر فنا ہو جاتا ہے اگرچہ یہ ایک دلچسپ بحث ہے[4] لیکن اس

---

[1] BERTRAND RUSSELL, ANALYSIS OF MATTER, ALLEN & UNWIN, LONDON, 1954, p. 168.

[2] جگجیت سنگھ ص ۱۹۴، حاشیہ، اور ص ۲۰۲، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸

[3] HOYLE NATURE OF UNIVERSE, PELICAN, LAST TWO CHAPTERS AND FRONTIERS OF ASTRONOMY, LAST TWO CHAPTERS.

[4] جگجیت سنگھ ص ۲۰۳ تا ۲۰۷ - مزید ملاحظہ ہو پروفیسر عبدالسلام، اقبال میموریل لیکچر جو انہوں نے اپریل، مئی ۱۹۶۵ء میں ریڈیو پاکستان پر اس موضوع پر دیئے۔

کی مزید وضاحت کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ بہرحال ان خیالات پر مبنی کائنات کا ماڈل بھی کما حقہٗ، کائنات کے تمام مشاہدات کا خاطر خواہ جواب نہیں دے پاتا اور یہ نظریہ بھی اتنا ہی ناقص یا کامیاب ہے، جتنا کہ دھماکے والا نظریہ۔

۷۔ ان نظریات کے علاوہ اضافیت پر مبنی کائنات کا ماڈل تیار کیا گیا ہے۔ یہ نظریہ بھی STEADY STATE کے نام سے ہی موسوم ہے۔ اگرچہ مادہ اس نظریہ میں بہت اہمیت کا حامل ہے، لیکن اس نظریہ کے مطابق مادہ کا "گمان ذرے" کی صورت میں ہونا ناممکن ہے۔ آئین سٹائن کے خیال کے مطابق یہ کائنات اگرچہ محدود ہے لیکن مسلسل پھیل رہی ہے ایک غبارے کی طرح جس میں متواتر ہوا بھری جا رہی ہو۔ اس غبارے کا پھیلاؤ اور انحنا بھی اس مادہ کی اس مقدار پر منحصر ہے۔ جو اس کائنات میں موجود ہے۔ ہم اس کائنات کا حجم بھی ناپ سکتے ہیں اور اس کا نصف قطر بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ نصف قطر کا انحصار کائنات کے انحنا پر منحصر ہے۔ انتہائی محتاط تجربات کی بنا پر ایڈون ہبل اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اس کائنات میں مادہ کی مقدار ۰۰،۲ گرام فی کیوبک سینٹی میٹر ہے اس سے آئن سٹائن کے خیالات کے مطابق اس کائنات کا نصف قطر ۳۵ بلین نوری سال بنتا ہے[۱] اور یہ اس قدر وسیع و عریض علاقہ ہے کہ اس میں کروڑوں کہکشائیں بڑی آسانی سے سما سکتی ہیں اور اسی انداز میں متحرک رہ سکتی ہیں جیسا کہ یہ اس وقت ہیں عام فہم زبان میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روشنی کی ایک کرن اپنی تسلیم شدہ رفتار کے مطابق ایک نقطہ سے اپنے سفر کا آغاز کرے تو وہ ۲۰۰ بلین سال میں اپنا سفر ختم کرنے کے بعد اپنی روانگی کے مقام پر پہنچ جانے گی وقت کے اعتبار سے، جو ہندوؤں نے کائنات کی زندگی کے لئے متعین کیا تھا، اگر اس مقدار سے تقابل کریں تو کئی دلچسپ نتائج برآمد ہوں گے۔ یہاں اس امر کا اعادہ بھی ضروری ہے کہ آئن سٹائن کے ہاں اگرچہ مادہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے لیکن اس کا ایک "بے حد گنجان ذرے" کی صورت میں ہونا نہیں پایا جاتا اس کی وضاحت رسل نے ان الفاظ میں کی ہے[۲]

"MATTER AS IT APPEARS TO COMMON SENSE, AND AS IT HAS UNTIL RECENTLY APPEARED IN PHYSICS, MUST BE GIVEN UP THE OLD IDEA OF MATTER WAS CONNECTED WITH THE IDEA OF 'SUBSTANCE', AND THIS, IN TURN WITH A VIEW OF TIME THAT THE THEORY OF RELATIVITY SHOWS TO BE UNTENABLE. THE OLD VIEW WAS THAT THERE IS ONE COSMIC TIME AND THAT . . . .THUS TIME IS NOT COSMIC BUT IT IS TO SOME EXTENT INDIVIDUAL AND PERSONAL FOR EACH PIECE OF MATTER "

ل i. SULLIVIAN, BASIS OF MODERN SCIENCE, PELICAN, 1938, p 190

ii. BARNETT, THE UNIVERSE & DR EINSTEIN, NEW YORK, p 98

ع RUSSELL, AN OUTLINE OF PHILOSOPHY, SIXTH IMPRESSION ALLEN & UNWIN, LONDON, p. 164, 165

باوجود اس امر کے نظریہ اضافیت مشاہدات سے کہیں زیادہ قریب ہے اور اس نظریہ کے تحت کی گئی پیش گوئیاں درست ثابت ہو چکی ہیں اور اہل علم اس نظریہ پر بہت اعتقاد رکھتے ہیں۔ مگر اس نظریہ میں وہی ساری کمزوریاں یا خوبیاں پائی جاتی ہیں جو تکوینِ کائنات کے دوسرے نظریات ہیں[1]

۸۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مندرجہ بالا اقتباس میں فرمایا ہے کہ "سائنس خط مستقیم کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی" اور اس لئے یہ تمام اجرام فلکی جو ابتدائی گنجان ذرے کے پھٹنے سے باہر کی طرف تیزی سے دوڑ رہے ہیں اور واپس اسی مقام پہ پہنچ جائیں گے جہاں سے وہ روانہ ہوئے تھے۔ ان کا یہ بیان بھی محل نظر ہے۔ اوّل اس وجہ سے کہ دھماکے کے نظریہ کے تحت کائنات کے اجزا اس لئے دوبارہ اکٹھے نہیں ہوں گے کہ وہ خط مستقیم کی بجائے دائرہ یا قوس میں حرکت کر رہے ہیں، بلکہ ان کو دوبارہ اکٹھا کرنے والی قوت کششِ ثقل ہی ہے اور اس کے بعد دوسرا دھماکہ پیدا کرنے والی قوت بھی اسی کششِ ثقل کے تحت وجود میں آئے گی۔ چنانچہ جب "ذرہ" گنجان سے گنجان تر ہو گا تو اس کا اندرونی دباؤ بڑھ جائے گا جس سے حرارت پیدا ہو گی اور وہ دوسرے دھماکے کا باعث بنے گی۔

دوئم ان کا یہ بیان ذہنی سادگی کی غمازی کرتا ہے کہ کسی خط کے مستقیم یا منحنی ہونے کا دارومدار اس امر پہ ہے کہ آپ کے ذہن میں مکان کا تصور کیا ہے اگر آپ اقلیدس کے تصور کے قائل ہیں اور کئی لوگ آج بھی اس تصور کے قائل ہیں، تو خط مستقیم موجود ہے۔ لیکن اگر آپ اس سے اتفاق نہیں کرتے اور مکان میں انحنا کے قائل ہیں تو مشکلات بڑھ جاتی ہیں اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ منفی انحنا کے قائل ہیں یا مثبت کے۔ اگر آپ مثبت انحنا کو مانتے ہیں تو روشنی کی کرن اپنے مقام روانگی پہ واپس آسکتی ہے اور اگر آپ منفی انحنا کے قائل ہیں تو اس خط کا یا روشنی کی کرن کا روانگی کے مقام پہ واپس پہنچنا ممکنات میں سے ہے۔ ان امور کے علاوہ اگر آپ اجرامِ فلکی اور کائنات کی SPIRAL حرکت کے بھی قائل ہیں تو اس خط کا اپنے نقطۂ آغاز پر پہنچنا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔ واضح رہے کہ صرف زمین کی ابھی تک تیرہ مختلف حرکات دریافت ہو چکی ہیں[2]

یہ نظریہ کائنات کی تخلیق کے متعلق ان نظریات کے علاوہ ہیں جن پر اسلامی تفکر کا سایہ ہے اور جس کی ایک ہلکی سی جھلک بیع البدعة میں نظر آتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تکوینِ کائنات کے اتنے سارے نظریات میں سے ڈاکٹر صاحب نے صرف اس دھماکے والے نظریے کا انتخاب کیوں کیا؟ اس کا ایک خوبصورت جواب تو ہمیں مذکورہ کتاب DISCOVERY OF TIME میں ان الفاظ میں ملتا ہے۔

---

[1] کائنات کے ان تمام نظریات پر تفصیلی تبصرے کے ایک خوبصورت مطالعہ کے لئے TOULMAN & GOODFIELD, p 312-323 ملاحظہ ہو۔

[2] SALZEDO, BASIC ASTRONOMY, LONDON, 1934, CHAPTER I,p. 11

THE PRIMEVAL-ATOM THEORY OF THE ABBE LEMAITRE HAS A DIRECT INTELLECTUAL ANCESTORY WHICH LINKS IT TO THE CREATION-STORIES OF EARLY MYTHOLOTY, BY WAY OF CHIRISTIAN THEOLOGY AND PLATO'S TIMAEUS[1].

دوئم اگر ہم اس نظریہ کا مطالعہ نرگجی کے مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں کریں تو معاملہ واضح ہو جاتا ہے اور یہ امر کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ مصنف کے ذہن پر تین ہزار سالہ فرسودہ ہندو فلسفہ سوار ہے اور وہ اس قسم کی مجہول کوشش میں معروف ہیں جس طرح مذہبی جنونی زندگی اور کائنات سے متعلق ہر سوال کا جواب آسمانی صحیفوں میں تلاش کرتے ہیں۔ پچھلے تقریباً گیارہ سو سال میں ہندوؤں میں یہ یقین راسخ ہو چکا ہے کہ ویدوں میں ہر سوال کا جواب موجود ہے اور ان میں پڑھے لکھے لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ویدوں میں ہوائی جہازوں اور موجودہ جنگی ہتھیاروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ویدوں کی مجہول پرستش کا یہ نیا رخ ہے[2]

ہمارے اس خیال کی تائید مصنف کے تصور زمان سے بھی ہوتی ہے۔ زمان یا وقت کے بارے میں ان کا بیان ہے۔

"ابتدائی ذرے کے پھٹنے اور اس کے اجزا کا کروڑوں کہکشاؤں کی صورت میں پھیلتے چلے جانے کا عمل وقت کا آغاز اور اس کے پھیلاؤ کا عمل ہے۔ گویا وقت کی نمو دراصل کائنات کی نمو ہے۔ تخلیق اس کا امتیازی وصف ہے اور وقت جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے کائنات لاکھوں کروڑوں مظاہر کی صورت میں خلق ہوتی چلی جاتی ہے۔ دراصل وقت ایک مسلسل تخلیق اور نمو کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جب ابتدائی ذرے کے اجزا وقت اور جہت سے نا آشنا ہو جائیں گے تو وقت مر جائے گا اور کائنات بجھ جائے گی۔ تا آنکہ عدم کی راکھ سے دوبارہ تخلیق کا شعلہ بلند ہوگا — وقت ایک بار پھر وجود میں آ جائے گا۔ وقت یا زمان کے برعکس مکان اس تخلیق کا مظہر ہے جو وقت نے کی ہے اور جس میں حرکت اور جہت کا فقدان ہے۔ جب وقت رک جائے گا تو مکان گویا انسانی جسم کی طرح سے روح سے نا آشنا ہو کر خود بخود عدم میں تحلیل ہو جائے گا۔ فنا ہو جانے کا یہ عمل وہی ہے جو ابتدائی ذرے کا متحرک اور جہت سے منقطع ہو کر واپس ہو کر پلٹنے کا عمل ہے"
ص ۱۲، ۱۳۔

یتا عورت، نٹشے اور افلاطون کے نظریہ زمان کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

---

[1] TOULMAN GOODFIELD محولہ بالا ص ۳۱۶

[2] NIRAD CHAUDHRY, THE CONTINENT OF CIRCE, JAICO BOOKS, DELHI, 6TH IMPRESSION 1978, p. 182

"اس طرح قدیم زمانے میں ہندوؤں نے وقت کو من ونتر، کلپ اور مہایگ میں، پھر مہا یگ کو ست یگ، ترتیا یگ اور دواپر یگ اور کل یگ میں تقسیم کر کے ان میں سے ہر ایک کے سال بھی مقرر کر دیئے ہیں اور اپنے عقیدے کا برملا اظہار کیا ہے کہ ہر مہا ونتر کے بعد دوسرا مہا ونتر آتا ہے اور کائنات کا دائرہ ازلی ابدی ہے"[1]

ڈاکٹر صاحب کا زمان کے ہندوانہ تصور کو بار بار اپنی تصانیف میں دہرانا اس بات کا مظہر ہے کہ وہ اس تصور سے کتنے مرعوب ہیں۔ ان کے نزدیک وقت کی حرکت دولابی ہے اور یہ امر ان کے ذہن میں جڑ پکڑ چکا ہے۔ اپنی ان تحریروں میں جو راقم الحروف کی نظر سے گذری ہیں وہ دائرہ کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ دائرہ کو مکمل ترین مکان تصور کرتے ہیں اور مکمل ترین حرکت صرف مکمل ترین مکان میں ہی ممکن ہے اور چونکہ مکان بھی دولابی ہے اس لئے ہر حرکت جو اس مکان میں ہو رہی ہے اس کا دولابی ہونا لازم آتا ہے۔ اگر ہم اس بحث کو آگے بڑھائیں تو شاید ان کی نظر میں SIMPLE HARMONIC MOTION بھی دولابی حرکت ہی ہو کیونکہ یہ حرکت بھی اپنے آپ کو دہراتی چلی جاتی ہے۔ وقت کے اس تصور کے بارے میں ہندو فلسفہ سے متعلق ایک اور اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ تاکہ یہ بات مزید واضح ہو جائے کہ ڈاکٹر صاحب کے خیالات کس حد تک طبع زاد ہیں اور اس میں ان کی اپنی سوچ کو کس حد تک دخل ہے۔

"HINDU THINKERS HAD EVOLVED A CYCLIC THEORY OF TIME. THE CYCLE WAS CALLED A KALPA AND WAS EQUIVALENT TO 4320 MILLION EARTHLY YEARS. THE KALPA IS DIVIDED INTO 14 PERIODS AND AT THE END OF EACH OF THESE THE UNIVERSE IS RECREATED AND ONCE AGAIN MANU (PRIMEVAL MAN) GIVES BIRTH TO THE HUMAN RACE. AT THE MOMENT WE ARE IN THE SEVENTH OF THESE FOURTEEN PERIOD OF THE PRESENT KALPA. EACH OF THESE IS DIVIDED INTO SEVENTY-ONE GREAT INTERVALS AND EACH OF THESE IS DIVIDED IN YUGAS OR PERIODS OF TIME. THE YUGAS CONTAIN RESPECTIVELY 4800, 3600, 2400, AND 1200 GOD-YEARS (ONE GOD YEAR EQUALS 360 HUMAN YEARS), AND THERE IS A PROGRESSIVE DECLINE IN THE QUALITY OF CIVILIZATION. WE ARE NOW IN THE FOURTH OF THESE YUGAS, THE KALIYUGA WHEN THE WORLD IS FULL OF EVIL AND WICKEDNESS, AND THUS THE END OF THE WORLD IS BY COMPARISON IMMINENT, THOUGH THERE ARE SEVERAL MILLENIA YET BEFORE THE END: THE KALIYUGA IS ALSO ASSOCIATED WITH THE COMING OF KALKIN,

---

[1] وزیر آغا تخلیقی عمل، ص ۹۳ بحوالہ تصورات عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں۔ اقبال اکیڈمی لاہور ۱۹۷۷ء، ص ۷

THE TENTH INCARNATION OF VISHNU THERE IS A CURIOUS SIMILARITY BETWEEN THESE IDEAS AND THE IDEA OF MILLENNIUM AS IT WAS CURRENT IN EUROPE AND ELSEWHIRE"[1]

ڈاکٹر صاحب کے خیالات کا ان دو آئینوں میں عکس دیکھنے کے بعد مزید صرف یہ کہنے کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ مسئلہ زمان اس قدر سلیس، سادہ اور آسان نہیں ہے۔ زمان و مکاں کے ان میکانکی تصورات کی بنیاد پر جو نتائج ڈاکٹر صاحب نے فنونِ لطیفہ یعنی رقص و موسیقی اور اردو شاعری کے مزاج پر مرتب کئے ہیں، ان کا جائزہ ہم بعد میں لیں گے۔ فی الحال زمان و مکان کی بحث کو ان کی کتاب سے ایک انتہائی دلچسپ اقتباس پر ختم کرتے ہیں۔

"حالانکہ بدوش انسان روشنی اور تاریکی، نیکی اور بدی کی تفریق سے آشنا تو ہوتا ہے لیکن اس سے اپنی سوسائٹی کو تہذیب کی دوڑ میں آگے بڑھانے سے قاصر رہتا ہے اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ جس طرح زمان جب تک مکان کی بنیاد پر ایستادہ نہ ہو باقی نہیں رہ سکتا اسی طرح کوئی سوسائٹی...... الخ" (ص ۱۵)

اس اقتباس میں دلچسپ فقرہ یہ ہے کہ "جس طرح زمان جب تک مکان کی بنیاد پر ایستادہ نہ ہو باقی نہیں رہتا"۔ صاف ظاہر ہے کہ زمان اور مکان کا مطالعہ گہری نظر سے نہیں کیا گیا ہے۔ ایک مفکر کے خیال میں زمان و مکان کی بحث میں ایک الجھن یہ ہے کہ مکان تو ہمیں مکمل طور پر بالذات نظر آتا ہے لیکن زمان کا ادراک ہمیں لمحہ لمحہ سے ہوتا ہے اور اس کو ہم اپنی مرضی سے مستقبل، حال اور ماضی میں تقسیم کر دیتے ہیں اور اس میں انسانی حافظہ کا دخل شروع ہو جاتا ہے۔ مستقبل ہم سے مخفی ہے اور صرف حال ہمیں نظر آتا ہے۔ زمان و مکان کے درمیان یہ تفریق انتہائی اہم ہے اور اس تفریق سے زمان کو مکان کے مقابلے میں ثانوی حیثیت دینی پڑ جاتی ہے۔ زمان و مکان کے مسئلہ پر اقبال نے بھی بہت سوچا ہے اور بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ :-

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

یہ شعر ڈاکٹر صاحب کے تصور زمان و مکاں پر ایک خوبصورت اور خیال افروز تبصرہ ہے۔ اقبال سے اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے لیکن اس امر سے بھی تو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ زمان کی بحث کی کئی جہتیں اور کئی تصورات ہیں جن میں سے کچھ معروضی ہیں تو کچھ موضوعی اور جس طرح مکان کا تصور زمانے کے ساتھ ساتھ

---

[1] THAPAR, A HISTORY OF INDIA, PELICAN, 1977 VOL. I, p. 161.

تبدیل ہوتا رہا ہے اسی طرح زمان کے تصور میں بھی انقلابات آتے رہے ہیں اور بیسویں صدی کا زمان و مکان کا وہ تصور جس میں دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر کشش ثقل کا بدل بن جاتے ہیں، حیران کن ہے۔ پھر کیا یہ ضروری ہے کہ آج کل ہم ان تصورات پر ہی انحصار کریں جو ہمارے ذہن کے LIMBO سے برآمد ہوتے ہیں۔ اور ان کو بطور ازلی ، ابدی اور عالمگیر حقائق کے اس طرح پیش کریں جیسے وہ اس موضوع پر حرف آخر ہوں۔ کسی بھی عالم سے ہم اس قسم کی SWEEPING STATEMENT کی توقع نہیں کر سکتے کہ جب تک زمان مکاں کی بنیاد پر ایسا دعویٰ نہ ہو باقی نہیں رہ سکتا۔ خصوصاً اس زمانے میں اور ان حالات میں جبکہ نہ جہان اقلیدس وطوسی" درہم برہم ہو رہا ہو اور چار سو سال تک انسانی ذہن پر حکومت کرنے والے نیوٹن کے نظریات متزلزل نظر آنے ہوں اور یکے بعد دیگرے باطل ہونے جا رہے ہوں اور نئے نظریات نئے مشاہدات سے لیس ہو کر ان کی جگہ لے رہے ہوں۔

زمان و مکان کی بحث لمبی اور الجھی ہوئی ہے۔ اگر ہم تفصیل میں چلے گئے تو ڈاکٹر صاحب کے باقی نادر خیالات سے جو تاریخ اور عمرانیات وغیرہ سے متعلق ہیں، محروم رہ جائیں گے۔

اس ذیل میں سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے وہ خیالات اور نظریات ہیں جن کا اظہار انہوں نے وادی سندھ کی تہذیب کے بارے میں جا بجا اور خصوصاً اس باب میں کیا ہے جس کا عنوان ہے" دو تہذیبوں کی آویزش" اس عنوان کے تحت ڈاکٹر صاحب کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

۱۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب دراوڑی تھی۔

۲۔ یہ تہذیب مادری نظام کی علمبردار تھی۔

۳۔ یہ ارضی تہذیب تھی اور اس کے مقابلے میں آریاؤں کی تہذیب سماوی تھی۔

مندرجہ بالا امور سے متعلق ڈاکٹر صاحب کے ارشادات پر کچھ عرض کرنے سے پہلے وادی سندھ کے بارے میں چند امور کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

اول تو یہ کہ ۱۹۲۰ء کے بعد ہڑپہ، موہنجو دارو اور باقی مقامات کی کھدائی سے جو سوابد دستیاب ہوئے ہیں، ان سے اس تہذیب کا ایک مبہم سا خاکہ تو ماہرین ضرور مرتب کر پائے ہیں۔ لیکن اس خاکے میں تہذیب کی جزئیات اور باقی تفصیلات کا رنگ ابھی تک بھرا نہیں جا سکا۔ اور کئی امور کے بارے میں ہم ماہرین کی آرا کے منتظر ہیں۔ پروفیسر پگٹ[1] اور وہیلر نے اس معاملے میں عرق ریزی ضرور کی ہے لیکن واقعاتی شہادت کا ناکافی ہونا ان کے راستے میں حائل رہا۔ مثلاً ان کے مذہب اور ثقافت کے بارے میں ہمیں کوئی ایسی شہادت جس سے ان دو اہم امور پر روشنی پڑ سکے، نہیں ملی۔

دوم یہ امر کہ ہڑپہ کا رسم الخط ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا۔ ہمارے راستے میں مزید رکاوٹ کھڑی کر

---

[1] پروفیسر پگٹ: پری ہسٹارک انڈیا۔ پلیکن۔ ۱۹۶۱ء، ری پرنٹ، باب پنجم

دیتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ جب تک رسم الخط کا یہ مسئلہ حل نہ ہو وہ اس تہذیب کے کئی پہلوؤں پر کچھ کہنے سے قاصر ہیں[1]

سوم، جب ہم مختلف ماہرین کی آرا کا تقابل کرتے ہیں تو ان میں ہمیں کئی موقعوں پر تضاد نظر آتا ہے اور بعض اوقات ایک ہی ماہر ایک ہی جملے میں متضاد رائیں دے جاتا ہے[2]

چہارم یہ امر بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ وادی سندھ کی تاریخوں کا کوئی حتمی تعین نہیں ہو پایا۔ جو کچھ ابھی تک ہمارے سامنے ہے، وہ تخمینے ہیں اور قیاسات پر مبنی ہے[3]

پنجم جن ماہروں نے رگ وید کے متن کے ذریعے اس تہذیب پر روشنی ڈالی ہے، ان کی کامیابی بھی ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھ پائی جس کی وجہ یہ ہے کہ خود وید کے زمانے کا، جس کا ذکر آگے آئے گا، تعین حتمی طور پر نہیں ہو پایا[4]

تاریخی مآخذ میں ہمیں لفظ دراوڑ منو کے ہاں ملتا ہے۔ جہاں اس کے معنی ایک کشتری قبیلہ ہے، جسے ذات بدر کر دیا گیا[5]۔ منو کا زمانہ پہلی یا دوسری صدی عیسوی ہے[6] دراوڑ کوئی نسل نہیں ہے بلکہ لفظ آریا کی طرح ایک لسانی گروہ کا نام ہے جن میں بہت سی نسلیں یا قبائل آجاتے ہیں۔ فریزر کے خیال کے مطابق اس لفظ کا اطلاق تامل زبان بولنے والے قبائل پر ہوتا ہے۔ لیکن مستشرقین نے اس لفظ کے مفہوم کو توسیع دی اور اس میں تامل کے علاوہ تلگو، ملیالم اور کنڑی زبانیں بولنے والوں کو بھی شامل کر لیا گیا[7] اور اب یہ لفظ پورے جنوبی ہند کی آبادی

---

[1] محمد ادریس صدیقی، وادی سندھ کی تہذیب، محکمہ آثار قدیمہ پاکستان۔ کراچی۔ ۱۹۵۹ء، باب بعنوان "رسم الخط" اس موضوع پر جدید ترین تحقیق کے لئے ملاحظہ ہو۔ KINNIER WILSON, INDO-SUMERIAN, OXFORD, 1974

[2] مثلاً باشم ص ۱۹ پر ہڑپہ کی مہروں کے بارے میں یہ فقرہ قابل غور ہے۔

"THE PRIMARY PURPOSE WAS PROBABLY TO MARK THE OWNERSHIP OF PROPERTY, BUT THEY DOUBTLESS ALSO SERVED AS AMULETS AND WERE REGULARLY CARRIED ON THE PERSONS OF THEIR OWNERS"

[3] باشم ص ۱۵، ادریس صدیقی، باب بعنوان زمانہ ص ۲۲

[4] ردمیلا تھاپر جلد اول ص ۳۰ حاشیہ ۲ جہاں رگ وید کی شہادت کی احادیث پر روشنی پڑتی ہے۔

[5] ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS, بذیل مادہ دراوڑ

[6] منو کے زمانے کا تعین نہیں ہے۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ پہلی یا دوسری صدی عیسوی میں تھا۔ تھاپر۔ ص ۱۲۱ مزید دیکھیں باشم۔ ص ۸۹، ۳۰۲، ۳۴۰

[7] انسائیکلوپیڈیا۔ محولہ بالا

کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ایک اور خیال یہ بھی ہے کہ اس لفظ کا اطلاق محض تامل ناڈ کے علاقے پر ہوتا ہے۔
لیکن اس میں غیر آریائی قبائل مثلاً گونڈ، بھیل، بھاڑ جو وسطی ہند میں ملتے ہیں شامل نہیں ہیں۔ لفظ دراوڑ ایک تامل لفظ کی سنسکرت شکل ہے۔ جس کا مطلب میٹھا ہے[۱] اس کے برخلاف رزلے نے اس لفظ کے مفہوم میں بہت وسعت پیدا کی ہے اور اس کا اطلاق ان تمام قبائل اور اقوام یا نسلوں پر کیا ہے جو لنکا سے لے کر وادی گنگا تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان علاقوں میں چھوٹا ناگپور، حیدرآباد دکن، مدراس اور وسطی ہند شامل ہیں۔ اس نے دراوڑوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ آریائی دراوڑ، منگول دراوڑ اور خالص دراوڑ۔ اس کے خیال کے مطابق دراوڑ جنوبی ہند کے جزیرہ نما میں، جو دنیا کا قدیم ترین خطہ ارض ہے۔ آباد تھے۔ یہ قدیم ترین اقوام ہیں اور ان کی آبادی مغربی گھاٹ سے شروع ہو کر راس کاری، مشرقی گھاٹ اور بنگال سے گزر کر رنگون اور سنگاپور تک پھیلی ہوئی ہے[۲]
دراصل یہ سارا علاقہ ثقافتی طور پر کرناٹک کہلاتا ہے۔

رزلے کی تحقیق کے مطابق آریائی دراوڑ پنجاب کی مشرقی سرحد سے شروع ہو کر بہار تک چلے گئے ہیں[۳]
اسی خیال کے مطابق دراوڑ اصلی پنجاب یعنی دریائے ستلج کے مغرب کی طرف اور وادی سندھ میں کبھی آباد نہیں ہوئے۔ دوسرے لفظوں میں وادی سندھ کی تہذیب میں دراوڑی عناصر شامل نہیں تھے۔

اس ضمن میں جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ آریا ورت سے نکل کر جب آریاؤں نے جنوب کا رُخ کیا[۴] اور وہاں اپنی نوآبادیاں قائم کر لی شروع کیں تو انہیں احساس ہوا کہ اگرچہ شمالی ہند میں انہیں برتری حاصل تھی، لیکن جنوبی ہند میں وہ اقلیت میں تھے۔ اس لئے وہ مقامی قبائل کو نہ تو مکمل طور پر ختم کر سکے اور نہ ہی آبادی کے لحاظ سے ان کے مقابل آ سکے۔ چنانچہ ان کا مقام بحیثیت نوآبادکار کے وہ نہیں تھا جو انگریزوں کا آسٹریلیا یا شمالی امریکہ میں ہے، بلکہ ان کا مقام اس مقامی آبادی میں وہ تھا جو یورپی اقوام کا جنوبی افریقہ میں ہے۔ وہ ایک مہذب اقلیت تھے جو غیر تہذیب یافتہ قبائل میں جا کر آباد ہو گیا تھا چنانچہ

FROM THIS CIRCUMSTANCE OF THEIR COLONIZATION THE ARYANS OF THE SOUTH DEVELOPED A SENSE OF BEING SOMEWHAT DIFFERENT FROM THEIR KINSMEN IN THE NORTH AND THOUGH THEY NEVER DEVELOPED ANY SENSE OF EMOTIONAL DETACHMENT FROM THESE RELATIVES AS MODERN AMERICANS HAVE DONE IN REGARD TO EUROPE, THEY WERE NOT ASHAMED TO BE COLONIALS STANDING ON THEIR OWN. NATURALLY, IN LATER TIMES, THIS

۱۔ سمتھ THE EARLY HISTORY OF INDIA ص ۴۰۳ حاشیہ

۲۔ RISLEY, THE PEOPLE OF INDIA, PAKISTAN REPRINT 1977, p. 434.

۳۔ ایضاً ۳۳

۴۔ یہ زمانہ ۸۰۰ ق م مانا جاتا ہے حوالہ ۲۵، ۲۲، ۳۳

CULMINATED IN THE CREATION OF A VIGOROUS SOUTHERN AND COLONIAL FORM OF THE HINDU CIVILIZATION OF THE ARYAVARTA. THERE THE ARYANS EVEN CAME TO BE CALLED DRAVIDAH, DRAVIDIANS, AFTER THE NAME OF THE ORIGINAL INHABITANTS OF THE SOUTH ITSELF. THIS WAS ANALOGOUS TO THE DUTCH COLONISTS CALLING THEMSELVES AFRIKANER (OR AFRIKANDER) AND ENGLISH COLONISTS AUSTRALIANS WHEN IN SUBSEQUENT TIMES THE ARYANS OF THE NORTH SPOKE OF DRAVIDIANS THEY MEANT THEIR OWN PEOPLE IN THE SOUTH, NOT THE DARKS NOWADAYS THE OLDER DRAVIDIANS, WHEN THE WORD IS USED AT ALL, ARE DISTINGUISHED FROM THE ARYAN DRAVIDIANS BY BEING CALLED ADI-DRAVIDA, WHICH MEANS 'ORIGINAL DRAVIDIANS'"[1]

سو مذکورہ بیان کے مطابق دو ہزار سال کے بعد اس نظریے کی مکمل تردید ہو جاتی ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ دراوڑ سے مراد (خواہ اس کا اطلاق لسانی گروہوں پر ہو یا نسلی اعتبار سے مختلف اقوام پر) جنوبی ہند اور وہاں کے باشندے ہیں۔ یوں اس نظریہ کی مکمل تردید ہو جاتی ہے کہ شمالی ہند میں یا وادی سندھ میں دراوڑی اقوام آباد تھیں اور یہاں کی خصوصاً وادی سندھ کی تہذیب دراوڑی تہذیب تھی۔ یعنی وہ نظریہ جس کے علمبردار ڈاکٹر دریرا آغا ہیں اور جنہوں نے اپنے THESIS کی بنیاد اسی اور محض اسی نظریہ پر رکھی ہے۔

وادی سندھ کی تہذیب کی تاریخوں کا تعین بھی حتمی طور پر نہیں ہو سکا ہے[2] ان لوگوں کا نسلی اعتبار سے تعین کرنے کے لئے ان ڈھانچوں کا تجزیہ کیا گیا ہے جو ان شہروں کی کھدائی سے ملے ہیں۔ ان کی کل تعداد پچاس ہے۔ ان میں سے کچھ کا تجزیہ کیا گیا ہے جس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نسلی اعتبار سے یہ معاشرہ ایک سے زیادہ نسلوں سے مرتب تھا۔

ان میں سے پہلے نمبر پہ بحیرہ روم کی نسل آتی ہے۔ جتنے ڈھانچوں کا تجزیہ ہوا ہے۔ ان میں سے نصف اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بحیرہ روم کی نسل کے لوگ سپین سے لے کر ہندوستان تک آج بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ نطوفیاں کے وقت میں یعنی ۹ یا ۱۰ ہزار سال قبل مسیح میں فلسطین میں پائے جاتے تھے اور یہیں سے وہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیلتے گئے۔ اوائل مصری جن کو ہم PRE-DYNASTIC کہتے ہیں اسی نسل سے تھے اور ان کا انتہائی تہذیب السطرفین نون جزیرہ نما عرب میں بھی ملتا ہے اور اونچے طبقوں میں شمالی ہندوستان میں بھی نظر آتا ہے۔

آثار قدیمہ کی شہادتوں کی رو سے یہ نسل مغربی افریقہ میں پہلی کاشت کار قوم تھی اور ان کے آثار ہمیں العبید و آنا و یا ایشیا میں نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے لوگوں کے ساتھ ان کی مماثلت حیرت انگیز ہے۔ ان کھوپڑیوں میں سے جن کا تجزیہ ہوا ہے۔ تین کھوپڑیاں ایسی ہیں جن کا تعلق PROTO AUSTRALOID نسل سے ہے اور ایک کھوپڑی منگول نسل کی ہے۔ اس تجزیہ کا خلاصہ پروفیسر پگٹ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

---

[1] نژاد چوہدری۔ ۵۴

[2] خاکہ ص ۳۰ اور حاشیہ

"THE SUM OF THE EVIDENCE FROM THE SKULLS, THEN, SHOWS THAT IN THF HARRAPA CULTURE THERE WAS, FIRST, THE ABORIGINAL PROTO-AUSTRALOID TYPE, PERHAPS THEN, AS NOW, RANKING AMONG THE 'UNDER-DOGS' OF THE SOCIAL SYSTEM, SECOND, THF PREDOMINENT MEDITERRANEAN SEA PRESUMABLY THE MAIN CONTRIBUTORS OF THE AGRICULTURAL AND URBAN FEATURF OF THF WHOLE WESTERN INDIAN PRF-HISTORIC WORLD AND/THEM WITH PROBABLY THE SHORT-HEADED ALPINE ELEMENT, THIRDLY AN OCCASIONAL 'FOREIGNER' FROM THE NORTH-EAST -- [illegible] COUNTRY OF NEPAL OR ASSAM, OR BEYOND, POSSIBLY FROM CHINA ITSELF-BUT HE IS PERHAPS PRESENT AS AN INVADER"[1]

اس نسل کے [illegible] کے بعد [illegible] ہے کہ کوئی [illegible] وادی سندھ کے لوگ دراوڑی نسل سے تعلق رکھتے تھے

اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ لوگ دراوڑ نہیں تھے تو کیا یہ ایک وادی خاموشاں تھی یا پھر یہاں کچھ لوگ آباد تھے؟ اس بارے میں متعدد قیاس آرائیاں ہو چکی ہیں۔ رگ وید ان قیاسوں کا اولین منبع ہے۔ اس کی مناجاتوں میں لوگوں سے معنی پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن وہ داخلی شواہد سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ مثلاً رگ وید میں "پانی" لوگوں کا ذکر ملتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ آریاؤں کو ان کے ہاتھوں سخت تکلیف پہنچی اور وہ مویشی چرایا کرتے تھے۔ لیکن ان لوگوں کی کوئی IDENTIFICATION نہیں ہو سکی۔ اسی طرح یہ قیاس بھی کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ براہوی تھے لیکن براہویوں کے بارے میں یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کی زبان دراوڑوں کی بولیوں سے ملتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ وہ ایرانی النسل ہیں[2]۔ انہی قیاسات میں یہ بھی شامل ہے کہ یہ لوگ دراصل آریہ تھے اور یہی رگ وید کو مرتب کرنے والے تھے لیکن اس نظریہ کی ساری بنیادیں بڑی کمزور ہیں۔ آریاؤں کی سب سے پہلی نوآبادی جس کا سراغ ہمیں ملتا ہے دریائے ستلج (ستودری) اور دریائے سرسوتی کے درمیان واقع تھی۔ رگ وید اسی علاقے کی پیداوار ہے[3] یہ علاقہ سپتا سرسوتی بھی کہلاتا تھا[4] اور اس علاقے کو انہوں نے برہم ورت کا نام بھی دیا[5]۔ اس نظریہ پر یہ اعتراض بھی وارد ہوتا ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب آریاؤں کی آمد سے پہلے کی تہذیب ہے اور ویدک عہد پر اسے سبقتِ زمانی حاصل ہے۔ رگ وید کی مناجاتوں کی اندرونی شہادت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی

---

[1] پگٹ، ص ۱۴۷، ۱۴۸

[2] باشم۔ ص ۲۵

[3] باشم ۳۰، ۳۱، ۳۲، کرجی ۵۲، ۵۵، ۶۸

[4] کرجی ۵۵

[5] کرجی ۸۴، باشم ۳۱

ہے کہ یہ بڑے عہد کے بعد کی تصنیف ہے[1] آثار قدیمہ کی شہادتوں کی بنا پر ہم اس نتیجہ پر بھی پہنچتے ہیں کہ وادی سندھ کی تہذیب کے اختتام اور آریاؤں کی آمد کے آغاز کے درمیان چند صدیوں کا عرصہ حائل ہے۔ یہ عرصہ چھ سو سال سے آٹھ سو سال کا ہو سکتا ہے اس لئے یہ کہنا کہ آریاؤں نے وادی سندھ کی تہذیب کو غارت کیا غلط ہے[2] وہیلر اور پگٹ نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس تہذیب کو ختم کرنے والے آریا تھے اور آریائی ہیرو اندرا نے یہاں کے نو سو قلعوں کو مسمار کیا، اب ایک پرانی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس علاقے میں اول تو نو سو قلعے تھے ہی نہیں اور اگر تھے تو بھی آریاؤں کا ان کی تباہی میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

مندرجہ بالا کوائف و حقائق کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب کے اس نظریہ کا مکمل طور پر بطلان ہو جاتا ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب دراوڑی تھی اور وہ براہ راست آریائی تہذیب پر اثر انداز ہوئی۔ ۲

وادی سندھ کی تہذیب کے بارے میں ہم مزید یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس تہذیب پر گفتگو کرتے وقت ڈاکٹر صاحب نے جغرافیائی اور تاریخی عوامل کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ دریائے سندھ کی اس وادی کی تہذیب ایک زنبیل میں بند تھی اور وہ تمام دنیا سے الگ تھلگ رہ کر پندرہ سو سال صرف آریاؤں کی منتظر رہی کہ وہ آئیں اور اس کا جمود توڑیں۔ یہ نظریہ اس رستا خیز کو جو اس وقت وادی سندھ کے شمال اور مغرب میں برپا تھی، کوئی وقعت دینے کو تیار نہیں اور نہ ہی ان جغرافیائی عوامل کو جن کے بارے میں ایک ہندو محقق نراد چوہدری یوں رقمطراز ہے:

"TO TAKE THE NORTH-WEST FIRST; THE LAND OF THE FIVE RIVERS, OR OF THE SEVEN RIVERS AS IT WAS CALLED IN ANCIENT TIMES, DID NOT FORM PART OF INDIA, NOR DOES IT DO SO NOW. GEOGRAPHICALLY, IT BELONGS TO THE MIDDLE EASTERN ZONE. CULTURALLY, IT MUST HAVE PASSED TO THAT REGION VERY EARLY, EVEN IF IT DID NOT FORM AN OUTLIER OF WESTERN ASIA FROM THE VERY BEGINNING OF HUMAN LIFE. SUCH ARCHAEOLOGICAL PEOPLE FROM THE MIDDLE EAST BEGAN TO SETTLE IN THE PUNJAB, FORMING OUTER RING OF THE DIFFUSION OF AGRICULTURAL TECHNIQUES FROM THEIR CENTRE IN MESOPOTAMIA. THIS EXPANSION TOWARDS INDIA COULD NOT HAVE BEEN LATER THAN THE EARLY BRONZE AGE IN WESTERN ASIA.

---

[1] باشم ۳۱ "THE DISCOVERY OF THE INDUS CITIES WHICH HAVE NOTHING IN COMMON WITH THE CULTURE DESCRIBED IN THE VEDA AND ARE EVIDENTLY PRE-VEDIC, PROVES THAT THE HYMNS CANNOT HAVE BEEN COMPOSED BEFORE THE END OF HARAPPA".

اس نظریہ کی تردید کے لئے ملاحظہ ہو نراد چوہدری ۳۰۳

[2] تقابلہ ۳۰، در حاشیہ، ادریس صدیقی [illegible]

THE CULTURE OF THE EARLY AGRICULTURISTS IS UNIFORM ALL OVER THE MIDDLE EAST, FROM PALSETINE TO BALUCHISTAN AND EVEN THE INDUS BASIN. BUT WHILE IN MOSOPOTAMIA THESE PEOPLE EVOLVED INTO CITY DWELLERS AND CREATED AN URBAN CIVILIZATION, FURTHER EAST THEY REMAINED AGRICULTURAL AND PASTORAL."

اس اقتباس کے بعد مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ البتہ یہ بتانا ضروری ہے کہ آریاورت کے باسیوں کے لئے یہ علاقہ ہمیشہ "علاقہ غیر" ہی رہا۔ اور انہوں نے یہاں کے رہنے والوں کو بھی اپنا نہیں سمجھا۔ انہوں نے صرف آریا ورت کے علاقے کو مقدس خیال کیا۔ یہاں کے پہاڑ، بن، جنگل اور دریا ان کے لئے مقدس تھے لیکن وادی سندھ کو انہوں نے کبھی کوئی اہمیت نہیں دی اور یہاں کے رہنے والوں کے لئے زہر میں بجھا ہوا لفظ "ملیچھ" ہی استعمال کیا[1] کیوں کہ آریاؤں سے قبل کے لوگ اور آریاؤں کے آنے کے بعد لوگ جو یہاں آباد ہوئے مثلاً پہلوی اور ان کی مختلف شاخیں کشاں، ستھین، پارتھین، باختری اور یونانیوں وغیرہ کو آریا ورت کے لوگوں نے 'یاوانا' YAVANA ہی قرار دیا اور ان کو ذات پات کے مخصوص تصورات کے پیش نظر کبھی اپنے سماج کا حصہ نہیں سمجھا۔ کام بوجی، پہلوا، ساکا اور دیگر یاوانا جو آریا ورت کے شمال مغرب میں آباد تھے ان کی نظر میں ہمیشہ 'ناپاک' گنے گئے اور اس کی شہادت ہمیں مہابھارت سے بھی ملتی ہے[2] چھٹی صدی قبل مسیح میں تو یہ علاقہ ایرانی تسلط میں آنے کے بعد ویسے ہی آریہ ورت سے کٹ چکا تھا[3]

یہ امر کہ جغرافیائی لحاظ سے وادی سندھ کی تہذیب مشرقِ وسطیٰ سے مربوط تھی۔ اس بات سے اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو شواہد اور واقعاتی شہادتیں ہمیں دستیاب ہوئی ہیں وہ روابط کی گہری غمازی کرتی ہیں۔ ان میں سے کانسی کا بنا ہوا رقاصہ کا مجسمہ[4]، مہریں[5]، رسم الخط کا انداز[6]، تل سمیرا اور ہڑپہ سے برآمد شدہ اشیاء کی مماثلت[7] موہنجو دارو سے سمیری طرز کا بالوں میں لگانے کا پن شامل ہیں۔ تجارتی تعلقات کی نشاندہی بھی ہو چکی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ بنا بنایا مال وادی سندھ سے سمیر پہنچتا تھا اور اس مال کے ساتھ ساتھ یہاں کے مذہبی مسالک

---

[1] ایضاً ۵۰، مکرجی ۱۶۶، پگٹ ۱۱۸، ۱۴۲، تھاپر ۵۹، ۶۰

[2] مکرجی ۱۳۰ — [3] تھاپر ۵۸

[4] مکرجی ۴۲، مخالف رائے کے لئے دیکھیں ادریس صدیقی ۲۰۹، باشم ۲۱

[5] ادریس صدیقی ۲۳۳، مکرجی ۴۰، ۴۷۔ — [6] ادریس صدیقی ۲۱۷، کننرولسن ۱، ۴۳، ۴۴

[7] ادریس صدیقی 225، ۲۳۶، باشم ۲۸

[8] مکرجی ۴۵، ۴۸ جہاں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پختہ اینٹوں کا استعمال اس وادی سے عراق پہنچا۔

بھی وہاں پہنچے[1] اور سمیریا کی مصنوعات کی نقلیں وادی سندھ کے علاقے میں بھی دستیاب ہوئی ہیں[2]

چنانچہ یہ تمام شہادت اس بات کی روشن دلیل ہے کہ وادی سندھ کے لوگ دراوڑ نہیں تھے، نسلی اعتبار سے اور مذہبی لسانی اعتبار سے ان کے تعلقات ہند کے باقی علاقوں کی بجائے مشرق وسطیٰ سے زیادہ گہرے اور وسیع تھے۔ یہ علاقہ نسلی، اقتصادی، ثقافتی، تمدنی لحاظ سے، اس زمانے میں بھی اور اس کے بعد بھی مشرق وسطیٰ سے ہی وابستہ رہا۔ سوائے ان چند برسوں کے جب یہ موریہ اور گپتا خاندانوں کے تسلط میں آیا۔ یہاں مارشل کے اس موضوع پر خیالات پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا[3]۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وادی کے لوگوں کی تہذیب مادری اصول پر استوار تھی، جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے یا آج سے تین ہزار سال قبل جب انسان حجری دور میں سے نکل کر زرعی دور میں داخل ہو چکا تھا، یہ تہذیب پدری اصولوں پر مبنی تھی۔ یہ تعین کرنے کے لئے، مادری اصول، کو ایک نظر دیکھنا ہوگا۔

ماہرین عمرانیات اس اصول کو MOTHER RIGHT کا نام دیتے ہیں ریورز RIVERS کے خیال کے مطابق یہ وہ سماجی نظام ہے جس کے تحت اس نظام میں تمام رشتہ داریاں ماں کے رشتے سے متعین ہوتی ہیں اس میں ہر فرد کے فرائض، اس کے حقوق اور اس پر لازم پابندیاں اسی رشتہ سے طے پاتی ہیں جو اس کا اپنی ماں کے ساتھ ہے۔ ریورز کے مطابق یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ اس کے عناصر یہ ہیں ۱۔ توارث ۲۔ رشتہ داریاں ۳۔ وراثت ۴۔ جانشینی ۵۔ اختیارات ۶۔ شادی۔ اس کے خیال کے مطابق موجودہ ہندوستان میں اس کے صرف دو مراکز ہیں اول کھاسی قبیلہ جو آسام میں ہے اور دوئم مالا بار کا ساحل جہاں NAYYAR نمالی، تیامان، TIYAN اور مسلمان موپلوں میں اس کے آثار ملتے ہیں۔ یہاں اس نظام کو "مکھاتم MARUMAKHATAYAM" کہا جاتا ہے اور اس کا تعلق چند شوہری POLYANDRY سے ہے[4]

J. J. BACHOFAN پہلا عالم ہے جس نے اس موضوع پر تحقیق کا آغاز کیا اساطیر اور قدیم مذاہب سے استنباط کر کے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ مادری نظام کے انسانی معاشرہ میں تین مراحل تھے۔ پہلے مرحلے کو وہ TULLERISM کا نام دیتا ہے اس میں مادری نظام بغیر شادی کے رواج یا ادارے کے مروج تھا۔ ریاست کا وجود نہیں تھا کاشت کاری اور زراعت ناپید تھیں بلکہ یہ طرز زندگی ابھی وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ دوسرے مرحلے کو وہ LUNARISM کا نام دیتا ہے۔ اس دور میں "باقاعدہ" شادی کا رواج ہوا اور اسے بطور ایک سماجی ادارہ کے تسلیم کیا گیا۔ 'اصلی' اور 'باضابطہ' اولاد کا تصور وجود میں آیا۔ اور ان کے ساتھ ہی

---

[1] ایضاً ۱۰۴

[2] مشرق وسطیٰ سے تعلقات کی تفصیل کے لئے دیکھیں نقابہ ۲۵، ۲۸ اور گارڈن چائلڈ کا باب پنجم

[3] سر جان مارشل بحوالہ ایس رادھا کرشنن، محولہ بالا۔ ص ۶۰۷

[4] ایڈیٹر ہیسٹنگز انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس۔ بذیل مادہ "مدر رائٹ"

کاشت کاری اور زرعی سکونت پذیر برادریوں کا آغاز ہوا۔ تیسرے دور کو بہ محقق SOLAR عہد کا نام دیتا ہے اس عہد میں مادری نظام معاشرے کا اختتام ہوا اور اس کی جگہ پدری نظام کا قیام عمل میں آیا۔ تقسیم کار کا تصور وجود میں آیا اور ساتھ ہی ذاتی املاک کا تصور معاشرے کا بنیادی اصول قرار دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے انسانیت نے بڑا لمبا سفر طے کیا ہوگا۔ مادری نظام معاشرہ حجری دور کے آخر میں مروج تھا۔ زمین اور باقی املاک پر اشتمالیت کا اصول کار فرما تھا۔ زمین پر کسی فردِ واحد کا تسلط نہ تھا اور اگر زمین پر کسی فرد واحد کو اختیار حاصل ہوتا تھا تو ایک محدود عرصہ کے لئے جس کے بعد وہ زمین کسی اور کو پھر ایک محدود عرصہ کے لئے منتقل ہو جاتی تھی۔ لیکن حجری دور کے بعد، خصوصاً اس وقت جب انسانیت "تانبے" کے دور میں داخل ہوئی اور اس دھات کی وجہ سے کئی ایجادات وجود میں آئیں، تو انسان نے کاشت کاری کو ایک باقاعدہ ذریعہ معاش بنا لیا۔ کاشت کاری کے ساتھ ساتھ حیوان اور مویشی پالنے کا دستور بھی وجود میں آیا اور ان کی نسل کشی کی بھی ابتدا ہوئی۔ ان ایجادات اور ذریعہ معاش میں تبدیلیوں کی وجہ سے معاشرے میں عورت کے مقام میں خاصی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ خصوصاً تقسیم کار کے اصول کے تحت۔ چنانچہ اس دور میں یعنی تانبے کے دور میں معاشرہ بجائے مادری اصول کے پدری اصول پر قائم ہوا۔ ذاتی املاک کا تصور ابھرا" شادی اور نکاح کی رسم کا آغاز بھی ذاتی املاک کے تصور سے وابستہ ہے۔ باپ بیٹیوں کو اور خاوند بیویوں کو اپنی ذاتی املاک سمجھتے تھے۔ باپ اپنی بیٹی کی قیمت وصول کرنے لگے۔ ایران کے دیہات میں آج بھی دولہن کی ماں دولہا سے شیر بہا وصول کرتی ہے یعنی اس دودھ کی قیمت مانگتی ہے جو اس نے بیٹی کو پلایا تھا۔ چین (انقلاب سے قبل کا چین) جاپان، وسطی امریکہ، قدیم ہندوستان اور یہودیہ میں بیٹیاں فروخت کرنے کا عام رواج تھا۔ بعض ممالک میں آج بھی بیٹیوں کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔

"زرعی انقلاب کے بعد عمرانی قدروں کے ساتھ اخلاقی قدریں بھی بدل گئیں۔ شکار کے عہد میں دوشیزگی اور دوشیزگی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ذاتی املاک کے تصور نے اسے عورت کی سب سے بڑی خوبی قرار دیا۔ اب مرد اپنی زوجہ کی عصمت و عفت کی کڑی نگرانی کرنے لگا۔ کیونکہ وہ اپنی املاک اپنے بچوں کو ورثے میں چھوڑنا چاہتا تھا"[1]

وادی سندھ کو ہم زرعی معاشرہ کہتے ہیں اور اس بات پر سب مورخوں کو اتفاق ہے اس صورت میں اس معاشرہ کے خدوخال وہ ہونے چاہئیں جو اوپر والے اقتباس میں درج ہیں نہ کہ وہ جو ڈاکٹر صاحب ہمیں باور کرانے کی کوشش میں ہیں۔ عمرانی نقطۂ نظر سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب میں ایسے کوئی شواہد دستیاب نہیں ہوتے جو یہ ثابت کریں کہ یہاں مادری نظام رائج تھا۔ اس سرزمین میں ہمیں کوئی معبد، مندر یا آتش کدہ نہیں ملا جس سے ان لوگوں کے مذہب کا تعین ہو سکے چنانچہ ان تمام امور کے لئے ہمیں ان تہذیبوں کی

---

[1] سید علی عباس جلال پوری۔ روح عصر، کتاب نما۔ راولپنڈی ۱۹۶۹ء ص ۷۵،۵۰

طرف دیکھنا پڑتا ہے جو وادی سندھ کی ہم عصر تھیں اور جن سے اس تہذیب کے گہرے روابط تھے۔ وہاں بھی ہمیں ایسی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہوتی جس سے ہم یہ کہہ سکیں کہ چونکہ وہاں مادری نظام تھا اس لئے وادی سندھ میں بھی مادری نظام تھا۔ وادی سندھ کا دور انسانیت کی تاریخ میں "تانبے" کا دور کہلاتا ہے اور اس کے تمام نقوش وادی سندھ کی تہذیب میں بھی ہونے چاہئیں اور ہمیں موجود نظر آتے ہیں۔ لیکن اس دور میں چونکہ مادری نظام کا اصول ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ وادی سندھ میں مادر اصول کا کوئی وجود نہیں تھا اور یہ تہذیب پدری اصول پر استوار تھی۔ حضرت ابراہیم کو PATRIARCH کہا جاتا ہے۔ ان کا زمانہ آج سے تقریباً چار ہزار سال قبل کا ہے۔ ان کے اس لقب سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں معاشرہ پدری اصولوں پہ استوار تھا۔ یہاں ڈاکٹر صاحب زرخیزی مذہب اور مادری نظام معاشرہ کو آپس میں گڈمڈ کر گئے ہیں اور یہ ذہنی انتشار پوری کتاب میں واضح طور پر موجود ہے۔

بدھ ازم کے بارے میں بھی ڈاکٹر صاحب کے بیانات تحقیقی ذمہ داری سے محروم ہیں اور یہ بیانات مسلمہ روایات، اعتقادات اور نظریات سے متصادم ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "مہاتما بدھ سماج کے نچلے درجہ سے تعلق رکھتا تھا"! (ص ۵۲)

یہ ایک غلط بیان ہے اور تاریخی حقائق کی رو سے صحیح نہیں ہے۔ گوتم سدھارتھ پہلا ہندوستانی ہے جو تاریخ کی روشنی میں پیدا ہوا اور جس کی پوری زندگی کی تاریخ ہمارے پاس مکمل طور پر موجود ہے[1] ڈاکٹر صاحب کی اپنی اسناد ان کے مندرجہ بیان کی تکذیب کرتی ہیں۔ باشم کے خیال میں سدھارتھ یعنی گوتم اور جین مت کا بانی مہاویر دونوں کشتری قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے[2] یہ ورن ہندوؤں میں برہمنوں کے بعد سب سے اونچا ورن خیال کیا جاتا ہے اور دنیاوی لحاظ سے سب سے اونچا بھی کیونکہ یہی وہ ورن ہے جو لوگوں پر حکومت کرنے کا اہل مانا گیا ہے۔

بدھ مت کے بانی کے بارے میں ان نادرست بیانات کے بعد انہوں نے اس مذہب کے بارے میں بھی اسی قسم کی روش اختیار کی ہے جس سے غلط تاثر ملتا ہے مثلاً

---

[1] رادھا کمل مکرجی، ص ۸۱۔

[2] باشم ص ۱۴۱، ۲۴۷۔ مزید دیکھیں نکولس اور پیراما دینا: اے کنسائز ہسٹری آف سیلون۔ کولمبو یونیورسٹی پریس کولمبو۔ ۱۹۶۱۔ ص ۴۳، سیمن، ہندوازم۔ پبلیکن ۱۹۶۳ ص ۶۵۔ سر رادھا کرشنن، انڈین فلاسفی۔ لندن۔ ۱۹۵۱ ری پرنٹ۔ جلد اول ص ۳۴۷؛ داس گپتا: اے ہسٹری آف انڈین فلاسفی۔ کیمبرج ۱۹۷۷۔ جلد اول ص ۸۱؛ ہمفریز: بدھ ازم۔ پبلیکن ۱۹۷۶ ری پرنٹ۔ ص ۲۹؛ رومیلا تھاپر ص ۵۲، ۵۳، ۷۶۔ بدھ ازم کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے اسی قسم کے بیانات سے کتاب بھری پڑی ہے۔

۱- " اپنشدوں کے بعد دراوڑی تہذیب کے خلاف آریاؤں کا ردعمل بدھ مت کی صورت میں منظر عام پر آیا۔" (ص ۷۶)

۲- " بدھ مت نے دراوڑی تہذیب کے اثرات کو کئی زاویوں سے زائل کرنے کی کوشش کی۔" (ص ۷۶)

۳- " بدھ مت ایک مکمل آریائی ردعمل ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس نے اخلاقی نظام و ضبط پر بہت زیادہ توجہ مرکوز کی۔" (ص ۷۷)

اگر ان بیانات کا تجزیہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں:-

۱- ویدی دراوڑی تہذیب کے تحت اپنا تقدس کھو چکے تھے۔

۲- اپنشدوں کی تحریک دراوڑی تہذیب کے خلاف ایک ردعمل تھا

ڈاکٹر صاحب اپنی ایک تصنیف " تصورات عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں" اقبال اکیڈمی لاہور۔ ۱۹۷۹، ص ۱۱ پر مہاتما بدھ کے موضوع پر یوں رقمطراز ہیں۔

" یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آرنس نامی کوئی شخص واقعتہ گزرا ہے یا نہیں بعینہ جس طرح کنفیوشس، بدھ اور زرتشت کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہیں تاریخی حقیقت حاصل تھی۔ تاہم آرمیس مت یقیناً موجود تھا۔"

ڈاکٹر صاحب نے یہ حوالہ سرراد ھاکرشنن کی محولہ بالا کتاب (ص ۳۵۰) سے بغیر کسی حوالے کے اٹھا لیا ہے اور اس میں نئے معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ راد ھاکرشنن کی عبارت یہ ہے۔

"WHILE WE ARE WILLING TO ADMIT THAT MUCH OF THE ACCOUNT OF BUDHA IS LEGENDARY, WE ARE NOT SO READY TO ACCEPT THE RECENT VIEW THAT IT IS ALL A LEGEND. WE REFER TO THE THEORY STARTED BY M. SENART AND DEVELOPED BY A FEW OTHERS THAT THE WHOLE STORY OF BUDHA IS A MYTH ADDED AT A LATER DATE TO RELIGION WHICH HAD A NATURAL GROWTH M SENART MAINTAINS THAT WE HAVE IN THE STORY OF BUDHA A SUN MYTH MIXED WITH MANY OTHER METROGENIOUS TENDENCIES WE ARE NOT PREPARED TO ADMIT THIS HYPOTHESIS. THE INCIDENTS RELATED IN THE STO Y OF BUDHA ARE NATURAL AND BELONG TO A REAL TRADITION. WE H EVIDENCE OF THE EARLY EXISTENCE OF THE BOOKS THE RELIGION OF BUDHA CANNOT BE UNDERSTOOD UNLESS IT IS VIEWED AS A WORK OF REAL GENIUS OF COMMANDING SPIRITUAL FERVOUR. EVEN M SENART RECOGNISES BUDHA AS A TEACHER BUT THINKS A SUN MYTH I WOVEN INTO HIS LIFE. THE CENTRAL INCIDENTS OF BUDHA'S LIFE, HOWEVER, CANNOT BE MYTHICAL"

۳۔ بدھ مت دراوڑی تہذیب کے خلاف ردعمل تھا۔

پہلے ویدوں کے تقدس کی بات ہو جائے۔

وید کا مطلب ہے علم۔ ویدوں کے ساتھ ملحق ادب کو ملا کر سمتھا کہا جاتا ہے یعنی اکٹھا کیا ہوا مقدس ترین وید رگ کہلاتا ہے۔ اس کے دس منڈل ہیں جن میں ۱۰۲۸ مناجاتیں (نظمیں) ہیں۔ ان کے علاوہ ۱۱ نظمیں اور بھی اس کے ساتھ ملحق ہیں۔ بندوں کی کل تعداد ۱۰۵۲۲ ہے[1]

دوسرا وید سام وید کہلاتا ہے جو رگ وید ہی کی نظموں پر مشتمل ہے اور اس میں ان نظموں یا مناجاتوں کو گانے کے بارے میں ہدایات ہیں[2]

تیسرا وید یجروید ہے جس میں ۱۰۷۵ نثری اور منظوم بند ہیں[3] ان میں قربانی کی رسومات کی تفصیلات اور جزئیات دی گئی ہیں۔

چوتھا اتھروید ہے جس میں دنیاوی خواہشات کی تکمیل اور کامیابی کے لئے مختلف جادو، ٹونے اور ٹوٹکے دیئے گئے ہیں۔

رگ وید کی تمام مناجاتوں یا نظموں میں مظاہر فطرت کو مخاطب کیا گیا ہے۔ چونکہ متکلم انسان ہے اور مخاطب مظاہر فطرت مثلاً ہوا، آگ۔ پانی۔ بجلی۔ اندرا۔ سورج۔ صبح وغیرہ۔ اس لئے انہیں الہامی رنگ دینے کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مناجاتیں منیوں اور رشیوں نے مختلف اوقات پر برگزیدہ ہستیوں کو سکھا دی تھیں اور انہی لوگوں نے ان کی تدوین کی۔

چونکہ بات ویدوں کے تقدس کی ہو رہی ہے۔ اس لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ ان چاروں کتابوں کو انیسویں صدی کے آخر تک کبھی ضبط تحریر میں نہیں لایا گیا۔ جس کی وجہ اس تقدس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ان کے نزول یا تدوین کے وقت آریاؤں کے ہاں رسم الخط ایجاد نہیں ہوا تھا۔ ان کے ہاں رسم الخط کی ایجاد کا زمانہ ۸۰۰ ق م خیال کیا جاتا ہے۔ یہ دلیل کوئی وزن نہیں رکھتی۔ کیونکہ ہندوستان میں داخل ہونے سے پیشتر آریاؤں کی ایسی قوموں میں مڈبھیڑ ہو چکی تھی جن کے ہاں رسم الخط موجود تھا مثلاً مصری۔ آشوری وغیرہ اور پھر ۸۰۰ ق م کے بعد جبکہ رسم الخط ایجاد ہو چکا تھا۔ ویدوں کو تحریری صورت نہیں دی گئی۔ دراصل اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو تحریر میں لانے سے برہمنوں کی اجارہ داری ختم ہو جاتی۔ صرف البیرونی کے زمانے میں کشمیر میں ایک شخص نے انہیں

---

[1] ہندو ازم۔ مجموعہ مضامین۔ پنجاب یونیورسٹی۔ پٹیالہ۔ ۱۹۶۹۔ ص ۱۔ اس وید کو رگ یا رک (RIK) اس لئے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ بحر یا وزن جس میں یہ نظمیں منظوم ہوتی ہیں رک کہلاتا ہے۔ زخاؤ کتاب الہند (انگریزی)، لاہور ۱۹۶۲ء۔ ص ۱۷۳۔ اس کی قرأت کے طریقوں کے لئے یہی یہی صفحہ ملاحظہ ہو۔

[2] ایضاً؛ زخاؤ ص ۱۷۵

[3] ایضاً ص۱؛ زخاؤ۔ ۱۷۳ا۔

ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے انجام کے بارے میں ہمیں کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ چنانچہ یہ کتابیں پشت در پشت باپ سے بیٹے کو سینہ بسینہ منتقل ہوتی چلی گئیں۔ ان کو حفظ کرنے کا طریقہ بھی عجیب و غریب اور انتہائی منظم تھا۔ جس کی کچھ تفصیل سردل نے بھی دی ہے۔ اس پر مزید وضاحت اس ڈیبیلو نے ایک لیکچر کے ذریعے کی ہے جو یونیسکو کے ادارہ کی طرف سے تیار کیا گیا ہے۔

ویدوں کی تدوین کے زمانے سے قطع نظر، جو کافی گنجلک مسئلہ ہے، اگر صرف ان کے تقدس پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کو ازلی ابدی خیال کیا جاتا ہے لیکن وہ کبھی بھی تلاوت کے طور پر نہیں پڑھے گئے۔ ان پر صرف برہمنوں کی اجارہ داری تھی۔ وہ کشتریوں کو وید پڑھا سکتے تھے۔ لیکن کشتریوں کو انہیں دوسروں کو پڑھانے کی اجازت نہیں تھی۔ ویش اور شودر ویدوں کے منتروں کو سننے کی سعادت سے بھی محروم تھے۔ اور اگر ان میں سے کسی کی زبان پر ویدوں کا کوئی لفظ آ جاتا تو اس شخص کی زبان کاٹ دینے کا حکم ہے[1]

ویدوں کے نفسِ مضمون کے بارے میں مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔ البیرونی کے خیال کے مطابق اس میں اوامر و نواہی اور سزا و جزا کے احکامات ملتے ہیں۔ لیکن ان کا بیشتر حصہ مناجاتوں پر مشتمل ہے اور ان میں قربانیوں کا ذکر ملتا ہے جن کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انسان ان کو شمار نہیں کر سکتا[2] رگ وید کے مضامین کے بارے میں یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بچگانہ اور بے تصنع دعاؤں کا مجموعہ ہیں۔ اس میں کہیں کہیں وحدت کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ قربانیوں پر پڑھی جانی والی دعاؤں کا مجموعہ ہیں۔ یہ علامتی دعائیں ہیں۔ اس میں پشت در پشت مختلف مفکرین کے خیالات ہیں جن کے معانی تہ در تہ ہیں اور یہ اس زمانے کے سادہ مذہب کا مظہر ہیں۔ یہ دعائیں اکثر اور بیشتر سیدھی سادھی ہیں جن میں ایک سادہ ذہن کے مذہبی احساس کا پتہ چلتا ہے۔ آخری دعائیں ایسی بھی ہیں جن میں انسان اور کائنات کے متعلق خیالات میں بلوغت کی جھلک نظر آتی ہے۔ بیشتر دعاؤں میں مختلف دیوتاؤں اور مظاہر قدرت کو مظاہر خداوندی کے طور پر مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ اوائل آدمی کی ابتدائی شاعرانہ دعائیں ہیں جو گستاخ فکر اور لاینحل سوالات سے پناہ کی تلاش میں سرگرداں رہے اور آخر میں، یہ دعائیں صرف اس حد تک فلسفیانہ اہمیت کی حامل نہیں کہ انسان کائنات کے راز ہائے سربستہ کو الہام یا کسی ماورائی قوت کے بغیر محض عقل کے ذریعے کھولنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ ان دعاؤں میں جو ذہن جھلکتا ہے۔ اس میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔

رگ وید کے مندرجات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ان کا رشتہ ہندو مذہب سے دیکھنا بھی ایک لازمی امر ہو جاتا ہے۔ وید کبھی بھی، کسی بھی زمانہ میں، ہندو مذہب کے اصولوں یا اعتقادات کا سرچشمہ نہیں رہے۔ یہ غیر منظم اعتقادات کا مجموعہ ہیں اور موجودہ صورت میں ہندو مذہب کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً ویدوں میں بتوں کا کوئی

---

[1] البیرونی: ۱۶۹، نزاد چوہدری: ۱۸۱۔
[2] البیرونی ص ۱۶۹، ۱۷۰، ارادھاکرشنن ۶۹-۷۱

تصور نہیں۔ مندر کا تصور نہیں۔ یہ صرف مذہبی قربانیوں تک ہی محدود مناجاتیں ہیں۔ آریا ان موقعوں پہ گاتے کا گوشت بھی کھاتے تھے اور جن دیوتاؤں کا ذکر ان ویدوں میں ملتا ہے وہ ہندوؤں کے اعتقادات کا حصہ کبھی نہیں رہے۔ یہ کتابیں نہ تلاوت کی جاتی تھیں اور نہ ہی ان کی کوئی ادبی حیثیت ہے۔ ان کی زبان بہت پہلے ہی متروک ہو چکی تھی اور ہیں دور نہیں ۵۰۰ ق م ہی میں رگ وید کے الفاظ متروک ہونا شروع ہو گئے تھے اور اس کے سدباب کے لئے اسی زمانے میں ایک کتاب "نروکتا" تصنیف کی گئی تاکہ ویدوں کی افادیت باقی رہ سکے[1] اب ان کی زبان اس قدر قدیم اور متروک ہے کہ اس کے جاننے والے اور اس کو سمجھنے والے لوگ خال خال ہی رہ گئے ہیں۔ البیرونی نے اپنے زمانے میں رگ وید کے بارے میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔

"برہمن ویدوں کے معانی سمجھے بغیر ان کو پڑھتے ہیں اور اسی طریقہ سے وہ ان کو حفظ بھی کرتے ہیں اور ایک سے دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔ بہت ہی کم لوگ ان کی تشریح سے واقف ہیں اور ان سے بھی کہیں کم تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو اس کے مندرجات پہ عبور حاصل ہوا اور اس کی تفسیر کر سکنے کے اس حد تک اہل ہوں کہ وہ ان پہ مناظرہ کرنے کے قابل ہوں[2]" ویدوں نے ۹۰۰ ق م کے لگ بھگ اپنا تقدس کھونا شروع کر دیا تھا[3] ویدوں کا جو حصہ قابل عمل ہے وہ کرم کنڈ ہے اور اس کے خلاف بھی ہندو احتجاج کر چکے ہیں۔ لیکن رسمی طور پہ یہ دعائیں اب بھی زندہ ہیں اور استعمال ہوتی ہیں اگرچہ ان کے پڑھنے والے اور سننے والے ان کے معانی سے بے خبر ہیں جو رسومات شادی بیاہ اور موت کے موقعوں پہ ادا ہوتی ہیں۔ ان میں یہی دعائیں پڑھی جاتی ہیں لیکن موت کے بارے میں ہندوؤں کے موجودہ یا قدیم اعتقادات سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ موت کے بارے میں ویدک نظریات، کرم اور تناسخ کے عقائد میں تضاد پایا جاتا ہے وہ لاینحل ہے اور نظر اس لئے نہیں آتا کہ ویدوں کی زبان سمجھنے والا کوئی نہیں۔ ویدوں میں ہندوؤں کا اعتقاد سراسر مصنوعی ہے اور مستشرقین کا پیدا کیا ہوا ہے۔

آریاؤں کا مذہب ویدک کہلاتا تھا۔ اس کی بنیاد ویدوں پر تھی۔ ہندو ازم آٹھویں صدی عیسوی کی اختراع ہے۔ ویدک لوگ صرف ان دیوتاؤں کو پوجتے تھے جن کا ذکر ویدوں میں موجود تھا۔ ان میں اندر جنگ اور موسموں کا دیوتا تھا۔ یہ شرابی اور بداخلاق تھا جسے ضیافتوں اور پینے پلانے کا بہت شوق تھا۔ رگ وید میں اس کی شراب نوشی پہ ایک نظم بھی ملتی ہے۔ سورج سے متعلق کئی دیوتا تھے۔ اگنی یعنی آگ بھی ایک دیوتا۔ سوم یا سوما شراب جو قربانی کے وقت پی جاتی تھی اور جو شاید حشیش یا بھنگ کی قسم تھی، بھی ایک دیوتا تھی۔

۱؎ ہاشم ۲۳۳

۲؎ البیرونی ۱۶۹

۳؎ ہاشم ۲۴۱

لیکن اخلاقی اعتبار سے اہم ترین دیوتا " ورونا " (یعنی ہوا) تھا اور اس کا ہر اہمیت کے اعتبار سے اندرا کے بعد دوسرا تھا۔ ہمیں چند دیویاں بھی اس مذہب میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً پرتھوی (زمین) آدیتی (دیوتاؤں کی ماں) اوشا (صبح کی دیوی) راتری (رات کی دیوی) ارینانی (جنگل کی دیوی) یہ سب کچھ بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ آریاؤں کا مذہب کوئی سماوی یا الہامی مذہب نہیں تھا۔ بلکہ اپنی صحیح صورت میں یہ بھی ANIMISM کی ایک صورت تھی جس میں ان طاقتوں کی پرستش کی جاتی تھی جن پر انسان کو کوئی اختیار نہ تھا یا جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ ان طاقتوں کو انہوں نے مختلف سروپ دے کر دیوتاؤں اور دیویوں کے قالبوں میں ڈھال لیا تھا[1] ان دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے اور ان سے مدعا طلبی کے طور پر قربانیاں کی جاتی تھیں۔ مدعا طلبی کی بھی کئی صورتیں تھیں۔ جنگ میں فتح، اولاد، دھن دولت، مویشیوں کی افزائش، طوالت عمر وغیرہ ان میں نمایاں مدعا تھے۔ قربانی ویدک مذہب کا بنیادی رکن تھا۔ سب سے بڑی قربانی اشومیدھ یگیہ تھی جس کی اجازت[2] علاقے کے سب سے طاقتور بادشاہ یا راجہ کو تھی، چھوٹی موٹی قربانیاں تو ہوتی ہی رہتی تھیں۔ لیکن یہ گھوڑے والی قربانی (اشومیدھ یگیہ) اہم ترین تھی۔ قربانیاں برہمنوں کے ذریعے تکمیل پاتی تھیں اور اس رسم کا اہم ترین رکن برہمن ہوتے تھے۔ اس وجہ سے برہمنوں کے وقار اور اہمیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا تاآنکہ وہ فرمانروا والے وقت کے مقابلے میں بھی کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہوگئے۔ اور یہ یقین راسخ ہوگیا کہ قربانی کے وقت وہ کوئی منتر غلط پڑھ کر نہ صرف قربانی کا اصل مقصد مفقود کر سکتے ہیں بلکہ بادشاہ وقت کا وقار بھی خاک میں ملا سکتے ہیں چنانچہ ان امور کے پیش نظر برہمنوں کی خوشنودی حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔ اس کی دشمنی بدترین دشمنی خیال کی جاتی تھی۔ ویدک مذہب میں یہ تصورات تقریباً ۹۰۰ ق م میں یعنی مہاتما بدھ سے تقریباً چار سو سال پہلے جڑ پکڑ چکے تھے۔ اس زمانے میں دیوتاؤں کی اہمیت میں بھی فرق آ چکا تھا۔ رگ وید کے بڑے بڑے دیوتا چھوٹے اور چھوٹے دیوتا بڑے ہوگئے تھے اور وہ زیادہ طاقتور بن چکے تھے۔ اسی زمانے میں ویدک دیوتا " ردرا " اور وشنو کو مدغم کرنے پر شیو دیوتا وجود میں آیا[3] اگرچہ تھاپر کو اس امر سے اختلاف ہے۔ ان کے خیال میں شیو ایک تامل دیوتا ہے جس کا ادغام " ردرا " سے کیا گیا[4]

ویدک مذہب کا تیسرا رکن ورن ہے۔ ورن سے مراد رنگ ہے اور یہ ذات پات کے تصور اور اعتقادات کا منبع و ماوی ہے۔ ہندوستان میں داخل ہونے وقت آریاؤں کے ہاں ایک عمودی سماجی تقسیم جس کے تحت ایک قبیلہ یا سماج براہمن، کشتری اور ویش، ان تین طبقوں میں تقسیم تھا[4] اس موضوع پر رگ وید کے

---

[1] ایضاً ۲۳۶

[2] باشم ۱۴۲ [3] تھاپر ۱۳۳

[4] ایضاً ۲۷، ۳۹؛ باشم ۳۴، ۳۵، ۲۴۰، ۲۴۱

آخری حصہ میں ایک نظم بھی ملتی ہے جو انسانیت کی اس تقسیم کی وضاحت بھی کرتی ہے۔ ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد ان میں ایک چوتھا طبقہ بھی شامل ہو گیا اور یہ تھا شودروں کا طبقہ۔

ویدک عہد میں ہر قسم کی شادی کا رواج تھا۔ جہاں ایک شوہر ایک بیوی کا تصور موجود تھا۔ وہاں کثرت ازدواج کی بھی اجازت تھی اور چند شوئی یعنی POLYANDRY کا اصول بھی موجود تھا۔ دہروپدی کے چار خاوند تھے۔ یہ اس بات کی علامت ہیں اور اگرچہ نزدیکی محرکات (INCEST) سے اجتناب برتا جاتا تھا لیکن یہ امر دیوتاؤں کے لئے ممنوع نہیں تھا اور چند صاحب اقتدار قبائل اپنا نسب و نژاد اسی فعل سے منسوب کرتے تھے[1]۔

سماج میں اس عمودی طبقاتی تقسیم کے علاوہ ویدک عہد میں انسانی زندگی کو بھی چار آشرموں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

شراب نوشی اور نشہ بازی عام تھی۔ سوم رس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ دوسری شراب "سورا" تھی۔ جہاں سوم کا استعمال مقدس موقعوں پر ہوتا تھا۔ وہاں یہ شراب عام استعمال کی چیز تھی۔ اس کا ذکر بھی ہمیں رگ وید میں ملتا ہے۔

جوا آریاؤں کی عام عادت تھی اور ہندوؤں میں لکشمی دیوی کو خوش کرنے کے لئے دیوالی پر آج کل بھی جوئے کا عام رواج ہے۔ رگ وید میں ایک نظم جواری کے بارے میں بھی ملتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عادت ویدک معاشرہ میں کتنی عام تھی[2]۔

مجموعی طور پر آریا وحشی اور غیر مہذب تھے۔ ان میں گناہ و ثواب اور حرمت کے تصورات وہ نہیں تھے جو بعد کے ہندو معاشرہ میں ملتے ہیں[3]۔

یہ ہیں اس تہذیب کے خدوخال جن کو ڈاکٹر صاحب "سماوی" تہذیب خیال کرتے اور وہ معاشرہ جو ان کے نزدیک "سماوی" اقدار کا حامل تھا۔ یہ ہے وہ "مشعل برداروں" کا قافلہ جس کی تعریف میں ڈاکٹر صاحب اتنے رطب اللسان ہیں کہ ان کی پوری کتاب اس معاشرے کی تعریف میں ایک قصیدہ معلوم ہوتی ہے اور یہی ہے وہ پس منظر جس میں ہمیں اپنشدوں اور بدھ ازم اور ان کی تعلیمات پر غور کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ان دو موضوعات پر ڈاکٹر صاحب کے بیانات کس حد تک تاریخی نقطۂ نظر سے صحیح ہیں۔

چھٹی صدی قبل مسیح کا دور انسان کی تاریخ میں ایک تاریخ ساز عہد تھا۔ اس زمانے میں اقوام عالم میں ذہنی اور مذہبی تحریکیں وجود میں آرہی تھیں۔ ان تحریکوں نے چین، ایران، یونان، فلسطین اور ہندوستان کو بہت متاثر کیا۔ ہندوستان میں انقلابی تحریک کی پہلی کروٹ ہمیں رگ وید کی اس نظم میں ملتی ہے۔ جس کو مورخ CREATION HYMN کہتے ہیں۔ اس میں پہلی دفعہ آریائی ذہن مظاہر فطرت سے ہٹ کر انسان، کائنات اور اس کے

۱؎ کھایہ ۵۱۰۵۰

۲؎ باشم ۳۶، ۳۷

۳؎ ایضاً

حالات کے باہمی رشتوں کے بارے میں نئی سوچ اور نئی جستجو میں مصروف نظر آتا ہے یہ نظم رگ وید کے آخری دور کی نظم ہے[1] اور بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ویدوں کی تاریخ، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، حتمی طور پر متعین نہیں ہوئی۔ لیکن ان کے اختتام کے ہم قدرے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ۶۰۰ ق م اور ۸۰۰ ق م کے قرب وجوار میں ہوا[2] اس عہد کی ابتدا کو ہم اور پیچھے بھی لے جا سکتے ہیں اگرچہ اس کے لئے ہمارے پاس شہادت بہت کم ہے[3] چند مشترکہ ناموں سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی ابتدا اس زمانے میں ہو چکی تھی جب آریا لوگ عراق میں تھے[4] چنانچہ ویدک عہد کی ابتدا سے لے کر، جس کے بارے میں ہم وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے، ۶۰۰ ق م تک کا زمانہ سرُتی عہد کہلاتا ہے[5] اس عہد کی تمام تصنیفات یعنی چاروں وید، براہمن، آریانیکا (جن کو انگریزی میں FOREST TREATISES کہتے ہیں اور جن کا شمار بھی کچھ لوگ اپنشدوں ہی میں کرتے ہیں) اور اپنشد یعنی "سن ہوئی"، دوسرے معنوں میں "الہامی" کہلاتی ہیں۔ اس کے بعد یعنی ۶۰۰ ق م سے ۸۰۰ عیسوی تک کا زمانہ سمرتی کہلاتا ہے۔ اس عہد کی کتابیں یعنی ویدانگا، پران، مہابھارت، رامائن، سوترا اور ہندو فلسفہ کے مختلف مکاتیب فکر سے متعلق کتابیں اور دہرم شاستر وغیرہ سمرتی کہلاتی ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں کتابوں میں یہ "الہامی" اور "غیر الہامی" امتیاز بہت اہمیت کا حامل ہے اور اس کے پیش نظر ہم دیکھتے ہیں کہ اپنشد جن کو ڈاکٹر صاحب دراوڑی مذہبی عناصر کے خلاف آریائی ردعمل قرار دیتے ہیں کس حد تک درست ہے۔

ا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اپنشد اور آریانیکا ایک ہی چیز ہیں[6] یہ کتابیں ان لوگوں کی مرتب کی ہوئی ہیں اور ان لوگوں کے افکار پر مشتمل ہیں جو ظاہری قربانیوں اور رسومات پر یقین نہیں رکھتے تھے اور مذہب کے باطنی معنوں کی تلاش میں تھے۔ یہ عقل و فکر سے کام لیتے تھے۔ ان کے لئے جنگل کی فضا زیادہ سازگار تھی۔ جہاں قربانیوں اور دیگر رسومات سے انہیں نجات حاصل تھی۔ ان لوگوں کی تصنیف کی ہوئی کتابوں کو "آریانیکا" اور اپنشد کہا جاتا ہے۔ اپنشدوں کی تعداد مختلف بتائی جاتی ہے۔ یہ ۱۰۸ بھی ہے، ۱۱۲ بھی اور ۱۲۰ بھی۔ ان کا تعلق دونوں زبانوں سے ہے۔ یعنی شرُتی سے بھی اور سمرتی سے بھی[7] چند اپنشدوں کے بارے میں ہم حتمی طور پر جانتے ہیں

---

[1] ترجمہ کے لئے دیکھیں باشم ۲۴۷ - ۲۴۸ اور تھاپر ۴۵

[2] سندرارجن۔ ہسٹاریکل سروے، مطبوعہ ہندوازم۔ پنجاب یونیورسٹی پٹیالہ ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۵، ۱۶، حاشیہ نمبرا

[3] نراد چوہدری ۱۸۲

[4] باشم ۴۰۰

[5] سندر راجن ۳

[6] سین ۵۲

[7] سین ۵۳۔ تھاپر ۳۳ جوآن ماسکارو: دی اپنشدز۔ پیلیکن ۱۹۶۵ء، ص ۷

کہ یہ شرِدتی عہد کی پیداوار ہیں۔ چینڈوگیا۔ برہادا، آرانیکا، ایتریا، کوسیتاکی، کینا، کٹھو، پراشنا اور ایسا۔ شردتی عہد سے تعلق رکھتے ہیں لیے گیتا بھی تقریباً ۵۰۰ ق م میں وجود میں آئی[1] لیکن یہ سمرتی عہد کی کتاب مہابھارت کا چھٹا حصّہ ہے۔ یہ بھی اپنشد ہی کہلاتی ہے[2]۔ اپنشد دراصل مختلف ویدوں کے نتیجے ہیں اور ہر وید سے ملحق اس کے اپنے اپنشد ہیں اور ہر اپنشد کا پہلا اشلوک اس کا مخصوص وید سے تعلق ظاہر کرتا ہے جس کا وہ حصّہ ہے[3] چنانچہ یہ وہ کتابیں ہیں جو ویدانت یعنی اختتامِ وید سے متعلق ہیں اور ان کا نقطۂ نظر بھی ویدک ہی ہے[4]۔

۲۔ لفظ اپنشد کے مختلف معنی بتائے جاتے ہیں[5] لیکن یہ طے ہے کہ یہ خفیہ تعلیمات تھیں[6] جو ان لوگوں کو دی جاتی تھیں جو صرف اہل لوگوں کو دی جاتی تھیں۔ ان میں سے اکثر کے مصنف کشتری ورن سے تعلق رکھتے تھے۔

۳۔ جنوب سے یعنی دراوڑوں سے آریاؤں کا تعلق ۸۰۰ ق م[7]، سدا سوڈ[8] اور ڈاکٹر صاحب بھی اس امر سے متفق ہیں کہ رامائن اسی تعلق کی داستان ہے اور یہ مہابھارت کے بعد کا واقعہ ہے (اگرچہ مہابھارت اور رامائن کی تاریخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے[9]) اس امر کے باوجود کہ مہابھارت پہلے کی کتاب ہے اور گیتا اس کا چھٹا حصّہ ہے تو اس میں رام کا نام اور اس کا ذکر کیسے آگیا[10]۔ چنانچہ اگر تاریخیں درست ہوں تو ۶۰۰ ق م یعنی اپنشدوں کی تصنیف کے وقت ویدک تہذیب میں دراوڑی تہذیب کے عناصر جیسے الزاندار ہو سکتے ہیں، یہ سوچنے وقت فاصلوں اور ذرائع آمد و رفت کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے اس نظریہ سے کہ اپنشد دراوڑی تہذیب کے خلاف ایک ردِعمل کے طور پر وجود میں آئے، اتفاق کرنا مشکل ہے۔ یہ اپنشد اسی CREATION HYMN والی سوچ کو آگے بڑھاتے ہیں اور اسی فکر کا ارتقا ہیں۔

---

[1] سندراجن ۱۶ حاشیہ ۷، ماسکارو ۷
[2] سندراجن ۳۔
[3] ماسکارو ۷
[4] سین ۵۳۰
[5] کرجی ۵۷، ۵۸
[6] سندراجن ۱۶ حاشیہ ۷
[7] سندراجن ۲
[8] نخاپہ ۲۵، ۲۶
[9] کرجی ۶۲، نراد چوہدری ۵۰، نخاپہ ۲۱، ۲۲؛ باشم ۴۱۲
[10] ماسکارو، ترجمہ بھگوت گیتا پیلیکن، ۸۶ اشلوک ۳۱؛ پرابھاوانندا اور اشروڈ۔ بھگوت گیتا۔ مینٹر۔ ص ۸۹

۴۔ ہر مذہب کے DOGMA کے ساتھ ساتھ اس کا مابعد الطبعیاتی حصہ بھی ہوتا ہے اور یہ اپنشد ایسی ہی مابعد الطبعیاتی سوچ پر مبنی ہیں ان کا موضوع برامن یعنی "روح کائنات" اور انسانی روح آتما ہے یہ ڈاکٹر صاحب نے ان کتابوں کو دراوڑی تہذیبی عناصر کے خلاف ایک آریائی ردعمل کہہ کر ان کو تقدیس اور انسانی فکر کی اس رفعت کے پایہ سے گرا دیا ہے، جن کی وہ مستحق ہیں اور جس کا ہلکا سا تاثر ہمیں شوپنہار کے ان الفاظ میں ملتا ہے جب اس نے ان کو پڑھ کر یہ کہا تھا کہ ان کا مطالعہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی ڈھارس ہے اور اس کی موت کی بھی ہے[1]

۵۔ بھگود گیتا بھی ایک اپنشد ہے اور یہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس میں بھی وہی آریائی ردعمل دیکھنے کی بے سود کوشش کی ہے اور کرشن کی تاریخی حیثیت کو مسخ کرکے رکھ دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "کرشن دراوڑی تہذیب کی علامت ہے اور مہابھارت کا کرشن غیر آریائی اور تہذیبی اقدامات کا مرتکب ہوتا ہے" ص ۵۷۔ دراصل ڈاکٹر صاحب دراوڑوں کو رگیدنے میں اور آریائی تہذیب کا پرچم بلند سے بلند تر کرنے کے جوش میں علم پر اپنی گرفت مضبوط نہیں رکھ سکے۔ کیونکہ تھوڑی سی کاوش سے انہیں یہ چل جاتا کہ کرشن کی تاریخی حیثیت مسلم ہے وہ آریاؤں کے یادو قبیلے کی ایک شاخ ورشنی کا سردار تھا۔ یادو متھرا اور دوارکا میں حکومت کرتے تھے اور ان کے وفاق میں ورشنی کے علاوہ بھوج، ککر اور اندھکا قبائل شامل تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا دوسرا اعتراض کرشن کے کردار پر ہے جو اس نے مہابھارت میں ادا کیا اور جسے وہ دراوڑی تہذیب کا مظہر خیال کرتے ہیں۔ اس بارے میں راقم الحروف کو سوائے اس امر کے کچھ نہیں کہنا ہے کہ آلڈس ہکسلے کے خیال میں یہ کتاب PERENNIAL PHILOSOPHY کا مظہر ہے جس کا جزو اول وحدتِ خداوندی، دوئم معرفت یا وجدان کے ذریعے حقیقت ازلی کا ادراک، سوئم انسانی فطرت میں خیرِ خداوندی کا ایقان اور چہارم انسانی زندگی کا مقصد حصول معرفت الٰہی مانے جاتے ہیں یہ دانشور موصوف اس کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"KRISHNA WHO IS HERE THE MOUTHPIECE OF HINDUISM IN ALL ITS MANIFESTATIONS, FINDS IT PERFECTLY NATURAL THAT DIFFERENT MEN SHOULD HAVE DIFFERENT METHODS AND EVEN APPARENTLY DIFFERENT OBJECTS OF WORSHIP"[2]

---

[1] اعظم وڈ ریبرہ بھگوت گیتا محولہ بالا۔ ص ۱۹

ایک فاضل اور صاحب علم کے ان الفاظ کے بعد اس موضوع پہ مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی سوائے اس امر کے کہ کرشن کا ۸۰۰ اور ۱۲۰۰ عیسوی کے درمیان "تامل دیوتا" مایاؤں" سے تطابق پیدا کیا گیا[1] اور اس کی بیلا کے چرچے ہونے لگے۔ باشم اس کو "مایاؤں" دیوتا ہی مانتا ہے اور اس کا دراوڑوں سے شمالی ہند میں بذریعہ ابھیر قبیلہ پہلی صدی عیسوی میں منتقل ہونا بیان کرتا ہے[2] اگرچہ دیوکی کے بیٹے کرشن کا ذکر ہمیں اپنشدوں میں بھی ملتا ہے[3] افسوس اس امر کا ہے کہ آریاؤں کی مدح و ثنا کے جوش میں ڈاکٹر صاحب کے قلم نے ٹھوکر کھا کر خود آریاؤں کو ان کے عظیم ورثہ یعنی بھگوت گیتا سے محروم کر دیا ہے۔ آج بھی گیتا کی علمی، ادبی، فلسفیانہ اور تصوفانہ اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا فلسفۂ ویدانت کا گیتا بنیادی رکن ہے۔

۶۔ اپنشدوں کا زمانہ سیاسی، فکری، اقتصادی اور ذہنی انتشار کا دور تھا[4] ذہنی اور فکری انتشار کا سراغ ہمیں اس CREATION HYMN میں ملتا ہے جہاں فکر کا محور بجائے مظاہر قدرت کے انسان کی ذات بن جاتی ہے سوتح میں یہی انقلاب اپنشدوں میں منعکس ہوتا ہے۔

۷۔ آج تک کسی بھی ہندو فلسفی یا مفکر نے اپنشدوں کو اس رنگ اور اس روپ میں پیش نہیں کیا جس میں ڈاکٹر صاحب انہیں پیش کر کے مسرت محسوس کرتے ہیں۔ باشم جو ڈاکٹر صاحب کا ایک اہم مآخذ ہے، ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ ایک ہندو مفکر کے خیال میں تمام ہندو فلسفے، مذاہب اور ان کے فرقے اور تمام سماجی اداروں کا منبع یہی وید اور اپنشد ہیں۔

۸۔ ان امور کے پیش نظر یہ بات کہیں زیادہ قرین قیاس اور معقول ہے کہ اپنشد اس ردعمل کی پیداوار ہیں جو براہمنوں اور ان کی ہوس پرستی کے خلاف ظہور پذیر ہوا۔ اس کی صورتیں ہمیں بدھ ازم، جین مت اور اجیوکا ازم کے تیاگ اور سنیاس میں نظر آتی ہیں[5] یہ عمل اور ردعمل کی صورت ہیگل کے جدلیاتی فلسفہ کے سخت زیادہ آسانی سے حل ہو سکتی ہے بہ نسبت جدلیاتی فلسفہ کا آریائی اور غیر آریائی منطقی زمرے یعنی CATEGORIES پہ اطلاق کرنے کے۔ ہندو ثنویت نے مظاہر حقیقت کو مذکر اور مؤنث زمروں میں تقسیم کیا ہے[6] اور ڈاکٹر صاحب اس کے تتبع میں ارضی اور سماوی ثنویت کے چکر میں پڑ گئے ہیں اور انہیں زندگی،

---

[1] مغایرہ ۲۶۰
[2] باشم ۳۰۵
[3] چندوگیا اپنشد ۱۱۱-۱۷-۶
[4] مکرجی ۶۰
[5] مکرجی ۱۲۱
[6] ایضاً ۲۰

انسانی تاریخ اور کائنات کے تمام مظاہر میں نر اور مادہ کا روپ نظر آتا ہے ثنویت کا یہ طرز فکر صرف ہندوؤں کے ہاں ہی نہیں ملتا بلکہ ایسی طرز فکر چینیوں کے ہاں بھی ہمیں ین اور یانگ کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ جہاں ان کی کارفرمائی "ساری زندگی میں نظر آتی ہے خواہ وہ مابعدالطبیعیاتی تفکر ہو، شادی ہو یا کھانا پکانے کا عمل۔ جہاں کہیں بھی ہم آہنگی کی تلاش ہو یا کوئی تبدیلی واقع ہو" چینی فلسفہ کا یہ مکتب "اسی ین اور یانگ کے ذریعے ہی اس کا موازنہ کرتا ہے"۔ چنانچہ ہیگل کی جدلیات جہاں ارتقا حرکت اور عمل کے تجزیے میں THESIS، ANTITHESIS اور SYNTHESIS کا اصول کارفرما ہے اور جہاں اس ثنویت کو مذکر اور مؤنث زمروں میں تقسیم نہیں کیا جاتا، ڈاکٹر صاحب کی نظر میں قابل اعتقاد نہیں ہے لیکن اسی ثنویت کے وہ روپ جو ادنےٰ سطح پر ہیں اور جن پر ابتدائی انسان کے تفکر کی انتہا تھی اور جو انسان کے ایام طفولیت کی یادگار ہیں، ان کی نظر میں قابل قبول ہیں۔ ان کی زیر نظر کتاب اس قسم کے ثنویت کے ابتدائی تصورات سے پٹی پڑی ہے یہ روش درست ہے یا غلط، یہ ایک الگ سوال ہے اور اس پر فیصلہ صادر کرنا راقم کا نہیں، ان کے قاری کا کام ہے۔ البتہ یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ہیگل کی جدلیات زیادہ سہل، زیادہ سادہ اور کہیں زیادہ نفی مانند ہے وہ بچوں کی طرح نر اور مادہ کے چکر میں نہیں پڑتا اور اس حیوانی سطح پر نہیں اترتا جہاں کائنات کے ہر سلسلہ کا منبع نر اور مادہ کا اختلاط ہے۔

۹۔ ویدانت کے THEISTIC اور ABSOLUTISTIC دونوں مکاتیب فکر کے لئے اپنشد، ویدانت سوتر اور بھگوت گیتا اساس مہیا کرتے ہیں[1]۔ اپنشدوں کو دراوڑی تہذیب کے عناصر کے خلاف ردعمل قرار نہ دینے کی یہ وجہ بھی ہے کہ یہ کبھی ایک تحریک کی صورت میں نمودار نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ خفیہ تعلیمات تھیں جو خواص تک محدود اور عوامی سطح کبھی نہیں پہنچ پائیں۔ دوئم ہندو مذہب میں دوسرے مذاہب کو، اپنے سے متضاد عقائد کو، مختلف مکاتیب کو اپنے اندر مدغم کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے جو اس کی اس تعریف سے ظاہر ہے جو ہم اوپر دے آئے ہیں۔ اگر اپنشد تحریک کی صورت میں نمودار ہوتے تو ان کا اثر عوام اور خواص دونوں پر ہوتا جیسا بدھ مت میں ہوا۔ بدھ مت بھی ڈاکٹر صاحب کے خیال کے مطابق دراوڑی تہذیب کے خلاف ایک آریائی ردعمل تھا۔ لیکن اس مذہب نے ڈاکٹر صاحب کے خیال کے برعکس "اپنے دروازے پوری انسانیت پر مذہب، رنگ، نسل، ذات، ورن، سکونت یا کسی اور اسی قسم کی تخصیص کے بغیر عوام اور خواص، دونوں پر کھول دیئے[2] اور شودر اور برہمن سبھی اس تحریک میں شامل ہوئے۔

چنانچہ ان امور کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب کا یہ نقطۂ نظر کہ اپنشد دراوڑی تہذیب کے عناصر کے خلاف

---

[1] ڈاکٹر مہادیوان: ہندو میٹا فزکس، مطبوعہ ہندوازم، پٹیالہ، محولا بالا۔ ص ۲۸
[2] مکرجی ۱۱۱

آریائی ردعمل کی صورت میں وجود میں آئے۔ کو قبول کرنا تاریخی حقائق کے پیشِ نظر بالکل ناممکن ہے اور ان کے پیچھے محض یہ جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ نووارد آریا مقامی لوگوں سے ہر لحاظ سے بہتر تھے اور وہ ہندوستان پہنچ کر یہاں کی آبادی سے مل کر خراب ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کے نرا اور مادہ پر مبنی جدلیاتی عمل نے ڈاکٹر صاحب کو ان مشکلات میں الجھا دیا ہے جہاں سے ان کا نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ بدھ ازم، اپنشدوں کی طرح دراوڑی عناصر کے خلاف آریائی ردعمل تھا، اس جدلیاتی عمل کا نتیجہ تو ضرور ہے لیکن اس نتیجے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ حقیقت اس کے سراسر برعکس ہے۔ اگر بدھ ازم دراوڑی تہذیب کا ایک آریائی ردعمل ہوتا تو وہ ویدک مذہب کی بنیاد کی نفی کیوں کرتا، بدھ ازم ویدوں اور ان کے تقدس پر یقین نہیں رکھتا۔ اس طرح وہ ذات پات اور ورن کے تصورات پر بھی یقین نہیں رکھتا[۱] اور نہ ہی وہ قربانی اور اس سے متعلقہ رسومات پر یقین رکھتا ہے۔ ویدوں میں خصوصاً CREATION HYMN میں ہمیں وحدت کی طرف ایک مبہم رجحان کی طرف اشارہ ملتا ہے لیکن اپنشدوں میں یہ موضوع برا ہما اور آتما کی بحث کے تحت مکمل کر سامنے آجاتا ہے۔ اس کے بعد بدھ خداوند تعالیٰ کے وجود یا عدم وجود کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔ بدھ کے نظام حیات کے لئے اس "مفروضے" کی ضرورت نہیں۔ بدھ کی یہ روش وحدت کی اس روایت سے ہٹ کر ہے جو آریاؤں کے ویدک عہد کے آخر میں خصوصاً اپنشدوں میں نمودار ہو چکی تھی اور اگر بدھ ازم ویدک مذہب کی تطہیر ہی مقصود تھی تو اس نے اپنے دروازے ہر کہہ و مہ کے لئے کیوں کھول دیئے اور ان کہہ و مہ میں براہمن، کشتری، ویش اور شودروں کے علاوہ تمام مقامی قبائل اور خود دراوڑ، شامل تھے اس نے انسانیت کو آریاؤں کی طرح مختلف خانوں میں بند نہیں کیا۔ بلکہ تمام انسانوں کو یکساں مقام دیا۔ یہاں تک کہ عورتوں کو جن کے حقوق راسخ العقیدہ براہمن رفتہ رفتہ محدود کر رہے تھے، اس نے ایک محترم مقام عطا کیا[۲] زندگی کے تمام مظاہر جن میں انسان کے علاوہ حیوانات اور نباتات تک شامل ہیں، بدھ کی نظر میں قابل احترام ہیں۔ یہ ایک انقلابی قدم تھا چنانچہ ان تمام کوائف کے پیش نظر معتقدین یہی کہنے پر مجبور ہیں کہ بدھ ازم ایک ایسی تحریک ہے جو قدیم آریائی مذہب مسلمہ عقائد کے خلاف جاتی ہے۔ یہ ایک مقامی تحریک تھی اور مقامی باشندوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے وجود میں آئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک نے پرستش وہ تمام طریقے اور رسومات اپنا لئے جو عوام میں مقبول تھے[۳] ان طور طریقوں میں درختوں کی پوجا اور "ارضی تہذیب" سے وہ تمام عناصر شامل ہیں جن کی مدد کرنے کے لئے بقول ڈاکٹر صاحب کے، یہ تحریک وجود میں آئی۔ مزید برآں اگر

---

[۱] سامروں۔ ٹامس بی کالنفس۔ سٹڈی آف ہسٹری۔ آکسفورڈ۔ ۱۹۶۲ ری پرنٹ۔ ص ۳۰۲

[۲] تعابیر ۷۶

[۳] تعابیر ۷۰

تحریک نے ویدک عہد کی زبان سنسکرت کو بھی قبول نہیں کیا اور اس کی جگہ عوام سے رابطہ پیدا کرنے کے لئے وہی زبان اپنائی جو عوام کی اپنی زبان تھی یعنی مگدھی[1]

بدھ ازم اور جین ازم کا طرۂ امتیاز یہ نہیں کہ وہ دراوڑی تہذیب کے خلاف آریائی ردعمل تھے۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ ان کی بنیادی تعلیمات نے جہاں سانکھیہ اور یوگا مکاتیب فکر سے کچھ خیالات اخذ کئے وہاں انہوں نے کئی قدیم مقامی تصورات جو براہمن ازم کے حدود سے باہر تھے بنیادی حیثیت دی اور دکھ کو انسانیت کا جزو لاینفک قرار دیا۔ اس سے بدھ ازم پر مایوسی کا گہرا سایہ ہے۔ اس کے برخلاف ویدک مذہب رجائیت کا حامل ہے اور انسان کو قربانیوں اور رسومات کے ذریعے اپنے ان دکھوں سے نجات کے علاوہ روشن اور پر امید مستقبل کا پیام دیتا ہے۔

بدھ ازم اور جین ازم سانکھیہ فلسفہ کو شامل کر کے اس کائنات کا ایک منطقی سائنسی اور غیر معبودی تصور پیش کرتے ہیں جس میں ANIMISM کے متعلق قدیم خیالات کے تحت زندگی کی وحدت کی نشاندہی کرتے ہیں خواہ وہ زندگی انسان کی ہو، حیوان کی یا نباتات کی اور یہی بات تناسخ کی بنیاد مہیا کرتی ہے۔ تو اس صورت میں ہم کس طریقے سے بدھ ازم کو ایک آریائی تحریک کہہ سکتے ہیں۔ اس کا طرۂ امتیاز تو یہی ہے کہ یہ مقامی عناصر، عقائد اور تصورات کے باہم مدغم ہونے سے ویدک مذہب کے خلاف ایک شدید ردعمل تھا۔ کیونکہ بدھ ازم نے ویدک روایات، ویدک علم، ویدک طرز زندگی اور ویدک سماجی تنظیم کو درہم برہم کر دیا۔ یہاں تک کہ ویدک عہد میں انفرادی زندگی کے جو چار آشرم مقرر کئے گئے تھے بدھ ازم نے ان کو رد کر دیا۔

ان امور کے پیش نظر باوجود اس جوش اور جذبہ اور ساتھ ہی زور قلم کے جو ڈاکٹر صاحب نے بدھ ازم کی نئی تفسیر ترتیب دینے میں صرف کیا ہے۔ قاری کا ان کی اس تفسیر سے متفق ہونا ایک امر محال ہو جاتا ہے اور جناب حسرت موہانی سے معذرت کے ساتھ، ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنا پڑتا ہے کہ

"خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا "کلک" کرشمہ ساز کرے"

اس جوش اور جذبے کے تحت جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا نہ توسن قلم کی باگ پر ہاتھ ہے اور نہ ہی ان کا پاؤں اعتماد کی رکاب میں ہے اور جب ہم ان کے مندرجہ ذیل بیانات پڑھتے ہیں تو یہ احساس یقین میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے مثلاً

۱۔ ارضی اور سماوی تہذیب کی ترکیبیں کتاب میں جا بجا استعمال ہوئی ہیں اور ڈاکٹر صاحب نے انہیں فکر کی دو CATEGORIES کے طور پر پوری کتاب میں استعمال کیا ہے۔ اگرچہ موضوع اس بات کا متقاضی تھا کہ ان دونوں فکری دھاروں کا امتیاز اور فرق کتاب میں کہیں نہ کہیں واضح الفاظ میں تعریف کے ذریعے

---

[1] ایضاً

متعین کرتے۔ لیکن پوری کتاب میں اس قسم کی وضاحت کہیں نہیں ملتی۔ آخر دراوڑی تہذیب ارضی کیوں تھی اور آریائی تہذیب سماوی کیوں، کیا اس لئے دراوڑ ایک منظم معاشرہ میں رہتے تھے! اور آریا بے گھر بے در وحشت اور بربریت کے عالم میں وطن کی تلاش میں صدیوں سے مارے مارے پھرتے تھے؟ بہر حال یہ نکتہ وضاحت کا طالب ہے۔

۲۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ "رکا ہوا آدمی مادہ پرست ہوتا ہے" ص ۱۵۔ یہاں یہ پتہ نہیں چلتا کہ "رکا ہوا آدمی" سے ڈاکٹر صاحب کی کیا مراد ہے۔ رکنا جسمانی ہے، فکری، ذہنی، جذباتی، معاشرتی، مذہبی یا اخلاقی۔ ایک رکنا ارتقائی عمل کا بھی رکنا ہے۔ ان تمام چیزوں کا مادہ پرستی سے کیا تعلق؟ اور کیا اس کلیہ کے برعکس عمل بھی اتنا ہی درست ہے! یعنی کیا مادہ پرست آدمی رکا ہوا ہوتا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو موجودہ مادہ پرست یورپی معاشرے کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟

۳۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب میں تین دفعہ اس امر کا اعلان کیا ہے کہ "اس کتاب میں ہندوستان سے مراد وہ خطۂ زمین ہے جو ۱۹۴۷ء میں دو آزاد ملکوں۔ پاکستان اور بھارت میں تقسیم ہوا" یہ اعلان ہمیں صفحہ ۹، ۴۰ اور ۱۱۸ پر ملتا ہے آخر اس اعلان کا اعادہ کیا معنی رکھتا ہے؟

۴۔ ڈاکٹر صاحب پوری کتاب میں درخت اور بیج اور پھر درخت کی زندگی کا دائرہ بار بار دہراتے ہیں ص ۱۳ لیکن وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ بیج سے جو دوسرا درخت پیدا ہوا ہے، درخت تو ضرور ہے، لیکن وہ درخت نہیں ہے جس سے بیج پیدا ہوا۔ یہ ذرا نازک نکتہ ہے اور ڈاکٹر صاحب کی توجہ کا مستحق۔ کیونکہ اسی سے منطق میں تمثیلی استدلال کا باب وا ہوتا ہے۔

۵۔ چاند کی گردش کو (ص ۱۴) بجائے سائنسی انداز میں پیش کرنے کے شاعرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اور جب وہ ایک رات کے لئے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو اس دفعہ کو انہوں نے رحم مادر میں جنین سے تشبیہ دی ہے جس سے برآمد ہو کر وہ اپنی "گردش پرکار" میں پھر گرفتار ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس عمل کو شاعرانہ تشبیہ کے طور پر تو استعمال کر سکتے ہیں لیکن منطقی استدلال اور سائنسی نقطۂ نظر سے یہ بیان بعید از فہم ہے۔

۶۔ "قدیم انسانی سوسائٹی وقت اور تاریخ سے بے نیاز صرف حال کے دائرے میں مقید ہے" ص ۱۲۔ ذرا مصر کی طرف لوٹ جائیے اور اس دسا دیزات، آثار قدیمہ اور ان کے مذاہب پر نظر ڈالیے تو پتہ چلے گا کہ انہیں تاریخ کا احساس کتنا شدید تھا۔ یہی شدید احساس ہمیں سومیریا، بابل، آسوری کلدانی وغیرہ تہذیبوں میں نظر آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آریا یا ہندو، کائنات کے بارے میں اپنے مخصوص نکتہ نظر کے پیش نظر تاریخ نویسی، تاریخ اور تقویم وغیرہ سے محض اس لئے بے نیاز رہا کہ اس کی نظر میں یہ سب "مایا" کا کھیل تھا۔ کرشن کی لیلا تھی یا برہما کا خواب، اور انسان کی کوئی حقیقت نہیں تھی لیکن جب اس کا ذہن پلٹا اور اس نے انسان اور کائنات کے رشتوں پر طفلی سطح سے بلند ہو کر سوچنا شروع کیا تو تاریخی دور بھی شروع ہوا جس کو ڈاکٹر صاحب خود

غیر آریائی دور گردانتے ہیں۔ یعنی اپنشدوں، پرانوں اور بدھ ازم کا زمانہ۔

۷۔ کلچر اور تہذیب میں جو فرق انہوں نے ص ۳۲ پر بیان فرمایا ہے، وہ بھی محل نظر ہے۔

۸۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ زرتشت آریہ نہیں تھا۔ لیکن اس امر کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔

۹۔ اسی طرح انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "چونکہ گنگا کا میدان زمین کا وہ ٹکڑا ہے جو سب سے آخر میں سمندر سے ابھرا اس لئے اس خطۂ زمین پر تہذیبی تصادم نسبتاً دیر کے بعد نمودار ہوا" (ص ۸۵)

کاش ڈاکٹر صاحب کسی بھی جغرافیہ یا علم الارض کی ابتدائی کتاب سے اپنے اس بیان کا تقابل کر لیتے۔ یوں وہ اپنا وہ غیر ذمہ دارانہ THESIS جو انہوں نے اس کتب کے اس مفروضہ پر مبنی پیش کیا ہے، لکھنے سے اجتناب کرتے۔

۱۱۔ ڈاکٹر صاحب نے چینی مکتب فکر سے ٹائن بی کی طرح ین اور یانگ کی اصطلاحات تو اٹھالی ہیں لیکن ان کے اطلاق میں اور ان کے ذریعے تہذیبوں کے ارتقا اور تنزل کی وضاحت میں محض اس وجہ سے جابجا غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں کہ انہوں نے اس مکتبہ فکر کا عمیق مطالعہ نہیں کیا۔ مثلاً ان کا یہ بیان کہ "بیشتر مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ انسانی زندگی کی ابتدا "ین" کی نفضل سے ہوئی۔۔۔" (ص ۳۳) لیکن سوائے چینیوں کے یہ اصطلاحات کسی اور تہذیب، مذاہب یا مکتبہ فکر میں ہمیں نہیں ملتی اور نہ ہی اس کیفیت سے مماثل کسی اور اصطلاح کا استعمال نظر آتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے:۔

چین میں جب تاؤ اور ماؤ مکاتیب فکر پھل پھول رہے تھے تو ان پر YIN YANG سکول چھانا شروع ہوا اور اس نے تمام مکاتیب فکر کو متاثر کیا۔ ہم اس سکول کی ابتدا یا ان کے ابتدائی نمائندوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے لیکن اس کے خیالات سادے اور واضح ہیں۔ بنیادی طور پر اس کے خیالات کا انحصار دو قوتوں پر تھا۔ ایک ین جو منفی، کمزور، منفعل اور منتشر کرنے والی اور دوسری یانگ جو مثبت، محرک، مضبوط اور مجتمع کرنے والی ہے تمام چیزیں انہی کے عمل اور ردعمل سے وجود میں آتی ہیں۔ اس نظریہ کے ساتھ منسلک پانچ عناصر کا نظریہ ہے یہ عناصر دھات، لکڑی، پانی، آگ اور زمین ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق چیزیں ایک دوسرے کے تعاقب میں ان پانچ عناصر کے مطابق گردش کرتی ہیں ابتدا میں یہ دونوں اصول الگ الگ تھے۔ عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ین سکول کا نمائندہ TSOW YEN (۳۰۲ - ۲۴۰ ق م) ہے جس نے ین یانگ کے عمل اور ردعمل کو ان پانچ عناصر کی گردش کے ساتھ متحد کیا۔

ین اور یانگ پہلے ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ یہ ایک دوسرے کے بعد واقع ہوتے تھے یا ایک دوسرے کی تکمیل کرتے تھے۔ پانچ عناصر کے بارے میں تصور کیا جاتا تھا کہ وہ ایک دوسرے پر غالب آتے ہیں یا ایک دوسرے کو پیدا کرتے ہیں۔ بالآخر تمام عناصر کو مربوط کر دیا گیا تاکہ ہم آہنگی، تضاد پر مسلط ہو سکے اور کثرت میں وحدت پائی جائے۔ ین یانگ اور پانچ عناصر قوت، طاقت اور عوامل ہیں۔ کہ مادی عناصر۔ حساب کو تعبیر کا ایک

منفعل عمل قرار دیا جاتا ہے جو معین اور قطعی قوانین کا پابند ہے اور واضح نمونوں PATTERNS کا اساس کرتا ہے جن کی بنیاد پہلے سے قائم شدہ ہم آہنگی پر ہے۔

اس اصول کا ایک مفہوم انسان اور فطرت میں مطابقت اور وحدت ہے کیونکہ دونوں ایک ہی عمل کے تابع ہیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کائنات ایک منظم ڈھانچہ ہے جو محدود ہے، قابل بیان ہے حتیٰ کہ یہ PREDICTABLE بھی ہے ایک اور مفہوم یہ ہے کہ کائنات گردش کا مسلسل عمل ہے جیسے پانچ عناصر گردش کرتے ہیں ویسے تاریخ بھی دائروں میں گردش کرتی ہے اور جیسے ین یانگ گھٹتے بڑھتے ہیں ویسے ہی "اشیا" ترقی یا تنزل کی طرف جاتی ہیں۔ ین یانگ مکتب فکر بمقابلہ دوسرے مکاتیب فکر کے، چینیوں کے اخلاقی اور سماجی تعلیمات کو کائناتی سطح پر لایا۔ بالعموم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مکتب فکر کے خیالات نے چینیوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا خواہ وہ مابعدالطبیعیاتی فکر ہو، فن ہو یا شادی ہو یا کھانا پکانا ہی کیوں نہ ہو۔ جہاں کہیں بھی ہم آہنگی کی ضرورت ہوگی یا کوئی تغیر واقع ہوگا ین یانگ یہ طاقتیں سرگرم عمل ہوں گی۔[1]

اس فلسفہ میں ین کی جگہ پراکرتی اور یانگ کی جگہ پرش رکھ دیجئے اور پانچ عناصر کی جگہ ان کی تعداد چار یعنی مٹی۔ آگ پانی اور ہوا رکھ دیجئے تو آپ کا یہ چینی فلسفہ ہندی روپ اختیار کرے گا اور اتنا ہی فرسودہ اور بے کار ثابت ہوگا جتنا کہ کائنات کی تخلیق کا مسئلہ حل کرنے میں پراکرتی اور پرش کے فلسفہ!

چنانچہ صرف اس مثال سے واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنا تھیسس پیش کرتے وقت کتنی سنجیدگی سے کام لیا ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ پوری کتاب ایسے ہی بیانات سے بھری ہوئی ہے اور ان بیانات میں حوالہ جات بھی مفقود ہیں۔ ویسے بحیثیت مجموعی با وجود تحقیق کے دعوے کے، ڈاکٹر صاحب نے حوالہ دینے سے گریز کیا ہے۔ مثلاً انہوں نے ٹائن بی سے ین یانگ کی اصطلاحات تو اخذ کر لی ہیں لیکن حوالہ ندارد۔

اسی طرح ٹائن بی سے ہی انہوں نے WITHDRAWAL AND RETURN کا اصول تو اٹھا لیا ہے لیکن حوالہ کہیں نہیں دیا۔

وادی سندھ میں مادری نظام کے رواج کے بارے میں بیانات جگہ جگہ موجود ہیں۔ لیکن حوالہ دستیاب نہیں ہوتا۔

ابن خلدون کی مشہور زمانہ کتاب "مقدمہ" کو انہوں نے جگہ جگہ مقدمات ہی بنا ڈالا ہے اور اس کی توقع ڈاکٹر صاحب سے کم از کم نہیں کی جا سکتی

اور آخر میں "متعین" کے بارے میں ان کا پورا بیان LEESON کی کتاب KAMASILPA

---

[1] ED· EDWARDS, THE ENCYCLOPEADIA OF PHILOSOPHY MACMILLAN, LONDON, REPRINT 1972 VOL 2 p. 86 - 90

سے ماخوذ ہے اور اس کو اخذ کرتے وقت شاید انکساف کے پیش نظر انہوں نے اس کتاب کے حوالہ جات بھی اخذ کر لئے ہیں۔ ان حوالوں میں ایک نام DANIELOU کا آتا ہے اور راقم الحروف کو یقین ہے ڈاکٹر صاحب اس عالم کی شخصیت اور علمی کاوشوں سے قطعاً واقف نہیں ہیں اور "کاماشیا" میں ان کا اس شخص سے تعارف پہلی بار ہوا ہے۔ مزید برآں ہندو EROTICISM کے بارے میں بھی ڈاکٹر صاحب کے اوّل تو اپنے کوئی خیالات ہیں ہی نہیں، اور اگر ہیں تو اتنے ہی سطحی ہیں جتنے کہ ان مستشرقین کے جو انہوں نے محولہ بالا کتاب سے اخذ کئے ہیں اگر ہم کتاب میں موجود دوسرے بیانات کو نظر انداز بھی کر دیں جو بار بار فکر و نظر کا دامن کھینچتے ہیں، تو بھی بڑے دکھ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ کتاب ان بلند بانگ دعووں پر پوری نہیں اترتی جو اس کتاب کے ناشر پ (؟) نے کئے ہیں اور صرف مندرجہ بالا چند امور ہی ایسے ہیں جو اس کتاب کو تحقیقی اور علمی معیار سے گرا دینے کے بعد اس طلائی تثلیث کو منہدم کر دیتے ہیں جس کا صرف ایک تحقیقی پہلو باقی رہ جاتا ہے۔ اور جس کے بارے میں غالب سے معذرت کے بعد ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنے پہ مجبور ہیں کہ

رو میں ہے رخش "عامر" کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اور اس "نظم" کی مزید دلآویز جولانیوں کا جائزہ ہم اگلی قسط میں لیں گے۔

نظمیں

احمد ندیم قاسمی

ایک اسیرِ ذات سے!

کب تک اپنے باہر سے، چشم بستہ، بھاگو گے؟
کب تک اپنے اندر کی الجھنوں سے الجھو گے؟
کب تک اپنے شانوں پر اپنا بوجھ لادو گے؟
ہانپتے ہوئے آخر کتنی دور جاؤ گے؟
اپنے خول سے باہر جب نگاہ ڈالو گے
اپنی ذات کے اندر، کائنات دیکھو گے
اک بڑی مسافت ہے، اپنا تجزیہ کرنا
جنگلوں سے گزرو گے، پربتوں میں بھٹکو گے
ایک بار اگر کر لو آپ احترام اپنا
اپنا عکس تکتے ہی آئینے نہ توڑو گے
رسم و راہِ فطرت سے، دوستی اگر کر لو
پت جھڑوں میں مہکو گے، ظلمتوں میں چمکو گے
کھیت رقص کرتے ہیں، تال پر ہواؤں کے
دل کی کھڑکیاں کھولو، تم بھی لہلہاؤ گے
ذہن کے سمندر میں، چاند نور گھولے گا
جب سفینۂ جاں کے بادبان کھولو گے!

احمد ندیم قاسمی

حُسنِ بے حساب

تمھارے حُسن کو جتنے رخوں سے دیکھتا ہوں
شمار کرنے جو بیٹھوں، شمار کر نہ سکوں
اگر فقط عشوہ ہائے دراز کا ہو بیاں
تو نیم وا رُے اتنا ہجوم کرتے ہیں
کہ جن سے گردشِ سیّارگاں بھی شرمائے

اگر حدیثِ لبِ شعلہ وش کہوں، تو مجھے
کئی ہزار مثالیں حصار میں لے لیں
اور اِک مثال کا چُننا ہو اس قدر دشوار
کہ میرا فن سپر انداز ہو کے رہ جائے

میں اپنے وقت کا تنہا حساب دانِ جمال
تمھیں جو سامنے پاؤں تو سوچ میں کھو جاؤں
کہ اتنا حسن مرے فن سے کیسے سمٹے گا
میں کائنات کو مٹھی میں کیسے بند کر دوں!

نیر جعفری

جبر

ذیل کی پرانی مگر غیر مطبوعہ نظم ۱۹۲۵ء میں ملایا میں کہی گئی تھی اس سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے عصر پر کیا کچھ گزرتی رہی ہے (ضمیر)

جو دل محسوس کرتا ہے لبوں پر آ نہیں سکتا
تڑپ سکتا ہوں اور دل کو مگر تڑپا نہیں سکتا
جہاں میں اپنے دل کی دھڑکنیں پھیلا نہیں سکتا
میں شعلے پی تو سکتا ہوں مگر بھڑکا نہیں سکتا
کہ میں اپنے وطن کا کوئی نغمہ گا نہیں سکتا!

اگرچہ ہر نفس چلتی ہوئی تلوار رکھتا ہوں
اگرچہ روح میں کچھ کھولتے اسرار رکھتا ہوں
اگرچہ دل میں غم کی دولتِ بیدار رکھتا ہوں
یہ سوزِ اندرون لیکن زباں تک لا نہیں سکتا
کہ میں اپنے وطن کا کوئی نغمہ گا نہیں سکتا!

ترنم ریز ہے اک سازِ بے مضراب سینے میں
چھپا رکھے ہیں کتنے انجم و مہتاب سینے میں
وہ جس دُھن میں دھڑکتا ہے دلِ بیتاب سینے میں
اُسی دُھن پر دلِ ارمن وسما دھڑکا نہیں سکتا
کہ میں اپنے وطن کا کوئی نغمہ گا نہیں سکتا!

ہزاروں کسمساتے شعلہ ہائے راز ہیں دل میں
ہزاروں شعر بے الفاظ و بے آواز ہیں دل میں
ہزاروں گیت ہیں دل میں، ہزاروں ساز ہیں دل میں
مگر اس ساز سے چنگاریاں برسا نہیں سکتا
کہ میں اپنے وطن کا کوئی نغمہ گا نہیں سکتا!

منیر نیازی

فیصل آباد زرعی یونیورسٹی میں ایک روشن دن

لال سنہرے رنگ کے نیچے ہرے رنگ کے تھال ہیں
تین شجر یہ رنگ اٹھائے کھڑے مئی کی دھوپ ہیں
ہجر ہی ہجر کی حد پر جاگے خواب کی کوئی مثال ہیں
تین بشر مسحور کھڑے ہیں دھوپ کے روشن روپ میں
جیسے کسی نئے جنوب کا کوئی نیا شمال ہیں
جیسے اُس کے نئے مکان کا کوئی نیا جمال ہیں

منیر نیازی

کیسے پھر اُس عہد کو زندہ کروں؟

میں محبّت کس طرح اُس سے کروں
دِل میں جو ہے کس طرح اُس سے کہوں

میرے اُس کے درمیاں بیگانگی برسوں کی ہے
ایک بے مفہوم جیسی خامشی برسوں کی ہے

اپنی اپنی زندگی میں مُبتلا اِتنے رہے
سارا کچھ دُھندلا گیا ہے ہم جُدا اِتنے رہے

اس کے کِس رُخ کو اشارہ عشق کا کیسے کروں
اِس ذرا سے کام کی میں ابتدا کیسے کروں

عارف عبدالمتین

ماں!

تو زندگی کے بسیط صحرا میں اِک شجر کی طرح کھڑی تھی
میں تیری چھاؤں میں ہر قیامت سے بے خبر تھا
ہر ایک آشوب سے ڈرا تھا!

بجا کہ چاروں طرف بگولے مرے لہو سے ہزاروں صدیوں کی پیاس
اِک آن میں بجھانے کے منتظر تھے
بجا کہ ریگِ رواں کا سیلاب ہر جہت سے،
مجھے مٹانے کی آرزو میں اُمڈ رہا تھا،
بجا کہ ہر سمت جھلملاتے سراب میری نظر کو احساسِ تشنگی کے عذاب
سے ہمکنار کرنے پہ تُل چکے تھے،
بجا کہ ہر لمحہ میرے سر پہ نجانے کتنے مہیب سورج چمک رہے تھے،
مگر تری مہرباں شاخوں کے ان گنت مہرباں پتّوں نے مجھکو
ماحول کی صعوبت کے ہر کٹھن روپ سے بچایا!
میں آئینہ تھا مجھے ہر اک سنگِ درد سے اجنبی بنایا!!
مرا پسینہ گرا جہاں پر، وہیں لہو اپنا تُو نے سو طرح سے گرایا!!!

پھر ایک دن صرصرِ فنا نے وجود تیرا جھنجھوڑ ڈالا
تجھے شقاوت کے ایک ہی پل میں بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا،
میں بے بسی کا سُراغ بن کر تجھے حزیں بھیگتی نگاہوں سے دیکھتا تھا،

ترے نحیف اور شفیق پیکر کو تک رہا تھا،
جو ریگِ صحرا کی آتشیں سی لحد میں چُپ چاپ اتر رہا تھا!
سنجانے کس کرب کی نہایت کے ساتھ مجھ سے بچھڑ رہا تھا !!
مگر وقار اس کے پیرہنِ مو سے برگِ گل بن کے جھڑ رہا تھا !!!

بچھڑ کے تجھ سے میں زندگی کے بسیط صحرا میں خود شجر کی طرح کھڑا ہوں۔
میں تو نہیں ہوں، مگر تری طرح میری چھاؤں بھی میرے بچوں کو ہر قیامت،
ہر ایک آشوب سے بچانے کو مضطرب ہے،
یہ اضطرابِ محیط میرا، تری محبت کی اِک عطا ہے
مری رگوں میں تری ہی رحمت کا سُرخ امرت لہو کے مانند دوڑتا ہے،
مگر مرے کانپتے لبوں پر ہر ایک لمحہ یہی دعا ہے۔
مجھے بھی ارزاں ہو تیرے کردار کی وہ قوت
جو میرے بچوں کی سمت بڑھتے ہوئے بگولوں کی گھومتی سی کلائیوں کو مروڑ ڈالے،
جو ریگ صحرا کے سیلِ خونیں کا رُخ بدل دے،
جو میرے معصوم نونہالوں کو بے نیاز سراب کر دے،
انہیں جہنم کی آگ برساتے سورجوں کے وجود سے بے خبر بنا دے!

مری تمنا ہے میں بھی اِن آئینوں کو ہر سنگِ درد سے اجنبی بنا دوں،
پسینہ اُن کا گرے جہاں پر وہیں لہو اپنا میں بھی سو طرح سے گرا دوں،
اور آئے جب صرصرِ فنا مجھ کو ریگِ صحرا کے مرقدِ گرم میں سلانے،
تو میں بھی ہر چند اپنے بچوں سے کرب کی انتہا پہ بچھڑوں،
مگر تری طرح میرے بھی انگ انگ سے برگِ گل کی صورت وقار ٹپکے
تری روایت، مرے حوالے سے، نسل در نسل، منتقل ہو تو اس کی رعنائی میں نہ کوئی زوال آئے

قیوم نظر

چاند چمکنے لگتا ہے

اُونچے اُونچے پیڑ کھڑے ہیں چیلوں کے
کہساروں کی ڈھلانوں پر جو نیچے
دوڑی جاتی ہیں
چاند سے چہرے والی ندّی کے ملنے کو ۔

چاروں جانب چھائی چُپ کے پہلُو سے
دَرد کی صورت اُٹھنے والی تیز ہوا
گرد و پیش سے بے پروا
اپنی رَو میں ایک ہی لَے میں گاتی ہے
اُس کی یہ بے گانہ روی
دیوانہ ہی بناتی ہے

اِک پتھر پر بیٹھا پہروں ایک ہی سمت میں تکتا ہوں
نیچے دَوڑی جاتی ڈھلانیں
جیسے پَلٹ کر آتی ہیں
چیلوں کے پیڑوں کی پھنگوں سے بھی اونچا جاتی ہیں
پتّوں کے اَب پیہم رقص کی تال بدلتی ہے
میں ہی شاید
دَرد کے ساز پہ اپنا راگ الاپے جاتا ہوں
جانے کب تک ـــــــ

دُور فلک پہ چاند چمکنے لگتا ہے

صلاح الدین محمود

اَن دیکھا خواب

ہال اور نا کے دروازوں میں
رات گئے جب ہوا چلی تھی
جسموں کی لانبی جنبش نے
شبنم سی اک بات کہی تھی

خشک ہوئی ہنس رات کی سمتیں
تاروں کی اک بسند کلی تھی
ہم اور تم اک شجر تلے تھے
شجر کے اندر آگ جلی تھی

کبھی کبھی دستک سی کرنیں
کبھی سیا ہی خود چمکی تھی
کبھی ہوا کے دو دامن تھے
کبھی ہوا جسموں سے ملی تھی

پھر گیلے گیلے تاروں نے
ہونٹوں سے اک بات کہی تھی
ہال اور نا کے دروازوں پر
ہم اور تم نے دستک دی تھی

صلاح الدین محمود

انتر گھاٹ کا دریا

جسم تمھارا
دریا جانے
یا میں
تنہا ، نابینا
جسم کے اندر
جو گل کھلتے
ان تک پانی کا زینہ

ہوا کی جانب
جب تم دیکھو
ہوا تمھاری خصلت سی
شجر نہیں ہریاول دیتا
نم لمحوں کی ساعت سی

کبھی کبھی ، آنکھوں کے رستے
دنگ فرشتے
آ بستے
کبھی تمھارے جسم کے اندر

ننھے طائر خود ہنستے

ہوا کی چتون ، جیسے بازو
زمیں کی شبنم جیسے تن
لانبے حجروں میں شبنم کے
بیگانہ ، ان جانے بن

قدم تمھارے ، بوندوں بوندوں
میری جانب جب چھاتے
آنکھوں کے ساکت شیشوں کو
شب کی جانب وا پاتے

جسم تمھارا ، دریا جانے
یا میں
تنہا ، نابینا
جسم کے اندر
جو گل کھلتے
ان تک پانی کا زینہ

محمد سلیم الرحمٰن

نظم

خزانوں کو تم ڈھونڈنے پر مصر ہو
ٹپکتا ہے خوں ناخنوں سے اور آنکھوں سے
کھولی ہوئی نیند کی تلخ سُرخی
یہ کھیتوں کی جیتی جڑیں کاٹتے پھاوڑے اور کدالیں
ہیں خود موت کے ہاتھ جس کے تمسخر
سے تم بے خبر ہو
ہتھیلی پہ عمر اور دل کی لکیروں میں اٹکے
یہ مدھم سے ذرے کہ جن میں ابھی تک تمھارے
اسب وجد کی مٹی
کی اک جھلملاتی کرن، کتنے زرخیز دعدول
کے دن رات سجتی ہوئی، اِس گھڑی
قید میں ہے
تمھاری طرح وہ خزانوں پہ بیٹھے ہوئے سانپ،
تماز لہو پی کے، پھر سے کسی کھوئے نئے
کی جنت میں گھُلنے
خیالی عذابوں میں جلنے کی حیرت سے گویا
سراپا زر و سیم کی یخ سلاخیں، اور آنکھیں
بلور اور ہیرے

خزانے تو سب خاک میں مل چکے ہیں
ہوا و ہوس کے پرانے ٹھکانوں پہ اب نہ
پھول حسرت کے دیکھو

یہ مٹی کہ چپ ہے بس اس کا دفینہ
برس کے برس چار دن پھول پتوں کی لیلا
یہ مٹی تمھیں ڈھونڈتی ہے

آفتاب اقبال شمیم

درخت

ابھی ابھی برف کی چڑیلیں
ہری ہری مسکراہٹوں کو
شگفتہ چہرے سے نوچ لیں گی
ابھی ابھی باد سے دنوں کی
سیاہ لٹکی ہوئی زبانیں
سررسر چاٹنے لگیں گی ترے بدن کو
خزاں کا سفاک لکڑ ہارا
ابھی ترا انگ انگ کاٹے گا، پھانسیاں سی
تجھے بلندی سے پستیوں میں کڑک کڑک
کھینچنے لگیں گی
مگر معطر لہو برستا ہے جب فضا سے
مہک مہک آگ جاگ اٹھتی ہے جب رگوں میں
تو ایسے موسم میں تیرے زخموں سے پھوٹ آئیں گی
عہد نامے کی آئتیں سی
تو مسکرا کر محبتوں کی گواہی دے دے گا
(کرن کا بے انت روشنی سے اٹوٹ رشتہ)
زمیں کے پرچم! تجھے نگوں کون کر سکا ہے!
کھڑے کھڑے مر بھی جائے گا تو
مگر وہیں پہ
جنم کی مٹی سے تیرا ناتا بندھا رہے گا

لگا ہوا اپنے آستاں سے
ملا رہا ہے یہاں کی پستی کو آسماں سے
مجھے بھی یہ شوکتیں عطا کر
مجھے بھی اپنا سا عزم دے دے
مجھے بھی اپنی صداقتوں کا
ہمیشہ سر کو اُٹھائے رکھنے کا بھید سمجھا
یہاں میں نیچی چھتوں کو اوڑھے
چہار دیواریوں کا کمبل بدن پہ مارے ہوئے
کھڑا ہوں
دروں پہ بے اعتمادیوں کی، شکوک کی کنڈیاں لگی ہیں
ثقافتوں میں گھرا ہوا ہوں
(یہی بہت ہے
تری بلندی سے دیکھ لیتا ہوں آسماں کو)
مرے اندھیرے کی جھیل میں روشنی کی شبنم
ٹپکتی رہتی ہے کھڑکیوں سے
میں اپنے روزن سے تک رہا ہوں
کھلی فضائیں ترے لچکتے دراز بازو
اُٹھے ہوئے ہیں
تو اپنی نمناک انگلیوں سے
فلک کے رُخ پر
چمکتے چھینٹے اُڑا رہا ہے
یہ شب کی بھیگی ہوئی سی خوشبو
مرے مساموں سے کیوں نکلتی نہیں
کہیں بھی
ہوا کو بھر دوں لطافتوں سے

وجود میرا

گیاہ زاروں کے بیچ میں جیسے کوئی سمٹا ہوا ہو صحرا
میں اپنے ہیجان کا جزیرہ ہوں
جس میں بدمست، پیل پیکر سوال
چنگھاڑتے ہیں
بے اطمینانیوں کی بلائیں، اندھی انائیں ہر سُو
نہیں، نہیں کی کٹار چیخوں پہ ناچتی ہیں
تجھے وفا کے، عبادتوں کے صلے میں شاید
سدا کا نروان مل گیا ہے
ازل کی پاکیزگی کا لمحہ
مرے تنفس میں گھونٹا ہے
تری محبت کے گرم معنی
تو میں اندھیرے کا، چینیوں کے دھوئیں کا پردہ
اُٹھا کے اُس سمت دیکھتا ہوں
جہاں مجھے بے لباس دیکھا تھا تیری چھاؤں نے
مجھ پہ جُھک کر
میں اِک بگولا تھا سرکشی کا
جسے جھلاتے رہے ہواؤں میں تیرے بازو
مجھے وہ لمحہ بھی یاد ہے جب مری رضا نے
مرے لیے وقت کی، زمانے کی سرپرستی
قبول کر لی
میں تجھ سے بچھڑا تو پھر نہ لوٹا
جنم جنم کی رفاقتوں کو بُھلا چکا ہوں
عجیب معصومیت کے دن تھے
میں تیری اُس رقص کرتی چھاؤں میں

دھوپ کی تتلیاں پکڑتا تھا
اور تو تالیاں بجا کر، مجھے اٹھا کر
اُچھالتا تھا
مرے تصور کا سبز پیکر
ہوا کی گت پہ چھڑا ہوا گیت طائروں کا
کبھی اندھیرے میں شاہزادہ دکھائی دیتا تھا
تو طلسمات کی زمیں کا

میں دیکھتا ہوں
کہ بدشگوں کے مہیب عفریت
تیرے سر پہ جھکے ہوئے ہیں
تو سنگ سڑکوں کی، تنگ رستوں کی
بیڑیاں ڈال کر کھڑا ہے
تو اُگ رہا ہے مری ہوس کی
سیاہ مٹی میں
میرے لاانتہا خلا میں
کھڑا ہے تو وقت کی عدالت میں
دے گواہی
یہ روپ۔ میـــرا۔ مرا نہیں ہے
مجھے مری ذات کے سفر میں
مرے ارادوں نے، حادثوں نے
فنا کیا ہے
لٹک رہا ہوں صلیب پہ
اور اپنا منکر ہوں ــــ جانتا ہوں
یہاں میں بن باس میں ہوں
یہ بے درخت دنیا مری نہیں ہے

کبھی کسی سچ کا اسمِ اعظم
مجھے رہائی دلائے اُس سے
جو میں نہیں ہوں
کبھی کسی راستے کا پربت
وجود کی گھاٹیوں سے مجھ کو
فراز کے دوش پہ اُٹھا لے
کبھی تری مامتا سی چھاؤں
کڑی اذیت کی دوپہر سے مجھے بچا لے
تری پناہوں میں اتنا سوؤں
کہ اپنی تاریخ بھول جاؤں
میں تیری پہچان بن کے جاگوں

دیپک)

آفتاب اقبال شمیم

دیوارِ چین

کہاں سے پھیلا ہوا ہے یہ سلسلہ کہاں تک
گزر گیا سیل ہمتوں کا
بنا کے یہ کوس کوس صدیوں کی رہگذر سی
پہاڑ چلّہ چڑھی کمانوں سے تیر پھینکیں
تو آسماں گر پڑے زمیں پر
رواں دواں وقت کے بہاؤ میں
ایک لمبی دراڑ جیسے پڑی ہوئی ہے
عظیم دیوار سر اٹھائے کھڑی ہوئی ہے
جھکے ہوئے آسماں کے نیچے
جو اس صحیفے کو عکس در عکس بانٹتا ہے
یہ رزمیہ — جو لہو کی شفاف روشنی سے
لکھا گیا ہے
زمیں پہ چنگاریاں اڑاتے ہوئے وہ آئے
جو بازوؤں سے بلندیوں کا خراج
لیتے رہے
شکم کو اناج دے کر
مشقتیں جن کی باندیاں تھیں
لہو کے نمکین ذائقے
رقص کرتے رہتے تھے
جن کے ہونٹوں کے آستاں پر

یہیں پہ جموں کے پیڑ گرتے تھے راکھ بن کر
کڑکتی آواز ــــ جبر کے چابکوں کی بجلی
انہی پہاڑوں پہ کوندتی تھی
یہیں پہ محنت کے نقش گر نے
لہو کے پانی میں سنگ گوندھے
صدائے تیشہ اُٹھی تو کوہوں سے پھوٹ نکلیں
بقا کی نہریں
زمیں کو اُس کی بلندیوں کی طرف اُٹھایا
افق کو باندھا افق سے اُس نے
قدیم قوت کی رخش نے دس ہزار لی[1] کی مسافتوں میں
فنا کے تاتاریوں کے لشکر کو مات دے دی
یہیں پہ محنت کے نقش گر نے
سلوں کو پہنا دیئے سلاسل
بٹے ہوئے خود گرفت قلعوں کی باڑ توڑی
اُسی نے کوہوں کے سر پہ گاڑا
ہزیمتوں، نصرتوں کا پرچم
کشود کر کے جسے اُڑایا
کئی زمانوں کے وارثوں نے
جو اُڑ رہا ہے
نشیب کو آسماں کی جانب اُڑا رہا ہے
جو کل کو کل سے ملا رہا ہے

(پیکنگ)

---

[1] پیمائش کا چینی پیمانہ۔ میل کا تقریباً ایک تہائی

حمایت علی شاعر

یوسف ثانی

میں چاہِ کنعاں میں زخم خوردہ پڑا ہوا ہوں
زمیں میں زندہ گڑا ہوا ہوں
کوئی مجھے اس برادرانہ فریب کی قبر سے نکالے
مجھے خریدے کہ بیچ ڈالے
کہ چشمِ یعقوب تو مرے غم میں
— کل بھی گریاں تھی، آج بھی ہے

شبنم رومانی

آنکھ کا زخم

جھوٹ ، سچ کی ترقیِ معکوس ہے
ایک عریاں تمنا کا ملبوس ہے
ہم نے خوش تاب پتھر کو ہیرا کہا
بندگی کو گناہِ کبیرہ کہا
بن گیا وہم صد رنگ بھی دیوتا
پیڑ بھی ، سانپ بھی ، سنگ بھی دیوتا
نیلگوں آسماں کا یقیں کچھ نہیں
جس کا اوّل نہ آخر نہیں ، کچھ نہیں
کون سمجھے یہ فطرت کی باریکیاں
رات کی روشنی ، دن کی تاریکیاں
چاندنی ، ردِ عنماک ہے ، کیا کہوں
چاند ، اِک تودۂ خاک ہے ، کیا کہوں
گرمیٔ خونِ دہقاں ہے ، سورج کی ضو
آنکھ کا زخم ہے ، خنجرِ ماہِ نو
ابر مٹی کی اُڑتی ہوئی پیاس ہے
بوئے گل اپنی ہی بوئے انفاس ہے

ساقی فاروقی

ڈسٹ بن

جاناں
صبح کے سورج کو
شام کے نارنجی بادل میں
کیوں گہناتی ہو

وہ کیا اندیشہ ہے
جس کے بڑھتے قدموں کی دھمک سُنی
اور تم نے اپنے آنسو اپنے اندر گرا لئے
اپنی روح میں نوحے جمع کئے
اور نیاں کی ڈسٹ بن میں پھینک دیئے

وہ کون سا مجرم درد ہے
جس کو دل کے شب خانوں میں چھپائے
جس کے نادیدہ شعلوں سے نظر ملائے بیٹھی ہو

چور ذہن کے
پچھلے شلف پے
تہہ کر کے مجھے مت رکھو
مجھ سے جان چھڑانی ہو تو
مجھے شعور کے شیش محل میں زندہ کرو . . . . . .
مجھے زندہ کرو
مرے ہونے کا اقرار کرو
مری طاقت سے انکار کرو
مجھے مار دو ــــــ :

عطا شاد

میرے ہونے کا عنوان

سبز پانی میں
میرے ہی ہاتھوں کی ریکھائیں
موج آزما ہیں
پربتوں پر ہواؤں کے یہ پیچ و خم
میرے ہی دامنِ دل کا احوال ہیں

مہرِ وادی میں
بوندوں کی مالائیں
میرے انفاس ہی کی طنابوں سے رستی ہیں ،
پھول بنتی
کبھی دھول بنتی فضائیں
میرے ہی موقلم کی دھنک ہیں ،

روز و شب
خاک خوشبو کی سوغات
میری آنکھوں کے گہرے خنک شامیانے میں
— سرمۂ نور آسا کے رنگوں کی پوشاک ہیں

میں ہوں دھرتی کا بیٹا
مجھکو ہالہ ہے
ہر گام پر میری سوچوں کا زرتاب ریشم
دامِ دل ہے مجھے
میری بکھری نظر کا طلب خواب پر چشم
زندگی کی عطا ہے
یہ گرداب روزن کُشا
میری پہچان کی سرحدوں کی ہوا
میری دھرتی
میری مزرعِ جان

میرے ہونے کا عنوان

اسداللہ غالب

بدلتے موسم

(۱)

پسینے سے بھیگی ہوا آرزو کی مسہری پہ کچھ سوکھے پتّے گرائے
تو تہمت تراشو...... یونہی ذات کا سُرخ پتھر سدا جگمگائے
شعاعوں کے نرغے میں بے نام، بے رنگ ڈھانچہ: مری ذات کے ایک سو ایک ٹکڑے
تری بستیوں کا چمکتا ہوا سُرخ سُورج کسی بیت اقدس کی چھت سے لٹکتے
پنگھوڑے میں لیٹے
مرے شہر کی انت بوجھل دکھوں کی سیاہ رات، رنگوں کی کاروں سے سڑکوں پہ چہروں کے
ریلے سے چمکے
بلکتی بدلتی رُتوں کا سویرا مگر اب بھی آدم کے سُورج کی کرنوں کو ترسے

(۲)

سبھی راستوں پر جزیروں کو جاتے ہوئے لوگ، جسموں سے رِستے لہو کی چمک میں، تری لاش
کے زرد ماتھے پہ لکھا مرا نام دیکھیں
جزیرہ...... جہاں موت کے اپنے بڑھتے ہوئے کرب چیخیں
جہاں حوضِ کوثر سے اُٹھتے بخارات دوزخ کے شعلوں پہ ٹپکیں
جزیرے کی مرتی ہوئی موت کو زندہ کر دو: زمانے کے بوڑھے خضر چھپ کے بیٹھیں
چوراہے میں اب سُرخ بتّی کے ہوتے زمانے کے بوڑھے خضر کی ضرورت کہاں ہے!
چوراہے کی اِس سُرخ بتّی سے آنکھیں چُراؤ
کہ تم اجنبی ہو
نئے شہر کے گرد لمحوں کی دیوار ہے...... تم مرے گھر میں آؤ
(...... مرے گھر کی دیوار پر اُبھری تختی تھی ہے اِن ازلی لمحوں کی ماتم کناں
کہ سب آنے والے انہی ازلی لمحوں کے قیدی تھے کہ بے دست و پا)

(۳)

اجنبی تم جو آتے ہو لمحوں کی بوسیدہ دیوار کو پھاندکر
اب مرے گھر کی مٹی کی بُو باس سُونگھو
کہ اس سوندھی بُو باس کا لمس جسموں کے آئینہ خانے میں ہو آشکارا
...... مگر موسموں کی زبان کی طرح تم بھی گم سم، تمہارے بدن پر پسینے سے بھیگی ہواؤں کے
اثرات، تم دُور افتادہ غاروں کے باسی، جھکتی ہوئی چاندنی، دیو ہیکل پہاڑوں کا
جوبن، ستاروں سے راتوں کو گرتی ہوئی برف جھولی میں ڈالے، کھنکتے ہوئے
چند سکوں کے سائل!
بدلتے ہوئے موسموں کا ہیولیٰ دکانوں کے شوکیس میں سج چکا ہے،
مہینوں سے یونہی مقید...... بدلتے ہوئے موسموں کے ہیولے کو ایک سانس تک بھی میسّر
نہیں ہے۔

جابر علی سید

دوسرے چہروں کو دیکھو

حاسِ رؤیں اور چوبِ مختصر[1] سے کھولتے ہیں آنکھ ہم
سرخ چہرے پر ہمیشہ، جو جھکا رہتا ہے ہم پر
اور لرزاں جسم سے
زندہ ہونے کا دکھاتے ہیں نشاں
دوسروں کے نغمۂ شاداں کا ساماں
اور اپنی زندگی مرہونِ خواب وگریۂ سوزِ فراق

آنکھ تصویروں سے تابندہ ہے، اس کی روشنی
دوسرے چہروں سے زندہ ہے
وہ چہرے جو تناسب سے چمکتے ہیں
دلوں کی گرم ثروت کے لیے

دوسرے چہروں کو دیکھو
جن کی موجِ دمبدم میں موجِ آہنگ ازل ہے
ساحلِ "گوشِ محبت" کے لیے
دوسرے ہونٹوں کو دیکھو
جن کی لرزش میں ہے ساماں
چشم بینا کے لیے

---

[1] نوزائندہ کی آنکھیں کھولنے کا سامان

حنیفاصدیقی

مختصر نظمیں

محبت :

ہماری زندگانی کے
تناور پیڑ پر
بس اِک محبت کی ہری کونپل بھی کافی ہے

پیاس :

مجھے تمنا ہے آئینے کی۔
ترس گیا ہوں
کہ اور کوئی نہیں تو اپنی ہی شکل دیکھوں

اندازِ نظر

سیہ رات میں بھی
اگر اپنے بچوں کو دیکھوں
تو سمجھوں
سحر ہوگئی ہے

ناآگہی کا شاخسانہ :

اگر تم میرے جذبے سے
ذرا بھی آشنا ہوتے
تو پھر میں دیکھتا
تم کس طرح مجھ سے جُدا ہوتے!

شفقت کی ضمانت

اگر بے نور آنکھوں سے بھی
چلنا پڑ گیا
تو چل کے تم کو چاہِ کنعاں سے نکالوں گا۔

طلوع کا حوالہ

اگر اٹھتے ہی
صورت اپنے بچوں کی نظر آتی نہیں
تو میں سمجھتا ہوں
ابھی سورج نہیں نکلا

حسرتِ یعقوب

عزیزِ مصر ہوتا تو
تمہارے واسطے
سب سے بڑی بولی مری ہوتی

بدنصیبی

تمہاری بدنصیبی ہے
کہ تم نے مجھ کو،
میرے دشمنوں کی آنکھ سے دیکھا!

ثروت حسین

بابِ نوروز

ایہا الناس!

زمیں ساعتِ نوروز میں انگشتِ براہیم سے نکلی ہوئی الواحِ جہاں تاب سے آغازِ تنگ و تاز'
ثمردار درختوں کی جڑیں گر بجتے گھراؤ کو چھوتی ہیں پلٹ آتی ہیں اسرار کے ہمراہ چلی جاتی ہے
ہر شاخ، مری داہنی دیوار پہ شہ دانہ دا انگور کی بیلوں پہ اترتی ہے ابابیل کہ اطراف میں احباب
کے تلنے کی تقاریب سے کیا اس کو سروکار . . . . . .

(ابابیل ۔ تعارفی نغمہ)

چراغ و چراگاہ سے کوئی مجھ کو علاقہ نہیں
مرے خواب میں
ارضِ موعود کا کوئی خاکہ نہیں
کس جگہ دفن ہیں وہ حکایات
کوئی بتاتا نہیں
زمینوں پہ اُڑتی ہوئی
اور زمانوں پہ بہتی ہوئی آئی ہوں
ایک تنہائی ہوں

ثروت حسین

بابِ دوآب

سرخ اینٹوں کا کمزا اس
اس سے ملحق باغ ـــــ
اِک برنجی بیلچہ اور تین مٹی کے پیالے
چار گھوڑوں، سات شمشیروں کے بدلے
رخصتِ نوروز پر
ابنِ اخناتون سے میں نے خریدے

خورشید احمد

یہ قافلے تو یونہی چلیں گے

تمام صبحیں تمام راتیں جو اس فضا سے گزر چکی ہیں
وہ میرے خوابوں میں بس رہی ہیں
میں زندگی کی تمام خوشبو جو مجھ کو پہلی رتوں نے دی ہے
بہارِ تازہ کو سونپ دوں گا
وہ اس کو لوگوں میں بانٹ دے گی
مری طرح پھر کوئی سخن ور یہ ساری خوشبو سمیٹ لے گا
بہارِ تازہ کو سونپ دے گا
فراغتوں کی جواں رتوں میں
وصالِ صبحِ حیاتِ نو کی حکایتِ داستاں لکھے گا
ہوا اڑاتی پھرے گی خوشبو زمین کے گوشے مہک اٹھیں گے
یہ قافلے تو یونہی چلیں گے

اشفاق نقوی

سوچ

سوچ ، سورج کی طرح
گرم اور تیز کرھُلسائے خیالوں کے چراغ
اور وہ کورِ نظر
کور دماغوں والے
بھانپ کر بھی تو تذکرے میں مفر پاتے ہیں!

اپنا ماحول اجاگر ہوگا
سوچ پردوں کے جھروکوں سے عیاں ہونے دو

محمد اجمل نیازی

منور یادوں کی سرزمیں

ہم اندھیرے میں ہیں!
یاس اور آس کے درمیاں منتشر وسعتوں پر بکھرتی ہوئی زرد آنکھوں کے ڈیرے میں ہیں
ایک معصوم موسم کی خوش فہمیوں کے تپتے بسیرے میں ہیں

درد کی چادریں لیراں لیراں ہوئیں،
اُن پہ اشکوں کا رنگ اور پختہ ہوا
ذہن کی چار دیواریاں وسوسوں کی پناہیں بنیں،
اُن میں کربِ تسلسل کا ڈھنگ اور پختہ ہوا
دلوں میں جہاں در جہاں پھیلتی سبز خواہش کے اندر
منافق زمانوں کا رنگ اور پختہ ہوا

منزلوں کی طرف جانے والے سبھی سرخرو شوق رستوں کی سمتیں بدلنے لگیں
اِک ہری آرزو کے سحر علاقے پہ اندھے خیالوں کی میلی گھٹائیں برسنے لگیں
رقص کرتے ہوئے ہمسفر خوں کے ساحل پہ پھر بجلیاں سی چمکنے لگیں

قریۂ عشق میں پھر دِصالِ محمدؐ کی خوشبو ہراساں ہوئی
دہکتے ہوتے دلوں کی زمیں پہ مہکتے ہوئے وقت کی آنکھ ویراں ہوئی
منقسم راستوں میں گھری زندگی اشتراکِ تمنا کی حیرت میں غلطاں ہوئی

منور دنوں اور یادوں کے منظر بھی سایۂ فردا کے گھیرے میں ہیں

ہم پہ بیتی ہوئی ہر قیامت کی ساری اِیں ساعتوں کی اذانیں،
کسی منتظر عہد کے آسماں پر تڑپتے پھڑکتے سویرے میں ہیں
نور ہی نور ہیں ہم سے وابستہ ہو کر زمانے،
مگر ہم اندھیرے میں ہیں

ہم اندھیرے میں ہی ٹمٹماتے بھڑکتے ہوئے خون کے نور سے جگمگانے کی تاریخ
لکھتے رہیں
روشنی کے تسلسل میں بھی جہانگیر یادوں کے سب سلسلے،
وقت کی زد پہ لانے کی تاریخ لکھتے رہیں
خود کو پھر اور پھر آزمانے کی تاریخ لکھتے رہیں
اور لکھتے رہیں
ہم اندھیرے میں ہیں۔

شاہد شیدائی

خاموش رہو

صبح سویرے،
اپنی بیویوں سے لڑ کر تم دفتر پہنچو!
گھر دل کا ہر غم گھر دل میں بھولو،
سارا دن
اپنے جسموں کو
کولہو کا تم بیل بناتے بجتے رہو!
ہندسوں ہندسوں خوں ٹپکاؤ،
مسلوں مسلوں سوچ بکھیرو!
گر بھولے سے،
ماؤں، بہنوں، بچوں کے دکھ
یاد آئیں تو جھٹک دو!
یعنی بے حس پرزے بن کر،
خوش اسلوبی سے تم اپنے کام کا ہر اک باب لکھو!
کٹے پھٹے ہو اندر سے پر باہر سے شاداب لگو!!
محنت، لگن، دیانت سے
اپنے باسوں کو خوش رکھنے کا
کوئی دقیقہ فردگزاشت نہ ہونے دو!
لیکن پورے سال کی محنت کا جب اجر کماؤ
تو جسموں کے زخموں میں کچھ اور اضافہ پا کر بھی خاموش رہو!
اپنی بیویوں سے نہ کہو

کہ تمھاری محنت پر سبقت لینے کی خاطر
بنتِ حوّا اور خوشامد جیسی
تیز اور چمکیلی تلواریں
تم پر سارا سال چلی ہیں !

علی اکبر عباس

کلمہ (ا) الف

(کہو زمین سرد پڑ رہی ہے بلکہ یوں کہو کہ مر رہی ہے)

مرتے مرتے اپنے سارے چاند ستارے رنگ نظاروں روشنیوں کو کھا جائے گی
شاید تم کو بھی کھا جائے۔

تم کو ہیبت اور دہشت کے یہ مفروضے کہاں سے آئے تمھیں خبر ہے؟
تمھیں خبر ہے! اس جیسی ہی کتنی اور زمینیں اس سے پہلے موت کی وادی میں گم سم ہیں
اس سے پہلے بھی تم کسی زمین زندہ پر زندہ تھے۔ جس سے تم کو گود لیا تھا اس تازہ اور زندہ
زمین نے۔ تمہیں خبر ہے!

تمہیں خبر ہے! اس جیسی ہی کتنی اور زمینیں باہوں کو پھیلائے اپنی کوکھ میں کتنے ہی امکان
چھپائے اپنی اپنی باری کا رس چوس رہی ہیں۔ اور اس زمیں کے مرنے سے پہلے ہی تم کو کون
زمین اٹھائے جائے۔ تمہیں خبر ہے؟ تمہیں خبر ہے۔ کون سی شکل و صورت ہیں اور کون
سے رشتوں کی شاخوں پر تم کو وہاں پہ کھلنا ہوگا۔ وہاں پر ساری آوازیں ہی روشنیاں ہوں، وہاں
پہ سارے رنگ تمھارے جسموں پر ہوں کتنے آتے جاتے سورج کتنا کتنا عرصہ ٹھہریں اور
پھر جانے کدھر کو چل دیں اور تم وقت کے پیمانے سے ناپ نہ پاؤ۔ عمر کی کوئی حد نہ ہو کچھ قید نہ ہو
تم کو جتنی پہلی اور آئندہ نسلوں کے اندازے ہیں، سب نسلیں، ایک ہی نسل کی صورت ہیں
تم اپنے چاروں جانب دیکھو پھر بھی سوچو آبادی کتنی تھوڑی ہے اور حوا نام کی کوئی شے
نہ ہوگی۔ تمہیں خبر ہے؟

تمہیں خبر ہے۔ پہلے کتنی ادوار زمینیں مار کے تم اِس تک پہنچے ہو۔ اور یہ زیرِ عمل زینہ بھی کتنا رسا ہے گی اور پھر کون پہلے پہل میں مردہ ہونے والی زمیں بھی زندہ ہو۔ پھر زندہ ہو۔ ابھی زندہ ہو ـــــ اپنے سورج کی لاٹھی بجاتے تم کو ڈھونڈنے چل نکلے۔ کیا تمہیں خبر ہے؟ نہیں حسرت! انہیں خبر ہے۔

کلمۂ ب (با)

یہ ایک سلسلۂ انفاس کا نہیں ہے فقط۔ فقط یہ سانس نہیں۔ فقط یہ سانس نہیں در دِ باد کا صیغہ۔ یہ سلسلہ تو ہے اک پیہ تو الم نشرح۔ جو سارے پہلے زمانوں کی اِک شہادت ہے۔ یہ سارے پہلے زمانوں کا جوہرِ اعتراف۔ زمانے قبلِ ازل کے زمانے جن کی نمو کو ازل سے نسبت ہے۔

یہ ایک سانس نہیں۔ یہ ایک ساعتِ موہوم کا قیام نہیں۔ یہ ایک دورۂ صدر۔ جو کائنات میں جاری ہیں جس قدر ادوار انہی کا حصہ ہے۔ یہ کائنات کا سینے سے گہرا رشتہ ہے فقط یہ سانس نہیں۔ وداع کے بعد شہادت بھی ہے یہ سینے کی۔ یہ ایک جاری شہادت۔ ابد اور بعدِ ابد تک۔

کلمۂ ج (جیم)

جادۂ ابر بھی کیا؟ سکتۂ کوہ بھی ـــ کیا؟ اور سیماب گرِ بحر بھی ـــ کیا؟ ـــ اور سحر ازل کا بہروپ نگہ ہیبت ہو کا امیں۔ اور اِن خراب نما جنگلوں کا حسن و کراہ۔ طائرِ سمع نواز۔ طائرِ سمع بریدہ۔ سب کی قسمت میں کہاں لمس نظر کی خلعت۔ ہاں یہ سب شکر گزار اس پہ ہیں جست درِ جستِ خیال! ان کو کرتے ہیں عطا عذرِ خیال لیکن اے رخشِ خیال پہلے کہاں تیری شناخت اور اے شاہِ نظر ہے کہاں تیرا لباس۔

پارۂ آب کا مستور ہے ابر۔ خامشی کوہ کی ردا۔ بے قراری ہے سمندر کا لباس۔ اور ان سارے
لبادوں سے ہی بے ترتیب کہیں جا کے بنے یہ ترے سر کی دستار۔ اے شہنشاہِ
نظر اور ان سب کے ہی دامانِ پناہ خیز سے ہے۔ تیری جستوں کا کمال۔ ہوش اے
رخشِ خیال۔ ہوش اے رخشِ خیال۔

آذر تمنا

نظم

اور اس رات کہ جب
آسماں اور زمیں خلوتِ تقصیر میں تھے
پڑھ لیے دیدۂ حیراں نے سب
لوحِ محفوظ کے وہ لفظ جو تقدیر میں تھے

حرفِ اظہار کی نایابیٔ مفہوم کے بعد
بسترِ خواب و لب و لمس کی خواہش سے پرے
اپنے آئندۂ معلوم کے بعد
دیر سے نشۂ غم ناک میں مدہوش تھے ہم
ایک اندوہِ سماعت تھا کہ خاموش تھے ہم

عزیز انجم حیدر

دورِ وسطیٰ کی کوئی شہزادی

مدتوں سے نہیں ہوا پیدا — کوئی وامق نہ قیس نہ فرہاد
کیوں جھروکوں کو چھوڑ کر اپنے — کر رہی ہے تو محفلیں آباد
محفلوں میں تو کتنی گم سم ہے — کتنی پابند تیری آزادی
جیسے سنگین محلکوں میں بند — دورِ وسطیٰ کی کوئی شہزادی
جس کا محبوب بے نظیر کہیں — کسی ماہ رُخ پری کی قید میں ہو
یا اسی چور سے محبت ہو — پھول چوری سے لے گیا تھا جو

شائستہ حبیب

نظم

نیند دل میں چلنے والے ہاتھوں میں سُر کے بادل
بادل آنسوؤں سے برتر
کس کس کے نکیوں کو بھگو کر جانے کس دیس میں جا کر
محبتوں کی کہانیوں کو زمین کے ماتھے پر لکھیں گے
ہم نے تو آنسوؤں کے آگے
ڈیم بنانے کی کوشش کی تو دریا نے اپنی دھارا کا رُخ کسی اور سمت موڑ دیا
پتھریلی چٹانوں سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہوتی محبتوں کو
ہم نے سیپی میں بند موتی کی طرح اپنے اندر چھپا لیا
کہ غلط آنکھیں اُنہیں دیکھ نہ سکیں
پر اس ساری توڑ پھوڑ میں ہمارا وجود کندن ہوا تو لشکارے
دیوار دیوار تصویروں کی طرح بکھرنے لگے
کس کس کا منہ بند کرو گے
کس کے سامنے جھوٹی نہیں نبھاؤ گے
کہ محبتوں کی خوشبو اب بادل سے اُڑ رہے ہیں
ہواؤں کے سنگ پر خوشبو جہاں جاتے گی
پانی کے ساتھ ہمارے آنسو بھی لوگوں کے صحنوں میں برسیں گے
رم جھم —— جل تھل

شائستہ حبیب

نظم

پیاسی رُوح کو بولتے کس نے سنا ہے —
ٹیلی ویژن کے پردے پر جو تصویریں سنتے ہو —
وہ بھی منظر کا دھوکا ہے
میں تو اپنی بند آنکھوں کے اندر ایک جہاں چلتے پھرتے دیکھتی ہوں
پر دیکھنا اور کچھ کہنا — دونوں باتیں ایک نہیں ہیں —
ویسے بھی تو ہم کو دیکھنے والے
اپنے اپنے لینز سے دیکھ کے
اپنے تئیں ہمارے بارے میں رائے لکھ لیا کرتے ہیں —
ہم کیا ہیں — کیا ہم یہی بتلانے اس دُنیا میں آتے ہیں
پر پیاسی رُوح کو بولتے کس نے سُنا ہے
کس نے دیکھا ہے
کس نے گھُپ اندھیرے کی خوشبو کو چکھا ہے

زاهد کامران

وہ زندہ ہوتے ہیں

درختوں کی نیلی جٹاؤں سے اوپر
ہرے رنگ کی تتلیوں کے گھروں میں
مقدس صحیفوں کے لفظوں میں زندہ
نئی ایک دُنیا
نئے وقت کے قرمزی آب خورے
مکانوں میں سمٹے ہوئے نیک انساں
فلک سے اترتی ہوئی سات رنگوں میں پھیلی ہوا کو
یونہی دیکھتے ہیں
وہ اوس اور شبنم کے سائے میں پلتے چلے جا رہے ہیں
انہیں اِس زمیں پر
جوانی کے سارے پرانے فسانے
کہانی میں لکھی ہر اِک بات ازبر ہے، وہ جانتے ہیں
مقدر کے سارے تماشے میں اُڑتے پرندے انہیں نوچتے ہیں،
وہ سانسوں کی اِک آہ میں ڈوبتے اور پھر اس زمیں پر
پرانی شبیہوں کی صورت نظر آ رہے ہیں،
زمان و مکاں سے بہت دُور
سجدہ کیے سات پشتوں سے اپنے گناہوں کی دلدل میں
ہر آنے والے کڑے وقت سے دُور ہی دُور
اُسی کرب میں، اپنے ہونٹوں سے دنیا کی مٹی کو چھوتے
فلک سے اُترتے فرشتوں سے اپنا پتہ پوچھتے ہیں
وہ زندہ ہوئے ہیں!

قمر جاوید

روشن دہلیز

وہ کل رات جب دیر تک گھر نہ آیا
تو بوسیدہ کمروں کی خستہ منڈیروں پہ تشویش آسیب بہروپ بدلنے لگے
صحن میں زرد پتوں کی لاشوں پہ کالی ہوا سرسرانے لگی
اور فالج زدہ کھڑکیوں کی سلاخوں کو چھونے لگیں اُکھڑی اُکھڑی صدائیں
اُس کے بابا کے اعصاب شل ہو گئے
اُس کی بہنوں کی سانسوں کی ترتیب کو
نارسا ساعتیں منقلب کر گئیں

شب کے پچھلے پہر اُس نے گہرے اندھیرے میں جلتے ہوئے دو چراغوں کو دیکھا
لپک کر اُجالے کی دہلیز چومی
تو ماں نے کہا
میرے بچّے
دیر تک رات کا ساتھ دینے لگے ہو
کبھی روشنی کو نہ پھر آزمانا

غزلیں

احسان دانش

جو چال تم آج چل رہے ہو — پستی کی طرف پھسل رہے ہو
رسوائی تو ہے ہوس کی تقدیر — کیوں بھیس نئے بدل رہے ہو
اب کے جو گرے تو پھر نہ اُٹھے — اچھا ہے اگر سنبھل رہے ہو
آئینے پہ ناچتی ہیں کرنیں — بچوں کی طرح بہل رہے ہو
تفریق ہے رنگ اور لہو میں — کیوں منہ پہ گلال مل رہے ہو
کھیتوں پہ برس رہا ہے ساون — تم بھوس کی طرح جل رہے ہو
اے ریت کے ابر پوش ٹیلو — تم دھوپ کے ساتھ ڈھل رہے ہو
ڈوبی ہوئی ناؤ کی طرح سے — دلدل میں پڑے ہو گل رہے ہو
کب سے ہے سروں کی فصل تیار — تم آج بھی پھول پھل رہے ہو
دنیا سے ملے گی راہِ عقبیٰ — کیوں اس سے نظر بدل رہے ہو
تم لالہ و گل کی دشمنی میں — کانٹوں کی روش پہ چل رہے ہو
ڈرتے ہو کہ مقبرے ہیں نزدیک — چلتے ہوئے پاؤں مل رہے ہو
باطن کا بھی جائزہ ہے درکار — ظاہر پہ عبث مچل رہے ہو
کیا حبس نے سانس روک دی ہے — اب خول سے کیوں نکل رہے ہو
آجاؤ مرے شجر کے نیچے — کیوں دشت کی لَو میں جل رہے ہو
ہر کام ہے تم کو سخت دشوار — اک عمر سے بے عمل رہے ہو
گو ختم ہے عمر کی مسافت — تشکیک کے پُل پہ چل رہے ہو
گزری ہوئی رُت نہ آئے گی اب — بے فائدہ ہاتھ مَل رہے ہو

کیا جان کا خوف ہے کہ دانشؔ
معیارِ طلب بدل رہے ہو

احسان دانش

جو اہلِ عشق ہیں نایاب ہوتے جاتے ہیں
یہ زندگی کے حسین خواب ہوتے جاتے ہیں

پہنچ چکا ہے ستاروں کے مرحلوں میں بشر
جہاز آج بھی غرقاب ہوتے جاتے ہیں

سمندروں کی طرح جن کا شور برپا تھا
جو یوں بھی ہے تو پایاب ہوتے جاتے ہیں

نشے کی جھانجھ میں پیرِ مغاں کے منصوبے
جزیروں کے حسیں خواب ہوتے جاتے ہیں

تھا جن کی گونج سے آبادیوں میں واویلا
زمیں میں جذب وہ سیلاب ہوتے جاتے ہیں

ابھی تو صاحبِ ظرف و ضمیر میں کچھ لوگ
مگر یہ لوگ بھی کمیاب ہوتے جاتے ہیں

چراغ جن کو تھی آشوبِ چشم کی تکلیف
چمک دمک میں وہ مہتاب ہوتے جاتے ہیں

وہ ذرے جن پہ نہ سورج کی پڑ سکی کرنیں
تمام کرمکِ شب تاب ہوتے جاتے ہیں

گزر رہے ہیں جو شام و سحر کے ہنگامے
کتابِ وقت کا اِک باب ہوتے جاتے ہیں

حلال رزق سے جن کے ضمیر زندہ تھے
وہ اِس زمانے میں نایاب ہوتے جاتے ہیں

جھلس گئے تھے لوؤں سے جو غنچۂ نورس
سحر کے لمس سے شاداب ہوتے جاتے ہیں

گناہ و جرم کی رو میں سیاستِ نو میں
جو کھو گئے تھے وہ خودیاب ہوتے جاتے ہیں

فضا کو سونپ رہے ہیں معانی و تاثیر
وہ نقش گم جو سرِ آب ہوتے جاتے ہیں

زباں میں شعلۂ دل سے پہنچ رہی ہے جو آنچ
یہ ہاتھ کس لیے برفاب ہوتے جاتے ہیں

بروزِ حشر خدا جانے کیا ہو اے دانشؔ
ابھی سے شل مرے اعصاب ہوتے جاتے ہیں

احسان دانش

ضبطِ گریہ میں جو کامل نہیں ہونے پاتے
میرے مشرب میں وہ شامل نہیں ہونے پاتے

ایسی بستی میں پڑا ہوں کہ مہینوں بھی جہاں
حادثاتِ نگہ و دل نہیں ہونے پاتے

راہ میں پاؤں کے چھالوں کی اگر ہوں مہریں
لوگ بیگانۂ منزل نہیں ہونے پاتے

حسن ہر گام پہ ملتا ہے اُفق تا بہ اُفق
طے نگاہوں سے مراحل نہیں ہونے پاتے

عکس جب دیتا ہے انساں کو برابر کے جواب
اس گھڑی آئینے حائل نہیں ہونے پاتے

راستے روپ بدلتے ہیں جہاں وقت کے ساتھ
رہنما واقفِ منزل نہیں ہونے پاتے

اب بھی کچھ لوگ ہیں رہزن کی روایت کے امیں
جن کے رُخ جانبِ منزل نہیں ہونے پاتے

میں تو اس در کا گدا ہوں کہ فرشتے بھی جہاں
درخورِ گوشۂ محفل نہیں ہونے پاتے

شکر کی جا ہے کہ ہم اہلِ جنوں کے صحرا
کارزارِ حق و باطل نہیں ہونے پاتے

تو نے جن جن کو عطا کی ہے انا کی نعمت
جان دے دیتے ہیں سائل نہیں ہونے پاتے

تجھ کو ان درد کے ماروں کی خبر ہے کہ نہیں
جو ترے شہر میں داخل نہیں ہونے پاتے

دوسروں کے پرِ پرواز کترنے والے
خود بھی پرواز کے قابل نہیں ہونے پاتے

نیم شب آتی ہے، دھڑکن میں انہی کی آواز
اور ہم بے خبرِ دل نہیں ہونے پاتے

دھڑکنیں تو ہیں ستاروں میں مسلسل لیکن
قلبِ انساں کی طرح دل نہیں ہونے پاتے

کون مجبور کرے آئینہ بینی پہ انہیں
جلوے جلووں کے مقابل نہیں ہونے پاتے

عرش سے جن کو بلاوا ہو بدستِ جبریل
آسماں راہ میں حائل نہیں ہونے پاتے

اپنے دیدار کا وہ وقت عطا کر مجھ کو
جلوے جب راہ میں حائل نہیں ہونے پاتے

انقلابات کی بُو سونگھنے والے دانشؔ
اپنے ماحول سے غافل نہیں ہونے پاتے

احمد ندیم قاسمی

ٹوٹتے جاتے ہیں سب آئینہ خانے میرے
وقت کی زد میں ہیں یادوں کے خزانے میرے

زندہ رہنے کی ہو نیّت ، تو شکایت کیسی
میرے لب پہ جو گِلے ہیں ، وہ بہانے میرے

رخشِ حالات کی باگیں تو مرے ہاتھ میں تھیں
صرف میں نے کبھی احکام نہ مانے میرے

میرے ہر درد کو اُس نے ابدیت دے دی
یعنی کیا کچھ نہ دیا مجھ کو ، خدا نے میرے

میری آنکھوں میں چراغاں سا ہے مستقبل کا
اور ماضی کا ہیولے ہے سرہانے میرے

تو نے احسان کیا تھا تو جتایا کیوں تھا
جھک گئے اتنے بڑے بوجھ سے شانے میرے

راستہ دیکھتے رہنے کی بھی لذت ہے عجیب
زندگی کے سبھی لمحات سہانے میرے

جو بھی چہرہ نظر آیا ، ترا چہرہ نکلا
تو بصارت ہے مری ، یار پرانے میرے

فصلِ گل دشت میں کاٹی تو خزاں تیرے پاس
حسبِ تقدیر بدلتے ہیں ٹھکانے میرے

سوچتا ہوں ، مری مٹی کہاں اڑتی ہوگی
اِک صدی بعد جب آئیں گے زمانے میرے

صرف اِک حسرتِ اظہار کے پَرتو ہیں ندیمؔ
میری غزلیں ہوں کہ نظمیں کہ فسانے میرے

احمد ندیم قاسمی

صرف اک عزمِ سفر، زادِ سفر اپنا تھا
کبھی صحرائے تمنا میں گذر اپنا تھا
میں اگر دشت سے گزرا تو وطن سے گزرا
گھر جو بے در نظر آیا، وہی گھر اپنا تھا
خود کو آئینے میں دیکھا تو میں مانندِ چراغ
اپنے ہی ہاتھ پہ رکھے ہوئے سر اپنا تھا
حسن سے یوں تو فرشتے بھی اثر لیتے ہیں
فرق یہ ہے ۔ مرا اندازِ نظر اپنا تھا
سب پہ طاری تھا طلسمِ رُخِ زیبا لیکن
میں جو بے چین تھا اتنا، مجھے ڈر اپنا تھا
یوں تو تا حدِّ نظر اوج پہ تھی شعلہ زنی
جس نے اِس گھر کو جلایا وہ شرر اپنا تھا
آج وہ مجھ پہ بڑھا طعن بہ لب، سنگ بہ دست
اور اِک روز وہی آئنہ گر اپنا تھا
جو بھی سنتا ہے، سمجھتا ہے، وہ خود بولا ہے
بات اِس طرح سے کہنا ہی ہنر اپنا تھا
پیش غیروں کی طرح آتے ہیں اپنے بھی ندیمؔ
کوئی اپنا تھا تو اندر کا بشر اپنا تھا

احمد ندیم قاسمی

اپنے خوابوں کے کئی ارمن وسما لے جائے گا
قبر میں انسان کیا اس کے سوا لے جائے گا

وقت کا طوفاں ہے حسن و سرخوشی کی تاک میں
دل سے جذبہ، ہاتھ سے رنگِ حنا لے جائے گا

پھول کی میت پہ کیوں سارا چمن ہے سینہ زن
کوئی جھونکا آئے گا! اس کو اٹھا لے جائے گا

آدمی کے دم سے آئینِ مشیت زندہ ہے
مرگیا تو ساتھ ہی اپنا خدا لے جائے گا

قطرۂ شبنم کے گر جانے سے جو گریاں ہوا
آندھیوں کے سامنے اپنا دیا لے جائے گا

موجۂ بادِ صبا کی ہمرہی اچھی، مگر
یہ تو ہر جانب تری آواز پا لے جائے گا

کوئی دیوانہ بکارِ خویش دیوانہ نہیں
نقشِ پا دے جائے گا اور آبلا لے جائے گا

داورِ محشر کے ہاں، عصرِ رواں کا حکمراں
خون میں ڈوبی ہوئی اِک فاختا لے جائے گا

اپنی بستی میں تو ہیں سب لوگ خوابیدہ ندیمؔ
اور کس کے در پہ کشکولِ صدا لے جائے گا!

منیر نیازی

رنگوں کی وحشتوں کا تماشا تھی بامِ شام
طاری تھا ہر مکاں پہ جلالِ دوامِ شام

○

گلدستۂ جہات تھا نیرنگِ راہِ عشق
تھا اک طلسمِ حُسن خیابانِ دامِ شام

○

آگے کی منزلوں کی طرف شام کا سفر
جیسے شبوں کے دِل میں تھا شہرِ قیامِ شام

○

باندھے ہوتے ہیں وقت سبھی اُسکے حکم میں
ہے جس خدا کے ہاتھ میں کارِ نظامِ شام

○

دُھند لاگئی ہے شام شب خام سے منیرؔ
خالی ہوا کشش کی شرابوں سے جامِ شام

○

منیرنیازی

روشنی در روشنی ہے اُس طرف
زندگی در زندگی ہے اُس طرف

○

جن عذابوں سے گزرتے ہیں یہاں
ان عذابوں کی نفی ہے اُس طرف

○

اک رہائش خواہشِ دل کی طرح
اِک نمائش خواب کی ہے اُس طرف

○

جو بکھر کر رہ گیا ہے اُس جگہ
حسن کی اک شکل بھی ہے اُس طرف

○

جستجو جس کی یہاں پر کی بہت
اُس سے ملنے کی خوشی ہے اُس طرف

○

منیر نیازی

بے حقیقت دُوریوں کی داستاں ہوتی گئی
یہ زمیں مثلِ سرابِ آسماں ہوتی گئی

○

کس خرابی میں ہُوا پیدا جمالِ زندگی
اصل کِس نقلِ مکاں میں رائیگاں ہوتی گئی

○

تنگیٔ امروز میں آئندہ کے آثار ہیں۔
ایک ضد بڑھ کر کسی شے کا نشاں ہوتی گئی

○

دوسرے رُخ کا پتہ جس کو تھا وہ خاموش تھا
وہ کہانی بس اسی رُخ سے بیاں ہوتی گئی

○

اِک صدا اٹھی تو اک عالم ہوا پیدا منیرؔ
اِک کلی مہکی تو پُورا گلستاں ہوتی گئی

○

منیر نیازی

دل کو حالِ قرار میں دیکھا
یہ کرشمہ بہار میں دیکھا

O

جس کو چاہا خمار میں چاہا
جس کو دیکھا غبار میں دیکھا

O

خواہشوں کو بہت ہوا دینا
وصف یہ ہم نے یار میں دیکھا

O

اِک بشر میں کئی بشر دیکھے،
جزو کُل کے حصار میں دیکھا

O

جب سے دیکھا ہے اس زمیں کو منیر
قیدِ لیل و نہار میں دیکھا

O

فارغ بخاری

اظہارِ عقیدت میں کہاں تک نکل آئے
ہم اہلِ یقیں وہم و گماں تک نکل آئے

شاداب بہاروں کے تمنائی کہاں ہیں
موسم کے قدم زخمِ خزاں تک نکل آئے

یہ کیسا الم ہے کہ گریباں ہو سلامت
اور آنکھوں سے خونِ رگِ جاں تک نکل آئے

کب نکلے گی دیوانوں کی بارات گھروں سے
سینوں میں بغاوت کے نشاں تک نکل آئے

مقتل میں بہتر بھی نہیں نکلے ہیں اب کے
درگاہوں میں سب پیر و جواں تک نکل آئے

اب تو نہ کرو راہنماؤں کی شکایت
اخباروں میں اب ان کے بیاں تک نکل آئے

اب کون سرِ دار نظر آئے گا فارغ
جب اہلِ جنوں سود و زیاں تک نکل آئے

انجم رومانی

جائے خرد نہیں ہے کہ فرزانہ چاہیئے — ہُو، کا مقام ہے کوئی دیوانہ چا
ہے اس میں قیدِ شہر، نہ ویرانہ چاہیئے — بہرِ فراغِ طبعِ فقیرانہ چا
یاں ہر قدم ہے محشرِ امکان تو بہ تو — یاں ہر قدم پہ سجدۂ شکرانہ چا
گنجائشِ تصور یک لفظ بھی نہیں — یاں ہر کسی کے واسطے افسانہ چا
جب تنگ کر ہیں زمانے میں ہم سے خراب لوگ — مسجد کہیں، کہیں کوئی مے خانہ چا
معلوم ہے خدا کو جو حالت دلوں کی ہے — اے شیخ! ہم فقیروں پہ فتویٰ نہ چا
رکھتے ہیں انجم آپ جو اوروں کے واسطے — اپنے لئے بھی تو وہی پیمانہ چا

قتیل شفائی

رقص کرتے ہوئے چلیے کہ غزل خواں چلیے
جان و دل بیچ کے سوئے درِ جاناں چلیے

گر تڑپنے کی ہوس ہے تو پھر اے حضرتِ دل
راستہ دیکھ رہی ہے شبِ ہجراں چلیے

نہ کوئی ذکرِ غزالاں نہ کوئی دورِ غزل
اپنے کس کام کی اب محفلِ یاراں چلیے

ہم تو خود ڈال چکے پاؤں میں زنجیرِ وفا
ایسے حالات میں کیا جانبِ زنداں چلیے

عقل والوں سے کہو پھر بھی تو آئے گی بہار
اب کے سی لیتے ہیں ہم چاکِ گریباں چلیے

فطرتاً ایک سے ہیں شیخ و برہمن دونوں
جانبِ دیر و حرم بے سر و ساماں چلیے

رونے والوں کا بھلا ساتھ دیا ہے کس نے
اپنے اشکوں کو چھپا کر پسِ مژگاں چلیے

تیز رفتار سے پڑ جاتے ہیں چھالے بھی قتیل
چلتے رہنا ہے تو آہستہ مری جاں چلیے

اداجعفری

ہر لفظ دل کی آرزو، ہر چہرہ آئینہ لگے
ہم خوش یقیں اتنے ہیں ہر خواب ہی سچا لگے

میراث ہے یہ امتحاں، جانِ حزیں یہ بھی سہی
جب تشنگی حد سے بڑھے ہٹتا ہوا دریا لگے

خوابوں کی وادی میں پھرے بے تاب سی بے حال سی
یہ زندگی مجھ کو کوئی بھولا ہوا وعدہ لگے

جس بات پر ہنسنا بہت اُس بات پر رونا بہت
احوال اپنا بھی ہیں کچھ داستانوں سا لگے

معلوم تو ہم کو بھی تھا، ہے آسرا جی کا زیاں
یہ ناتواں سا رابطہ دل کو مگر اچھا لگے

اِک زرد پتے کے قریں ٹہنی پہ یہ کھلتی کلی
اِس آن تو دل کو مرے ہر فاصلہ جھوٹا لگے

اِک کم سخن فرمان سا، اِک اَن کہا پیغام سا
مجھ کو تو سنگِ راہ تک اس کا ہی نقشِ پا لگے

ہر شخص ہی تم سا ہیاں دِل سے کبھی پوچھو اداؔ
یہ دشتِ شب کا راہرو کیوں اسقدر تنہا لگے

شہزاد احمد

فصلِ دل اب کے برس بھی کاٹ ڈالی جائے گی
پھول روندے جائیں گے، مٹی بچا لی جائے گی

بادلوں میں دیکھ پائے ہیں، کوئی چہرہ نہ جسم
اب تو لگتا ہے کہ یہ برسات خالی جائے گی

یہ ضروری تو نہیں گھر تک ہی آئے سیلِ غم
کچھ نہ کچھ دیوار بھی آگے بڑھا لی جائے گی

رفتہ رفتہ اپنے مرکز سے نظر ہٹنے لگی
اب جہاں جائے گی آوارہ خیالی جائے گی

کشتِ دل اب تیری مٹی میں نمو باقی نہیں
شاخِ گل اب سنگریزوں سے نکالی جائے گی

کارگر ہو یا نہ ہو شامِ زمستاں کی دعا
برف تو خالی ہتھیلی پر جما لی جائے گی

اپنے خوں سے جسم کی مٹی تو گیلی ہو چکی
دیکھئے کب تک دلوں کی خشک سالی جائے گی

آسمانوں پر لکیریں پھیر دے گی تیرگی
روشنی سورج کی آنکھوں سے چرا لی جائے گی

ایک سے ہو جائیں گے ہر ایک چہرے کے نقوش
دل سے مستی سانس سے خوشبو اڑا لی جائے گی

اب نئے جگنو ستاروں سے بنائے جائیں گے
اور دھرتی گیند کی صورت اچھالی جائے گی

ختم تو شہزادؔ کیا ہوگا جدائی کا سفر
اب جہاں ٹھہرے وہیں منزل بنا لی جائے گی

شہزاد احمد

تابندہ یونہی شب کے نظاروں میں رہے گا
جگنو بھی ستارہ ہے ستاروں میں رہے گا

گہرے ہیں سمندر سے بھی آنکھوں کے اندھیرے
انسان ہمیشہ انہی غاروں میں رہے گا

ان آنکھوں سے آنسو نہ بہے ہیں نہ بہیں گے
یہ جھیل کا پانی ہے کناروں میں رہے گا

الفاظ ادا کر نہ سکے کیفیت دل
جو ربط بھی باقی ہے اشاروں میں رہے گا

کیا دولتِ غم میری ہی جاگیر بنے گی
کیا درد فقط درد کے ماروں میں رہے گا

ہم فرض کریں گے کہ بہار آئی ہوئی ہے
جب پھول بھی کوئی نہ بہاروں میں رہے گا

شہزادؔ ہمیں برف سے دن راس نہیں ہیں
دل آگ سے کھیلے گا شراروں میں رہے گا

اقبال ساجد

رُخِ روشن کا روشن ایک پہلو بھی نہیں نکلا
جسے میں چاند سمجھا تھا وہ جگنو بھی نہیں نکلا

○

وہ تیرا دوست جو پھولوں کو پتھرانے کا عادی تھا
کچھ اُس سے شعبدہ بازی میں کم تو بھی نہیں نکلا

○

ابھی کس منہ سے میں دعویٰ کروں شاداب ہونے کا
ابھی ترشے ہوئے شانے پہ بازو بھی نہیں نکلا

○

گھروں سے کس لیے یہ بھیڑ سڑکوں پر نکل آئی
ابھی تو بانٹنے وہ شخص خوشبو بھی نہیں نکلا

○

شکاری آتے تھے دل میں شکارِ آرزو کرنے
مگر اس دشت میں تو ایک آہو بھی نہیں نکلا

○

تری بھی حُسن کاری کے ہزاروں لوگ ہیں قائل
گلی کوچوں سے لیکن اُس کا جادو بھی نہیں نکلا

○

بتا اِس دَور میں اقبال ساجد کون نکلے گا
صداقت کا علَم لے کر اگر تو بھی نہیں نکلا

○

اقبال ساجد

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

دکھاوے کے لیے خوشحالیاں لکھتے ہیں کاغذ پر
ہم اِس دھرتی پہ ورنہ رزق کے چکر میں رہتے ہیں

ضرورت ہی لئے پھرتی ہے ہم کو در بدر ورنہ،
ہم اُن میں سے نہیں جو جستجوئے زر میں رہتے ہیں

لہو سے جو اُٹھائی تھیں وہ دیواریں نہیں اپنی
یہی محسوس ہوتا ہے پرائے گھر میں رہتے ہیں

کبھی بیداریاں قسمت تھیں اب نیندیں مقدر ہیں
ہمارا کیا ہے ہم تو شہرِ خواب آور میں رہتے ہیں

مزہ مل جائے گا تجھ کو بھی سنگِ راہ بننے کا،
ترے جیسے تو اُس کے پاؤں کی ٹھوکر میں رہتے ہیں

وہ خوشبودار چہرے جو نگاہ و دل کا مرکز تھے،
خدا جانے بچھڑ کے ہم سے کس محور میں رہتے ہیں

دُکھوں کے باغ میں ہر وقت شاخِ زخم پھلتی ہے
ازل سے یہ شجر کربِ ثمر آور میں رہتے ہیں

کوئی شہکار فنِ تکمیل کا دعوےٰ نہیں کرتا
اُدھورے پن کے دُکھ ساجد ہر اک پیکر میں رہتے ہیں

عطا شاد

ہے جھم جھم دھڑکتی رتوں کا شہر آباد
یہ آفریدۂ مہتاب، وہ گلاب نژاد

ہم اک بشارتِ وصل نظر پہ مر جائیں
ترا مزاجِ نظر ناشناس، زندہ باد

نظر نظر میں دمکتی ہے، رت جگوں کی دھنک
فصیلِ جسم میں ہم ہیں، مثالِ خواب آزاد

قدم قدم پہ چمکتے ہیں، چاہتوں کے چراغ
بچھا ہے شیشۂ دل، اے نگاہِ آئینہ زاد

پھوار بن کے گرے جیسے حرف حرف کا رس
تری زباں سے سنوں، اپنے عشق کی روداد

عطاؔ نہ پوچھ کسی شبنمی خیال کی آنچ
غبارِ آب بنا چاہتی ہے، خاطرِ شادؔ

اسرار زیدی

گم ہوتی ہوئی فصلِ شبِ ماہ نہ دیکھو
میں صبحِ سفر میں ہوں مری راہ نہ دیکھو

ہنگام ہزیمت ہو تو پھر طبل و علم کیا
اب کوئی بھی حیرت سرِ جنگاہ نہ دیکھو

دستک بھی جو دو گے تو کوئی در نہ کھلے گا
اک سیلِ بلا ہے یہ گذرگاہ نہ دیکھو

ہر شخص کہاں شمع کے مانند جلا ہے
یوں ہر سفر آمادہ کو ہمراہ نہ دیکھو

ہم اپنے ہی خوابوں کے جزیرے میں گھرے ہیں
اس قریۂ غم کا حشم و جاہ نہ دیکھو

اسرار زیدی

برف کا ہر منجمد تودہ پگھل ہی جائے گا
آج پت جھڑ ہے تو کل موسم بدل ہی جائے گا

سامنے کی دشمنی تو حوصلے کی بات ہے
جو پسِ پردہ رہا وہ ہاتھ جل ہی جائے گا

اب تو شاخوں پہ رہے کیا زرد پتے بھی نہیں
وائے خوش فہمی کہ یہ طوفاں بھی ٹل ہی جائے گا

گھر سے نِکلے تو نگہبانوں کے تیور اور تھے
ہم انہی سوچوں میں گم ہیں کام چل ہی جائے گا

اِک نہ اِک دن ختم ہو جائیں گے سائے جبر کے
آدمی اپنے حِصاروں سے نِکل ہی جائے گا

ذوالفقار احمد تابش

کنارِ دشت، سرِ ساحل ہوا دیکھیں
کہیں تو ہوگا لکھا، اس کا نقشِ پا دیکھیں

کہاں اڑے گی وہ خوشبو ترے تکلّم کی
کہاں کھلے گا ترا غنچۂ صدا دیکھیں

ترے خرام کے ہمراہ چاند، پھول، ہوا
کہاں پہ ٹھہرے گا جاکر یہ قافلہ دیکھیں

مرے لہو میں کھلے ہیں تمہارے ہجر کے پھول
کب آتے ان پہ ترا موسمِ وفا دیکھیں

لکھا ہے نقش ہوا پر تمہارا نقشِ سخن
مگر کدھر وہ گیا پیکرِ صدا دیکھیں

کبھی ہو یوں بھی کہ وہ آتے اور ہم نہ ملیں
کبھی تو اہلِ جفا کا بھی حوصلہ دیکھیں

محسن احسان

شعلۂ شوق بھی ہم دیدۂ نم بھی ہم تھے
وہ بھی کیا دور تھا جس دور میں ہم بھی ہم تھے

ہم نے اِک عمر نباہی ہے تمہارے غم سے
ہم کو ہے فخر کہ شائستہ غم بھی ہم تھے

تجھ کو بھولے تو نہ ہوں گے وہ شب و روز کہ جب
تیرا وعدہ بھی تھے ہم تیری قسم بھی ہم تھے

تیرا اعجازِ عنایت بھی ہمیں کہلائے
تیرے اندازِ تغافل کا بھرم بھی ہم تھے

بزم کے رنگ کو ہم نے متوازن رکھا
تیری محفل میں زیادہ بھی تھے کم بھی ہم تھے

پھر ہوا یوں کہ وہ مشتاق کرم تھا ہم پر
پھر ہوا یوں کہ طلب گار ستم بھی ہم تھے

ہم نے جاری کیے فرمان کرم بھی محسن
دست نا اہل میں کمزور قلم بھی ہم تھے

محسن احسان

سائے کی امید تھی تاریکیاں پھیلا گیا
جو شجر پھوٹا زمیں سے بیج ہی کو کھا گیا
کیا گلہ تجھ سے کہ گلشن کا مقدر ہے یہی
ابر گھر کر جب بھی آیا بجلیاں برسا گیا

اب کناروں سے نہ مانگے قطرے قطرے کا حساب
کیوں سمندر کی طرف بہتا ہوا دریا گیا
میری سیرابی بھی میری تشنگی سے کم نہ تھی
میں مثالِ ابر آیا صورتِ صحرا گیا

حسن کے ہمراہ دیکھا اِک جلوسِ تشنگاں
عشق تنہا دہر میں آیا تھا اور تنہا گیا
محسن احساں بھی کسی بادل کا ٹکڑا ہے، کہ جو
ایک لمحے کے لیے آیا، گِھرا، برسا، گیا

امجد اسلام امجد

لہو کے پھول سرِ شاخِ انتظار کھلے
یہ کس بہار کے غنچے، پسِ بہار کھلے
دلوں سے گردِ مسافت دھلی تو آنکھوں میں
گلِ وصال کھلے اور بے شمار کھلے
ہنر کے باب میں بے بس ہے قوتِ تخلیق
کہ موجِ رنگ تو پتھر کے آرپار کھلے
ہے جو بھی پھول وہ زردِ حباب جیسا ہے
گئی رتوں میں جو بوئے تھے اب کی بار کھلے
ہوا کچھ ایسی چلی ہے سوادِ ہجراں میں
خزاں کے صحن میں جیسے گلِ بہار کھلے

O

لہو میں تیرتے پھرتے ملال سے کچھ ہیں
کبھی سنو تو دلوں میں سوال سے کچھ ہیں
میں خود بھی ڈوب رہا ہوں ہر اِک ستارے میں
کہ یہ چراغ مرے حسبِ حال سے کچھ ہیں
اک اور موج کہ اے سیلِ اشتباہ ابھی
ہماری کشتِ یقیں میں خیال سے کچھ ہیں
غمِ فراق کی صدیاں، نشاطِ وصل کے پل
شمارِ عمر میں یہ ماہ و سال سے کچھ ہیں
غمِ فراق سے اِک پل نظر نہیں ہٹتی
اس آئینے میں ترے خد و خال سے کچھ ہیں

پاشا رحمٰن

برفانی ہواؤں پہ ترا شک ہوا کیسے
احساسِ صدا موجبِ دستک ہوا کیسے

کیا شہرِ وفا مستقرِ بوالہوساں ہے
چہرہ پری چہروں کا بھیانک ہوا کیسے

اے لالہ رخو! عشوہ گرو! تنگ قباؤ!
یہ لطف و کرم ہم پہ اچانک ہوا کیسے

شیوہ تو ترا صرف ستم تھا ستم ایجاد!
اخلاص و مروت ترا مسلک ہوا کیسے

اب جاں سے گذر جا کہ تقاضائے جنوں ہے
پاشاؔ تری الفت پہ اسے شک ہوا کیسے

○

مثالِ آئینہ یارو نکھر گیا کل شب
عجیب سانحہ دل پہ گزر گیا کل شب

بساطِ دشت پہ یوں چاندنی تھی رقص کنا
کہ جیسے چاند کا ہر زخم بھر گیا کل شب

سیاہ رات کا وہ راہبِ چراغ بکف
سنو! وہ کرمکِ شب تاب مر گیا کل شب

کچھ اتنا چہرہ بھیانک تھا خواب میں اس
کہ اپنے آپ سے پاشا بھی ڈر گیا کل شب

○

ثروت حسین

فراتِ فاصلہ سے دجلۂ دعا سے اُدھر
کوئی پکارتا ہے دشتِ نینوا سے اُدھر

کسی کی نیم نگاہی کا جل رہا ہے چراغ
نگار خانۂ آغاز و انتہا سے اُدھر

میں آگ دیکھتا تھا آگ سے جدا کر کے
بلا کا رنگ تھا، رنگینیٔ قبا سے اُدھر

میں راکھ ہو گیا طاؤسِ رنگ کو چھو کر
عجیب رقص تھا، دیوارِ پیش پا سے اُدھر

زمین میرے لیے پھول لے کے آئی ہے
بساطِ معرکۂ صبر آزما سے اُدھر

یہ میرے ہونٹ سمندر کو چوم سکتے ہیں
حکایتِ شبِ افراد و آئینہ سے اُدھر

کس پر پوشیدہ اور کس پہ عیاں ہونا تھا
کون ہوں میں مجھ کو اس وقت کہاں ہونا تھا

تم کہاں اس کنجِ آزار میں کھوئی ہوئی ہو
تم کو تو میرے بچے کی ماں ہونا تھا

اس سے پہلے کہاں تھے ہم کس خواب میں تھے
ہم دونوں کو ایک سفر پہ رواں ہونا تھا

آئینے کو سبز کیا میری آنکھوں نے
مجھ سے ہی یہ کارِ شیشہ گراں ہونا تھا

انور مسعود

مجھے خود سے بھی کھٹکا سا لگا تھا
مرے اندر بھی اک پہرا لگا تھا

ابھی آثار سے باقی ہیں دل میں
کبھی اس شہر میں میلا لگا تھا

جدا ہو گی کسک دل سے نہ اسکی
جدا ہوتے ہوئے اچھا لگا تھا

بس اک بات اسکی جی میں کھب گئی تھی
طبیعت کا انوکھا سا لگا تھا

اکھٹے ہو گئے تھے پھول کتنے
وہ چہرہ ایک باغیچہ لگا تھا

پہنے جانا تھا انور آنسوؤں کو
عجب اس شخص کو چسکا لگا تھا

○

روحی کنجاہی

اب تک کوئی چہرہ مجھے بھولا ہی نہیں ہے
اُس شہر سے رشتہ مرا ٹوٹا ہی نہیں ہے

خط ڈاکیہ لائے تو مرے نام کہاں سے
مکتوب حبیب اُس نے کوئی لکھا ہی نہیں ہے

کمزوریاں اُس کی ہیں کسی ذکر کے قابل
میں نے کبھی اِس بارے میں سوچا ہی نہیں ہے

اچھا ہے اگر اب بھی سمجھتا ہے کہ اُس نے
رستہ کوئی میرے لیے چھوڑا ہی نہیں ہے

لے جاتا ہے روحی وہ کسی اور ہی جانب
موضوعِ سخن کی طرف آتا ہی نہیں ہے

○

ہر شکایت سمجھ میں آتی ہے
مسئلہ سارا نفسیاتی ہے

بات چاہے ہو کتنی معمولی
شور دنیا بہت مچاتی ہے

شہر کل تک لپیٹ میں ہو گا
آج جھگڑا اگرچہ ذاتی ہے

روشنی میں بھٹک رہے ہیں لوگ
تیرگی قہقہے لگاتی ہے

یاد گزرے سمے نہ آئیں کیوں
ہر نئی رت مذاق اڑاتی ہے

آدمی کب کا مر چکا ہوتا
زیست خود حوصلہ بڑھاتی ہے

کیسے روحی بجھے گا دل کا نگر
یاں دیئے خود ہوا جلاتی ہے

جمال احسانی

میں تنگ دست تھا ایسا گزارا کیسے کرتا
کرم وہ کرکے بھی مجھ پہ دوبارہ کیسے کرتا
وہ روز دن ڈھلے آتا نہ گر دریچے میں
تو چاند کیسا کیا کرتا ستارہ کیا کرتا
کوئی بھی شخص اکیلا نہیں تھا ساحل پر
کسی کو ڈوبنے والا اشارہ کیسے کرتا
گنوانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا پاس مرے
میں اُس گلی سے گزر کر دوبارہ کیسے کرتا
مری زمیں نے گو اچھا نہیں کیا مرے ساتھ
میں اپنی خاک سے لیکن کنارہ کیسے کرتا
میانِ صحن اِک دیوار اٹھانے کے بدلے
میں ساری عمر تکلف گوارہ کیسے کرتا
نیا محاذ کوئی اور کھول دیتے ہم
وہ فتح یاب بھی ہو کر ہارا کیسے کرتا

○

پرندے سرِ شاخ پیوند ہیں — شجر جنگلوں میں نظر بند ہیں
ہمیں لوگ ہوتے تھے آئینہ گر — ہمیں لوگ آئینہ پابند ہیں
جنہیں ہونا تھا میری پوشاک پر — مرے رزق پر سب وہ پیوند ہیں
کوئی شب میں رستہ سجھاتا نہیں — سروں پر ستارے بھی ہر چند ہیں
ہمیں بھی جمال ایسی جلدی نہیں
کبھی تو کھلیں گے جو در بند ہیں

جمال احسانی

تنہا بھی منہ اٹھا کے نکلنا محال ہے
ہمراہ بھی ہجوم کے چلنا محال ہے

حرفِ دعا کا صفحۂ دستِ بلند پر
وہ بوجھ ہے کہ ہات بدلنا محال ہے

دل نے جلائے ہیں جو سرِ طاقِ انتظار
اُن موم بتیوں کا پگھلنا محال ہے

گم کیا ہوا ہے کاسۂ درویش اک یہاں
نظریں اُٹھا کے شہر کا چلنا محال ہے

میرے بھی دستخط ہیں سرِ محضرِ شکست
میرے لیے بھی بچ کے نکلنا محال ہے

جن میں جمالؔ رات کو سوتے نہیں ہیں لوگ
اُن آنکھوں سے چاند کا ڈھلنا محال ہے

خالد شریف

یوں ہر اک کاغذ اُٹھا کر چاک کرنا کیا ہُوا
خاک کی خواہش میں خود کو خاک کرنا کیا ہُوا

یہ بھی کوئی بات ہے کہ مسکرانا بھی نہیں
ہر بہانے آنکھ کو نمناک کرنا کیا ہُوا

خواہشیں معصوم کلیاں ہیں مہکنے دو انہیں
شہرِ دل کو خواہشوں سے پاک کرنا کیا ہُوا

پیارے پیارے تذکروں کا شہد کانوں میں گھُلے
ذہن کو وقفِ خس و خاشاک کرنا کیا ہُوا

کیسے یخ بستہ سلیقے میں مقیّد ہے حیات
بے طرح پھرنا، گریباں چاک کرنا کیا ہُوا

کیوں بدن پر چھا گئے خالدؔ کڑی باتوں کے نیل
وہ ترا فن زہر کو تریاک کرنا کیا ہُوا

خالد شریف

دل اپنے آپ بھر آیا تو میں نے پھر سوچا
یہ ہم سخن بھی گنوایا تو میں نے پھر سوچا

پھر اُلٹے قدموں اسی سمت لوٹ آنا ہے
جو اس نے پاس بلایا تو میں نے پھر سوچا

وہ کوئی عکس تھا، سایہ تھا یا مری خواہش
میں اپنے آپ میں آیا تو میں نے پھر سوچا

وہ چاندنی ہے اسے میں کہاں رکھوں گا بھلا
جو وقت ملنے کا آیا تو میں نے پھر سوچا

یہ رات تھی کہ وہی خواب تھا تحیّر کا
ہوا نے مجھ کو جگایا تو میں نے پھر سوچا

بہت دنوں سے میں بھولا ہوا تھا یاروں کو
کسی نے زخم لگایا تو میں نے پھر سوچا

احمد حسن حامد

افق افق ہے دھنک اور زمیں گلاب گلاب
قدم قدم پہ حقیقت، قدم قدم پہ سراب

عجیب وقت کے تیور ہیں کیسا دور ہے یہ
کہ نفیِ عظمتِ انساں ہے عین کارِ ثواب

ورق ورق پہ سبق نفرتوں کے ملتے ہیں
کہ مدرسوں میں ہوا گم محبتوں کا نصاب

جھلستی دھوپ گھٹن، بے کلی و خشک لبی
گذر گیا ترے مستوں پہ آج روزِ حساب

مہیب سایوں نے دھندلا دیئے نقوشِ چمن
طلسم ہوش جو ٹوٹا بکھر گئے مرے خواب

نہیں ہیں وجہِ تسلی مرے لیے حامد
ترے اشارے کنائے ترے سوال و جواب

تحسینِ نوائی

خریطۂ رمزِ جاں کھُلا بھی تو کیا مِلا ہے
یہی کہ فصلِ کلام و مفہوم کچھ سوا ہے

جو عہد نامے ابھی ابھی لوحِ دل پر اُترے!
میں کِس سے پوچھوں کہ انکی سطروں کیا لکھا ہے

ابھی تو فصلیں سروں کی تن سے جدا ہوئی ہیں
ابھی تو مینارِ کاسۂ سر نہیں بنا ہے
سوادِ زیتوں سے ناختائیں نکل پڑی ہیں
سوادِ زیتوں سے ناختائیں نکل پڑی ہیں
حجر کی لوحوں سے حرفِ محفوظ اُڑ چکا ہے

جہاں جہاں بھی نظر پڑی شہرِ آب و گل میں
ہر ایک قریہ حنوط جسموں کا گھر لگا ہے،

میں لائقِ التفاتِ عہدِ رواں نہیں ہوں
مرے تو اِک ہاتھ میں درّا، ایک میں دِیا ہے

تحسین فراقی

گزر رہے ہیں کچھ اس طرح اب کے دن اپنے — کہ جس طرح سے گئے سب حقوق چھن اپنے
یہ آپ ہم تو بدلتی رُتوں کے قیدی ہیں — نہ سال دسن ہیں کسی کے نہ سال دسن اپنے
ترے بغیر تو جوں توں گزار دی میں نے — ستم تو وہ ہے جو ٹوٹا ہے مجھ پہ بن اپنے
یہ سلسلہ کئی سالوں سے چل رہا ہے یونہی — مری شبیں ہیں تمہاری، تمہارے دن اپنے
گندھے ہوئے ہیں مرے آنسوؤں میں عکس ترے
ان آئینوں میں خد و خال آ کے گن اپنے

○

ستارۂ سحری تھا کہ میں تھا یا تو تھا — تب ایک ذرہ خلاؤں میں زندگی جُو تھا
مرا وجود اجڑ کر بھی تیرے کام آیا — درخت اکھڑا تو نیچے دفینہ ہر سُو تھا
بدل دیئے ترے عہدِ ستم نے سب معیار — میں جس کو مرثیہ سمجھا تھا، لحنِ کوکو تھا
ندی رواں تھی مگر آبِ شور کے دم سے — کٹا پھٹا ہوا چٹیل، کنارۂ جُو تھا!
اسی سبب سے یقیناً ہماری بن نہ سکی — کہ انحراف نہ مجھ سے اُسے سرِ مُو تھا
میں پاگلوں کی طرح اب بھی اس کی کھوج میں ہوں — وہ عہدِ چند نفس تو گلوں کی خوشبو تھا!

حسن رضوی

میرے گھر کی ہر کڑی پر اس قدر جالے لگے
روشنی میں بھی مجھے یاروں کے منہ کالے لگے

رات کی تنہائی نے یوں ڈس لیا میرا وجود
اُجلے پانی میں بھی میرے نقش مٹیالے لگے

میں ڈھنک کر اِس طرح بھاری سے ہلکا ہو گیا
جسم کے حصے بھی میرے روئی کے گالے لگے

گاؤں میں کیونکر کریں محسوس ہم اپنا وجود
کچے پکے سب گھروں پر ایک سے تالے لگے

اُس کا چہرہ آج بھی رضویؔ میری آنکھوں میں ہے
آج بھی اُس شوخ کے سب رنگ متوالے لگے

رضیہ فصیح احمد

افسانے لکھے ہم نے اور شعر کہے ہم نے
جو قافلہ جاتا ہے کہتا ہے چلے چلئے
ہم نے تو جسے دیکھا، کینہ ہی بھرا دیکھا
تدبیر کی ناکامی تقدیر کہی تو نے
کہتے ہیں نصیبوں سے ہر چیز ملی تجھ کو
کتنے ہی خداؤں کو مٹی میں رِلا دیکھا
اس شعر ہمارے کی تاویل نہ تم ڈھونڈو

نہ کوئی پڑھا چاہے، نہ کوئی سنا چاہے
اس شہرِ خرابی میں دل پھر بھی رہا چاہے
درویش کہاں ہے وہ جو سب کا بھلا چاہے
تقدیر کی ہر خوبی تدبیر کہا چاہے
اب کیسے کہوں دل کچھ اس سے بھی سوا چاہے
اس پہ بھی تجھے ہرگز عبرت نہ ہوا چاہے
جو کہہ نہ سکے رضیہ بس وہ ہی کہا چاہے

خالد شیرازی

گلی کے موڑ پہ آہٹ ہوئی جو قدموں کی — فضا میں تیر گئیں سسکیاں دریچوں کی
میں پچھلی رات اکیلا ہی گھر سے نکلا تھا — چہار سمت سے لپکی صدا رفیقوں کی
ترے دیار پہ سایا ہے نیک روحوں کا — مرے دیار میں سرگرمیاں ہیں جسموں کی
نگاہِ سُرخ ملے گی تمھیں قدم بہ قدم — سنائے گی جو کہانی چھٹے ہاتھوں کی

اِس ایک جلتے ہوئے شہر میں بھی ہو بارش
کہ آنکھ بھیگ چکی ہے بہت، مکینوں کی

صادق نسیم

نہ رہنمائی کی مشعل نہ رہ روی کے چراغ
وہ آندھیاں ہیں کہ جلتے نہیں کسی کے چراغ

وہ ظلمتیں ہیں کہ آنکھوں کی دسترس میں رہیں
نہ دلبری کی شعاعیں نہ عاشقی کے چراغ

ہر ایک شمع کی لَو تیرگی اگلتی ہے
کبھی وہ دن تھے کہ مظہر تھے روشنی کے چراغ

قریب و دور کوئی لَو نظر نہیں آتی
فضا ہی ایسی ہے کجلا گئے سبھی کے چراغ

وہی جو ظلمتِ شب سے بہت لڑتا تھا
سو پہلے سب سے بجھاتے گئے اسی کے چراغ

وہ لوگ آج کہاں ہیں جنہوں نے گُھل گُھل کر
تمام عمر جلائے ہنروری کے چراغ

تمام شہر پہ چھائے ہوئے ہیں سناٹے
بجھا کے رکھ دیئے کس نے ہماہمی کے چراغ

ہیں اتنے بعد میں بھی کتنے قُرب کے پہلو
مری مژہ پہ جلیں تیری گردش کے چراغ

نسیمؔ ایک مسافر ہے جادۂ شب کا
ہیں اُس کے مونس و دمساز ہر گلی کے چراغ

انوار فیروز

جو لوگ روشنی کی حدوں سے گزر گئے
سورج بجھا تو اپنے ہی سائے سے ڈر گئے

زندانِ آرزو سے کوئی لوٹتا نہیں
کیا لوگ اپنی موت سے پہلے ہی مر گئے

جب گھٹ گئی تو اہلِ وفا مشعلیں لئے
خنجر کی طرح رات کے دل میں اتر گئے

برسات پتھروں کی تھمے گی تو دیکھنا
ہم آئینہ حیات کا رنگیں کر گئے

مایوسیوں کے دشت سے آواز کون دے
اس قافلے کے لوگ تو کب کے بکھر گئے

انوارؔ بحرِ غم کا تموج تھا زور پر
مثلِ حباب داغِ تمنا ابھر گئے

o

شکستہ پا ہی سہی دور کی صدا ہی سہی
بکھر گیا جو ہوا سے وہ نقشِ پا ہی سہی

یہ حکم ہے کہ گئے موسموں کو یاد کروں
نئی رتوں کا تجسس مجھے ملا ہی سہی

زمیں کے بعد ابھی آسماں کے دکھ بھی سہوں
مرے لیے یہ سزا ہے تیری عطا ہی سہی

چراغ کہہ کے مرا نور مجھ سے چھین لیا
چراغ پھر بھی رہونگا بجھا ہوا ہی سہی

سجا لیے ہیں مصائب کے تیر آنکھوں میں
سکوں کی نیند نہیں ہے تو رت جگا ہی سہی

اے دھڑکنوں کو نیا نور بخشنے والے
میں نور سے ہوں تہی تو مری خطا ہی سہی

حقیقتوں کے بدن پر کوئی لبادہ نہیں
اگر یہ سچ کی سزا ہے تو پھر سزا ہی سہی

یہ دل کا کرب لبوں تک کبھی نہ آئے گا
مرے لیے یہ خموشی کا ارتقا ہی سہی

جہاں کے درد کو انوارؔ نے سمیٹ لیا
میں اک خوشی کی تمنا میں مر مٹا ہی سہی

غلام حسین ساجد

اس غفلت کی ماری مٹّی میں بھی پھول اگاؤں گا
اِک دن میں ان نیند بھری گلیوں میں واپس آؤں گا

بس اِک سانس کی اور مسافت ہے جو ختم نہیں ہوتی
کبھی کبھار تو یوں لگتا ہے جیسے میں مر جاؤں گا

اپنی چھاؤں سے ڈرتا رہتا ہوں اور دل میں کہتا ہوں
ایک اندھیرے گھر کے آنگن میں بھی دیپ جلاؤں گا

کہیں اندھیرے میں جب سائے سے ناطہ بھی ٹوٹ گیا
پھر تو ساری عمر میں بھی اپنا کھوج نہ پاؤں گا

میری آس پہ زندہ رہنے والی آنکھیں بھی سُن لیں
اب میں اپنے ہاتھوں اپنا سارا رزق کماؤں گا

اپنے عکس سے باہر آنے پر آئینہ ٹوٹ گیا
اب میں اپنی صورت لے کر کس کے سامنے آؤں گا

ساجدؔ یوں وہ میری جھوٹی سچی باتوں پر خوش ہے
جیسے میں بھی اُس کی خاطر تارے توڑ کے لاؤں گا

بیدار سرمدی

ہرا جدا ابھی گلاب سا سر — جو دیکھتا ہوں
شہیدِ شاخ اور ہے جواں تر — جو دیکھتا ہوں

اِک اور جانب سے اندھے پتّھر کے سامنے ہوں
ہیں اِک جانب سے سر بچا کر — جو دیکھتا ہوں

میں اس سے آنکھیں بچا کے دل تک تو پہنچا لیکن
یہ مورچہ کب کا ہو چکا سر — جو دیکھتا ہوں

نہ جانے ٹھوکر لگے اِسے کب - کہاں یہ اڑتے
غبار سا بادلوں کا لشکر — جو دیکھتا ہوں

نہ وہ نہ پانی بھرا گلاس اور نہ عکس کوئی
میں سچ ہم اُس کے قریب جا کر — جو دیکھتا ہوں

اِسی لیے میں رہا ہوں بیدار عمر بھر کیا
یہی ہے کیا میری سوچ کا گھر — جو دیکھتا ہوں

کرن میں پھر سے بدلنے لگا خیال اس کا
اتر رہا ہے نئے چاند پہ جمال اس کا

گیا ہے شاخ سے وہ اس لئے کہ شاخ رہے
ہوا تو زیج کی صورت ہوا زوال اس کا

جیوں گا میں بھی ہمیشہ کہ جاوداں ہے وہ
میں جی رہا ہوں کہ یہ سال بھی ہے سال اُسکا

وہ لے گیا ہے مری آنکھ اپنی بستی میں
کہ میرے ساتھ رہے رابطہ بحال اسکا

میں صرف پانی کی چھاگل سہی مگر بیدار
ہوا گلاب میرے دم سے بال بال اُسکا

حفیظ الرحمٰن احسن

اب کہاں زخمِ وفا، غم کی روایت کیسی
جب نہیں تیغِ ستم ہی تو جراحت کیسی

اِک عجب سوچ میں گم ہے دلِ حیراں میرا
پیار کیا چیز ہے، ہوتی ہے محبت کیسی؟

درخورِ جور بھی کل تک تو نہ تھے، آج مگر
لطف کیسا ہے یہ ہم پر یہ عنایت کیسی

یوں تو احوالِ زمانہ ہیں نظر میں لیکن
ذوقِ عبرت ہے کہاں، چشمِ بصیرت کیسی

یوں ترے روٹھ کے جانے سے یہ جانا ہم نے
مہر کیا چیز ہے، ہوتی ہے مروّت کیسی

تھے کبھی دل کے مقابل ترے جلوے ہر دم
رہنِ ظلمات ہوئی اب کے بصارت کیسی

دل کسی حرفِ تسلی کو ترستے ہیں یہاں
جب عداوت کی نہ فرصت رہی، الفت کیسی

جنسِ اخلاص و وفا کا نہیں طالب کوئی
اُٹھ گئی آہ زمانے سے مروّت کیسی!

ہم ثنا خواں بھی نہ تھے تیرے ستم کے لیکن
ربطِ باہم نہ رہا جب تو شکایت کیسی

زخم کھا کر بھی ترے ہاتھ سے چوما اس کو
ہم نے بھی پائی ہے اے دوست طبیعت کیسی

اشک بکھرے مری آنکھوں سے شرارے بن کر
گھُٹ کے دم توڑ گئی دل میں یہ حسرت کیسی

اپنے ہی خول میں سمٹا ہوا انساں، توبہ
اس کی تقدیر میں لکھّی گئی قسمت کیسی

غم کی آندھی جو چلی پھر نہ وہ میں تھا، نہ وہ تُو
ڈھل گئی آہ، فسانے میں حقیقت کیسی

مٹ گیا دل سے تمنّا کا وہ افسوں آخر
کیا اب روزِ وصال اور شبِ فرقت کیسی

قدر داں کوئی نہ پایا غمِ دل کا احسنؔ
ہو گئی دہر سے ناپید محبت کیسی

عابد نظامی

پھولوں میں نہاں آپ، ستاروں سے عیاں آپ
ہو دیدۂ بینا تو یہاں آپ، وہاں آپ
ہے کون سی شے جس کے نہیں رُوحِ رواں آپ
ہم تو یہی سمجھے ہیں کہ ہیں جانِ جہاں آپ
دوری کا یہ عالم کہ ورائے حدِ ادراک
قُربت کی یہ حالت کہ قریبِ رگِ جاں آپ
ذرّوں کو ستاروں سے نہیں ہے کوئی نسبت
ہم بجھتے ہوئے دیپ کہاں اور کہاں آپ
ہو دیدنی کیفیتِ اربابِ محبت
خود چھیڑیں نگاہوں سے جو سازِ رگِ جاں آپ
مخلوق کی اِس بھیڑ میں تنہا نہیں عابدؔ
صد شکر کہ ہیں اُس کی پنہ آپ اماں آپ

محمد خالد

منظرِ شب میں جھلک اٹھتا ہے تیرا عکس ندامت بھی
میرے لئے ہر آنے والی صبح ہے ، صبح قیامت بھی
تجھ سے معنون کر دیتا ہوں تیری یاد کے لمحوں میں
جو ہیں تیری یاد سے خالی ، اُن لمحوں کی مسرّت بھی
ایسے اُس کو دیکھنا جیسے بہتے ہوئے دریاؤں کو
آنکھ کی حیرانی میں لا کر گئے دنوں کی رفاقت بھی
آخرکار یہ بات کسی کے ہاتھوں میں تلوار بنی
ہم بھی یہی کہتے تھے کوئی چیز ہے مہر و مروّت بھی
شعر کہے ، آوارہ ٹھہرے ، گلی گلی رسوائی ہوئی
ناصحو تم بھی ٹھیک ہو ، لیکن اپنے خون کی حدت بھی

٭

خورشید احمد

یہ قیامت بھی درختوں پہ گزر جانے دو
خشک پتوں کو ہواؤں میں بکھر جانے دو

ریت رہ جائے گی دریا کی گزرگاہوں میں
تم یہ سیلاب کا پانی تو اتر جانے دو

گھر کی تنہائی سے بہتر کوئی غم خوار نہیں
دن کے ہنگامو مجھ کو بھی گھر جانے دو

اگلے موسم میں صداؤں کے چمن مہکیں گے
یہ جو رُت آئی ہے چپ چاپ گزر جانے دو

زندگی شوخیٔ اظہار کو ترسے کب تک
سادہ خاکوں میں کوئی رنگ تو بھر جانے دو

یہ سفر چاہے زمانوں کا سفر بن جائے
قریۂ شب سے مجھے سوئے سحر جانے دو

موت جب زندگی ٹھہری ہے تو پھر عذر نہیں
میں سزاوارِ وفا ہوں مجھے مر جانے دو

شفیع ضامنؔ

کبھی ضرور ڈالتے ہیں انقلاب کی طرح
وہ لوگ جن کی زندگی ہو اک عذاب کی طرح

گناہ کی طرح کوئی گناہ بھی نہ کر سکیں
نہ ہم ثواب ہی کما سکیں ثواب کی طرح

کچھ اور بھی قریب آ چکے تو فیصلہ کریں
کہ یہ دھواں سا کیا ہے جو لگے سحاب کی طرح

کچھ اتنا بدگماں سا کر دیا ہے تجربات نے
کہ موجِ آب بھی نظر پڑے سراب کی طرح

بچھڑ گیا وہ شخص تو ہیں ہو گئیں جو آج تک
کھلا ہوا ہے شاخِ دل پہ اک گلاب کی طرح

سمے وصال کا اگرچہ اب بھی یاد ہے مگر
بس اِک خیال کی طرح بس ایک خواب کی طرح

○

اپنے اندر جو کبھی ہم نے اُتر کر دیکھا
دل میں اُترا ہوا خود اپنا ہی خنجر دیکھا

تب کہیں جا کے بنی صورتِ اظہار کوئی،
میں نے جب اپنے خیالات کو چھو کر دیکھا

آنکھ رنگوں سے ہے معمور تو خوشبو سے مشام
تجھ کو دیکھا کہ سرِ شاخ گلِ تر دیکھا

یک بیک پیار کے قابل نظر آئی دنیا
اپنا اندازِ نظر جب بھی بدل کر دیکھا

یوں لگا ذات کے زنداں سے نکل کر ضامنؔ
جس طرح پہلے پہل صبح کا منظر دیکھا

○

افضل آرش

چاہوں کہ چاندنی چاندا جالوں میں جا بسوں
گاؤں کو چھوڑ پاؤں تو شہروں میں جا بسوں

سورج ہے سر پہ اور بدن برف برف ہے
میں کاش اس گھڑی تیری باہوں میں جا بسوں

چہروں پہ چھوڑ آؤں محبت کے سارے رنگ
کچھ روز نفرتوں کی زمینوں میں جا بسوں

میں توڑ دوں حصار نہ کیوں اپنی ذات کا
میں کیوں نہ فرد فرد کی آنکھوں میں جا بسوں

چھو کر تو دیکھ پاؤں کبھی اپنے چاند کو
اُڑ جاؤں آسماں پہ ، ستاروں میں جا بسوں

افضل آرش

بند مٹھی وہ اگر چلتی ہوا میں کھول دے
رنگ لاکھوں خالی خالی منظروں میں گھول دے
بخش دیں جو برف جسموں کو حرارت پھر کوئی
ذہن کو وہ فکر دے، ہونٹوں کو ایسے بول دے
لوٹ لے گا اس کی عزت بھی لٹیروں کا ہجوم
بند دروازہ وہ اپنے گھر کا کیسے کھول دے
ذائقہ منہ کا بدل جاتے رتوں کے ساتھ ساتھ
آنے والے موسموں میں پیار کا رس گھول دے
میں نے کب تجھ سے دعا مانگی ہے لمبی عمر کی
میں تو چاہوں مجھ پہ میری ذات کا در کھول دے

شفق سلیمی

میرا سایہ قد سے بڑھتا ہی نہیں
سر پہ سورج ہے کہ ڈھلتا ہی نہیں

اس لئے سڑکوں پہ آ جاتا ہوں میں
گھر میں بیٹھے وقت کٹتا ہی نہیں

کیا ہوں اندر سے کسی کو کیا خبر
پھر بھی دل سے خوف جاتا ہی نہیں

میں سجاؤں کس لئے دیوار و در
میرے گھر جب کوئی آتا ہی نہیں

کچھ نہ کرنے کی تھکن سے چور ہوں
میں کبھی بیکار بیٹھا ہی نہیں

ہے مگن ہر ایک اخبارات میں
میرا چہرہ کوئی پڑھتا ہی نہیں

شفیق سلیمی

دیکھا تو سمندر تھا، پرکھا ہے تو صحرا ہے
اک شخص پہاڑ ایسا، پاتال سے گہرا ہے
ہر صبح کو جو سورج اک شان سے چڑھتا ہے
ہر شام، سدا، اس کو ڈھلتے ہوئے دیکھا ہے
برسا بھی تو کیا دے گا جھلسی ہوئی دھرتی کو
جس ابر کے ٹکڑے کا سر پر مرے سایا ہے
مجھ تک نہ پہنچ پائیں کرنیں کسی سورج کی
ان اونچے مکانوں نے یوں گھر میرا گھیرا ہے
ہر راہ پہ چلتا ہوں رکھتا ہوں کھلی آنکھیں
شائد کہ نظر آئے جو دھیان میں بستا ہے
اس سمت ہوائیں بھی آتے ہوئے ڈرتی ہیں
پھر کون ہے جو دستک دروازے پہ دیتا ہے

سجاد بابر

زلزلہ آئے گا ابھی، سوچ کی کائنات میں
اتنی عجیب بات اور اتنی مہیب رات میں

میں تو چٹخ چٹخ گیا دھوپ سے بارشوں کے بعد
پھر بھی رسیلی چھاؤں کی ڈور نہ آئی ہات میں

بس اسی ایک بات پر کرۂ ربط ایک ہے
کوئی مطابقت نہیں تیری مری صفات میں

تجھ سے زمیں کے قرب کی سوندھی مہک نہ آسکے
ایسی خلیج ڈال دے شہرِ تعلقات میں

کیسی متاعِ جاں کہ جب سوچ کے نقش تک یہاں
ریزہ بہ ریزہ اُڑ گئے روز کے حادثات میں

شعر اُداس تذکرے، رنگ اجاڑ رابطے
کتنی رُتوں کی دیر ہے کس کو خبر نجات میں

دیکھئے سُرخرو رہیں یا ہمیں اب شکست ہو
دل کو وکیل کر لیا سارے معاملات میں

○

اس گھر پہ اندھیرے کی ردا کس کے لیے ہے
دہلیز سے باہر کا دیا کس کے لیے ہے

اب دل کے کُتب خانے میں پُرزہ بھی نہیں ہے
رہداری میں پھر تیز ہوا کس کے لیے ہے

ہر سمت سماعت کی صفیں بننے لگی ہیں
کیا جانئے اب اُس کی صدا کس کے لیے ہے

ہم شہر بدر آج بھی معتوب کھڑے ہیں
اِس بار یہ دروازہ کھُلا کس کے لیے ہے

سچ کہتے ہو منزل کی طلب کس کو رہی ہے
اِک بھیڑ مگر آبلہ پا کس کے لیے ہے

وہ دور سیاہی میں شفق گھُلنے لگی ہے
یہ رات کے ہاتھوں پہ حنا کس کے لیے ہے

طارق پیرزادہ

تصورات میں نقشے ہیں جن زمانوں کے
مَیں ان سے نقش بناؤں نئے جہانوں کے

وہ ایک کاہ کا ٹکڑا بچا گیا سب کو
جواب دے گئے جب حوصلے چٹانوں کے

لگی ہے چاٹ ہوا کو لہُو کے چھینٹوں کی
بدلنا چاہتے ہیں ذائقے زبانوں کے

ہمیں بھی اپنی فضاؤں میں وسعتوں کے لئے
تراشنے ہیں نئے زاویے اُڑانوں کے

پڑے ہیں پاؤں میں ریگِ رواں کی زنجیریں
بنے ہیں دائرے رستے میں ساربانوں کے

مَیں کر رہا تھا جمع ریزہ ریزہ روشنیاں
ستارے لوٹ رہے تھے عجب آسمانوں کے

راتوں کے مسافر کی طرح کون و مکاں ہیں
تاریک زمانوں کے سمندر میں رواں ہیں

اُن بادیہ گردوں کے بھی جینے کے ہیں انداز
جو سینۂ صحرا پہ تغیر کے نشاں ہیں

خیموں سے نکل کر درِ صحرا سے گزر کر
جو لوگ سوئے شہر رواں تھے وہ کہاں ہیں

لگتا ہے ہوا سنگ گرا کر ہی رہے گی
یہ ساعتیں مٹی کے گھروندوں پہ گراں ہیں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہونا بھی ہے اک چیز
ورنہ تو یہاں چاروں طرف وہم و گماں ہیں

ہم دیکھنے والے بھی عجب لوگ ہیں طارق
ہر بار یہ کہتے ہیں کہ بے حرف و زباں ہیں

اعجاز کنور راجہ

خیال سلمیٰ کے رنگ جیسے اسی سبب، سے ملے ہوئے ہیں
اُس ایک ساعت کے سلسلے سب تری طلب سے ملے ہوئے ہیں
نہ رات بس میں نہ دسترس میں ہے دن میں ایسے مقام پر ہوں
جہاں سحر کے تمام رشتے حدودِ شب سے ملے ہوئے ہیں
مرا ہنر یا کمال کیا یہ سب لہو کے ہی سلسلے ہیں
سخنوری کے رنگ سارے مجھے نسب سے ملے ہوئے ہیں
جو میرے باہر دبا میں ہیں تو میرے اندر بھی زلزلے ہیں
یہ موسموں کے ستم ارادے ترے غضب سے ملے ہوئے ہیں
کنورؔ کڑی رات کہہ رہی ہے اسیرِ خواہش رہا تو ہو گا
مگر اسے زنجیر تیرے حلقے کمال ڈھب سے ملے ہوئے ہیں

خالد اقبال یاسر

لگتا ہے زندہ رہنے کی حسرت گئی نہ … مر کے بھی سانس لینے کی عادت گئی نہیں
شاید کہ رچ گئی ہے ہمارے ضمیر میں … سو بار صلح پر بھی عداوت گئی نہیں
آنا پڑا پلٹ کے حدود و قیود میں … چھوڑی بہت تھی پھر بھی شرافت گئی نہیں
رہتی ہے ساتھ ساتھ کوئی خوشگوار یاد … تجھ سے بچھڑ کے تیری رفاقت گئی نہیں

باقی ہے ریزے ریزے میں اک ارتباط سا
یاسر بکھر کے بھی مری وحدت گئی نہیں

شعیب بن عزیز

ایک ذرہ بھی نہ مل پائے گا میرا مجھ کو
زندگی تو نے کہاں لا کے بکھیرا مجھ کو

شکوۂ حال ہے گردشِ دوراں سے نہیں
شام ماتی تھی کہ جب رات نے گھیرا مجھ کو

د سب میں تو پھر چاند کی ہمراہی ہے
کیا عجب ہو کسی جنگل میں سویرا مجھ کو

ب کہاں جاؤں گا ماضی کو صدائیں دینے
یں کہ اب یاد نہیں نام بھی میرا مجھ کو

دولتِ دردِ فراواں سے ہو دل تنگ شعیب
لوٹ لے کاش کوئی آ کے لٹیرا مجھ کو

زاہد فخری

چاند روٹھا جگنوؤں سے دوستی ہونے لگی
یوں مری تیرہ شبوں میں روشنی ہونے لگی

دل ترے جانے پہ رویا تھا مگر اجڑا نہ تھا
بس ذرا اک اور ڈھب سے زندگی ہونے لگی

ہاتھ ہی ملتے رہے پھر اور کیا کرتے مکین
دھوپ کی جب بام و در سے رخصتی ہونے لگی

مدتوں جلتے رہے ان بارشوں کی آس میں
ابر کیا برسا چھتوں کی فکر سی ہونے لگی

دھوپ کی شدت ہوا چلنے سے کچھ تو کم ہوئی
شکر ہے جو موسموں میں دوستی ہونے لگی

میں نے کیا دیکھی اترتی جھیل کے پانی میں شام
شہر بھر کو فخریؔ مجھ سے دشمنی ہونے لگی

قائم نقوی

جاگتے میں بھی خواب دیکھے ہیں
کیا شبانے سراب دیکھے ہیں

خشک کھیتی ہری کبھی نہ ہوئی
آتے جاتے سحاب دیکھے ہیں

چاند بھی ساتھ ساتھ چلتا تھا
راستے ہم رکاب دیکھے ہیں

کتنے بیلوں کی خاک چھانی ہے
ہم نے کتنے چناب دیکھے ہیں

قربتوں میں سمٹ گئی دوری
پیتوں سے گلاب دیکھے ہیں

باہر اندر غبار ہے قائم
ہم نے کیا کیا عذاب دیکھے ہیں

راشد مبنی

دیپمے سُر میں رم جھم رم جھم میٹھا میٹھا شور
ست رنگا کرنوں کا جھولا، جھولا جھولیں مور
دلہن فصلوں کو پہنانے چاندی کی پوشاک
سرسوں کے کھیتوں سے نکلا سورج نیا نکور
بوڑھا برگد تان کے سویا ہری کھجور عبا
دم سادھے شاخوں پر بیٹھے کرگس زاغ چکور
سبز بستی اوڑھنیوں میں چہرہ چہرہ چاند
سُرخ عناب بدن ہر پیکر انگارہ بھرپور
بہنت بہنت بھریں کلیلیں جھرنے مست ملنگ
چنچل شوخ ہوا صحرائی بادل ڈنگر ڈھور
چپ چپ نیلی جھیلیں، راتیں، دن، سرسبز پہاڑ
بہہ ناہیں تج کر نکلی خواہش من کی اور
جولی بہن بہن اٹھلائے برف قنب براق
ناک میں صدیوں سے سرگرداں دھوپ کی صورت چور
دیو چناروں کے مال ماتے آہو پری جمال
چرخ پتنگ کھلنڈرے لمحے ہاتھ میں جیون ڈور
اپنے پورے جوبن پر ہے موسم کا دریا
بانجھ زمینوں پر برسے گی آج گھٹا گھنگھور
شام ڈھلے تک رہے گا یونہی روشنیوں کا راج
شام گئے سے رات ڈھلے تک گھور اندھیرا گھور
خواب میں شاید دیکھے تھے سب ہنستے بستے لوگ
آنکھ کھلی تو پایا راشد جگ بے درد کٹھور

زاہد مسعود

مسافتیں دو خطوں کے مابین نقطۂ اتصال تک ہیں
جدائیوں کے تمام قصے فصیلِ شہرِ وصال تک ہیں

ہر اس شب کی مہیب دلدل سے یا دل پاؤں نکل رہا ہوں
گھنی اداسی کی زرد شامیں بس اک سحر کے گلال تک ہیں

سکوت پیوست ہونٹ چیخیں دعائیں اب ہجرا کو ترسیں
یہ کور آنکھوں میں نقش آنسو غبار رنگِ ملال تک ہیں

جو آئینوں سے لپٹ رہے ہیں شبیہہ اپنی بچا کے رکھیں
کہ عکس ہائے فریب خوردہ تو آئینوں کے زوال تک ہیں

فشار آلود ساحلوں کی زمین سر سبز ہو گئی ہے
وہ بادباں جو کہ سرنگوں تھے نجانے کس احتمال تک ہیں

انعام الحق جاوید

بکھری ہے ہر اک چیز مکاں ہے نہ مکیں ہے
خوشبو ہے کہیں پھول کہیں سایہ کہیں ہے

چہرے پہ اتر آئی ہے کرنوں کی نمازت
تو چاند کا ہم عکس تو ہے چاند نہیں ہے

اذکار کے جگنو ہی چمکتے ہیں پسِ دفن
یا ردتشنۂ فکر و نظر زیرِ زمیں ہے

دیکھا ہے جوانی نے بڑھاپے کو حسد سے
لگتا ہے کہ انسان نہیں عمر حسیں ہے

سینے میں تڑپتے ہیں دھڑکتے ہوئے جذبے
اتنی سی مرے وہم کی دنیائے یقیں ہے

تکمیل سے تھمتی نہیں خواہش کی روانی
پنہا ہوا احساس محبت کا امیں ہے

○

سفر میں پیڑ بہت ہیں مگر پڑاؤ نہیں
مسافتوں کی تھکن سے فریب کھاؤ نہیں

ہوا کے چلنے سے کچھ فائدہ نہیں اب تو
ہمارے پاس فقط بادباں ہے ناؤ نہیں

بدن بدن کو ملی تجربوں کی آنچ مگر
نظر نظر میں ابھی فکر کا الاؤ نہیں

کنول کھلے ہیں نگاہوں میں پر خیال رہے
کسی بھی سمت کو اس جھیل کا بہاؤ نہیں

کچھ اس ادا سے اصولوں کی بات کرتا ہے
کہ جیسے اس کی طبیعت میں رکھ رکھاؤ نہیں

عجیب ڈھنگ سے بکھرا شکستِ ذات کا رنگ
کسی سے عشق تو کیا خود سے بھی لگاؤ نہیں

ان اداس نگاہوں کا راز پا کر بھی
وہ کہہ رہے ہیں کسی اور کو بتاؤ نہیں

یہ شخص مر بھی چکا ہے یقیں نہیں آتا
کہ جسم صاف ہے چہرے پہ کوئی گھاؤ نہیں

جو کھل چکے ہیں انہیں شوق سے چنو لیکن
یہ اذن ہے کہ نئے پھول اب اگاؤ نہیں

جاوید انور

مانا کہ میرے سر کی تعبیر اور ہے
پر تیرے خواب اور مری تعبیر اور ہے

چہرے تو سب وہی ہیں، وہی شور ہے مگر
اب کے اُسی جرم میں تقصیر اور ہے

اس بار شاہراہوں نے لکھا ہے فیصلہ
اس بار ہاتھ اور ہیں زنجیر اور ہے

یہ پوسٹر ہیں زخموں پہ پہلے سے لکھے ہوئے
دیوار پر لکھی ہوئی تحریر اور ہے

جاوید آؤ سڑکوں کو باتیں کہیں، کہ اب
خستہ چھتوں کی آنکھ میں تصویر اور ہے

ڈاکٹر ظفر علی ـــــ راجا

[illegible] اِس حزن میں بھی وہ نہ نکلے پھر زبانوں سے
نظر آتے تھے آنکھوں میں جو عُریاں مکانوں سے

نئے چہرے اُسے بھی اس نگر میں لے کے آنے ہیں
بلاتی ہے وہ بستی بھی تجھے [illegible] بہانوں سے

کوئی آفت یہاں [illegible] ٹوٹنے والی ہے اسے روکو!
پرندے اُڑ گئے ہیں اس نگر کے آشیانوں سے

ہم اپنے جی کو بہلانے کی خاطر اب کہاں جائیں
اُٹھا کر لے گیا سارے کھلونے وہ دکانوں سے

قیامت کی گھڑی بھی آئے تو ان کو جواں دیکھے
ہماری چاہتوں کو ماوراء کر دے زمانوں سے

نکالیں ایک جملے سے ہزاروں اَن کہے جملے!
خدا محفوظ رکھے آدمی کو ترجمانوں سے

[illegible] آپ کہتے ہیں تو شاید ہو یونہی لیکن
یہ قصے آپ کے لگتے ہیں راجا جی فسانوں سے

ریحانہ فردوس دیپ

جنوں میں دیکھ کر ہم کو گلستانوں پہ کیا گزری
کیا جب قید دنیا نے تو زندانوں پہ کیا گزری
ملی غم سے جو آزادی تو دیوانوں پہ کیا گزری
بہاریں چھا گئیں ہر سو تو ویرانوں پہ کیا گزری
تمہاری ذات تھی محور، تمہاری ذات تھی مرکز
گئے تم بزم سے اٹھ کر تو پیمانوں پہ کیا گزری
محبت سرفروشوں کا فسانہ ہی سہی، لیکن
خرد مندوں پہ کیا بیتی، ہے فرزانوں پہ کیا گزری
مجھے ہر پل زوالِ آدمیت ہی کا صدمہ ہے
یہاں انسان کے ہاتھوں ہی انسانوں پہ کیا گزری
دلوں کا ساز سوزِ عشق کا سامان ہوتا ہے
جلی محفل میں جب شمع تو پروانوں پہ کیا گزری
ڈبویا ناخدا نے جب سفینہ ہاتھ سے اپنے
تو سے ذرا سوچ کر طوفانوں پہ کیا گزری
یہ خود ... محبت کی حقیقت کی گواہی ہے
حقیقت بن گئی اُلفت تو افسانوں پہ کیا گزری
یہاں ہستی کے صحرا میں مقید ہر بشر کیوں ہے
حیاتِ دائمی کی چاہ میں، جانوں پہ کیا گزری
ہمارے نور کی محتاج تھی دنیا کی ہر محفل
بجھے جب دیپ ہم تو پھر شبستانوں پہ کیا گزری

طویل افسانہ

چشم براہ

گابریل گارسیا مارکیز / فاروق حسن

گابریل گارسیا مارکیز ۱۹۲۸ء میں کولمبیا کے ایک قصبے آراکاتاکا میں پیدا ہوا۔ اوائل عمر میں اس کی پرورش نانا نانی کے ہاں ہوئی۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۶ء تک اس نے ریپاکیرا کے ہائی سکول میں تعلیم حاصل کی۔ سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہائش کے دوران وہ پہلی مرتبہ تنہائی کے تجربے سے دوچار ہوا۔ اس کے اپنے قول کے مطابق اس کی کہانیوں میں بیان کیے گئے تنہائی اور بے بسی کے تمام تجربوں کا تعلق تنہائی کی اس پہلی واردات سے ہے۔ سکول سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۴۸ء میں وہ بوگاتا کے شہر میں مقیم ہو گیا۔ وہاں قومی یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اخبار نویسی کا پیشہ بھی اپنا لیا۔ ۱۹۴۷ء میں اس نے اپنی پہلی کہانی تحریر کی۔ وہ ہسپانوی زبان میں لکھتا ہے۔

۱۹۴۸ء کا سال کولمبیا کی تاریخ میں اور خاص طور پہ بوگاتا شہر کی تاریخ میں تاریک ترین سال گنا جاتا ہے۔ اس سال کولمبیا کی لبرل اور کنزرویٹو پارٹیوں کے حامیوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوئی جو تقریباً دس برس تک جاری رہی۔ اس خانہ جنگی میں کئی لاکھ افراد ہلاک ہوئے اور بوگاتا شہر آدھے سے زیادہ جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ خانہ جنگی کا اصل سبب کنزرویٹو کارکنوں کے ہاتھوں ۹ اپریل ۱۹۴۸ء کو مشہور لبرل لیڈر گیتان کا قتل تھا۔ کولمبیا کی تاریخ میں اس خانہ جنگی کو بوگاتازو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ خانہ جنگی کے باعث نہ صرف گارسیا مارکیز کی قانون کی تعلیم ادھوری رہ گئی بلکہ وہ جس پانسیون میں مقیم تھا وہ بھی جل کر راکھ ہو گیا اور اس کا تحریر کردہ بہت سا مواد آگ کی نذر ہو گیا۔

کولمبیا میں تشدد اور سیاسی مکافات کی تاریخ خاصی قدیم ہے۔ وہاں صرف دو سیاسی پارٹیاں ہیں جن کے کارکن اس صدی کے آغاز سے ایک دوسرے کی جان کے دشمن رہے ہیں۔ لبرل پارٹی نے ۱۹۹ء میں پہلی بار حکومت قائم کی تھی اور اسی حکومت کے دوران امریکہ نے کولمبیا سے لڑائی میں پانامہ کا علاقہ حاصل کر کے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۹۰۳ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک لبرل اور کنزرویٹو یکے بعد دیگرے ملک پر حکومت کرتے رہے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے ان کے عناد کا یہ عالم رہا ہے کہ مستحکم لبرل علاقوں میں کوئی کنزرویٹو لیڈر ووٹ حاصل کر سکا اور کنزرویٹو علاقوں میں کسی لبرل کو کبھی کام نہیں کرنے دیا گیا۔ دونوں پارٹیوں سے ...

ویسے تھوڑے مرتے رہے ہیں۔ لوگا تازو کے بعد چیدہ چیدہ سیاسی لیڈروں کی کوششوں سے دونوں پارٹیوں کے درمیان صلح کا معاہدہ قائم ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے ۱۹۵۸ء سے لے کر اب تک دونوں پارٹیوں نے ہر چار سال بعد متبادل طریقے سے الکشن کرا کے بغیر حکومت کی ہے۔ اس لحاظ سے سیاسی طور پر کولمبیا میں آج کل اطمینان ہے۔ البتہ ایک اور طرح کا تشدد ۱۹۷۰ء کے بعد سے زوروں پر ہے جو کہ تشدد پسند گروپ اغوا، قتل اور گوریلا تحریک کے ذریعے کر رہے ہیں۔

۱۹۵۲ء میں گارسیا مارکیز کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "پتوں کا طوفان" شائع ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں وہ کمیونسٹ پارٹی کا رکن بنا اور اسی سال اسے ملک سے باہر نکلنے کا پہلا موقع نصیب ہوا۔ اس نے دو برس جنیوا اور پیرس میں بسر کیے۔ "چشم براہ" کی تخلیق پیرس ہی میں ہوئی۔ پہلی بار یہ کہانی ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔

گارسیا مارکیز کا ناول "تنہائی کے سو برس" جس سے اس کی عالمی شہرت کا آغاز ہوا ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ اگلے دو برسوں کے اندر اندر اس کتاب کا ترجمہ یورپ کی ہر اہم زبان میں ہو چکا تھا۔ بنیادی طور پر یہ کتاب بوآندیا خاندان کی سات نسلوں کی داستان ہے مگر انجیل کی طرح اسے پوری کائنات کی تاریخ کا استعارہ بھی گردانا گیا ہے۔ کتاب کے تمام واقعات گارسیا مارکیز کے تخلیق کردہ شہر ماکوندو میں رونما ہوئے ہیں۔ اس شہر کا اصل گارسیا مارکیز کا بچپن کا قصبہ آراکاتاکا ہے۔

گارسیا مارکیز کی تازہ ترین کتاب ایک اور ناول ہے جس کا نام "قبیلے کے سردار کا زوال" ہے جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۷۴ء کے بعد سے اس نے ناول اور کہانیاں لکھنے کا کاروبار پس پشت ڈالا ہوا ہے اور لاطینی امریکی ریاستوں کی سیاسی صورت حال پر مضامین تحریر کر رہا ہے۔ چلی کی سیاست پر حال ہی میں اس کا ایک مضمون امریکہ میں چھپا ہے۔ اس مضمون میں اس نے چلی کے معزول صدر سالوادور آلیندے کی حمایت میں اور موجودہ صدر آگستو پنوشیت اور پینٹاگون میں اس کے حمائتیوں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

گارسیا مارکیز کی تحریر کی خاص صفت اس کی سحر آفریں حقیقت پسندی ہے جس میں واقعات اور اشیا کی خارجی صفات اور انسان کے ذہن پر انہی واقعات کے داخلی اثرات میں فاصلہ ختم ہو جاتا ہے حتیٰ کہ واقعات اپنی مکمل صورت میں، جن میں ان کے وجود اور انسانی تجربہ دونوں کا دخل ہوتا ہے، ظاہر ہوتے ہیں۔ اس حقیقت پسندی کی تخلیق میں گارسیا مارکیز کے انداز بیان کے ایجاز اور سچائی اور وہم میں تمیز نہ کرنے کی عادت کو بھی دخل ہے۔

کردار کے لحاظ سے گارسیا مارکیز خاموش طبع اور شرمیلا آدمی ہے اور عوام کے سامنے تقریر کرنے سے گھبراتا ہے۔ صرف اس کے چند قریبی دوستوں کا حلقہ اس کے ذہن کی تخلیقی وسعت سے پوری طرح واقف ہے۔ اپنے سیاسی اور سماجی نظریات کو بھی وہ قصوں اور کہانیوں کی صورت میں بیان کرنے کا عادی ہے۔

آج کل وہ بارسلونا، سپین میں اپنی بیوی اور دو لڑکوں کے ہمراہ مقیم ہے۔

کافی کے ڈبے کا ڈھکن اٹھانے پر کرنل کو پتہ چلا کہ ڈبے میں صرف چمچ بھر کافی باقی ہے۔ اس نے گرم پانی کے برتن کو چولہے سے اتارا اور اس میں سے آدھا پانی مٹی کے فرش پر گرا دیا۔ پھر وہ چاقو لے کر ڈبے کی دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی کافی کھرچنے لگا۔ کافی کے ساتھ زنگ بھی اتر اتر کر ڈبے میں گرنے لگا

جس وقت پانی ابل رہا تھا اور کرنل پتھر کے آتش دان کے سامنے مطمئن مگر معصوم توقع کے ساتھ بیٹھا تھا اسے اپنی انتڑیوں میں کھمبیوں اور سوسن کے زہریلے پھولوں کے اگنے کا احساس ہوا۔ اکتوبر کے مہینے میں ہر سال اس کے ساتھ یہی کچھ ہوتا تھا۔ آج کا دن مشکل سے گزرے گا۔ اس نے سوچا حالانکہ وہ ایسے کئی دن گزار چکا تھا۔ تقریباً ساٹھ برس سے، یعنی خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد، کرنل نے سوائے انتظار کرنے کے کچھ نہ کیا تھا۔ صرف اکتوبر کا مہینہ ہر سال وقت پر لوٹتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے انتظار سے کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔

کرنل کی بیوی نے اسے کافی کا پیالہ اٹھائے سونے کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو مچھر دانی کا کونا اٹھا دیا۔ پچھلی رات اسے دمے کا حملہ ہوا تھا اور وہ ابھی تک سست اور خوابیدہ سی تھی لیکن کافی کا پیالہ لینے کی خاطر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اور تمہاری کافی کہاں ہے؟" اس نے پوچھا

"میں پی چکا ہوں" کرنل نے جھوٹ بولا "چمچ بھر کافی بچ رہی تھی۔"

اسی وقت گرجے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ کرنل جنازے کے بارے میں تقریباً بھول چکا تھا جب اس کی بیوی کافی پی رہی تھی اس نے اپنے جھولا بچھونے کو ایک جانب سے اتار کر اور گول کر کے دروازے کے پیچھے رکھ دیا۔ اس کی بیوی کو مرنے والے کا خیال آیا۔

"وہ ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوا تھا" اس نے کہا "سات اپریل کو۔ ہمارے بیٹے کی پیدائش کے ایک ماہ بعد۔"

اپنے اکھڑے ہوئے سانسوں کے درمیان کے وقفوں میں وہ کافی کے گھونٹ بھرتی رہی۔ بیماری کے سبب اس کی خمیدہ سی لوچ دار ریڑھ کی ہڈی پر بہت کم گوشت رہ گیا تھا۔ سانس لینے میں دشواری کے باعث اس کے سوالیہ فقرے بھی یوں لگتے تھے جیسے کوئی دعویٰ کیا جا رہا ہو۔ کافی ختم ہو چکی تھی مگر وہ ابھی تک مرنے والے کے بارے میں سوچ بچار میں مستغرق تھی۔

"اکتوبر کے مہینے میں دفنایا جانا کس قدر ہیبت ناک ہوتا ہوگا!" اس نے کہا، مگر اس کے خاوند نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا کرنل نے کھڑکی کھول دی۔ اکتوبر کی ہریالی گھر کے دالان تک آ پہنچی تھی۔ سبزے کی بالیدگی ہر جگہ گہرے سبز رنگ میں عیاں تھی۔ سبزے کے بارے میں غور کرتے ہوئے اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کو دیکھتے ہوئے جو کیچوؤں نے ہر سمت بنا رکھے تھے، کرنل نے دوبارہ اپنی انتڑیوں میں اکتوبر کے نحوست زدہ مہینے کے وجود کو محسوس کیا

"میری ہڈیاں تک بھیگ گئی ہیں" اس نے کہا۔

"سرما میں یہی کچھ تو ہوگا۔" اس کی بیوی نے جواب دیا "جب سے بارشیں شروع ہوئی ہیں تمہیں کہہ رہی ہوں کہ

جرابیں پہن کر سویا کرو:
"وہ ایک ہفتے سے تو پہن رہا تھا"
بارش آہستگی کے ساتھ مگر لگاتار ہو رہی تھی۔ کرنل کا جی چاہا کہ ادنی کمبل اوڑھ کر دوبارہ سو رہے مگر گرجے کی ٹوٹی ہوئی گھنٹیوں کی مسلسل آواز نے اُسے جنازے کی یاد دلائی۔ "اُف یہ اکتوبر!" اس نے سب لفظوں میں کہا اور کمرے کے وسط میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ تب اُسے اپنا لڑاکا مرغا یاد آیا جو بستر کے پائے کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔
کافی کا خالی پیالہ باورچی خانے میں رکھنے کے بعد کرنل نے شاقول والے کلاک کو جو لکڑی کے کندہ نقش میں بیٹھنے کے کمرے کی دیوار پر آویزاں تھا چابی دی۔ سونے کے کمرے کے برعکس جو خاصا تنگ تھا اور جس میں دمے کے مریض کا سانس ناحق رکنے لگتا تھا، بیٹھنے کا کمرہ کشادہ اور ہوادار تھا۔ کمرے کے درمیان میں ایک میز کے اردگرد چار مضبوط جھولنے والی کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر غلاف بچھا ہوا تھا اور اس پر مٹی کی بنی ہوئی بلی رکھی تھی۔ کلاک کے سامنے والی دیوار پر ایک تصویر تھی جس میں ایک عورت نے باریک کپڑے کا سفید لباس پہن رکھا تھا۔ عورت کے اردگرد چھوٹے چھوٹے کیوپڈ گلاب کے کینولوں سے بھری کشتی میں بیٹھے تھے۔
جب کرنل نے کلاک کو چابی دینے کا عمل ختم کیا تب سات بجکر بیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ مرغے کو باورچی خانے میں لے گیا۔ اُسے چولہے کی ٹانگ کے ساتھ باندھ کر اس نے مرغے کا پانی تبدیل کیا اور مٹھی بھر مکئی اس کے سامنے رکھی۔ گھر کے باہر کی باڑھ میں جو ایک سوراخ تھا اس میں سے محلے کے چند بچے اندر آ گئے اور مرغے کے اردگرد بیٹھ کر اسے کھاتے ہوئے خاموشی سے دیکھنے لگے۔
"مرغے کو ایسے مت گھورو" کرنل نے انہیں کہا "مرغوں کو دیر تک یوں دیکھیں تو وہ گھس جاتے ہیں" بچے وہیں بیٹھے رہے۔ ایک بچے نے ماؤتھ آرگن پر ایک مشہور گانے کے سُر نکالنے شروع کر دیئے۔ "آج یہ سارمت بجاؤ" کرنل نے اسے منع کیا "قصبے میں ایک فوتیدگی ہو گئی ہے" بچے نے باجہ اپنی پتلون کی جیب میں اڑس لیا اور کرنل جنازے کے لئے تیار ہونے کی خاطر سونے کے کمرے میں چلا گیا۔
اس کی بیوی کے دمے کے دورے کے باعث کل رات کا سفید سوٹ استری نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے کرنل کو اپنا پرانا کالا سوٹ ہی پہننا پڑا۔ یہ سوٹ شادی کے بعد سے اب تک اس نے صرف چند خاص موقعوں پر ہی پہنا تھا۔ بڑے صندوق میں کپڑوں کے نیچے اخبار کے کاغذوں میں لپٹے ہوئے اس سوٹ کو ڈھونڈنے میں کرنل کو خاصی دیر لگی۔ کیڑوں کو کپڑوں سے بچانے کے لئے صندوق میں چاروں طرف نفتالین کی گولیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کرنل کی بیوی بستر میں دراز ابھی تک مرنے والے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔
"اب تک مرحوم شاید ہمارے آگستین سے مل چکا ہو گا۔ شاید وہ ہمارے بیٹے کو یہ نہ ہی بتائے کہ اس کے مرنے کے بعد سے ہمارا کیا حال ہوا ہے" اس نے لیٹے لیٹے کہا۔
"اس وقت وہ دونوں شاید مرغوں کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں گے" کرنل نے جواب دیا۔

سوٹ ڈھونڈتے ڈھونڈتے کرنل کو صندوق میں ایک بڑی سی چھتری نظر آگئی۔ یہ کرنل کی بیوی نے اس قرعہ اندازی میں جیتی تھی جو کرنل کی پارٹی کے لئے چندہ اکٹھا کرنے کی خاطر منعقد کی گئی تھی۔ پارٹی کی رات وہ گھر کے باہر بیٹھ کر تماشا دیکھتے رہے تھے جو بارش کے باوجود جاری رہا تھا۔ کرنل، اس کی بیوی اور ان کے بیٹے آگستین نے جو اس وقت آٹھ برس کا تھا ساری رات اس چھتری کے نیچے بیٹھ کر تماشا دیکھا تھا۔ اب آگستین مر چکا تھا اور چھتری کے چمکدار ساٹن میں کیڑوں نے سوراخ کر دیئے تھے۔

"ایسی سرکس کے مسخروں والی چھتری کا دیکھو کیا حال ہو گیا ہے!" کرنل نے اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا۔ چھتری کو کھولنے پر اس کے اوپر بہت ساری عجیب و غریب سلاخیں نمودار ہو گئیں۔

"اس میں اتنے سوراخ ہیں کہ اب یہ صرف آسمان کے تارے گننے کے کام آ سکتی ہے۔"

کرنل ہنسا مگر اس کی بیوی نے مڑ کر چھتری کو دیکھنا گوارا نہ کیا۔ "ہر چیز سڑ رہی ہے" کرنل کی بیوی نے آہستگی سے کہا۔ "ہم جیتے جی گل سڑ رہے ہیں۔" اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ مرحوم کے بارے میں پورے انہماک سے سوچ سکے۔

کرنل کے گھر میں کوئی شیشہ نہ تھا۔ داڑھی کے بالوں پہ ہاتھ پھیر پھیر کر شیو کرنے کے بعد کرنل نے آہستگی کے ساتھ کپڑے پہنے۔ سوٹ کی پتلون جو اس کے لمبے انڈرویئر جیسی ہی چست اور کسی ہوئی تھی، ٹخنوں پر فیتوں سے گانٹھ لگا کر بند کی جاتی تھی۔ پیٹ پر پھر اسی طرح کے فیتے جو ملمع کئے ہوئے دو بکسوؤں میں سے گزرتے تھے پتلون کو سنبھالے رکھتے تھے۔ کرنل نے بیلٹ نہیں باندھی۔ اس کی قمیض جو میلا کے بھورے کاغذ کے رنگ کی تھی اور اسی کاغذ جیسی سخت بھی تھی، تانبے کے گول بٹن کے ساتھ کالر سے جوڑی جاتی تھی۔ قمیض کا الگ کالر اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ کرنل نے ٹائی لگانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

کرنل نے ہر کپڑا ایسے پہنا جیسے معرفت کا کوئی کارنامہ انجام دے رہا ہو۔ اس نے دیکھا کہ اس کی انگلیوں کے جوڑوں کی کھنچی ہوئی اور شفاف کھال پر سفید دھبے تھے جیسے اس کی گردن کی کھال پر تھے۔ اپنے نقلی چمڑے کے جوتوں کو پہننے سے قبل اس نے ان کی سیون میں گھسی ہوئی خشک مٹی کو کھرچ کر صاف کیا۔ اس کی بیوی نے اس وقت اسے دیکھا۔ اس نے وہی لباس پہن رکھا تھا جو شادی کے روز پہنا تھا۔ اسے دیکھنے پر اس کی بیوی کو احساس ہوا کہ وہ کس قدر عمر رسیدہ ہو چکا تھا۔

"ایسے لگتا ہے جیسے تم کسی خاص موقع کے لئے بن سنور رہے ہو" اس کی بیوی نے کہا۔

"ہاں، اس جنازے کو کندھا دینا خاص موقع ہی ہے" کرنل نے کہا۔ "برسوں کے بعد اس قصبے میں یہ پہلا آدمی ہے جو طبعی موت مرا ہے۔"

نو بجے کے بعد مطلع صاف ہو گیا۔ کرنل باہر نکلنے کے لئے تیار کھڑا تھا جب اس کی بیوی نے اسے ا... سے پکڑ لیا اور کہا:

بالوں میں کنگھی کرتے جاؤ۔

کرنل نے اپنے ہاتھ سے سخت بالوں کو کنگھی سے بٹھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

میں طوطے کی طرح لگ رہا ہوں گا؟ کرنل نے آخر کار کہا۔

بیوی نے اسے غور سے دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ طوطے کی طرح ہرگز نہیں لگتا تھا۔ کرنل ہڈیوں اور پٹھوں کا آدمی تھا اور ایسے لگتا تھا جیسے نٹ بولٹ سے کس کر تیار کیا گیا ہو لیکن اس کی آنکھوں میں جان تھی جس کے بغیر وہ شاید فورمالین میں محفوظ کیا ہوا نمونہ لگتا۔

"تم ٹھیک لگ رہے ہو" اس کی بیوی نے جواب دیا اور جب کرنل گھر سے باہر قدم رکھنے لگا تو اس نے اضافہ کیا: "ڈاکٹر سے ملو تو اسے پوچھنا اتنے دنوں سے ادھر کیوں نہیں آیا۔ ہم نے کس بدر اس کے سر پر کھولتا پانی انڈیلا تھا؟"

کرنل اور اس کی بیوی قصبے کے ایک سرے پر ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے جس کی چھت پر کھجور کے پتوں سے چھپر ڈالا گیا تھا گھر کی دیواروں سے سفیدی اور پلستر گرتے رہتے تھے۔ اس وقت ہوا میں نمی سی طرح تھی بل بارش بند ہو چکی تھی۔ کرنل ایک تنگ گلی میں سے گزر کر، جس کے دونوں جانب گھر تھے، پلازا کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ قصبے کی بڑی سڑک پر پہنچا تو اسے کپکپی سی آئی، سڑک پر جہاں تک نظر جاتی تھی پھولوں کی چادر بچھی تھی۔ ایسے ایسے گھروں کی دہلیزوں پر کالے کپڑوں میں ملبوس عورتیں جنازے کے گزرنے کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

جب کرنل چوک میں داخل ہوا تو بوندا باندی پھر شروع ہو گئی۔ بلیرڈ ہال کے مالک نے اپنے دروازے میں سے کرنل کو آتے دیکھا تو وہیں سے چلایا:

"ٹھہرو، میں تمہیں اپنی چھتری دیتا ہوں۔"

لیکن کرنل نے مڑے بغیر اسے جواب دیا۔ "ضرورت نہیں ہے، میں اسی طرح ٹھیک ہوں۔"

ماتمی جلوس اور جنازہ ابھی گرجے سے باہر نہیں آئے تھے۔ مرد سفید سوٹ اور کالی ٹائیاں لگائے ایک نیچے دروازے کے پاس اپنی اپنی چھتریوں کے نیچے کھڑے باتوں میں مشغول تھے۔ ایک آدمی نے کرنل کو چوک میں پانی اور کیچڑ کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ پھلانگتے دیکھا تو اسے پکار کر کہا۔

"ادھر چھتری کے نیچے آ جاؤ!"

اس نے کرنل کے لئے چھتری کے نیچے جگہ بنائی۔

کرنل "مہربانی، دوست" کہتا ہوا آگے نکل گیا اور سید ھا مرحوم کے گھر کے اندر گھس گیا تاکہ اس کی والدہ سے تعزیت کر سکے۔ گھر میں داخل ہونے پر جس چیز کا اسے سب سے پہلے احساس ہوا وہ مختلف پھولوں کی مہک تھی۔ پھر گرمی کی ایک لہر اٹھی۔ لوگوں کے درمیان میں سے راستہ بنا کر کرنل نے سونے کے کمرے کی طرف جانا چاہا۔ مگر کسی نے اس کی کمر پہ ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے کی طرف کھینچا اور لوگوں کے متعجب چہروں کے درمیان میں سے وہ

پیچھے گھسٹتا ہوا کمرے کے اس مقام پر جا پہنچا جہاں لاش کے کھلے اور گہرے نقشے تھے۔

مرحوم کی والدہ کھڑی ہوئی کھجور کے پنکھے سے لاش پر سے مکھیاں اتار رہی تھی۔ دوسری عورتیں کالے کپڑے پہنے لاش کو ایسے غور سے دیکھ رہی تھیں جیسے آدمی دریا کے دھارے کو دیکھتا ہے۔ یکدم کمرے کے دوسری جانب سے کسی نے آواز لگائی۔ کرنل ایک عورت کو ہاتھ سے پرے ہٹا کر مرحوم کی والدہ کے قریب جا پہنچا۔ اس کے عقب میں کھڑے ہو کر کرنل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"مجھے بہت افسوس ہے۔"

مگر اس عورت نے اسے مڑ کر دیکھنے کی بجائے منہ کھول کر اتنے زور سے چیخ ماری کہ کرنل کانپ گیا اسے ایسے لگا جیسے کا ہتی، تھرتھراتی آوازیں آہ و زاری اور شور کرتا ہوا بے ہیئت ہجوم اسے لاش کی جانب دھکیل رہا ہے۔ اس نے کسی خاص چیز کا سہارا لینے کی کوشش کی مگر اس کے نزدیک کہیں کوئی دیوار نہ تھی۔ ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ کسی نے ان کے کان میں آہستہ سے سرگوشی کی: "خبردار، کرنل!" کرنل نے جلدی سے آواز کی جانب منہ موڑا تو اس کے سامنے مرحوم خود کھڑا تھا۔ لیکن کرنل نے اسے نہیں پہچانا کیونکہ سفید کپڑوں میں ملبوس بگل ہاتھ میں لئے وہ اکڑا ہوا کھڑا تھا اور محرک تھا اور اس کے چہرے پر ایسی ہی گھبراہٹ تھی جیسے خود کرنل کے چہرے پر تھی۔ جب کرنل نے تازہ ہوا میں سانس لینے کی خاطر اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو اس نے دیکھا کہ بند تابوت سیڑھیوں سے پھسلتا، پھولوں کو کچلتا ہوا نیچے آ رہا ہے اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا اور اس کے جسم کے جوڑوں میں درد شروع ہو گیا۔ ایک لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ باہر گلی میں کھڑا ہے کیونکہ بارش کے قطرے اس کی پلکوں پر ہلکی ضربوں کے ساتھ گر رہے تھے۔ کسی نے اسے بازو سے پکڑا اور کہا۔

"جلدی کرو دوست، میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

اسے بازو سے پکڑنے والا اس کے مرحوم بیٹے کا دینی باپ ساباس تھا۔ ساباس پارٹی کے لیڈروں میں سے اکیلا شخص تھا جو سیاسی مکافات سے بچ رہا تھا۔ اور قصبے ہی میں مقیم تھا۔ "شکریہ دوست" کہہ کر کرنل اس کی چھتری کے نیچے آ گیا اور خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بینڈ نے ماتمی گیت بجانے شروع کر دیئے تھے۔ بینڈ میں بگل بجانے والے کو موجود نہ پا کر کرنل کو پہلی بار مکمل طور پر یقین ہوا کہ مرحوم واقعی مر چکا تھا۔

"بیچارہ!" اس نے آہستہ سے کہا۔

سا باس نے اپنا گلا صاف کیا اور چھتری کو بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کا قد اتنا چھوٹا تھا کہ چھتری کا دستہ اس کے سر کے برابر پہنچ رہا تھا۔ جب جنازہ چوک سے باہر نکل رہا تھا تو دونوں گفتگو میں مشغول تھے۔ سا باس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے اس لئے کرنل سے پوچھا:

"مرغے کے بارے میں کیا خبر ہے؟"

"ابھی موجود ہے" کرنل نے جواب دیا۔

عین اس وقت کسی کے زور سے بات کرنے کی آواز سنائی دی۔

"جنازہ اس راستے سے کیوں گزر رہا ہے؟"

کرنل نے آنکھیں اوپر اٹھائیں تو اسے برکوں میں ایک بالکنی پر قصبے کا میئر اپنے ملازمین کے لیے انڈرویر میں کھڑا نظر آیا۔ اس کا گال سوجا ہوا تھا اور اس نے اس گال پر حجامت نہیں بنوائی تھی۔ کچھ لمحوں بعد کرنل نے پادری ایجل کو دیکھا جو چیخ چیخ کر میئر سے مکالمے میں مصروف تھا۔ چھتری پر بارش کی ٹپاٹپ کے باوجود کرنل نے گفتگو کی غایت سمجھ لی۔

"کیا ہے؟" ساباس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" کرنل نے جواب دیا "جنازے کو پولیس کی برکوں کے سامنے سے گزرنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"ہاں میں بھول گیا تھا۔ میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ مارشل لا ابھی لگا ہوا ہے۔"

"وہ تو ہے۔ لیکن یہ کون ساباغیوں کا جلوس ہے؟ ایک بچارے غریب موسیقار کا جنازہ ہی تو ہے۔"

جنازے والوں کو اپنا راستہ تبدیل کرنا پڑا۔ غریب علاقے میں عورتیں پہلے تو جنازے کو گزرتے خاموشی سے دیکھتی رہیں اور دانتوں سے اپنے ناخن کاٹتی رہیں مگر تھوڑی دیر بعد وہ سڑک کے درمیان میں آگئیں اور انہوں نے دادوتحسین کے اور الوداع کے نعرے لگانے شروع کر دیئے، یوں جیسے مردہ آدمی کفن کے اندر زندہ تھا اور ان کی داد کو سن رہا تھا۔ قبرستان میں پہنچ کر کرنل کو ایسے محسوس ہوا جیسے وہ علیل ہو۔ جب ساباس نے اسے ایک طرف دھکیل کر تابوت برداروں کے لئے راستہ بنایا تو اس نے ہنس کر ساباس کی طرف دیکھا۔ ساباس کے چہرے پر اب بھی درشتگی کے آثار تھے۔

"دوست کیا بات ہے؟" ساباس نے پوچھا۔

کرنل نے آہ بھری اور جواب دیا۔

"اکتوبر کا مہینہ ہے۔"

وہ اسی سڑک سے واپس لوٹے۔ جس سے قبرستان گئے تھے۔ مطلع اب صاف ہو چکا تھا اور آسمان کا رنگ گہرا نیلا ہو گیا تھا۔ اب شاید بارش نہیں ہوگی، کرنل نے سوچا اور اس کی طبیعت جیسے بحال ہو گئی۔ لیکن اندر سے ابھی وہ آزردہ تھا۔ ساباس کی بات نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا:

"ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے؟"

"میں بیمار نہیں ہوں" کرنل نے کہا "صرف اکتوبر میں ایسے لگتا ہے جیسے میری انتڑیوں میں کیڑے مکوڑے پرورش پا رہے ہوں۔" ساباس "ہاں" اور پھر "خدا حافظ" کہہ کر اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس کا مکان نیا اور دو منزلہ تھا جس کی کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں نصب تھیں۔ کرنل اپنے سوٹ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر گھر کی طرف روانہ ہو گیا لیکن سڑک کے کونے پر دکان سے کافی کا ڈبہ اور مرغ کے لئے آدھا پونڈ کی

خریدنے کے لئے اسے ایک بار پھر گھر سے باہر نکلنا پڑا۔ جمعرات کے روز وہ عموماً اپنے جھولنے والے بستر میں لیٹا رہتا تھا لیکن اس جمعرات کو وہ سارا دن مرغے کی تواضع میں جُٹا رہا۔ بارش بہت دن تک ہوتی رہی تھی اور سارا ہفتہ اس کی انتڑیوں میں نباتات اگتے رہے تھے، اس کی بہت سی راتیں بیوی کے دمے کی سیٹیوں کی بدولت بے خوابی میں گزری تھیں، لیکن جمعہ کی دوپہر کو اکتوبر نے اپنی معرکہ آرائی سے توقف کر لیا تھا۔ اس عارضی صلح کی بدولت اس روز جب آگستین کے ساتھی جو درزی کے کارندے اور مرغوں کی لڑائی کے رسیا تھے، اس کے ہاں مرغے کو دیکھنے آئے تو کرنل کا مزاج بہت حد تک ٹھیک تھا۔

لڑکوں کی روانگی کے بعد جب کرنل اکیلا رہ گیا تو سونے کے کمرے میں لوٹ آیا۔ اس کی بیوی کی طبیعت بھی آج قدرے بہتر تھی۔

"لڑکے کیا کہہ رہے تھے"؟ اس نے پوچھا

"بہت جوش و خروش دکھا رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک مرغے پر پیسے لگانے کے لئے بچت کر رہا ہے" کرنل نے اسے اطلاع دی۔

"خدا جانے اس بدصورت مرغے میں سب کو کیا نظر آتا ہے؟ سب کا خیال ہے کہ کچھ کر دکھائے گا۔ شکل سے ذرا بھی اس قابل نہیں لگتا۔" کرنل کی بیوی نے کہا

"سب کہہ رہے تھے کہ ایسا مرغا سارے علاقے میں کہیں نہیں ہے۔" کرنل نے جواب دیا "کم از کم پچاس پیسوز کے برابر قیمت ہے اس کی"!

کرنل کو یقین تھا کہ اس منطق میں اس کے مرغے کی دیکھ بھال کے عزم کا مکمل جواز موجود تھا۔ مرغا ایک لحاظ سے ان کے بیٹے کی وراثت تھا۔ آگستین مرغوں کی لڑائی کے دن ہی، آج سے نو ماہ قبل، خفیہ مواد اور کاغذات بانٹتا ہوا شہید ہو گیا تھا۔ "مرغے کی نگہداشت مہنگی پڑے گی" کرنل کی بیوی نے کہا "مکئی ختم ہو گئی تو اسے اپنا کلیجہ ہی کھلا کر پال سکیں گے"! کرنل کافی دیر تک اس معاملے پر غور کرتا رہا، ساتھ ساتھ وہ الماری میں سے اپنے کپڑے بھی ڈھونڈتا رہا۔

"چند مہینوں کی بات ہے۔ جنوری میں مرغوں کی لڑائی ہے۔ اس کے بعد ہم اسے کہیں زیادہ قیمت پر فروخت کر سکیں گے"۔ اس نے کہا۔

کرنل نے جو تپلون صندوق سے نکالی اسے استری کی ضرورت تھی۔ کرنل کی بیوی نے تپلون کو چولہے کے اوپر پھیلا دیا اور دو استریوں کو دہکتے کوئلوں پر گرم کرنا شروع کر دیا۔

"آج باہر جانے کی کیا جلدی ہے تمہیں"؟ اس نے پوچھا

"ڈاک کا دن ہے"؟ کرنل نے جواب دیا۔

"ہاں میں بھول گئی تھی۔ آج جمعہ ہے"۔ کرنل کی بیوی نے سونے کے کمرے کے اندر جاتے ہوئے جواب دیا۔

کرنل نے پتلون کے علاوہ باقی سب کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کی بیوی نے اس کے جوتوں کی طرف دیکھا اور کہا:

"یہ تو اب پھینکنے کے لائق ہیں۔ بہتر ہے کہ تم اب سے اپنے نقلی چمڑے کے جوتے ہی پہنا کرو۔"

کرنل کو لگا جیسے وہ ویرانی اور بدحالی کا شکار ہو۔ اس نے احتجاجاً کہا۔

"نہیں وہ کسی یتیم کے جوتے لگتے ہیں۔ میں جب بھی انہیں پہنتا ہوں کسی پاگل خانے سے بھاگا ہوا قیدی لگتا ہوں۔"

"ہم اپنے بیٹے کے یتیم ہی تو ہیں۔" اس کی بیوی نے جواب دیا۔

لانچوں کے لنگر ڈالنے سے قبل ہی کرنل چلتا ہوا بندرگاہ تک پہنچ گیا۔ اس کی بیوی نے اس بار پھر اپنی بات منوالی تھی۔ کرنل نے نقلی چمڑے کے جوتے پہن رکھے تھے۔ اس نے تنگ موری والی سفید پتلون جس پہ بیلٹ نہ تھی چڑھائی ہوئی تھی اور کالر کے بغیر قمیص جو گردن پہ تانبے کے بٹن سے بند کی گئی تھی۔ پہنی ہوئی تھی موسیٰ شامی کی دکان پر سے وہ لانچوں کو یکے بعد دیگرے ساحل تک آتے دیکھتا رہا۔ سواریاں اتریں، اترنے والے تھکے ماندے لوگ تھے، وہی تھے جو اترا کرتے تھے، یعنی گھر گھر جا کر اشیا بیچنے والے اور وہ لوگ جو پچھلے جمعے قصبے سے گئے تھے اور اب واپس لوٹ رہے تھے

آخری لانچ ڈاک والی لانچ تھی۔ کرنل نے قدرے دکھ اور قدرے بے چینی سے اسے کھاڑی پر لگتے دیکھا لانچ کے عرشے پہ چمنی سے بندھا ہوا اور روغنی کپڑے میں لپٹا ڈاک کا تھیلا اسے دکھائی دیا۔ پندرہ برس کے انتظار نے کرنل کے دکھ میں اور مرغے نے اس کی بے چینی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ جب پوسٹ ماسٹر لانچ پہ جا کر تھیلے کو کھول کر اسے اپنے کندھوں پر اٹھا رہا تھا کرنل نے اپنی نظر ایک لمحے کے لیے بھی پوسٹ ماسٹر سے نہیں ہٹائی۔

پھر وہ اسے تھیلا اٹھائے ہوئے اس سڑک پہ چلتے دیکھتا رہا جو ساحل کے متوازی بنی ہوئی تھی اور جس پر مختلف پیچیدہ دکانوں کے آگے رنگ برنگے سودے لٹکے ہوئے تھے۔ ہر جمعہ کے روز کرنل اسی مرحلے میں سے گزرتا تھا اور ہر بار اسے خوف کا احساس ہوتا تھا، ایسے خوف کا جو بے چینی سے بہت مختلف تھا مگر اسی جیسا جابر اور شدید تھا۔ ڈاکٹر ڈاکخانے میں اپنے اخباروں کا منتظر تھا۔

"میری بیوی نے کہا ہے کہ میں تم سے دریافت کروں کہ ہم نے کس روز جب تم ہمارے مہمان تھے تمہارے سر پہ کھولتا ہوا پانی پھینکا تھا؟" کرنل نے ڈاکٹر سے کہا۔

ڈاکٹر جوان آدمی تھا۔ اس کے سر کے بال کالے اور چمکدار تھے۔ جب وہ ہنستا تھا تو اس کی ہنسی کی ہمواری دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ دانت اس کے اپنے اور اصلی ہیں۔ اس نے کرنل سے اپنے مریض کا حال پوچھا۔ کرنل نے اپنی بیوی کے دمے کی مکمل رپورٹ دی لیکن اس دوران میں لگاتار پوسٹ ماسٹر پہ نظریں جمائے رہا جو تھیلے میں سے خط نکال کر لکڑی کے چوکور ڈبوں میں رکھ رہا تھا۔ اس کی آہستہ روی سے کرنل پراگندہ ہوتا رہا

ڈاکٹر نے اپنے خط اور اخبار وصول کیے۔ دوائیوں کے اشتہار اس نے ایک جانب رکھ دیئے اور ایک نظر اپنے ذاتی خطوط کو دیکھنے لگ گیا۔ اس عرصے میں پوسٹ ماسٹر نے ان لوگوں میں جو ڈاک خانے میں موجود تھے ڈاک بانٹی۔ کرنل نے اس خانے کو دیکھا جس پر اس کے نام کا پہلا حرف درج تھا اور اس میں ایک ہوائی ڈاک والا لفافہ پڑا تھا جسے دیکھ دیکھ کر کرنل کے اعصابی تناؤ میں اضافہ ہوتا رہا۔

ڈاکٹر نے اخباروں کے بنڈل پر لگی مہر کو توڑا اور اخبار کی سرخیوں کو پڑھا۔ کرنل لگاتار اپنے نام والے خانے کو دیکھ رہا تھا اور پوسٹ ماسٹر کے اس کے آگے رُکنے کا منتظر تھا مگر پوسٹ ماسٹر اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل گیا۔ ڈاکٹر نے اخبار کا مطالعہ روک کر پہلے کرنل کو اور پھر پوسٹ ماسٹر کو دیکھا جو اب ٹیلیگراف کے آلے کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔ تب اس نے بلند آواز میں کہا:

"ہم لوگ اب جا رہے ہیں۔"

پوسٹ ماسٹر نے سر اٹھائے بغیر کہا:

"کرنل کے لیے کوئی ڈاک نہیں ہے۔"

کرنل کو خفت کا احساس ہوا

"مجھے ڈاک کی توقع بھی نہیں تھی" اس نے جھوٹ بولا۔ پھر ڈاکٹر کی طرف مڑ کر وہ بالکل بچوں کے سے لہجے میں بولا: "مجھے کوئی خط نہیں لکھتا۔"

وہ دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ ڈاکٹر کی توجہ ابھی اخبار ہی پر تھی۔ کرنل اپنے خاص انداز میں چل رہا تھا، ایسے شخص کے انداز میں جس کا کوئی سکہ زمین پر گر گیا ہو اور جو چلتے وقت مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا ہو۔ اس وقت خوبصورت دھوپ بھری دوپہر تھی، چوک میں بادام کے درختوں سے آخری گلے سڑے پتے گر رہے تھے۔ جب وہ دونوں ڈاکٹر کے دفتر پہنچے تو اندھیرا چھانے لگا تھا۔

"خبروں میں کیا ہے؟" کرنل نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ میں چند اخبار تھما دیئے۔

"خدا ہی جانے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "صحیح خبر جاننا تو ناممکن ہے۔ خبروں کے بین السطور پڑھنے سے بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

کرنل نے اخبار کی سرخیاں پڑھیں جو سب بین الاقوامی خبروں کی تھیں۔ اوپر چار کالم میں نہر سویز پر رپورٹ تھی۔ پہلا صفحہ سارے کا سارا مرگ اور جنازوں کے اوقات کے اعلانات سے بھرا ہوا تھا۔ ان اعلانات کے لیے لوگوں نے ادائیگی کی تھی۔

"الیکشن ہوتے تو ناممکن ہیں؟" کرنل نے کہا۔

"بچوں کی سی باتیں کرتے ہو کرنل" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہماری زندگی میں تو کسی مسیحا کے پیدا ہونے کی توقع

نہیں ہے۔"

"کرنل نے ڈاکٹر کو اخبار واپس کر نے جا رہے ہے۔ مگر ڈاکٹر نے انکار کر دیا۔"

"وہ گھر لے جاؤ" اس نے کہا۔ "پڑھ کر کل صبح واپس کر دینا۔"

پادری انجل کا دستور تھا کہ گرجے کے مینار سے گھنٹیاں بجا کر اعلان کیا کرتا تھا کہ قصبے میں آنے والی فلموں میں سے کونسی فلم اخلاق سوز ہے اور کون سی عوام الناس کے دیکھنے کے قابل ہے۔ اسے ڈاک کے ذریعے ہر ماہ فلموں کے بارے میں شہر سے اطلاع موصول ہوتی تھی۔ سات بجے فلم کے سنسر کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں اس شام کرنل کی بیوی نے بارہ گھنٹیاں سنیں۔

"غیر اخلاقی فلم ہے" اس نے کہا "سال ہو چلا ہے۔ کوئی فلم ایسی نہیں آئی جسے سب لوگ دیکھ سکیں۔"

مچھر دانی گراتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا "ساری دنیا کا اخلاق خراب ہو گیا ہے۔" کرنل نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بستر پر بیٹھنے سے قبل اس نے مرغ کو بستر کے پائے سے باندھا، دروازے کی کنڈی چڑھائی اور سونے کے کمرے میں حشرات مارنے کی دوائی چھڑکی۔ پھر لیمپ فرش پر رکھ کر وہ اپنے جھولنے والے بستر میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔

سب اخبار اس نے پہلے صفحے سے آخر تک پڑھے، حتیٰ کہ اشتہار بھی پڑھ ڈالے۔ گیارہ بجے کرفیو کا بگل بجا۔ آدھ گھنٹہ بعد کرنل نے اخبار کا مطالعہ ختم کیا۔ اٹھ کر دالان کا دروازہ کھولا اور گھپ اندھیری رات میں باہر نکل کر، دیوار کے ساتھ لگ کر پیشاب کیا۔ مچھر اس کا طواف کر رہے تھے۔ جب وہ سونے کے کمرے میں واپس آیا تو اس کی بیوی ابھی جاگ رہی تھی۔

"ریٹائرڈ جنگی سپاہیوں کے بارے میں کوئی خبر تھی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں" کرنل نے اپنے بستر میں دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "پہلے کم از کم نئے پنشن حاصل کرنے والوں کی فہرست ہی شائع کر دیا کرتے تھے۔ پانچ سال سے وہ بھی چھپنی بند ہو گئی ہے۔"

آدھی رات کے بعد بارش پھر شروع ہو گئی۔ کرنل تھوڑی دیر تو سویا مگر پھر اپنی انتڑیوں کے خوف سے جاگ گیا۔ کمرے کی چھت کہیں سے ٹپک رہی تھی۔ اپنے آپ کو اونی کمبل میں کانوں تک لپیٹ کر وہ ادھر ادھر پھر کر ٹپکاؤ کے مقام کو ڈھونڈتا رہا۔ بخار کی وجہ سے اس کی ریڑھ کی ہڈی پر پسینہ بہنے لگا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ جیلی کے تالاب میں چکر کھا رہا ہو۔ کسی نے اس سے کچھ پوچھا۔ اپنے انقلابیوں والے فوجی بستر سے اس نے اسے جواب دیا۔

"کس سے باتیں کر رہے ہو؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"ایک انگریز سے جو چیتے کا بھیس بدل کر کرنل اوریلیانو بوآندیا کے کیمپ میں آ گیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ اس کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ "اصل میں وہ ڈیوک آف مالبرو تھا۔"

صبح صبح آسمان صاف ہو گیا۔ گرجے کی نماز کی دوسری گھنٹی بجنے پر وہ تذبذب کی حالت میں بستر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ مرغے کی بانگ نے اس کی پریشانی اور ذہنی ابتری میں اور اضافہ کیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور اُسے متلی ہو رہی تھی۔ دالان میں سے بھاگ کر، موسم سرما کی دھیمی سرگوشیوں اور گہری خوشبوؤں میں سے گزر کر وہ غسل خانے کی طرف لپکا۔ جست کی چھت والے لکڑی کے تختوں کے بنے غسل خانے کے اندر امونیا کی بو سے ہوا لطیف ہو گئی تھی۔ کرنل نے پیشاب کی نالی کا ڈھکن اٹھایا تو اس میں سے ہزاروں مکھیاں ایک تکونے بادل کی صورت برآمد ہوئیں۔

اس کا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ کھردرے تختوں پر بیٹھے ہوئے قے کرنے کی خواہش میں ناکامی کا احساس ہوا۔ اس کے اعضائے ہاضمہ میں اب کُند قسم کے درد نے جگہ پالی تھی۔ "ہر اکتوبر میں کچھ ہوتا ہے۔" وہ بڑبڑایا لیکن جب تک اس کی انتڑیوں میں اگنے والی کھمبوں کو سکون نہ آیا وہ اطمینان اور معصوم اشتیاق کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔ آخر کار مرغے کو دیکھنے کی خاطر وہ واپس سونے کے کمرے میں لوٹ آیا

"کل رات بخار میں تمہیں ہذیان تھا۔" اس کی بیوی نے کہا

ہفتے بھر کے دمے کے دورے کے ختم ہوتے ہی اس کی بیوی نے اُٹھ کر کمرے کی صفائی شروع کر دی تھی۔ کرنل نے پچھلی رات کے واقعات کے بارے میں اپنی یادداشت پر زور ڈالا مگر اسے کچھ یاد نہ آیا

"بخار نہیں تھا۔" اس نے جھوٹ بولا۔ "مجھے دوبارہ مکڑی کے جالوں کے خواب آرہے تھے۔"

ہمیشہ کی طرح کرنل کی بیوی دمے کے دورے کے اختتام پر اعصابی قوت اور جوش سے بھرپور کمرے کی ہر چیز کو ادلنے بدلنے میں مصروف تھی۔ کلاک اور عورت کی تصویر کے علاوہ اس نے ہر چیز کی جگہ تبدیل کر دی تھی۔ جسمانی لحاظ سے وہ دھان پان عورت تھی مگر جب اپنے کپڑے کے چپلوں اور ہر سمت سے بند کالے لباس میں چلتی تھی تو لگتا تھا جیسے اپنی قوت کے سبب دیواروں کے بیچ میں سے گزر جائے گی۔ بارہ کے سے پہلے پہلے اس کے وجود نے جو بستر میں چند انچ سے زیادہ جگہ نہیں گھیرتا تھا، اپنے انسانی وزن کو اپنے تن و توش کو دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ تیگو نیا اور فرن کے گملوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے گھر اس کی موجودگی سے معمور معلوم ہوتا تھا۔

"اگستین کے سوگ کا برس اگر گزر گیا ہوتا تو آج میں گانا گاتی۔" اس نے ہنڈیا میں چمچ ہلاتے ہوئے کہا اس ہنڈیا میں منطقہ حارہ میں اگنے والی ہر سبزی کٹی ہوئی موجود تھی اور پک رہی تھی۔ "گانے کو جی چاہ رہا ہے تو ضرور گاؤ۔" کرنل نے کہا۔ "کوئی ہرج نہیں۔ گانا ویسے بھی آدمی کی تلی کے لئے مفید ہوتا ہے۔"

دوپہر کے کھانے کے بعد ڈاکٹر اپنے مریض کو دیکھنے کے لئے آیا۔ کرنل اور اس کی بیوی باورچی خانے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ انہیں گلی والے دروازے کے کھلنے کی آواز آئی اور ڈاکٹر نے بلند آواز میں کہا۔

"ادھر کوئی ہے یا سب فوت ہو گئے ہیں؟"

کرنل اسے خوش آمدید کہنے کو اٹھا۔

"ہاں یہ مردوں کی بستی ہی ہے"۔ بیٹھنے کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے ڈاکٹر سے مسکرا کے کہا "اور تم بھی جب تک تمہارا مریض گدھوں کے کھانے کے لائق ہو جائے، اس کی جانب رخ نہیں کرتے"۔ کرنل کی بیوی معائنے کی خاطر تیار ہونے کے لیے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ ڈاکٹر کرنل کے ہمراہ بیٹھنے کے کمرے ہی میں رہا۔ گرمی کے باوجود ڈاکٹر کے لنن کے کپڑوں میں تازگی کی مہک تھی۔ جب کرنل کی بیوی نے اعلان کیا کہ وہ تیار ہے تو ڈاکٹر اٹھا۔ دوسرے کمرے میں جانے سے قبل اس نے کرنل کو کاغذ کے تین پرچے دیئے جو ایک لفافے میں بند تھے۔

"یہ وہ خبریں ہیں جو کل اخبار نے شائع نہیں کی تھیں"۔ اس نے کہا اور سونے کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

کرنل یہ تو جانتا تھا کہ ان کاغذوں پر کیا رقم تھا۔ ان میں ملکی حالات کا خلاصہ تھا جو خفیہ ترسیل کی خاطر مائیمیوگراف کیا گیا تھا۔ اندرونِ ملک میں مسلح بغاوت کے بارے میں چند نئے انکشافات تھے۔ ان انکشافات کو پڑھ کر ایسے لگا جیسے وہ نہایت ہزیمت زدہ آدمی ہو۔ دس سال لگاتار خفیہ خبریں پڑھنے کے باوجود اسے یہ احساس نہ ہوا تھا کہ ہر نئی خبر گذشتہ خبروں سے کہیں زیادہ حیران کن ہوتی ہے۔ جب تک ڈاکٹر واپس آیا وہ کاغذات پڑھنا ختم کر چکا تھا۔

"میری یہ مریض تو مجھ سے بھی زیادہ صحت مند ہے۔ مجھے ایسا دمہ ہو تو سو برس تک جی سکتا ہوں"۔ اس نے کہا۔ کرنل نے پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر لفافہ اسے واپس کرنا چاہا مگر ڈاکٹر نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔

"آگے دے دینا" اس نے کہا۔

کرنل نے لفافے کو پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ اس کی بیوی سونے کے کمرے میں سے باہر آئی۔ "مجھے پتہ ہے کسی روز میں نے بیٹھے بیٹھے مر جانا ہے لیکن اکیلے جہنم میں نہیں جاؤں گی، تمہیں بھی ساتھ لے کر جاؤں گی"۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ڈاکٹر نے حسب معمول اپنی تبسم دکھا کر خاموشی سے بات کی داد دی۔ پھر وہ کرسی گھسیٹ کر میز کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اپنے چرمی تھیلے میں سے دوائیوں کے مفت نمونوں کی بہت سی شیشیاں اس نے نکال کر سامنے رکھ لیں۔ کرنل کی بیوی باورچی خانے میں چلی گئی۔

"کافی گرم کر رہی ہوں۔ پی کر جانا" اس نے وہاں سے کہا۔

"نہیں۔ بہت بہت شکریہ"۔ وہ ایک کاغذ پر دوائیوں کی ترکیب استعمال لکھ رہا تھا۔ "میں تمہیں موقع نہیں دینا چاہتا کہ تم مجھے زہر پلاؤ"۔ اس نے کہا۔

کرنل کی بیوی باورچی خانے میں بیٹھی ہنستی رہی۔ ڈاکٹر نے لکھنا بند کیا اور بلند آواز سے اپنے لکھے کو پڑھا تاکہ دوائی استعمال کرتے وقت کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بدخطی مشہورِ عام تھی۔ کرنل غور

سے ڈاکٹر کی ہدایات سنتا رہا۔ اس کی بیوی باورچی خانے سے باہر آئی۔ کرنل کے چہرے کو ایک نظر دیکھنے پر اسے محسوس ہوا کہ ایک ہی رات کے بخار اور درت بجّے نے اسے کمزور کر دیا تھا۔

"آج صبح اسے بخار تھا" اس نے ڈاکٹر کو بتایا۔ "دو گھنٹے یہ خانہ جنگی کے بارے میں الٹی سیدھی ہانکتا رہا تھا"

کرنل یہ سن کر چونکا۔

"نہیں بخار نہیں تھا" اس نے اپنی بڑبڑاہٹ پر قابو پا کر کہا۔ "جس دن میں اصل بیمار رہوں گا خود ہی اپنے آپ کو ایک کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دوں گا"

اٹھ کر وہ سونے کے کمرے میں سے اخبار لانے چلا گیا۔

"تعریفی جملے کا شکریہ" ڈاکٹر نے کہا۔

وہ دونوں گھر سے نکل کر چوک کی طرف روانہ ہو گئے۔ آج ہوا میں خشکی تھی اور گرمی سے سڑکوں پر بچھی تارکول نے پگھلنا شروع کر دیا تھا۔ جب ڈاکٹر نے کرنل کو الوداع کہا تو کرنل نے اس سے اس کی فیس کے بارے میں پوچھا۔

"ابھی کچھ دینے کی ضرورت نہیں" اس نے کرنل کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا "مرغا جیت جائے گا تو بڑا سا بل بھیج دوں گا۔"

آگستین کے ساتھیوں کو خفیہ اخبار پہنچانے کی خاطر کرنل درزی کی دکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب سے کرنل کے اپنے رفیق اور خانہ جنگی کے شریک کار مارے گئے یا ملک بدر کر دیئے گئے تھے اور اس کا اپنا کام چھپے کے چھپے خط کا انتظار کرنا رہ گیا تھا۔ درزی کی دکان ہی اس کا واحد سہارا تھی۔

سہ پہر کی گرمی کے باعث کرنل کی بیوی کی قوت دوبارہ بحال ہو گئی تھی، بیگو نیا کے گملوں کے پاس پھٹے پرانے کپڑوں کا ڈبہ سامنے رکھے وہ بغیر کسی سامان کی مدد سے نئے لباس تیار کرنے کے ابدی معجزے میں مستغرق تھی۔ پرانی قمیضوں کی آستینوں میں سے کالر اور چھوٹے چھوٹے مختلف رنگوں کے قمیضوں کے ٹکڑوں میں سے آستینیں بنانے کا اس کا کام جاری تھا۔ ایک جھینگر نے دالان میں اپنا راگ الاپنا شروع کیا۔

بیگو نیا کے پودوں کی اونچائی کے سبب اسے احساس ہی نہ ہوا کہ سورج کی روشنی مدھم پڑ گئی تھی جب شام ڈھلے کرنل گھر واپس آیا تب اس نے اپنا سلائی کڑھائی کا شغل بند کیا۔ اپنی گردن کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس نے اپنی انگلیاں چٹخائیں اور کہا:

"میری گردن تختے کی طرح اکڑ گئی ہے"

"تمہاری گردن ہمیشہ سے ایسی ہی ہے" کرنل نے کہا اور جب اس نے اپنی بیوی کے کپڑوں اور جسم پر چاروں طرف چھوٹی چھوٹی رنگدار کترنیں دیکھیں تو اضافہ کیا "تم نیل کنٹھ کے گھونسلے میں سے نکلی لگتی ہو"

"تمہارا لباس تیار کرنے کے لئے آدھا نیل کنٹھ بنا ہی پڑتا ہے۔" اس نے جواب دیا اور تین مختلف رنگوں کے کپڑوں سے تیار کی ہوئی کرنل کی قمیض اسے دکھائی۔ صرف قمیض کے کالر اور آستین کے لئے ایک ہی رنگ کا کپڑا استعمال کیا گیا تھا۔ "سرکس کا مسخرہ بننے کے لئے اب تمہیں تہوار کے دن صرف کوٹ اتارنے کی ضرورت ہوگی۔"

گرجے سے چھ بجے شام کی گھنٹیاں اس کی بات میں دخل انداز ہوئیں۔ "خداوند خدا کے فرشتے نے مریم کو خبر دی ......" اس نے بلند آواز میں دعا پڑھنی شروع کی اور سونے کے کمرے کی جانب چلی گئی۔ کرنل دالان میں بیٹھا بچوں سے باتیں کرتا رہا جو سکول ختم ہونے پر مرغے کو دیکھنے آئے تھے۔ تب اسے یاد آیا کہ مرغے کے لئے اگلے روز کی مکی نہیں تھی۔ اپنی بیوی سے پیسے لینے وہ اندر گیا۔

"میرا خیال ہے صرف پچاس سینٹ باقی بچے ہوئے ہیں۔" اس کی بیوی نے کہا۔

اس نے سکوں کو رومال میں باندھ کر بستر کے گدے کے نیچے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ آگستین کی کپڑے سینے کی مشین کو بیچ کر جو رقم حاصل ہوئی تھی اس سے وہ پچھلے نو مہینوں سے اپنی اور مرغے کی ضرورتیں پوری کر رہے تھے۔ اب دو بیس سینٹ کے سکے اور ایک دس کا باقی بچے تھے۔

"آدھ سیر مکی خرید لو اور باقی کے پیسوں سے کل کے لئے کافی اور چار اونس پنیر لے آنا۔"

"ہاں، اور دہلیز میں لٹکانے کے لئے سونے کا ہاتھی بھی لے آؤں گا۔" کرنل نے جواب دیا۔ "مکی کے ہی بیالیس سینٹ لگیں گے۔"

دونوں کچھ دیر سر جھکائے سوچتے رہے۔ "مرغا ایک آدھ روز بھوکا بھی رہ سکتا ہے۔ کوئی بڑی آفت نہیں آتی، جانور ہی تو ہے۔" کرنل کی بیوی نے بات شروع کی۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کرنل کے چہرے کی کیفیت نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ کرنل اپنی کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے بستر پر بیٹھا سکوں کو کھنکھنانے میں مصروف تھا۔ "یہ میں اپنے لئے نہیں کر رہا ہوں" اس نے کچھ لمحوں بعد کہا۔ "صرف اپنی بات ہوتی تو آج ہی مرغے کو پکا کر کھا گیا ہوتا۔ پچاس پیسوز کی بدہضمی بھی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔" بات کرتے کرتے رُک کر اس نے اپنی گردن پر بیٹھے ایک مچھر کو مارا۔ اس کی بیوی کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

"اپنے سے زیادہ مجھے ان بچوں کا خیال ہے جو مرغے کی خاطر پیسے جوڑ رہے ہیں۔"

کرنل کی بیوی نے اس بات پر تھوڑی دیر غور کیا۔ پھر وہ اچانک مڑ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں جراثیم مارنے کی دوائی تھی۔ کرنل کو اپنی بیوی کا اس موقعے پر اس انداز سے رکنا عجیب لگا، جیسے وہ گھر کی نگہبان روحوں کے ساتھ صلاح مشورہ کر رہی ہو۔ بالآخر اس نے دوائی کو کارنس پر رکھ دیا اور اپنی شربتی رنگ کی آنکھیں کرنل کی شربتی رنگ کی آنکھوں میں ڈال کر بولی:

"سے آدمی. خدا ہی جانتا ہے ہمارا گزارہ کیسے ہوگا"

اگلے ہفتے کے دوران میں ہر روز دوپہر کو میز پر کھانے کو موجود پاکر کرنل یہ کہتا رہا "اسے روٹیوں کی افزائش کا معجزہ نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟" اس کی بیوی نے اپنی رفوگری اور سلائی کڑھائی کی حیرت انگیز صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ شاید پیسے کی مدد کے بغیر گھر کی خانہ داری چلانے کا گر بھی دریافت کر لیا تھا. اکتوبر کے مہینے کے ساتھ کرنل کا صلح کا معاہدہ ابھی باقی تھا. ہوا سے نمی غائب تھی اور دن بھر غنودگی کا عالم رہتا تھا. تب جیسے سورج کی کرن کی عطا کردہ آسودگی کی بدولت کرنل کی بیوی نے تین روز اپنے بالوں کی صفائی کے پیچیدہ عمل میں صرف کیے "بڑا اہتمام شروع ہو گیا ہے" کرنل نے اسے لمبے سیکڑوں بالوں میں سے ٹوٹے کنگروں والی کنگھی سے پیچ نکالتے ہوئے دیکھ کر کہا. دوسرے روز دالان میں بیٹھ کر، چادر گود میں پھیلائے وہ باریک کنگھی سے بالوں میں سے جوئیں نکالنے میں مصروف رہی جو اس کی بیماری کے دنوں میں جاگزیں ہو گئی تھیں. آخر کار اس نے لیونڈر کے عرق سے اپنے بال دھوئے اور ان کے سوکھنے کا انتظار کرنے لگی. پھر اس نے بالوں کو دو دفعہ گول کر کے تولئے کے ساتھ گردن کے اوپر باندھے رکھا. کرنل اس طویل رسم کے ختم ہونے کا منتظر رہا. رات کو اپنے جھولے والے بستر میں لیٹا بے خوابی کی حالت میں وہ مرغے کے بارے میں فکر مند رہا لیکن بدھ کے روز جب مرغے کا وزن کیا گیا تو وہ ٹھیک ٹھاک نکلا.

اس دوپہر کو جب آگسٹن کے ساتھی اسے مرغے کی متوقع کامیابیوں کا حساب لگاتے ہوئے کرنل کے گھر سے واپس ہوئے تو کرنل چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا. اس کی بیوی نے اس کی حجامت بنائی. "تم نے مجھے دس سال جوان کر دیا ہے" کرنل نے اپنے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا. اس کی بیوی کو بھی کچھ ایسا ہی لگا.

"میری صحت ٹھیک رہے تو میں مردوں کو بھی زندہ کر سکتی ہوں" اس نے کہا لیکن اس کی خود اعتمادی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی کیونکہ گھر میں اب کلاک اور تصویر کے علاوہ فروخت کرنے کو کچھ نہ بچا تھا. جمعرات کی شام تک وہ اپنے مالی وسائل کی آخری حد تک پہنچ چکے تھے اور کرنل کی بیوی نے تشویش کا اظہار شروع کر دیا تھا.

"کل ڈاک کا دن ہے" کرنل نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی "پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں."

دوسرے روز کرنل ڈاکٹر کے دفتر کے سامنے کھڑا لانچوں کا انتظار کر رہا تھا. اس کی نظر ڈاک کے تھیلے پر جمی ہوئی تھی مگر وہ ڈاکٹر سے مخاطب ہوا.

"ہوائی جہاز کمال شے ہے. سنا ہے ایک ہی رات میں آدمی یورپ پہنچ سکتا ہے؟"

"درست ہے" ڈاکٹر نے ایک باتصویر رسالے سے اپنے آپ کو پنکھا کرتے ہوئے کہا. کرنل نے لانچوں کے منتظر اور بہت سے لوگوں کے درمیان پوسٹ ماسٹر کو لانچ پہ جانے کو تیار پایا. لانچ پہ کودنے والا سب سے پہلا شخص پوسٹ ماسٹر ہی تھا. لانچ کے کپتان سے ایک مہر لگا لفافہ وصول کرنے کے بعد وہ لانچ کے عرشے پہ پہنچ گیا. ڈاک کا تھیلا دو تیل کے کنستروں کے درمیان بندھا ہوا تھا.

"ہوائی سفر میں خطرہ تو ضرور ہوتا ہوگا۔" کرنل نے کہا۔ تھوڑے عرصے کے لیے پوسٹ ماسٹر اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا لیکن جلد ہی وہ اسے جائے پانی والے ریڑھے پر سجی ہوئی رنگ برنگی بوتلوں کے درمیان کھڑا نظر آگیا۔ "انسان کو ترقی کی خاطر کچھ قیمت تو ادا کرنی ہی پڑتی ہے۔"

"حالانکہ ہوائی سفر نئی ایجاد ہے مگر لانچوں سے پھر بھی محفوظ ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "آدمی بیس ہزار فٹ کی بلندی پر سفر کر رہا ہو تو موسم کے اثرات سے اوپر ہوتا ہے۔"

"بیس ہزار فٹ؟" کرنل نے پریشان ہوکر دہرایا۔ اس کا ذہن اس ہندسے کے معانی سے ناآشنا تھا۔ ڈاکٹر نے کرنل کو سمجھانے کی خاطر باتصویر رسالے کو پھیلا کر اپنے دونوں ہاتھوں پر ٹکایا اور کہا:

"یہ دیکھو یہ مکمل سکوت اور توازن کی مثال ہے۔"

لیکن کرنل پوسٹ ماسٹر پر زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ڈاک کا تھیلا تھا اور بائیں میں گلاس جس میں سے وہ گلابی رنگ کا شربت پی رہا تھا۔

"مزید یہ کہ رات کو پرواز کرنے والے جہاز سمندر میں لنگر ڈالے ہوئے ہر جہاز سے رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ ان احتیاطی تدابیر کی وجہ سے ہوائی جہاز لانچ سے کہیں زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔" ڈاکٹر بولتا رہا۔

کرنل نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور بولا:

"جہاز کا سفر یقیناً اڑنے والے قالین پر سفر کی طرح ہوتا ہوگا۔"

پوسٹ ماسٹر چلتا ہوا سیدھا ان کی طرف آیا۔ کرنل دو قدم پیچھے ہٹا۔ بے تابی میں اس نے مہر لگے لفافے پر لکھا ہوا نام پڑھنے کی کوشش کی۔ پوسٹ ماسٹر نے ڈاک کا تھیلا کھولا اور اخباروں کا پلندہ نکال کر ڈاکٹر کے حوالے کیا۔ تب اس نے لوگوں کے ذاتی خطوط والا پیکٹ کھولا اور رسید کی صحت جانچنے کے بعد خطوں پر لکھے لوگوں کے نام بلند آواز میں پکارنے شروع کر دیئے۔ ڈاکٹر نے اخباروں کا پلندہ کھولا۔

"سویز میں جنگ ابھی جاری ہے۔ مغربی طاقتوں کی پٹائی ہو رہی ہے۔" اس نے سرخی پڑھی۔

کرنل اپنے پیٹ کو قابو میں لانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس نے کہا: "جب سے خبروں پر سنسر لاگو ہوا ہے اخباروں میں صرف یورپ کی خبریں ہی آتی ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ یورپ کے لوگ یہاں آجائیں اور یہاں کے سب لوگ یورپ میں جا بسیں۔ اس طرح ہر ایک کو معلوم ہوتا رہے گا کہ اس کے اپنے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔"

"یورپ کے لوگوں کی نظر میں لاطینی امریکی مونچھوں والے لوگ ہیں جو ہاتھوں میں گٹار اور پستول لئے پھرتے ہیں۔ انہیں ہمارے مسائل کا کچھ علم نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے اخبار سے سر اٹھا کر ہنستے ہوئے کہا۔

پوسٹ ماسٹر نے خط بانٹنے ختم کیے، فاضل ڈاک تھیلے میں رکھی اور اسے بند کر دیا۔ ڈاکٹر نے اپنے ذاتی خط کھول کر پڑھنے سے قبل کرنل کو دیکھا۔ پھر اس نے پوسٹ ماسٹر سے پوچھا "کرنل کے لئے کچھ نہیں ہے؟"

کرنل کا دل دبلا ہوا تھا۔ پوسٹ ماسٹر تھیلا اپنے کندھے کے پیچھے پھینک کر پلیٹ فارم سے اترا اور اپنا منہ موڑے بغیر بولا:

"کرنل کو لکھنے والا کوئی نہیں۔"

اُس روز کرنل اپنی عادت کے خلاف ڈاک خانے سے سیدھا گھر نہیں گیا بلکہ درزی کی دکان پر بیٹھ کر کافی پیتا رہا۔ اس دوران میں آگستین کے ساتھی اخبار کے صفحے الٹتے رہے۔ کرنل کو احساس ہوتا رہا جیسے اس کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ خالی ہاتھ اپنی بیوی کے سامنے جانے کی بجائے اگلے جمعے تک وہیں بیٹھا رہے، لیکن جب شام کو درزی کی دکان بند ہونے آئی تو اسے حقیقت کا سامنا کرنا ہی پڑا۔

اس کی بیوی اس کی منتظر تھی۔ "کچھ نہیں آیا؟" اس نے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں" کرنل نے جواب دیا۔

اس سے اگلے جمعے وہ پھر لانچوں کو دیکھنے گیا اور پچھلے ہر جمعے کی طرح خط کے بغیر لوٹ آیا۔ اُس رات اس کی بیوی نے اسے کہا: "ہم نے کافی انتظار کر لیا ہے۔ پندرہ برس کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ تم بیل کی طرح ایک ہی کام میں جتے ہوئے ہو۔" کرنل اخبار پڑھنے کی غرض سے اپنے جھولنے والے بستر میں لیٹ گیا۔

"ہمارا نمبر اٹھارہ سو تئیسواں ہے۔ باری آتے آتے وقت لگے گا۔" اس نے کہا

"جب سے ہم انتظار کر رہے ہیں لاٹری میں بھی یہ نمبر دو دفعہ نکل چکا ہے۔" اس کی بیوی نے جواب دیا۔

کرنل نے حسب معمول اخبار پہلے صفحے سے آخری صفحے تک اشتہاروں سمیت پڑھا، لیکن آج وہ پڑھتے وقت خبروں پر دھیان دینے کی بجائے پرانے سپاہیوں کی پنشن کے بارے میں غور کرتا رہا تھا۔ انیس برس قبل کانگریس نے قانون بنایا تھا۔ قانون بننے کے بعد آٹھ برس اسے اپنا کلیم منوانے میں لگے تھے۔ مزید چھ سال بعد اس کا نام پنشن کے حقداروں کی لسٹ پر لکھا گیا تھا۔ حکومت کی طرف سے آخری مراسلہ اسے تب ہی موصول ہوا تھا۔

کرفیو کے بگل کے بعد کرنل نے اخبار پڑھنا بند کیا۔ اس نے بتی بجھا دی مگر اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔

"تمہارے پاس وہ اخبار کا تراشہ ابھی موجود ہے" اس نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

اس کی بیوی نے کچھ دیر سوچا۔

"ہاں، باقی تمام کاغذات کے ساتھ ہی پڑا ہوگا۔" اس نے جواب دیا۔

تب وہ مچھر دانی میں سے باہر آئی۔ الماری میں سے اس نے لکڑی کا صندوق نکالا۔ اس میں ایک طرف خطوں کا ایک بنڈل رکھا تھا جو ربڑ کے فیتے سے بندھا ہوا تھا۔ بنڈل میں سے اس نے وکلا کی ایک فرم کا اشتہار ڈھونڈ نکالا جنہوں نے سپاہیوں کی پنشن پر جلدانہ جلد کارروائی کروانے کا یقین دلایا ہوا تھا۔

اس نے اشتہار اپنے خاوند کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "اتنی دیر سے میں تمہیں وکیل تبدیل کرنے کا

کہہ رہی ہوں۔ تم نے میری بات مان لی ہوتی تو اب تک ہم رقم وصول کر کے خرچ بھی کر چکے ہوتے۔ جان بوجھ کر اپنے مقدمے کو انڈین لوگوں کے مقدموں کی طرح طاق پر رکھوانے میں کیا فائدہ ہے؟“

”مصیبت یہ ہے کہ وکیل تبدیل کرنے میں پیسے خرچ ہوں گے“۔ کرنل نے کہا۔

”بالکل بھی نہیں“۔ اس کی بیوی نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ ”تم انہیں لکھو کہ وہ اپنی فیس جتنی بھی ہو پنشن ملنے پر اس میں سے وضع کر لیں۔ صرف اسی شرط پر وہ تمہاری وکالت کی حامی بھریں گے۔“

چنانچہ ہفتے کی صبح کرنل اپنے وکیل سے ملنے گیا۔ وکیل ایک عظیم الجثہ نیگرو تھا جس کے صرف سامنے کے اوپر والے دو دانت سلامت تھے۔ وہ کاہلی کے ساتھ اپنے جھولنے والے بستر میں دراز تھا۔ کرنل کو دیکھ کر اس نے اٹھ کر اپنے کھڑاؤں پہنے اور پیانو کے پیچھے والی کھڑکی کھول دی۔ پیانو گرد آلود تھا اور اس کے مختلف خانوں سے جہاں پہلے موسیقی کے کاغذات کے گول بنڈل ہوتے تھے، اب رجسٹروں میں چپیاں سرکاری گزٹ کے تراشے اور حساب کتاب کے بہی کھاتے بے ترتیبی کی حالت میں رکھے ہوئے تھے۔ یوں کنجیوں کے بغیر پیانو ڈیسک کا کام بھی دیتا تھا۔ وکیل اپنی گھومنے والی کرسی میں بیٹھ گیا۔ ملاقات کا مقصد بیان کرنے سے قبل کرنل کے چہرے پر بے اطمینانی اور گھبراہٹ کے آثار تھے۔

”میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس مقدمے میں وقت لگے گا“۔ کرنل کی بات ختم ہونے پر وکیل نے کہا۔ گرمی کے باعث وکیل کا جسم پسینے سے تر تھا۔ کرسی کو پیچھے دھکیل کر اس نے اسے متوازن کیا اور ایک رسالے سے اپنے آپ کو پنکھا کرنے لگا۔ ”میرے کارندوں نے کئی بار مجھے اطلاع دی ہے کہ اس معاملے میں بے صبری سے کام نہیں چلے گا“۔

”بے صبری؟“ کرنل نے کہا ”پندرہ سال سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اب تو یہ مقدمہ خصی مرغے کی کہانی کی طرح لگنے لگا ہے“۔

وکیل نے کرنل کی اطلاع کے لئے انتظامی امور کے جزئیات کی تفصیلی نقشہ کشی کی۔ کرسی اس کے کولہوں کے گوشت کے پھیلاؤ کے لئے ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ ”پندرہ سال پہلے معاملہ پھر بھی آسان تھا۔ شہر کے پرانے سپاہیوں کی جماعت میں دونوں پارٹیوں کے لوگ شامل تھے“۔ اس کے پھیپھڑے کمرے کی دم گھونٹنے والی ہوا سے بھرے ہوئے تھے اور اس نے اگلا فقرہ ایسے ادا کیا جیسے اسے ابھی ابھی ایجاد کیا ہو: ”اتحاد میں برکت ہوتی ہے“۔

”ہمارے معاملے میں تو نہیں تھی“ کرنل نے کہا۔ پہلی بار اسے اپنے اکیلے پن کا احساس ہوا۔ ”میرے تو سارے ساتھی ڈاک کا انتظار کرتے کرتے مر گئے“۔

وکیل کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔

”دراصل قانون بہت دیر میں جاری ہوا تھا“ اس نے کہا ”تم معدودے چند آدمیوں میں سے تھے

چوبیس سال کی عمر میں کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہو گئے تھے، ہر کوئی اتنا خوش قسمت نہیں تھا۔ مزید یہ کہ پنشنوں کے لئے کوئی خاص رقم مختص تو کی نہیں گئی تھی اس لئے حکومت کو بجٹ میں بہت سارد و بدل کرنا پڑا تھا:

یہ وہی پرانا قصہ تھا۔ کرنل کو وکیل کی گفتگو سن کر ہر بار ایک ہی طرح کی بے جان سی آزردگی کا احساس ہوتا تھا۔ "ہم خیرات تو نہیں مانگ رہے۔" اس نے کہا" اور نہ ہی حکومت ہمارے سروں پر احسان کر رہی تھی۔ ریپبلک کو بچانے میں ہم نے اپنا ستیاناس کر لیا تھا"۔

"یہی ہوتا آیا ہے"۔ وکیل نے جواب دیا" انسان کے ناشکرے پن کی کوئی حد نہیں ہے"۔

کرنل کی اس منطق سے بھی پرانی آشنائی تھی۔ نیرلانڈیا کے معاہدے (جس کی رو سے حکومت نے دو سو انقلابی افسروں کو قانونی تحفظ اور سفر خرچ کی ضمانت دی تھی) کے دوسرے دن ہی لوگ اس انداز میں گفتگو کرنے لگے تھے۔ سیں کے عظیم درخت کے تلے ڈیرہ ڈالے انقلابی افسروں کی ایک بٹالین نے جو زیادہ تر سکول سے فارغ ہوئے نوجوانوں پر مشتمل تھی تین ماہ تک نیرلانڈیا میں حکومت کے موعود سفر خرچ کا انتظار کیا تھا اور بعد میں اپنے اپنے وسائل سے گھروں میں پہنچ کر وہاں انتظار کرتے رہے تھے۔ اس واقع کے تقریباً ساٹھ سال بعد کرنل آج بھی منتظر تھا۔

پرانے واقعات کو یاد کر کے کرنل مضطرب ہو اگر اپنے دائیں ہاتھ کو جو صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ لگتا تھا ران پہ رکھ کر وہ تمام شکووں اور شکایات سے بلند ہو گیا اور بڑبڑایا "خیر، مجھے اس کا بندوبست کرنا ہے"۔

وکیل مزید بات کا منتظر تھا "کیا بندوبست؟"

"میں وکیل تبدیل کرنا چاہتا ہوں"۔

ایک بطخ اپنے متعدد چوزوں کے ساتھ دفتر میں گھس آئی۔ وکیل نے اٹھ کر بطخ اور اس کے خاندان کو مار نکالا۔ پھر وہ کرنل سے مخاطب ہوا۔ "جیسے تمہاری مرضی، کرنل۔ میں اگر کرامات کر سکتا تو آج اس بیلے کی کوٹھڑی میں مقیم نہ ہوتا"۔ لکڑی کا ایک جنگلہ اٹھا کر اس نے دروازے کے آگے سجا دیا اور واپس آکر اپنی کرسی میں دھنس گیا۔

"میرا بیٹا جتنی دیر جیتا رہا، ملازمت کرتا رہا۔ میرا گھر رہن ہے۔ اس ریٹائرمنٹ کے قانون سے وکیلوں کو زندگی بھر کے لئے پنشن مہیا ہو گئی ہے"۔ کرنل نے کہا۔

"غلط ہے۔ مجھے اس رقم سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ میرے تو مقدمے کے اخراجات بھی مشکل سے پورے ہوئے"۔ وکیل نے ناراض ہو کر جواب دیا۔ کرنل یہ سوچ کر پشیمان ہوا کہ شاید اس نے ناانصافی سے کام لیا ہے "میرا بھی یہی مطلب تھا"۔ اس نے اپنے بیان کی تصحیح کی اور قمیض کی آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا "گرمی سے میرے دماغ کے پرزے ڈھیلے ہو گئے ہیں"۔

تھوڑی دیر کے بعد وکیل مختار نامہ ڈھونڈنے میں سارے دفتر کو اوپر نیچے کر چکا تھا۔ لکڑی کے کھردرے

تختوں سے بنے اس چھوٹے سے کمرے میں دھوپ درمیان تک آچکی تھی۔ چیزوں کے اوپر چاروں طرف ڈھونڈنے اور مختار نامہ نہ پا سکنے کے بعد وکیل ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل ہو کر پیانو کے نیچے گھس گیا اور تھوڑی دیر بعد ہانپتا کانپتا کاغذوں کا ایک گول بنڈل نکال لایا۔

"یہ رہا تمہارا مختار نامہ!" اس نے کرنل کے ہاتھ میں ایک کاغذ جس پر مہر ثبت تھی، پکڑا دیا۔

"میں اپنے کارندوں کو لکھ دوں گا کہ وہ اس مختار نامے کی نقلوں کی تنسیخ کر دیں۔" وکیل نے اپنا جملہ مکمل کیا

کرنل نے کاغذ سے گرد جھاڑی اور اسے تہہ کر کے اپنی قمیض کی جیب میں رکھ لیا۔

"اسے خود پھاڑ دینا۔" وکیل نے کرنل کو تنبیہ کی۔

"نہیں۔ اس کاغذ کے ساتھ میری بیس برس کی یادیں وابستہ ہیں۔" کرنل نے جواب دیا اور منتظر رہا کہ وکیل باقی کاغذات بھی اس کے حوالے کر دے۔ مگر وکیل اپنے جھولنے والے بستر کے ساتھ کھڑا ہو کر اپنا پسینہ صاف کر رہا تھا اور چمکاتی روشنی میں سے کرنل کو دیکھ رہا تھا۔

"مجھے باقی دستاویزات بھی چاہئیں۔" کرنل نے کہا

"کون سی؟"

"میرے دعوے کے عینی ثبوت کے کاغذ۔"

وکیل نے پھر دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھائے اور بولا "انہیں حاصل کرنا تو ناممکن ہے، کرنل۔"

کرنل کو یہ سن کر پریشانی لاحق ہو گئی۔ وہ ماکوندو کے علاقے میں انقلابی فوجوں کا خزانچی رہا تھا اور نیرلانڈیا کے معاہدے پر دستخط ہونے سے آدھ گھنٹے قبل، چھ دن کا صبر آزما سفر طے کر کے وہ خانہ جنگی کا تمام سرمایہ دو ٹرنکوں میں ایک ہو کے، قریب المرگ گدھے پر لاد کر لایا تھا۔ کرنل اوریلیانو بوئندیا نے جو بحر اوقیانوس کے ساحل پر انقلابی فوجوں کا کوارٹر ماسٹر جنرل تھا، وہ دونوں ٹرنک دست برداری کے لئے تیار کی گئی فہرست میں شامل کر دیئے تھے اور ان کے لئے رسید حاصل کی تھی۔

"ان دستاویزات کی قیمت کا تو اندازہ لگانا ناممکن ہے۔" کرنل نے کہا "اور ان میں کرنل اوریلیانو بوئندیا کی خود نوشت رسید بھی ہے۔"

"درست ہے۔" وکیل نے کہا "مگر یہ کاغذات ہزاروں ہاتھوں اور ہزاروں دفتروں سے گزر کر اب وہ کاغذات خدا جانے محکمہ جنگ کے کس شعبے میں ہوں گے۔"

"کوئی سرکاری افسران کاغذات کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔" کرنل نے کہا

"لیکن پچھلے پندرہ برسوں میں کتنے سرکاری افسر تبدیل کئے جا چکے ہوں گے۔" وکیل نے کہا "حساب لگالو اب تک سات صدور حکومت کی باگ ڈور سنبھال چکے ہیں، ہر صدر نے کم از کم دس دفعہ اپنی کابینہ بدلی ہے اور ہر وزیر نے سو دفعہ اپنے اہلکار تبدیل کئے ہیں۔"

"لیکن کوئی افسران کاغذات کو گھر تو نہیں لے گیا ہوگا۔ ہر نئے افسر کو وہ مخصوص فائل میں نظر آئے ہوں گے" کرنل نے جواب دیا۔

وکیل اب تک کرنل کے سوالوں سے زچ ہو چکا تھا۔

"اور اگر کسی نے وہ کاغذات محکمہ جنگ سے نکال لئے ہیں تو ان کو نئے سرے سے رجسٹروں پر چڑھانے میں مزید انتظار کرنا پڑے گا" اس نے کہا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا" کرنل نے جواب دیا۔

"اس میں صدیاں لگ جائیں گی"۔

"کوئی بات نہیں۔ اگر آدمی بڑے مسائل کے حل ہونے کا انتظار کر سکتا ہے تو چھوٹے مسائل کے حل کا بھی کر سکتا ہے"۔

کرنل نے لائینوں والے کاغذوں کا پیڈ، قلم، سیاہی کی دوات اور سیاہی چوس اٹھا کر بیٹھنے کے کمرے کی چھوٹی میز پر رکھے۔ سونے کے کمرے کا دروازہ اس نے کھلا چھوڑ دیا تاکہ اسے اگر اپنی بیوی سے بات کی ضرورت پڑے تو وہ اس کی بات سن سکے۔ وہ بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔

"آج کیا تاریخ ہے؟" کرنل نے اس سے پوچھا۔

"ستائیس اکتوبر"۔

کرنل کی کتابت ستھری تھی اور وہ نہایت محنت اور اہتمام سے لکھتا تھا۔ لکھتے وقت اس کا قلم والا ہاتھ سیاہی چوس کے اوپر ٹکا ہوتا تھا اور وہ سیدھا بیٹھا ہوتا تھا تاکہ اس کے سانس کی آمد و رفت یکساں رہے۔ یہ انداز اس نے سکول میں سیکھا تھا۔ چھوٹے سے بند کمرے میں گرمی ناقابل برداشت ہو چلی تھی۔ پسینے کا ایک قطرہ خط کے اوپر گرا۔ کرنل نے سیاہی چوس سے اسے خشک کر لیا مگر چند لفظ پانی سے مٹ سے گئے تھے۔ انہیں پوری طرح مٹانے میں کرنل نے خط پر مزید دھبے ڈال لئے لیکن وہ اس بات سے چنداں پریشان نہ ہوا۔ صحیح تحریر کے نزدیک ستارے کا نشان لگا کر اس نے حاشیے پر دوبارہ وہی الفاظ لکھ دیئے اور پورے پیرے کو پڑھا۔

"میرا نام حقداروں کی فہرست پر کب چڑھا تھا؟"

اس کی بیوی نے اپنی عبادت کا تسلسل توڑے بغیر جواب دیا: "بارہ اگست انیس سو انچاس کو"۔

تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہو گئی۔ کرنل نے بچگانہ انداز میں صفحے کے حاشیوں پر لمبے ٹیڑھے خطوط سے تھوڑی سی خاکہ کشی کی جو اس نے مانا ورے کے پبلک سکول ہی میں سیکھی تھی۔ اس کے بعد اس نے دوسرے صفحے کے نصف تک مزید لکھا اور اپنے دستخط کر دیئے۔

پھر اس نے اپنی بیوی کو خط پڑھ کر سنایا۔ بیوی نے ہر فقرے کی سر ہلا کر توثیق کی۔ خط پڑھنے کے

بعد کرنل نے لفافہ بند کر دیا اور لیمپ بجھا دیا۔

"کسی سے کہہ کر خط ٹائپ کروا لو۔"

"نہیں" کرنل نے جواب دیا۔ "میں لوگوں کے احسان اٹھا اٹھا کر تنگ آ چکا ہوں۔"

آدھ گھنٹے تک کرنل بارش کو چھت پر گرتے سنتا رہا۔ قصبہ بارش کے طوفان میں غرق ہو رہا تھا۔ کرفیو کے بگل کے بعد کہیں سے چھت کے ٹپکنے کی آواز آنے لگی۔

"یہ قدم تمہیں بہت پہلے اٹھا لینا چاہئے تھا" کرنل کی بیوی نے کہا۔ "آدمی اپنے معاملات کو خود ہی نپٹائے تو ٹھیک رہتا ہے۔"

کرنل کے کان چھت کے ٹپکنے کی طرف لگے ہوئے تھے "خیر، زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے مکان کے رہن کے قرضے کی ادائیگی کی تاریخ سے پہلے پہلے یہ سارا معاملہ طے ہو جائے۔"

"دو برسوں میں!" اس کی بیوی نے کہا۔

چھت کا سوراخ ڈھونڈنے کے لئے کرنل نے لیمپ روشن کیا۔ مرغے کا پانی والا ڈبہ ٹپکاؤ کے نیچے رکھ کر وہ سونے والے کمرے میں آگیا۔ قطروں کے خالی ڈبے میں گرنے کی کرخت آواز نے اس کا تعاقب کیا۔

"یہ بھی ممکن ہے کہ حکومت اپنی رقم پر سود بچانے کی خاطر مقدمے کا فیصلہ جنوری سے قبل ہی کر دے" کرنل نے اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تب تک آگستین کا سوگ کا برس بھی پورا ہو جائے گا اور ہم فلم دیکھنے بھی جا سکیں گے۔"

کرنل کی بیوی نے دبی دبی ہنسی ہنس کر کہا "مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ کارٹون کیسے ہوا کرتے تھے۔" کرنل نے اندھیرے میں اسے دیکھنے کی کوشش کی اور پوچھا، "آخری دفعہ تم نے کب فلم دیکھی تھی؟"

"انیس سو اکتیس میں" اس نے جواب دیا "مردے کی وصیت، دکھائی جا رہی تھی۔"

"اس میں کوئی لڑائی بھی تھی؟"

"معلوم نہیں، بھوت لڑکی کا نیکلیس چوری کرنے والا تھا جب طوفان آگیا تھا اور فلم بند کر دی گئی تھی۔"

بارش کی آواز نے دونوں کو لوری دے کر سلا دیا۔ کرنل نے انتڑیوں میں بے چینی سی محسوس کی۔ لیکن وہ خوفزدہ نہ ہوا۔ ایک اور اکتوبر ختم ہونے کو تھا۔ اس نے اونی کمبل کو اپنے اردگرد لپیٹ لیا اور دور سے اپنی بیوی کے سانسوں کی بھربھری آواز کو کسی خواب کی رَو میں بہتے ہوئے سنتا رہا۔

تب اس نے بات کی۔ بولتے وقت وہ پورے ہوش میں تھا۔

اس کی بیوی جاگ گئی۔ "تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کسی سے نہیں" کرنل نے کہا "میں یہ سوچ رہا تھا کہ ماکوندو کے جلسے میں جب ہم نے کرنل اوریلیانو بوئندیا سے کہا تھا کہ ہتھیار نہ ڈالے تو ہم نے اسے غلط مشورہ نہیں دیا تھا۔ ہماری پریشان حالی کا آغاز اسی

وقت سے ہوا تھا۔"

بارش پورا ہفتہ ہوتی رہی۔ نومبر کی دو تاریخ کو کرنل کی بیوی، اپنے خاوند کی خواہش کے برعکس، اگستین کی قبر پر پھول چڑھانے گئی۔ قبرستان سے واپس آتے ہی اسے دمے کا حملہ ہو گیا۔ اگلا ہفتہ کرنل پر کٹھن گزرا، اکتوبر کے ان چار ہفتوں سے بھی زیادہ کٹھن جن میں بچ رہنے کا کرنل کو امکان نہیں تھا۔ ڈاکٹر مریضہ کو دیکھنے کے لئے آیا۔ مریضہ کے کمرے سے نکل کر اس نے بلند آواز میں مریضہ کی ہمت بڑھانے کے لئے کہا: "مجھے ایسا دمہ ہو تو سارے قصبے کو دفن کرنے کے بعد بھی زندہ رہوں۔" لیکن اس نے علیحدگی میں کرنل سے بات کی اور مریضہ کے لئے خاص خوراک تجویز کی۔

کرنل کا اپنا مرض پھر عود کر آیا۔ غسل خانے میں وہ دیر تک قے کرنے کے لئے زور لگاتا رہا۔ اسے ٹھنڈے پسینے آتے رہے اور یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ گل سڑ رہا ہو اور اس کی انتڑیوں میں اگے زہریلے پھول ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہوں۔ "اب تو سردی آ گئی ہے۔" اس نے خود کو اطمینان دلایا۔

"بارش بند ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہر چیز مختلف ہو جائے گی۔" اسے یقین تھا کہ جب پنشن کا خط آئے گا تو وہ اسے وصول کرنے کے لیے زندہ اور موجود ہو گا۔

اس بار کرنل کو گھریلو اخراجات میں پیوند لگانے پڑے۔ اردگرد کی دکانوں سے اسے کئی مرتبہ دانت کچکچا کر ادھار مانگنا پڑا۔ "صرف ایک ہفتے کی بات ہے۔ پچھلے جمعے کو مجھے رقم مل جانی چاہیے تھی، مگر نہیں مل سکی۔" وہ دکانداروں سے کہتا رہا حالانکہ اسے خود بھی علم تھا کہ اس بہانے میں سچائی کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ دورے کے گزر جانے کے بعد اس کی بیوی اسے غور سے دیکھنے پر دہشت زدہ رہ گئی۔

"تم تو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے ہو۔" اس نے کہا

"نہیں، میں اپنا خاص خیال رکھ رہا ہوں تاکہ اپنے آپ کو فروخت کر سکوں۔ کلیرنیٹ فیکٹری والوں کو ایک کلیرنیٹ کی ضرورت ہے۔" کرنل نے جواب دیا۔

لیکن حقیقت یہ تھی کہ خط کی امید نے اسے معمولی سا سہارا دے رکھا تھا۔ تھکان اور بے خوابی سے چور وہ بمشکل اپنی اور مرغے کی ضرورتوں کی خبرگیری کر رہا تھا۔ نومبر کے دوسرے ہفتے میں اسے خیال ہوا کہ مرغا دو دن تک نہ ملنے کی وجہ سے چل بسے گا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے جولائی کے مہینے میں چمنی کے اندر مٹھی بھر لوبیا سنبھال کر رکھا تھا۔ لوبیے کی پھلیوں سے دانے نکال کر اس نے پتیل کے ڈبے میں ڈالے اور مرغے کے آگے رکھ دیئے۔

"ادھر آؤ۔" اس کی بیوی نے اسے آواز دی۔

"ایک منٹ ٹھہرو۔" کرنل نے جواب دیا اور کھڑے ہو کر لوبیا کے دانوں کے بارے میں مرغے کے ردعمل کا جائزہ لینے لگا۔ "بھک منگوں کو انتخاب کا حق نہیں ہوتا۔" اس نے مرغے سے کہا۔

کرنل کی بیوی بستر میں اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے بیماری سے لاغر جسم میں سے دوائیوں اور جڑی بوٹیوں کی بو آ رہی تھی۔ جب اس نے کرنل سے بات کی تو ہر لفظ ٹھہر ٹھہر کر اور نپے تلے انداز میں ادا کیا "اس مرغے سے ابھی فوراً چھٹکارا حاصل کرو۔

کرنل اس جملے کو سننے کا بہت دیر سے متوقع تھا۔ اس روز سے جس روز اس کے بیٹے کو گولی لگی تھی اور اور اس نے مرغے کی نگہداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس موضوع پر سوچ بچار کا اسے خاصا وقت مل چکا تھا "اب کیا فائدہ ؟" اس نے کہا۔ "دو مہینوں میں مرغوں کی لڑائی ہے، اس کے بعد ہم اس کے اچھے پیسے حاصل کر سکیں گے۔"

"پیسوں کا کوئی سوال نہیں ہے" کرنل کی بیوی نے کہا "آج جب لڑکے آئیں تو انہیں کہو کہ مرغے کو لے جائیں اور اس کے ساتھ جو کرنا ہو کر لیں۔"

"میں آگستین کی خاطر یہ سب کچھ کر رہا ہوں" کرنل نے پہلے سے سوچی ہوئی دلیل پیش کی "تمہیں اس کی شکل یاد ہے جب وہ ہمیں بتانے آیا تھا کہ مرغا جیت گیا ہے؟"

دراصل کرنل کی بیوی نے اپنے بیٹے ہی کے بارے میں سوچا تھا۔

"ان بدبخت مرغوں کی وجہ سے ہی اس کی جان گئی تھی" اس نے چیخ کر کہا "تم جنوری کو رہ اگر گھر میں ٹکا رہتا تو اس پر برا وقت کیوں آتا" اپنی سوکھی ہوئی شہادت کی انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولی: "مجھے یاد ہے جب وہ مرغا بغل میں دبا کر گھر سے باہر نکلا تو میں نے اسے کہا تھا کہ مرغوں کی لڑائیوں میں شامل ہو کر خواہ مخواہ اپنے لیے عذاب مول نہ لے مگر اس نے ہنس کر اور ڈانٹ کر مجھے خاموش کرا دیا تھا اور کہا تھا کہ شام تک ہم روپے پیسے میں لوٹیں لگا رہے ہوں گے"

اتنی دیر تک بات کرنے سے تھک کر وہ نڈھال ہو گئی اور پیچھے گر گئی۔ کرنل نے نرمی سے ہلا کر اسے تکیے کے قریب کر دیا۔ اپنے جیسی ہی سرمئی رنگ کی آنکھوں پر اس کی نظر پڑی "ملنے کی کوشش کرو" کرنل نے اسے کہا اور اسے یوں لگا جیسے اس کی بیوی کی بیٹھی ہوئی سانس کی آواز اس کے اپنے سینے سے برآمد ہو رہی کرنل کی بیوی تھوڑی دیر کے لئے جیسے بے حس ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کا سانس کچھ دیر کے لئے پرسکوں ہو گیا۔

"کچھ اپنی حالت کا ہی خیال کرو" وہ بولی "اپنے منہ سے نوالہ چھین کر اسے مرغے کو دینا، گناہ نہیں تو اور کیا ہے؟"

کرنل نے چادر سے اپنے ماتھے کا پسینہ خشک کیا۔

"تین مہینوں میں کوئی نہیں مرتا۔"

"اور ان تین مہینوں میں ہم نے کھانا کیا ہے؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"پتہ نہیں" کرنل نے جواب دیا۔ "لیکن ہمیں اگر بھوک کے ہاتھوں مرنا ہوتا تو بہت دیر پہلے مر گئے ہوتے" مرغا دوسرے روز زندہ اور بھلا چنگا اپنے پتیل کے خالی ڈبے کے پاس موجود تھا۔ کرنل کو دیکھ کر اس نے گلے سے بالکل انسانی آواز نکالی اور اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ کرنل سازشی ہنسی ہنسا اور بولا۔

"زندہ رہنا آسان نہیں ہے، دوست"

کرنل باہر گلی میں نکل آیا اور جس وقت لوگ قیلولہ کر رہے تھے وہ بے مقصد ادھر ادھر گھومتا رہا، اس دوران میں اس نے کچھ سوچنے کی کوشش نہ کی، حتیٰ کہ اپنے آپ کو باور کرانے سے بھی باز رہا کہ اس کی مشکلات کا کوئی حل نہیں تھا۔ وہ ان گلیوں اور سڑکوں پر پھرتا رہا جن کے نام بھول چکا تھا حتیٰ کہ وہ چل چل کر نڈھال ہو گیا تب وہ واپس گھر لوٹ آیا۔ اس کی بیوی نے اس کے گھر میں داخل ہونے کی آواز سنی اور اسے اندر سونے کے کمرے میں بلایا۔

"کیا بات ہے؟"

اُسے دیکھے بغیر اس کی بیوی نے کہا "ہم کلاک کو بیچ سکتے ہیں"

کرنل کو بھی یہ خیال آ چکا تھا۔ "مجھے یقین ہے آلوارو تمہیں اس کے چالیس پیسوز تو ایک دم دے دے گا" کرنل کی بیوی نے اسے آگاہ کیا "یاد ہے اُسنے سلائی کی مشین ہم سے کتنی جلدی خرید لی تھی" آلوارو وہ درزی تھا جس کی دکان میں آگستین سلائی کا کام کیا کرتا تھا۔

"کل صبح اس سے بات کروں گا" کرنل نے حامی بھری۔

"کل صبح کا کیا مطلب؟ ابھی کلاک اس کے پاس لے جاؤ اور اس سے سیدھے بات کرو اس سے کہو 'آلوارو، یہ کلاک میں تمہارے پاس بیچنے کو لایا ہوں' وہ بات سمجھ جائے گا"

کرنل کو شرمندگی کا احساس ہوا۔

"اس کلاک جیسے نمائشی نمونے کو قصبے میں لے کر پھرنا ایسے ہی ہے جیسے آدمی حضرت عیسٰی کے مزار کے گنبد کو لے کر پھر رہا ہو" کرنل نے احتجاجاً کہا۔ "اگر فائیل الیکا لونا نے مجھے کلاک کے ساتھ دیکھ لیا تو میرے بارے میں گانے ایجاد کرے گا"

لیکن ایک بار پھر اسے اپنی بیوی کی بات ماننا پڑی۔ اس کی بیوی نے خود کلاک دیوار سے اتارا اخبار میں لپیٹا اور کرنل کے بازوؤں میں تھما دیا۔ "چالیس پیسوز کے بغیر گھر مت واپس آنا" اس نے کہا۔ کرنل بنڈل کو بغل میں لئے درزی کی دکان کی سمت روانہ ہو گیا۔ آگستین کے ساتھی، اس نے دیکھا، دکان کی دہلیز کے باہر بیٹھے تھے۔

ان میں سے ایک نے کرنل کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ کرنل نے جواب دیا کہ اس کا زیادہ دیر وہاں رکنے کا ارادہ نہیں تھا۔ دکان کے اندر ایک تار پر لنن کا ایک گیلا ٹکڑا سکھانے کی خاطر لٹکا ہوا تھا۔ آلوارو دکان

سے باہر آیا۔ وہ دبلے مگر بے لوچ جسم والا لڑکا تھا جس کی آنکھوں میں وحشت سی تھی۔ اس نے بھی کرنل کو بیٹھنے کو کہا۔ کرنل کے دل کو تھوڑا سا قرار محسوس ہوا سٹول کو تھوڑا سا جھکا کر دروازے کے ڈھانچے کے ساتھ ٹیک لگا کر وہ بیٹھ گیا اور منتظر رہا کہ آلوارو کو فرصت ہو تاکہ وہ علیحدگی میں اس سے بات کر سکے یکدم اسے احساس ہوا کہ وہ بہت سارے تاثر و جذبات سے عاری چہروں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔

"میں تمہارے کام میں مخل تو نہیں ہو رہا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

انہوں نے جواب دیا "نہیں" اور ان میں سے ایک لڑکے سنے آگے جھک کر نیچی، تقریباً ناقابل سماعت آواز میں اسے کہا: "آگستین کا نوشتہ ملا ہے"۔

کرنل نے اجاڑ سڑک پر نظر دوڑائی اور پوچھا: "کیا لکھا ہے؟"

"کوئی نئی بات نہیں" لڑکے نے کہا اور خفیہ اخبار کرنل کے ہاتھ میں دے دیا۔ کرنل نے اسے اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ دیر تک خاموش رہا اور انگلیوں سے بنڈل کو کھٹکھٹانے کے کھیل میں لگ گیا حتیٰ کہ ایک کارندے کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی۔ مشوش ہو کر کرنل نے بنڈل سے کھیلنا بند کر دیا۔

"اس میں کیا ہے، کرنل؟" خرنان نے پوچھا۔ کرنل نے خرنان کی تیز، عقاب کی سی آنکھوں سے آنکھیں ملانے سے گریز کیا۔

"کچھ نہیں۔ جرمن کے پاس کلاک مرمت کے لئے لے جا رہا تھا" کرنل نے جھوٹ بولا۔

"دیوانے ہوئے ہو، کرنل؟" خرنان نے بنڈل کرنل کے ہاتھ سے لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے دو، میں اسے ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں" لیکن کرنل نے بنڈل پکڑے رکھا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ مگر جھوٹ کے سبب اس کی پلکوں کا رنگ بینگنی ہو گیا۔ باقیوں نے بھی اصرار کیا:

"اسے دیکھ لینے دو، کرنل، خرنان پرزوں مشینوں کا ماہر ہے"۔

"میں خواہ مخواہ کی تکلیف نہیں دینا چاہتا" کرنل نے کہا۔

"تکلیف کیسی؟ خرنان نے حجت کی اور کلاک اٹھا لیا "جرمن تم سے دس پیسوز دھر والے گا اور کلاک ویسے کا ویسا ہی رہے گا"۔

کلاک کو تھامے خرنان دکان کے اندر چلا گیا۔ آلوارو مشین پر سلائی میں مصروف تھا۔ دکان کے عقب میں دیوار پر ٹنگی ہوئی گٹار کے نیچے ایک لڑکی قمیض پر بٹن ٹانکنے میں مشغول تھی۔ گٹار کے اوپر سائن نصب تھا "یہاں سیاسی گفتگو کرنا منع ہے" باہر بیٹھے بیٹھے کرنل کو اپنا جسم بالکل بے مصرف لگا۔ اپنے پاؤں اٹھا کر اس نے سٹول میں نصب سلاخ پر رکھ دیئے۔

"خدا تمہیں غارت کرے، کرنل"

کرنل بوکھلا گیا "گالیاں دینے کی کیا ضرورت ہے ؟" اس نے کہا

الفانسو نے ناک پر اپنی عینک ٹھیک سے سجائی اور کرنل کے جوتوں کا معائنہ کرنے لگا۔ "تمہارے جوتوں کے بارے میں کہا ہے۔ یہ مردود جوتے کہاں سے لیے تم نے ؟"

"گالیاں دیئے بغیر بھی تم یہ سب کچھ کہہ سکتے ہو" کرنل نے کہا اور الفانسو کو اپنے نقلی چمڑے کے جوتوں کے تلے دکھائے۔ "یہ مخروط روزگار جوتے چالیس سال پرانے ہیں لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار گالیاں کھائی ہیں۔"

"میں ہو گیا" دکان کے اندر سے جرنان نے نعرہ لگایا اور ساتھ ہی کلاک نے گھنٹہ بجایا۔ ساتھ والے گھر سے ایک عورت نے دیوار پر مکے مارے اور چلا کر کہا "کلاک بجانا چھوڑ دو، آگستین کے سوگ کا برس ابھی پورا نہیں ہوا۔"

درزی کے کارندوں میں سے ایک نے زور کا قہقہہ لگایا اور کہا: "یہ کلاک ہے، گٹار نہیں۔"

جرنان بنڈل لے کر دکان سے باہر آگیا "کوئی ایسی مشکل خرابی نہیں تھی۔ جرنان نے کہا "اگر چاہو تو تمہارے گھر چل کر کلاک کی سطح بھی برابر کر دوں ؟"

کرنل نے جرنان کی پیشکش کو قبول نہ کیا۔

"کتنے پیسے دوں ؟"

"فکر مت کرو، کرنل" جرنان نے باقیوں کی صف میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔ "تمہارا مرغا سب قرضوں کی ادائیگیاں کر دے گا۔"

کرنل کو اب وہ موقع ملا جس کی اسے تلاش تھی۔ "میں تمہارے ساتھ ایک سودا کرتا ہوں" اس نے کہا

"کیسا سودا ؟"

"میں مرغا تمہیں دیے دیتا ہوں" کرنل نے چہروں کے نیم دائرے کو دیکھا "وہ تم سب کی ملکیت میں ہوگا" اس نے کہا۔

جرنان نے پریشان ہو کر کرنل کو دیکھا۔

"میری عمر اب مرغے لڑانے کی نہیں رہی" کرنل نے اپنا بیان جاری رکھا اور اپنی آواز میں وثوق اور سنجیدگی کا تاثر پیدا کیا: "یہ بہت کڑی ذمہ داری ہے۔ کئی روز سے مجھے لگ رہا ہے جیسے مرغا قریب المرگ ہے۔"

"کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں، کرنل" الفانسو نے کہا "اس کے پر جھڑ رہے ہیں، اس کے پروں میں بخار ہو گیا ہوگا۔"

"اگلے ماہ تک ٹھیک ہو جائے گا" جرنان نے تسلی دی۔

"میں اب اس کی رکھوالی نہیں کرنا چاہتا" جرنان نے دوررس نظر سے کرنل کو دیکھا۔

"اصل معاملہ تو نہیں معلوم ہے، کرنل" خزاں نے اصرار کیا۔ "تمہارا فرض ہے کہ اس کے مرغے کو تم اپنے ہاتھوں سے لڑائی کے احاطے میں چھوڑو۔"

کرنل نے اس بات پر غور کیا۔ "مجھے معلوم ہے۔ اسی لئے اب تک میں اس کی رکھوالی بھی کرتا آیا ہوں۔" اس نے دانتوں کو مضبوطی سے بند کیا۔ وہ اس موضوع پر مزید بات کر سکتا تھا۔

"وقت یہ ہے کہ لڑائی میں ابھی دو مہینے باقی ہیں" کرنل نے کہا۔

خزاں اصل بات سمجھ گیا۔ "اگر صرف یہی وقت ہے تو اس کا حل آسانی سے مل سکتا ہے۔" اس نے کہا۔ اس نے اپنی ترکیب بتائی جسے اس کے ساتھیوں نے بھی قبول کر لیا۔ شام کو جب کرنل بنڈل تھامے گھر واپس آیا تو اس کی بیوی کو اسے دیکھ کر سخت طیش آیا: "کچھ بھی نہیں ملا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں" کرنل نے جواب دیا۔ "لیکن اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ لڑکوں نے مرغے کی خوراک کا ذمہ لے لیا ہے۔"

"ٹھہرو دوست، میں تمہیں اپنی چیزیں دیئے دیتا ہوں۔"

ساباس نے دفتر کی دیوار میں نصب الماری کھولی۔ اندر بے ترتیب چیزوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ گھوڑ سواری کے جوتے، رکابیں، لگامیں اور المونیم کی بالٹی میں مہمیزیں۔ اوپر ایک زنانہ اور آدھی درجن مردانہ چھتریاں لٹک رہی تھیں۔ کرنل کے ذہن میں کسی آسمانی آفت کے بعد شہر کے ملبے کا نقشہ ابھر آیا۔

"شکریہ دوست" کرنل نے کھڑکی میں جھک کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا: "میں بارش کے تھمنے کا انتظار کروں گا۔" ساباس نے الماری کے پٹ کھلے رہنے دیئے۔ بجلی کے پنکھے کی ہوا کے رخ میں وہ جا کر ڈیسک پر بیٹھ گیا۔ تب اس نے دراز میں سے روئی میں لپٹی ہوئی ایک سرنج نکالی۔

کرنل بارش میں بھیگتے ہوئے مجبور سے بادام کے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سہ پہر سنسان تھی

"اس کھڑکی سے بارش مختلف لگتی ہے" کرنل نے کہا "جیسے بارش کسی دوسرے شہر میں ہو رہی ہو۔"

"بارش ہر جگہ سے بارش ہی لگتی ہے۔" ساباس نے جواب دیا۔ اس نے سرنج اور سوئی کو دے کے شیشے کی سطح پر رکھے پانی میں ابلنے کے لئے ڈال دیا۔" یہ سارا قصبہ ہی متعفن ہے۔" اس نے اضافہ کیا۔

کرنل نے اپنے کندھے اچکائے اور چلتا ہوا کمرے کے درمیان تک آ گیا۔ کمرے کے فرش پر سبز ٹائلیں لگی تھیں اور فرنیچر شوخ رنگ کے کپڑوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کمرے کے عقب میں بے ترتیبی کے عالم میں، نمک اور شہد کے چھتوں کے تھیلے اور کاٹھیاں پڑی تھیں۔ ساباس کرنل کو خالی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"اگر میں تمہاری جگہ ہوں تو اس قصبے کے بارے میں یوں نہ سوچوں" کرنل نے کہا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سکون کے ساتھ ڈیسک کے اوپر جھکے شخص کو گھورنے لگا۔ ساباس چھوٹے سے قد کا نہایت موٹا آدمی تھا جس کے جسم کا گوشت پلپلا تھا اور تھل تھل کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے مینڈک جیسی اداسی اور بے بسی

جھلکتی تھی۔

کرنل کو مخاطب کر کے ساباس نے کہا: "کسی ڈاکٹر سے معائنہ کروالو۔ کفن دفن کے دن کے بعد سے تم کچھ اداس لگ رہے ہو۔"

کرنل نے اپنا چہرہ اٹھایا اور کہا: "نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

ساباس سرنج کے ابلنے کا منتظر تھا۔ "کاش میں اپنے بارے میں بھی یہ کہہ سکتا" اس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "تم خوش قسمت آدمی ہو۔ تمہارا معدہ فولاد کا بنا لگتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھوں کی بالوں بھری جلد کو دیکھنے لگا جس پر جگہ جگہ کالے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ شادی کے چھلے والی انگلی میں اس نے چھلے کے ساتھ ایک کالے نگ والی انگوٹھی بھی پہن رکھی تھی۔

"ہاں وہ تو ہے۔" کرنل نے تسلیم کیا۔

دفتر اور گھر کے درمیانی دروازے میں سے ساباس نے اپنی بیوی کو آواز دی اور کرنل کو اپنی غذا کی تفصیلات کی پر درد داستان سنانے لگ گیا۔ اپنی جیب سے اس نے ایک بوتل نکالی اور اس میں سے مٹر کے دانے جتنی سفید گولی نکال کر ڈیسک پر رکھ دی۔

"ہر جگہ اس دوائی کو ساتھ لئے پھرنا بہت بیزاری کا کام ہے۔" ساباس نے کہا۔ "یہ ایسے ہی ہے جیسے آدمی موت کو اپنی جیب میں لئے پھرتا ہو۔"

کرنل ڈیسک کے قریب آیا اور گولی کو اپنی ہتھیلی میں رکھ کر اس کا معائنہ کیا۔ ساباس نے اسے گولی چکھنے کی دعوت دی۔

"یہ کافی کو میٹھا کرنے کے لئے ہے۔ ہے تو یہ شکر مگر شکر کے بالکل بغیر ہے۔" ساباس نے کہا۔

"واقعی۔" کرنل کے منہ میں بھاری سی مٹھاس کا مزا تھا۔ "یہ ایسے ہی ہے جیسے آدمی گھنٹیوں کے بغیر گھنٹیوں کی آواز پیدا کرے۔"

بیوی سے ٹیکہ لگوانے کے بعد ساباس نے اپنی کہنیاں ڈیسک پر ٹکا لیں اور ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ کر بیٹھ گیا۔ کرنل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے جسم کے ساتھ کیا کرے۔

ساباس کی بیوی نے پنکھے کا سوئچ نکال کر پنکھے کو تجوری کے اوپر رکھ دیا اور الماری کی طرف چل دی۔

"چھتریوں کا موت کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔

کرنل نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ وہ چار بجے ڈاک دیکھنے کی خاطر گھر سے نکلا تھا مگر بارش نے اسے ساباس کے دفتر میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے لانچوں کی سیٹی کی آواز سنائی دی مگر بارش بدستور جاری تھی۔

"ہر ایک کا خیال ہے کہ موت عورت ہوتی ہے" سا باس کی بیوی نے بات جاری رکھی۔ وہ فربہ عورت تھی مگر اس کا قد اپنے خاوند کے قد سے نکلتا ہوا تھا۔ اس کے اوپر کے ہونٹ پر ایک موٹا سا تل تھا جس پر بال اُگے ہوئے تھے۔ اس کی گفتگو کے انداز سے آدمی کو بجلی کے پنکھے کی بھنبھناہٹ کا دھوکا ہوتا تھا۔ "لیکن میں نہیں سمجھتی کہ موت عورت ہے" اس نے الماری کے پٹ بند کر دیئے اور کرنل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی: "میرا خیال ہے کہ موت ایسا جانور ہے جس کے پنجے ہوتے ہیں۔"

"ممکن ہے" کرنل نے اعتراف کیا: "بعض اوقات بہت عجیب و غریب باتیں ہوتی ہیں۔" کرنل نے پوسٹ ماسٹر کے بارے میں سوچا جو موم جامے کا لبادہ اوڑھے لانچ پر کود نے والا ہوگا۔ کرنل کو اپنا وکیل تبدیل کیے ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اب تک وہ جواب کا مستحق ہو گیا تھا۔ سا باس کی بیوی موت کے بارے میں باتیں کرتی رہی حتیٰ کہ اسے اندازہ ہوا کہ کرنل کے چہرے پر غیر حاضر ہونے کی علامت تھی۔

"دوست" اس نے کرنل سے کہا "تم پریشان لگتے ہو!"

کرنل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"درست ہے، دوست" اس نے جواب دیا "میں سوچ رہا تھا کہ پانچ بج رہے ہیں اور مرغے کے ٹیکے کا ابھی انتظام نہیں ہو سکا۔"

سا باس کی بیوی پریشان ہو گئی۔

"مرغے کے ٹیکے؟ جیسے وہ کوئی انسان ہو! سخت ناپاکی کی بات ہے۔"

سا باس اب اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اپنا غصے سے تمتاتا ہوا چہرہ اٹھا کر بولا: "تم ایک منٹ کے لئے اپنا منہ بند رکھ سکتی ہو؟" اس حکم سے ڈر کر اس کی بیوی نے واقعتاً اپنا منہ ڈھانپنے کو ہاتھ اٹھا لیا۔ "پچھلے آدھ گھنٹے سے تم میرے دوست کا دماغ چاٹ رہی ہو۔"

"نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں" کرنل نے احتجاج کیا۔

سا باس کی بیوی گھر کے اندر چلی گئی اور اس نے زور سے دروازہ بند کر لیا۔ لیونڈر میں تر رومال سے سا باس نے اپنی گردن کا پسینہ پونچھا۔ کرنل اٹھ کر کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ لمبی ٹانگوں والا ایک مرغا خالی پلازا میں ایک طرف سے چلتا ہوا دوسری طرف جا رہا تھا۔

"کیا مرغے کو واقعی ٹیکے لگ رہے ہیں؟" سا باس نے پوچھا۔

"ہاں" کرنل نے کہا "لڑائی کے لئے اس کی مشق اگلے ہفتے سے شروع ہو گی۔"

"پاگل پن ہے" سا باس نے کہا "یہ سب کچھ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔"

"صحیح ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرغے کی گردن مروڑ دی جائے۔"

"تمہاری خواہ مخواہ کی ہٹ دھرمی ہے" سا باس نے کھڑکی کی جانب مڑتے ہوئے دیکھا۔ کرنل نے

اسے دھونکنی کی طرح آہ بھرتے ہوئے سُنا۔ اپنے دوست کی آنکھوں پر اسے بے حد رحم آتا تھا۔

"ابھی میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں۔" کرنل نے جواب دیا۔

"نا سمجھی کی بات نہ کرو" ساباس نے زور دیا اگر مرغے کو بیچ دو تو تمہارا دوہرا فائدہ ہے۔ ایک تو سر دردی سے نجات ملے گی اور دوسرے نو سو پیسوز جیب میں آئیں گے۔"

"نو سو پیسوز!" کرنل زور سے بولا۔ اس نے اپنے ذہن میں نو سو پیسوز کا تصور باندھا۔

"تمہارا خیال ہے کہ ایک مرغے کی خاطر لوگ اتنی دولت خرچ کرنے کو تیار ہو سکتے ہیں؟"

"خیال ہی نہیں" ساباس نے جواب دیا۔ "مکمل یقین ہے۔"

انقلاب کا خزانہ واپس کرنے کے بعد سے آج پہلی بار کرنل کے ذہن میں اتنی بڑی رقم کا خیال آیا تھا۔ ساباس کے دفتر سے نکلتے وقت اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھا، مگر اُسے یقین تھا کہ یہ مروڑ موسم کے باعث نہ تھا۔ ڈاک گھر پہنچ کر وہ سیدھا پوسٹ ماسٹر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"مجھے آج ایک بہت ارجنٹ خط کی توقع ہے۔ ایر میل سے آیا ہوگا۔" کرنل نے کہا۔

پوسٹ ماسٹر نے خانوں میں دیکھا۔ خطوں کے نام پتے پڑھ کر اس نے انہیں مناسب خانوں میں واپس رکھ دیا۔ لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولا۔ اپنے ہاتھ جھاڑ کر اس نے معنی خیز نظروں سے کرنل کو دیکھا۔

"آج اس خط کو یقیناً آنا چاہیئے تھا۔" کرنل نے کہا۔

پوسٹ ماسٹر نے کندھے اچکائے اور کہا: "صرف موت ہی ایسی چیز ہے جو یقیناً آتی ہے، کرنل۔"

کرنل گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے مکی کے دلیے کی تھالی اس کے سامنے رکھ دی۔ رُک رُک کر، خاموشی سے کرنل کھاتا رہا۔ اس کے مقابل بیٹھی اس کی بیوی کو احساس ہوا کہ کرنل کے چہرے پر کچھ تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں اس ملازم کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا کام ہمارے پنشن کے کاغذ تیار کرنا ہے۔" کرنل نے جھوٹ تراشا۔ "اگلے پچاس برس میں ہم تو اطمینان سے چھ فٹ مٹی کے نیچے سو رہے ہوں گے مگر وہ غریب آدمی ابھی تک پرمنٹ پنشن کے انتظار میں ہر جمعے کو ہلکان ہوتا رہے گا۔"

"یہ بُرا شگون ہے۔" اس کی بیوی نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی قسمت پر قناعت کرتے جا رہے ہو۔" وہ دلیا کھاتی رہی لیکن ایک لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کا خاوند اس سے بہت دور سوچوں میں کھویا ہوا ہے۔

"کم از کم اپنا کھانا تو اطمینان سے کھاؤ۔"

"ہاں مزے کا ہے۔" کرنل نے کہا "مکی کہاں سے آئی تھی؟"

"مرغے سے" اس کی بیوی نے جواب دیا۔ "لڑکے اس کے لئے اتنی زیادہ لے آئے تھے کہ اس

نے دافر کی باٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ زندگی کا کاروبار ایسا ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" کرنل نے آہ بھر کر کہا "دنیا کی تمام ایجادوں میں سے زندگی سب سے بہتر ایجاد ہے۔"

اس نے چولہے کی ٹانگ کے ساتھ بندھے مرغے کو دیکھا۔ اس بار مرغا اسے پہلے سے مختلف لگا۔

اس کی بیوی مرغے کو گھور رہی تھی۔

"آج دوپہر کو مجھے بچوں کو ڈنڈے لگا کر گھر سے نکالنا پڑا۔ وہ ایک بوڑھی مرغی کو مرغے سے میل کرانے لائے تھے۔" اس نے کہا۔

"کوئی نئی بات نہیں" کرنل نے کہا "کرنل اوریلیانو آمدیا کے ساتھ بھی چھوٹے قصبوں میں یہی ہوتا تھا۔ لوگ اپنی لڑکیاں اس سے میل کرانے لایا کرتے تھے۔"

کرنل کی بیوی یہ قصہ سن کر بہت محظوظ ہوئی۔ مرغے نے اپنے گلے میں سے آواز نکالی جو کرنل اور اس کی بیوی کو انسانی کلام کی طرح لگی۔ "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے یہ جانور ابھی باتیں کرنا شروع کر دے گا۔" کرنل کی بیوی نے کہا۔ کرنل نے دوبارہ مرغے کی جانب دیکھا۔

"وہ سونے میں تولنے کے لائق ہے۔" اس نے کہا۔ کرنل نے منہ زبانی کچھ ہندسے جمع تفریق کئے اور کھانا کھاتے ہوئے بولا: "مجھے توقع ہے کہ یہ مرغا ہماری تین سال کی خوراک کا انتظام کرے گا۔"

"توقع سے پیٹ تو نہیں بھر سکتا۔" اس کی بیوی نے کہا۔

"نہ سہی مگر آدمی کی ہمت تو قائم رہتی ہے۔" کرنل نے جواب دیا۔ "میرے دوست سابا کی حیرت انگیز گولیوں کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔"

اس رات نو سو کے ہندسے کو دماغ سے نکال پھینکنے کی کشمکش کے باعث کرنل کو ٹھیک سے نیند نہ آ سکی۔ دوسرے روز دوپہر کو اس کی بیوی نے مکئی کا دلیہ دو رکابیوں میں ڈالا اور اپنے حصے کے دلیے کو سر جھکا کر کھانے لگی۔ کرنل کو یوں لگا جیسے اس کی بیوی کی غمگینی کا سایہ خود اس پر بھی پڑنا شروع ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں"

کرنل نے سوچا اب اس کی بیوی کی جھوٹ بولنے کی باری تھی۔ اس نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی مگر اس کی کیفیت میں تبدیلی نہ آ سکی۔

"کوئی ایسی خاص بات نہیں" اس کی بیوی نے کہا "میں سوچ رہی تھی کہ موسیقار کو مرے دو ماہ ہو چلے ہیں اور میں ابھی تک اس کے خاندان کے پاس تعزیت کے لئے نہیں جا سکی۔"

لہذا اس شام وہ مرحوم کے گھر گئی۔ کرنل اسے وہاں چھوڑ کر خود لاؤڈ سپیکر سے سنائی دینے والی موسیقی کی جانب کھنچا چلا سینما گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ پادری اینجل اپنے دفتر کے باہر سینما گھر کے دروازے سے

کو گھور رہا تھا تاکہ اسے پتہ چل سکے کہ بستی میں سے کون کون بارہ گھنٹیوں کی تنبیہ کے باوجود فلم دیکھنے سے باز نہیں رہ سکا تھا۔ روشنی کے سیلاب، کرخت موسیقی اور بچوں کے شور و غل کے باعث اس علاقے کی فضا لوگوں کے لطف میں مانع لگتی تھی۔ ایک چھوٹے سے لڑکے نے اپنی جھوٹ موٹ کی بندوق سے کرنل کو مارنے کی دھمکی دی اور رعب دار آواز میں پوچھا "مرنے کے بارے میں کیا خبر ہے، کرنل؟"

کرنل نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور کہا "ابھی موجود ہے۔"

فلم گھر کے سامنے کی دیوار پر چار رنگوں کا بڑا سا "آدھی رات کی کنواری دوشیزہ" کا اشتہار چسپاں تھا۔ اشتہار میں ایک عورت نے شام کا ڈھیلا ڈھالا گاؤن پہن رکھا تھا اور اس کی ایک ٹانگ ران تک ننگی تھی۔ کرنل فلم گھر کے پڑوس میں گھومتا پھرتا رہا حتیٰ کہ اسے دور سے بادل گرجنے کی آواز سنائی دی اور بجلی کی چمک نظر آئی۔ تب وہ اپنی بیوی کو لینے روانہ ہوگیا۔

اس کی بیوی موسیقار کے گھر پر نہ تھی، نہ ہی وہ اپنے گھر پہنچی تھی۔ کرنل کا کلاک رکا ہوا تھا مگر اس نے اندازہ لگایا کہ کرفیو شروع ہونے میں تھوڑا وقت ہی باقی تھا۔ گھر میں بیٹھ کر وہ اپنی بیوی کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ بارش کا طوفان آہستہ آہستہ قصبے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ تیار ہو کر دوبارہ باہر جانے والا ہی تھا کہ اس کی بیوی گھر میں داخل ہوئی۔

وہ مرغے کو سونے کے کمرے میں لے گیا۔ اس کی بیوی نے اپنے کپڑے تبدیل کئے اور بیٹھنے کے کمرے میں پانی کے چند گھونٹ پینے گئی۔ کرنل نے اسی وقت کلاک کو چابی دی تھی اور اب کرفیو کے بگل کا منتظر تھا تاکہ کلاک کی سوئیاں وقت کے مطابق کر سکے۔

"تم کہاں گئی تھیں؟" اس نے بیوی سے پوچھا۔

"اِدھر اُدھر پھر رہی تھی" اس نے جواب دیا۔ گلاس کو اس نے گھڑونچی پر رکھ دیا اور اپنے خاوند کی طرف دیکھے بغیر سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ "کسے توقع تھی کہ بارشیں اتنی جلدی پھر شروع ہو جائیں گی۔" اس نے کہا مگر کرنل نے اس بارے میں کوئی رائےزنی نہ کی جب کرفیو کا بگل بجا تو کرنل نے کلاک کو گیارہ بجے پر لگایا، کلاک کے تختے بند کئے اور کرسی کو اٹھا کر اس کی مناسب جگہ پر رکھ دیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی تسبیح پڑھنے میں مصروف ہے۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟" کرنل نے کہا۔

"کیا؟"

"تم کہاں گئی تھیں؟"

"وہیں بیٹھی باتیں کر رہی تھی" اس نے کہا "اتنی دیر کے بعد تو گھر سے باہر قدم رکھا تھا۔"

کرنل نے اپنے جھولنے والے بستر کو لٹکایا۔ گھر کو کنڈی لگائی اور کمرے میں دوائی چھڑکی۔ تب اس نے

لیمپ کو فرش پہ رکھ دیا اور بستر میں لیٹ گیا۔

"مجھے معلوم ہے" کرنل نے اداسی کے ساتھ کہا: "برے حالات انسان کو جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔"

کرنل کی بیوی نے آہ بھری۔

"میں پادری اینجل کے پاس گئی تھی۔ اس سے اپنی شادی کی انگوٹھی کے بدلے قرض مانگنے۔"

"کیا کہا اس نے؟"

"مقدس چیزوں کا لین دین کرنا گناہ ہے۔"

مچھر دانی کے اندر سے اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ "دو روز ہوئے ہیں میں نے کلاک کو بیچنے کا سوچا تھا مگر اس کا کوئی بھی خواہشمند نہیں ہے۔ سب لوگ قسطوں پہ نئے چمکتے ہندسوں اور سوئیوں والے کلاک خرید رہے ہیں۔ ان میں اندھیرے میں بھی وقت نظر آ جاتا ہے۔"

کرنل کے ذہن نے تسلیم کیا کہ چالیس برس کی رفاقت، بھوک اور تکلیف میں حصہ داری نے بھی اس کی اپنی بیوی کو پوری طرح سمجھنے میں مدد نہیں کی تھی۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے ان کی ایک دوسرے کے لئے چاہت بھی بال خوردہ ہوتی جا رہی تھی۔

"تصویر خریدنے کو بھی کوئی تیار نہیں ہے۔" کرنل کی بیوی نے کہا۔ "ہر ایک کے پاس یہی تصویر پہلے سے موجود ہے حتیٰ کہ ترک نے بھی انکار کر دیا۔"

کرنل کو یہ بات ناگوار گزری۔

"اب تو ہر ایک کو پتہ چل گیا ہوگا کہ ہم فاقوں مر رہے ہیں۔" اس نے کہا

"میں تو تھک گئی ہوں" اس کی بیوی نے کہا "مردوں کو گھر گرہستی کی الجھنوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا، کئی بار مجھے ہنڈیوں میں پتھر ابالنے پڑے ہیں تاکہ ہمسایوں کو یہ نہ پتہ چل سکے کہ اس گھر میں کھانا نہیں پکتا۔"

کرنل کی خودداری کو اس بات سے ٹھیس پہنچی۔

"یہ تو ذلت کی بات ہے۔"

اس کی بیوی مچھر دانی میں سے نکل کر کرنل کے بستر کے پاس پہنچ گئی۔ "میری طرف سے یہ سمجھ رکھو کہ اس گھر میں ظاہر داری اور بناوٹ سے کام نہیں چلے گا۔" اس نے کہا۔ اس کی آواز غصے سے غضبناک ہونا شروع ہو گئی۔ "تمہاری قناعت پسندی اور ظاہری بناوٹ سے میں عاجز آ چکی ہوں۔"

کرنل نے مطلق جنبش نہ کی۔

"تم نے بیس سال تک لوگوں کے الیکشنوں پہ کئے ہوئے سہانے وعدوں کے پورا ہونے کا انتظار کیا ہے۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس سے ہمیں کیا ملا ہے؟ ایک مردہ بیٹے کے علاوہ کیا ملا ہے؟"

کرنل اپنی بیوی کے اس قسم کے طعنوں سے واقف تھا۔

"ہم نے اپنا فرض پورا کیا تھا" کرنل نے کہا

"اور انہوں نے اپنا فرض پورا کیا تھا۔ بیس سال تک سینیٹ سے ہر مہینے ہزار پیسوز کی تنخواہ وصول کر کے" اس کی بیوی نے جواب دیا۔ "میرے عزیز دوست سابا س کا حال دیکھ لو۔ اس کا گھر دو منزلہ ہے لیکن اس کی ساری دولت کو رکھنے کے لئے وہ بھی کافی نہیں ہے۔ جب اس قصبے میں آیا تھا تو گلے میں سانپ لٹکائے دوائیاں بیچا کرتا تھا۔"

"وہ بیچارہ ذیابیطس کے ہاتھوں مر رہا ہے۔" کرنل نے کہا

"اور تم بھوک کے ہاتھوں مر رہے ہو۔" اس کی بیوی نے کہا۔ "اب تک تمہیں علم ہو جانا چاہیئے تھا کہ اپنی اکڑ اور خالی شان سے تم اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے۔"

بجلی کی چمک نے اس کا سلسلہ کلام منقطع کر دیا۔ کڑکتی بجلی سڑک پر گر کر بم کی طرح پھٹی اور کمرے میں داخل ہو کر بستر کے نیچے سے ایسے گزری جیسے پتھر لڑھک رہے ہوں۔ کرنل کی بیوی نے لپک کر مچھر دانی میں سے اپنی تسبیح اٹھائی

کرنل ہنسا۔

"اپنی زبان قابو میں نہیں رکھو گی تو تمہارے ساتھ ایسا ہی ہوگا۔" اس نے کہا "تبھی میں کہتا ہوں کہ خدا میری حمایت کرتا ہے۔"

لیکن حقیقت میں وہ شدید تلخی محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے لیمپ بجھا دیا اور اس اندھیرے میں جو بجلی کی چمک سے بار بار چاک ہو رہا تھا، گہری سوچوں میں ڈوب گیا۔ اسے کئی برس پہلے کا ماکوندو کا قصبہ یاد آیا۔ نیرلانڈیا کے مقام پر کئے ہوئے وعدوں کے پورا ہونے کے انتظار میں کرنل کو دس برس گزر چکے تھے ایک روز دوپہر کی غنودگی میں اس نے ایک پیلی، گرد آلود ریل گاڑی کو قصبے میں داخل ہوتے دیکھی، گاڑی کے ڈبوں کے اندر، باہر حتیٰ کہ چھتوں پر بھی مرد، عورتیں اور جانور لدے ہوئے تھے یہ لوگ شہر میں کیلوں کی نصل سے کمائی کی دیوانگی کے سبب وارد ہو رہے تھے

چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر نو واردوں نے اس قصبے کو ... سب کے اندر ... بدل دیا تھا۔ "مجھے اب اس جگہ سے کوچ کرنا پڑے گا" کرنل نے اس وقت اپنے آپ سے کہا تھا ... پر سڑتے ہوئے کیلوں کی ڈھیری انتڑیاں کاٹ رہی ہے" بدھ کے روز ... کو ... دو بجکر اٹھارہ منٹ پر کرنل نے ماکوندو کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا تھا۔ ... کے بعد کرنل کو پوری طرح اندازہ ہوا تھا کہ نیرلانڈیا میں اطاعت قبول کرنے کے ... اب تک ایک لمحے کو سکون بھی نصیب نہیں ہو سکا تھا۔

کرنل نے آنکھیں کھولیں۔

"لیکن اب اس بارے میں زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہے" اس نے کہا

"کس بارے میں؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"مرغے کے بارے میں" کرنل نے کہا۔ "کل میں مرغے کو ساباس کے ہاتھ نو سو پیسوں کے بدلے فروخت کر دوں گا۔"

غصّی جانوروں کی چیخوں میں شامل ساباس کی چیخ و پکار دفتر کی کھڑکی میں سے اندر آ رہی تھی۔ اگر ساباس اگلے دس منٹوں میں اندر نہ آیا تو میں یہاں سے چل دوں گا، کرنل نے دو گھنٹے کے انتظار کے بعد اپنے آپ سے عہد کیا۔ لیکن اس نے مزید بیس منٹ اس کا انتظار کیا۔ کرنل اٹھ کر چلنے کو تیار تھا جب ساباس کارکنوں کے غول کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ کئی بار وہ کرنل کی طرف توجہ کئے بغیر اس کے سامنے اور پیچھے سے گزرا۔

"میرا انتظار کر رہے ہو، دوست؟" آخر اس نے پوچھا

"ہاں، دوست" کرنل نے کہا "لیکن اگر تم مصروف ہو تو میں پھر کبھی حاضر ہو جاؤں گا۔"

دروازے کے عقب سے کرنل ساباس کا جواب نہ سن سکا۔

"میں ابھی آتا ہوں" ساباس نے کہا۔

دوپہر کی گرمی دم گھونٹنے والی تھی۔ سڑک کی روشنی سے دفتر تمتما رہا تھا۔ گرمی کی کسالت سے کرنل نے بلا ارادہ آنکھیں بند کر لیں اور فوراً ہی اپنی بیوی کے بارے میں خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ ساباس کی بیوی دبے پاؤں چلتی ہوئی دفتر میں داخل ہوئی۔

"سپے تک آنکھیں بند رکھو" اس نے کہا۔ "میں کھڑکی کے پردے گرانے آئی تھی۔ دفتر جہنم کی طرح تپ رہا ہے۔"

کرنل خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پردے گرانے کے بعد کمرے کے اندھیرے میں سے ساباس کی بیوی نے کرنل سے پوچھا:

"کیا تم اکثر خواب دیکھتے ہو؟"

"کبھی کبھی" کرنل نے جواب دیا۔ ساباس کے دفتر میں اونگھنے کے باعث وہ پشیماں سا تھا۔

"میں ایک ہی خواب دیکھتا ہوں کہ مکڑی کے جالوں میں پھنستا جا رہا ہوں۔"

"مجھے ہر رات ڈراؤنے خواب آتے ہیں" ساباس کی بیوی نے کہا "میرے دماغ میں یہی بات سمائی ہوئی ہے کہ کسی طرح خواب میں آنے والے لوگوں کے بارے میں پتہ کیا جائے کہ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔"

اس نے بجلی کا پنکھا چلا دیا۔ "پچھلے ہفتے میں نے خواب میں ایک عورت کو دیکھا جو میرے سرہانے کھڑی تھی۔ میں نے اسے پوچھ ہی لیا کہ وہ کون تھی۔ اس نے کہا میں وہ عورت ہوں جو بارہ برس پہلے اسی کمرے میں فوت ہوئی تھی۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس گھر کو بنے مشکل سے دو برس ہوئے ہوں گے" کرنل نے کہا

"صحیح ہے" ساباس کی بیوی نے جواب دیا۔ "پتہ یہ چلا کہ مردے بھی حساب میں غلطیاں کر جاتے ہیں"

پنکھے کی بھنبھناہٹ سے کمرے کا اندھیرا اور گہرا لگنے لگا تھا۔ ساباس کی بیوی خوابوں سے ہٹ کر اب آواگون کے مسئلے پر اظہار خیال کر رہی تھی۔ اپنی غنودگی اور اس عورت کی بے تکی گفتگو سے کرنل بے چین ہو رہا تھا۔ وہ گفتگو میں تھوڑا سا وقفہ پڑنے کا منتظر تھا تاکہ رخصت کی اجازت چاہے۔ لیکن ساباس اپنے نورین کے ہمراہ دفتر میں داخل ہو گیا۔

"تمہارا سوپ میں چار دفعہ گرم کر چکی ہوں" اس کی بیوی نے اُسے کہا۔

"چاہے دس دفعہ گرم کر لو لیکن اس وقت میرا سر کھا چھوڑ دو" ساباس نے جواب دیا۔

ساباس نے تجوری کھول کر نورین کو نوٹوں کا ایک بنڈل اور کاغذ پر رقم ہدایات پکڑائیں۔ نورین کھڑکی کا پردہ ہٹا کر روشنی میں نوٹ گننے لگ گیا۔ ساباس نے دفتر کے عقب میں کرنل کو بیٹھے دیکھا مگر کوئی تاثر ظاہر نہ کیا۔ جس وقت ساباس اور نورین دوبارہ دفتر سے باہر جانے والے تھے کرنل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازہ کھولنے سے قبل ساباس رُکا۔

"میں تمہاری کیا خدمت کروں کرنل؟"

کرنل نے دیکھا کہ نورین اسے گھور رہا تھا۔

"کوئی خدمت نہیں۔ میں تم سے صرف بات کرنا چاہتا تھا" کرنل نے کہا۔

"تو جلدی سے کہو، مجھے ایک منٹ کی فرصت بھی نہیں ہے" ساباس نے کہا اور دروازے کے دستے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ کرنل کو اپنی زندگی کے پانچ طویل ترین سیکنڈ گزرنے کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے دانت بھینچ لئے۔

"مرغے کے بارے میں پوچھنا تھا" وہ بڑبڑایا۔

اب تک ساباس دروازہ کھول چکا تھا۔ ہنستے ہوئے اس نے نورین کو باہر دھکیلا اور کرنل کا فقرہ دہرایا "میرے سر پہ آسمان گرنے والا ہے اور میرا عزیز دوست کرنل مرغے کے بارے میں پریشان ہے"۔ تب اس نے کرنل کو مخاطب کر کے کہا:

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی آتا ہوں"۔

کرنل دفتر کے وسط میں بے حس و حرکت کھڑا رہا حتیٰ کہ اسے دونوں آدمیوں کے پاؤں کی چاپ ہال کے

اخیر میں پہنچ کر سنائی دینی بند ہو گئی. تب وہ دفتر سے باہر نکلا اور قصبے میں گشت کرنے لگا جہاں اتوار کے تیلوے کے باعث زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی. درزی کی دکان پر کوئی نہ تھا. ڈاکٹر کا دفتر بند تھا حتیٰ کہ شامی کی دکان کے تختوں پر پڑے مال کی حفاظت کرنے کو بھی کوئی موجود نہ تھا. دریا کولاد کی چادر جیسا لگ رہا تھا. تیل کے چار ڈرموں پر ایک آدمی اپنا چہرہ ہیٹ سے ڈھانپے سویا ہوا تھا. کرنل کو لگا جیسے سارے شہر میں وہی متحرک تھا. وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا.

اس کی بیوی دوپہر کا کھانا سامنے رکھے اس کی منتظر تھی.

"یہ ساری خوراک میں نے ادھار پر لی ہے. کل پیسے دینے کا وعدہ کر کے" اس نے وضاحت کی. کھانا کھانے کے دوران کرنل نے اپنی بیوی کو پچھلے تین گھنٹوں کا ماجرا سنایا. وہ بے چینی کے ساتھ اس کی روداد ختم ہونے کا انتظار کرتی رہی.

"تمہارے ساتھ دقت یہ ہے کہ تم میں کردار نام کو بھی نہیں ہے" وہ آخر کار بولی "لوگوں کے سامنے تم اپنے آپ کو ایسے پیش کرتے ہو جیسے ان سے خیرات مانگنے لگے ہو جبکہ تمہیں سر اٹھا کر بات کرنی چاہیے. سابا س کو ایک طرف لے جا کر اس سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ سکتے کہ "دوست، میں نے مرغا تمہیں بیچنے کا فیصلہ کر لیا ہے، ؟"

"تمہارے حساب سے تو دنیا کا کوئی کام بھی دشوار نہیں ہے." کرنل نے کہا.

کرنل کی بیوی توانائی سے بھرپور تھی. صبح صبح اس نے گھر کو صاف کیا تھا اور اپنا حلیہ عجیب وغریب بنا رکھا تھا. اس نے کرنل کے پرانے جوتے پہنے ہوئے تھے اور کمر کے گرد موم جامے کا جھاڑن باندھ رکھا تھا. بالوں پر جو کپڑے کی دھجی اس نے باندھی ہوئی تھی اس میں کانوں کے اوپر دونوں جانب گانٹھیں دی ہوئی تھیں. "تم میں کاروبار کی عقل بالکل بھی نہیں ہے" اس نے کرنل سے کہا "چیز بیچتے وقت آدمی کے چہرے پر وہی کیفیت ہونی چاہیے جو خریدتے وقت ہوتی ہے."

"تم نے جو اپنی شکل بنا رکھی ہے، اسے قائم رکھنا" کرنل نے ہنستے ہوئے اپنی بیوی کی بات کاٹی "تم کویکر اوٹس کے ڈبے پر بنے ہوئے آدمی کی طرح لگ رہی ہو."

کرنل کی بیوی نے سر سے کپڑے کی دھجی اتار پھینکی.

"میں سنجیدگی سے بات کر رہی ہوں" اس نے کہا "میں مرغے کو سابا س کے پاس لے کر جا رہی ہوں جتنی رقم کی چاہو شرط لگا لو، آدھ گھنٹے میں اس سے نو سو پیسو لے کر آجاؤں گی."

"تمہارا دماغ چل گیا ہے" کرنل نے اسے کہا. "ابھی سے تم مرغے کی قیمت سے شرطیں بدنے لگی ہو"

بہت مشکل سے کرنل نے اپنی بیوی کو سابا س کے ہاں جانے سے باز رکھا. کرنل کی بیوی نے ساری صبح اپنے ذہن میں اگلے تین برس کے اخراجات کا تخمینہ لگانے میں صرف کی تھی. کم از کم اگلے تین برس وہ ہر جمعہ

کی مسلسل کونت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے گھر کے لئے اشد ضرورت کی چیزوں کی فہرست بنالی تھی جس میں کرنل کے لئے جوتوں کا نیا جوڑا بھی شامل تھا۔ سونے کے کمرے میں نیا آئینہ لٹکانے کے لئے اُس نے جگہ کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ اپنے منصوبوں کی وقتی شکست سے وہ پشیمان اور آزردہ ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ جا کر سو رہی۔ جب وہ اٹھی تو کرنل آنگن میں بیٹھا ہوا تھا۔

"اب تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں۔" کرنل نے جواب دیا۔

"تب تو ہمارے سارے مسائل سمجھو حل ہو گئے۔ اگلے پچاس برس تک ہم مرغے کی رقم حاصل کرنے کی توقع رکھ سکتے ہیں۔" لیکن حقیقت میں کرنل اسی شام مرغے کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اسے ساباس کا خیال آیا جو اس وقت اکیلا پنکھے کے آگے بیٹھا اپنا روز کا ٹیکہ لگوانے کی تیاری کر رہا ہوگا۔ کرنل نے سوچ لیا تھا کہ وہ ساباس سے کیا کہنا چاہتا تھا۔

"مرغے کو بھی ساتھ لے جاؤ" کرنل کی بیوی نے اُسے مشورہ دیا۔ "اسے جیتا جاگتا اپنے سامنے دیکھ کر ساباس پر حیرت انگیز اثر ہوگا۔"

کرنل نے مرغے کو اپنے ساتھ لے جانے پر اعتراض کیا۔ مایوس مگر مضطرب، اس کی بیوی اس کے ہمراہ چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔

"دفتر میں پوری فوج بھی موجود ہو تو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں" اس نے کہا۔ "تم ساباس کو بازو سے پکڑ لینا اور اس وقت تک نہ چھوڑنا جب تک وہ نو سو پیسوز تمہارے حوالے نہ کر دے۔"

"ایسا لگے گا جیسے میں اس کا خزانہ لوٹنے آیا ہوں۔"

کرنل کی بیوی نے اس فقرے پر دھیان نہ دیا۔

"بس یہ یاد رکھنا کہ تم مرغے کے مالک ہو" اس نے کہا۔ "اور تم ساباس پر احسان کر رہے ہو۔"

"اچھا۔"

ساباس ڈاکٹر کے ہمراہ سونے کے کمرے میں تھا۔ "اب موقع ہے" ساباس کی بیوی نے کرنل سے کہا۔ "ڈاکٹر اسے تین چار روز کے سفر کے لئے تیار کر رہا ہے۔ ساباس اب کا گیا جمعرات کو واپس لوٹے گا۔" کرنل کے ذہن میں دو متضاد قوتوں میں جنگ جاری تھی۔ مرغے کو بیچ دینے کے عزم کے باوجود وہ سوچ رہا تھا کہ اچھا ہوتا اگر وہ ایک آدھ گھنٹہ دیر سے ساباس کے ہاں پہنچا ہوتا اور اس سے ملاقات نہ کر سکتا۔

"میں انتظار کر سکتا ہوں۔"

لیکن ساباس کی بیوی اسے اندر بھیجنے پر مُصر رہی۔ ساباس اپنے تخت جیسے بستر پہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے صرف انڈر ویئر پہن رکھا تھا اور اس کی بے رنگ آنکھیں ڈاکٹر کے چہرے پر جمی تھیں۔ ڈاکٹر نے ساباس

کے پیشاب کا نمونہ شیشے کی نالی میں گرم کیا. اس کی بو کو سونگھا اور اثبات میں سر ہلایا. کرنل اس سارے عمل کے ختم ہونے کا منتظر رہا.

"اسے گولی سے ہی ختم کرنا پڑے گا" ڈاکٹر نے کرنل کی طرف دیکھ کر کہا "ذیابیطس امیر آدمیوں کو ختم کرنے میں بہت دیر لگاتی ہے."

"تمہارے انسولین کے ملعون ٹیکوں نے خامی کمی پوری کر دی ہے." ساباس نے کہا اور اپنے کولہوں کے بل تھوڑا سا اوپر اٹھا. "لیکن مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہے." پھر اس نے کرنل کو دیکھ کر کہا. "آجاؤ، دوست، دوپہر کو جب میں تمہیں دیکھنے گیا تو تم کیا تمہاری ٹوپی بھی کہیں نظر نہیں آئی."

"میں پہنتا ہی نہیں تاکہ ہر ایک کے سامنے سر سے اتارنی نہ پڑے."

ساباس نے کپڑے پہننے شروع کر دیئے. ڈاکٹر نے ساباس کے خون کے نمونے والی شیشے کی ٹیوب اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالی اور اپنے بیگ میں چیزوں کو ترتیب سے رکھا. کرنل نے سوچا ڈاکٹر وہاں سے روانہ ہونے والا ہے.

"میں تمہاری جگہ ہوں تو اپنے دوست کو ایک لاکھ پیسوز کا بل بھیج دوں." کرنل نے ڈاکٹر کو مخاطب کر کے کہا. "اتنی رقم جانے سے ساباس کی پریشانی بہت حد تک کم ہو جائے گی."

"میں پہلے ہی اسے ایک کروڑ پیسوز کا بل بھیجنے کی تجویز دے چکا ہوں." ڈاکٹر نے کہا "ذیابیطس کا غربت سے بہتر کوئی علاج نہیں ہے."

"تجویز کا شکریہ" ساباس نے اپنا ضخیم پیٹ گھوڑ سواری کی تنگ پتلون کے اندر سکیڑتے ہوئے کہا. "لیکن تمہیں امارت کے عذاب سے بچانے کی خاطر میں اسے قبول نہیں کر سکتا." ڈاکٹر ہنسا اور اسے اپنے چرمی تھیلے کے چمکدار تالے کی سطح پر اپنے دانتوں کا عکس دکھائی دیا. بے صبری دکھائے بغیر ڈاکٹر نے کلاک کی طرف دیکھا بوٹ چڑھاتے وقت ساباس نے اچانک کرنل سے بات کی:

"تو دوست، مرغے کا کیا بن رہا ہے؟"

کرنل نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر بھی اس کے جواب کا متوقع تھا. اس نے اپنے دانت سختی سے بند کیے.

"کچھ نہیں بن رہا." کرنل نے کہا "میں تمہارے پاس اس کا سودا کرنے آیا ہوں."

ساباس بوٹ پہن چکا تھا.

"ٹھیک ہے." اس نے کسی جذبے کے بغیر جواب دیا. "نہایت معقول بات ہے."

"میری عمر اب پیچیدگیوں میں پڑنے کی نہیں رہی." ڈاکٹر کے چہرے پہ ناقابل بیان قسم کا تاثر دیکھ کر کرنل نے جواز ڈھونڈا: "میری عمر بیس سال کم ہوتی تو اور بات تھی."

"کرنل، تمہاری عمر ہمیشہ بیس سال کم ہی رہے گی." ڈاکٹر نے جواب دیا.

کرنل کے حواس کچھ بحال ہوئے۔ وہ ساباس کے مزید بات کرنے کا منتظر رہا مگر ساباس کچھ نہ بولا۔ وہ اپنی چمڑے کی زپ والی جیکٹ پہن کر کمرے سے باہر جانے کو تیار تھا۔

"اگر تم چاہو تو ہم اگلے ہفتے اس بارے میں پھر بات کر سکتے ہیں" کرنل نے کہا۔

"ہاں میں بھی یہ کہنے والا تھا۔ ایک خریدار میری نظر میں ہے جو مرغے کے چار سو پیسوز دے گا لیکن تمہیں جمعرات تک انتظار کرنا پڑے گا۔" ساباس نے کہا۔

"کتنے پیسوز؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"چار سو"

"مجھے تو پتہ چلا تھا کہ مرغے کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"تم نے خود نو سو پیسوز کا ذکر کیا تھا" کرنل نے کہا۔ ڈاکٹر کی حیرت سے کرنل کی حوصلہ افزائی ہو گئی تھی۔ "سارے علاقے میں وہ سب سے بہتر مرغا ہے"۔

ساباس نے ڈاکٹر کو مخاطب کر کے کہا:

"کوئی اور وقت ہوتا تو اس کے ہزار پیسوز بھی مل جاتے" ساباس نے وضاحت کی "مگر اتنے قیمتی مرغے کو کوئی نہیں لڑواتا۔ لڑائی میں یہ خطرہ ہمیشہ رہتا ہے کہ مرغا چوٹوں سے جانبر نہ ہو سکے گا اور اسے گولی مارنی پڑے گی"۔ تب ساباس نے کرنل کی طرف بناوٹی مایوسی سے دیکھا اور کہا۔

"دوست میں تمہیں یہی بتانا چاہتا تھا"

کرنل نے سر ہلایا اور کہا "ٹھیک ہے"

ساباس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کرنل ہال میں آگیا۔ ڈاکٹر بیٹھنے کے کمرے میں ساباس کی بیوی سے مصروف گفتگو رہا جو اس سے ان کیفیتوں کا علاج دریافت کر رہی تھی جو بقول اس کے آدمی پر اچانک وارد ہو جاتی ہیں اور جن کے بارے میں آدمی کو علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا ہیں۔

کرنل دفتر میں بیٹھ کر ڈاکٹر کا انتظار کرتا رہا۔ ساباس نے تجوری کو کھولا، اپنی تمام جیبیں نوٹوں سے بھریں اور چار نوٹ کرنل کی طرف بڑھا دیئے۔

"یہ لو، یہ ساٹھ پیسوز ہیں، دوست" اس نے کہا "باقی کا حساب مرغا بکنے پر چکا دوں گا"

کرنل اور ڈاکٹر دریا کے کنارے چلتے ہوئے سٹالوں کے سامنے سے گزرے۔ لبعد دوپہر کی خنکی کے باعث بازار میں رونق شروع ہو گئی تھی۔ گنوں سے لدا ہوا ایک بجرا پانی کے بہاؤ کے رُخ آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ کرنل نے ڈاکٹر کو غیر معمولی طور پر اپنے خیالوں میں گم پایا۔

"اور تمہارا کیا حال ہے، ڈاکٹر؟" کرنل نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اپنے کندھے اچکائے۔

"ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔" اس نے کہا۔ —— "میرا خیال ہے مجھے بھی کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہئے۔"

"سردی تمام تکلیفات کی جڑ ہے۔" کرنل نے کہا "مجھے اندر سے گھن کی طرح کھا گئی ہے۔" ڈاکٹر نے کسی پیشہ ورانہ دلچسپی کے بغیر کرنل کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے یکے بعد دیگرے شامیوں سے جو اپنے اپنے سٹالوں پر بیٹھے تھے، دعا سلام کی۔ ڈاکٹر کے دفتر کے دروازے پر پہنچنے پر کرنل نے مرغے کی فروخت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا

"اس کو بیچنا لازمی ہو گیا تھا" کرنل نے توضیح کی "اب تو انسانوں کا گوشت اس جانور کی غذا بن گیا تھا۔"

"جس جانور کی غذا انسانوں کا گوشت ہے وہ تو ساباس ہے" ڈاکٹر نے کہا: "مجھے معلوم ہے وہ تم سے چار سو پیسوز میں خرید کر مرغے کو نو سو میں بیچ دے گا۔"

"سو تمہارا یہ خیال ہے!"

"خیال نہیں مجھے پکا یقین ہے۔ یہ سوا ساباس کے لئے اتنا ہی نفع بخش ہے جتنا اس کا میئر کے ساتھ حب الوطنی کے جذبے میں کیا ہوا مشہور و معروف معاہدہ تھا۔"

کرنل نے ڈاکٹر کی بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ "مگر میرا خیال ہے وہ معاہدہ تو اس نے اپنی جان کے خوف سے کیا تھا۔" کرنل نے کہا۔ "وہ معاہدہ نہ کرتا تو اس قصبے میں نہ رہ سکتا۔"

"ہاں، اور نہ ہی اپنے ساتھیوں کی جنہیں میئر نے نکال باہر کیا تھا، زمینیں آدھی قیمت پر خرید سکتا۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ڈاکٹر کو اپنی جیب میں سے تالے کی چابی نہیں ملی، اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کرنل سے کہا:

"اتنے بے عقل مت بنو، کرنل، ساباس کو پیسہ اپنی جان سے کہیں زیادہ ہے۔"

اس رات کرنل کی بیوی خریداری کرنے کی خاطر بازار گئی۔ شامیوں کے سٹالوں تک کرنل بھی اس کے ہمراہ گیا۔ سارے راستے وہ ڈاکٹر کے انکشافات پر غور کرتا رہا۔

"لڑکوں کو تلاش کر کے انہیں بتا دو کہ مرغا بک گیا ہے؟" اس کی بیوی نے کہا "انہیں خواہ مخواہ امید دلانے سے کیا فائدہ؟"

"مرغا اس وقت تک نہیں بکے گا جب تک ساباس واپس نہیں آجاتا" کرنل نے جواب دیا۔ کرنل کو آلوارو دکھائی دیا جو بلیرڈ ہال میں رولٹ پر جوا کھیل رہا تھا۔ گرمی کے سبب اس اتوار کی رات بلیرڈ ہال تپ رہا تھا۔ ریڈیو سے نکلنے والی تیز آوازوں کے ارتعاش سے گرمی اور بھی شدید ہو گئی تھی۔ بڑے سے موم جامے پر لکھے ہوئے ہندسے سامنے، میز کے اوپر، عین درمیان میں رکھی ہوئی تیل کی لالٹین کی روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ کرنل ان ہندسوں کو پڑھ پڑھ کر اپنا جی خوش کرتا رہا۔ آلوارو ہر بار تئیس کے ہندسے پر پیسے لگا کر ہار رہا تھا۔ اس کے شانے کے پیچھے سے کرنل کھیل کا مشاہدہ کرتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ پچھلی نو دفعہ کے گھمانے میں

گیارہ کا ہندسہ چار بار ظاہر ہوا تھا۔

"گیارہ نمبر پر رقم لگاؤ" کرنل نے آلوارَد کے کان میں کہا "سب سے زیادہ بار گیارہ نمبر ہی نکلا ہے۔

آلوارَد نے میز کو غور سے دیکھا۔ اگلی باری پر اس نے پیسے نہیں لگائے۔ اپنی پتلون کی جیب سے اس نے کچھ نقدی اور ایک کاغذ کا پرزہ نکالا۔ پرزے کو اس نے میز کے نیچے سے کرنل کے حوالے کر دیا

"آگستین کا نوشتہ ہے"، اس نے کہا۔

کرنل نے خفیہ خط اپنی جیب میں ڈال لیا۔ آلوارَد نے گیارہ نمبر پر خاصی بڑی رقم لگا دی۔

"تھوڑے پیسوں سے شروع کرو" کرنل نے اسے مشورہ دیا۔

"کیا پتہ ہے گیارہ نمبر کے بارے میں تمہارا قیاس درست ہو" آلوارَد نے جواب دیا۔ دوسرے بہت سے جواریوں نے بھی اور نمبروں سے رقمیں اٹھا کر گیارہ نمبر پر لگا دیں حالانکہ رنگدار پہیے نے گھومنا شروع کر دیا تھا۔ کرنل نے اپنے آپ کو مجبور اور مظلوم محسوس کیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے جوئے کی اصل کشش اور اضطراب اور تلخی کا احساس ہوا تھا۔

اس بار گیند پانچ نمبر پر رک گیا۔

"مجھے افسوس ہے" کرنل نے احساس جرم اور شرمندگی سے بے اختیار ہو کر آلوارَد سے کہا لیکن اس کی نظریں اس جھاپی پر لگی ہوئی تھیں جس سے میز پر سے آلوارَد کی لگائی ہوئی رقم سمیٹی جا رہی تھی۔ "جس بات سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ اس میں مجھے ٹانگ نہیں اڑانی چاہیئے تھی"

کرنل کو دیکھے بغیر آلوارَد نے ہنس کر کہا:

"کوئی پرواہ نہیں کرنل، سب چلتا ہے"

امبو بجاتے ہوئے بگل یکدم خاموش ہو گئے۔ جوئے کے کھلاڑی اپنے ہاتھ ہوا میں اٹھائے تتر بتر ہو گئے۔ کرنل کو اپنے عقب میں بندوق کا گھوڑا چڑھائے جانے کی واضح اور کرخت اور بے حس آواز سنائی دی۔ اپنا یقینی انجام اس پر یکلخت آشکار ہوا۔ پولیس کے چھاپے میں وہ خفیہ اخبار رکھنے کے جرم میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے بغیر کرنل مڑا۔ پہلی بار اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے، بالکل نزدیک، وہ شخص کھڑا تھا جس نے اس کے بیٹے کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ اس شخص کا چہرہ کرنل کے مقابل تھا اور اس کی بندوق کی نالی کا رُخ کرنل کے پیٹ کی طرف تھا۔ وہ چھوٹے سے قد کا، انڈین خدوخال والا آدمی تھا جس کے جسم کی کھال نے دنیا کا گرم سرد چکھا تھا اور جس کے سانس سے ایسی بو آ رہی تھی جیسے بچوں کے سانس سے آتی ہے۔ کرنل نے اپنے دانت کچکچائے اور آہستگی سے بندوق کی نالی کا رخ اپنی انگلیوں سے موڑ کر دوسری جانب کر دیا۔

"گستاخی معاف" کرنل نے کہا۔

کرنل کا سامنا دو چمگادڑ کی سی گول گول آنکھوں سے ہوا۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے ان آنکھوں سے اس کے جسم کو نگل لیا ہو، جیسے انہوں نے اسے کھول کر، ہضم کر کے یکدم باہر نکال پھینکا ہو۔

"تم جا سکتے ہو، کرنل"

یہ بتانے کے لئے کہ باہر دسمبر کا مہینہ تھا کرنل کو کھڑکی کھولنے کی ضرورت نہ تھی۔ باورچی خانے میں بیٹھا جب وہ مرغے کے لئے پھل کاٹ رہا تھا، اُسے اپنی ہڈیوں میں دسمبر کے وجود کا احساس ہوا۔ تب اس نے دروازہ کھولا۔ دالان کی سمت ایک نظر دیکھنے سے اس کے احساس کی تصدیق ہوگئی۔ گھاس، درختوں اور ڈبے جیسے غسل خانے کو دیکھتے ہوئے جو زمین سے ایک ملی میٹر اوپر تیرتا لگتا تھا، اسے یقین ہوا کہ اس کا دالان حیرت انگیز اور انوکھا تھا۔

کرنل کی بیوی نو بجے تک بستر میں دراز رہی۔ جس وقت وہ باورچی خانے میں داخل ہوئی اس وقت تک کرنل گھر کی صفائی کر چکا تھا اور مرغے کے اردگرد دائرہ بنا کر بیٹھے ہوئے بچوں سے باتوں میں مشغول تھا۔ اس کی بیوی کو لمبا چکر کاٹ کر چولہے کی جانب جانا پڑا۔

"رستے سے ہٹ جاؤ" اس نے ڈانٹا اور قہر آلود نظروں سے مرغے کو دیکھا "پتہ نہیں اس منحوس پرندے سے کب چھٹکارا حاصل ہوگا؟"

کرنل نے اپنی بیوی کی ذہنی کیفیت اور مرغے کے تعلق اس کے رویّے پر غور کیا۔ مرغے سے اس کی خفگی بے جا تھی۔ مرغا لڑائی کی تربیت کے لیے تیار تھا، اس کی گردن، جامنی پروں والی ٹانگیں اور آری کے دندانوں والی کلغی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کا بدن چھریرا ہوگیا تھا اور اس کے انداز سے لاپروائی ٹپکتی تھی۔

"کھڑکی سے باہر دیکھو اور مرغے کے بارے میں پریشان ہونا چھوڑ دو" کرنل نے بچوں کے رخصت ہونے کے بعد اپنی بیوی سے کہا: "ایسی صبح ہے کہ آدمی کا تصویر کھنچوانے کو جی چاہتا ہے"

اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا مگر اس کے چہرے پر کوئی جذبہ رونما نہ ہوا۔ چولہے کی طرف لوٹتے ہوئے اس نے کہا: "گلاب کی قلمیں لگانے کا وقت آگیا ہے" کرنل نے شیو بنانے کی خاطر آئینہ دیوار پر لٹکایا۔

"گلاب لگانے کو جی چاہ رہا ہے تو لگالو" کرنل نے کہا۔

وہ شیشے میں ظاہر ہونے والی شکل سے اپنی شکل کا موازنہ کر رہا تھا۔

"مگر سؤر گلابوں کو کھا جاتے ہیں" اس کی بیوی نے کہا۔

"اور بھی اچھی بات ہے۔ گلابوں پر پلے ہوئے سؤر زیادہ مزیدار ہونے چاہئیں" کرنل نے کہا۔

اس نے آئینے کے ایک کونے میں سے اپنی بیوی کو دیکھا۔ اس کی شکل پر بیزاری کا تاثر ابھی موجود تھا۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھے بغیر، اپنی بیوی پر نظریں جمائے، وہ ہمیشہ کی طرح چہرے پر ہاتھ پھیر پھیر

کر شیو بناتا رہا۔

"لیکن میں گلاب نہیں اگانا چاہتی"۔ اس کی بیوی نے کہا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔ نہ اگاؤ" کرنل نے جواب دیا۔

کرنل کی طبیعت ٹھیک تھی۔ دسمبر نے اس کی انتڑیوں میں اگنے والے نباتات کو سکیٹر دیا تھا۔ صبح اسے نئے جوتے پہننے میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کئی دفعہ کوشش کرنے کے بعد جب ا سے یقین ہو گیا کہ وہ وقت ضائع کر رہا ہے تو بالآخر اس نے اپنے پرانے، نقلی چمڑے کے جوتے ہی چڑھا لئے۔ اس کی بیوی نے اس کے لباس میں اس نمایاں تبدیلی کو محسوس کر لیا۔

"نئے جوتے نہیں پہنو گے تو وہ کبھی کاٹنا بند نہیں کریں گے"۔ اس نے کہا۔

"یہ جوتے تو کسی ایسے لنگڑے کے لئے بنے ہیں جس نے کہیں آنا جانا نہ ہو" کرنل نے احتجاج کیا "لوگوں کو چاہیئے کہ ایسے جوتے بیچا کریں جو ایک ماہ تک استعمال کئے جا چکے ہوں"۔

اس دوپہر خط کی آمد کے خیال نے کرنل کو اکسایا اور وہ گلی میں نکل آیا۔ لانچوں کے آنے میں ابھی دیر تھی اس لئے وہ ساباس کے دفتر میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا رہا۔ اسے بتایا گیا کہ ساباس سوموار سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ اپنے منصوبوں میں اس رکاوٹ کے باوجود کرنل نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جب وہ بندرگاہ کی طرف جا رہا تھا تو اس نے اپنے آپ سے کہا "دیر سویر کبھی تو اس نے واپس آنا ہی ہے"۔ یہ لمحہ اس کی زندگی کا حیرت انگیز لمحہ تھا جس میں اس کی ہوشمندی سالم اور بے داغ تھی۔

"دسمبر کو سارا مہینہ سال چلنا چاہیئے" موسیٰ شامی کی دکان میں بیٹھے اس نے آہستگی سے کہا:
"آدمی کو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کانچ کا بنا ہوا ہو"۔

موسیٰ کو یہ تصور اپنی بھولی بسری عربی میں ترجمہ کرنے میں محنت کرنا پڑی۔ وہ نہایت حلیم الطبع مشرقی تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کانوں تک اس کے جسم پر ہموار کھنچی ہوئی کھال کا غلاف چڑھا ہوا ہو، اور اس کی حرکات کسی ڈوبتے شخص کی حرکات کی طرح کڈھب تھیں۔ بلکہ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے اسے ابھی کھینچ کر پانی سے باہر نکالا گیا ہو۔

"پہلے مجھے بھی یوں ہی لگتا تھا" اس نے کہا "وہی حال رہتا تو میری عمر اس وقت آٹھ سو ستانوے سال کی ہوتی۔ تمہاری کیا عمر ہے؟"

"پچھتر سال" کرنل نے جواب دیا۔ اس کی آنکھیں پوسٹ ماسٹر کا پیچھا کرنے میں مصروف تھیں۔ دفعتاً اس کی نظر سرکس کے ساز و سامان پر پڑی۔ ڈاک والی لانچ کی چھت پر بہت سی رنگدار چیزوں کے درمیان سرکس کا پیوند لگا خیمہ رکھا تھا۔ کرنل کی نظروں سے ایک لمحے کے لئے، جب وہ دوسری لانچوں

پر اوپر نیچے رکھے ڈبوں میں بند جنگلی جانوروں کو ڈھونڈ رہا تھا، پوسٹ ماسٹر اوجھل ہو گیا۔ جانور کرنل کو نظر نہ آسکے۔

"یہ تو سرکس ہے!" کرنل نے کہا "دس برسوں میں یہ پہلی سرکس اس قصبے میں آئی ہے۔"

موسیٰ شامی نے کرنل کے خیال کی تصدیق کی۔ ملی جلی عربی اور ہسپانوی زبان میں اس نے اپنی بیوی سے بات کی جس نے سٹور کے عقب سے اسے جواب دیا۔ تب اس نے اپنے آپ سے کچھ کہا اور پھر اپنی پریشانی کا ترجمہ کر کے کرنل کو بتایا۔

"اگر تم نے بلی پالی ہوئی ہے تو کچھ روز اسے چھپائے رکھو ورنہ لڑکے اسے چوری کر کے سرکس والوں کے ہاتھ بیچ دیں گے۔" کرنل اٹھ کر پوسٹ ماسٹر کے تعاقب میں روانہ ہونے والا تھا۔

"یہ جنگلی جانوروں کا تماشا تو نہیں ہے۔" اس نے موسیٰ سے کہا۔

"اس سے فرق نہیں پڑتا" شامی نے جواب دیا۔ "رسّے پر چلنے والے بازی گر بلیاں کھاتے ہیں۔ تاکہ ان کی اپنی ہڈیاں بھی لوچدار ہو جائیں اور ٹوٹیں نہیں۔"

ساحل پر سٹالوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کرنل پوسٹ ماسٹر کے تعاقب میں پلازا تک آ پہنچا۔ وہاں اسے ایسے شور کی آواز سنائی دی جو خاص مرغوں کی لڑائی برپا ہوتا ہے وہ متعجب ہوا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص نے اس سے اس کے مرغے کے بارے میں کچھ کہا، تب اسے یاد آیا کہ وہ دن لڑنے والے مرغوں کی آزمائش اور جانچ پرکھ کا دن تھا۔

وہ ڈاک خانے کے سامنے سے گزر کر آگے چلا گیا۔ کچھ لمحوں بعد وہ مرغوں کی لڑائی کے احاطے کے پرآشوب ماحول میں کھو چکا تھا۔ اس کی نظر اپنے مرغے پر پڑی جو میدان میں اکیلا اور بے حفاظت کھڑا تھا۔ اس کے پنجوں پر کپڑے کی دھجیاں بندھی ہوئی تھیں اور اس کے کانپتے پاؤں سے اس کا خوفزدہ ہونا ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کا مدمقابل خاکستری رنگ کا غمگین صورت مرغا تھا۔

کرنل نے کسی قسم کے جذبے کا اظہار نہ کیا۔ مرغ یکے بعد دیگرے ایک دوسرے پہ ایک ہی طریق سے حملہ آور ہوئے۔ لوگوں کی پُرجوش داد و تحسین کے دوران مرغوں کے پَر، پنجے اور گردنیں چند لمحوں کے لئے برسرپیکار ہوئیں۔ کرنل کے مرغے کے مدمقابل نے لڑائی کے احاطے کی دیوار کے ساتھ ٹکرانے پر ایک قلابازی لگائی لیکن واپس آ کر دوبارہ حملہ آور ہوا۔ کرنل کے مرغے نے اس کے حملوں کا جواب حملوں سے نہ دیا بلکہ صرف مدافعت میں مصروف رہا اور اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اب اس کے پاؤں نے کانپنا بند کر دیا تھا۔

خرنان دیوار پھلانگ کر احاطے کے اندر آ گیا۔ اس نے مرغے کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر چاروں جانب مجمع کے سامنے اس کی نمائش کی۔ لوگوں نے دیوانہ وار تحسین کے نعرے بلند کئے۔ کرنل کو لوگوں کی داد کے رولے اور مرغوں کی لڑائی کے انتشار میں بے پناہ تفاوت کا احساس ہوا۔ اسے ایسے لگا جیسے جو کچھ بھی

انس، ابھی اس کے سامنے ہوا تھا ڈھونگ تھا ایسا ڈھونگ جس میں دونوں مرغے خود بالارادہ اور شعور
سے شریک تھے۔ تقریباً حقارت آمیز تجسس سے مجبور ہو کر کرنل نے لڑائی کے گول احاطے میں جا کر
لوگوں کا پرجوش مجمع اوپر کے سٹالوں سے گرتا پڑتا نیچے احاطے کی طرف آرہا تھا۔ کرنل نے ان پرجوش، پر
آرزو مند اور مکمل طور پر زندہ دجاوید چہروں کی ابتری کا مشاہدہ کیا۔ وہ ان سب لوگوں سے ناآشنا تھا
کے تمام باشندے نئے لگ رہے تھے۔ ایک انجانے خوف کے ساتھ کرنل ایک ایسے لمحے سے
گزرا جو اس کے لاشعور سے محو ہو چکا تھا۔ تب وہ دیوار پھلانگ کر بھرے مجمع میں سے راستہ بناتا ہوا
گزرا، درمیان جا پہنچا اور حیران کی پرسکون آنکھوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آنکھیں جھپکائے بغیر وہ
احاطے دو سرے کو دیکھتے رہے۔

دونوں ایک دوسرے کو خوش آمدید کہا۔

خرنان نے اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کے سلام کا آہستگی سے جواب دیا۔ اس کے بعد وہ کچھ
کرنل نے جسم کے گرم اور گہرے ارتعاش سے خود وحشت زدہ تھا، جیسے اس نے زندگی
نہ بولا کیونکہ جاندار چیز کو ہاتھوں میں پکڑا ہو۔

میں پہلی مرتبہ تو،" خرنان نے جھینپ کر کہا۔

"تم گھر بڑھ جائے" تحسین نے خرنان کو بات آگے نہ بڑھانے دی۔ کرنل ڈر گیا تھا اور کسی کی
ایک بغل میں دبائے، لوگوں کے نعروں سے چکرایا ہوا مجمع میں سے راستہ بنا کر گلی میں
طرف دیکھا

سکول کے بچوں کی معیت میں جاتے ہوئے اسے دیکھنے کو پورا قصبہ جو زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگوں
پر مشتمل تھا، امڈ آیا تھا۔ چوک کے کونے پر ایک دیو قامت نیگرو میز پر کھڑا ہو کر، سانپ گلے میں لپیٹے
لائسنس کے بغیر دوائیاں بیچنے میں مصروف تھا۔ بندرگاہ سے واپس آتے ہوئے چند لوگ اس کے
ارد گرد کھڑے ہو کر اس کے قصوں کو سن رہے تھے۔ لیکن جب مرغا اُٹھائے ہوئے کرنل ان کے پاس
سے گزرا تو ان سب کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ گھر کا راستہ کرنل کو کبھی اتنا طویل نہیں لگا تھا

لیکن ان سب واقعات پر کرنل کو کوئی تاسف نہ ہوا۔ اس کا قصبہ دس برس کی تاریخ کی دست
برد کا شکار ہو کر عرصہ دراز سے بے ہوشی کی نیند سو رہا تھا۔ اس دوپہر، خط کے بغیر ایک جمعہ کی دوپہر
کو لوگ جاگ اٹھے تھے۔ کرنل کو ایک اور زمانے کی یاد آئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹے کے ہمراہ
ایک بڑی سی چھتری کے تلے بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے اور وہ تماشہ بارش کے باوجود جاری ہے۔ پارٹی
کے لیڈر نہایت احتیاط کے ساتھ بنے سنورے، اس کے گھر کے دالان میں بجتے ہوئے بینڈ کی موسیقی
کی لے پر اپنے آپ کو پنکھا کرتے ہوئے اس کی نظروں کے آگے سے گزر رہے۔ بینڈ کے ڈھول کی

گہری دھمک کی اذیت وہ گونج کو اس نے اپنی انتڑیوں میں تقریباً ایک بار پھر محسوس کیا ساحل کے متوازی سڑک پر ہجوم کو دیکھنے پر بھی کرنل کو بہت سال پہلے کے الیکشن کے اتوار کا دھوکہ ہوا۔ لوگ ادھر ادھر کھڑے سرکس کے سامان کو لانچوں سے اترتے دیکھ رہے تھے۔ ایک خیمے کے اندر سے کسی عورت نے مرغے کے بارے میں چیخ کر کچھ کہا۔ اپنے آپ میں گم، کرنل گھر کی طرف رواں رہا، سارے راستے اسے اکا دکا آوازیں سنائی دیتی رہیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے مرغوں کی لڑائی کے احاطے کے نعرے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ گھر پہنچ کر وہ لڑکوں سے مخاطب ہوا:

"اب تم سب گھر جاؤ" اس نے کہا "جو کوئی اندر آیا اس کی چمڑی ادھیڑ دی جائے گی۔"

اس نے دروازہ بند کیا اور سیدھا باورچی خانے میں چلا گیا۔ اس کی بیوی سونے کے کمرے سے نکلی، رونے سے اس کا دم گھٹا ہوا تھا۔

"وہ زبردستی اسے لے گئے تھے" اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "میں نے انہیں کہا بھی تھا کہ جب تک میں ہوں، مرغا اس گھر سے باہر نہیں جائے گا" کرنل نے مرغے کو چولہے کی ٹانگ کے ساتھ باندھ دیا اور اس کا پانی بدلا۔ اس سارے وقفے میں اس کی بیوی کی غضبناک آواز اس کا پیچھا کرتی رہی۔

"انہوں نے کہا وہ مرغے کو بچانے کی خاطر ہمیں جان سے بھی مار سکتے ہیں۔ مرغا ہمارا نہیں ہے، سارے قصبے کا ہے"

مرغے کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد ہی کرنل نے اپنی بیوی کے اینٹھے ہوئے چہرے کی طرف توجہ دی، اس پر انکشاف ہوا کہ اس کی حالت دیکھ کر نہ اسے افسوس ہوا تھا اور نہ ہی اسے اس پر ترس آیا تھا۔ اس انکشاف پر اسے قطعاً تعجب نہ ہوا۔

"انہوں نے ٹھیک کیا تھا" اس نے نرمی سے کہا۔ پھر اپنی جیبوں میں کچھ تلاش کرتے ہوئے اس نے اپنی آواز میں گمبیر مٹھاس پیدا کر کے کہا "مرغا بیچنے کے لئے نہیں ہے"۔

اس کی بیوی اس کے پیچھے چلتی ہوئی سونے کے کمرے تک آئی۔ اسے لگا جیسے وہ سینما کے پردے پر اس کی تصویر دیکھ رہی ہو، جیسے کرنل انسان تو تھا مگر یکدم دوسرے لوگوں کی پہنچ سے باہر ہو گیا تھا۔ کرنل نے الماری میں سے گول کر کے رکھے ہوئے چند نوٹ نکالے، ان میں اپنی جیبوں میں سے ریزگاری نکال کر شامل کی اور سب پیسوں کو گننے کے بعد دوبارہ الماری میں رکھ دیا۔

"یہ انتیس پیسوز میرے دوست سابا س کو واپس کئے جائیں گے" اس نے کہا "باقی کی رقم اسے میری پنشن آنے پر ملے گی"

"لیکن اگر تمہیں پنشن کی رقم نہ ملی تو؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"وہ مل جائے گی"

"لیکن اگر یہ مل تو؟"

"تو اسے باقی رقم کی ادائیگی نہیں ہو گی۔"

اس نے بستر کے نیچے سے نئے جوتوں کا جوڑا نکالا۔ پھر جوتوں کا خالی ڈبہ لینے الماری کی طرف گیا۔ جوتوں کے تلے کپڑے کی دھجی سے صاف کر کے اس نے جوتوں کو ڈبے میں اسی طرح رکھ دیا جیسے اس کی بیوی انہیں اتوار کی رات کو لائی تھی۔ اس کی بیوی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"یہ جوتے واپس جائیں گے" کرنل نے کہا "یہ میرے دوست کے لئے تیرہ پیسوز کی مزید رقم اکٹھی ہو گئی۔"

"وہ واپس نہیں لیں گے" اس کی بیوی نے کہا۔

"کیوں نہیں لیں گے؟" کرنل نے جواب دیا "میں نے تو صرف دو بار پہنے ہیں۔"

"ترک لوگ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے" اس کی بیوی نے کہا۔

"انہیں سمجھنا پڑیں گی۔"

"اگر وہ نہ سمجھیں تو؟"

"تو پھر نہ سہی!"

کھانا کھائے بغیر وہ دونوں اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔ کرنل نے اپنی بیوی کی تسبیح کے ختم ہونے کا انتظار کیا تاکہ لیمپ بجھا سکے لیکن اسے نیند نہ آ سکی۔ اس نے فلم کے سنسر کی گھنٹیاں سنیں اور تین گھنٹے بعد کرفیو کا بگل بھی سنا۔ رات کی سرد ہوا سے اس کی بیوی کے سانس کا کرب اور بڑھ گیا تھا۔ جب وہ کرنل سے دھیمے اور صلح کن لہجے میں مخاطب ہوئی تو کرنل کی آنکھیں ابھی کھلی تھیں۔

"تم جاگ رہے ہو؟"

"ہاں"

"کبھی سمجھ بوجھ سے بھی کام لے لیا کرو" اس نے کہا "کل جا کر سابا س سے بات کر لو۔"

"وہ سوموار سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔"

"اور بھی اچھا ہے" کرنل کی بیوی نے کہا "تمہیں سوچ بچار کرنے کے لئے تین دن مل جائیں گے۔"

"کسی بات پر سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہے۔" کرنل نے کہا۔

اکتوبر کی چپ چپاہٹ کی بجائے اب ہوا میں خوشگوار خنکی تھی۔ پلوور پرندوں کی آمدورفت کے بندھے ٹکے معمول سے بھی کرنل نے دسمبر کی پہچان کی۔ رات کے دو بجے وہ نیند سے کوسوں دور تھا، لیکن اسے علم تھا کہ اس کی بیوی بھی جاگ رہی تھی۔ اپنے جھولنے والے بستر میں اس نے پہلو بدلنے کی کوشش کی۔

"تمہیں نیند نہیں آ رہی ہے؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"نہیں۔"

اس کی بیوی نے ایک لمحے کے لئے غور کیا اور بولی:

"ہمارا حال ایسا نہیں ہے کہ اپنے ساتھ ہم یہ سلوک کریں۔ ذرا سوچو چار سو پیسوز کی ایک مشت رقم کتنی ہوتی ہے!"

"اب پنشن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" کرنل نے کہا۔

"تم پندرہ سال سے یہی کہتے آرہے ہو۔"

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" کرنل نے کہا۔

وہ خاموش تھی لیکن اس نے جب دوبارہ بات کی تو کرنل کو اس کی اس اور آخری بات میں کوئی وقفہ محسوس نہ ہوا۔

"مجھے پتہ ہے پنشن کی رقم کبھی نہیں پہنچے گی۔" کرنل کی بیوی نے کہا

"پہنچ جائے گی۔"

"اور اگر نہ پہنچی تو؟"

کرنل اس بارے میں اپنے خیال کا اظہار نہ کر سکا۔ مرغے کی پہلی بانگ کے ساتھ اسے حقیقت کا احساس ہوا مگر وہ فوراً ہی گہری بے خطر اور بے ملامت نیند میں ڈوب گیا۔ جب وہ اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا۔ اس کی بیوی ابھی سو رہی تھی۔ کرنل نے باقاعدگی کے ساتھ صبح کے تمام فریضے ہر روز کی طرح مگر دو گھنٹے دیر سے پورے کئے اور اپنی بیوی کے اٹھنے اور ناشتہ کرنے کا انتظار کرتا رہا۔

اس صبح وہ بہت کم گو تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے صبح کا سلام کہا اور خاموشی سے بیٹھ کر ناشتہ کرتے رہے۔ کرنل نے پنیر اور میٹھی ڈبل روٹی کا ٹکڑا کھایا اور بغیر دودھ کے کافی کا پیالہ پیا۔ باقی صبح اس نے درزی کی دکان پر بیٹھ کر گزار دی۔ ایک بجے وہ گھر واپس آیا۔ اس کی بیوی بیگونیا کے گملوں کے درمیان بیٹھی کپڑے رفو کر رہی تھی۔

"دوپہر کے کھانے کا وقت ہے۔" اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"کھانا نہیں ہے۔"

کرنل نے کندھے اچکائے اور دالان کی دیوار کے سوراخوں کو جن میں سے بچے باورچی خانے میں گھس آیا کرتے تھے، بند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب وہ واپس گھر میں داخل ہوا تو کھانا میز پر رکھا تھا۔ کھانا کھانے کے دوران کرنل کو احساس ہوا کہ اس کی بیوی بہت مشکل سے رونے سے گریز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس بات نے اُسے چوکنا کیا۔ وہ اپنی بیوی کے کردار سے واقف تھا۔ فطری طور پر وہ جلد دل برداشتہ ہونے والی عورت نہ تھی اور پچھلے چالیس برس کی تلخیوں نے اسے اور بھی سخت

دل کر دیا ہوا تھا حتیٰ کہ اپنے بیٹے کی موت پر بھی اس کی آنکھ سے آنسو نہ نکلا تھا۔

تنبیہ کی نیت سے کرنل نے اپنی بیوی کی آنکھوں کو گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹے اور آستین سے اپنے آنسو پونچھے مگر کھانا کھاتی رہی۔

" تمہیں دوسروں کا کوئی خیال نہیں ہے"، اس نے کہا۔

کرنل نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

" تم خود سر، ضدی اور خود غرض آدمی ہو" اس نے دہرایا۔ کھانا ختم کر کے اس نے اپنے چھری کانٹے کو پلیٹ میں ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیا مگر فوراً ہی اپنے وہم سے خوفزدہ ہو کر انہیں سیدھا کر دیا۔

" ساری عمر میں نے اس لئے جھاڑ جھونکا تھا کہ اب آ کر تم مجھے یہ بتا سکو کہ میری وقعت ایک مرغے سے بھی کم ہے ؟"

" مرغے کا معاملہ دوسرا ہے" کرنل نے کہا۔

" نہیں، ایک ہی معاملہ ہے ؟ اس کی بیوی نے جواب دیا " تمہیں اتنا تو خیال ہونا چاہئے کہ میں گور کنارے ہوں۔ میرا یہ مرض آہستہ آہستہ میری جان لے کر ٹلے گا"۔

جب تک کرنل نے کھانا ختم نہیں کیا اس نے اپنی بیوی کی بات کا جواب نہیں دیا۔

" اگر تمہارا ڈاکٹر یہ ضمانت دے دے کہ مرغے کے بیچنے سے تمہارا دمہ ختم ہو جائے گا تو میں اسے ابھی بیچ دوں گا"۔ اس نے کہا " لیکن اگر اس نے نہ کر دی تو پھر نہیں"۔

اس دوپہر کو وہ مرغے کو لڑائی کے احاطے میں لے گیا۔ جب وہ واپس لوٹا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی دمے کے حملے کا شکار ہونے کے قریب تھی۔ گھر میں بال کھولے اور بازو پھیلائے وہ ادھر ادھر پھر کر اپنے پھیپھڑوں کی سیٹیوں پر قابو پانے اور اپنا سانس درست کرنے کے مرحلے سے گزر رہی تھی شام تک وہ اسی حالت میں رہی۔ آخرکار اپنے خاوند سے بات کئے بغیر وہ بستر میں جا کر لیٹ گئی۔

کرفیو کے وقت تک وہ حمدیں پڑھتی رہی۔ کرنل نے لیمپ بجھانا چاہا مگر اس نے اعتراض کیا " میں اندھیرے میں نہیں مرنا چاہتی" اس نے کہا۔

کرنل نے جلتے ہوئے لیمپ کو فرش پر ہی رہنے دیا۔ اب اسے تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ سب کچھ فراموش کر کے وہ چالیس دن کے لئے سو جائے اور بیس جنوری کو دوپہر تین بجے اٹھے تاکہ عین وقت پر مرغے کو لڑائی کے احاطے میں چھوڑ سکے۔ لیکن وہ اپنی بیوی کی متوقع بے خوابی سے ڈرا ہوا تھا۔

کچھ ہی لمحوں بعد اس کی بیوی نے بات شروع کر دی ؛ " یہ ہماری ایک ہی کہانی ہے۔ ہم بھوک

پیاس برداشت کرتے رہتے ہیں تاکہ دوسروں کا پیٹ بھر سکے۔ چالیس برس سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔
کرنل خاموش رہا آخر اس کی بیوی نے پوچھا کہ آیا وہ جاگ رہا ہے۔ اس نے اثبات میں جواب دیا
تب اس کی بیوی نے اطمینان اور روانی اور کھٹور پن سے اپنی بات جاری رکھی۔

"اس قصبے کا ہر آدمی مرغے پر پیسہ لگا کر امیر بن جائے گا۔ صرف ہم ہیں جن کے پاس مرغے پر لگانے کے لئے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔"

"مرغے کا مالک منافع میں سے بیس فیصد کا حقدار ہوتا ہے۔"

"ہاں، الیکشنوں میں دن رات کام کرنے کے بعد تم کسی عہدے کے بھی حقدار تھے،" اس کی بیوی نے کہا "اپنی جان خطرے میں ڈالنے پر پرانے سپاہیوں کی پنشن کے بھی حقدار تھے۔ اب باقی سب کی زندگیاں بن گئی ہیں، صرف تم اکیلے بھوکے مر رہے ہو۔"

"میں اکیلا نہیں ہوں۔" کرنل نے کہا۔

اس نے اس امر کی وضاحت کرنی چاہی مگر نیند نے اس پر غلبہ پا لیا۔ یک آہنگی کے ساتھ اس کی بیوی دیر تک بات کرتی رہی حتیٰ کہ اسے احساس ہوا کہ اس کا خاوند سو چکا تھا۔ تب وہ مچھردانی میں سے نکلی اور اندھیرے میں بڑے کمرے میں اِدھر اُدھر پھرتی رہی۔ وہاں بھی وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی، سورج طلوع ہونے کے وقت اس کے خاوند نے اسے آواز دی۔

وہ دروازے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ لیمپ کی روشنی سے جو زمین کی جانب سے اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی وہ کسی چڑیل کی طرح لگ رہی تھی۔ اپنی مچھردانی میں داخل ہونے سے قبل اس نے لیمپ کی بتی گل کر دی مگر اپنی تقریر جاری رکھی۔

"ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ...." کرنل نے بات شروع کی۔

"ہم صرف ایک کام کر سکتے ہیں کہ مرغے کو فروخت کر دیں" اس کی بیوی نے کہا

"ہم کلاک بھی تو بیچ سکتے ہیں۔"

"اسے کوئی نہیں خریدے گا۔"

"کل میں آلوارو سے پوچھوں گا اگر وہ مجھے چالیس پیسوز دے سکے۔"

"وہ نہیں دے گا۔"

"تب ہم تصویر کو بیچ سکتے ہیں۔"

اس بار کرنل کی بیوی بات کرنے کی خاطر مچھردانی سے باہر نکل آئی۔ کرنل کے نتھنوں میں اپنی بیوی دائیوں اور جڑی بوٹیوں سے لبریز سانس کی بو آئی۔

"اسے کوئی نہیں خریدے گا" اس کی بیوی نے کہا۔

"دیکھیں گے!" کرنل نے نہایت ملائمت سے اور اپنے لہجے میں کسی قسم کی تبدیلی کا احساس دلائے بغیر کہا: "اب جاکر سو جاؤ۔ کل اگر کوئی چیز بھی نہ بک سکی تو کوئی اور طریقہ سوچ لیں گے۔"

کرنل نے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کا ارادہ کیا مگر نیند نے اس کے عزم کو خاک میں ملا دیا۔ وہ وقت اور مکان کے احساس سے ورا ایک ایسی کیفیت کی تہہ میں غرق ہو گیا جہاں اس کی بیوی کے کلمات کا مفہوم مختلف تھا۔ ایک لمحے بعد ہی اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے شانوں کو ہلا رہا ہو۔ "میری بات کا جواب دو۔"

کرنل کو علم نہ ہو سکا کہ یہ الفاظ اس نے نیند میں سنے تھے یا سونے سے قبل اس کے کانوں میں پڑے تھے۔
صبح طلوع ہو رہی تھی۔ نتھری اور شفاف صبح کی سرسبزی میں اس نے کھڑکی کو دیکھا۔ اس نے سوچا شاید اسے بخار ہے۔ اس کی آنکھیں تپ رہی تھیں اور اپنے ذہن کا ابہام دور کرنے میں اسے دقت کا سامنا ہوا۔

"اگر ہم کچھ بھی نہ بیچ سکے تب کیا ہوگا؟" اس کی بیوی نے اپنا سوال دہرایا۔

"تب تک بیس جنوری کا دن آ پہنچے گا" کرنل نے کہا۔ وہ اب پوری طرح بیدار تھا "اور مرغوں کی لڑائی کے نفع میں سے بیس فیصد اسی شام ہمیں مل جائے گا۔"

"اگر مرغا جیتا تو" اس کی بیوی نے کہا "اور اگر وہ ہار گیا تو پھر کیا ہوگا؟ تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ اگر مرغا ہار گیا تو ہم کیا کریں گے؟" "وہ ایسا مرغا ہے جو نہیں ہار سکتا۔"

"فرض کرو اگر وہ ہار گیا تو؟"

"اس بارے میں سوچنے کو ابھی چالیس دن پڑے ہیں" کرنل نے کہا۔ اس کی بیوی کی ہمت اب جواب دے چکی تھی۔

"اور اس دوران میں ہم کھائیں گے آخر کیا" اس نے پوچھا اور فلالین کی قمیض کے کالر سے پکڑ کر کرنل کو زور سے جھنجھوڑا

اس ایک ساعت پہ پہنچنے میں کرنل کی عمر کے پچھتر برس صرف ہوئے تھے، وہ پچھتر برس جو اس نے لمحہ لمحہ کر کے بسر کئے تھے۔ اپنی بیوی کی بات کا جواب دیتے وقت اس نے اپنے آپ کو ایسا شخص جانا جو مکمل طور پر پاک صاف، واضح اور کھرا تھا اور جو جھکنا نہ جانتا تھا۔

"گوبر" اس نے کہا۔

تراجم   احمد ندیم قاسمی

چند جرمن نظمیں

ہولڈرلین ۲۰ مارچ ۱۷۷۰ء کو پیدا ہوا اور ۷ جون ۱۸۴۳ء کو وفات پائی۔ وہ ۷۳ برس زندہ رہا مگر اس کی عمر کے آخری ۳۶ برس دیوانگی کے عالم میں گزرے۔ اگرچہ وہ اس عالم میں بھی نظمیں لکھتا رہا مگر وہ شاعری اس نے ابتدائی ۳۰ برس ہی کی عمر تک کی جس نے بعض پہلوؤں سے اسے اپنے معاصرین پر فوقیت بخشی اور یاد رکھیے کہ اس کے معاصرین میں شلر اور گوئٹے کے سے عظیم جرمن شعرا شامل ہیں۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ سائنسوں کا زندگی سے، فن اور خوش ذوقی کا بیلنس سے، دل کا دماغ سے اور مقصد کا حقیقت سے رابطہ اتحاد قائم کیا جائے۔ مائیکل ہیمبرگر کا کہنا ہے — گوئٹے نے شلر کے بارے میں کہا تھا کہ جب وہ اپنے ناخن بھی کاٹ رہا ہوتا تھا تو اس حالت میں بھی وہ دوسرے اہلِ قلم سے عظیم تھا — مگر ہولڈرلین کے مقابلے میں شلر دنیادار اور بے کیف تھا۔ ہولڈرلین تو صرف اپنے شاعرانہ تخیل کے بل پہ زندہ رہا اور اسی تخیل پر قربان ہو گیا" —
اسی بڑے جرمن شاعر کی چند مختصر نظموں کا ترجمہ نذرِ قارئین ہے۔

محبوب

اے آسمانی شاعری کی رحمتو!
جس طرح ایک بار تم نے عناصر کو پُرسکون بنایا تھا
اسی طرح آؤ اور میری خاطر اس عہد کے انتشار کو ختم کر دو
جنگ کے شور و شغب میں آسمان کی نرم موسیقی گھول دو
حتیٰ کہ انسانوں کے دلوں میں وہ سب کچھ متحد ہو جائے جو منتشر ہو چکا ہے
حتیٰ کہ انسان کا قدیم ضمیر — پُرامن اور نجیب ضمیر —
اس پراگندہ عہد میں سے ایک عظمت اور وقار کے ساتھ اُبھرے اور اُبھرا چلا جائے
اے جیتے جاگتے حسن!

لوگوں کے صرف مند دلوں میں پھر گھر کر دو
واپس آؤ شبستانوں میں اور واپس آؤ عبادت گاہوں میں!
اس لیے کہ میری محبوبہ ان نرم کلیوں کی طرح زندہ ہے
جو موسم سرما میں کھلتی ہیں
وہ تازگی سے تو لبریز ہوتی ہیں
مگر وہ دھوپ کی محتاج ہوتی ہیں
لیکن ضمیر کا سورج ڈوب گیا ہے
اور یخ بستہ رات میں صرف لڑا کا طوفان ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں!

مقدر سے

اے عظیم قوت!
ایک رسیلا گیت گانے کے لیے
مجھے صرف ایک موسم گرما ۔۔ صرف ایک موسم خزاں عنایت کر
تاکہ میرا دل اس گیت کی مٹھاس میں لپٹ کر
رضامندی سے ڈوب سکے
وہ روح جسے زندگی میں اپنے مقدر میں لکھا ہوا حق نہیں ملتا
عدم میں بھی سکون سے محروم رہتی ہے
لیکن اگر میں ایک بار صحیح معنوں میں اسے تکمیل تک پہنچا سکوں
جو میرے نزدیک مقدس اور پیاری ہے
یعنی اگر میں اپنی شاعری کی تکمیل کر سکوں
تو پھر اے پرچھائیوں کی دنیا کی خاموشیو! میں تمھارا خیر مقدم کروں گا
چاہے عدم کے اندھیروں میں مجھ سے میرے فن کا ساتھ چھوٹ جائے
مگر میں مطمئن رہوں گا
یہ سوچ کر کہ کبھی میں دیوتاؤں کی طرح زندہ رہا تھا
اور یہ بڑی بات ہے!

محبوبہ سے

اے مقدس وجود!
تم خاموش رہو
اور صبر کے ساتھ سب کچھ سہہ رہی ہو
اور وہ تمھیں نہیں سمجھتے
تم چپ چاپ گھل رہی ہو
اور افسوس کہ تم آدم خوروں کے درمیان
ان شریف روحوں کو بے کار ڈھونڈتی پھرتی ہو
جو نابود ہو چکیں
اور وقت اڑا جا رہا ہے
اور میری محبوب
میرا شعر اس دن کو قریب لا رہا ہے
جب تم دیوتاؤں کی صف کے بعد
عظیم شخصیتوں کی صف میں شامل ہو گی
اور میرا شعر تمہارا نام پکارے گا
اور ہو بہو تمھاری طرح حسین ہو گا

انسانی داد

جب سے میں نے عشق کرنا شروع کیا ہے
کیا میرا دل مقدّس نہیں ہو گیا اور ایک نادر زندگی سے بھر نہیں گیا؟
آخر تم اس وقت میری زیادہ قدر کیوں کرتے تھے
جب میں زیادہ مغرور اور زیادہ وحشی تھا
اور لفظوں سے بھرا ہوا تھا اور کھوکھلا تھا؟
آہ — ہجوم صرف اسی چیز کو پسند کرتا ہے

جو بازار میں زیادہ بکتی ہے
اور ملّایانہ ذہنیت والے صرف جابر کی عزت کرتے ہیں
اور صرف وہی لوگ دیوتاؤں پر یقین رکھتے ہیں
جو خود دیوتاؤں کے سے ہوتے ہیں۔

اعتماد

اے قیمتی وجود!
تم بیمار ہو
اور میرا دل رو رو کر چُور ہو چکا ہے
اور میں خوف کی نوک کی چبھن بھی محسوس کرنے لگا ہوں
تاہم میں مان ہی نہیں سکتا کہ جب تک تم محبت کر رہی ہو
مر بھی سکتی ہو!

ناقابلِ معافی

اگر تم اپنے دوستوں کو بھول جاؤ گے
اگر تم فن کار کا مذاق اڑاؤ گے
اگر تم بے سلیقگی اور بدتہذیبی سے کسی بڑے خیال کی تشریح کرو گے
تو شاید خدا انھیں معاف کر دے
مگر وہ تمھیں کبھی معاف نہیں کرے گا
اگر تم دو محبت کرنے والوں کے سکون کو گزند پہنچاؤ گے

نوجوان شاعروں سے

پیارے بھائیو۔ شاید تمھارا فن جلد پختہ ہو جائے گا
کیونکہ تمھاری جوانی کی طرح تمھارا فن بھی مدت سے ہیجان میں ہے
تمھارا فن حسن کی پختگی حاصل کرے گا۔

بس نیک بنو جیسے کہ یونانی نیک تھے
دیوتاؤں سے محبت کرو اور انسانوں کے بارے میں نرمی سے سوچو
شراب نوشی سے یوں نفرت کرو جیسے تم پلیے سے نفرت کرتے ہو
نہ اخلاقی سبق دو نہ تفصیلیں بیان کرو
اور اگر تمھارا آقا تمھیں دھمکائے
تو عظیم قدرت سے مشورہ طلب کرو

جرمنوں سے

اس بچے پر کبھی نہ ہنسو
جب وہ اپنے لکڑی کے گھوڑے پر بیٹھا ہوا
اسے چابک لگاتا ہے اور ایڑی ملتا ہے
اس وقت وہ اپنے آپ کو بہادر اور عظیم سمجھ رہا ہوتا ہے
کیونکہ اسے جرمنو
تم بھی خیالوں سے بھرے ہوئے ہو
اور عمل سے خالی ہو

یا کیا جس طرح بادلوں سے کوندا لپکتا ہے
تمھارے خیالوں میں عمل بھی چمکے گا؟
کیا تمھاری کتابیں زندہ ہوجائیں گی؟
اگر یہی ہوگا تو اے میرے پیارو
مجھے پکڑ لو اور مجھ سے اس بہتان کی معافی منگواؤ
جو میں نے تم پر باندھا ہے۔

سقراط

" مقدس سقراط

آخر تم ہر وقت اس نوجوان کی طرف کیوں دیکھتے رہتے ہو؟
کیا تمھیں کوئی بہتر کام کرنا نہیں آتا ؟
تم اس کی طرف اتنے پیار سے کیوں دیکھتے ہو جیسے دیوتاؤں کو دیکھ رہے ہو؟ "

وہ جو بہت گہری سچائیوں کا جائزہ لے چکا ہے
صرف اس سے پیار کرتا ہے جو سب سے زیادہ جیتا جاگتا ہے
جس نے اس دنیا کو کچھ بھی پہچانا ہے
وہ جوانی کے بلند ارادوں کو سمجھتا ہے
اور آخر کار
داناؤں کو حسن کے سامنے جھکنا ہی ہوتا ہے ۔

چند جاپانی نظمیں

جدید جاپانی شاعری کا نقطۂ آغاز ۱۸۸۲ء ہے جب نئے انداز کی نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا۔ مرتبین میں سے ایک کا نام تیسیے تھا۔ اس نے تمہید میں لکھا کہ یہ حقیقت کتنی افسوسناک ہے کہ جاپانیوں نے "عام الفاظ" میں کبھی شاعری نہیں کی! — "ہمیں قدیم انداز کی شاعری کی گرفت سے آزادی حاصل کرنی چاہیئے جو صرف ایسے لمحاتی خیال کا اظہار کر سکتی ہے جس کی حیثیت ایک پٹاخے یا ٹوٹتے ہوئے ستارے کی سی ہوتی ہے۔" اس مجموعے کی اشاعت ہی سے لوگوں کو یقین آیا کہ شعر کہنے کا ایک بہتر انداز بھی موجود ہے۔ ویسے جاپان کی نئی شاعری نے بیسویں صدی کے ربع اوّل میں بے پناہ عروج حاصل کیا۔ نئے شاعروں میں بہت سی چیزیں نئی تھیں مگر انہوں نے اپنے ہاں کی شعری روایت سے رشتہ منقطع نہ کیا۔ ذیل میں انہی میں سے چند نظموں کے تراجم پیش کیے جا رہے ہیں ،

:

ہوا، روشنی اور ایک پتہ

میں گھاس کی ایک پتی سے

ہوا کی طرح
چمٹ جاؤں گا

میں ایک مکڑی کے جالے میں
ایک پتے کی طرح
لٹک جاؤں گا

میں ایک تتلی کے پروں میں سے

روشنی کی طرح
چھن جاؤں گا

میں ہوا بن جاؤں گا ، روشنی بن
جاؤں گا
ایک پتہ بن جاؤں گا
میرا دل اس حد تک خالی ہے
(آنتو اوہکی)

ناریل کا درخت

جیسے وہ دھرتی کے دکھوں سے بلند ہونے کی کوشش میں ہوں
وہ خطوطِ مستقیم میں کھڑے ہیں
اور بلند ہو رہے ہیں، بلند تر ہو رہے ہیں
ہمیشہ اپنا سر آسمان کی طرف اٹھائے رکھتے ہیں
یہ لمبے سربرآوردہ ناریل کے درخت

ان کے بے قرار ہاتھ
جیسے اُداسی کے عالم میں بلند ہو رہے ہیں
اوپر اور اوپر
زمین سے بہت بہت اوپر
آسمان کی طرف اٹھے ہوئے
مگر آسمان ان کی رسائی سے دور ہے
وہ ایک خواب کی طرح
ہمیشہ دور سے دور تر ہوتا رہا ہے
اور یہ درخت وہاں تک پہنچنے کا ابھی کوئی راستہ نہیں پاتے
کہ شام گلابی ہو جاتی ہے

ناریل کے درخت ان پجاریوں کی طرح ہیں جو تائب ہو رہے ہوں
جب زمین گہرے سایوں میں ڈوب جاتی ہے
اور مغربی افق پر شام کا ایک ستارہ اُبھرتا ہے
اور اپنی سیاہی نیلی روشنی بکھیرتا ہے،
ناریل کا ہر درخت ایک اونچی لمبی صلیب کی طرح عبادت میں مصروف ہو جاتا ہے
ہوا مقدس گھنٹی کی گونجیں اپنے ساتھ لاتی ہے
اور سمندر کی موجیں کبھی نہ ختم ہونے والی دعائیں پڑھتی ہیں

گرم شاموں میں جو سنہری اور سُرخ ہوتی ہیں
ناریل کے درخت آسمانوں کے مقدس معبد معلوم ہوتے ہیں
جو انسانی جذبات کے بھنور سے اُبھر کر بلند ہو گئے ہیں
وہ خاموشی سے دعا مانگ رہے ہیں
ہر درخت مقدس صلیب کی طرح ہے

مگر کیا وہ ناریل کے درخت ہیں
یا میری روح ہیں ؟

(وایگا کوھری گوچی)

بیٹا

وہ ایک صاف دل نوجوان ہے
اچھی صحت کی ایک تصویر
اس کے خون میں چمکتی ہوئی دھوپ ہے
اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کی ہڈیاں
پھولوں کے سبز ڈنٹھلوں کی طرح نازک ہیں
دھوپ میں اس کے بالوں کا رنگ ہلکا زرد ہو جاتا ہے
اس کے گال سُرخ ہیں
جیسے کسی نے ان پر خوب آزادی سے
گلاب کے پھول رگڑے ہیں

وہ اپنی دادی کی طرح پیتل کی ایک انگوٹھی پہنتا ہے
جب وہ شہر جاتا ہے تو سبز شیشے کا چشمہ لگاتا ہے
جیسے دوسرے نوجوان لگاتے ہیں
وہ گھر واپس آتا ہے تو اس کے پاس میک اپ کی سستی چیزیں ہوتی ہیں
ایسی کہ ان پر کھیتوں میں اُگنے والے پھول ہنسیں
اور دریا کا آئینہ قہقہہ سر کر دے
وہ ایک ایسا ہیرو ہے جو صرف اس باغیچے میں
جہاں ناشپاتیاں پک رہی ہیں
خوب باتیں کرتا ہے اور خوب ہنستا ہے
وہ اپنی بادبان نما قمیض پہن کر

سمندر کی طرف بحری نرسل جمع کرنے جاتا ہے

وہ کبھی کبھی پھلوں سے لدی ہوئی ایک ریڑھی شہر کی طرف لے جاتا ہے
مگر اس میں اتنی جرأت نہیں
کہ گاؤں کی لڑکیوں سے عشق کرنے لگے
چنانچہ وہ اپنی بہنوں سے جھگڑتا ہے
اور چوزوں اور بچھڑوں پر برستا ہے
اور جب گاؤں کا میلہ لگتا ہے
تو وہ بیئر کے چند پیالے پیتا ہے
اور فوراً لکڑی کی طرح دھب سے زمین پر گر جاتا ہے

دیکھو بیٹا، تازہ پانی خوب پیو
اور کھیتوں میں گھومو
تم تو نیلے آسمان اور سبز گھاس سے بنا ہوا
ایک پیکر ہو!

(سوزسو کے ساتوہ)

آزادی کے چند گیت

(انگریزی روزمرے اور تلمیحات سے بچنے کے لیے بعض گیتوں کے صرف ملخص پیش کئے گئے ہیں اور بعض کے آزاد تراجم)

آزادی کی یادیں

اے وہ کہ تیرا ذہن آزاد ہے
تیری روح قوی ہے اور بے لوث ہے

جس نے قوت کی جبین پر شکن پیدا کی
جو نہ کبھی غلام بنا نہ کسی کو غلام بنایا
جس نے صرف نیکی کا احترام کیا
اور جو صرف اپنی ہی شکایت سے متاثر ہوا
اس یادگار کی طرف آ اور اس کی پرستش کر

(رابرٹ برنس ۱۷۵۹ء-۱۷۹۶ء)

خواب سحر

بہار کا دلآویز موسم تھا
جب صبح کو سوتے ہیں میں نے ایک خواب دیکھا
یہ خواب ایسا تھا جس کے بارے میں، میں کچھ بتا نہیں سکتا
صرف گا سکتا ہوں
میں نے دیکھا کہ ایک کشتی کو سمندر کی لہریں اچھال رہی ہیں
اور اسے ایک خاتون چلا رہی ہے
عورتوں میں حسن تو میں نے ضرور دیکھا ہے، دبدبہ نہیں دیکھا
مگر اس خاتون کو دیکھ کر مجھے دبدبے کا احساس ہوا
وہ بیٹھی تھی اور اس کے قریب ایک ڈھال رکھی تھی
جو سمندر پر چمکتے ہوئے سورج کی طرح چمک رہی تھی
اور اس نے بڑے وقار سے مسکراتے ہوئے کہا
"میں غلاموں کو آزاد کرنے جا رہی ہوں!"
پھر ایک ایسی رسیلی آواز میں
کہ اس سے زیادہ رسیلی آواز میں نے کبھی نہیں سنی
اس نے غلاموں کی ٹوٹتی زنجیروں کا گیت گایا
چند بادل جو ہمارے اوپر گھر آئے تھے
اس کی موسیقی کے سیل میں بہ گئے

پھر ہم غلاموں کے ایک جزیرے پر پہنچے
وہاں اس کا دشمن کھڑا تھا جس کا نام تشدد تھا
اور وہ اپنے ہاتھ میں چابک لیے
افریقہ کے اداس ساحلوں کی طرف دیکھ رہا تھا
اسے اپنے شکار کی تلاش تھی
پھر اس نے دیوی نما خاتون کو دیکھا
اور اس کے ہاتھ سے وہ چابک گر گیا
جو ہزاروں غلاموں کے لہو سے آلودہ تھا
اور جب وہ مر گیا تو میں نے مسرت کی چیخیں سنیں
جو آسمانوں سے زمین پر اتر رہی تھیں
پھر میری آنکھ کھُل گئی اور میں سوچنے لگا
کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہے
تب میں اس نتیجے تک پہنچا
کہ برطانیہ نے اعلان کر دیا ہے
کہ اسے غلاموں کے تاجروں سے کوئی واسطہ نہیں ہے

(ولیم کوپر ۳۱ء-۱۸۰۰ء)

لنڈن

میں دریائے ٹیمز کے قریب کی گلی میں گھوم رہا ہوں
اور مجھے ہر چہرے پر ضعف اور دُکھ کے نشان نظر آتے ہیں
میں ہر آدمی اور ہر بچے کی چیخ میں
ذہنوں کی ڈھالی ہوئی ہتھکڑیوں کی آواز سنتا ہوں
چمنیاں صاف کرنے والے کی چیخ
گرجاؤں کی دیواروں کو لرزا رہی ہے
اور بدنصیب اہل کار کی آہ

خون کی صورت میں ایوان شاہی کے قریب بہہ رہی ہے
مگر ان سب سے بلند اس جوان طوائف کی بد دعا ہے
جو نومولود بچے کے آنسوؤں کی چوس لے جاتی ہے
اور شادی کے تابوتوں میں طاعون بھر دیتی ہے

(ولیم بلیک ۱۷۵۹ء - ۱۸۲۷ء)

مقدس

کیا ایک سرسبز و شاداب سرزمین میں
ایسے بچوں کو دیکھتے رہنا بہت مقدس کام ہے
جنہیں افلاس نے جکڑ لیا ہے
اور جنہیں استحصال کا ہاتھ صرف سردی کی خوراک دیتا ہے؟
کیا یہ لرزتی ہوئی چیخ ایک نغمہ ہے؟
کیا اسے مسرت کا گیت قرار دیا جا سکتا ہے؟
یہاں اتنے بے شمار بچے غریب کیوں ہیں؟
کیا یہ غریبی کی سرزمین ہے؟
اور یہاں سورج کبھی نہیں چمکتا
اور ان کے کھیت سیاہ اور بنجر ہیں
اور ان کی راہیں کانٹوں سے پٹی پڑی ہیں
اور یہاں ابدی خزاں مسلط ہے
کیوں کہ جہاں بھی سورج چمکتا ہے
اور جہاں بھی بارش ہوتی ہے
بچوں کو بھوکا نہیں رہنا چاہیئے
اور ذہنوں کو غریبی کے کرب میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے

(ولیم بلیک ۱۷۵۹ء - ۱۸۲۷ء)

ایک گیت

اس بچے کا مقدر کتنا تاریک ہے
جو خاز۔خس کی چھت کے نیچے پیدا ہوا
چاہے وہ سخی ہو، دانا ہو، بہادر ہو
اسے بہر حال غلام رہنا ہے
وہ ہمہ وقت محنت کرتا ہے
اسے آرام کی گھڑیاں کم ہی نصیب ہوتی ہیں
وہ قسم قسم کے محصول ادا کرتا ہے
اور پھر اسے غریب ہونے کی سزا دی جاتی ہے
اور شرفا وہ ہیں جو سوتے ہیں جب دہقان ہل چلاتا ہے
اور وہ کاٹتے ہیں جو دہقان بوتا ہے
چاہے وہ ظالم اور احمق ہی کیوں نہ ہوں

(رابرٹ ساؤدے، ۱۷۷۴ء۔ ۱۸۴۳ء)

غلاموں کی تجارت

اوپر ہوا میں غلام معلق ہے
اور وہ دنیا جہاں کے پرندوں کے لیے جیتی جاگتی غذا ہے
اگرچہ ظالم سورج نے اسے جگا دیا ہے مگر وہ کراہتا تک نہیں
کیونکہ ابھی بہت سے ظالموں کو اس کا لہو پینا ہے
اگرچہ اس کی کپکپاتی ہوئی بوٹیوں کو گدھ نوچے لئے جا رہے ہیں
مگر وہ آہ تک نہیں بھرتا
اے وہ جس نے اس انسان کی آزادی چھین لی
ذرا ادھر دیکھ
اے وہ جو گناہ سے منافع کماتا ہے

ذرا اس طرف تو دیکھ
قبر سے ادھر ایک اور دنیا بھی ہے
اور وہاں خدا کے سامنے اور پورے عالم انسانیت کے سامنے
اس غلام کو اپنی گرجتی ہوئی آواز میں
تیرے اعمال پر لعنتوں کی بجلیاں برسانا ہیں

(رابرٹ ساؤدے ۱۷۷۴ء-۱۸۴۳ء)

توسان سے

(توسان ایک حبشی تھا جو فرنچ ری پبلک میں سینٹ ڈومینگو کا گورنر مقرر ہوا۔ اپنے ہاں غلامی کے احیاء کے خلاف اس نے نپولین کی حکم عدولی کی، گرفتار ہوا۔ پیرس لایا گیا اور وہاں ۱۸۰۳ء میں جیل کے اندر مر گیا)

توسان! اے انسانوں میں سے سب سے زیادہ دکھی انسان!
تجھے سکون کب اور کہاں ملے گا؟
دیکھ، ابھی مت مر بلکہ زنجیروں میں بھی مسکرا
اے وہ جو کبھی نہ اٹھنے کے لیے گر پڑا ہے
جاگ اور یہ دیکھ کر تسکین حاصل کر
کہ تو نے اپنے پیچھے ایسی قوتیں چھوڑی ہیں
جو تیرے لیے کام کریں گی۔ یہ ہوا اور زمین اور آسمان ہیں
ہوا کا کوئی جھونکا ایسا نہیں جو تجھے فراموش کر دے
تیرے بے شمار ساتھی ہیں
مسرتیں اور محرومیاں اور محبتیں
اور انسان کا ناقابل شکست ضمیر۔ سب تیرے دوست ہیں

(ولیم ورڈز ورتھ ۱۷۷۰ء-۱۸۵۰ء)

فیکٹری کی مزدور لڑکی کا آخری دن

یہ سرما کی ایک صبح کا ذکر ہے
موسم نمناک اور خوف ناک تھا
پو پھٹے سے تین گھنٹے پہلے
باپ نے اپنی بچی کو بیدار کیا
اس نے تاریک کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا
"میری بدنصیب بچی، اُٹھ!
فیکٹری کا گھنگھرو بج رہا ہے"
لڑکی نے کہا "ابا" میں اٹھ تو گئی ہوں
مگر ہائے میں کتنی کمزور ہوں
مجھ سے تو دروازے تک بھی نہیں چلا جاتا
اور مجھے اتنا لمبا اور ویران سفر طے کرنا ہے
مجھے ایک بار پھر اٹھا کر وہاں پہنچا دو
کاش اماں زندہ ہوتیں تو ہمارا ہاتھ بٹاتیں
اور تم بے کار ہو آبا
انہوں نے میرے بھائی کو مار ڈالا
میں بھی اس کی طرح کام کرتی رہوں گی اور مر جاؤں گی"
اس کے گھلے ہوئے وجود کی حیثیت صفر تھی
اگر کچھ بوجھ تھا تو وہ اسکے باپ کے دل پہ تھا
وہ اپنی بیٹی کو دلاسا دیتا رہا
اور فیکٹری کے پاس وہ ایک دوسرے سے جُدا ہوئے
پہرہ دار نے لڑکی کو دیکھا تو اسے چھڑی سے مارنے لگا
اور جب وہ رونے لگی تو وہ اسے گالیاں دینے لگا
درد اور افسوس آہستہ آہستہ رخصت ہو گئے

وہ کام کرتی رہی اور کمزور ہوتی رہی
دھاگے اس کے ہاتھ میں ٹوٹتے رہے
اور مشینیں تیز ہوتی گئیں اور مزدوریں سخت ہوتی گئیں
سورج کب کا غروب ہو چکا تھا
مگر رات بھی اس کے لیے کوئی سکون نہ لا سکی
آخر ایک ساتھی کو ایک سکہ دے کر اس نے اپنا کام اس کے حوالے کیا
اور خود وہیں فرش پر لیٹ گئی
آخر مشینیں رکیں اور محبوس لوگ گھروں کو روانہ ہوئے
اس نے اس رہائی پر سکون محسوس کیا
اٹھی اور باہر آ گئی مگر پھر تیورائی اور گر پڑی
اس کے ساتھی اس کا پنجر اٹھا کر اس کے گھر لے آئے
اس کا باپ اپنے زخم خوردہ احساسات کے ساتھ
اپنی مہر بلب بچی کو رات بھر دیکھتا رہا
وہ نہ مسکرائی نہ اپنے باپ کو پہچانا
بس دیکھتی رہی کہ کوئی اس کے قریب رات بھر گھٹنوں کے بل جھکا رہا
پھر فیکٹری کا گھگھو بجا
اور یکایک وہ اپنے تنکوں کے بستر پر سے اٹھی
اور چیخ کر پکاری "وقت ہو گیا!"
مگر پھر گری اور مر گئی
اور جب وہ زمین پر مردہ پڑی تھی
اس کے قریب سے ایک گھوڑا گاڑی گزری
جس پر اس کے مل مالک کی بیٹیاں سوار تھیں
وہ سیر کو نکلی تھیں
اور ان کے نازک دل حبشی غلاموں پر کی جانے والی زیادتیوں پر کانپ رہے تھے
جب کہ ایک گوری غلام، جو ان کے باپ کے لیے سونا کماتی تھی

ٹھنڈی زمین پر مری پڑی تھی

(ایم ٹی سیڈلر ۱۸۰۰ء - ۱۸۳۵ء)

میں خود کر لوں گا

گرمیوں کے دن تھے۔ ایک روز ایک لوہار ایک بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔
بادشاہ نے کہا۔ "آج ملکہ یہاں نہیں ہیں اس لئے کیا ہم تمہارے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟"
لوہار نے جواب دیا۔ "یقیناً جہاں پناہ - مجھے روٹی کا ایک ٹکڑا چاہیئے"
"کیوں چاہیئے" بادشاہ نے کڑک کر پوچھا اور
اُس نے آہ بھر کر کہا "میں بھوکا ہوں جہاں پناہ"
"اوہو! ہم اپنے "چانسلر" کو بلاتے ہیں۔ ایسی باتوں کو وہ خوب سمجھتا ہے۔
تمہارے مطالبات کو ہم نہ تو رد کر سکتے ہیں نہ انہیں بادشاہوں کی (براہ راست) توجہ کے لائق
چانسلر صاحب یہ بتاتا ہے جو چوہوں اور چوہیوں کی طرح فاقے کاٹ کر رہا ہے۔"
چانسلر نے جواب دیا۔ "میں چشم زدن میں "فرسٹ لارڈ" کو لے کر حاضر ہوتا ہوں
فرسٹ لارڈ آیا۔ اس کے تیوروں ہی سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کچھ کر کے نہیں دے گا
اس نے کہا۔ "جہاں پناہ کو غلط فہمی ہوئی ہے - یہ کام تو "چیف کلرک" کا ہے"
چیف کلرک نے کہا "معاملہ تو نازک ہے مگر اس کے اختیار میں نہیں ہے
اور روٹی آٹے کے ذخائر کی چابیاں تو "سٹیوارڈ" کے پاس رہتی ہیں۔"
سٹیوارڈ نے بھرائی آواز میں کہا "مجھ سے چابیاں کھو گئی ہیں مگر میں ایک لمحے میں
لوہار کو بلاتا ہوں — ارے! یہ سامنے لوہار ہی تو کھڑا ہے۔"
"بھئی واہ — بھئی واہ!" اس نے بلند آواز سے کہا۔ ہم نے یہ سب کچھ کتنی ہوشیاری سے کر لیا ہے۔
یہ گہرا اور وسیع مسئلہ، حل کرنے کی کوشش کے آغاز ہی سے حل ہو گیا ہے!"
"شکریہ!" لوہار بولا "او احمقو اور بدکردارو! جاؤ اپنی پناہ گاہوں میں چھپ کر پڑے رہو
اب آئندہ جب کبھی مجھے فاقہ ہو گا تو یہ سب کچھ میں خود کر لوں گا۔"

(ایڈورڈ کارپینٹر)

کولرج
مجید امجد

قبلا خاں

ظانا دو میں قبلا خان کے رنگ محل کے سائے
لرزیں اس ویران ندی پر، جس کی مقدس موجیں
گہری اور اتھاہ دراڑوں کے سینوں کو ڈستی
گھور اندھیروں کے ساگر میں بسالیں اپنی بستی
دور، دور تک سونا اگلتی دھرتی کا پھیلاؤ
جس کی چاروں اور فصیلیں گنبد اور منارے
باغ —— جو ہنستی آبجوؤں کی چنچلتا سے چمکیں
بوجھل بوجھل خوشبوؤں سے لدے پھندے اشجار
بوڑھے جنگل —— جیسے پرانے پہاڑوں کے ہمزاد
کہیں کہیں جن کی وسعت میں
دھوپ میں لیٹے سبزہ زار

اوہ! وہ دیکھو!!
گھنے گھنیرے پیڑوں کے اس پار
سبز چٹانوں کے سینوں میں گہرے بھیانک غار
ہیبت ناک مقام
رسی بسی پاکیزگیوں کا ایک فسوں دوام
جیسے ڈھلتے چاند کی پیلی چھایا میں گھل جائیں
برہا کی اگنی میں جل مٹنے والی اک دیو اداسی کی پرچھائیں

یہی وہ غار، یہی وہ گھاؤ
جس کی تھاہ سے اچھلے، کھولے
ایک ابلتے چشمے کی ان تھک آوازوں کا وہ الاؤ
جو دھرتی کی ہانپتی چھاتی میں بے کل سانسوں کی مانند
تڑپے اور تڑپتا جائے
جس سے جھم جھم برسیں
جلتی چٹانوں کے سیال انگارے
جیسے تپتے توے پر بھنتے دانوں کی کلپاہٹ
انہیں اچھلتی چٹانوں کے جھرمٹ سے ابھر کر ڈوبے
وہی مقدس دریا، جس کی موجیں
گہری اور اتھاہ دراڑوں کے سینوں کو ڈستی
گھور اندھیروں کے ساگر میں بسائیں اپنی بستی
یہی ہے وہ ہنگامۂ صوتِ سنگ و خروشِ دریا
جس کے روپ میں قبلا خان کے کانوں سے ٹکرائیں
گزرے پرکھوں کی صدائیں
جنگ کے نقارے کی دھم دھم!

ایڈون میور
محمد سلیم الرحمٰن

گھوڑے

دنیا کو سلا دینے والی
ہفت روزہ جنگ کے بمشکل بارہ مہینے بعد
شام گئے وہ عجائب گھوڑے وارد ہوئے
اس وقت تک ہمارے اور خاموشی کے درمیان
ایجاب و قبول کی نوبت آ چکی تھی
لیکن شروع کے چند دنوں میں سناٹا ایسا تھا
کہ ہم اپنی سانس چلتی سنتے تھے اور سہمے جاتے تھے
دوسرے دن ریڈیو جواب دے گئے۔
ہم گھنڈیاں مروڑتے رہے؛ صدائے برنخاست
تیسرے دن ایک جنگی جہاز، شمال کا رُخ کیے،
ہماری طرف سے گزرا، عرشے پر کشتوں کے پشتے لگے ہوئے
چھٹے دن ایک طیارہ
ہمارے اوپر سے ہوتا ہوا سمندر میں جا گرا
اس کے بعد اللہ اللہ خیر سلا۔ ریڈیو مہر بلب۔
اور وہ اب بھی ہمارے باورچی خانوں میں ایک طرف کو رکھے ہیں
اور شاید دنیا بھر میں لاکھوں کمروں میں۔ اَون ہوئے، دھرے ہیں
لیکن اب انہوں نے اگر کوئی بات کی،
اگر اچانک انہوں نے پھر سے کوئی بات کی،
اگر ٹھیک بارہ بجے کوئی آواز سنائی دی
تو ہم اسے ان سنی کر دیں گے، ہم اسے وہ پرانی خبیث دنیا،

جو اپنے بال بچوں کو چپاک سے ایک ہی جھڑپے میں نگل گئی تھی ،
واپس نہیں لانے دیں گے۔ وہ دنیا ہمیں اب ہرگز منظور نہیں۔
کبھی کبھی ہمیں خیال آتا ہے کہ وہ ہیں ،
ناقابلِ گزر اندوہ میں اندھا دھند منڈکڑی مارے ،
پڑی سو رہی ہیں ؛ اور پھر یہ خیال
اپنے انوکھے پن سے ہمیں ششدر چھوڑ جاتا ہے
ہمارے کھیتوں میں اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے ٹریکٹر
شام کو ایسے لگتے ہیں جیسے سیلی سیلی سمندری بلائیں ، گھات میں بیٹھیں۔
ہم ٹریکٹروں کو وہ جہاں ہیں وہیں پڑا رہنے دیتے ہیں۔ زنگ لگتا ہے تو لگے۔
"وہ گل سڑ کے ، کھاد ملی مٹی میں ملتے ملتے ، مٹی ہو جائیں گے۔"
ہم نے اپنے بیلوں کو زنگ آلود ہلوں میں ،
جو مدت سے بے کار پڑے تھے ، جوتا ہے۔ ہم اپنے اب وجد کی زمینوں کو
پیچھے چھوڑ کر پچھلے کسی زمانے میں جا پہنچے ہیں ،
اور پھر اس شام
جاتی گرمیوں وہ عجائب گھوڑے وارد ہوئے۔
ہم نے سڑک پر دور کہیں کھٹاپٹ سنی ،
ایک گہری ہوتی ہوئی دھم دھم ، جو تھمی ، دوبارہ شروع ہوئی
اور موڑ پہ پہنچ کر کھوکھلے رعد میں ڈھل گئی۔
ہم نے ان کے سر دیکھے ،
جیسے کوئی ویران موج یلغار کرتی چلی آ رہی ہو اور ڈر گئے۔
ہم نے اپنے والدین کے جیتے جی نئے ٹریکٹر خریدنے کے لیے
اپنے گھوڑے بیچ کھائے تھے
اب وہ گھوڑے ہمارے لیے اتنے ہی نرالے تھے
[illegible] دہشت افسانوی راہوار
[illegible]

ہمیں ان کے قریب جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔
پھر بھی وہ کھڑے انتظار کرتے رہے ہاڑیں اور شرمیلے،
جیسے انہیں کسی قدیمی فرمان کے تحت ہمارا اتا پتا لگانے
اور اِس مدتوں سے گم عتیق ہمدمی کو پالینے کے لیے بھیجا گیا ہو۔
اولیں لمحے میں ہمیں اتنا بھی نہ سوجھا
کہ وہ ایسے جانور ہیں جنہیں اپنا مطیع بنایا اور برتا جا سکتا ہے
ان میں کوئی آدھے درجن بچھیرے تھے
جو ٹوٹی پھوٹی دنیا کے کسی اجاڑ بن میں بیاہے گئے تھے
اور پھر بھی ایسے نئے نویلے
جیسے کسی اپنے باغِ بہشت سے چلے آ رہے ہوں۔
جب سے وہ ہمارے ہل چلا اور بوجھ ڈھو رہے ہیں۔
لیکن ان کی وہ آزاد غلامی اب بھی ہمارے دلوں میں چبھتی رہتی ہے ۔
ہماری زندگی بدل گئی ہے۔ ان کی آمد ہماری ابتدا تھی ۔

مایا کوفسکی

عبدالعزیز خالد

بادِ شمال

کارنامہ ہے مرا کیا؟ مرا سرمایہ کیا؟
سچ تو یہ ہے کہ حقیقت میں کوئی خاص نہیں
کیا ہے تخلیق مری؟ میں نے کیا کیا پیدا؟
قابلِ ذکر ہو جو ایسی کوئی چیز نہیں

جہدِ جاوید ہے مقسوم مرا
حسبِ مقدور میں رہتی ہوں ہمیشہ کوشاں
(جسے "مقدور" میں کہتی ہوں وہ کیا کافی ہے؟)
مجھ کو رہتی ہے یہ اُمید مدام
کہ ابھی وقت بہت باقی ہے
کیا مجھے اس گھڑی افسوس نہ ہوگا جس وقت
منکشف مجھ پہ یہ ہوگا کہ متاعِ ساعات
ہو چکی ختم، گجر کوچ کا دیتا ہے صدا؟

مارگریتا الیفر

ٹکرا کے روزمرّہ کی بے کیف زیست سے
کشتی ہوئی ہماری محبت کی پاش پاش
آپس کا جو حساب تھا بے باک ہو چکا
کیا فائدہ ہے اب غمِ باہم کے ذکر کا؟
جو ایک دوسرے کو لگائے وہ زخم و ضرب

ان کو شمار کرنے سے اب کیا حصول ہے؟
طوفان ختم چکا ہے سمندر ہے پُر سکوں
بے فائدہ ہے شکوہ جو ہونا تھا ہو چکا!

مایا کوفسکی

الفاظ کی طاقت سے میں واقف ہوں بخوبی
جو زہر ہے ان میں وہ بھی پوشیدہ نہیں ہے

•

قافیہ لمسِ محبت بھی ہے نعرہ بھی ہے سنگیت بھی ہے کوڑا بھی

•

مشین روح کی ہے ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ!
مرورِ وقت سے کیا یہ بدن نہیں گھِستا؟

•

شاعری کیا ہے؟ سفر اک فلکِ نامعلوم کا!

•

مقروض کائنات کا شاعر رہے سدا
جرمانہ اور سُود دکھوں میں کرے ادا

•

دردِ دل جس کا کوئی نام نہیں!

•

جن لبوں پہ ہے مہُرِ خاموشی
ان لبوں کی پُکار سنتا ہوں!

ایزرا پاؤنڈ

خاطر غزنوی

سوچ

فطرتِ سگ کو میں نے پرکھا
غور کیا
اور آخر اس نقطے پر پہنچا
انساں بہتر حیواں ہے

میں نے انساں کی فطرت کو
ہر پہلو سے دیکھا
پرکھا
آخر اس نقطے پر پہنچا
میں محصور ہوں اِک الجھن میں

سفید آہو

انہیں جو دیکھا
تو مرغ ابر و نو لئے ایتھر میں جلوہ گر تھے
رُکے وہ
لیکن نہ بہرِ الفت
نہ مدعا اُن کا پرسشِ غم
مگر وہ آنکھیں
کہ اِک محبوب رشیم عاشق کا عہد و پیماں

قلانچیں بھرتا سفید آہو
ہوائے تازہ سحر کی چاندی کا بار اٹھائے
"یہی تو ہے وہ سفید آہو
نگارِ نام و نمود و نصرت
کہ اس نے بھی ہم کو دی ہے دعوت
کہ ہم زمیں کے حریص تازی سگوں کی صورت
صدائے قرنا سنیں تو اس پر کچھ ایسے جھپٹیں —— شکار کر لیں"

کفراب (KAFU . HOB) گھانا

ترجمہ: امجد اسلام امجد

مادرِ وطن افریقہ کیلئے ایک نوحہ

میں سرحد کے اُس پار سے
(جہاں آسمان اور زمیں جھلساتی ہوئی حدت اور تپش
ایک دوسرے سے ملتے ہیں)
اپنی ماں کی چیخ سنتا ہوں
وہ پورے استحکام کے ساتھ اُن غاصبوں سے برسرِ پیکار ہے
اور انہیں سرِعام بُرا بھلا کہہ رہی ہے
جنہوں نے بندوقوں اور بموں کے زور سے
اُس کے وطن پر قبضہ کر رکھا ہے۔

اس دُور افتادہ چیخ کو سنو
جو کبھی تیز ہو جاتی ہے
اور کبھی تشدد اور دکھ کی وجہ سے ڈوب ڈوب جاتی ہے
وہ غاصبوں سے ایک نا ختم جنگ لڑ رہی ہے
اور چلّا چلّا کر انہیں اُن کے ظلم
اور اُس لُوٹ مار سے آگاہ کر رہی ہے
جو انہوں نے اپنے ہمسایوں پر
اپنے چارے کے لیے شروع کر رکھی ہے

ہوا کے دوش پر بلند ہوتی ہوئی اس چیخ کو سنو

اور اسے اپنے ذہن میں محفوظ کر لو
میری معصوم ماں شدتِ تکلیف سے اپنی زبان کو دانتوں سے کاٹ رہی ہے
لیکن وہ اپنے عہد میں مضبوط اور مستحکم ہے
وہ ایک ایسے چوزے کی طرح اپنی پوری طاقت سے چلاتی ہے
جسے چیل نے پکڑ لیا ہو،
ہمیں چاہیئے کم از کم چیل کی طرف ایک پتھر ہی پھینک دیں
اس اندوہناک پکار کے برعکس
بدمعاشوں اور غاصبوں کا ایک گمراہ کن شور بلند ہوتا ہے
"جس طرح چھوٹی مچھلی بڑی مچھلی کی خوراک ہوتی ہے
اسی طرح ایک بے وقوف آدمی عقلمند کی خوراک بنتا ہے
روٹی کے ایک خشک ٹکڑے اور ایک تمغے کے لیے
اُسے بغیر کسی آرام کے جانوروں کی طرح
اپنے مالک کی خوشنودی اور مفاد کے لیے کام کرنا چاہیئے"

وہ کہتے ہیں
ہمارے آباء یہاں مدتوں سے مقیم ہیں
اور یہاں کے لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں
اس لیے اب اُن کے بچوں اور جانوروں پر ہمارا حق ہے
ہمیں سوچنا چاہیئے
کہ وہ کس طرح ہمارے لیے زیادہ سے زیادہ کام کر سکتے ہیں
ہمیں اُن کے لیے کپڑے اور چارے کی فکر کرنی چاہیئے
جس طرح کہ ہم گدھوں کے لیے کرتے ہیں
اُن کی نرم خوئی کی ایک خداداد انداز افتخار کے ساتھ سرپرستی کرنی چاہیئے
اور انہیں مزید نرم خو اور صلح کل بنانا چاہیئے۔

اور اب دور سے آتی ہوئی اس مسلسل آواز کو سنو
جو مجھے اور تمھیں بلا رہی ہے
ہم اپنی ماں کو بچا لیں یا کھو دیں
فریاد کریں یا طوفان بن کر حملہ آور ہوں
بدمعاشوں کو ماریں یا انہیں خوفزدہ کریں
اور انہیں دھکیلتے ہوئے اپنے وطن کی سرحدوں سے نکال دیں
سنو ہمارے دیوتا مقدس لفظوں میں ہم سے التجا کر رہے ہیں

ہمارے آبا اور دانشوروں کی روحیں
جن کی دانش اور جرأت کی تعریف و توصیف
تمام اہلِ علم کرتے ہیں
ہماری کم ہمتی کے لیے ہم پر لعن طعن کرتی ہیں
اور ہماری شرمناک سرنگونی کا مضحکہ اڑاتی ہیں
جس نے اتنا عرصہ ہمیں بے زبان رکھا ہے
اور ہمارے چہروں پر بزدلی نقش کی ہے

اے میری ہمت، جاگ، اور دشمن کو نابود کر
میرے اعضا کو مجتمع کر اور ضرب لگا
تم کاٹو گے یا مارو گے
چلاؤ گے یا ٹھوکر لگاؤ گے
آزادی کی جنگ میں
اُس وقت تک خوف اور رحم کو نزدیک نہ آنے دو
جب تک ہمارے یہ زبردستی کے مہمان، اس کی روشنی
اور اپنے مذموم ارادوں کی شکست اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں

میرے تمام ساتھیوں کو یکجان اور متحد ہو کر
اس جنگ میں لڑنا اور مرنا چاہیئے
کیونکہ جس بے رحم اور عاقبت فراموش دشمن
کے لیے ہم رزق ڈھونڈتے ہیں
وہ ہماری جان کے درپے ہے اور ہماری جڑیں کاٹ رہا ہے۔
نرم خو اور صلح کل رہتے رہتے بہت ہو چکی
گونگوں اور گونگوں کی طرح زندہ رہتے رہتے اب بہت ہو چکی
آؤ اب اس ظالم اور اجنبی مہمان کو
اُس کے جیسا ہی میزبان بن کر دکھائیں

اے ہواؤ اور اے ٹوٹتی ہوئی لہرو، سنو
پہاڑوں اور غاروں کی طرف واپس جاؤ
اور تمام لوگوں، مچھلیوں اور جانوروں کو بتا دو
کہ میں نے اب اپنی بے عمل انگلیوں کو مکے کی شکل میں تان لیا ہے
اور جب تک یہ آکاس بیل
جو میرے وطن کے پودے کو چاٹ رہی ہے
صفحۂ ہستی سے نابود نہیں ہو جاتی
میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔

جے۔ ایم۔ بوگینتی (آیوری کوسٹ)
امجد اسلام امجد

انکشافِ ذات

ایک وقت تھا کہ
مفلوک الحال سیاہ فامی کے آشوب کے باوجود
تم ایک ان تھک مزدور تھے

ایک وقت تھا کہ
تھکا دینے والے ظلم سہنے کے باوجود
تم ایک ان تھک فن کار تھے
پھر چاروں طرف سے غنیم امڈے اور تمہارے گھروں میں در آئے
اور پھر تم پہلی مرتبہ اپنے آقاؤں سے منحرف ہونے پر مجبور ہوئے
"تمھارے کندھوں پر زوال کا بھاری بوجھ تھا
لیکن تم ایک رضاکار کی طرح
والہانہ جوش کے ساتھ شہادت گاہ کی طرف بڑھے
مجھ سے مت پوچھو کہ میں تمھارے اس عظیم
اور ناقابلِ اظہار دکھ کے بارے میں کیا سوچتا ہوں!
اے شریف محنت کش،
اے دھند میں لپٹے ہوئے عظیم سیہ فام
تم سچ کی وہ عظیم قوت ہو جو ازلی دانش میں گندھی ہوئی ہے
بدی کی کائنات میں رعد کی طرح گونجو اسے جھنجھوڑ کر رکھ دو
اور اپنے لیے سچائی اور خاکساری کا ایسا راستہ تراشو
جو انکشافِ ذات کی بے مثل منزل کی طرف جاتا ہے

ڈیوڈ ڈیوپ (سینی گال)
اصغر ندیم سید

گدھ

اُن دِنوں میں
جب تہذیب نے ہمارے چہرے پر دھمکیاں اور مُکّے برسائے تھے
جب مُقدس پانیوں نے ہمارے ٹیڑھے ایروؤں پر تھپیڑ مارے تھے
گِدھوں نے اپنے بدشکل پنجوں کے سائے میں
اپنے آباؤ اجداد کی خون آشام یادگاریں تعمیر کی تھیں
اُن دِنوں میں
ایک اذیت ناک ہنسی سڑکوں کے پتھریلے جہنم پر دوڑتی پھرتی تھی۔
اور آقاؤں کی مقدس دعاؤں کے اکتا دینے والے آہنگ نے
کھیتوں سے اُٹھنے والی چیخوں کو دبا لیا تھا۔
آہ ٹوٹے پھوٹے بوسوں کی تلخ یاد
ان وعدوں کی جو بندوق کے اشارے سے ٹوٹ گئے۔
ان غیر ملکیوں کی جو انسان نہیں تھے
جو تمام کتابوں کی بابت علم رکھتے تھے
لیکن محبت کے لفظ سے ناآشنا تھے
لیکن ہم جن کے ہاتھ زمین کی کوکھ کو زرخیز کرتے ہیں
تمہارے فخریہ گیتوں کے باوجود
روتے ہوئے افریقہ کی برباد آبادیوں کے باوجود
ہمارے اندر اُمید ایسے محفوظ تھی جیسے بند قلعہ میں
اور سوازی لینڈ کی کانوں سے یورپ کے کارخانوں تک

بہار ہمارے روشن قدموں کے نیچے دمکا کرے گی

لینگسٹن ہیوگز
اصغر ندیم سیّد

نیگرو دریاؤں کی باتیں کرتا ہے

میں جانتا ہوں دریاؤں کو
میں جانتا ہوں دریاؤں کو قدیم اور کلاسیکی دنیا کی مانند
اور انسانی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی طرح کہنہ
میری روح دریاؤں کی طرح بہت نیچے اتر گئی ہے
میں گرم پانیوں میں نہایا جب صبحیں جوان ہوتی تھیں
میں نے کانگو کے قریب اپنی جھونپڑی کھڑی کی
اور اس نے مجھے تھپکیاں دے کر سُلایا
میں نے دریائے نیل پر نظر ڈالی
اور اس پر ترشے ہوئے ہیرے جیسی شعاعیں پڑتے دیکھیں
میں نے مسسی پی کے گیتوں کی آواز سُنی
جب آبنائے لنکن نیو اورلینز میں گر رہی تھی
میں نے اس کے کیچڑ بھرے سینے کو مغرب کے وقت سونے میں بدلتے دیکھا
میں جانتا ہوں دریاؤں کو
قدیم، شام کی رنگت والے دریا
میری روح دریاؤں کی طرح بہت نیچے اتر گئی ہے

لینزا وز روف

اصغر ندیم سید

ایک چپتو پڑا ہوا ہے

ایک چپتو ساحلی ریت پر پڑا ہوا ہے
یہ مجھے چمکدار، کشادہ اور عظیم سمندر کے مقابلے میں
پھیلاؤ اور حرکت کے متعلق زیادہ معلومات دیتا ہے
وہ عظیم سمندر
جو اسے یہاں تک لایا
اور اسے یہاں پھینک گیا۔

نیلے سیش (جرمن)

اصغر ندیم سید

اگر میں اتنا جان لیتا !

اگر میں اتنا جان لیتا
کہ کس شے پر تمہاری آخری نگاہ نے آرام کیا
کیا وہ پتھر تھا
جو بہت سی آخری نگاہیں پی گیا
وہ نگاہیں جو اس کے اندھے پن پر اندھی ہو کے گریں
یا کیا وہ زمین تھی
جو تنے جانے کے لیے کافی
اور پہلے جیسی کالی

گہرے شگافوں کے ساتھ
اور بہت سے حملوں سے بچھڑی ہوئی
اور کیا وہ تمھاری آخری سڑک تھی
جس نے تمہیں
اُن تمام سڑکوں سے الوداعی سلام کا موقع فراہم کیا تھا
جن پر تم چلتے رہے تھے
ایک گندے پانی کا جوہڑ
چمکتی ہوئی دھات کا معمولی ٹکڑا
شاید تمھارے دشمن کی بیٹی کا تکیہ
یا جنت سے آئی ہوئی کوئی معمولی پیش گوئی
یا وہ زمین ہو گی
جو کسی کو محبت سے محروم نہیں چھوڑتی
جو تمہیں پرندے کی نشانی ہوا کے ذریعے بھیجتی ہے
تمہاری روح کو یہ یاد کرانے کے لیے
کہ وہ تمہارے جلے ہوئے جسم کی اذیت سے دوہری ہو رہی ہے

پشتو سے ترجمہ: پریشان خٹک

شاعر: پریشان خٹک

ارمان

تم چاہو تو جل جاؤں راکھ ہو جاؤں
یا اگر ظلم کی اس سے آگے بھی کوئی منزل ہو
تیری حسین جفاؤں کے صدقے
یہ دل جو پہلے ہی زخموں سے چور ہے، حاضر ہے
دیکھو گھبرانا نہیں
میں تیرے ستم سہنے کی دعا مانگوں گا
زمانے کے ہاتھوں سر پر آریاں چلیں
میں آہ بھی نہ کروں گا
یہ آہ دبکا جس پر مجھے کوئی اختیار نہیں
ذرا پوچھو تو . . . .
کہ مجھ پر کیا گزرتی ہے
ناحق میرے رنگ روپ کا شکوہ کرتے ہو
تم اپنی زلفوں کو ملامت کرو
جس نے میرے حسیں خواب مجھ سے چھین لیے
اپنے تیر مژگاں سے پوچھو
جس کی اَنی ہر وقت دل میں چبھتی رہتی ہے
ذرا آئینے میں دیکھ کر بتاؤ
کہ تیری آنکھوں نے میری روح پر کیا ستم کیا
یہ تیرے ہونٹوں کی سرخی
میری آہوں کا سبب ہے

یہ جو میرا دل و دماغ دونوں معطر ہیں
اس کا سبب تیرا سراپا ہے اے شجر پھول دار
تو ہی بتا میں تیرے بغیر
اپنا فسانۂ غم کس کو سناؤں

زندگی کے یہ دکھ درد اب سہے نہیں جاتے
تیری یادوں نے ناتواں کر دیا
تمام آسرے اور سہارے بے بنیاد ہیں
مجھے تیری جدائی نے بے بس کر دیا ہے

دل چاہتا ہے کہ انقلاب برپا کر دوں
تاکہ دنیا کے یہ قوانین نیست و نابود ہو جائیں
جہاں بے روح بتوں کی پرستش ہوتی ہے
تو کیوں نہ یہ بت خانے گرا دیئے جائیں

ہر بے ستون جو قدم قدم پر راہ روکے کھڑا ہے
یا ان کو ہٹا دوں یا خود ہی فنا ہو جاؤں
مردانہ وار میرا ہاتھ فرعون کے گریبان پر ہو
اور موسےٰ کی طرح دوسروں سے خراج حاصل کروں

اپنے ہی دل کے زخموں کے ہاتھوں جب خون کا سیلاب امنڈتا ہے
تو بے اختیار میرے دل سے فریاد نکلتی ہے
جس چیز پہ نگاہ پڑتی ہے تم ہی تم نظر آتے ہو
تو جدائی کے صدمہ سے دل لرز لرز جاتا ہے

ایک لمحہ بھی تیری یاد کے بغیر نہیں گزرتا
تیری چاہت روح سے زیادہ میرے خون میں شامل ہے
میری برباد دنیا کے سہارے
خدارا! اس کا کوئی علاج دو
مانتا ہوں کہ میرے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا ہے

[redacted]

ایسی اندھیری راہیں جو چاند سے بھی منور نہیں ہو سکتیں
لیکن میرا جوش و ولولہ ایسا ہے
کہ وہ ان اندھیروں سے ذرا بھی متزلزل نہیں ہو سکتا

میں یہ ثابت کر دکھا دوں گا کہ محبت بے ستون کو اکھاڑ سکتی ہے
ورنہ پھر یہ سر تیشے سے پاش پاش ہو جائے گا
اگر میرے خون میں ننگ کی اک رمق بھی باقی ہو
تو تم بہت جلد اس کا تماشہ دیکھ لوگی

نہ مجھے بے پت زندگی چاہیئے نہ بے محبت دنیا
میں تیرے پت میں دنیا و جہان دونوں سے گزر گیا ہوں
جو لوگ محبت کی راہوں میں سختیوں سے گھبراتے ہیں
میں ان سے امان چاہتا ہوں

تجھے کیا معلوم...... کہ تیرے بغیر ایک ایک لمحہ
میرے لیے قیامت سے کم نہیں
خدا دشمن کو بھی نہ دے وہ شب و روز
جو میں تیرے بغیر ماہیٔ بے آب کی طرح گزارتا ہوں

کبھی کبھی تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں
جیسے تم میری آنکھوں میں بس گئے ہو میرے دل میں اتر گئے ہو
میں تم سے ہم کلام ہوتا ہوں تم سے جواب طلب کرتا ہوں
لیکن جلد ہی ہوش میں آکر سنتا ہوں کہ یہ جاگتے کا خواب تھا

میرا دل ڈوب رہا ہے میرا دل تڑپ رہا ہے
تم کب آؤ گی..... ایسا نہ ہو کہ دیر سے آؤ
اس وقت جب میری آرزو دل کی دنیا
تباہ و برباد ہو گئی ہو
اس وقت کون تمہیں میرے دل کا حال سنائے گا
کہ میں نے موت سے بھی فرصت مانگی تھی

مگر موت نے تیری مسیحائی کے ڈر سے
مجھے یہ مہلت بھی نہ دی

موت کے بعد میری تلاش کرو
تو قبر سے تیرے نام کی صدا آئے گی
اگر ایسا نہ ہوا تو سمجھ لو
کہ یہ پریشاںؔ کی قبر نہیں کسی اور کی لاش ہے

شیخ کی تصانیف

محمد سہیل عمر

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جب مغرب میں نشاۃ ثانیہ کی پیدا کردہ سائنس پرستی
[...] پرستی اور حیات پرستی کا زور شور دھیما پڑا اور دانش عزب کے بدن کے زخم ٹھنڈے ہو کر ٹیسیں مارنے لگے تو مغرب کے
[...]پنے مسائل کے حل کی خاطر دوسری تہذیبوں کی طرف نگاہ دوڑانے پر مجبور ہو گئے۔ کچھ تو اپنی ذہنی کم مائیگی اور چار سو برس میں
[...]کری مغالطوں کے باعث اور کچھ تعصب اور خالی خولی احساس برتری کے مارے مغرب کے بہت ہی کم لوگ تھے جنہیں مشرقی
[...] صحیح تفہیم کا موقع مل سکا اسی دور میں ایک اور رجحان بھی مغرب کے دانشوروں میں زور پکڑ گیا۔ اپنے معاشرے کی اقدار
[...]طنی اور روحانی جہت سے شاکی لوگوں نے مشرق کے نظریات اندھا دھند، کچے پکے جیسے سمجھ میں آئے اختیار کرنے
[...]ر دیئے اپنی تہذیب سے اکتائے تو ہندومت یا بدھ کی تعلیمات میں پناہ ڈھونڈنے لگے یہ نہ ہوا تو کنفیوشش
[...]با ہی نہیں [1] اسلام کی طرف ان میں سے بہت کم نے توجہ کی صلیبی جنگوں کے بعد سے مغرب کے ذہن میں اسلام کا
[...]م چکا تھا وہ ہمیشہ ان کی پیشقدمی میں مانع رہا۔ بایں ہمہ گذشتہ سو پچاس برس میں بہت سے مغربیوں نے اسلام قبول
[...]ے ہاں کے سادہ دل مسلمان ایسی خبروں سے بہت خوش ہوا کرتے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ ان میں سے اکثر لوگوں کا
[...]لام ایسا ہی ہے جیسا ایک جوڑا اتار کر دوسرا پہننا۔ یہ بات مغرب کے لیے بالعموم درست ہے مگر استثناء ہر جگہ
[...]ہے اور قدرت الٰہی جسے چاہے اپنا آلہ کار بنا لیتی ہے۔ چنانچہ مغرب میں بھی ماضی قریب میں ایک شخص ایسا ہو گذرا ہے
[...]اسلام کی قدمے، سخنے، قلمے امداد پیدائشی مسلمانوں سے زیادہ کی ہے اس کے قبول اسلام کے اثرات مشرق و مغرب میں

[...]جدید انگریزی شاعری میں ایذرا پاؤنڈ EZRA POUND اور YEATS اس کی مثالیں ہیں
[...]ب نے اپنا نظام اقدار کنفیوشس سے مستعار لیا مگر اس کی مابعدالطبیعاتی اساس کو رد کر دیا۔ دوسرے نے ہندوؤں
[...]کی ELIOT ایلیٹ صاحب آدھی راہ سے بھاگ نکلے۔ چند برس ہندو مابعدالطبیعاتی فکر کی باقاعدہ تعلیم حاصل
[...]ہے مگر پھر یہ بہانہ بنا کر چل دیئے کہ اگر اس کو پوری طرح حاصل کر لیا تو اپنا سب کچھ چھوڑنا پڑے گا کہ اس کی کوئی
[...]ہیں باقی نہ رہے گی۔ رہ گئے فرانسیسی اور دیگر یورپین اقوام توان کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ
[...]ا اس معاملے میں بھی انگریزوں سے آگے رہے ہیں اور انگریزوں نے حسب سابق نقالی پر اکتفا کیا۔

بہت گہرے اور دور رس ہوئے۔ مغرب کے لیے وہ ایسا انقلاب ثابت ہوا جس سے مغرب کے اہلِ نظر میں کھلبلی مچ گئی بہت
سے لوگ اس کی تقلید میں اسلام لائے ان نومسلموں میں فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے مخلص کیتھولک پیش پیش تھے یہ شخص تھا رینے
گینون، عالم، فیلسوف، دانشور، صوفی اور نہ جانے کیا کیا۔ اس کے انتقال کو آج ۲۷ برس ہونے کو آتے ہیں مگر اس کا نام آج بھی یورپ
اور امریکہ میں گونج رہا ہے اور یورپ و امریکہ میں فلسفہ، دین سے حقیقی دلچسپی رکھنے والا کوئی شخص ان کے نام سے بے نیاز نہیں دیکھا
مسلمانوں پر ان کے احسان کے پیشِ نظر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں ان کا تعارف کروایا جائے تاکہ مسلمان مفکرین کئے کرائے کام کو
دوبارہ کرنے میں اپنی توانائی اور وقت برباد نہ کریں یہ ناقص اور مختصر مضمون اس کوشش کا آغاز ہے

رینے گینوں کا کام جتنا عظیم الشان ہے ان کے ذاتی کوائف اتنے ہی غیر معروف ہیں مشرقی زبانوں میں ان پر ایک چھوٹی
سی کتاب کے علاوہ کچھ لکھا ہی نہیں گیا [1] فرانسیسی میں ضرور کتابیں تصنیف ہوئی ہیں [2] مگر وہ فی الوقت ہماری دسترس سے باہر
ہیں لہٰذا ان کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ وہ ۱۸۸۶ء میں فرانس
میں پیدا ہوئے [3] ان کا خاندان فرانس کے ٹھیٹھ کیتھولک گھرانوں میں سے ایک خوشحال خاندان تھا وہ شروع ہی سے انتہائی
ذی شعور، مرحب الرجان اور طبعاً دقیق ابحاث اور تفکرِ عمیق کی طرف مائل تھے۔ پختگیٔ فکر کی منزل کو پہنچے تو ان کو اپنی ہر
ضلالت اور گمراہی مضطرب کرنے لگی انہیں حق کی تلاش ہوئی اور انہوں نے ادراکِ حقیقت کی جدوجہد شروع کر دی ملکِ حق
ہے کہاں؟ مشرق میں یا مغرب میں؟ زمین پر یا آسمان میں؟ حقیقت کیا ہے؟ یہ رینے گینوں کا اپنے آپ سے سوال
تھا، وہی سوال جو ان سے قبل امام محاسبی، امام غزالی، محی الدین ابن عربی اور اندھی تقلید سے نفور جیسوں دوسرے مفکرین
اپنے آپ سے دریافت کر چکے تھے۔ اس کے بعد رینے گینوں پر تشکیک اور حیرت کا المناک دور گذرا اور آخر کار انہیں
خدا کی مدد نصیب ہو گئی ان کے حق میں امدادِ حق یہ تھی کہ اسلام کے نورِ دائم نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا وہ اسلام لے
آئے اور ان کا نام عبدالواحد یحییٰ رکھا گیا اس کے بعد تو وہ لشکرِ اسلام کے وہ سپاہی ثابت ہوئے جو اسلام کی دعوت بھی دیتا ہوا
اس کی مدافعت بھی کرتا ہو۔ طریقت میں وہ شاذلی تھے اور شیخ ... سے بیعت تھے [4] ۱۹۳۰ء میں مصر
چلے گئے اور ۱۹۵۱ء میں اپنے انتقال تک وہیں رہے [5] اپنے کام میں کیسے مگن اور نام و نمود کی خواہش سے کیسے آزاد تھے
اس کا اندازہ ایک چھوٹے سے واقعہ سے ہوتا ہے جو W N PERRY صاحب نے اپنے ایک مقالہ میں بیان
کیا ہے [6] ان کا بیان ہے کہ قاہرہ میں رینے گینوں جس محلہ میں رہتے تھے وہاں ان کے برابر کے گھر میں ایک خاتون رہتی تھیں
رینے گینوں کی تحریروں کی بہت مداح تھیں۔ دروازے سے دروازہ ملا ہوا تھا۔ جب رینے گینوں کا انتقال ہو گیا اور
خبریں شائع ہوئیں تو وہ خاتون یہ جان کر بھونچکی رہ گئی کہ برابر والے گھر میں رہنے والے بڑے میاں جن کو وہ برسوں سے دیکھا

---

[1] ، [2] مضمون کے آخر میں فہرستِ مراجعات دیکھیے۔

[3] PAUL CHACORNAC — LAVIE DE RENE GUENON
PARIS: 1958 PAGE — 2

(باقی حاشیہ ۴، ۵، ۶ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔)

یحیٰ کے نام سے جانی جاتی تھیں، ہی رہنے گینوں تھے

شیخ عبدالواحد کا قبول اسلام بھی بہت سیدھی سادھی منطقی وجہ سے ہوا تھا انہوں نے قرآن مجید کی اس نص مقدس کو آزمانا چاہا۔ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ و لا من خلفہ (حم سجدۃ ۴۱۔ آیۃ ۴۲)

گہرے مطالعہ کے بعد قرآن کے سوا اور کوئی ایسی مقدس کتاب نہ پائی جو تحریف یا تبدیلی سے محفوظ ہو۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لے رکھا ہے

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (الحجر۔ ۱۵۔ آیۃ ۸)

چنانچہ وہ اس پر مضبوطی سے جم گئے اور اسلام کے علم تلے ان کو اطمینان قلب نصیب ہو گیا

اس واقعہ کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کی تلاش کا آغاز حق کی تلاش سے ہوا تھا۔ تمام ادیان قدیمی روایت کے ظہور کی مختلف شکلیں ہیں اور اپنے زمانے میں اور اپنے مقام پر سب درست اور برحق تھے روایت حق کا آخری اصلی اور مکمل ظہور اسلام کی شکل میں ہوا ہے اس روایت کو قیامت تک رہنا ہے قدیم اور منسوخ شدہ روایتوں کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ خود ایک زندہ روایت میں شامل ہوں۔ آخری دور کی واحد مستند روایت اسلام ہے جو تمام روایتوں کی جامع ہے۔ اس صورت حال میں ہر مخلص محقق کے لیے قبول اسلام کے سوا چارہ کار بھی کیا ہے۔

قبول اسلام کے بعد شیخ عبدالواحد نے مشرقی تصورات کی شرح اور مغرب کو ان سے روشناس کرانے کا بیڑا اٹھایا اور اس کام کو پورا کر دکھایا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے مشرقی فکر کی روشنی میں مغرب کے کارناموں پر تبصرہ بھی کیا عمر بھر لکھا اور بہت کچھ لکھا ۲۵ سے زیادہ تو ان کی مستقل تصانیف ہیں ان میں سے جو زیادہ اہم اور معروف ہیں ان کا تذکرہ ہم کئے دیتے ہیں EAST AND WEST (مشرق و مغرب) ان کی وہ کتاب ہے جو دائمی اہمیت کی حامل ہے اس کی وجہ سے مشرق اپنے مشرقی ہونے پر فخر کر سکتا ہے اس کتاب نے مشرق کو اس کا کھویا ہوا اعتبار اور اعتماد لوٹا دیا اس کی تہذیبی برتری بیان کی اور فکر مشرق کی عظمت و رفعت کی وضاحت کی۔ مشرق کی انسانیت جس کا ادارہ مادہ پرست اور خونریزی کی عادی مغربی تہذیب نہیں کر سکتی کیونکہ اس کی بنیاد ظلم و عدوان اور مادی استحصال پر رکھی گئی ہے کتاب کے ہر صفحہ سے مشرق والوں کی عظمت، گہرائی، فہم امور اور انسانی مبادیات میں برتری کی شہادت ملتی ہے اس کتاب میں انہوں نے مغرب کے ہیں بڑے

(حاشیہ پچھلا صفحہ سے آگے)

(۴) شاذلیہ سلسلہ تصوف کے چند بڑے سلاسل میں سے ہے ابوالحسن الشاذلی (متوفی ۶۵۶ھ) کے نام سے منسوب ہے المغرب۔ افریقہ اور مشرق اوسط کے ممالک میں اس سلسلے کے لوگوں کی کثرت ہے۔

(۵) دیکھئے محمد حسن عسکری کا خط مدیر "الحق" کے نام (الحق۔ اکوڑہ خٹک اپریل ۱۹۷۰ء)

(3) W N PERRY — COOMARASWAMY — THE MAN, MYTH AND HISTORY (STUDIES IN COMPARITIVE RELEGION) SUMMER 1977 - ENGLAND

خداؤں ترقی (PROGRESS) تہذیب (CIVILIZATION) اور سائنس (IENCE)
کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ ان کے پیچھے کارفرما اغراض و مقاصد کی جھلک دکھائی ہے اور ان کے بودے پن کو واضح کیا۔
پھر انہوں نے مغربی فلسفہ کی بنیادی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ بات بغیر لگی لپٹی کے کہہ ڈالی ہے کہ اگر مغرب کی مار
قوت کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کی حیثیت ایشیا اور افریقہ کے مقابلے میں جسد ارضی پر ایک بے وقعت بد گوشت کی رہ جاتی۔
تاریخ میں ہمیشہ مغرب کی وہی حیثیت رہی ہے جو ایک غلط رخ میں بڑھی ہوئی شاخ کی تنے کے سامنے ہوتی ہے اس موضوع
ان کی دوسری کتاب CRISIS OF THE MODERN WORLD میں مزید خیالات کا اظہار کیا گیا ہے یہاں
انہوں نے تاریخ کے قدیم اور روایتی دوری تصور کے حوالے سے تہذیب مغرب کا مقام انسانی تاریخ میں متعین کیا ہے ساتھ ہی اس
مہلک راہ انحراف کی نشاندہی بھی کی ہے جس پر مغرب گامزن ہے، جو کھلی گمراہی ہے اور جس نے مغرب کو سیدھی راہ دیکھنے
سے اندھا بنا رکھا ہے۔

شیخ عبدالواحدؒ کا کہنا ہے کہ ظاہری اختلافات کے باوجود تمام مشرقی ادیان میں مابعدالطبیعات یا دوسرے الفاظ میں الٰہیات
ایک ایسی چیز ہے جو مشترک ہے مغرب میں بھی نشاۃ ثانیہ سے پہلے بری بھلی شکل میں مابعدالطبیعات موجود تھی گو مغرب نے
کبھی بھی اس کو پوری طرح نہیں سمجھا۔ فی زمانہ تو مغرب والے مابعدالطبیعات کے لفظی معنی سے بھی غافل ہو چکے ہیں مغرب کو یہ بات
سمجھانے کے لیے انہوں نے ہندو روایت کو استعمال کیا ہے کیونکہ مغرب والے اسلام کے حوالے سے کوئی بات سنجیدگی سے
اور تعصب کے بغیر سننے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ہندو تصور حقیقت کو سمجھانے کے لیے انہوں نے تمہیدی مقدمات کے طور پر جو
کچھ لکھا ہے وہ ان کی تصانیف کو سمجھنے کے لیے کلیدی اہمیت رکھتا ہے مشرق و مغرب کی تاریخ قدیم تاریخ کے متعلق مغرب
کے مغالطے اور کذب عمد، ازمنۂ قدیمہ میں بین الاقوامی علمی روابط، لسانیات، ترجمہ، مستشرقین کی حماقتیں اور بدویانتی روایت،
روایت اور مذہب، مابعدالطبیعات، مابعدالطبیعات اور فلسفہ میں فرق اور دونوں کا موازنہ اور مقارنہ، غرض یہ کہ وہ
موضوعات ہیں جن پر انہوں نے اپنی کتاب INTERODUCTION TO THE STUDY OF HINDU DOCTRINE
میں قلم اٹھایا ہے۔ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے حصہ اول میں ان تعصبات کو دور کرنے کی سعی کی گئی ہے جو مغرب کے ذہن میں
نشاۃ ثانیہ کے بعد سے راسخ ہو چکے ہیں مثلاً یونان و روم کی تہذیبوں کی بے جا تحسین اور اس کی خاطر دوسری تمام تہذیبوں کی
عمداً یا غیر شعوری تحقیر۔ اس ضمن میں تمام متعلقہ تاریخی مسائل سے بھی بحث کی گئی ہے دوسرا حصہ کتاب کا سب سے اہم حصہ
ہے اس میں اولاً تو مختلف انداز ہائے تفکر کو ایک دوسرے سے ممیز کیا گیا ہے اور پھر مابعدالطبیعات یا حکمت خالدہ کی امتیازی
اور حقیقی نوعیت کو واضح کیا ہے جو ہر روایت کی روح لازوال ہے، جس کا عرفان فوز عظیم ہے اور صرف اسی پر علم کے لفظ کا حقیقی
معنوں میں اطلاق کیا جا سکتا ہے اسی سلسلے میں مذہب (RELIGION) علامت (SYMBOLS)
تصوف (ESOTERISM) اور توہمات (SUPESTITIONS) جیسے الفاظ کی بھی تشریح کی گئی ہے
لوگ باگ عموماً ان الفاظ کو مبہم اور گمراہ کن انداز میں استعمال کرتے ہیں شیخ عبدالواحدؒ نے ان کی اصل اور ان کی تحریف دونوں کی تحقیق و
تفتیش کے بعد ان کو متعین اور باقاعدہ معانی عطا کیے۔ علاوہ ازیں مابعدالطبیعات اور اس کے موزوں ترین ذریعہ نقل و ابلاغ "روایت"

کی الہاماتی حیثیت کو بحال کیا ہے ۔ مابعد الطبیعات جو اصل اصول یا حقیقت مطلقہ کا علم ہے جو مبداء و معاد اور منتہاء و مقصود ہے [1]

حصہ سوم میں ہندو روایت اور مختلف مراتب وجود پر اس کا اطلاق موضوع بحث ہے حصہ چہارم میں پھر مروجہ فکری مغالطوں کی تصحیح کی سعی کی گئی ہے اس مرتبہ یہ صرف مغرب ہی سے متعلق نہیں بلکہ ہندوؤں کے تصور حقیقت میں جو تحریف کی گئی اور ان میں سے مغربی خیالات برآمد کرنے یا ان پر مغربی خیالات کا پیوند لگانے کی جو کوششیں مختلف اغراض کے تحت کی گئی تھیں ان کا پول کھولا ہے ان تمام باتوں کے بعد انہوں نے خاتمۃ الکتاب کے عنوان سے باب لکھا ہے جس میں مشرق و مغرب کے مابین تبادلۂ افکار کی بنیادی شرائط پیش کی گئی ہیں۔

MAN AND HIS BECOMING ایک طرح سے INTRODUCTION کا ضمیمہ ہے یہاں شیخ نے ہندو روایت کے حوالے سے انسان کی فطرت و ماہیت سے بحث کی ہے۔ اور مابعد الطبیعاتی اصولوں کے موقع اطلاع کی وضاحت کی ہے۔

ان تمام افکار میں ان کے ہاں عام یورپی یا مغربی فلاسفہ کی طرح من گھڑت آراء کا کوئی وجود نہیں انہوں نے تو صرف مشرق کی روایتی فکر کے مستند نمائندوں سے ان کی تعلیمات سیکھ کر ان کی روشنی میں مغرب پر تنقید کی اور مغرب کو مشرق سے روشناس کروایا۔ یوں بھی مابعد الطبیعات کے میدان میں انفرادی شخصیت کی اہمیت ثانوی اور علم کی حیثیت بنیادی اور مقدم ہوتی ہے اسی لیے تو ہمارے ہاں کی تاریخ میں ایک سے زیادہ نوح اور ابراہیم علیہ السلام کا نام ملتا ہے۔ یہی حالت زرتشت اور بدھ کی ہے کہ یہ اسماء ایک فرد معین کی ہی نہیں بلکہ ایک ادارہ کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ خود شیخ نے بھی لکھا ہے کہ "IN A TRADITIONAL CIVILIZATION THE HIGHEST INSULT WHICH COULD BE OFFERED TO A THINKER WAS TO PRAISE HIM FOR HIS NOVELTY"

مغرب والے چونکہ روایت TRADITION کے لفظ کو صرف رسم و رواج یا عادت کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور ان کے دانشور بھی اس کے برتنے میں جا بجا ٹھوکر کھاتے ہیں [2] لہذا شیخ عبدالواحد نے اپنی تصنیف

---

[1] مضمون میں مابعد الطبیعات کا لفظ بار بار آ رہا ہے اس لیے یہ وضاحت بیجا نہ ہوگی کہ اس کے معنی یہاں پر نہ تو وہ ہیں جو جناب ارسطو صاحب کے ہاں تھے یا ان کے جاہل مترجمین نے سمجھے نہ ہی اس سے مراد موجودہ مغربی فلسفہ کی ایک شاخ ہے جو اس نام سے غلط طور پر موسوم ہے برعکس نہند نام زنگی کافور۔ اس کے صحیح معانی کے لیے شیخ کی مذکورہ بالا کتاب کے حصہ دوم سے رجوع کیجئے یا اپنی روایت کے کسی مستند نمائندے سے دریافت فرمائیے۔

[2] مثال کے طور پر دیکھئے (T S. ELIOT) کی روایت کے تصور پر بحث جو انہوں نے اپنے مضمون TRADITION AND THEINDIVIDUAL TALENT اور کتاب AFTER STRANGE GODS میں فرمائی ہے

(دنیا کا بادشاہ) LE ROI DU MONDE

میں قدیمی روایت کے تصور اور اس لفظ کے مختلف اطلاقات کی وضاحت کی ہے اور اس کے صحیح معانی کا تعین کر دیا ہے ضمناً الزبتھ اوّل (ELIZABETH 1ST) کے دور کا عالمگیر شہنشاہیت کا تصور بھی زیر بحث آیا ہے اس تصور کی روایتی معنویت کیا تھی، اس کی توضیح کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ الزبتھ اوّل کے نظریہ شہنشاہیت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حکمران میں ظاہری اور باطنی استعداد ہو یا نہ ہو اسے زمین پر خدا کا نمائندہ تسلیم کیا جائے اور نہ صرف دنیاوی بلکہ دینی معاملات میں بھی اس کو مطلق اور غیر مسؤل اقتدار حاصل ہو۔ اس معاملے میں جو خلفشار یورپ میں پیدا ہوا اس کا حال انہوں نے ایک اور کتاب (L'AUTORITE SRIRITUELLE ET POUVOIR TEMPORAL) میں بیان کر دیا ہے۔

مضمون کے آغاز میں ہم نے اس فکری صورت حال کی طرف مختصر اشارہ کیا ہے جس سے مغرب انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں دو چار تھا۔ شیخ نے اسی دور میں کام شروع کیا چنانچہ وہ اس دور سے کما حقہ آگاہ تھے اس زمانے میں جو لوگ واقعی اپنی تلاش میں مخلص تھے ان میں سے بھی بہت کم مشرقی ادیان کے مستند نمائندوں سے رابطہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے بیشتر لوگ جعلی مذاہب ایجاد کرنے والوں کے ہتھے چڑھ گئے[1] مغرب میں تحریف روایت اور جعلی مذاہب و کلیسا ایجاد کرنے کی با وجہ اس مرعت سے پھیلی کہ شیخ کو اس کی تردید کے لیے

LE THEOSOPHISME, HISTOIRE D'UNE PSEUDO — RELIGION

کے نام سے پوری کتاب لکھنی پڑی۔ اسی صورت حال میں وہ لوگ بھی سامنے آئے جو جعلی باطنیت اور روحانیت کی ترویج کے لیے کوشاں تھے تحریف فی الروایت اور انکار روایت کے بعد تیسرا مرحلہ جعلی روایت ایجاد کرنے کا ہوتا ہے۔ اسی سے مغرب اس وقت گزر رہا ہے۔ اس مرحلہ میں جعلی روحانیت کے علمبردار اصلی روحانیت کے انکشاف کا اعلان کر رہے ہیں اور مخفی علوم (OCCULT) کے نام پر لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ شیخ نے بتایا کہ مخفی علوم تو ہر دور اور ہر تہذیب میں رہے ہیں مگر ان کو OCCULTISM کے نام سے کبھی نہیں یاد کیا گیا ISM کے لاحقے سے مراد ہے کہ ان کی بنیاد کسی ایک اصول واحد پر ہے۔ روایتی تہذیبوں میں ان کا درجہ بہت پست تھا اور ان کی طرف توجہ کرنے والے بھی گھٹیا سمجھے جاتے تھے۔ ان سب باتوں کی وضاحت انہوں نے ایک اور کتاب L'ERRUER SPIRITE میں کی ہے اور ان جعلی مدعیان مذہب کے بے بنیاد دعوؤں کی تردید کی ہے۔

1۔ جعلی مذہب سازی کی مثال کے طور پر دیکھیئے GURDGIEFF گروجیف اور اس کے شاگرد آسپنسکی OSPENSKY کی تصانیف، گروجیف نے کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا لے کر بھان متی کا کنبہ بنا رکھا تھا اور ان نظریات کو کسی بھی روایت سے وابستہ ہوئے بغیر استعمال کرتا تھا درحقیقت یہ شخص اپنے قریب آنے والے ہر شخص پر تنویمی اثرات سے قابو پایا کرتا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیئے GURDGIEFF IN THE LIGHT OF TRADITION: BY W.N. PERRY (سیدی عبد القیوم)

مغربی سائنس کا مزاج خالصتاً مقداری اور نتیجتہً مادی واقع ہوا ہے اور یہ کچھ اس سے خاص نہیں بلکہ مغربی تہذیب کے ایک غالب رجحان کا بس ایک مظاہرہ، یہ وہی رجحان ہے جو ہر معیار اور اصول کو فقط مقدار اور تعداد تک محدود کر کے رکھنا چاہتا ہے شیخ عبدالواحد نے اپنی کتاب REIGN OF QUANTITY جس میں ہر شعبہ حیات میں اس رجحان اور ذہنیت کی کارفرمائی پر روشنی ڈالی ہے اس کتاب میں انہوں نے مغربی سائنس اور صنعت کے مختلف ہولناک پہلوؤں پر خاص طور پر تبصرہ کیا ہے آخر میں تحلیل نفسی PSYCHO - ANALYSIS اور اس کے نظریات اور خطرات پر بھی تبصرہ کیا ہے اور اس کے نقصانات اور کوتاہی پر اظہار خیال کیا ہے

ان کتابوں کے علاوہ ان کی کئی کتابیں اور بھی ہیں جن کے ہم صرف نام جانتے ہیں اور فی الوقت ان کا تعارف کروانے کے قابل نہیں ان کے نام فہرست میں دیکھے جا سکتے ہیں

کتابوں کے علاوہ شیخ عبدالواحدؒ نے متعدد رسائل و جرائد میں کثیر تعداد میں مضامین بھی تحریر کئے ہیں ان رسائل میں مصطفیٰ عبدالعزیز (ریشل والساں) کا رسالہ ETUDES TRADITIONELLES سر فہرست ہے اس میں شیخ کے مضامین عرصہ دراز تک شائع ہوتے رہے ہے تصوف سے متعلق ان کے بعض مضامین مثلاً الروح، اعیان ثابتہ، الفقر، وغیرہ کا انگریزی ترجمہ محمد حسن عسکری مرحوم کے ذاتی کتب خانہ، کراچی میں موجود ہے جو غالباً انہوں نے خود ہی کیا تھا اردو میں ان کی کسی کتاب کا باقاعدہ ترجمہ ابھی تک نہیں ہو سکا۔ سنا جاتا ہے کہ مشکور حسین یاد صاحب نے.... CRISIS کا ترجمہ کر دیا ہے مگر تا دم تحریر یہ منظر عام تو کیا منظر خواص پر بھی نہیں آسکا۔ شیخؒ کی ایک اور کتاب رمز صلیب کے ایک باب کا ترجمہ جمال پانی پتی صاحب نے کیا ہے جو "سیپ" شمارہ نمبر ۳۷ کے ایک باب میں "جنگ کی رمزیت" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ انہوں نے کچھ اور کام بھی اس سلسلے میں کر رکھا ہے اور بہت کچھ کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صحت کاملہ عطا کریں اور اس موجودہ ترجمہ کی تکمیل کی توفیق دیں اردو میں شیخ عبدالواحدؒ یحییٰ کی حیات و تصانیف پر یہ پہلا مضمون ہے اور اسے بھی میں نے اس لیے لکھ دیا کہ وہ لوگ جو ہر طرح مجھ سے بہتر اور اس کام کے زیادہ اہل ہیں، بچکچا رہے ہیں۔ ان کے عدم تعاون کے باعث یہ بار مجھ کو اٹھانا پڑ رہا ہے کہ ہم لاکھ غافل سہی اپنے محسنین کو پہچاننا تو چاہیئے پروفیسر حضرات کا تو ذکر ہی کیا ہے انہیں تو صرف PROFESS کرنے سے غرض ہوتی ہے، وہ لوگ بھی جو دن رات اجتہاد اجتہاد کا ورد کیا کرتے ہیں اور اسلام کی تعبیر نو زمانہ حال کے مطابق کرنے یا اسے اذہان جدیدہ کے لیے قریب الفہم طریقے سے پیش کرنے پر زور دیتے ہیں وہ بھی یہ نہیں جانتے کہ یہ کام شیخ عبدالواحدؒ اور ان کے تلامذہ اور مستفاد حضرات کس خوبی سے کر رہے ہیں۔

ان کے حلقہ اثر میں آنے والوں کا ذکر آ ہی گیا ہے تو یہ بیان کرنا بے جا نہ ہوگا کہ آج مغرب کے صف اوّل کے دانشوروں میں ان لوگوں کی کثرت ہے جو کسی نہ کسی طرح شیخؒ سے وابستہ رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ آئندہ دس برس میں یہ گروہ مغرب کا سب سے با اثر اور فکر ساز طائفہ علمی ثابت ہوگا۔ اس کے ارکان کی بات اسی توجہ سے سنی جائے گی جس توجہ سے آج سارتر اور اس کے قبیل کے لوگوں کی سنی جاتی ہے ان لوگوں میں سر فہرست شیخ عیسیٰ نورالدین ہیں

جن کو فلسفے کے پروفیسر پاکستان میں FRITHJOF SCHUON کے نام سے جانتے ہیں موصوف سلسلۂ شاذلیہ علویہ میں صاحب اجازت ہیں تقابل ادیان اور فلسفہ دین پر ان کو مغرب میں سند مانا جاتا ہے انگریزی میں ان کی نو دس کتابوں کا ترجمہ ہوچکا ہے تاہم پروفیسر حضرات اپنی فکری بے بضاعتی چھپانے کے لیے انہیں پڑھنے کی زحمت کم ہی کرتے ہیں۔

دوسرے صاحب ابوبکر سراج الدین ہیں۔ ہمارے ہاں یہ MARTIN LINGS کے نام سے معروف ہیں انگریزی اور عربی میں لکھتے ہیں۔ تصوف ان کا خاص موضوع ہے اور مغرب میں اس پر سند کا درجہ رکھتے ہیں اعلیٰ پائے کے شاعر اور مترجم ہیں ان کی پانچ چھ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

مصطفےٰ عبدالعزیز MICHAL UALSAN صاحب کا گزشتہ برس انتقال ہوگیا۔ مرحوم مجلہ ایتود ۔ ۔ ۔ ! دتراد یسیونل کے مدیر اور متبحر عالم تھے ان کا مجلہ مغرب میں تصوف اور روایتی علوم کی توضیح اور اشاعت کرنے والا معتبر ترین جریدہ ہے۔ TITUS BURCHARDT نے خصوصیت سے قدیم تہذیبوں کے تصورات فن اور ان کے نمونوں پر توجہ مرکوز کی ہے صوفی تصورات پر ایک معرکۃ الآرا کتاب لکھی ہے اس صدی میں کیمیا ALCHEMY پر لکھی جانے والی سب سے اچھی کتاب کے مصنف بھی یہی حضرت ہیں شیخ اکبر ابن عربی کی فصوص الحکم، الجیلی کی انسان کامل اور شیخ درقاوی کی رقعات درقاویہ کا ترجمہ فرانسیسی اور انگریزی میں انہوں نے کیا ہے۔ موصوف جرمن، انگریزی، فرانسیسی، سوئس عربی اور فارسی پر عبور رکھتے ہیں۔

دیگر اہم شخصیات GIA ETON, MARCO PALLIS, W N, PERRY, LORD NORTHBOURNE اور LEO SCHAYA کی ہیں۔ ان تمام حضرات کا اور شیخ عبدالواحدؒ کا بارہ سے بیس برس تک ساتھ رہا۔ انؒ کی وفات کے بعد سے یہ لوگ مغرب کے مختلف حصوں میں پھیل کر مشرق و مغرب کے درمیان واسطۂ تفہیم کا کام دے رہے ہیں

شیخ عبدالواحد یحییٰؒ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے عبدالحلیم محمود مرحوم رئیس الجامعہ ازہر نے ایک عبارت نقل کی ہے جو ایک مصری جامعہ میں شیخ کے تعارف کے طور پر پیش کی گئی تھی کہ

"رینے گینوں ان شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے تاریخ میں ایک مقام پیدا کرلیا ہے مسلمان انہیں امام غزالیؒ جیسے لوگوں کا ہم پلہ سمجھتے ہیں اور غیر مسلم ان کو نو افلاطونیت کے بانی افلوطین PLOTINUS اور اس جیسے بڑے لوگوں کا ہمعصر گردانتے ہیں"

ہمارے زمانے میں عموماً ایسی نابغہ شخصیات کی قدر ان کی زندگی میں نہیں ہوا کرتی مگر شیخ عبدالواحدؒ کچھ ایسے نصیبہ ور تھے کہ ان کی قدر و منزلت اس کی زندگی میں بھی ہوئی اور ان کی موت کے بعد بھی۔ گو کلیسا نے ان کی کتابوں کا مطالعہ ممنوع قرار دے دیا تھا۔ تاہم اس سے ان کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ کلیسا ایسا سلوک صرف ان عباقرۂ فکر سے کیا کرتا ہے جس سے اسے شدید قسم کا اندیشہ ہو۔ رینے گینوں کی ذات میں اسے گزشتہ تمام خطرات سے بڑا خطرہ نظر آرہا تھا اس کے باوجود شیخ عبدالواحدؒ کی دعوت پر لوگوں نے لبیک کہا اور ان کے نقش قدم پر چل کر اسلام قبول کرلیا۔ تنزکیہ، اخلاص اور اطاعت الٰہی کو اپنا شعار بنایا۔ ان

بیں سے بعض اصحاب کے نام مندرج ہو چکے ہیں ان کے زہد و تقویٰ اور اطاعتِ الٰہی کی شہادت ان کے دشمن بھی دینے پر مجبور رہیں۔ ہمہ گیر مادیت، ہوا و ہوس کے غلبے اور مغربی تہذیب کی ظاہری چکا چوند میں گھرے ہوئے لوگ آج بھی اطمینان قلب اور پاکیزگی کے لیے ان کی پناہ لینے پر مجبور ہیں۔

کلیسا کی مخالفت کے باوجود شیخ عبدالواحدؒ کی تصانیف دنیا میں پھیل گئیں ان کے یکے بعد دیگرے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور مغرب کی بہت سی زبانوں میں ان کے تراجم کئے گئے ان کی ایک کتاب کا ترجمہ سندھ چلینی کی زبان میں ہوا تو اسے ولانی لاؔم کے آخری وصایا کی شرح کا درجہ حاصل ہو گیا۔

آج مغرب میں تاریخ ادیان کا کوئی متخصص ایسا نہیں پایا جاتا جو ان کے نام سے ناآشنا ہو یہ تو تھی ان کی زندگی میں ان کی تقدیر موت کے بعد ان کی قدر شناسی میں اور اضافہ ہو گیا دنیا کے بیشتر جرائد میں ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور شائع ہوا مثلاً مصر کا عربی مجلہ "مصور" دوسرا رسالہ مصر جدید EGYPT NOVELLE نہ صرف کئی ہفتے تک ان پر مواد شائع کرتا رہا بلکہ بعدازاں ہر سال ان کی تاریخ وفات پر ضرور کچھ شائع کرتا ہے

فرنسا آسیا FRANCIOS ASIE نے ان کے متعلق ایک ضخیم خاص شمارہ شائع کیا۔ (۱۹۵۱ء) اس میں مشرق و مغرب کے بڑے بڑے مصنفین نے حصہ لیا اس کا افتتاح فرانس کے ایک بڑے شاعر آندرے ژید کی تحریر سے ہوا تھا جس میں اس نے اعتراف کیا تھا کہ رینے گینوں کی تحریریں مٹنے والی نہیں۔

اسی طرح معروف مجلہ ایتود ترادیشونل (ETUDES TRADITIONELLES) نے جو سارے مغرب میں تصوف کی صحیح نمائندگی کرتا رہا ہے، ایک ضخیم خاص نمبر ان کے بارے میں شائع کیا (۱۹۵۱ء)

مشہور صحافی پول سیران (PUAL SIRON) نے ان کی حیات و افکار پر ایک ضخیم کتاب لکھی اور ان پر لکھنے والے تمام لوگوں کی طرح انہیں وہی مقام دیا جس کے وہ مستحق ہیں یعنی امام غزالیؒ یا افلوطین کے برابر۔

شیخ عبدالواحدؒ کے بارے میں ہم نے اپنی معلومات کا خلاصہ پیش کر دیا ہے اب ہمیں مضمون کے اختتام سے قبل صرف ایک سوال کا جواب دینا ہے بعض افادیت پرستوں کے ذہن میں ممکن ہے یہ اشکال پیدا ہوا ہو کہ اگر شیخ "مشرق کے ایسے مداح، مفسر اور مبلغ تھے کہ مغرب والے پہلی بار ان کے ذریعے صحیح طور پر مشرق سے واقف ہوئے اگر انہوں نے سب کچھ مشرق ہی سے اخذ کیا ہے (وہ اس کے معترف ہیں) تو پھر مغرب کے لیے ان کی اہمیت سے قطع نظر ہمارے لیے ان کی تصانیف یا افکار کی کیا معنویت ہے؟ (محذوف یہ ہے کہ ہم تو خود مشرقی اور اپنی روایات سے واقف ہیں) اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ وہ ایک مسلمان عالم ہیں اور انہوں نے عصری تاریخ کے مہمات مسائل پر ٹھیٹھ روایتی نقطۂ نظر سے تبصرہ کیا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ خود عالم اسلام میں بھی گزشتہ سوا ڈیڑھ سو سال کے عہد غلامی اور دور استعمار کے دوران ایک ایسا طبقہ بڑی تعداد میں پیدا ہو چکا ہے جو نہ صرف یہ کہ مغربی تہذیب کی برتری کا دل سے قائل ہے بلکہ مغرب

سجاد سلیم ہوتیانہ مدیر "راوی" کے سامنے ایک انٹرویو کے دوران، مس این میری شیمل نے ان کے قول و فعل کی یکسانیت اور ان کے طرز حیات کی للّٰہیت کا اعتراف کیا ہے (ریڈیو پاکستان)

کے انسان کو بھی اعلیٰ قسم کا انسان بلکہ فوق الانسان تصور کرتا ہے، دوم وہ لوگ جن کی تعلیم و تربیت خالصاً مغربی انداز ہائے فکر و عمل کے تحت ہوئی ہے اپنی روایت کو سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔ شیخ عیسیٰ نورالدین کے الفاظ میں "جن کی نگاہ سے خدا اور دین پر یقین کی ٹھوس بنیاد شاذ و نادر ہی اوجھل ہو چکی ہے۔ جو یہ بھول چکے ہیں کہ روایت کوئی بچگانہ یا ازکار رفتہ دلیر بالا نہیں بلکہ وہ علم ہے جو بے حد حقیقی ہے" [1] روایت کے مستند نمائندوں اور ان کے مابین مغرب کی خلیج حائل ہو چکی ہے۔

ثالثاً وہ مخلص مسلمان جو اپنی روایت کی ہر قیمت پر مدافعت کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کو معلوم نہیں کہ دشمن کے لشکر کی تعداد اور نوعیت کیا ہے اس کے کمزور مقامات کون سے ہیں اور اس پر حملہ کرنے کا کون سا طریقہ موزوں ترین ہے۔ شیخ عبدالواحد کی تحریریں ان تینوں طبقات کے لیے مفید ہیں گو ان کی اہمیت مختلف الحیثیات اور اس سے کہیں زیادہ ہے پہلے طبقے کے غلط خیالات کا تریاق ہیں دوسرے کی راہ تفہیم میں حائل رکاوٹوں کو دور کرتی ہیں اور تیسرے کو مطلوبہ امداد بہم پہنچاتی ہیں۔

مغرب روز بروز ہمارے ہاں نفوذ پذیر ہے۔ ہم آپ کسی طرح اسے اپنے ہاں سے یکلخت اکھاڑ کر نہیں پھینک سکتے۔ تو پھر جب ہمیں اس سے نبرد آزما ہونا ہی ہے تو ایک نئی چیز کو مجبوراً ہی سہی اپنے ہاں جگہ دینے سے قبل اس کی نوعیت اور قدر و قیمت تو سمجھ لی جانا چاہیئے دوسری طرف یہ بات مسلم ہے کہ مغربی تہذیب کا عمومی مزاج تو دور کی بات ہے اس کا کوئی پہلو بھی شیخ عبدالواحد کی تحریروں کے بغیر ڈھنگ سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ مشرق و مغرب کی جانچ پڑتال میں بھی ان کی کتابیں بہت مساعد ہیں اس سے بڑھ کر یہ کہ ہم جس زمانہ میں زندہ ہیں اس کے مسائل کا ادراک تاریخ عالم میں موجودہ دور کے مقام کا تعین اور اس کے بارے میں ہمارے رویے کی تشکیل ان کی تحریروں کے بغیر ممکن نہیں اگر ہمیں اپنی نجات مقصود ہے اگر ہمیں اپنی روایت کی حفاظت اور غلبۂ اعدا سے اس کی مدافعت کرنا ہے اگر ہمیں سلامتیٔ فکر عزیز ہے اور ہم فکری و علمی مغالطوں سے بچ کر حق و باطل میں تمیز کرنا چاہتے ہیں تو . . . . ہمیں شیخ عبدالواحد یحییٰ کو پڑھنا اور سمجھنا ہوگا خواہ اس کے لیے ہمیں چین کے علاوہ فرانس جانا پڑے۔

واللہ الموفق والمعین ھو یقول الحق و یھدی السبیل

---

1 ISA NUR UDDIN (SCHUON) UNDERSTANING ISLAM FOREWARD (ALLAN SUNWIN – LONDON) 1963

المراجع (حیات و افکار)

فرانسیسی

1 PAUL CHACORENAC – LA VIE SIMPLE DE RENE' GUENON PARIS 1958

(اس کتاب کا انگریزی ترجمہ لندن سے شائع ہو چکا ہے)

2 LUCIEN MEROZ – RENÉ GUÉNON – ON LA SAGESSE INITIATIQUE– PARIS : 1962

3 PAUL SIRON — RENÉ GUENON

عربی

۴ عبدالحلیم محمود — الفیلسوف المسلم ۔ مکتبہ انجلومصریہ - قاہرہ ۱۹۵۴ء

۵ ——— اروبا والاسلام — المکتبہ الفنی للنشر قاہرہ ۱۹۵۹ء

(اس کتاب میں شیخ" پر ایک مختصر تعارفی مضمون شامل ہے)

تصانیف

(الف) جن کے انگریزی تراجم ہو چکے ہیں

1 - EAST AND WEST (LUZAC — LONDON 1941)

2 — CRISIS OF THE MODERN WORLD (LUZAC — LONDON, 1941, 1943, 1958)

3 — INTRODUCTION TO THE STUDY OF HINDU DOCTRINES (LUZAC - LONDON — 1945)

4 — MAN AND HIS BECOMING ACCORDING TO VEDANTA (LUZAC- LONDON — 1958)

5- SYMBOLISM OF THE CROSS (LUZAC LONDON 1958) new. ed — PERENNIAL BOOKS ENGLAND)

6- REING OF QUANTITY — (LUZAC 1956, LONDON new, ed PERENNIAL - BOOKS, ENGLAND)

7 INITIATION AND THE CRAFT (PERENNIAL BOOKS, ENGLAND)

8 REFLECTIONS ON CHLISTIAN ESOTERISM LONDON)

فرانسیسی (تاحال غیر مترجم)

9 — LE THEOSOPHISMS ; HISTORIE DUNE PSEUDO RELIGION

10 - L' ERRUER SPIRITE

11 - L, ESOTERISM DE DANTE

12, LE ROI DU MONDE

13, L, AUTORITE' SPIRITUELLE ET POUVOIR TEMPORAL.

14- LES, ETATS MULTIPLES DE L'ÊTRE

15- LES OPRINCIPES DU CALCUL INFINITÉSIMAL

16, LA METAPHYISIQUE ORIENTALE,

17, L' ESOTERISME ISLOMIQE

18, APERSUS SUR L CSOTERISME ISLAMIQUE CT LE TAOISME. PROLOGOS BOOKS ENG 1975

19, FORMES TRADITIONELLES CT CYCLES COSMIQUE PROLOGOS BOOKS : ENG. 1978

ڈاکٹر عبدالحلیم محمود
اخذ و ترجمہ: محمد سہیل عمر

رینے گینوں: حیات و نظریات

شیخ عبدالحلیم محمود جامعۃ ازہر کے چانسلر تھے۔ پچھلے برس کے اواخر میں انتقال ہوا موصوف نے سوربون سے ڈاکٹریٹ کی تھی تصوف اور فلسفۂ اسلام سے خصوصی دلچسپی تھی ان موضوعات پر درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ خود بھی صوفی تھے اور سلسلہ شاذلیہ میں بیعت تھے (مترجم)

میں عبدالواحد یحییٰ سے کیسے متعارف ہوا

جون ۱۹۴۰ء کا وہ خوبصورت اور روشن دن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس روز میں جلدی جاگ گیا تھا اور اپنے آپ کو اس معرکۂ علمی کے ہنگامے کے لیے تیار کر رہا تھا جو سوربون یونیورسٹی میں میری ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے انٹرویو کی صورت میں ہونے والا تھا۔ یونیورسٹی کی روشوں پر سے گذرتے ہوئے جدھر نگاہ دوڑاتا تھا گھبرائے ہوئے چہروں اور دہشت زدہ لوگوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ جرمن پیرس کے سر پر آپہنچے تھے اور ان کی راہ میں حائل ہونے والے قلعے اور حفاظتی اقدامات حملے کی تندی کا سامنا کرنے سے معذور تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود میں اپنی ہی دھن میں مگن تھا۔ میرے ذہن میں صرف وہ سوالات گردش کر رہے تھے جن سے مجھے دوچار ہونا تھا اور وہ تنقید گھوم رہی تھی جس کا مجھے سامنا کرنا تھا یونیورسٹی کے احاطے میں پہنچا تو پال ریوولیٹی کو اپنی تلاش میں پایا۔ پال سفید روس کے مہاجرین میں سے تھا وہ ایک کتاب ہاتھ میں لیے میرا انتظار کر رہا تھا۔ کتاب کا عنوان تھا "دانتے کا تصوف" اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں وہ کتاب مصر میں عبدالواحد یحییٰ کو پہنچا دوں اس کو معلوم تھا کہ انٹرویو کے بعد میں وطن واپس لوٹ جاؤں گا۔ میں نے پوچھنے کی کوشش کی کہ عبدالواحد یحییٰ کون ہیں مگر وہ چپ سادھے رہا۔

انٹرویو ختم ہوگیا۔ فرانس میں میرا دورِ قیام اپنے خیر و شر اور تلخ و شیریں سمیت گذر گیا اور انجام کار میں قاہرہ چلا آیا اپنے مستقر پر پہنچتے ساتھ ہی میں شیخ عبدالواحد یحییٰ کے گھر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ پوچھتا پاچھتا شارع نوال پر محلہ الدقی کے ایک مکان پر جاکر دستک دی۔ ایک نوکر نے باہر جھانکا۔ میں نے کتاب اس کے حوالے کر دی اور اس سے کہا کہ میں شیخ سے ملنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ نوکر اندر چلا گیا۔ میں اجازت کا منتظر کھڑا تھا کہ وہی نوکر ہاتھ میں لکڑی کی ایک سٹول نما کرسی لیے باہر نکلا اور اس پر گدی جاکر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "آپ یہاں بیٹھ کر کچھ دیر انتظار فرمایئے۔"

میں دروازے کے باہر سڑک پر بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ وقت گذرتا رہا۔ انتظار طویل ہوتا گیا وہی نوکر پھر نظر آیا۔ میں بے تاب ہو کر اندر داخل ہونے کو تھا کہ اس نے مجھ سے درخواست کی "آپ آج تو لوٹ جایئے کل گیارہ بجے صبح آجایئے گا"

میں تلملاتا ہوا منہ لٹکائے لوٹ آیا۔ میرے دل پر ایک رعب سا طاری تھا اور چہرے پر خجالت کی چھاپ، تاہم اس واقعہ نے میری آتش شوق کو اور بھڑکا دیا کہ ان صاحب کو دیکھوں تو سہی جو اپنے ملاقاتیوں کے لیے سڑک پر کرسی بچھوا دیتے ہیں اور پھر ان کو نامراد لوٹا کر اگلے روز آنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اگلے دن میں وقت مقررہ پر پہنچ گیا پھر بھی دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا، نہ جانے آج بھی داخلہ ہوتا ہے یا نہیں مگر آج بھی میری قسمت میں کل سے کچھ زیادہ کامیابی نہ تھی چنانچہ مجھے لوٹا دیا گیا اور کسی وعدۂ امید پرور کے بغیر۔ اس نوکر نے آج جو پیغام لاکر دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ جو چاہتے ہیں شیخ کے نام لکھ دیجیے وہ جب پسند کریں گے اس کا جواب دے دیں گے۔

یوں میں دو دن ان سے ملاقات کرنے کی کوشش میں برباد کرکے لوٹ آیا کوئی تحریر چھوڑے بغیر۔ اس لیے کہ میرے لیے ان سے ملاقات اس مراسلت اور جواب سے زیادہ اہم تھی اور پھر میں لکھتا بھی کیا؟ دن گزرتے گئے مگر میرے ذہن میں یہ سوال باقی رہا...... یہ شیخ عبدالواحد یحییٰ ہیں کون؟

پھر ایک روز میں موسیو ڈی کومینن کو ملنے گیا۔ وہ مصر میں فرانس کے ثقافتی اور علمی روابط کے مدیر تھے گفتگو حسب معمول ان کے مشاغل اور علوم کی طرف نکل گئی وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم رینے گینوں کو جانتے ہو جب میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ مجھے ان کے اور ان کے اسلامی نام کے بارے میں بتانے لگے ...... عبدالواحد یحییٰ ...... میں نے اپنے اوپر جو گذری تھی کہہ سنائی۔ انہوں نے مجھے ہمت دلائی کہ میں پھر ملاقات کی کوشش کروں مگر مجھے اپنے اندر عزیمت کی کوئی رمق محسوس نہ ہوئی تھی جو مجھے اس کوشش پر دوبارہ آمادہ کرسکے۔ لکڑی کا وہ سٹول میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا تھا...... چند روز اور گذر گئے۔

پھر ایک روز ڈاک سے مجھے موسیو کومینن کا خط ملا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ مصر میں ارجنٹائن کے سفیر موسیو ہیکٹور مادیرد ان سے ملنے آئے تھے اور متمنی تھے کہ ان کی راہنمائی کسی ایسے شخص تک کر دی جائے جو ان سے فلسفۂ اسلام اور تصوف اسلامی کے باب میں گفتگو کرسکے۔ موسیو کومینن کے خیال میں میں اس کام کے لیے مناسب ترین شخص تھا لہٰذا انہوں نے مجھے سفیر صاحب سے ملنے کی ہدایت کی تھی۔

میں سفیر صاحب سے جاکر ملا۔ انہوں نے چھوٹتے ہی مجھ سے سوال کیا "تم رینے گینوں کو جانتے ہو؟" ایک بار پھر میرے ذہن میں وہ کتاب لکڑی کا سٹول اور موسیو کومینن کی گفتگو چکر لگانے لگی۔ میں نے سفیر صاحب کو سب کچھ کہہ سنایا وہ کہنے لگے کہ بھئی آپ نے تو بڑا معرکہ سر کیا کہ ان کے گھر کا پتہ لگا لیا۔ یہی بڑی بات ہے۔ کیونکہ فرانسیسی سوئس اور دوسرے ممالک کے صحافی جب مصر آتے ہیں تو ان کے پیش نظر ایک مہم رینے گینوں کی تلاش کی بھی ہوتی ہے وہ کبھی ازہر کے محلے کا رخ کرتے ہیں۔ کبھی سیدنا حسین کے محلے کا، کبھی سیدہ زینب کا مگر ان کا کھوج نہیں نکال پاتے اور دل میں حسرت لیے لوٹ جاتے ہیں کہ ان کا مصر کا سفر بار آور نہ ہو سکا۔ چنانچہ اس روز میرے اور موسیو مادیرڈ کے درمیان طے پایا کہ ہم شیخ عبدالواحد اور اپنے مابین اس حجاب کو دور کرکے دم لیں گے۔

وہ دن مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ اتوار کا دن تھا جب ہم نے دروازہ کے سامنے پہنچ کر گھنٹی بجائی اور شیخ نے خود آکر دروازہ کھولا۔ طویل القامت، نور سے دمکتا رعب دار چہرہ، پروقار و پرجلال، آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور صلاح و تقویٰ کی شہادت، شیخ ہمارے روبرو کھڑے تھے ہم نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے ہمارے سلام کا جواب دیا اور ہمارے آنے کا مقصد پوچھا۔ سفیر صاحب نے ان کے ایک دوست کا سلام ان کو پہنچایا۔ اپنے دوست کا نام سن کر شیخ نے ہمیں اندر آنے کو کہا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ شیخ بالکل خاموش تھے۔ ممکن تھا کہ ہماری ملاقات ایک زحمت بن جاتی مگر سفیر صاحب کی ڈپلومیسی کام آگئی۔ انہوں نے شیخ عبدالواحد کے آراء وافکار کی بات چھیڑ دی اور ان کی تعریف شروع کر دی۔ ان کی دقتِ نظر کی تعریف کی۔ یہ سب ہوتا رہا اور شیخ عبدالواحد خاموش۔ ان کے لبوں کو جنبش تک نہ ہوئی حتیٰ کہ محفل ختم ہوگئی ہم نے ان سے درخواست کی کہ ہمیں دوبارہ ملاقات کے لیے حاضر ہونے کی اجازت دی جائے جو انہوں نے ازراہ تلطف قبول کر لی۔ ملاقات سے فارغ ہو کر جب ہم سفارت خانہ پہنچے تو سفیر صاحب نے اپنی بیگم سے کہا" ہم نے ایک بہت اہم شخصیت سے ملاقات کی۔ جانتی ہو کون ہ کوئی وزیر! اس سے بھی بڑا۔ رئیس الوزراء! اس سے بھی بڑا! بادشاہ! اس سے بھی بڑا! ارے تو اور کیا خدا! بس ایک اللہ والا تھا اس کا نام رینے گینوں ہے وہ مرعوب اور متعجب ہو کر کہنے لگی، واقعی آپ دونوں تو خوش نصیب ہیں۔

ہماری ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ شیخ عبدالواحد باتیں کرنے لگے ہم ان سے باتوں باتوں میں بہت کچھ سیکھتے تھے انہوں نے ہمیں بتایا کہ ان کی عزلت گزینی صرف ان ناسمجھوں کے لیے تھی جو سوائے شخصی باتوں اور ذاتی احوال کی کرید میں وقت ضائع کرنے کے اور کوئی مقصد نہیں رکھتے۔ ہم میں چونکہ ان کو معرفت کی طلب صادق نظر آئی تھی لہٰذا ان کے اور ہمارے درمیان کوئی حجاب نہیں رہا۔

اس کے بعد ہماری ہمت بڑھی تو ہم انہیں ان کے حجرے سے نکال کر اپنے ساتھ مسجد سلطان ابوالعلیٰ لے جاتے کبھی کسی حلقۂ ذکر میں جا بیٹھتے اور منہ ہی منہ میں کچھ دہرانے اور جھومنے لگتے۔ آہستہ آہستہ ان کے الفاظ واضح اور جنبش تیز ہو جاتی۔ کبھی وہ دوسرے ذاکرین کے ساتھ مل کر اونچی آواز میں ہل ہل کر ذکر کرنے لگتے کبھی ان کی آواز ڈوب جاتی اور وہ ذکر میں مستغرق ہو جاتے۔ کچھ دیر بعد میں انہیں ٹھوکہ دے کر متوجہ کرتا تو وہ اس طرح زور سے جھرجھری لیتے گویا میں انہیں دوسرے عالم سے کھینچ لایا ہوں۔

دن پر دن گذرتے رہے سفیر صاحب واپس چلے گئے شیخ عبدالواحد وفات پا گئے اور میرے دل میں حسین یادیں باقی رہ گئیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے امام غزالی کی کتاب المنقذ من الضلال شائع کرنے کی توفیق دی اس کے مقدمہ میں مَیں نے تصوف کے بارے میں شیخ عبدالواحدؒ کے بعض مقالات کا خلاصہ بھی شامل کر دیا۔ پڑھنے والوں نے اس حصے کو بہت پسند کیا اس سے مجھے جرأت ہوئی کہ شیخ کے رشحاتِ سے استفادہ کروں اور دوسروں تک پہنچاؤں

شیخ عبدالواحد (رینے گینوں) ۱۵ر نومبر ۱۸۸۶ء میں بلوا[1] (BLOIS) کے ایک کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوئے خاندان کھاتا پیتا خوشحال تھا۔ ان کے والد ایک معزز انجنیئر تھے۔ شیخ کا بچپن بہت پرسکون اور محفوظ گذرا۔ طفولیت ہی سے غیر معمولی ذہانت کی علامات نمایاں تھیں۔ تعلیم کا آغاز آبائی وطن سے ہی کیا اور اپنے ساتھیوں میں ہمیشہ ممتاز اور فائق رہے۔ ۱۹۰۳-۴ء میں بکالوریا (BACHOLAR) کی ڈگری حاصل کی جس کے ساتھ ان کو خاص امتیازی اسناد بھی دی گئیں اسی سال وہ ریاضی میں دلیسانس) کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے عازم پیرس ہوئے۔ دو برس یونیورسٹی کی تعلیم میں گذارے۔ پیرس میں ان کا حصول علم صرف رسمی درسیاتی تعلیم تک محدود نہ رہا۔ وہاں ان کے لیے اور بہت سے دروا ہوئے لذت بخش اور نعمتوں سے بھرپور۔ اس سے ہماری مراد نہ تو حسیاتی لذت ہے نہ مادی انعام۔ بے شک پیرس یہ چیزیں بھی مادیین اور حسیات میں محصور لوگوں کے لیے فراہم کرتا رہا ہے مگر ساتھ ہی پیرس میں لذاتِ روحانی اور انعامات وجدانی کا سامان بھی تھا، صرف ان کے لیے جو دنیا اور اس کی زینت سے دھوکا نہیں کھاتے گینوں بھی اس دوسری قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ انہیں معرفت کی دھن تھی۔ ان کی توجہ کا مرکز زمین نہیں آسمان تھا وہ چاہتے تھے کہ حجابات دور کرکے۔ تمام پردے چاک کرکے واصل الی اللہ ہو جائیں۔ ان کی حالت بھی امام غزالی جیسی تھی جو ہمیں ان کی تحریروں سے معلوم ہوتی ہے۔

"اپنے عنفوان شباب سے لے کر . . . . . بیس برس کی عمر سے آج تک کہ عمر کے پچاس برس پورے ہوتے ہیں میں اس بحرِ عمیق (بحر معرفت) میں غوطہ زن ہوں اور اس کی گہرائی میں اترنے کی جسارت کر رہا ہوں بے دھڑک ڈرتے بچتے نہیں۔ ہر اندھیرے میں گھستا ہوں، ہر مسئلہ کا سامنا کرتا ہوں۔ ہر گرہ کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہر فرقے کے عقیدے کی چھان پھٹک کرتا ہوں، ہر گروہ کے مذہب کا انکشاف کرتا ہوں تاکہ حق و باطل اور مسنون اور بدعت میں تمیز کر سکوں۔ کسی باطنی کو نہیں چھوڑتا کہ اس کی باطنیت سے آگاہ نہ ہوں۔ کسی ظاہری کو نہیں جانے دیتا حتیٰ کہ اس کی ظاہریت کا حاصل نہ معلوم کرلوں، نہ کسی فلسفی کو جب تک کہ اس کے فلسفہ کی کنہ سے واقف نہ ہو جاؤں اور نہ کسی متکلم کو جب تک کہ اس کے کلام اور مجادلہ سے مطلع نہ ہو جاؤں نہ صوفیا کو کہ ان کا راز جان نہ لوں، نہ کسی عابد کو کہ جب تک اس کی عبادت کا حاصل نہ جانچ لوں، نہ ہی کسی زندیق کو نظر انداز کرتا ہوں جب تک اس کے زندقہ اور فسق کے اسباب نہ معلوم ہو جائیں . . . ."

بالکل یہی کیفیت گینوں کی تھی۔ پیرس میں رہ کر وہ رسمی درسیات سے دور ہوتے گئے وہاں طرح طرح کی ثقافتیں موجود تھیں۔ ہر رنگ کی جماعتیں اور مکاتب فکر تھے فری میسن تھے۔ وہ مکاتب فکر تھے جو اپنی نسبت

---

[1] فرانس کا یہ شہر دریائے لوار کے کنارے پیرس سے ۱۷۲ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے مکان کی تعداد ۸۶۸۰۰ کے لگ بھگ ہے بسکٹ اور چاکلیٹ بنانے کے لیے مشہور ہے بہت سے مشاہیر یہاں پیدا ہوئے۔

ہندوستان، تبت یا چین سے کرتے تھے ۔ یہیں گوناگوں رو یا ینیں اپنے مختلف مشارب اور نزاعات سمیت پائے جاتے تھے وہ لوگ بھی تھے جو جادو کے دعوے دار تھے ، منجم تھے یا عناصر میں تصرف اور حاضرات روح کرتے تھے ۔گینوں نے یونیورسٹی کی تعلیم کو بلا تاسف خیر باد کہا۔ اور ان مختلف ماخذ سے اپنی پیاس کی تسکین کا سامان کرنے لگے ان سے منسوب ہو کر ان کو قریب سے دیکھنا شروع کیا ان کے مدعا اور مقصود سے آگاہ ہوئے یہی نہیں بلکہ ان میں اس طرح شامل ہوئے کہ ان مکاتب فکر نے ان کو اپنے ہاں کے کاہنوں میں اونچے درجے پر فائز کر دیا . . . . . مگر ان کا یہی قرب و اختلاط ان فرقوں اور تنظیموں سے ان کی علیحدگی کا باعث بھی بن گیا اس لیے کہ اس میل جول سے ان پر کھل گیا کہ ان میں سے کون طیّب اور کون خبیث ہیں ان کی تنقیدی بصیرت نے ان کی رہبری کی ۔ اپنی متوازن سوچ کی رہنمائی میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان تنظیموں میں سے زیادہ تر محض کھوکھلی اور سطحی ہیں اور انسان کو حقیقتاً" ماورائے طبیعات کی معرفت حاصل کرنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتیں نہ ہی انہیں فرق حجابات پر کوئی قدرت ہے آہستہ آہستہ وہ ان سے دور ہونے لگے ۔ پھر بھی ان جھنجھٹوں سے نکلتے نکلتے انہیں ۵ برس لگ گئے ۔ ۱۹۰۹ء میں انہوں نے ایک رسالہ جاری کیا " المعرفت " یہ رسالہ بھی اسی نہج پر گامزن ہوا جو اس کے پیشرو رسالہ " الطریق " نے قائم کی تھی ۔ دونوں رسالوں کا مزاج اور مواد متصوفانہ تھا " الطریق " کے نکالنے میں ایک فرانسیسی عالم شمپرینو مدد کرتے تھے ۔ وہی اس کی پالیسی کے بھی ذمہ دار تھے شمپرینو نے اسلام قبول کر لیا ان کا نام عبدالحق رکھا گیا ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۹ء تک وہ اس مجلہ کی اشاعت میں مدد کرتے رہے پھر متعدد اسباب کی بنا پر یہ رسالہ بند ہو گیا ۔ اسی اثناء میں گینوں کا تعارف عبدالحق سے ہوا اور عبدالحق " المعرفت " کی تحریر و ترتیب میں گینوں کی مدد پر آمادہ ہو گئے اس رسالہ میں اسلام ، ہندومت ، بدھ مت سے متعلق مباحث شائع ہوتے تھے کبھی ان گمراہ فرقوں پر تنقید بھی ہوتی تھی جو روحانیت کے مدعی بنے ہوئے تھے یہ مجلہ ۱۹۱۲ء تک جاری رہا۔ اسی سال گینوں مسلمان ہو گئے ۔ ان کا نام الشیخ عبدالواحد یحییٰ رکھا گیا ۔

گینوں کا قول ہے کہ وہ مشرقی ادیان تک ان کے نمائندوں سے ملاقات کے ذریعے پہنچے ۔ یہ کیسے ممکن ہوا ؟ ان میں سے کن کن سے وہ ملے ؟ پھر گینوں نے ایک کتاب شیخ عبدالرحمٰن علیش کو معنون کی تھی ۔ یہ شیخ عبدالرحمٰن علیش کون تھے ؟ گینوں ان کو کیسے جانتے تھے ؟ کیا وہی تھے جنہوں نے گینوں کو اسلام کی راہ دکھائی ؟ اگر ہاں تو کیسے ؟

یہ سب سوالات اس وقت تک ناقابل حل اور غامض تھے جب تک میشل والساں (MICHEL VALSAN) نے اپنے مضمون مشمولہ ، اتیود ترادیسونل ، جنوری ۱۹۵۳ء میں ان پر روشنی نہیں ڈالی میشل والساں (مصطفےٰ عبدالعزیز) نے گینوں کے بعد اسلام قبول کیا اور عربی میں مہارت حاصل کی ۔ اس مضمون کا خلاصہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں

(۳)

الشیخ عبدالرحمٰن علیش کا خاندان المغرب کا رہنے والا تھا ۔ اس کے مشہور افراد میں سے شیخ محمد علیش الکبیر

ہیں (۱۲۱۸ - ۱۲۹۹ھ) انہوں نے ازہر سے تعلیم مکمل کی اور وہیں پر ۱۲۴۵ھ میں مسند تدریس پر فائز ہوئے۔ ان کے درس میں تقریباً دوسو طلبہ شریک ہوئے تھے مصر میں فقہ مالکی کے مطابق فتویٰ بھی ان کے ذمہ تھا۔ ایک معاصر شہادت کے مطابق " زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف، تدریس اور عبادت میں دنیا کے جھمیلوں سے الگ تھلگ بسر کیا۔ اللہ کی راہ میں کسی ملازمت کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ بہت سی کتابیں ازہر میں پڑھانے جانے والے مختلف فنون میں تالیف کیں خدیو توفیق کے دور میں آوازِ حق بلند کرنے پر ان کی مخالفت بھی کی گئی مگر وہ اس آزمائش میں کامیاب ہوئے اور خدیو مصر کے ہتھکنڈے ان پر کارگر نہ ہو سکے۔ انہی کی اولاد عبدالرحمٰن علیش تھے۔

گینوں اور محی الدین ابن عربیؒ کا رشتہ تو سامنے کی بات ہے گینوں نے اسلام بھی ایک ایسے شیخ کے واسطے سے قبول کیا جس کی روحانی نسبت شیخ اکبر ہی سے تھی یعنی شیخ علیش الکبیر۔ انہی کے نام گینوں نے اس عنوان سے ایک کتاب کا انتساب بھی کیا " اس مقدس یادوں کے لیے . . . . . شیخ عبدالرحمٰن علیش الکبیر، المالکی، المغربی کی یاد کے نام، جنہوں نے مجھے اس کتاب کا اولین خیال سجھایا، مصر ۱۳۲۹ - ۱۳۴۷ھ"

شیخ عبدالرحمٰن علیش الکبیر کی شخصیت ایک اور پہلو سے بھی اہم ہے تصوف میں تو وہ صاحبِ عظمت تھے ہی ان کی دوسری صفت کی طرف گینوں نے ایک خط میں اشارہ کیا ہے " شیخ علیش طریقہ شاذلیہ کی ایک شاخ کے مرشد بھی تھے اور ساتھ ہی ازہر میں فقہ مالکی کے مفتیٔ اعظم بھی"!

طریقہ شاذلیہ وہ سلسلہ تصوف ہے جس کی بنا ساتویں صدی ہجری میں شیخ ابوالحسن الشاذلی نے رکھی تھی۔ جو مسلمانوں کی بہت بڑی روحانی شخصیت تھے۔

تو گینوں کی نسبت جس شیخ کی طرف کی جاتی ہے اس میں دو صفات مجتمع تھیں شریعت اور شریعت کی حقیقت وہ شیخ طریقت بھی تھے اور فقیہہ مالکی بھی۔ گینوں کی اسلام کے بارے میں آراء یا بحیثیت مجموعی ان کی فکر کے حوالے سے ۴
شیخ علیش کی اہمیت ہمارے لیے دوچند ہو جاتی ہے کیونکہ وہی تھے جنہوں نے گینوں کو " رمزیتِ صلیب " کا خیال دیا، وہی تھے جنہوں نے گینوں کے لیے راہ نکالی اور انہیں راستہ دکھایا، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ پڑھنے والے ان کے اور گینوں کے تعلق سے آگاہ ہو جائیں ان کے بارے میں جو باتیں ہم بیان کریں گے ان کا مآخذ وہ عربی۔ اطالوی مجلہ ہے جو قاہرہ سے ۱۹۰۷ میں " النادی " کے نام سے شائع ہوا تھا۔

اس رسالہ کے روحِ رواں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے افکار تھے یہ رسالہ بعد میں جاری ہونے والے تمام فرانسیسی رسالوں کا پیشرو اور ہراول تھا گینوں اس رسالے میں لکھا کرتے تھے۔ اس رسالے کے دونوں حصوں یعنی عربی ور اطالوی میں جو مصنف سب سے نمایاں تھا وہ تھے عبدالہادی، عبدالہادی اصل میں تو فن لینڈ کے عیسائی تھے ۸
نام ان کا آئیوان گستاف تھا پھر وہ اسلام لے آئے۔ عربی زبان سیکھی اور اس مجلہ میں مقالات لکھنے لگے اس میں انہوں نے صوفیائے اسلام کے بعض رسائل چھپوائے جو شیخ اکبر کے مؤلفات میں سے تھے اور بعض متون کا ترجمہ بھی کیا۔ اس رسالے میں شیخ عبدالرحمٰن علیش کا بہت تذکرہ رہتا تھا۔ اس رسالے میں خود شیخ علیش نے ایک خاص مقالہ محی الدین ابن

عربی پر لکھا تھا۔

عبدالہادی کے شیخ عبدالرحمٰن علیش سے ذاتی تعلقات تھے۔ ان کی تحریر سے ہمیں شیخ کے بارے میں بہت سی نفیس معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی رائے میں شیخ مشہور اسلامی شخصیات میں سے تھے شیخ کے والد فقہ مالکی کے بہت بڑے عالم تھے۔ خود شیخ بڑی گہری فکر کے مالک تھے ہر کوئی ان کا احترام کرتا تھا عوام بھی اور امراء و سلاطین بھی عالم اسلام میں پھیلی ہوئی بہت سی دینی جماعتوں کے شیخ تھے اور زعماء اسلام میں سے تھے اسی طرح تصوف میں، فقہ میں اور سیاست کے حوالے سے بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔ بایں ہمہ وہ اور ان کے والد سیاست کی تمام آلودگیوں سے بہت دور تھے ان کے خلاف ایک بے بنیاد تعصب پھیلایا گیا جس کا آغاز ان کے اس فتویٰ سے ہوا تھا جس کے باعث اعرابی پاشا کی بغاوت (۱۸۸۲ء) میں ظہور میں آئی۔ اسی سال ان دونوں کو قید کر دیا گیا۔ انہیں عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ ان کے والد کا تو قید خانے میں ہی انتقال ہو گیا۔ البتہ شیخ کی عمر قید جلاوطنی میں تبدیل کر دی گئی مگر ان کی تکالیف نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ان کی شہرت اور خاندانی اثر و رسوخ سے خوف کھا کر ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ خلافتِ اسلامیہ قائم کرنا چاہتے ہیں اپنے لیے یا سلطان مراکش کے نام پر۔ اس طرح انہیں پھر قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

دو برس انہوں نے ایک متعفن اور بدبودار کوٹھڑی میں گزارے جہاں ان کے اور بھی سامان اذیت کیا گیا تھا۔ انہیں دھمکانے خوفزدہ کرنے کے لیے ان کے سامنے بعض عمر قید کے قیدیوں کو قتل کیا جاتا رہا۔ آخر انہیں جیل سے نکال کر روڈس میں جلاوطن کر دیا گیا۔

دمشق میں ان دنوں امیر عبدالقادر الجزائری کا بھی قیام تھا۔ شیخ اور امیر عبدالقادر میں گہری دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا دونوں میں اس پرخلوص محبت کی بنیاد شیخ اکبر تھے جن کے مطالعہ کے لیے امیر نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وقت لگایا اور جن کی تعلیمات امیر کے دل کو کچھ ایسی لگیں کہ انہوں نے فتوحات مکیہ کی پہلی طباعت کا خرچ بھی برداشت کیا کتاب کی ضخامت ۲۵۰۰ صفحات کے قریب تھی جب امیر کا انتقال ہوا تو شیخ نے ان کو کفن دیا۔ ان کی نمازِ جنازہ پڑھی اور ان کو صالحیہ میں شیخ اکبر کے مقبرہ کے قریب دفن کر دیا۔

ملکہ وکٹوریہ نے شیخ کے لئے معافی کا اعلان کر دیا تو وہ مصر لوٹ آئے اور قاہرہ میں مقیم ہو گئے ان کا نور قاہرہ سے عالم اسلامی کی تمام اقالیم میں پہنچنے لگا وہ خود بھی صغائرِ گناہ سے دور رہتے تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی دور رکھتے تھے جب بھی آپ کسی مشرقی آدمی سے ملیں اور آپ کو اس میں اخلاق کی بلندی اور وسعت معرفت نظر آئے تو جان لیجئے کہ وہ لازماً شاذلی ہوگا[1] "النادی" نے شیخ علیش کا مقالہ شائع کیا جو محی الدین ابن عربی علیہ الرحمۃ کے آثار کے متعلق تھا اس مقالہ کے اختتام پر شیخ نے عبدالہادی کا شکریہ ادا کیا ہے ان کی خدمات کے لیے جو انہوں نے لوگوں کو ابنِ عربی سے متعارف کروانے کے سلسلے میں انجام دیں پھر یہ کہہ کر مقالہ ختم کر دیا کہ عبدالہادی کو چاہیئے کہ وہ تصوف میں اپنے دراسات کو جاری

---

[1] یہ عبدالہادی صاحب کی رائے ہے۔ ورنہ حقیقی اصحابِ صوفیاً تو سبھی خیر ہیں اور سبھی برکت والے

رہیں اور ان لوگوں کے بہرکنے اور بہکنے کی پرواہ نہ کریں جو اسلام کی حقیقت سے آگاہ نہیں۔ اس مقالہ کے چھپنے کے بعد رسالہ میں ایک اعلان کیا گیا کہ اٹلی اور مشرق میں ابن عربی کی تدریس اور مطالعہ کے لئے ایک جمعیت تشکیل دی گئی ہے جس کا نام "الاکبریۃ" ہوگا۔ اس کا منہاج مندرجہ ذیل تھا۔

(۱) ابن عربیؒ کی تعلیمات کی اشاعت اور تدریس خواہ ان کا تعلق شریعت سے ہو یا اس کی حقیقت سے۔ ان کی اور ان کی تلامذہ کی تصانیف کی طباعت کا انتظام اور ان کی شرح۔ ان کے بارے میں تقاریر، محاضرات اور ان کی آراء کی تشریح کے لیے مذاکرات۔

(۲) شیخ اکبر کے متبعین کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اکٹھا کرنا اور انہیں ایک مضبوط رشتے میں منسلک کرنا مشرق و مغرب کے چنے ہوئے خواص (ﷺ) میں فکری روابط کو فروغ دینا۔

(۳) ان لوگوں کی مادی مدد اور تحریری ہمت افزائی کرنا جو ابن عربیؒ کے چھوڑے ہوئے نقوش کی پیروی کر رہے ہیں خصوصاً وہ لوگ جو ان کی کسی دعوت کو اپنے قول و عمل سے پھیلا رہے ہوں۔

(۴) جمعیت کا کام صرف اسی تک محدود نہ ہوگا بلکہ وہ دوسرے مشرقی صوفیا مثلاً مولانا جلال الدین رومی وغیرہ کی تدریس و اشاعت کا بھی اہتمام کرے گا۔ ہاں اس کی کاوشوں کا مرکز ابن عربیؒ ہی رہیں گے

(۵) جماعت کا سیاست سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اور یہ دین و دانش کے دائرہ سے باہر نہ نکلے گی۔

چنانچہ عبدالہادی نے تعلیمات تصوف کی اشاعت کا آغاز کر دیا۔ قسمت نے یاوری کی اور انہوں نے ابن عربی علیہ الرحمۃ کے تقریباً ۲۰ رسائل مخطوطات کی شکل میں دریافت کر لیے جو بالکل نادر الوجود اور بیش قیمت تھے۔ اور ان کی تحلیل میں مصروف ہو گئے۔ لیکن افسوس کہ ان کا رسالہ بھی تصوف کے دشمنوں کے شر سے محفوظ نہ رہ سکا اور آخر کار بند ہو گیا عبدالہادی نے شیخ علیش کے اشارے پر مشرق و مغرب کے درمیان روحانی روابط استوار کرنے کا بیڑا اٹھایا اور گینوں سے ملنے کے لیے فرانس روانہ ہو گئے

اس زمانے میں گینوں مجلہ "معرفت" نکالتے تھے ۱۹۱۰ء سے عبدالہادی نے اس رسالہ میں گینوں کا ہاتھ بڑھانا شروع کر دیا اس رسالہ میں ان کی بہت سی تحقیقات شائع ہوتی رہیں بالخصوص صوفی متون کے فرانسیسی تراجم گینوں اور ان کی رفاقت اس طرح بارآور ہوئی کہ ان کے ذریعے گینوں کا تعلق شیخ علیش سے پکا ہو گیا۔ ان دونوں کے درمیان خط و کتابت جاری رہی۔ گینوں اپنی آراء سے انہیں آگاہ کرتے رہے۔ اس سوال کے جواب کے نتیجے میں ۱۹۱۲ء میں گینوں نے ایک طویل تحقیق اور مطالعہ کے بعد اسلام قبول کر لیا۔

۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑ گئی۔ دین، روح اور فکر سے متعلق تمام سرگرمیاں معطل ہو گئیں عبدالہادی آسانیا چلے گئے اور وہاں برشلونہ کے شہر میں ۱۹۱۷ء میں اپنے رب سے جا ملے۔ گینوں ان کے نقش قدم پر "اکبریۃ" کے لیے کوشش کرتے رہے

فی الواقع گینوں کو جو کچھ بنایا شیخ علیش ہی نے بنایا وہ ایک ایسا آئینہ تھے جس میں ابن عربی شیخ اکبرؒ کا عکس جھلکتا

تھا۔ ایک طرف وہ عقائد اسلام اور تصوف اسلامی کے مظہر تھے دوسری طرف چونکہ وہ بیٹھے ماں کے تھے لہٰذا ان کا تصوف بھی اسلامی تعلیمات سے خارج نہیں تھا۔ یہی صورت ان کے شاگرد گینوں کی تھی۔

(۴)

جس سال گینوں نے اسلام قبول کیا اور ان کا نام عبدالواحد یحییٰ رکھا گیا اسی سال انہوں نے اپنے علاقے کی ایک خاتون سے شادی کی تھی یعنی ۱۹۱۲ء میں۔ اسی سال ان کا رسالہ "معرفت" بند ہو گیا اور انہوں نے دوسرے مختلف مجلات میں لکھنا شروع کر دیا۔ پہلے انہوں نے فری میسن والوں کے جعل کا پول کھولا جس سے وہ بھڑک اٹھے۔ پھر پروٹسٹنٹ فرقے کے انحراف پر روشنی ڈالی جس سے وہ ان کے خلاف ہو گئے اس کے بعد انہوں نے کھوٹی روحانیت (Psuedo Spiritualism) پر تنقید کی جس سے وہ تمام لوگ جو جدید روحانیت کے علمبردار تھے غصے میں آ گئے۔

ستمبر ۱۹۱۷ء میں شیخ عبدالواحد کو الجزائر میں فلسفے کا استاد مقرر کیا گیا مگر وہ صرف ایک سال بعد فرانس واپس چلے آئے اور شہر کے مدرسہ میں متعین ہوئے اس کے ایک سال بعد انہوں نے استعفا دے دیا تاکہ تحقیق کے لیے فراغت میسر آ جائے اس فراغت کا ثمرہ ۱۹۲۱ء میں دو کتابوں کی صورت میں نمودار ہوا۔

(۱) مدخل لدراسۃ العقائد الہندیۃ —

(۲) تھیوسوفی کھوٹے دین کی تاریخ

اس کے بعد ان کی کتابیں پے در پے شائع ہوتی گئیں اور مختلف جرائد میں ان کے مقالات دھڑا دھڑ چھپنے لگے۔ ۱۹۲۵ء میں مجلہ "قناع ایزیس" نے ان کو اپنے ہاں لکھنے کی دعوت دی۔ گینوں نے یہ دعوت قبول کر لی اور ۱۹۲۹ء تک وہ اس رسالے کے اہم ترین لکھنے والوں میں شمار ہونے لگے اس رسالے میں ان کے ساتھ دوسرے لکھنے والوں میں عالم متبحر شواں Schuon بھی تھے جنہوں نے "عین القلب" کے نام سے فرانسیسی میں کتاب لکھی۔ انہوں نے بھی اسلام قبول کیا اور گینوں کی عبقریت اور پختگی کے باوجود بہت سی دلچسپیوں میں گینوں کو مشورہ دیتے رہے

پیرس کے اشاعتی اداروں میں سے ایک نے شیخ عبدالواحد کو پیشکش کی کہ وہ اس کے خرچ پر قاہرہ جائیں اور وہاں تصوف کا مطالعہ کریں اور صوفیا کی تصانیف اور ان کے تراجم ارسال کریں۔ شیخ نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ فروری ۱۹۳۰ء میں وہ اس غرض سے مصر کے لیے روانہ ہوئے مصر میں ان کا مفروضہ قیام چند ماہ کے لیے تھا لیکن ان کے کام کا تقاضا ہوا کہ وہ طویل مدت قیام کریں۔ اشاعتی ادارے والے اس پر رضامند نہ ہوئے اور معاہدہ منسوخ ہو گیا۔ شیخ عبدالواحد یحییٰ قاہرہ میں محلہ ازہر میں رہ پڑے۔ وہاں ان کی زندگی بڑی متواضع اور عام زندگی سے الگ تھلگ تھی۔ یورپی لوگوں سے تو وہ بالخصوص چھپ کر رہتے تھے۔

ان کے والد، والدہ اور اہلیہ تینوں ان کے قاہرہ آنے سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ قاہرہ وہ تن تنہا آئے تھے اکیلے گذر بسر مشکل ہوتی تو انہوں نے ۱۹۳۷ء میں کریمہ بنت شیخ ابراہیم سے بیاہ کر لیا۔ اس نیک بی بی نے ان کی زندگی سکون د

اطمینان سے بھر دی۔ محلہ ازہر سے وہ محلہ الدقی میں منتقل ہو گئے۔ فرانس مقالات بھیجنے کا کام جاری رہا۔ کتابوں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ اللہ نے ان کو دو بیٹیاں عطا کیں۔ پہلی کا نام خدیجہ اور دوسری کا لیلیٰ رکھا گیا۔ پھر ایک بیٹا ہوا۔ اس کا نام احمد رکھا ان کی وفات کے چار ماہ بعد ان کی اہلیہ نے ایک اور بیٹے کو جنم دیا جس کا نام ان کی بیگم کی خواہش پر عبدالواحد رکھا گیا۔

قاہرہ سے انہوں نے پھر اپنے رسالہ "معرفت" کی اشاعت شروع کی مگر اب رسالہ کی کوئی خاص پذیرائی نہ ہو سکی کہ یہ خالص تصوف کا رسالہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس میں تھوڑا تھوڑا ادبی مواد بھی شامل کرنا شروع کر دیا۔ یہ رسالہ ان کی وفات کے تین سال بعد بند ہو گیا۔

شیخ عبدالواحد قاہرہ میں کتابیں تالیف کرتے رہے، اور مقالات و خطوط دنیا میں ہر طرف بھجواتے رہے وہ ہر وقت حرکت میں رہتے تھے فکری اور روحانی حرکت، ہر طالب ہدایت کے لیے ان کے ہاں سامان رشد و ہدایت تھا۔ دن اسی طرح بیتتے گئے اور ۷ جنوری ۱۹۵۱ء کو ان کے لیے ان کے رب کا بلاوا آ گیا۔ ان کی وفات کے وقت محترمہ فلینٹن دی سان پوان ان کے پاس موجود تھیں۔ یہ خاتون ۱۹۲۴ء سے قاہرہ میں مقیم تھیں اور شیخ کے قاہرہ آنے پر ان کا استقبال اسی خاتون نے کیا تھا۔ شیخ کے قیام قاہرہ کے ایام میں بھی وہ ان سے ملتی رہیں اور ان کے انتقال کے وقت بھی موجود تھیں مشہور ادیبہ اور صحافی تھیں بعد کو مسلمان ہو گئیں۔

آندرے روسو نے جو شیخ کے انتقال کے وقت قاہرہ میں تھے ان کے جنازے کا آنکھوں دیکھا حال اپنے رسالہ "لیفیگارو" میں اس طرح لکھا۔

"وفات کے اگلے روز جنازہ اٹھایا گیا۔ رواج کے مطابق ان کی نعش کے نیچے مینڈھا ذبح کیا گیا اور مکان کی دہلیز پر اس کا خون بہایا گیا۔ جنازہ میں ان کی زوجہ اور تینوں بچے شامل تھے پہلے مسجد حسین میں ان پر نماز جنازہ پڑھی گئی اور پھر جنازہ دراستہ کے قبرستان میں لے جایا گیا۔ جنازہ صرف چند دوستوں اور ان کے خاندان پر مشتمل تھا ازہر کے شیوخ میں سے کوئی جنازہ کے ہمراہ نہ تھا۔ شیخ عبدالواحد کو شیخ ابراہیم کے مقبرہ میں دفن کیا گیا"۔

"اپنی اہلیہ سے ان کے آخری الفاظ یہ تھے، "مطمئن رہو، میں تمہیں بالکل چھوڑ نہیں دوں گا، درحقیقت تم مجھے دیکھ نہ سکو گی مگر میں یہیں ہوں گا اور تمہیں دیکھتا رہوں گا"۔

، روسو نے اس پر اضافہ کیا ہے کہ "آج بھی جب ان کا کوئی بچہ خاموش ہونے میں نہ آئے تو ان کی بیوی اس سے کہتی ہے "ارے تمہارے ابو تمہیں دیکھ رہے ہیں اور تم خاموش ہی نہیں ہو رہے۔ بچہ اپنے غیر مرئی والد کے حوالے پر ایک دم چپ ہو جاتا ہے"۔

۹ جنوری کو پیرس میں تار موصول ہوا "فرانسیسی فلسفی اور مستشرق رینے گینوں کا انتقال ہو گیا" تار کا پہنچنا تھا کہ مختلف اخبارات، مجلات و رسائل میں طرح طرح کے مضامین مختلف عنوانات کے تحت شائع ہونے لگے مثلاً "اہرام کے سائے میں مقیم دانشور"، "فیلسوف قاہرہ"۔ "دور جدید کی سب سے بڑی روحانی شخصیت" ان کی تعریف و توصیف میں بہت کچھ لکھا گیا۔ (اس کی تفصیل ہمارے دوسرے مضمون میں دیکھیے۔ مترجم) لیکن ان پر صرف تحسین و آفرین کی تحریریں ہی نچھاور نہیں

کی گئیں۔ وہاں ان کے دشمن بھی تھے۔ مثلاً فری میسن والے، منحرف شدہ عیسائی اور مادی تہذیب کے علمبردار۔ جنہوں نے گینوں پر بلا کسی رورعایت یا رحم کے کڑی تنقید کی تھی۔ ان سب نے گینوں کے خلاف لکھا۔ ان کے دشمنوں اور مددگاروں کے درمیان ایک مباحثہ چل پڑا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ ان کی تصانیف کے مطالعہ کی طرف مائل اور متوجہ ہوئے اور چونکہ گینوں کی کتابوں کا مطالعہ خیر محض اور باعث ہدایت ہے، بہت سوں کی اصلاح ہوئی۔ اس مباحثے سے اسلام کے بارے میں عیسائی مبلغین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں بھی دور ہوئیں اور یورپ کے سنجیدہ طبقے میں سے بعض افراد نے اسلام قبول کیا اور فرانس، سوئٹزرلینڈ میں کچھ جماعتیں وجود میں آگئیں جو شیخ عبدالواحد کے طریقۂ کار اور منہاج کی پیروی پر کمربستہ تھیں"

انفرادیت پرستی

شیخ عبدالواحد یحییٰ

ترجمہ: محمد سہیل عمر، عبدالرؤف

"دنیائے جدید کا بحران" CRISIS OF THE MODERN WORLD شیخ عبدالواحد یحییٰ کی ان بہت اہم کتابوں میں سے ایک ہے جن میں انہوں نے جدید دُنیا کے بنیادی رویوں کی تشکیل واضح کی ہے۔ روایتی کائنات سے دُور ہوتی جاتی اس دنیا کی سمتِ سفر کے بارے میں بلیغ اشارے کیتے ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں یہ کتاب پہلی بار سامنے آئی تھی اور اس میں دنیائے جدید کی ذہنی کیفیت کے بارے میں جو باتیں کہی گئی تھیں ان کا فہم آج آسان تر ہو گیا ہے کیونکہ حالات و واقعات نے کم و بیش وہی صورت اختیار کی ہے جس کی نشاندہی اس کتاب میں کی گئی ہے۔ اردو میں شیخ عبدالواحد کی تحریروں کا ترجمہ ایک نہایت مشکل اَمر ہے اس لیئے کہ معانی کے صحیح ابلاغ کے لیئے اصطلاحات کے متعینہ تلازمات سے لے کر جملے کی ساخت تک ہر سطح پر بڑی احتیاط ملحوظ رکھنی پڑتی ہے۔ محمد سہیل عمر اور عبدالرؤف نے بہر ممکن احتیاط اور محنت کے ساتھ شیخؒ کی اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ کیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ اسلوبِ بیان شیخ کے اپنے اسلوب کے قریب تر رہے۔ انگریزی میں اس کتاب کا سب سے پہلا ترجمہ ۱۹۴۲ء میں ہوا اور دوسرا ۱۹۷۵ء میں۔ ترجمہ کرتے ہوئے یہ دونوں تراجم پیشِ نظر رہے ہیں۔ (ایڈیٹر)

انفرادیت پرستی سے ہماری مراد وہ رویّہ ہے جو انفرادیت سے اعلیٰ ہر اصول کی نفی کرے، جس کے نتیجے میں تہذیب اپنے تمام شعبوں میں فقط انسانی عناصر تک محدود ہو کر جاتی ہے۔ چنانچہ بنیادی طور پر انفرادیت پرستی اس رویے کے مماثل ہے جو نشاۃ ثانیہ کے دور میں انسانیت پرستی HUMANISM کہلایا۔ نیز یہ دنیوی PROFANE نقطۂ نظر کی امتیازی خصوصیت ہے۔ درحقیقت یہ ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔ اور یہ دنیوی نقطۂ نظر دراصل وہی غیر روایتی نقطۂ نظر ہے جو تمام جدید رجحانات کی بنیاد ہے اس سے مراد قطعاً یہ نہیں کہ یہ نقطۂ نظر یکسر نیا ہے بلکہ یہ کم و بیش ہر دور میں اعلانیہ طور پر ظاہر ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس کے مظاہر ہمیشہ مرکزی رجحان سے علیحدہ

اور محدود رہے ہیں۔ اور ایسا کبھی نہ ہوا کہ انہیں کسی ایک تہذیب پر مکمل غلبہ حاصل ہو جائے جیسا کہ حالیہ صدیوں میں مغرب میں ہوا۔ جو چیز آج تک دیکھنے میں آئی تھی وہ یہ ہے کہ کسی تہذیب کی بنیاد کسی خالصتاً منفی رحجان پر استوار ہو! اسے ہم اصول کی عدم موجودگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی نقطہ نظر دنیائے جدید کے غیر معمولی ABNORMAL اور انسانیت سوز کردار کا تعین کرتا ہے اسے اسی وقت صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے جب اسے ایک دور کا نقطۂ اختتام قرار دیا جائے۔ انفرادیت پرستی اپنی اس تعریف کے مطابق مغرب کے موجودہ زوال کی بنیادی وجہ ہے کیونکہ یہ ہمیشہ کی طرح بنی نوع انسان کے گھٹیا ترین امکانات کے عروج کا محرک ثابت ہوتی ہے وہ امکانات جن کے لئے کسی ورائے انسانی عنصر کی مداخلت کی ضرورت نہیں بلکہ جو اس کے برعکس ان عناصر کی عدم موجودگی میں ہی پروان چڑھتے ہیں کیونکہ فی الحقیقت یہ رحجانات روحانیت اور تعقلِ حقیقی کی عین ضد ہیں۔

اس انفرادیت پرستی میں بنیادی طور پر عقلی وجدان INTELLECTUAL INTUITION کی نفی مضمر ہے یعنی عقلی وجدان بحیثیت ایک فوق الفردی SUPER INDIVISUAL استعداد کے، اور اس علم کی بھی جو اس وجدان کے اصلی دائرہ کار کی تشکیل کرتا ہے یعنی ماوراء الطبیعات جب اسے اس کے اصلی مفہوم میں استعمال کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام جدید فلسفی اس اصطلاح سے جو مراد لیتے ہیں، اگر کبھی وہ اس چیز کا وجود تسلیم کریں جس پر اس لفظ کا اطلاق کیا جا سکے تو، وہ حقیقی ماوراء الطبیعات کے لئے قطعاً اجنبی ہے۔ جدید فلاسفہ کی مابعد الطبیعات کی حقیقت عقلی ڈھانچوں اور ان خیالی مفروضات کے سوا کچھ نہیں جو خالصتاً انفرادی تصورات ہیں اور جن کا اطلاق صرف قلمرو طبیعیات یا دوسرے الفاظ میں فطرت پر ہو سکتا ہے۔ اگر کبھی کوئی ایسا سوال کیا بھی جاتا ہے جو ماوراء الطبیعات کے محیط سے تعلق رکھتا ہو تو اس پر اس انداز سے غور کیا جاتا ہے اور اس طرح پیش کیا جاتا ہے جو نہ صرف اسے کھوٹی ماوراء الطبیعات PSUEDO - METAPHYSIC بنا کر رکھ دیتا ہے۔ بلکہ کسی حقیقی اور درست حل کو بھی خارج از امکان بنا دیتا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کے فلاسفہ خود ساختہ اور موہوم مسائل پیش کرنے کا تو بہت شوق رکھتے ہیں۔ مگر انہیں حل کرنے سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ ان کے تحقیق برائے تحقیق کے پراگندہ نظریے کا صرف ایک پہلو ہے جو ذہنی اور مادی دونوں دائروں میں لاحاصل ترین تحرک کے سوا اور کچھ نہیں۔ پھر ان فلاسفہ کی توجہ کا اہم مرکز یہ بھی ہے کہ کسی طرح اپنے نام سے ایک عدد "نظام" فلسفہ منسوب کیا جائے یعنی ایک محدود اور محصور مجموعۂ نظریات جو صرف ان کا اور خالصتاً ان کی تخلیق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک ابتکاریت ORIGINALITY کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ خواہ اس کے لئے حقیقت کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے چنانچہ فی زمانا ایک فلسفی کو شہرت نئی غلطی اختراع کرنے پر ملتی ہے نہ کہ ان حقائق کی تذکیر و تکرار پر جن کا اظہار اس سے قبل دوسرے بھی کر چکے ہوں اسی قسم کی انفرادیت پرستی سے وہ موجودہ نظام ہائے فکر پرورش پاتے ہیں جن کے اندر ممکن ہے کوئی داخلی تضاد نہ ہو۔ مگر جو بہر حال باہمی تضاد اور تصادم کا شکار ہوتے رہتے ہیں یہ چیز جدید علماء

اور فنکاروں میں بھی ملتی ہے ۔ تاہم فلسفے کے میدان میں یہ فکری نزاع جو انفرادیت پرستی کا لازمی نتیجہ ہے واضح ترین شکل میں نظر آتا ہے

ایک روائتی تہذیب میں یہ ناقابل تصور ہے کہ کوئی شخص کسی نظریہ کی ملکیت کا دعویٰ کرے اور کہیں اگر وہ ایسا کردے تو وہ نظریہ تمام وقعت اور اعتماد کھو بیٹھے گا ۔ اور اسے دے کر ایک لایعنی واہمہ رہ جائے گا ۔ اگر ایک نظریہ مبنی بر صداقت ہے تو وہ ان سب کا ہے جو اس کے ادراک کے قابل ہیں اور اگر وہ غلط ہے تو پھر اس کی اختراع کوئی قابل تعریف حرکت نہیں ایک سچا نظریہ کبھی " نیا " (مبتدع یا مخترع) نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ صداقت انسانی دماغ کی پیداوار نہیں ہے ۔ یہ ہم سے جدا وجود رکھتی ہے ۔ اور ہمارا کام صرف اس کا ادراک ہے ۔ اس کے علم کے علاوہ سوائے غلطی کے کچھ ممکن نہیں ۔ لیکن جدید لوگوں کو بحیثیت مجموعی صداقت کی پرواہ ہی کتنی ہے! وہ جانتے ہی کب ہیں کہ یہ ہے کیا ؟ یہاں آکر الفاظ پھر اپنے صحیح معانی کھو بیٹھتے ہیں ۔ کیونکہ کچھ لوگوں نے جن میں معاصر نظریہ تجربیت PRAGMATISM کے پیروکار پیش پیش ہیں لفظ " صداقت " میں اتنا ناجائز تصرف کیا کہ اسے " عملی افادیت " کا ہم معنی بنا ڈالا ۔ جو فکری دائرہ عمل سے بارہ پتھر باہر کی چیز ہے ۔ یہ انکار صداقت ، انکار عقل کو مستلزم ہے کیونکہ صداقت عقل INTELLECT ا ہی کا تو موضوع اور مُدرَک ہے ۔ یہ سب کچھ جدید روّیہ انحراف کا منطقی نتیجہ ہے مزید قیاس کئے بغیر اس مقام پر صرف اتنا اضافہ اور کردیں کہ یہی انفرادیت پرستی وہ بنیادی وجہ ہے جس سے نام نہاد " عظیم آدمیوں " اور " نابغہ " GENIUS کی خواہ مخواہ اہمیت کا فریب پیدا ہوا (جب ان الفاظ کو ان کے دنیوی PROFANE معنی میں استعمال کیا جائے) یہ انفرادیت پرستی اتنی بودی اور بے حقیقت ہے کہ یہ حقیقی علم کی کمی پوری کرنے کے قطعاً قابل نہیں"

چونکہ فلسفہ کا ذکر آگیا ہے ۔ لہٰذا ہم تمام تفاصیل میں جائے بغیر اس میدان میں انفرادیت پرستی کے نتائج کی طرف اشارہ کریں گے ۔ پہلا تو ہے عقلی وجدان INTELLELTUAL INTUITION کی تردید اور انسانی سوجھ REASON کی ہر دوسری چیز پر ترجیح ، سوجھ جو خالصتاً انسانی اور اضافی استعداد ہے اسے گویا عقل کے برترین حصہ کا مقام دے دیا گیا ۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے ہی عقل کل سمجھا جانے لگا ۔ اسی سے عقلیت پرستی RATIONALISM کی تشکیل ہوئی جس کا بانی ڈیکارٹ تھا ۔ تاہم عقل INTELLIGENCE کی یہ تحدید فقط پہلا مرحلہ تھا ۔ کیونکہ سوجھ REASON کو جلد ہی اس درجے سے گر کر فقط عملی مناسبت تک محدود ہو جانا پڑا جوں جوں عملی اطلاقات نے ان علوم پر حاوی ہونا شروع کیا جن میں نظری پہلو برقرار رکھنے کی کچھ صلاحیت تھی اور تو اور خود ڈیکارٹ ہی کو خالص سائنس سے زیادہ اس کے عملی اطلاقات کی فکر تھی اس سے بڑھ کر یہ کہ انفرادیت پرستی لازماً فطرتیت یا فطرت پرستی NATURALISM کی متقاضی ہے کیونکہ وہ چیز جو فطرت سے ورا ہے وہ بایں وجہ فرد کی گرفت سے باہر ہے فطرت پرستی اور ماورا الطبیعات کا انکار ایک

ہی رویے کے دو نام ہیں کیونکہ جب ایک مرتبہ عقلی وجدان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے تو پھر ماوراء الطبیعات کا امکان بھی باقی نہیں رہتا اب بعض لوگ تو کسی نہ کسی طرح ایک کھوٹی ماوراء الطبیعات اختراع کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور کچھ لوگ زیادہ کشادہ ظرفی سے اس کا عدم امکان تسلیم کر لیتے ہیں اسی سے اضافیت (۱۰ RELATIVISM اپنی تمام صورتوں میں نمودار ہوتی ہے خواہ کانٹ KANT کی "تنقید" ہو یا آگسٹ کامتے کی اثباتیت۔ چونکہ سوجھ REASON خود اضافی ہے اور صرف اسی دائرہ کار سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکتی ہے جو خود بھی اتنا ہی اضافی ہو۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اضافیت، عقلیت پرستی کا واحد منطقی نتیجہ ہے مگر اسی تعبیر میں ایک صورت عقلیت پرستی کی خرابی کی بھی مضمر تھی۔ اضافیت کے ذریعے عقلیت پرستی نے اپنی تباہی کا سامان خود ہی کر دیا۔ فطرت NATURE اور BECOMING تکوین، جیسا کہ اس سے قبل ذکر ہوا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں لہٰذا ایک مضبوط و مربوط فطرتیت یا فطرت پرستی صرف تکوینی نظام ہائے فلسفہ کا مجموعہ ہی ہو سکتی ہے۔ جس کی جدید مثال ہم ارتقائیت EVOLUTIONISM میں پہلے ہی پیش کر چکے ہیں۔ مگر یہی وہ تحریک ہے جسے آخر کار عقلیت پرستی کے خلاف میدان میں اترنا تھا۔ چنانچہ اس نے سوجھ REASON کو ایک طرف تو اس بات کے ناقابل قرار دیا کہ وہ اس شے کو گرفت میں لا سکے جو تغیر و تعدد سے عبارت ہے۔ اور دوسری طرف اسے اشیائے محسوسہ کی لامحدود پیچیدگیوں کو سلجھانے سے معذور بنا دیا۔ یہ وہ استدلال ہے جو ارتقائیت کی ایک قسم یعنی برگسانی وجدانیت INTUITIONISM نے عقلیت پرستی کے خلاف اختیار کیا۔ اگرچہ وہ خود بھی عقلیت پرستی سے کچھ کم انفرادیت پرست اور غیر ماوراء الطبیعاتی نہیں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موخر الذکر پر اس کی تنقید بالکل بجا ہے لیکن اس نے عقلیت پرستی کے بجائے جس کا استعداد کا سہارا لیا وہ تو بذات خود عقلیت سے بھی گھٹیا نکلی یعنی ایک مبہم ساحتی وجدان جو زیادہ تر تخیل، جبلت اور جذبے سے خلط ملط ہوا رہتا ہے۔ یہ چیز بڑی اہمیت کی حامل اور قابل توجہ ہے کہ اس نظام میں صداقت کا کوئی سوال باقی نہیں رہا۔ اُنکے ہاں صرف ایک "حقیقت" کی تلاش لے دے کر رہ گئی ہے۔ اور حقیقت بھی وہ جس کی محض دائرۂ محسوسات تک تحدید کر دی گئی ہے۔ اور جو خود ان کے خیال میں ایک بے ثبات اور ہر دم رواں چیز ہے۔ اس قسم کے نظریات میں عقلی درحقیقت اپنے اسفل ترین مقام تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور سوجھ REASON کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی سوائے یہ کہ اس سے صنعتی ضروریات کے لئے مواد تیار کرنے کا کام لیا جائے۔ اس کے بعد بس ایک قدم کی کسر رہ جاتی ہے۔ یعنی عقل اور علم کا کلی استرداد اور صداقت کی جگہ افادیت پر یقین تجربیت اسی قدم کی مصداق ہے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے ہمارا ناطہ انسانی قلمرو سے بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ جو عقلیت پرستی میں برقرار تھا۔ تحت الشعور پر توجہ مرکوز کرنا جو عمومی درجۂ مراتب کی مکمل تعقیب سے عبارت ہے نا ہمیں درحقیقت تحت الانسانی سطح پر لے آتا ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر دنیوی PROFANE

فلسفہ کو گامزن ہونا تھا اور وہ ہوا جب اسے اس دعویٰ کے ساتھ بے لگام چھوڑ دیا گیا کہ تمام علم اسی کے حلقہ تک محدود ہے۔ جب تک ایک برتر علم کا وجود تھا، اس قسم کی حرکت ناممکن تھی کیونکہ فلسفہ کم از کم اس چیز کا احترام کرنے کا پابند تھا جو اس کو معلوم تو نہیں تھی مگر اس کے وجود سے فلسفے کا انکار محال تھا، مگر جب یہ علم برتر جاتا رہا تو اس کے انکار کو ایک باقاعدہ نظریے کی شکل دے دی گئی۔ جدید فلسفہ سارے کا سارا اسی کا مرہونِ منت ہے۔

فلسفہ کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت عطا کرنا غلط ہوگا کیونکہ جدید دنیا میں اس کا بظاہر کتنا ہی اہم مقام کیوں نہ ہو ہمارے نقطۂ نظر سے اس میں دلچسپی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر دور کا فلسفہ اس دور کے رجحانات کا خالق کم اور مظہر زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ یہ ایک خاص حد تک ان رجحانات کی راہ متعین کرتا ہے تو بھی ہم کہیں گے کہ صرف تب جب وہ متشکل ہو چکے ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ مسلّم ہے کہ تمام جدید فلسفہ کا آغاز دیکارت سے ہوتا ہے مگر اس کے جو اثرات اس کے اپنے اور بعد کے زمانے پر اور اس زمانہ کے فلاسفہ پر پڑے وہ اس وقت تک ممکن نہ ہوتے اگر دیکارت کے تصوّرات پہلے سے موجود ان رجحانات سے ہم آہنگ نہ ہوتے جو اس کے ہم عصروں میں عام تھے۔ جدید نقطۂ نظر کارتیزینزم CARTESIANISM میں منعکس ہوتا ہے اور اسی سے اپنا منشور واضح طور پر اخذ کرتا ہے۔ مزید برآں اگر ایک تحریک کسی بھی میدانِ کار میں اتنی ہی نمایاں ہو جتنی کہ کارتیزینزم فلسفہ میں رہی ہے۔ تو یہ ہمیشہ ایک نتیجہ ہوتی ہے نہ کہ نقطۂ آغاز۔ نہ ہی ایسی تحریک یکدم خود بخود نمودار ہوا کرتی ہے بلکہ اس کے برعکس طویل منتشر محنتوں کے سلسلے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اب اگر ایک آدمی مثلاً دیکارت اس جدید انحراف کا نمائندہ ہے اس طرح کہ کسی حد تک اور ایک خاص نقطۂ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ گویا اس کی تجسیم ہے، جب بھی یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ اس کا بانی اور آغاز کنندہ نہیں ہے بلکہ اس کے مبداء کی تلاش میں ہمیں اس سے کہیں پیچھے جانا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے نشاۃ ثانیہ اور دورِ اصلاح REFORMATION پر، جسے عام طور پر جدید رویّہ کا سب سے بڑا مظہر گنا جاتا ہے، روایت سے انقطاع کا عمل مکمل ہو جاتا ہے، اس کا آغاز نہیں ہوتا۔ ہمارے نزدیک اس انقطاع کی ابتداء چودھویں صدی میں تلاش کی جانی چاہیئے اور جدید دور کا آغاز ایک یا دو صدی بعد مقرر کرنا چاہیئے۔

روایت سے انقطاع مزید تبصرے کا متقاضی ہے کیونکہ یہی تو ہے جس نے جدید دنیا کو جنم دیا۔ اس کے تمام خصائص کو ایک فقرے میں سمیٹا جا سکتا ہے یعنی، روایتی نقطۂ نظر کی مخالفت اور روایت کی نفی کا مطلب ہے انفرادیت پرستی۔ یہ چیز محولہ بالا عقائد سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، کیونکہ عقلی وجدان اور ماوراء الطبیعاتی عقائد ہی ہر روایتی تہذیب کو اس کے اصول سے وابستہ رکھتے ہیں اس لئے جب اصول ہی کا انکار کر دیا جائے تو اس کے تمام فروع اور عواقب کا بھی لامحالہ کرنا ہوگا، کم از کم مضمر طور

پر اس طرح ہر وہ چیز جو روایت کہلانے کی مستحق ہوتی ہے فوری طور پر برباد ہو جاتی ہے۔ علوم کے ضمن میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ عمل کس طرح وقوع پذیر ہوا۔ چنانچہ اب ہم ایک اور قلمرو کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جہاں غیر روایتی نقطۂ نظر کے مظاہر اور بھی نمایاں ہیں کیونکہ اس کی پیدا کردہ تبدیلیاں یورپ میں عوام پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔ دراصل قرونِ وسطیٰ میں علوم SCIENCES ایک قلیل تعداد پر مشتمل منتخب گروہ تک محدود تھے اور ان میں سے بعض پر تو چند مکاتیب کی سختی سے اجارہ داری تھی جس سے ESOTERISM باطنیت (اپنے صحیح مفہوم میں) پیدا ہوتی۔ مگر روایت کا ایک حصہ ایسا بھی تھا جو سب کے لئے عام تھا اور اس مقام پر ہم اس خارجی حصے کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اس زمانے میں مغرب کی روایت اپنے ظاہر میں ایک صریح مذہبی صورت کی حامل تھی جس کا نمائندہ کیتھولک ازم تھا۔ چنانچہ اب ہم مذہب کی قلمرو میں روایتی نقطۂ نظر کے خلاف بغاوت کا مطالعہ کریں گے جو ایک مخصوص و متعین شکل اختیار کرنے کے بعد پروٹسٹنٹ ازم کے نام سے معروف ہو گئی۔ یہ محسوس کرنا بہت آسان ہے کہ یہ بھی انفرادیت پرستی ہی کا مظہر ہے اور اس قدر صریحاً ہے کہ اسے مذہب پر انفرادیت پرستی کے اطلاق کا نام دیا جا سکتا ہے۔ دُنیائے جدید کی طرح پروٹسٹنٹ ازم کی بنیاد بھی تردید محض پر ہے اصولوں کی تردید جو انفرادیت پرستی کا بنیادی وصف اور جوہر ہے چنانچہ اس میں ہمیں مزاج اور زوال کی اس صورتِ حال کی ایک اور نمایاں مثال نظر آتی ہے جو ایسی تردید سے پیدا ہوا کرتی ہے۔

انفرادیت پرستی لامحالہ طور پر فرد سے بلند کسی اور ہیئت حاکمہ کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے نہ ہی اس کے نزدیک انفرادی سوچ (INDIVIDUAL REASON) کے سوا حصولِ علم کا کوئی اور ذریعہ موجود ہے، یہ دو رویے جدا نہیں کیے جا سکتے۔ چنانچہ جدید نقطۂ نظر پر لازم تھا کہ وہ صحیح معنوں میں روحانی اقتدار کی نفی کرے، وہ اقتدار جس کی اساس فوق الانسانی درجہ کی ہو اور ہر روایتی تنظیم کی بھی جو اپنی بنیاد لازماً اس اقتدار پر رکھتی ہو خواہ اس تنظیم نے صورت کوئی بھی اختیار کر رکھی ہو کیونکہ ہر تہذیب کے ساتھ (روایتی تنظیموں) کی صورت قدرتاً بدل جاتی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ پروٹسٹنٹ ازم نے اس تنظیم کے اقتدار کی تردید کی جو مغرب کی مذہبی روایت کی ترجمانی کی جائز حقدار تھی اور اس کی جگہ آزادانہ تنقید کا نعرہ بلند کیا، یعنی ذاتی فیصلے کی بنیاد پر کی جانے والی ترجمانی بالفاظ دیگر انفرادی رائے، خواہ وہ جہلا اور نااہلوں ہی کی ہو جو خالصتاً انسانی سوچ کی کوششوں پر مشتمل تھی۔ مذہبی دائرے میں جو کچھ ہوا اس میں اور جو عقلیت پرستی نے فلسفے کے ساتھ کیا بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ پروٹسٹنٹ ازم کے اس رویے سے ہر طرح کی بحثا بحثی، انحراف اور کج فکری کو صلائے عام مل گئی اور نتیجہ ہوا وہی جو ہونا تھا فرقوں کی روز افزوں کثرت جن میں سے ہر ایک چند افراد کی ذاتی رائے کی نمائندگی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اندریں حالات چونکہ عقیدے پر کسی قسم کا اتفاق ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اسے پس منظر میں دھکیل دیا

گیا اور مذہبی کی ثانوی جہت یعنی اخلاقیات سامنے آگئی۔ اس زوال کا نتیجہ اخلاقیت پرستی MORA-LISM تھا جو آج کی پروٹسٹنٹ ازم کا امتیازی نشان ہے۔ سو اس طرح مذہب میں بھی فلسفے کے متوازی وہ صورتحال پیدا ہوتی جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں یعنی نسخ عقائد جو مذہب کے تعقلاتی INTELLECTUAL عناصر کے غائب ہو جانے کا ناگزیر نتیجہ تھی۔ عقلیت پرستی کے بعد مذہب کا جذبات پرستی SENTIMENTALISM میں غرق ہو جانا لازم تھا اور اس کی بڑی واضح مثالیں اینگلو سیکسن ممالک میں دکھائی دیتی ہیں۔ جب ایک بار یہ نوبت پہنچ جائے تو مسخ شدہ اور کھوکھلے مذہب کا بھی سوال باقی نہیں رہ جاتا۔ لے دے کر مذہبیت رہ جاتی ہے یعنی مبہم جذباتی آرزوئیں جن کا کوئی جواز کسی حقیقی علم میں موجود نہ ہو۔ اس انتہائی مرحلے سے ولیم جیمز کے "مذہبی تجربے" کی قبیل کے نظریات مطابقت رکھتے ہیں جو الوہیت کے ساتھ انسان کے رابطے کے ذرائع کی تلاش میں تحت الشعور کی حد تک جا پہنچتے ہیں اس نقطے پر مذہبی انحطاط اور فلسفیانہ زوال کے آخری نتائج ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں اور "مذہبی تجربہ" بالآخر تجربیت پرستی PRAGMATISM میں گم ہو جاتا ہے جس کے نام پر ایک محدود تصور الٰہ LIMITED GOD، الٰہ لامحدود INFINITE GOD (ذاتِ لاتعین) سے مفید تر ٹھہرتا ہے کیونکہ اس کے لئے ان جذبات سے مشابہ جذبات کا پیدا ہونا ممکن ہے جو کوئی شخص اپنے سے برتر آدمی کے لئے محسوس کر سکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ "تحت الشعور" کا سہارا لینے کی کوشش جدید روحانیت اور "کھوٹے مذاہب" PSUEDO RELIGIONS کی مددگار ثابت ہو رہی ہے جو ہمارے زمانے کا امتیازی نشان بن گئے ہیں اور جن کا جائزہ ہم اپنی دوسری تحریروں میں لے چکے ہیں۔(4)

دوسری طرف پروٹسٹنٹ اخلاقیت پرستی رفتہ رفتہ تمام عقیدوں کو جو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں منہا کر دینے کی وجہ سے تنزل پذیر ہو کر "آفاقی اخلاقیات" LAY MORALITY بن کر رہ گئی۔ جس کے ماننے والوں میں ہر کینیڈے کے لبرل پروٹسٹنٹ لوگوں کے ساتھ ساتھ ہر مذہبی منکر کے کھلے دشمن تک شامل ہیں، اس لئے کہ دونوں گروہوں پر ایک ہی طرح کے رجحانات کا غلبہ ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ہر شخص ان کے منطقی مضمرات میں یکساں حد تک آگے نہیں بڑھتا۔

فی الاصل، چونکہ مذہب اپنے جوہر میں روایت ہی کی ایک صورت ہے لہٰذا روایت دشمن نقطۂ نظر لازمی طور پر مذہب دشمن ہوتا ہے یہ مذہب میں تحریف سے آغاز کرتا ہے اور جب بھی ممکن ہو اس کا کتمان کر کے دم لیتا ہے۔ صرف یہی حقیقت پروٹسٹنٹ ازم کو غیر منطقی بنا دیتی ہے کہ مذہب کو محض انسانی سطح تک محدود کر دینے کے باوجود وہ بہرحال، کم از کم نظری حد تک، ایک ماورا الانسانی عنصر وحی کو برقرار رکھتا ہے پروٹسٹنٹ ازم نفی کے عمل کو اس کے منطقی نتائج تک لے جانے سے جھجکتا ہے لیکن وحی کو خالص انسانی تعبیر سے پھوٹنے والے مباحث کا شکار بنا کر فی الاصل اسے تقریباً بے وقعت کر دیتا ہے اور جب

معلوم ہو کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے آپ کو عیسائی کہلانے کے باوجود مسیح کی الوہیت کا انکار کرتے ہیں تو یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہوتا کہ وہ عیسائیت کے بجائے نفیٔ کامل سے قریب تر ہیں اگرچہ ان کو اس حقیقت کا علم نہیں ہے۔ بہرحال اس طرح کے تضادات بہت زیادہ باعثِ حیرت نہ ہونے چاہئیں کیونکہ وہ ہمارے زمانے کی پراگندگی اور بدنظمی کی علامتیں ہیں جیسے کہ پروٹسٹنٹ ازم کی ناختم کسریت SUB DIVISiViON جو جدید سائنس اور جدید زندگی کے انتشار اور تقسیم در تقسیم کے بہت سے مظاہر میں سے ایک ہے جن سے ہر جگہ سابقہ پڑتا ہے۔ مزید برآں یہ ایک فطری امر تھا کہ پروٹسٹنٹ ازم نے جس کا روح ورواں نفی کا اصول تھا اس تباہ کن "تنقید" کو جنم دیا جو نام نہاد مؤرخین مذہب کے ہاتھوں میں تمام مذاہب کے خلاف ایک ہتھیار کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس طرح، کتابِ مقدس کے سوا کسی اور چیز کو حجت نہ مانتے ہوئے خود بھی پروٹسٹنٹ ازم ہی نے اس حجیت کو مجروح کرنے کا راستہ ہموار کیا یعنی روایت کا وہ اقل حصہ جو پروٹسٹنٹ ازم نے اس صورت میں باقی رکھا تھا اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ ایک بار جو ابتداء ہو گئی تو پھر روایتی نقطۂ نظر کے خلاف بغاوت کا عمل ہیچ راہ روکا نہ جا سکا۔

اب یہاں ایک اعتراض کی گنجائش ہو سکتی ہے یعنی یہ کہ اگرچہ پروٹسٹنٹ ازم کیتھولک نظام سے الگ ہو گیا، لیکن بہرحال کتابِ مقدس کو معتبر تسلیم کرنے کی وجہ سے روایتی عقیدہ ان کے ہاں محفوظ رہا ہو، لیکن "آزاد تنقید" کی ابتداء اس طرح کے کسی بھی مفروضے کی تردید کر دیتی ہے اس لیے کہ یہ ہر قسم کے انفرادی ظن وتخمین کا در باز کر دیتی ہے۔ مزید برآں عقیدے کا تحفظ ایک منظم روایتی تعلیم وتربیت سے مشروط ہے تاکہ مستند تفسیر کو برقرار رکھا جا سکے۔ فی الاصل مغرب میں اس نظامِ تعلیم و تربیت کا سرچشمہ کیتھولک ازم رہا ہے۔ بلاشبہ دوسری تہذیبوں میں بھی اس مقصد کے لئے مختلف النوع ہئیتوں میں اس طرح نظام موجود رہے ہیں۔ لیکن ہم یہاں مغربی تہذیب اور اُس کی مخصوص صورتحال سے بحث کر رہے ہیں۔ لہٰذا یہ اعتراض بے جا ہو گا کہ ہندوستان میں پاپائیت جیسا کوئی ادارہ موجود نہیں ہے۔ یہاں معاملہ بالکل الگ ہے، اس لئے کہ اولاً تو روایت وہاں مغربی معنوں میں مذہب کی ہیئت اختیار نہیں کرتی۔ چنانچہ وہ ذرائع جن سے روایت کی ترسیل اور تحفظ ہوتا ہے ایک سے نہیں ہو سکتے۔ ثانیاً یہ کہ ہندو ذہنیت چونکہ مغربی ذہنیت سے یکسر مختلف ہے لہٰذا ہندو روایت ایک ایسی داخلی قوت رکھتی ہے جس سے یورپی روایت استفادہ نہیں کر سکتی تھی جب تک اسے ایک ایسی تنظیم کا سہارا نہ میسر ہوتا جو اپنی ظاہری تشکیل میں باقاعدہ طور پر مدون ہوتی۔ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ یورپ میں روایت کے لئے ضروری تھا کہ وہ عیسائیت کی آمد کے بعد ایک مذہبی پیرائے میں ظاہر ہوتی۔ اس کی تمام وجوہات کی وضاحت بہت تفصیل طلب ہے اور ان وجوہات کو پیچیدہ مسائل میں اُلجھے بغیر قابلِ فہم نہیں بنایا جا سکتا۔ بہرحال یہ ایک حقیقت امری ہے جس سے انکار ممکن نہیں[۵] اور ایک بار اگر اسے تسلیم کر لیا

جاتے تو اس کے تمام نتائج جو اس سے ظاہر ہوتے ہیں انہیں تسلیم کرنا لازم ہو جاتا ہے جہاں تک اس قسم کی روایتی ہیئت کے لئے موزوں تنظیم کا تعلق ہے۔

مزید برآں، جیسے کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، یہ بھی خاصا یقینی ہے کہ مغرب میں روایت کے اصول میں سے جو کچھ بھی باقی ہے وہ کیتھولک ازم کی شکل میں محفوظ ہے، مگر کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کیتھولک ازم کی شکل میں روایت، جدید نقطۂ نظر کی رنگ آمیزی سے مبرّا، پوری طرح محفوظ رہی ہے۔ بدقسمتی سے ایسا لگتا نہیں، بلکہ صحیح معنوں میں اگرچہ روایت ثابت و سالم رہا ہے جو بذاتہٖ بہت کچھ ہے تو بھی یہ بات مشکوک ہے کہ روایت کے عمیق تر معانی مؤثر طور پر ایک محدود طبقۂ خاص کے لئے بھی قابلِ فہم رہ گئے ہیں جس کے وجود کے شواہد یقیناً اس کے کسی عمل یا اثر کے ذریعے مل جاتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ آثار کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ اغلب یہ ہے کہ روایت صرف بالقوہ ہی محفوظ رہ گئی ہے اور اس طرح اہل استعداد کے لئے روایت کے پورے معانی کی از سرِ نو دریافت کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اگرچہ فی الوقت کوئی بھی اس کا کامل شعور نہیں رکھتا۔ علاوہ ازیں مذہبی قلمرو کے باہر بہت ساری علامتیں اور نشانات مغربی دنیا میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوتے ملتے ہیں جو قدیم روایتی نظامِ عقائد سے چلے آرہے ہیں اور بلا سمجھے بوجھے محفوظ کر لئے گئے ہیں۔ اس طرح کی صورت ہائے حال میں مکمل طور پر زندہ روایتی مزاج سے رابطہ ضروری ہے تاکہ جو چیزیں خوابیدہ ہو گئی ہیں وہ دوبارہ بیدار کی جائیں اور اس طرح فہمِ گم گشتہ کو واپس لایا جا سکے۔ یہاں اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ مغرب کو اپنی روایت کا از سرِ نو شعور حاصل کرنے کے لئے مشرق سے اسی سلسلے میں سب سے زیادہ مدد درکار ہے۔

جو کچھ ہم نے ابھی کہا ہے وہ خاص طور پر کیتھولک ازم کے امکانات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کیتھولک ازم اپنی اصولی حیثیت میں، مستقل اور غیر متغیر شکل میں محفوظ رکھتا ہے۔ نتیجتاً اس دائرے میں جدید نقطۂ نظر کا اثر اس سے زیادہ نہیں ہوا کہ اس نے ایک طویل یا مختصر عرصے کے لئے بعض باتوں کے فہم کو ممکن نہیں رہنے دیا۔ تاہم کیتھولک ازم پر جدید نقطۂ نظر کے زیادہ بیّن اثرات تسلیم کرنے پڑیں گے۔ اگر کیتھولک ازم کی موجودہ صورتِ حال کا اندازہ اس کے متبعین کی غالب اکثریت کے اندازِ فہم سے لگایا جاتے یہ بیّن اثرات ایک درجے میں فی الحقیقت ایک منفی اثر ہے یہ کہتے ہوئے ہمارے ذہن میں صرف کم و بیش معروف تحریکیں ہی نہیں ہیں مثلاً وہ جن میں سے ایک "جدیدیت" کے نام سے موسوم ہوتی جو بس ایک کوشش تھی پروٹسٹنٹ رویہ کو کیتھولک کلیسا کے اندر سمگل کرنے کی جو خوش قسمتی سے کامیاب نہ ہو سکی، بلکہ ہم یہاں خصوصیت کے ساتھ ایک ذہنی کیفیت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو کہیں زیادہ عام اور منتشر ہے۔ اس کا تعیّن مشکل تر ہے اور وہ اسی لئے زیادہ خطرناک بھی ہے۔ اس کا خطرناک ترین پہلو یہ ہے کہ جو لوگ اس سے متاثر ہیں وہ اکثر و بیشتر مکمل طور پر اس سے بے خبر ہیں، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص خلوص کے

ساتھ خود کو مذہبی سمجھتا ہو اور فی الاصل قطعاً مذہبی نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص خود کو مذہبی سمجھتا ہو اور روایت کی روح سے کاملاً بے بہرہ ہو۔ یہ ہمارے زمانے کی ذہنی پراگندگی کی ایک اور علامت ہے۔

جس ذہنی کیفیت کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ بنیادی طور پر مذہب کی تقلیل سے عبارت ہے گویا اسے ایسی چیز میں ڈھال لینے سے جسے ایک طرف ڈال دیا جائے اور جس کے لئے ہر ممکنہ حد تک محدود اور تنگ دائرہ کار مختص کر دیا جائے تاکہ اسے باقی زندگی سے اس طرح علیحدہ کر دیا جائے کہ اس کا کوئی اثر زندگی پر باقی نہ رہے۔ آج کتنے کیتھولک رہ گئے ہوں گے کہ عام زندگی میں جن کا طرزِ فکر و عمل اپنے لا مذہب معاصرین سے واضح طور پر الگ ہو! یہاں ہم عقیدہ اور ہر اس چیز سے جس کا تعلق عقیدے سے ہے مکمل لاعلمی اور بے نیازی کی طرف بھی توجہ دلائیں گے۔ بہت سے لوگوں کے لئے مذہب صرف چند اعمالِ ظاہرہ اور رواج کا معاملہ ہے اور اس کے بارے میں کوئی بات سمجھنے سے ایک ارادی انکار پایا جاتا ہے، بلکہ اس انکار کی حدود اس خیال کو چھونے لگتی ہیں کہ مذہب کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا یا شائد اس میں سمجھنے سمجھانے کی کوئی بات ہے ہی نہیں۔ علاوہ ازیں وہ شخص جو مذہب کو حقیقتاً سمجھتا ہو اسے اپنی مصروفیات میں ایسا غیر اہم مقام دے بھی کیسے سکتا ہے؟ دریں صورت عقیدہ یا تو فراموش کر دیا جاتا ہے یا اسے لاشئے محض بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس رویّے کے حاملین پروٹسٹنٹ ازم سے غیر معمولی طور پر قریب ہو جاتے ہیں، کیونکہ دونوں ایک سے جدید رجحانات کا نتیجہ ہیں جو کسی بھی قسم کی دانش کے یکسر مخالف ہیں اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ جس قسم کی تعلیم عموماً دی جاتی ہے وہ اس ذہنی کیفیت سے مقاومت کرنے کی بجائے، اس کے برعکس، اپنے آپ کو جھٹ اس کے مطابق ڈھال لینے پر راضی ہو جاتی ہے۔ اخلاقیات کے بارے میں مسلسل بات ہوتی رہتی ہے جبکہ عقائد کا شاذونادر ہی ذکر ہوتا ہے۔ بہانہ یہ بنایا جاتا ہے کہ ان کو کوئی سمجھے گا ہی نہیں۔ فی زمانہ مذہب بس لے دے کر "اخلاقیت پرستی" کے برابر رہ گیا ہے، یا کم از کم اتنا ضرور ہے کہ کسی کو یہ شناخت کرنے کی خواہش باقی نہیں رہی کہ مذہب حقیقتاً ہے کیا۔ کیونکہ وہ یقینی طور پر اخلاقیت پرستی سے مختلف چیز ہے۔ تاہم اگر عقیدہ کا ذکر آ ہی جائے تو اس کے بارے میں اس کے مخالفوں کی دنیوی سطح پر بحث کر کے اسے بے قدر بنا دیا جاتا ہے جس کا لامحالہ انجام یہ ہوتا ہے کہ ان مخالفین کو بالکل بلاجواز مراعات دینی پڑ جاتی ہیں اور اسی وجہ سے خاص طور پر لوگ اپنے آپ کو جدید "تنقید" سے برآمدہ مفروضات دریافتوں کا کم و بیش محتاج سمجھنے لگے ہیں۔ جب کہ اگر انہوں نے ایک دوسرا مختلف نقطۂ نظر اختیار کیا ہوتا تو ان کے لئے ان دریافتوں کی لغویت اور اتھلا پن واضح کرنا چنداں دشوار نہ ہوتا۔ ان حالات میں حقیقی روایتی روح کتنی کچھ برقرار رہ سکتی ہے؟

مذہبی دائرے میں انفرادیت پرستی کے مظاہر پر تبصرہ کرتے ہوتے ہم نے موضوع سے جو انحراف کیا ہے وہ بلاجواز اور بے فائدہ نہیں ہے کیونکہ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اس دائرے میں نقصِ اس

سے کہیں زیادہ خطرناک اور پھیلا ہوا ہے جتنا کہ بادیٔ النظر میں قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہمارے مسئلہ مبحوث سے لاتعلق بھی نہیں کیونکہ جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے، یہ انفرادیت پرستی ہی تو ہے جس نے ہر جگہ اٰا رائے زنی کو جنم دیا ہے۔ ہمارے معاصرین کو یہ بات سمجھانا بہت دشوار ہے کہ کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی فطرت کے اعتبار سے ہی بحث کی زد سے باہر ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی مشکل معاصرین کو یہ سمجھانا کہ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو بالفطرت حرف و بیان سے ماوراء ہیں۔ جدید آدمی اپنے آپ کو حق کی سطح تک بلند کرنے کی بجائے حق کو اپنی سطح تک کھینچ لانے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ اسی امر سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ لوگوں کو ایک بڑی تعداد ایسی کیوں ہے کہ جب ان سے "روایتی علوم" یا "خالص ماوراء الطبیعات" کی بات کی جاتی ہے تو انہیں گمان ہوتا ہے کہ اشارہ "دنیوی سائنس" یا فلسفے کی طرف ہے۔ انفرادی رائے کے دائرے میں رہتے ہوئے بحث ہمیشہ ممکن ہوتی ہے، اس لئے کہ یہ عام سوچ کے نظام سے ورا نہیں جاتی، کیونکہ ایک اصولِ برتر کے حوالے کے بغیر ایک مسئلے کے حق یا اس کی مخالفت دونوں میں معتبر دلائل بآسانی مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ اکثر اوقات مباحثے کو غیر متعین حد تک کسی بھی نتیجے پر پہنچے بغیر طول دیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً سارا جدید فلسفہ ابہام، لفظی ہیر پھیر اور غلط طور پر مرتب شدہ مقدمات سے تعمیر ہوا ہے۔ مباحثہ عموماً، عام توقع کے برعکس، ان مسائل کی وضاحت کرنے کی بجائے محض ایک گورکھ دھندا پیدا کر دیتا ہے۔ مسائل کو مبہم تر بنا دیتا ہے اور ہر فریق کے لئے اس کا نتیجہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے فریقِ مخالف کو قائل کرنے کی کوشش میں اپنی رائے پہ پکا ہوتا چلا جاتا ہے اور پہلے سے بڑھ کر اپنی رائے کے حصار میں بند ہو جاتا ہے۔ مقصود حقیقت کے علم تک پہنچنے کی خواہش نہیں بلکہ مخالفت کے باوجود خود کو حق پر ثابت کرنا یا اگر دوسرے قائل نہ بھی ہوں تو کم از کم خود کو اپنی راستی کا قائل کرنا ہے۔ اگرچہ دوسرے کو قائل کرنے میں ناکامی ملال پیدا کرتی ہے جو نتیجہ ہے "نو اعتقادیت" کی آرزو کا، جو جدید مغربی ذہنیت کا ایک اور امتیازی نشان ہے۔ کبھی کبھی انفرادیت پرستی، اپنے اسفل اور عامیانہ معنی میں اس سے بھی زیادہ بیّن طریقے پر لوگوں کی اس خواہش میں بار بار ظاہر ہوتی ہے کہ کسی آدمی کے کام کے معیار کا تعین اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں ان کی معلومات کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے گویا کہ ان دونوں چیزوں میں کسی قسم کا کوئی تعلق ممکن ہے۔ یہی رجحان تفصیل کے خبط سے مخلوط ہو کر اس دلچسپی کا موجب بنتا ہے جو "عظیم لوگوں کی" زندگیوں کے غیر اہم انوکھے واقعات میں ظاہر کی جاتی ہے اور یہی چیز اس وہم کا بھی باعث ہے کہ ان "عظیم آدمیوں" کے کئے ہوئے ہر کام کی توضیح و تشریح ایک طرح کے "نفسی وجسدی" PSYCHO-PHYSIOLOGICAL تجزیہ سے کی جا سکتی ہے۔ یہ سب کچھ ہر اس شخص کے لئے بہت اہم ہے جو معاصر ذہنیت کی اصل نوعیت کو سمجھنا چاہتا ہے

ایک لمحے کے لئے ہم واپس آئیں ان قلمروں میں مباحثے کے داخلے کی طرف جہاں مباحثے کے لئے کوئی جائز

مقام نہیں ہے۔ یہ بات وضاحت سے کہہ دینی چاہیئے کہ "معذرت خواہانہ" APOLOGETIC رویہ محض فعالی (اپنے قانونی معانی میں) ہونے کی وجہ سے فی نفسہٖ انتہائی کمزور واقع ہوا ہے۔ یہ بات بے سبب نہیں ہے کہ یہ لفظ APOLOGY (عذر) سے مشتق ہے جس کے اصلی معنی وکیل کے اعتذار کے ہیں اور جو انگریزی میں فی زمانہ "بہانہ" EXUSE کے معنی میں مستعمل ہے۔ معذرتیات APOLOGETICS کو دی جانے والی غیر معمولی اہمیت مذہبی روح کے انحطاط کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے۔ یہ کمزوری اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب معذرتیات زوال پذیر ہو جائیں، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، اور اپنے نقطۂ نظر اور طریقۂ کار میں مکمل طور پر دنیویؔ بن جائیں جس میں مذہب کو سب سے زیادہ ذیلی اور معروضاتی فلسفیانہ، سائنسی یا کھوکھلے سائنسی نظریات کی سطح پر کھینچ لایا جاتا ہے تاکہ خود کو "مصالحتی" ظاہر کیا جا سکے اور جس میں معذرت خواہ حضرات ایسے نظریات کو بھی قبول کرنے سے نہیں جھجکتے جن کی اختراع کا مقصود ہی مذہب کی بیخ کنی کرنا تھا۔ ایسے معذرت خواہ حضرات اس عقیدے کے بارے میں جس کا وہ خود کو کم و بیش مستند نمائندہ جانتے ہیں، اپنی جہالت کا ثبوت بہم پہنچا دیتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں کسی روایتی عقیدے کی طرف سے بولنے کا حق حاصل ہے انہیں محض دنیویؔ PROFANE لوگوں سے بحث میں الجھنے اور مناظرہ بازی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ان کا کام فقط اتنا ہے کہ وہ عقیدے کی تفسیر اس کی صحیح نوعیت کے مطابق کر دیں، اُن کے لئے جو اسے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں، اور ساتھ ہی ساتھ خطا کی تکفیر کریں، جہاں کہیں وہ جنم لے اور علم صحیح کی روشنی سے اس کی قلعی کھول کر رکھ دیں، ان کا منصب کسی نزاع میں حصّہ لے کر عقیدے کے بارے میں مصالحتی راہ اختیار کرنا نہیں ہے بلکہ وہ فیصلہ دینے کے مجاز ہیں، اگر وہ ایسے اصولوں کے حامل ہوں جن کے تحت بے خطا تعبیر کی جا سکتی ہو۔ محلّ عمل محلّ نزاع ہے یعنی انفرادی اور دنیاوی قلمرو۔ محرِّک غیر متحرک" حرکت میں شامل ہوتے بغیر اسے جنم دیتا ہے اور اس کی جہت مقرر کرتا ہے علم، عمل کے تغیّرات میں حصّہ لئے بغیر اسے منوّر کرتا ہے۔ روحانی دنیاوی کی راہنمائی کرتا ہے، اس کے ساتھ مخلوط ہوئے بغیر، اور اس طرح تمام اشیاء کائناتی نظام مراتب HEIRARCHY میں اپنی صحیح ترتیب اور اپنے محلّ پر برقرار رہتی ہیں لیکن جدید دنیا میں صحیح نظامِ مراتب کا تصوّر کہاں پایا جاتا ہے؟ کوئی شے اور کوئی شخص بھی اپنے صحیح مقام پر باقی نہیں رہا لوگ اب نہ تو مرتبۂ روحانیہ SPIRITUAL ORDER کی کسی مؤثر حاکمیت کے قائل رہے ہیں نہ دنیاوی مرتبہ TEMPORAL ORDER کی کسی جائز قوت کو تسلیم کرتے ہیں۔ دنیوی لوگ القدس SACRED پر بحث کرنے بلکہ اس کی نوعیت اور اس کے وجود میں کلام کرنے کی ٹھانے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ کیا ہے اکہ اسفل اعلیٰ پر فیصلہ دے رہا ہے، دانش کی تحدید جہالت سے ہو رہی ہے، باطل حق پر غالب ہے بشری الوہی پر فائق ہے

زمین آسمان کے سر چڑھی جا رہی ہے، فرد اپنے آپ کو معیارِ اشیاء بنائے بیٹھا ہے اور کائنات کے لیئے قوانین کی تخلیق کر رہا ہے۔ ایسے قوانین جو سراسر اس کی اضافی، محدود اور پرخطا سوچ کی ہیں "وائے ہو تم پر، اے نابینا راہبرو" "WOE UNTO YOU, YE BLIND GUIDES" کتب مقدس کا فرمان ہے اور لاریب آج ہر جگہ اندھے اندھوں کی راہنمائی کر رہے ہیں کہ اگر جنہیں صحیح قـ پر رد کا نہ گیا تو وہ لازماً انہیں پاتال میں گرا دیں گے اور ان کے ساتھ خود بھی ہلاک ہوں گے۔

محمد خالد اختر
(خصوصی مطالعہ)

محمد خالد اختر کا فن

محمد کاظم

جناب محمد کاظم نے یہ مضمون قریباً پندرہ سال قبل لکھا تھا جبکہ اس دوران محمد خالد اختر فن کی نئی منزلوں کی طرف گامزن ہو چکے ہیں، تاہم اس مضمون میں خالد صاحب کے فن کے بنیادی جوہر کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے اور یوں یہ مضمون آج بھی کارآمد ہے۔ (ایڈیٹر)

ہماری تنقید نے معاصر ادب کی جن شخصیتوں کو بالکل نظرانداز کرنے کا فیصلہ کیا ہے ان میں محمد خالد اختر کا نام سرفہرست ہونا چاہیے۔ ایک تو اس لیے کہ وہ ادب کی بساط پر نووارد نہیں ہیں۔ بلکہ تیس، پینتیس برس سے لکھ رہے ہیں، دوسرے اس لیے کہ انہوں نے ادب کی ان خاص اصناف میں اپنے فن کے نمونے پیش کیے ہیں، جن میں اردو ادب سدا سے مفلس رہا ہے، آج بھی مفلس ہے اور اگر تنقید کا یہی رجحان رہا تو آئندہ بھی ان اصناف میں اس کی ترقی کے امکانات زیادہ روشن نہیں ہیں۔

ہمارے نقاد اپنے اس رویہ کے حق میں ایک سے زیادہ عذر پیش کر سکتے ہیں۔ محمد خالد اختر نے ابھی کچھ زیادہ نہیں لکھا۔ اور جتنا کچھ لکھا ہے وہ سب کا سب رسالوں کے اوراق میں بکھرا پڑا ہے اور ایک تنقید نگار کے لیے منتشر چیزوں کا جائزہ لینا مشکل ہے! محمد خالد اختر کے طنز و مزاح کا مزاج بالکل مغربی ہے اور ہم ٹکسالی زبان کا ذوق رکھنے والوں کے لیے وہ ایک اجنبی اور نامانوس چیز ہے! — محمد خالد اختر کی زبان انگریزیت زدہ ہے اور ان کے جملوں کی ساخت اور الفاظ کی ترکیب و نشست قواعد کی رو سے بہت محکم نہیں ہوتی (اور اس لحاظ سے شاید ان کے مرتبے کی بابت بھی سوال ہو سکتا ہے!) — محمد خالد اختر اپنے طنز و مزاح کے لیے کبھی فنٹیسی کا پیکر استعمال کرتے ہیں، کبھی پیروڈی اور برلسک کا، اور کبھی فارس کا اور ان اصناف کی صحیح قدر و قیمت لگانے کے لیے ہمیں فی الحال کچھ وقت درکار ہے! — لیکن یہ اتنی ساری باتیں کہنے کی بجائے کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ہم عالی ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے وہ ایک ناخوشگوار حقیقت تسلیم کر لیں جو ان سب پر بھاری ہے — وہ یہ کہ ہمارے یہاں تنقید نے ابھی اپنے پاؤں پر چلنا نہیں سیکھا۔ ابھی وہ تعلقات اور ذاتی جان پہچان کے سہارے ہی چلتی ہے اور اس کا زاویہ ان شخصی مراسم کے خط و خال سے قائم ہوتا ہے جو ایک ادیب اور نقاد کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ جہاں کسی ادیب نے بالکل ہی بیراگی اور آزاد منش رہنا پسند کیا ہو، اور کسی نقاد کے ساتھ بھی اس کی یاد اللہ نہ ہو، وہاں تنقید کا کوئی زاویہ قائم ہی نہ ہو پاتا۔ نہ اچھا، نہ برا۔

محمد خالد اختر نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اس کا بہت بڑا حصہ طنز و مزاح پر مشتمل ہے۔ ادب میں طنز و مزاح کہنے کو تو ایک ہی صنف ہے، لیکن اس میں ایک خالص ظرافت اور استہزا سے لے کر ایک سنجیدہ اور نوکیلی طنز تک قوس قزح کے رنگوں کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ لایعنی استہزا، (FARCE)، مزاح (HUMOUR)، بذلہ سنجی (WIT)، رمز، طعن آمیز (IRONY)، تمسخر (PARODY)، مسخ نگاری (BURLESQUE) اور طنز (SATIRE) ــــ یہ سب اس صنف کی الگ الگ اور قابل شناخت صورتیں ہیں۔ پھر ان کے امتزاج سے کچھ اور مرکب صورتیں بھی پیدا ہوتی ہیں جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ محمد خالد اختر کی تخلیقات میں طنز و مزاح کی یہ تقریباً ساری صورتیں کہیں تنہا، کہیں باہم ملی جلی دیکھی جا سکتی ہیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے "سفرنامہ" کی صنف میں چند ایک ایسی چیزیں پیش کی ہیں جو اس قابل ہیں کہ ان کا خصوصی جائزہ لیا جائے۔ اس لیے کہ اس سلیقے اور ہنر کی چیزیں اردو ادب میں اگر ہیں بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ سفرنامے سے ملتی جلتی ایک صنف "رپورتاژ" ہے۔ اس میں بھی انہوں نے کچھ تجربے کیے ہیں، جن میں ایک انفرادیت پائی جاتی ہے۔ فکشن میں انہوں نے اب تک دو تین چیزیں ہی لکھی ہیں، لیکن بہت ہونہار اور امید افزا قسم کی۔ ان میں یقیناً فینٹسی لکھنے کا ملکہ موجود ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس صنف میں وہ اردو ادب کے کچھ مزید تقاضے پورے نہ کریں ـــــــ اور اب حال میں انہوں نے عملی تنقید میں ایک بار پھر طبع آزمائی کی ہے اور ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ تنقید بذاتِ خود بھی ایک ادب پارہ ہو سکتی ہے ـــــــ ایک ایسی ہنستی، مسکراتی اور جھلملاتی ہوئی تحریر جس کے سر پر علمیت کی دستار اور جس کے چہرے پر متانت کی پرچھائیں نہیں ہوتی۔ جسے پڑھتے ہوئے انسان کی روح اپنے آپ کو لطیف اور ہلکا محسوس کر سکتی ہے!

یہ صحیح ہے کہ طنز و مزاح کے علاوہ باقی اصناف ادب میں محمد خالد اختر نے دو دو چار چار چیزیں ہی اب تک پیش کی ہیں لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ یہ گنتی کی چند کوششیں کیا لازماً نظر انداز کر دینے ہی کے لائق ہیں یا ان کے اندر ہمیں فن کے ایسے تجربے ملتے ہیں جو اپنی ندرت اور تازگی کی وجہ سے کچھ خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

طنز و مزاح کا مرکب دو بنیادی اور مختلف عناصر پر مشتمل ہے: ایک طنز یعنی نکتہ چینی اور تنقید، دوسرے مزاح یعنی ظرافت و تفنن۔ ادب میں خالص اور بے نیام قسم کی طنز کا زمانہ اب کہیں بھی باقی نہیں رہا۔ اگرچہ خالص مزاح کے نمونے آج کے ادب میں بھی مل جاتے ہیں۔ یہ زمانہ دراصل طنز کی کڑواہٹ کو مزاح کی شیرینی میں لپیٹ کر پیش کرنے کا ہے اور مزاح سے ان دونوں زیادہ تر طنز ہی کی خدمت لی جاتی ہے اور ان دونوں اجزا کے باہمی تناسب سے طنز و مزاح کی بوقلموں صورتیں وجود میں آتی ہیں۔ اگر اس میں طعن و تنقید کا عنصر غالب ہو تو اس صنف ادب کی حدیں جھلاہٹ سے گزر کر دشنام طرازی تک جا پہنچتی ہیں جو اسلوب شعر میں منتقل ہو کر 'ہجو' کہلاتی ہے اور دوسری طرف اگر اس میں ظرافت اور مسخرے پن کا پہلو حدِ اعتدال سے گزر جائے تو وہ خالص مزاح یا استہزا بن کر رہ جاتی ہے۔

محمد خالد اختر کے یہاں طنز و مزاح کا جو مرکب ملتا ہے۔ اس میں ان دو عناصر کا تناسب کچھ اس طرح کا ہے کہ اس سے ایک طرف تو سلیقہ اور رجحان ہر حال میں قائم رہتی ہے۔ دوسری طرف اس کی تیزی اور چبھن کو ایک نہایت ہی شگفتہ اور اردو ادب میں نئی طرز کے ـــ مزاحیہ اسلوب سے اس طرح نرم اور معتدل کر دیا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف قابل برداشت بلکہ پرلطف

اور مسرت انگیں بن جاتی ہے۔

اس دنیا میں ہمیں انسان کے منفرد کردار اور اس کی اجتماعی حیثیتوں اور تنظیموں کی سرگرمیوں میں دو طرح کی زندگی سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک زندگی وہ ہے جو سطح کے اوپر اور نمایاں ہوتی ہے جسے حسب منشا "بنا کر" پیش کیا جاتا ہے اور دوسری وہ جو حقیقی اور اصلی ہوتی ہے اور ہمیشہ سطح کے نیچے مستور رہتی ہے' یا جان بوجھ کر مستور رکھی جاتی ہے۔ محمد خالد اختر کی طنز کا نشانہ یہی اوپری پر تصنع زندگی ہے' جسے بعض اوقات ایک قابلِ رحم سادگی کے ساتھ اپنی اصلیت سے ایک بالکل ہی مختلف شکل میں دکھایا جاتا ہے۔ اس اوپری اور سطحی زندگی کا فاصلہ اپنی اندرونی حقیقت سے جس قدر زیادہ ہوتا ہے اور اس "نقل" کے خدو خال اپنی "اصل" سے جتنے زیادہ مختلف ہوتے ہیں۔ اتنا ہی محمد خالد اختر کی طنز بھی گہری اور بھرپور ہو جاتی ہے اور ایسی حالت میں ان کا لطیف اور شائستہ مزاح بجائے اسے ہلکا اور نرم کرنے کے کچھ زیادہ ہی دلخراش کر دیتا ہے۔ انگریزی طنز کے مورثِ اعلیٰ سوفٹ کا اپنے بارے میں قول ہے۔

HIS VEIW IRONICALLY GRAVE

EXPOSED THE FOOL, AND LASHED THE KNAVE

یہی رویہ ہمارے اس طنز نگار کا بھی ہے۔ انہیں اس بناوٹ اور ظاہر داری میں جہاں محض سادگی اور بھول پن نظر آتا ہے وہاں وہ اسے صرف بے نقاب کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ لیکن جہاں اس کے پیچھے انہیں منافقت اور جھوٹے تکبر کا احساس ہوتا ہے وہاں انکی طنز میں ملائمت اور ہمدردی نہیں' ایک نشتریت اور بے رحمی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

ہمارا یہ عام طبقاتی معاشرہ، علم و ادب کا ماحول، تجارت اور کاروبار کی دنیا، فلمی نگار خانے، سرکاری پروٹوکول، سیاسی ادارے مزار، درگاہیں اور ان کے درویش اور مجاور، ڈاکٹری، طب اور تعویذ و عملیات کے مشاغل ——— ان مختلف دنیاؤں میں جہاں کہیں بھی انہیں اس کھوکھلی وضعداری، تصنع اور فریب سے سابقہ پیش آتا ہے وہ اس کی تصویر ایک نپے تلے مبالغے کے ساتھ اپنے مخصوص مزاحیہ اسلوب میں اس طرح کھینچتے ہیں کہ اس کا ظاہری لباس، تشفاف اور مزل ہو کر اندر کی حقیقت کو عریاں کر دیتا ہے۔ اس طرح ان کی طنز میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ وہ اس کی یکسوئی اور مقصد کی سنجیدگی ہے ان کی طنز ہوا میں نہیں ہوتی نہ اس میں مزاح برائے مزاح کا رنگ ہوتا ہے اور نہ اس کا حال اس کھلنڈرے مسخرے کا سا ہوتا ہے جو راہ چلتے چلتے دائیں بائیں لوگوں کو اپنی تضحیک اور ٹھٹھے پن کا نشانہ بناتا چلا جائے ——— بلکہ ان کی طنز کا رخ باوجود ایک توانا مزاح کی آمیزش کے، ہر جگہ صاف کھلا ہوا رہتا ہے اور جس موضوع کو بھی وہ اپنا ہدف بناتی ہے، اس کے تمام پہلوؤں اور زاویوں سے پورا پورا انصاف کرتی ہے ——— اس طرح کے طنز و مزاح میں جو جہت اور سمت اور جو گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے' وہی دراصل اسے سنجیدگی عطا کرکے' ادب کی اصناف میں باعزت جگہ پانے کے قابل بناتی ہے۔!

طنز کا اثر پیدا کرنے کے لیے مقالہ، انشائیہ، سوانحی خاکہ، تبصرہ، سفر نامہ، کہانی اور ناول ——— ادب کی تقریباً بھی اصناف استعمال کی جا سکتی ہیں اور کی گئی ہیں۔ لیکن جو طنز کہانی اور ناول کے اسلوب میں کرداروں کے واسطے سے پیدا کی جائے وہ بالواسطہ اور لطیف و معنٰی ہونے کے باعث زیادہ با اثر، پرلطف اور فنی اعتبار سے بلند پایہ ہوتی ہے۔ محمد خالد اختر کو چونکہ افسانہ گوئی

اور کردار نگاری کی اعلیٰ صلاحیتیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنے طنز و مزاح کے لیے کہانی اور ناول کی ہیئت زیادہ استعمال کی ہے اور بہت کامیابی کے ساتھ! ان کے طنز و مزاح کے اعلیٰ اور بہتر نمونے ہمیں ان کی کہانیوں اور ناولوں ہی میں ملتے ہیں۔ اس غرض کے لیے وہ کچھ انوکھی اور پُر تصنع شخصیت رکھنے والے کردار سٹیج پر لاتے ہیں۔ اور ان کی گفتگو، اندازِ فکر اور حرکات و سکنات سے انسانوں کی ان کمزوریوں، بناوٹوں اور حماقتوں کو طشت از بام کرتے ہیں جن کے بارے میں ہم۔ انسان۔ عموماً بہت حساس اور اسی لیے انہیں چھپائے رکھنے پر اتنے مصر ہوتے ہیں۔ ان کا یہ پردہ ہٹانے کا انداز اپنے مجموعی تاثر کے اعتبار سے عموماً تلخ اور بے رحم نہیں ہوتا اور نہ اس میں تضحیک و تمسخر کا کہیں احساس ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں زیادہ تر ایک ایسی مروت اور خوشدلی پائی جاتی ہے جس سے قاری کو ان کمزور و ناتواں اور بناوٹی کرداروں سے ایک گونہ ہمدردی پیدا ہونے لگتی ہے اور ایسی صورت میں طنز نگار کا مقصد اپنی طنز سے صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی 'انسانی' کمزوریوں اور بے چارگیوں کو چھپانے اور ان پر بناوٹ اور تکلف کے پردے ڈالنے کی بجائے انہیں سیدھی طرح تسلیم کریں اور اپنی ناقص و ناتمام شخصیت پر کوئی ملمع چڑھانے کی بجائے اس دنیا میں 'اپنا آپ' بن کر رہیں۔!

ایک اور خصوصیت محمد خالد اختر کی طنز میں ایسی ہے جس کے باعث ان کا فن 'ہنگامی' اور مرورِ زمانہ کے ساتھ بے کیف اور فرسودہ ہونے کی بجائے ادب کی روایت میں بہت دیر تک اپنی تازگی اور شگفتگی قائم رکھ سکے گا۔ ان کی طنز اپنے موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے شخصی اور ذاتی نہیں ہوتی اگرچہ وہ بعض اوقات بظاہر ایسی ہی معلوم ہوتی ہے بلکہ نوعی اور گروہی ہوتی ہے انہوں نے ––– پیروڈیوں اور ایک آدھ دوسرے مضمون کو چھوڑ کر ––– اپنے عام طنزیہ مضمونوں اور کہانیوں میں کسی معلوم و معروف شخص کو اپنے طنز و مزاح کا ہدف نہیں بنایا، بلکہ کچھ ناشندہ کرداروں اور کچھ خاص حماقت زدہ ذہنیتوں کی پردہ دری کی ہے۔ اور یہ ناشندہ کردار، اور یہ حماقت زدہ ذہنیتیں بہت دیرپا ہوتی ہیں اور اسی لیے محمد خالد اختر کا انداز طنز بھی اتنا عارضی اور چند روزہ ثابت نہیں ہوگا۔ جتنا کہ طنز کی عام شکلوں کے بارے میں عموماً سمجھا جاتا ہے۔

آج سے کوئی چودہ پندرہ برس پہلے ہمارے اس نوزائیدہ ملک میں نیا نیا جمہوری راج تجربے کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ جمہوریت کی آزاد اور لا ابالی فضا نے حکومت اور سیاست سے لے کر ایک عام آدمی کی زندگی تک میں ایسے عجیب و غریب تضاد اور منافقانہ رویے کو جنم دیا تھا جس سے حساس طبیعتیں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ ہر طرح کی آزادی اور آوارگی کی فضا! یہ ایک طنز نگار کے لیے وہی تاثیر رکھتی ہے جو گل ہائے چمن کے لیے بادِ سحر! اس میں اس کی تنقیدی حس کو شہہ ملتی ہے اور اس کا فن اپنے اظہار کے لیے نئی نئی صورتیں تلاش کرتا ہے ––– ایسے ہی حالات تھے جن میں محمد خالد اختر نے سنہ ۱۹۵۰ء میں اپنا ناول "بیس سو گیارہ" لکھا۔ جو بظاہر ایک فینٹیسی تھی لیکن درحقیقت کنائے (ALLEGORY) کے پیرائے میں ایک خوش طبع، مگر جاندار طنز تھی اور اس لحاظ سے اردو ادب میں ایک بالکل ہی نئی چیز! حکومتوں کے پر دلوکوں میں جو تکلفات، نمائش اور رکھ رکھاؤ ایک زمانے سے چلے آتے ہیں۔ اور نئی جمہوری حکومتوں میں وزیروں کے رنگ ڈھنگ اور سوچنے اور کام کرنے کے جو انداز آج بھی ہر جگہ دیکھے جا سکتے ہیں، وہ سب "۲۰۱۱" کا موضوع ہیں۔ اس کے علاوہ اس ناول میں ایک خاص مذہبی ذہنیت، عورت اور پردے کے بارے میں عوام کا ایک بے لچک تصور، سیاسی پارٹیوں اور خصوصاً کمیونسٹوں کے کام کرنے کے ڈھنگ اور ادیبوں کی گروہ بندیاں

اور ان کے باہمی تنازعات ــــــ اس وقت کی زندگی کے یہ سارے پہلو طنز و مزاح کے عمل کی زد میں آتے ہیں!

اس کتاب کے انتساب میں مصنف لکھتے ہیں: "میرا ارادہ ایچ جی ویلز کی فینتاسیوں کے تتبع میں لکھنے کا تھا مگر میں اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ مجھے ڈر ہے کہ میری یہ فینتاسی ایک فارس بن کر رہ گئی ہے ۔ ۔ ۔" لیکن درحقیقت یہ نہ کوئی فارس ہے اور نہ صحیح معنوں میں فینٹسی۔ اس لیے کہ اگر یہ محض تفریحی مزاح اور ہنسی مذاق کی ایک کہانی ہے تو پھر آپ طنز کسے کہیں گے۔ اس میں ایک کامیاب اور موثر طنز کے سارے خط و خال موجود ہیں ــــ اور فینٹسی اس میں صرف اس قدر ہے کہ ۱۹۹۰ء کی خوفناک عالمگیر تباہی کے بعد اگست ۲۰۱۱ء کی ایک صبح کو جمہوریت یوکنا پوٹاوا کے صدر ہز ایکسی لنسی پوپو پالنہار چوکا مانیغو اپنے ملک کے دارالخلافہ چنفتی کے راکٹ ڈروم سے اپنے ملٹری سیکرٹری سارجنٹ بزفر کی معیت میں "فائر" کیے جاتے ہیں اور چار منٹ کے اندر اندر ایک دوسرے ملک ماضنین کے دارالخلافہ شترابا کے اڈے پر وصول کرنے والے آلے میں وصول ہوتے ہیں۔ "میرا سر اس ہزار دل میل کے سفر میں زدوں زدوں لٹو کی طرح گھوم رہا تھا!" وہ بعد میں اس سفر کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ اس کتاب کے پہلے باب (پیش لفظ) میں "جو زیادہ تر ان لوگوں کے لیے ہے جن کی تاریخ قدرے کمزور ہے" وہ تاریخ کی اس ہولناک تباہی، اور روئے زمین پر سے انسانی تہذیب و تمدن کے سارے نشانات کے آناً فاناً مٹ جانے کی بابت ایک مورخ کے لہجے میں مفصل بات چیت کرتے ہیں ــــ اس باب کے بعد اس کتاب میں کہیں فینٹسی نہیں ہے۔ بلکہ پورا ناول کنائے میں لپٹی ہوئی خالص انگریزی طرز کے ایک شگفتہ اور تازہ مزاحیہ اسلوب میں ایک پُر اثر طنز ہے، طنز کا لہجہ کہیں دھیما اور معتدل اور کہیں چبھتا ہوا ہے اور کنائے کی برجستگی کو مصنف نے جس تسلسل و تواتر کے ساتھ پوری کتاب میں نبایا ہے وہ اس کے فن کی پختگی کی ایک ناقابل انکار دلیل ہے۔

ناول "بیس سو گیارہ" کے علاوہ طنز و مزاح میں محمد خالد اختر کے صرف مقالات اور خاکے ہی ابھی تک شائع ہوئے ہیں۔ جن کی تعداد پینتالیس پچاس کے قریب ہو گی۔ ان مقالات میں موضوع کا کافی تنوع اور انداز طنز کی رنگا رنگی نظر آتی ہے اور انہی کے اندر ہمیں کہانیوں کے وہ سلسلے بھی ملتے ہیں، جن میں قاری کو ایک خاص ماحول اور چند خاص کرداروں سے بار بار واسطہ پڑتا ہے۔ ان سلسلوں میں سب سے نمایاں اور مکمل سلسلہ "عبدالباقی" کہانیوں کا ہے جس میں ہماری یادداشت کے مطابق اب تک "مچھلیاں اور عبدالباقی"، "ماہنامہ الو کا اجراء" "زیبرا سکیم"، "آپ کا کافی ہاؤس"، "فورکلینڈ رکمپنی" "باقی بہادر سرکس" "ماڈرن ڈیزاسٹرز" تقریباً اسی ترتیب کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں۔ ان کہانیوں میں ہمارے طنز نگار نے چچا "عبدالباقی" اور بھتیجے "بختیار خلجی" کے دو بہت ہی زندہ اور مانوس قسم کے نمائندہ کردار تخلیق کیے ہیں۔ چچا عبدالباقی ایک ناٹے قد کا گول معصوم اور دوستانہ چہرے والا بظاہر ایک ہوشیار اور صاحب تخیل آدمی ہے۔ تجارتی کاروبار کی منصوبہ بندی میں اس کا ذہن ہمیشہ تصور و خیال کی آخری بلندیوں کو جا چھوتا ہے۔ لیکن فن تجارت کی واقفیت اور اس کے عملی تجربے میں آپ اتنے ہی کورے ہیں جتنا کورا کوئی انسان ہو سکتا ہے کچھ وقت کے لیے بات بنانے اور وضعداری نبھا لینے میں البتہ آپ کو کافی ملکہ حاصل ہے۔ لیکن اس کی چکنی چپڑی باتوں کا واحد شکار اگر کوئی شخص بنتا ہے تو وہ اس کا سادہ لوح اور اسی کی طرح کا عزیز علی بھتیجا بختیار خلجی ہے۔ اس نوجوان کے علاوہ کسی دوسرے شخص پر اس کی سرسبز باتوں کا فسوں زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔ اس کی ہر نئی عظیم الشان تجارتی سکیم، جس کے لیے سرمائے کا بندوبست کرنے کی خاطر ہوشیار اور کائیاں چچا ہر بار اپنے احمق اور سادہ لوح بھتیجے کو اپنے باپ سے روپیہ منگوانے پر آمادہ کر لیتا ہے۔

بڑی آن بان سے اور مضحکہ خیز بناوٹ کے ساتھ نہایت ہی کھوکھلی اور ہوائی بنیادوں پر اٹھتی ہے اور عبد الباقی کی ظاہری چستی چالاکی انتظامی قابلیت اور سائن بورڈوں اور افتتاحی تقریروں کے اہتمام کے باوجود چند دنوں کے اندر ہی دھڑام سے نیچے آ رہتی ہے۔ اور بختیار جلجی ہمیشہ کی طرح اخلاقی جرأت اور صبر سے کام لیتے ہوئے اپنے اس بصد مشکل حاصل کیے ہوئے سرمائے پر فاتحہ پڑھ لیتا ہے لیکن یہ تجارتی تجربے باوجود اپنی دلخراش ناکامیوں کے کچھ تابناک اور مسرت بخش لمحوں سے کبھی خالی نہیں ہوتے اور یہ لمحے وہ ہوتے ہیں جو کسی نئی سکیم کے لیے نیا نیا سرمایہ ہاتھ آنے پر تجارتی مہموں کے یہ ڈون کوکزوٹ آنے والی کامیابیوں کی خوشی میں کسی شاندار ہوٹل میں پر تکلف لنچ کھاتے ہوئے یا ریل کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں سفر کرتے ہوئے بسر کرتے ہیں اور جن میں اس محدود سرمائے کا بڑا حصہ ابتدا ہی میں اٹھ آتا ہے۔

اس قسم کی چند ایک سکیموں کی ناکامی کے بعد بھتیجے جلجی کا چوکنا ہو جانا ایک طبعی امر تھا اور اب کسی نئی سکیم کے لیے اس سے سرمایہ بہم پہنچانے کے لیے کچھ کہنا بظاہر ایک دشوار سی بات معلوم ہوتی تھی۔ لیکن چچا عبد الباقی کے متعلق جیسے کے لیے یہ کبھی مسئلہ نہیں بنا اور ہر پچھلی ناکامی کے لیے اس کے پاس ہمیشہ ایک مدلل اور قابل یقین وجہ موجود ہوتی تھی۔

”ماہنامہ الوادر زیبروں کی سکیم کی ناکامی سے مجھے جج نہ کرو“ وہ اپنے بھولے اور خوش اعتقاد بھتیجے سے ”آپ کا کافی ہاؤس“ کی ایک نئی سکیم کی تمہید باندھتے ہوئے کہتا ہے ”اس میں ہماری بدقسمتی سے ہمیں دوسرے لوگوں نے دھوکا دیا اور تم بھی جلد دل چھوڑ گئے ورنہ ہماری کامیابی یقینی تھی۔ اس نئی بزنس میں ہم بالکل اپنے آپ پر بھروسہ کریں گے اور اپنی لائنز پر اس کو چلائیں گے۔ اچھا منافع میں پچاس فیصدی حصہ تمہیں غالباً منظور ہوگا۔ نہیں تو تم پچپن بلکہ ساٹھ فیصدی حصہ لے سکتے ہو۔ صرف تمہارے کہنے کی دیر ہے“ عبد الباقی کی چکنی باتوں کا جال پھیلنا شروع ہوتا ہے، بختیار جلجی اس میں تھوڑی دیر کے لیے پھڑپھڑاتا ہے۔ لیکن کچھ لمحوں کے بعد چچا عبد الباقی کے ساتھ اپنی پہلی تجربوں کی تاریخ کو بھول کر یہ سوچنے لگا کہ یہ کافی ہاؤس عجیب چیز ہے ایک شخص کافی ہاؤس میں ساری عمر خوش خوش گذار سکتا ہے۔ یہ چیز بالکل میرے مزاج کے مطابق ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ کافی ہاؤس کا جنرل منیجر اپنی نئی پوزیشن میں اپنے آپ کو متصور کر کے گلابی خواب دیکھنے لگا“ ــــ شکار بالآخر جال میں پوری طرح پھنس جاتا ہے۔

عبد الباقی کہانیوں کا اصل موضوع تو ہمارے کاروباری ماحول کے یہی خوش فہم اور تجربہ کار افراد ہیں، جن سے ہمیں آپ کو خصوصیت کے ساتھ آزادی کے بعد سابقہ پیش آنے لگا ہے اور ہم انہیں سڑکوں پر پھرتے ہوئے یا بازار میں کسی دکان پر فارغ اور بےکار بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں۔ لیکن ان کہانیوں کی طنز کا دائرہ کافی وسیع ہے اور اس کی لپیٹ میں تجارت اور بیوپار کی دنیا کے بہت سے کردار آتے ہیں، جن میں وہ ”عمر عیار“ بھی شامل ہیں جو اس میدان میں نئے نئے داخل ہونے والے بیوقوفوں کو اور بھی زیادہ بے وقوف اور الو بنا کر ان کی ساری پونجی اڑا لے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ زیبروں کی سپلائی میں اچھی قسم کے گدھے لے کر اور ان پر رنگ کی مصنوعی دھاریاں بنا کے انہیں اصل زیبروں کے طور پر پیش کرنے سے بھی نہیں چوکتے اس طرح عبد الباقی کہانیوں کی تہ میں ہمیں اس عظیم تفاوت کا ایک تلخ احساس ملتا ہے جو زندگی کے ایک خاص شعبے میں انسانوں کے مزاج، عادات قابلیتوں اور اہلیتوں کے درمیان پایا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے ایک ہی سوسائٹی میں مختلف طبقات اور اجارہ داریاں قائم ہوتی ہیں اور ہر طبقہ یا گروہ دوسرے طبقے کو بجائے سہارا دینے کے اسے دور دھکیلنے کی فکر میں رہتا ہے، عبد الباقی کہانیوں کے

ظاہری مزاج اور خوش طبعی کے پیچھے انسانی کردار کی کمزوریوں اور بناوٹوں کا ایک ایسا دبا ہوا المیہ ملتا ہے جس کی بابت زیادہ سوچنے سے انسان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔

ان کہانیوں میں محمد خالد اختر نے افسانہ گوئی، کردار نگاری اور جزرسی مشاہدہ کے حسن کا مظاہرہ کیا ہے، وہ کسی بھی اچھے افسانہ یا ناول نگار کے لیے قابلِ فخر ہو سکتا ہے۔

ایک اور کردار جس سے محمد خالد اختر نے اپنے طنز و مزاح کی خدمت لی ہے، ایک منقلب شخصیت کا نچلے طبقے کا فرد ہے جو اپنا پورا نام اپنی نگارشات کے آخر میں یوں دیتا ہے۔

خاکسار، خاکپائے اولیائے کرام، مرید حاجی حضرت گھوڑے شاہ، فقیر درویش لالو شاہ صاحب رسابق وال خان کلرک تھرڈ گریڈ محکمہ آبکاری، دولت خداداد پاکستان، حال مقیم لاہور۔

اپنی شخصیت کے ان دو مختلف پہلوؤں کے متعلق جو اس کے نام ہی میں ظاہر ہیں، وہ "لاہور شہر کی مختصر تاریخ" کے شروع میں اپنا تعارف کراتے ہوئے بتاتا ہے کہ:۔

"یہ عاجز اور کم ظرف شخص کہ نام اس کا آپ کو معلوم ہی ہے اور یہاں اسے پوری کنیت اور القاب کے ساتھ دینا باعث تعلی ہوگا، عرض کرتا ہے کہ میرا اصل پیشہ محرری اور کلرکی تھا۔ من جملہ دیگر ادنیٰ درجہ کے عارضی محرروں کے یہ منحوس بھی دو سال گزرے تخفیف کی زد میں آ گیا۔ خدائے عزوجل کا لاکھ لاکھ شکر بجا لانا چاہیئے کہ ان کئی دوسرے ہم عصر ملازمین مالی و ملکی کے مثل نااہلی یا رشوت خوری کی بنا پر برطرف نہیں ہوا۔ ورنہ اپنے اعزا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ اپنے عہدے سے باعزت فراغت کے بعد اپنی زوجہ حیات اور چار بچوں سمیت شہر لاہور کو اپنا ٹھکانا بنایا کہ یہ شہر عالم میں انتخاب ہے۔"

"لاہور شہر کی مختصر تاریخ"، "فاسنامہ انتخابی" اور "عرض حال مصنف" میں ہمارے طنز نگار نے اس روایت پسند اور وضعدار اور غیور کردار کی زبان سے عام شہری زندگی، ملکی سیاست، علمی و ادبی ماحول اور مزدوروں اور روزگاروں کی دنیا پر ایک معتدل اور خوش طبع انداز میں طنز کی ہے، جس میں بیشتر جگہ اگرچہ مزاح کا عنصر ہی نمایاں ہے۔ لیکن اس سے طنز کی جہت کہیں کم نہیں ہونے پائی اور نہ کسی جگہ محض تفریحی استہزا، یا ہرزہ سرائی کا رنگ پیدا ہوا ہے۔ فقیر درویش لالو شاہ کی قدامت پسندی اور روایتی انداز فکر کی مناسبت سے محمد خالد اختر نے جو اسلوب بیان استعمال کیا ہے وہ اردو ادب میں مسخ نگاری ۔۔۔ کا ایک کامیاب اور عمدہ نمونہ ہے اور اگر ہم اس امر کو پیش نظر رکھیں کہ ان کا اپنا عام اسلوب قدیم اور روایتی اسلوب سے ایک بے حد مختلف چیز ہے اور وہ فارسی اور عربی زبانوں کے بھی فاضل نہیں ہیں تو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ برلسک لکھنے میں وہ کتنی ریاضت اور کاوش سے کام لیتے ہیں اور تفصیلات و جزئیات کے معاملے میں ان کی نگاہ کتنی دقیقہ رس ہے۔

محمد خالد اختر کی تند اور بے رحمانہ طنز کا نمونہ ان کے ایک مشہور طنزیہ خاکے "اہل مسلم خود اپنی نظر میں" ملتا ہے۔ تصنع، بناوٹ اور جھوٹا فخر و غرور لہیں بھی ہو، محمد خالد اختر کی طنز کو اپنی طرف متوجہ کیے بغیر نہیں رہتا۔ لیکن علم و فن اور ادب اور آرٹ کی دنیا میں خصوصیت کے ساتھ وہ کسی بھی بناوٹ اور خود بینی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہاں وہ اپنے ہدف پر پوری قوت کے ساتھ حملہ آور ہوتے ہیں اور اسے کسی صورت میں معاف کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ "اہل مسلم۔۔۔" کے خاکے میں کنایہ بہت ہی خفیف قسم

آج سے اٹھارہ برس پہلے ماہنامہ "ادبِ لطیف" میں چھپی تھی اور یہ ان کی شائع ہونے والی سب سے ابتدائی چیزوں میں سے تھی۔ اس طرح ہر ادیب اپنی ابتدائی تخلیقات میں ہی اپنی تمام امکانی صلاحیتوں کی جھلک دکھا دیا کرتا ہے۔ محمد خالد اختر نے بھی سندھ کے اس دور افتادہ علاقے میں ایک چھوٹے سے سفر کی کہانی لکھ کر یہ بتا دیا کہ ان کے اندر سفرنامہ لکھنے کی فطری استعداد موجود ہے لیکن اس فطری استعداد کا ایک یقین دلانے والا اور موثر اظہار انہوں نے کافی عرصے کے بعد ماہنامہ "نصرت" کے صفحات پر اپنے سلسلہ وار سفرنامے "ابن جبیر کا سفر" میں کیا۔ یہ بارہویں صدی عیسوی کے ایک اندلسی عرب سیاح کا سفرنامہ تھا جسے انہوں نے ترجمہ و تلخیص کے عام گھسے پٹے اسلوب سے ہٹ کر اقتباس اور تبصرے کے ایک ایسے نئے اور اچھوتے انداز میں پیش کیا کہ اس کی کلاسیکی داستانِ سفر میں ابن جبیر کی شخصیت جو پہلے ہی زندہ اور سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور بھی زیادہ جاندار، حسین اور انسانی ہو گئی۔ "نصرت" کے گیارہ شماروں میں مسلسل شائع ہونے والے اس سفرنامے کی بابت نقاد حضرات کو تو خیر کچھ کہنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ اچھے اور ذہین پڑھنے والوں نے بھی جس ردِعمل کا اظہار کیا، اسے ہمارے ادبی و فنی ذوق کا ایک المیہ کہنا چاہیے۔ ایک صاحب نے تین چار قسطوں کے بعد اکتا کر لکھا کہ یہ سلسلہ کافی طویل ہو گیا ہے اسے اب بند کر دینا چاہیے۔ ایک دوسرے قاری نے کچھ ہمدردی کرتے ہوئے رائے دی کہ اس سلسلے کا اتنا فائدہ تو ضرور ہے کہ اس میں ہمیں آج سے سات سو سال پہلے کے عرب ممالک کے تاریخی اور جغرافیائی حالات کا علم ہوتا ہے —— یہ ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ آلڈس ہکسلے کی JESTING PILATE میں اور کچھ نہیں تو سن انیس سو بیس پچیس کی ہندوستانی سیاست کے بعض پہلو تو سامنے آ ہی جاتے ہیں۔ کسی سفرنامے کی قدر و قیمت اس کی افادیت کے ایک ثانوی اور نامکمل پہلو سے لگانا —— یہ سفرنامے کے فن سے عدم واقفیت کا وہ افسوسناک مظاہرہ ہے، جس میں ہم نے بڑی حیرت کے ساتھ نقد و تحقیق کی بعض بزرگ اور ثقہ شخصیتوں کو بھی مبتلا پایا ہے۔ ان میں سے ایک بزرگ نے (نام لینے سے ہم پھر احتراز کریں گے) محمد خالد اختر کی "کاغانی مہم" میں کسی شہر کے ایک ہوٹل کا لطیف اور مزاحیہ انداز میں تذکرہ پڑھ کر صاحبِ سفرنامہ کو یہ مشورہ دیا کہ اس شہر میں اچھے ہوٹل بھی موجود ہیں اگر وہ دوسری مرتبہ ادھر جائیں تو ان بہتر ہوٹلوں میں جا کے ٹھہریں۔

"ابن جبیر کا سفر" میں محمد خالد اختر نے اپنے حسنِ انتخاب سے اپنے اس ذوق اور معیار کا مظاہرہ کیا تھا جو وہ ایک اچھے سفرنامے کی بابت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد "کاغانی مہم" (ماہنامہ نصرت شمارہ ۱، ۲، ۳) میں انہوں نے گویا خود یہ بتا دیا کہ اس معیار کے مطابق ایک اچھا سفرنامہ کیونکر لکھا جاتا ہے۔ "کاغانی مہم" میں بالاکوٹ کی پہاڑیوں، کنہار کی ندی اور سیف الملوک جھیل کے طلسماتی پس منظر کے آگے ہم ایک ایسا انسانی ڈرامہ دیکھتے ہیں جس میں انقلابی، ہزاروی، خزانچی، ڈمبل اور خود سیاح کے رنگا رنگ کردار ہمیں اپنی بشری کمزوریوں اور صفتوں کے ساتھ بے حد محظوظ کرتے ہیں۔ اس ڈرامے کا ایک سین جس میں سیاح ایک کوہستانی گوجر قبیلے سے ہمارا تعارف کراتا ہے، فن کی آخری بلندیوں کو چھوتا ہے اور قاری جب یہ فصل پڑھ کر فارغ ہوتا ہے تو اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا کہ اس نے سفر کی یہ دلچسپ کہانی فی الواقع اردو زبان میں پڑھی ہے۔ اس کہانی کو آپ انگریزی کے کسی بھی اچھے سفرنامے کے پہلو میں رکھ دیجیے۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو زبان کو اس کی وجہ سے شرمانے کی کوئی ضرورت لاحق نہیں ہوگی۔

" بالاکوٹ کی پہاڑیوں تو ننگی ہیں۔ مگر جوں جوں اوپر جائیں، چوٹیوں اور ڈھلانوں پر صنوبر، چنار، دیودار کے جھنڈ نمودار ہونے لگتے ہیں اور اردگرد کی دنیا نکھر کیلی سبز ہو جاتی ہے۔ قدرت کے ہاتھ نے کاغان کی وادی کو بڑے پیمانے پر ڈیزائن کیا ہے۔ پہاڑوں میں وقار اور آن بان ہے۔ اسی طرح اس کے شاندار جنگلوں میں اور اس کی ہریالی میں ایک بھرپور را رابطہ ہے۔ کنہار ایک سچے رفیق کی طرح کبھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو پاتا۔ چاندی کا ایک لہراتا ہوا سانپ! وادی بڑی تنگ ہے۔ آپ اسے دریائے کنہار کی وادی بھی کہہ سکتے ہیں!"

یہ وادیٔ کاغان کے ایک منظر کی تصویر ہے جو اپنے خلوص اور بے تکلف خوبصورتی کی بدولت پڑھنے والے کو ایک لحظہ کے لیے خود وادیٔ کاغان میں لے جاتی ہے اور وہ یہ ساری چیزیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ کاغانی سفر کے انسانی کرداروں کی ایک تصویر ملاحظہ ہو۔

" انقلابی نے کتاب (انسپیکشن بک) میں میرے پتہ کے ساتھ ایس ڈی او لکھا ہوا دیکھ کر آنکھیں اوپر اٹھائیں اور پھر یوں خاموش ہو گیا۔ جیسے اس کے سینے پر بہت سے سانپ لوٹ گئے ہوں۔ ہزاروی نے مجھے تعریف کی نظروں سے دیکھا۔ جیسے میرے پر نکل آئے ہوں اور میں یک لخت فرشتہ بن گیا ہوں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کتنی تنخواہ لیتا ہوں۔ جب میں نے اپنی تنخواہ بتائی تو اس کی نگاہوں میں میری قدر اور بڑھ گئی اور فوراً ہی اپنے کو میرے برابر کرنے کے لیے اس نے ایک خالہ زاد بھائی دریافت کر لیا۔ جو میری طرح ایس۔ ڈی۔ او تھا۔۔۔!"

اور ان ساری چیزوں کے ساتھ ساتھ سیاح کی اپنی نفسی کیفیت اور "اپنا آپ" ہمیں ہر جگہ دکھائی دیتا ہے! ایک سفرنامے میں سب سے زیادہ جو چیز زندگی، حرارت اور حسن پیدا کرتی ہے وہ سیاح کا "اپنا آپ" ہوتا ہے۔ جسے اس کے سفر کی روئداد میں کہیں بھی گم نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ پہاڑیوں اور وادیوں کے مناظر بیان کر رہا ہو۔ یا کسی انسانی شخصیت کی کہانی!

"سنگریزوں اور ریچھوں کے بیچ گنگناتی ہوئی ندی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں نے سوچا کہ شاید ایسی ہی جگہ کے پاس آدمی سچی خوشی پا سکتا ہے۔ مجھے دریاؤں سے محبت ہے۔ میرے خیال میں ایک اچھی عورت کے بعد ایک دریا زندگی کی سب سے دلپذیر شے ہے۔ چمکیلا دن، عمدہ تمباکو اور سیٹوٹسن! ــــ کون ان کے مسرت بخش اثر سے بچ سکتا ہے۔ مگر میں ان سب کو دریا کے بعد رکھوں گا۔ اس سے پوری پوری لذت حاصل کرنے کے لیے بھی دریا کا کنارہ ضروری ہے۔۔۔ میں اپنے دریا کو سست اور تنہا ریتلے کناروں کے درمیان پڑے ہوئے زیادہ پسند کرتا ہوں اور اگر اس دریا میں کھاڑیاں اور آبنائیں ہوں، اگر اس میں روح افزا پیچ اور موڑ ہوں، اور کناروں پر اکا دکا کھجور کے پیڑ ــــ تو پھر میری خوشی مکمل ہے۔"

"کاغانی مہم" میں یہ تینوں رنگ ایسی خوبصورتی سے ملے ہوئے ہیں کہ اس سفری روئداد کو پڑھتے ہوئے انسان اس سحر سے نہیں بچ سکتا۔ جو ادب کی تمام اصناف میں صرف "سفرنامے" کے ساتھ مخصوص ہے۔

اور اب آخر میں دو لفظ محمد خالد اختر کے اسلوب کے بارے میں! محمد خالد اختر نے کسی جگہ خود ہی یہ اعتراف کر کے کہ وہ سوچتے انگریزی میں ہیں اور لکھتے اردو میں ہیں، مبصروں کی ایک مشکل حل کر دی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اردو میں لکھتے ہوئے وہ ذہن میں آتے ہوئے جملے کی انگریزی ترکیب اور الفاظ اور محاورے کی انگریزی نشست میں بہت کم تبدیلی کرتے ہیں۔ ایک

زمانے میں وہ اس قسم کی تبدیلی کرنے کے سرے سے قائل ہی نہیں تھے۔ "بیں سو گیارہ" کے انتساب میں لکھتے ہیں کہ :۔

"میں اردو کو اتنی چھوٹی موٹی سی نہیں سمجھتا کہ وہ تھوڑی سی بے تکلفی اور بے باکی بھی برداشت نہ کر سکے۔" نیز "میرے نزدیک زبان کا چپٹا اور بے جان ہونا اس کے غلط اور چونکا دینے والی ہونے سے زیادہ ناقابل معافی گناہ ہے"۔ لیکن جب بر لک اور ریڈیو کی لکھنے کی خاطر انہیں اردو کے کلاسیکی ادب کا بنظر غائر مطالعہ کرنا پڑا تو لاشعوری طور پر ان کی زبان میں بہت کچھ توازن آ گیا۔ اور اس سے وہ ناگوار گزرنے والی " انگریزیت " خود بخود کافی حد تک دور ہو گئی ـــ لیکن اس کے باوجود ان کی نثر کا ڈھانچہ اور الفاظ اور ان کی ترتیب و ترکیب اب بھی انگریزی انشا کے طرز پر ہوتی ہے اور "محمد خالد اختر کی اردو تحریر کا انگریزی میں ترجمہ کرنا غالباً دنیا کے آسان ترین کاموں میں سے ہے !

سوال یہ ہے کہ اردو زبان میں انگریزی طرز انشاء کا یہ تجربہ ایک خوش آئند چیز ہے اور اس کی ہمت افزائی کی جانی چاہیئے۔ یا یہ ایک ناپسندیدہ رجحان ہے جسے اردو میں پنپنے کا موقع نہیں دینا چاہیئے؟ اس سوال پر بڑی آسانی کے ساتھ دو رائیں ہو سکتی ہیں، لیکن ہمارے نزدیک اردو زبان کی ترقی اور نشو و نما کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں زبان و اسلوب کے نئے نئے تجربے کا راستہ بالکل بند نہیں کرنا چاہیئے۔ اردو زبان کے آب رواں میں جب تک مختلف پہاڑی نالے اپنے ساتھ طرح طرح کی معدنیات اور نمکیات لے کر شامل نہیں ہوں گے، اس میں وہ قوت حیاتیت اور توانائی پیدا نہیں ہو سکے گی جو ایک دریا کے پانی کو کنوؤں اور جھیلوں کے ساکن پانیوں سے ممیز کرتی ہے۔ جن لوگوں میں انگریزی ادب کا کچھ مذاق پیدا ہو چکا ہے وہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ محمد خالد اختر کی زبان میں وہی شستگی اور تازگی پائی جاتی ہے جو انگریزی کے اچھے لکھنے والوں کے اسلوب کی خصوصیت ہے۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ محمد خالد اختر کے پاس باوجود ان کی عبارت کی بعض ظاہری کمزوریوں اور ان کے الفاظ کی بعض اوقات ایک کمزور اور ڈھیلی ڈھالی نشست کے اردو زبان کو دینے کے لیے بہت کچھ ہے سو اور اگر ہم اپنی زبان کا ایک ہی تاریخی اور موروثی رنگ ہمیشہ قائم رکھنے پر مصر نہیں ہیں تو ہمیں ان کا راستہ چھوڑ دینا چاہیئے تاکہ وہ اردو میں زبان و اسلوب کے نئے تجربے جاری رکھ سکیں۔

محمد خالد اختر

احمد ندیم قاسمی

ایک صاحب محمد خالد اختر سے ملنا چاہتے تھے۔ مجھ سے ان کا پتہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ واپڈا ہاؤس چلے جائیے وہاں اونچے قد، تیکھے نقوش اور پھیکے لباس کا جو سب سے نحیف و نزار آدمی آپ کو نظر آئے اور جسے دیکھتے ہی یہ اندیشہ دامن گیر ہو جائے کہ اگر چلتے چلتے اس شخص کو ذرا سی بھی ٹھوکر لگی تو یہ کہیں نہ کہیں سے ٹوٹ جائے گا، تو آپ بے کھٹکے اس سے مصافحہ کر لیجیے کہ یقیناً وہی محمد خالد اختر ہو گا۔ مصافحہ کرتے ہوئے اس کے ڈھیلے ڈھالے ہاتھ سے یہ دھوکا نہ کھائیے گا کہ اس شخص میں گرم جوشی کی کمی ہے۔ بے نیازی کا تاثر بھی نہ لیجیے گا کہ اگر وہ اس دنیا میں کسی سے بے نیاز ہے تو صرف اپنی ذات سے بے نیاز ہے۔ اس کے اسلوبِ تپاک سے بھی یہ نہ سمجھیے گا کہ وہ مغرور ہے۔ جس شخص کو یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ کتنا بڑا اور کتنا منفرد ادیب ہے، وہ غرور کس بات پر کرے گا۔

محمد خالد اختر سے میرے تعارف کی نصف صدی بس دو چار برس میں مکمل ہونے کو ہے۔ اس کے باوجود میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اسے کما حقہ جانتا ہوں۔ جب انسان خود اپنے آپ کو مرتے دم تک ٹھیک سے نہیں سمجھتا تو میں خالد کے بارے میں یہ دعویٰ کیوں کروں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ جہاں تک میں نے اسے سمجھا ہے اس سے زیادہ بے لوث اور بے غرض آدمی آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔

جب (شاید ۱۹۳۳ء میں) اس نے صادق ایجرٹن کالج بہاولپور کی انٹر کلاس میں داخلہ لیا تھا تو اس کا سا دبلا اور مختصر سا طالب علم پورے کالج میں موجود نہ تھا۔ وہ ایک امیر باپ کا بیٹا تھا۔ اس کے والد مولوی اختر علی ان دنوں وہاں کالونائزیشن آفیسر تھے۔ پھر اگرچہ ان کا خاندان پنجاب کے ضلع گجرات سے تعلق رکھتا تھا مگر بزرگ بہاولپور میں آباد ہو گئے تھے اور وسیع اراضی کے مالک تھے۔ امرا کے طرزِ زندگی کے برعکس اس خاندان کے افراد کو علم و ادب سے بھی گہرا اور سنجیدہ تعلق تھا مگر یہ باتیں مجھے بعد میں جا کر معلوم ہوئیں۔ اس وقت تو میرا اندازہ یہ تھا کہ اس لڑکے میں دو خصوصیات ایسی ہیں جو اس امر کی دلیل ہیں کہ وہ کند ذہن ہو گا۔ اول یہ کہ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا اور دوم یہ کہ وہ خوش شکل تھا۔ اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ امیروں اور خوش شکلوں کو میں نے بہت کم ذہین پایا ہے۔ اگر وہ ذہین ہوتے بھی ہیں تو امارت کی وجہ سے انہیں اپنی ذہانت کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور خوش شکلی انہیں نرگسیت کا شکار بنا دیتی ہے۔ محمد خالد اختر کے ساتھ ابتدائی ملاقاتوں ہی میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرے کلیے کی نفی ہو گئی ہے۔ اس نے نہ صرف اپنی نصابی کتابوں کے معاملے میں اپنی ذہانت کے جوہر

دکھائے بلکہ اس عمر میں بھی انگریزی ادب کا ایک حصہ لے سے رٹنا پڑا تھا۔

ان دنوں وہ رابرٹ لوئی سٹیونسن اور رائڈر ہیگرڈ کا بے حد رسیا تھا۔ ہیگرڈ تو ممکن ہے اب اس کے محبوب مصنفین کی صف میں پیچھے ہٹ گیا ہو مگر سٹیونسن پر وہ آج بھی فریفتہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ نہ صرف اس کے ذہن بلکہ اس کے طرزِ فکر اور طرزِ زندگی کو بھی جس مصنف نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ یہی رابرٹ لوئی سٹیونسن ہی ہے۔ جن خواتین و حضرات نے میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ "چوپال" دیکھا ہے، جانتے ہوں گے کہ میں نے اپنی یہ پہلی تصنیف محمد خالد اختر ہی کے نام معنون کی ہے اور انتساب میں خالد کے ان خطوط کے اقتباسات درج کئے ہیں جو اٹھارہ بیس برس کی عمر میں اس نے مجھے لکھے تھے۔ ان خطوط میں بالکل واضح طور پر سٹیونسن اردو زبان میں بول رہا ہے۔ اردو ادب میں یہ قطعی طور پر نئی اور تازہ اور توانا آواز تھی۔ اس آواز کی گونج خالد کے سفرناموں میں موجود ہے جو اتنے سچے، سوہے اور ہرے بھرے سفرنامے ہیں کہ آج بھی جب سفرنامہ نگاری اردو کی ایک شاداب صنف ادب ہے، خالد کے سفرنامے بے مثال ہیں۔ میں سمجھتا ہوں خالد کا اصلی رنگ یہی ہے بعد میں اس کے ہاں مزاح اور طنز کے رنگ بہت گہرے ہو گئے، مگر میں ابتدا میں اس کے مزاج کے اس پہلو سے بالکل بے خبر تھا۔ ظاہر ہے کہ ناولوں، افسانوں، سفرناموں اور سوانح عمریوں کے اس شیدائی کے مزاج میں قہقہے کی بے ساختگی پہلے سے موجود تھی۔ جس نے بعد میں اس کے بے مثال مضامین میں اظہار پایا، مگر میں سمجھتا ہوں کہ اسے طنز نگار بنانے میں بعض ایسے حالات کا ہاتھ بھی ہے جنہوں نے اس کی بصیرت پر زندگی اور انسان کے بعض مضحک پہلو واضح کئے اور اس کے ہاتھ میں قلم کی صورت میں ایک ایسا نشتر دے دیا جس نے کتنی ہی مصنوعی حقیقتوں کے پردے چاک کئے اور کتنی ہی بڑی شخصیتوں پر عمل جراحی کر کے ان کے ایک ایسے ایسے چھوٹے پن نکال لئے جنہیں دیکھ کر ان سے نفرت نہیں ہوتی۔ ترس آتا ہے اور بعض اوقات تو ان سے پیار بھی ہو جاتا ہے۔

یہ شاید ۴۳-۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے۔ میں دارالاشاعت پنجاب کے ایک ہفت روزے "پھول" کا ایڈیٹر تھا۔ جب یکایک میرے پاس خالد کے والد گرامی آنکلے۔ وہ ایک اعلیٰ افسر ہونے کے باوجود نہایت خوش مزاج انسان تھے۔ مگر اس روز وہ مجھے سخت گھبرائے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے پہلا سوال یہ پوچھا کہ خالد کہاں ہے؟ میں نے بے خبری کا اظہار کیا تو فرمایا۔

"ہم اس کی منگنی کا بندوبست کر رہے تھے کہ کل صبح سے وہ یکایک غائب ہو گیا ہے۔ نہ جانے کہاں نکل گیا۔ تمہارا دوست ہے، اس لیے میں سمجھا تمہارے پاس آیا ہوگا۔ آخر وہ اور کہاں جا سکتا ہے۔"

میں نے عرض کیا کہ خالد کے بارے میں جونہی مجھے کوئی اطلاع ملی۔ میں آپ کو مطلع کر دوں گا مگر یہ نہ میں تصور کر سکتا تھا اور نہ خالد کے والد سوچ سکتے تھے کہ خالد پنجاب کے ایک شہر سے کسی دوسرے شہر میں نہیں گیا بلکہ احاطہ بمبئی کی طرف نکل گیا ہے۔ چند روز کے بعد مجھے سورت سے اس کا خط ملا کہ میں یہاں جنوبی ہند کی اس ساحلی آبادی میں چلا آیا ہوں اور مچھیروں کی ایک بستی میں قیام پذیر ہوں۔ پھر اس نے مچھیروں کی آزاد اور رنگا رنگ زندگی اور نیلے سمندروں

سے ان کی دوستی کا طویل تذکرہ رومانی انداز میں کیا اور اس حسرت کا اظہار کیا کہ کاش وہ ایک سیدھا سادا مچھیرا ہوتا اور جب اس کی کشتی سمندر کی موجوں پر ہچکولے کھاتی تو وہ گہرائیوں اور دوریوں اور نیلاہٹوں کے بے تکلف اور بے ساختہ گیت گاتا! — سو جو شخص برصغیر کے شمال میں ضلع گجرات کے ایک گاؤں سے بھاگے تو جنوبی ہند میں سورت تک بھاگا چلا جائے، اس کے مزاج کے لاابالیانہ پن کا اندازہ لگانا کچھ ایسا مشکل نہیں رہتا اور میرے خیال میں اس کا یہی لاابالیانہ پن اس کی نہایت پیاری اور نہایت دلآویز شخصیت کا عنوان ہے۔

محمد خالد اختر سے دو چار، دس، بیس مرتبہ ملنے پر بھی آپ یہ اندازہ نہیں لگا سکیں گے کہ وہ آپ سے محبت کر رہا ہے یا نفرت کر رہا ہے یا آپ سے بالکل لاپرواہ ہے۔ وہ نفرت بھی کرتا ہے مگر برے اور لوبر آدمی سے یا پھر برے اور لوبر ادب سے۔ باقی سب اسے بے پناہ پیارے ہیں مگر مجال ہے جو وہ اس پیار کا بالمشافہ اظہار ہونے دے قریب قریب نصف صدی کے بعد آج بھی وہ مجھ سے ہاتھ ملائے گا تو وہ ایسا ڈھیلا ڈھالا ہاتھ ہوگا کہ ولیم ہیزلٹ کے بقول ایسے بے جذبہ اور بے حرارت ہاتھ کو کھڑکی سے باہر پھینک دینے کو جی چاہے۔ مگر میں جانتا ہوں وہ اندر سے خالص سونا ہے۔ سالہا سال کے واقعات و تجربات کی کسوٹی پر کسا ہوا سونا۔ ایسا سونا جس پر ہزار مٹی ڈال لیے اس کے کھرے پن کی شعاع چھپائے نہیں چھپے گی۔

پیشے سے وہ الیکٹرک انجینیر ہے اور انگلستان کا سند یافتہ ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کے مزاج کے لاابالیانہ پن میں اس پیشے نے اضافہ کیا ہے کہ وہ جو سٹیونسن کے انداز میں پورے کرۂ ارض کا شہری بننا چاہتا تھا اور جو لپکی زندگی انسان اور کائنات کے حسن کی تحسین میں بسر کرنا چاہتا تھا اور جو مکانوں اور ملکیتوں کی حد بندیوں سے بہت بلند تھا آج اپنے دفتر میں بیٹھا بجلی کے کھمبے گنتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ لاابالی انسان بعض معاملات میں اتنا مستقل مزاج کیوں ہے۔ مثلاً یہی کہ دفتر باقاعدگی سے جاتا ہے اور فرض شناس اور لائق افسروں میں شمار ہوتا ہے یا یہی کہ اس پر جذبہ و احساس کی کئی قیامتیں گزری ہیں مگر کسی بھی مرحلے پر اس نے قلم ہاتھ سے نہیں رکھا اور کرب کی انتہائی کیفیتوں میں بھی اس نے مسکراہٹیں سجائی ہیں اور قہقہے بکھیرے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی محنت کی عظمت پر اس کا ایمان ہے۔ ان لوگوں کی زندگی کا مقصد اس کی سمجھ میں نہیں آتا جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے کو عیاشی کی انتہا سمجھتے ہیں یا جن کا پیشہ دوسروں کی محنت کے پھل کھانا ہے پچھلے دنوں اس نے خود اپنے بارے میں ایک کہانی لکھی مگر جب کہانی ختم ہوئی تو اس کے گھر کا وہ ملازم بچہ اس کہانی کا ہیرو بن چکا تھا۔ جسے ننگے پاؤں دیکھ کر خالد کے اپنے پاؤں کے تلوے شل ہو گئے تھے۔

استقامت کا ذکر آیا ہے تو ایک مزے کی بات سنیے کہ شاید پانچویں یا چھٹی جماعت میں خالد کے استاد نے اسے مشورہ دیا تھا کہ صرف ریلیف کی نب کے ساتھ اردو لکھنے سے خط اچھا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے دس برس کی عمر سے ریلیف کی نب سے لکھنا شروع کیا تو اب تک اس نب سے چمٹا ہوا ہے۔ اس نب نے اس کا خط ایسا بگاڑا ہے کہ صرف ہم چند دوست جنہوں نے اس کے خط کو برسوں بھگتا ہے اس کی تحریر پڑھ سکتے ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ اس

استقامت میں بھی اس کا لاابالیانہ پن در آتا ہے۔ روانی میں لکھ رہا ہے تو حروف کے نقطوں کو نظر انداز کرتا جا رہا ہے مگر مثال کے طور پر وہ لفظ "ان" لکھ کر سوچنے کے لیے رکا ہے تو اس کا قلم نہیں رکتا اور اس کی ریلیف سب "ان" کی نون کے پیٹ میں پندرہ بیس نقطوں کا انبار لگا دیتی ہے۔ آپ چاہیں تو ان نقطوں کو ان حروف پر تقسیم کر سکتے ہیں جو نقطوں سے محروم رہ گئے تھے۔

سفرنامہ، افسانہ، پیروڈی، مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کے علاوہ اس نے اردو ادب میں تبصرہ نگاری کی بھی ایک صحت مند روایت قائم کی ہے۔ اس کے تبصرے نہ پیشہ ور نقادوں کے لکھے ہوئے تبصروں کی طرح بوجھل ہوتے ہیں اور نہ صرف فلیپ اور دیباچہ پڑھ کر لکھے جانے والے تبصروں کی طرح مختصر اور سطحی۔ اس کا بے پناہ اور بے حد و مطالعہ پوری رعنائی کے ساتھ اس کے تبصروں کے پس منظر میں ابھرتا ہے اور وہ کتاب کو اپنی کسوٹی پر دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیتا ہے۔ مگر جب وہ کسی پر معترض بھی ہوتا ہے تو بڑے ساتھ کے ساتھ۔ کسی پر طنز بھی کرتا ہے تو بڑے مثبت انداز میں۔ ظاہر ہے کہ لوگ اس سے بگڑ بھی جاتے ہیں مگر وہ یوں مسکراتا رہتا ہے جیسے کہہ رہا ہے کہ یہ لوگ کتنے سادہ لوح ہیں کہ میں نے ان کا جو خول نوچ کر اتارا ہے اس میں دوبارہ گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

نمائش سے اسے بیر ہے یہی وجہ ہے کہ وہ نہ ریڈیو کے مائیکروفون پر آتا ہے اور نہ ٹیلی ویژن کے کیمرے کے سامنے سٹیج پر جا کر کچھ بولنے یا پڑھنے سے بھی وہ محترز ہے البتہ ایک بار ملتان کے دوست "ظہور نظر کے ساتھ ایک شام" کی تقریب میں خالد کو سٹیج پر لے گئے تھے اور اس سے ظہور نظر پر ایک مضمون پڑھوا لیا تھا مگر میں سمجھتا ہوں یہ سحر ظہور نظر کی شخصیت کا ہے یا پھر اس حقیقت کا کہ خالد کو ظہور نظر سے بہت پیار ہے۔ پھر ایک بار ہم لوگ اسے گھیر گھار کر ریڈیو سٹیشن پر بھی لے گئے تھے۔ اسی کے فن کے بارے میں گفتگو تھی۔ اس نے بار بار "رسہ" تڑا کر بھاگنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوا بحث شروع ہوئی تو وہ چپکا بیٹھا رہا البتہ جب اس کے بولنے کی باری آئی تو یوں بولتا چلا گیا کہ اسے روکنا اور ٹوکنا مشکل ہو گیا۔ مگر میں سمجھتا ہوں یہ میرا "کمال" ہے کہ میں نے کالج کے دنوں میں خالد سے اداکاری بھی کرا لی۔ ہم لوگ آغا حشر کا ڈرامہ "رستم و سہراب" سٹیج کر رہے تھے۔ بہت منت ترلے کے بعد میں نے خالد کو منا لیا کہ وہ ایک ایسے خاموش کردار کی حیثیت سے سٹیج پر آ جائے گا جس میں مکالمے کا ایک لفظ بھی نہ بولنا پڑے۔ ہم نے اسے ایک قیدی کی کوٹھڑی کے باہر ٹہلنے والے چوکیدار کا پارٹ دیا۔ پردہ اٹھا اور خالد قدیم ایرانی سپاہی کے لباس میں ہاتھ میں ننگی تلوار لیے آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ چلتے ہوئے اس کے ٹخنے آپس میں بج رہے ہیں۔ اور وہ قدم کہیں رکھتا ہے مگر پڑتا کہیں ہے۔ قیدی کی ایک جھلک ہی دکھانا تھی۔ چنانچہ میں نے ڈرامے کے ڈائریکٹر پروفیسر مرلی دھر کی منت کر کے پردہ فوراً گرا دیا۔ ورنہ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں ہمارا پہرہ دار سپاہی غش نہ کھا جائے اور "سہراب" کو (یعنی مجھے) لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

تو یہ ہے محمد خالد اختر جو سالہا سال سے لکھ رہا ہے لیکن جس کی عظمت کو اب آ کر پہچانا جانے لگا ہے اور اعتراف میں اس تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ اسے اپنے عظمت کا شعور ہی حاصل نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے میں لکھتا ہوں مگر بس لکھتا ہوں۔ جو شخص اپنے رف مسودات اپنے قریبی دوستوں محمد کاظم یا میرے حوالے کر دیتا ہے کہ "انھیں دیکھ لینا۔

تجھیں چونکہ چنانچہ کی غلطی ہو تو درست کر دینا۔ اس قابل ہوں تو اپنے کسی پسندیدہ رسالے میں بھجوا دینا اور اس قابل نہ ہوں تو چولھے میں جھونک دینا۔ دونوں صورتوں میں میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا!" تو ایسے شخص سے آپ کیسے توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ خود ہی اپنا نام اونچا کرنے کی بیماری میں مبتلا ہوگا اور جگہ جگہ اپنے آپ کو منواتا پھرے گا۔

مگر دنیا اسے مانے گی کیونکہ اس کی ادبی تخلیقات میں جو خلوص ہے۔ وسعت ہے، کھرا پن ہے۔ نیک نیتی ہے۔ انسانی ہمدردی ہے اور حسن فطرت اور حسن انسانی سے پرستش کی حد تک لگاؤ ہے۔ اس کا نقش "دیر آید درست آید" کے مصداق جب انسانی دلوں اور دماغوں پر جمے گا تو پھر اسے صدیاں بھی نہیں کھرچ سکیں گی۔!

محمد خالد اختر کے خطوط

انور محمود خالد کے نام

لاہور۔

۳ مارچ ۶۹ء

پیارے انور محمود خالد

تمہارا اچھا خلوص بھرا خط ملا۔ ان دنوں مصروفیت کچھ ایسی رہی کہ اتنے اچھے خط کا جواب دینے کا وقت بھی نہ نکال سکا۔ یہ خط بھی بالکل مختصر سا ہوگا جس سے نہ تمہاری تشفی ہوگی نہ میری۔ اسے ایک ادھوری ملاقات سمجھو۔ بات یہ ہے کہ بجلی کی رو ایک گھنٹے سے غائب ہے اور یہ سطریں (تم مانو یا نہ مانو) موم بتی کی روشنی میں لکھ رہا ہوں۔

رسمی ملاقاتوں کی تصویر تم نے بڑی خوبی سے کھینچی ہے۔ ایسی ملاقاتوں سے مجھے بھی سابقہ پڑ چکا ہے۔ جس میں فریقین کھنچے کھنچے اور لیے دیئے رہتے ہیں۔ کھل کر باتیں نہیں ہوتیں اور گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ میں اوپری گفتگو سے جس میں باتیں کرنے والے تکلف کی حد کو پار نہیں کر سکتے، سخت کتراتا ہوں۔ میں کہہ سکتا کہ تم مجھے بھارت بلڈنگ والے دفتر میں ملتے تو تم کیا تاثر لے کر جاتے۔ میں ایک بے حد شرمیلا اور نروس انسان ہوں۔ ملاقاتوں سے میری جان جاتی ہے۔ میری گفتگو بے ربط اور اکھڑی اکھڑی ہوتی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ کئی لوگوں کے نزدیک میں ایک ناقابلِ برداشت 'بور' ہوں گا۔ آلیور گولڈ سمتھ کا نام تم نے ضرور سنا ہوگا۔ جو 'وکر آف ویکفیلڈ' اور 'ڈیزرٹڈ ولیج' کا مشہور مصنف تھا۔ باسویل نے ڈاکٹر جانسن کی ضخیم سوانح میں جا بجا بے چارے گولڈ سمتھ کو آڑے ہاتھوں لیا ہے اور اس کی باتوں کے نمونے درج کئے ہیں۔ ذہن اور ضلع جگت میں طاق ڈاکٹر جانسن کے سامنے گولڈ سمتھ نرا احمق دکھائی دیتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ گولڈ سمتھ احمق تھا لکھنے والوں میں بھی احمقوں اور فاترالعقل حضرات کی اتنی ہی کثرت ہوتی ہے جتنی کسی اور طبقے میں)۔ بے وقوف اور 'بور'، گولڈ سمتھ ضرور تھا مگر وہ ایک اچھا آدمی تھا اس کے مرنے کے بعد کسی ستم ظریف نے اس کے کتبے کی عبارت تجویز کی۔ مجھے یہ علم نہیں کہ یہ اس کے کتبے پر کندہ ہے یا نہیں

تمہارے کئی سوالوں کے جواب رہ گئے کیا تم یقین کروگے کہ میں خود بھی تعجب کرتا ہوں کہ انگلستان میں ایک مدت گھومنے پھرنے کے باوجود میرے ذہن پر کیوں کسی تجربے نے اتنا گہرا نقش نہ چھوڑا کہ میں اسے تحریر میں لانے پر مجبور ہو جاتا۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ نہیں۔ شاید میں تیلیے کی خنڈول کی طرح ہوں۔

تم نے اشک کا وہ ناولٹ 'بڑی بڑی آنکھیں' پڑھا۔ اپنی رائے لکھو۔

ہیں گو لاڈسمتھ کی مانند فرشتے کی طرح تو نہیں لکھتا۔ مگر 'پورپال' جیسی گفتگو ضرور کرتا ہوں۔ پھر بھی پیارے بھائی تم مجھے ضرور کبھی نہ کبھی آملو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری گفتگو اتنی رسمی نہیں ہوگی۔ کیونکہ پہلی ملاقات کی جھجک تو اب سب کچھ ہمارے بیچ میں سے اٹھ گئی ہے۔ جیسی خوشبو تمہاری تحریر میں ہے۔ ویسی ہی ضرور تمہاری باتوں میں ہوگی اور میرا 'پورپال' ہونا ڈھک چھپ جائے گا۔

اگلے روز ندیم کے دفتر کی بیٹھک میں مَیں نے تمہارا نام لیا وہ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں اور یہ بھی کہ تم لائل پور میں نائیکچرر ہو۔ میرا خیال ہے جن دنوں تم لاہور میں تھے۔ تم ان سے اکثر ملتے رہتے ہوگے۔

فنون کا غزل نمبر تو تم نے ضرور خرید لیا ہوگا۔ یہ ایک صحیح معنوں میں ادبی کارنامہ ہے۔ تم جانتے ہو۔ اردو شاعری میں میری درک گہری نہیں۔ اردو غزل کو تو بالکل نہیں پڑھ سکتا۔ (صرف مشاعرے میں داد دے سکتا ہوں)۔ سمجھتا ہوں کہ یہ میری محرومی ہے اور قدرے افسوسناک۔ بات یہ ہے۔ کہ محض گل و بلبل کے قصوں اور خیال و بیاں کی لطافت کو میں عظیم دل کو ہلا دینے والی شاعری نہیں سمجھتا۔ بہت تھوڑی غزلیں ایسی ہیں (غالب اور فیض کی)۔ جن میں دل کا اصل درد بھی رچا ہوا ہوتا ہے۔ بیشتر مجھے فن سے زیادہ صناعی کے قریب معلوم ہوتی ہیں۔ بہر حال اب یہاں اردو غزل کے بارے میں اپنے ناپختہ جاہلانہ خیالات لکھنا [illegible] تھا۔ غزل نمبر میرے پاس ہے اور اگر تم اسے کسی وجہ سے حاصل نہیں کر سکے۔ تو تمہارے لیے سنبھال کر رکھوں گا۔ جب کبھی [illegible] جانا۔

کاظم کا ذکر [illegible] ہے۔ وہ میرا 'جگری' دوست ہے اور رفیق کار' ہمارے کمرے بالکل ملحق ہیں شاید تم یہ نہیں جانتے کہ کاظم [illegible] ہے۔ کسی زمانے میں وہ جماعت اسلامی کا ایک سرگرم رکن بھی رہا (وہ اب بالکل مختلف آدمی ہے)۔ مودودی [illegible] کے نہایت ادبی اور جستہ رفتہ عربی میں ترجمے کئے۔ جو بیروت میں چھپے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ عربی زبان [illegible] محنت سے حاصل کیا۔ کسی یونیورسٹی میں تدریس سے نہیں۔ وہ ایک بڑا قابل [illegible]

[illegible] آئے پر میں ایک واقعی سیر حاصل خط لکھوں گا اور اب تمہارے کم از کم تین چار صفحے کے مکتوب کا متوقع ہوں

تمہارا خالد

از لاہور

۱۷ر فروری ۶۹ء

پیارے انور محمود خالد۔

آپ کا مفصل اور سا تنا اچھا خط ملا اور اس کے بعد مبارک بادی کا خط بھی۔ جب ہیکر ناشر نے کھلے ہوئے چہرے سے دفتر میں

آکر مجھے یہ خوشخبری دی کہ مجھے "کھویا ہوا افق" پر آدم جی انعام ملا ہے (میں نے اس صبح اخبار نہیں دیکھا تھا) تو میں بے حد حیران ہوا۔ یہ انعام میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ مجھ سے زیادہ خوشی میرے ناشر کو ہوئی ہے جس کا دو بیہ میری طرف ابھی تک قرضے مرہیا نہ تھا میں اس کی نظروں میں یکخت قابل وقعت ہو گیا۔ تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ اس نے اس کتاب کا ایک لفظ نہیں پڑھا اور اگر پڑھتا بھی تو اس کے لیے پلے کچھ نہ پڑتا۔ انعام کا ایک فائدہ یہ ہے کہ کتاب اب بکے گی اور بہت سے لوگ جو ایسے انعاموں سے کسی کتاب کی خوبیاں پرکھتے ہیں۔ غالباً اسے پڑھیں گے۔

جیسا کہ میں نے تمہیں اپنے پہلے خط میں لکھا تھا 'کھویا ہوا افق' اور میری دوسری تحریریں ایک طرح اپنے دیدہ اور نادیدہ دوستوں اور ہمنواؤں کے نام بھیجے ہوئے خطوط ہیں۔ سچ مانو۔ مجھے اپنا انعام تمہارے خط سے ہی مل چکا ہے۔ اس کے مقابلے میں آدم جی انعام یا ایسے دوسرے انعاموں کی کچھ وقعت نہیں۔ میرے پیارے بھائی انور محمود۔ تمہارا اور حفیظ صاحب کا بہت بہت شکریہ۔

تم نے یہ بہت ٹھیک لکھا ہے۔ کہ مصنف سے قاری ہونا خوش بختی ہے۔ دکھ بھری بی فاختہ اور انڈے کوے کھائیں' والی بات ہے۔ میں خود ایک قاری ہوں۔ مصنف قطعاً نہیں۔ مجھے اپنی صلاحیتیں اور حدود خوب معلوم ہیں۔ جب میں رات کو بستر میں بیٹھ کر کوئی ———— رومانس پڑھتا ہوں تو مجھے اپنی کم مائگی اور بے بضاعتی کا شدید احساس ہوتا ہے ال دو دیدہ کے خار اور گرج ابھی تک بہت دور ہیں۔ میرے قدم تھک ہار چکے ہیں اور میں خاک راہ میں پڑا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ منزل پہ پہنچنے کے لیے جدوجہد کرنا اسے پا لینے سے بہتر چیز ہے۔

یہ سچ ہے کہ جان کیٹس کی نظم نوحہ عندلیب ———— —— اس دق سے گھلتے ہوئے نوجوان شاعر کے اندرونی کرب و اندوہ نے اس سے لکھوائی۔ کیٹس نے اسے لکھا۔ مگر کیا۔ اب ہم سب کی چیز نہیں۔ جب ایک اچھی تخلیق ایک مصنف کے قلم سے نکل جاتی ہے۔ تو وہ پھر اس کی نہیں رہتی۔ اس میں اپنی زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ میرے نزدیک اس بات پر بحث کرنا کہ شیکسپیئر کے ڈرامے شیکسپیئر نے لکھے تھے یا کسی اور نے بالکل لایعنی سی بات ہے۔ ڈرامے اصل چیز ہیں۔ یہ غیر اہم ہے کہ انہیں کس نے لکھا تھا۔ جب میں 'ہیملٹ' کو پڑھتا ہوں۔ تو میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ یہ میرے اپنے دل کی فریاد ہے اور میں نے ہی اسے قلمبند کیا ہے۔ میں محض قاری نہیں رہتا۔

دنیا کی ادب کتنے انمول جواہرات سے مالا مال ہے اور وہ جواہرات اب ہمارے ہیں۔ ان کی چمک اور آب و تاب ان کی اپنی ہے۔ ہم کیوں فکر کریں کہ ان کو کس نے تراشا تھا۔

بھائی۔ میں اردو شاعری سے تقریباً نابلد ہوں۔ غالب اور اقبال اور فیض کو البتہ خوب پڑھا ہے اور اقبال کی کئی نظمیں مجھے زبانی یاد ہیں۔ جدید شعراء کو اپنی کم فہمی کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتا۔ ایک زمانہ میں کلاسیکی انگریزی شاعری۔ کیٹس بائرن ———— کی شاعری میرا اوڑھنا بچھونا تھی۔ کیٹس کے نوحے کے کئی بند مجھے اب بھی یاد ہیں۔ اردو شاعری میں مجھے ایسی نظمیں کم ملتی ہیں۔ جن میں میری روح کی آواز کی گونج ہو۔ مجھے یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ ادب کی اس صنف میں تمہارا مطالعہ وسیع ہے۔ یہ تمہاری خوش بختی ہے۔ میری محرومی۔ ندیم کی جن نظموں سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ وہ اس کی 'آخری سجدہ' اور 'رم جھم' کے قطعات ہیں۔

ظہور نظر میرا دوست ہے۔ لیکن مجھ پر اس کے گن تب کھلے جب میں نے ریزہ ریزہ چھپنے پہ پہلی بار اس کی نظموں کو سنجیدگی سے پڑھا۔ تم نے یہ ظہور کی نظمیں پڑھی ہیں۔ ضرور پڑھو۔ میں تم پہ رشک کرتا ہوں۔

اردو نثر میں ان دنوں میرے نزدیک جو سب سے خوبصورت اور دیرپا چیز لکھی گئی ہے وہ اوپندر ناتھ اشک کا ناولٹ 'بڑی بڑی آنکھیں' ہے میں نے ایسے جاندار ناول کم ہی پڑھے ہیں۔ 'بڑی بڑی آنکھیں' نقوش کے حالیہ افسانہ نمبر میں تمہیں مل جائے گا۔ غالباً میری طرح کتابوں کا کیڑا ہونے کی وجہ سے تم اسے پہلے ہی پڑھ چکے ہوں گے۔ تمہاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے۔

تم نے لکھا ہے کہ میں تمہیں انگریزی ادب کی ان کتابوں سے متعارف کروں جو تمہیں پڑھنی چاہیئں۔ انگریزی ادب اتنا امیر اور وسیع ہے کہ ان کتابوں کے نام گنانا ممکن نہیں۔ میرے پسندیدہ کلاسکز میں جین آسٹن۔ ایملی برانٹے۔ گولڈ سمتھ اور رابرٹ لوئی اسٹیونسن ہیں۔ جدید دور کے نثر نگاروں میں ماہام۔ گراہم گرین۔ سایون را۔ اور جارج آرویل اور ہیمنگوے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔

خدا جانے ۲۰۰۱ تمہیں پسند آئی یا نہیں۔ اب تک تم اسے ضرور ختم کر چکے ہو گے۔ اس میں زبان و بیان کی لاتعداد خامیاں ہیں لیکن یہ ایک بے لاگ غیصیل کتاب ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس پر نظرثانی کروں اور اسے دوبارہ شائع کرانے کی کسی ناشر کے پاؤں پکڑوں۔

'پیروڈیز' میں یُوں ضرور کام کروں گا۔ مگر ایسی پیروڈی لکھنا جس میں اوریجنل کے اسلوب کی پوری جھلک ہو اور حرفی طور پر بے عیب ہو۔ بڑا ہی جان جوکھوں کا کام ہے۔ پھر بھی وعدہ کرتا ہوں کہ پیروڈی کی طرف ضرور توجہ دوں گا اور انشاء اللہ اگلے فنون کے شمارہ میں تم میری ایک پیروڈی دیکھو گے۔

حفیظ صاحب کے خطوط سے جو ٹکڑے تم نے اپنے خط میں دیئے۔ ان سے میں بڑا متاثر ہوا۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ تمہارے اور حفیظ جیسے ذہین اور اچھے لوگ مجھے پڑھتے ہیں میرے لیے یہ جاننا کتنا باعثِ خوشی ہے کہ میری مجذوب کی بڑ ہیں کسی ہمنوا ساتھی کے کان میں پڑ رہی ہیں۔ میرے نادیدہ دوستو اور رفیقو۔ پھلو پھولو اور خوش رہو۔

تمہارا خالد

از لاہور

مورخہ ۳۰ جنوری ۷۹ء

اسسٹنٹ ڈائریکٹر (کمرشل) الیکٹرسٹی واپڈا۔ دفتر آپریشنل مینجر (الیکٹرسٹی) واپڈا

بیک روڈ۔ پرانی انارکلی

پیارے انور محمود خالد!

خدا کرے تم میرا یہ چینی رسم الخط پڑھ سکو۔ فنون کے کاتب کو تو اس کی کافی مشق ہو چکی ہے۔ مگر ان کے علاوہ کوئی اور

اسے بمشکل ہی پڑھ سکتا ہے) تمہارا خط تو مجھے پندرہ دن پہلے ہی مل گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو۔ میں "دنیا کا کاہل ترین" شخص
ہوں۔ اتنے دن تمہارے خط کو اپنی ڈائری میں لیے پھرتا رہا اور ارادے باندھتا رہا۔ کہ اس کا جواب دوں گا ضرور۔ آخر یہ میرے
ملاپ کا خط تھا اور آج بھی ایسا ہی لگا ایک "ہمزاد روح" (KINDERED SPIRIT) معلوم ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں میں
خوش نصیب ہوں۔ اس قسم کا اچھا پیارا خط۔ تنقید نگاروں کے درجنوں تعریفی مقالوں سے زیادہ قیمتی ہے اور اس کے پڑھنے سے
میرے دل میں ایک دمک لگا دی جو اب تک قائم ہے (کیا میں تمہارا شکریہ ادا کروں)

میرے پیارے انور محمود خالد۔ ایک لکھنے والا جو کچھ بھی وہ لکھتا ہے۔ اپنے بہترین دوستوں اور ان ہمزاد روحوں کی خاطر
لکھتا ہے۔ جن کے دلوں میں اس کی تحریر سے کوئی گھنٹی بج سکے۔ میں نے نقادان فن کے لیے کبھی نہیں لکھا۔ وہ میری دنیا سے باہر
ہیں اور ایک ایسے سیارے کے باشندے ہیں جو میرے لیے اجنبی ہے۔ دراصل میں اس لفظ کے مروجہ معنوں میں ادیب ہوں ہی
نہیں۔ ادب کا طالب علم اور عاشقِ زار ضرور ہوں۔ دل بہلانے کے لیے یا اپنے کرب و شادمانی کے اظہار کے لیے کبھی کبھار قلم ہاتھ
میں لے بیٹھنے کی غلطی مجھ سے سرزد ہو جاتی ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میری کسی چیز نے تمہیں مسرت دی اور تمہارے احساس میں
کوئی جوت جگائی۔ میں اسے قدرتوں کا انعام سمجھتا ہوں۔

"اردو ڈائجسٹ" میں میں نے ہم مزاجیہ، نیم سنجیدہ انداز میں قارئین کی ناراضگی کا گلہ کیا ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ مجھے ان کی
بے اعتنائی کا ذرہ بھر بھی گلہ نہیں اور نہ ہی یہ (بے اعتنائی) میرے لیے کڑھنے کا سامان بنی ہے۔ ہو بھی کیوں! میں کوئی ادیب
نہیں۔ لکھنا میرے لیے اتنا ہی کٹھن ہے جتنا کہ ایک ڈھلانی پہاڑ کی چڑھائی۔ لکھتا میں صرف اس وقت ہوں۔ جب اظہار کے بغیر
چارہ نہ رہے پھر ایک گھسی پسی بال پوائنٹ کے ہولڈر سے ایک چھوٹی ڈائری میں اٹک اٹک کر الفاظ کی صورتیں بنانے لگتا ہوں (جیسا کہ
اب تمہیں یہ خط لکھتے وقت۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہ ڈائری کا ورق نہیں بلکہ ایک نئے پیڈ کا پہلا صفحہ) میں دوبارہ لکھنے یا اپنے
لکھے کو نشستِ صاف سے درست کرنے کی جانکاہ صعوبت کبھی نہیں کرتا۔ کیا تم یقین کرو گے کہ میں نے اپنی کہانی، "ایک زندگی کی کہانی"
جو فنون میں چھپی تھی۔ جوں کی توں اور ایک لفظ کے رد و بدل کے بغیر ایڈیٹر کے ہاتھ میں تھما دی اور اسے پہلی بار اول تا آخر
رسالے میں چھپ جانے سے ایک ماہ بعد پڑھا۔ اسے نا قابلِ معافی کاہلی کا نام ہی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں۔ مجھے خدا
نے بنایا ہی ایسا ہے کہ محنت سے جی چراتا ہوں۔ میں ایک حقیقی ادیب کی لامحدود مشقتیں برداشت نہیں کر سکتا اور پھر میں اپنی
ہمزاد روحوں کے لیے لکھتا ہوں۔ جن کی شفقت بھری نظر میری تحریر کی خامکاریوں اور کوتاہیوں پر نہیں جاتی اور جو مجھے سب کچھ
معاف کر دیتے ہیں (پیارے انور محمود کی طرح)

"کھویا ہوا افق" میں جن کہانیوں اور سفرناموں کا تم نے ذکر کیا ہے۔ انہیں میں بھی اس کتاب میں اپنے دل کے زیادہ قریب
سمجھتا ہوں (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم دونوں کھوئے ہوئے افق کے متلاشی ہیں) ہاں انور محمود تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔
ان چیزوں کو اب میں نے سالوں کے وقفے کے بعد پڑھا۔ ایک پڑھنے والے کی حیثیت میں تو مجھے یقین نہ آیا۔ کہ یہ میں
ہی تھا جس نے انہیں لکھا تھا۔ ان میں ایک انوکھا پن ہے۔ ایک تازگی۔ ایک معصومیت جو (مجھے ایسا لگتا ہے) میں اب
کھو چکا ہوں یا کھونے والا ہوں

تمہیں "چاکیواڑہ" بھی اچھی لگی! یہ ایک دیوانی فنتاسٹک کتاب ہے میں اقرار کرتا ہوں کہ یہ اتنی بری نہیں۔ اپنے پلاٹ میں، وڈہاؤسین WODEHOUSIAN منٹو نے اسے پڑھ کر مجھے کہا "اوئے محمد خالد اختر! اسے توں کی بکواس لکھیا اے۔ ایہہ دے کسے کردار وچ جان نہیں۔ اس کے منہ سے یہ رائے سن کر مجھے منٹو اتنا پیارا لگا کہ میرا دل چاہا کہ میں اسے چوم لوں۔۔ ۔۔ ۔۔

اور میں نے تمہارے لیے "بیس سو گیارہ" کی ایک جلد ڈھونڈ لی ہے اسی نیلے گنبد کے فٹ پاتھ پر سے ہے بھی مجلد۔ کباڑیے سے سودا کر کے میں نے اس سے یہ کتاب آٹھ آنے میں حاصل کر لی ہے۔ چند دنوں تک یہ تمہیں پہنچ جائے گی۔ میں پیکٹ بنانے میں اصلاً اناڑی ہوں۔ میں اسے اس بے ہودہ کرفیو کے ختم ہو جانے پر دفتر فنون لے جاؤں گا اور وہاں کے دفتری اختر سے درخواست کروں گا کہ اسے بذریعہ بک پوسٹ تمہارے نام روانہ کر دے۔ مجھے امید ہے کہ تم اس "سیاسی اور معاشرتی، طنز کو 'بین السطور' پڑھو گے۔ بہت سے پڑھنے والوں کو اس کتاب سے یہ شکایت ہے کہ وہ اسے سمجھ نہیں سکتے۔ پیارے انور محمود "بیس سو گیارہ" بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جانے والی کتاب ہے۔ صرف تمہیں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ تم اس کتاب کو اکیسویں صدی کے پہلے ربع میں پڑھ رہے ہو۔ (یہ بالکل معقول مفروضہ ہوگا۔ کیونکہ "بیس سو گیارہ" بھی اکیسویں صدی میں لکھی گئی تھی) کیسے کہ تو یہ مستقبل کی شناسی ہے۔ جارج آرویل کی ۱۹۸۴ کی طرح۔ حقیقت میں یہ اس ملک کے موجودہ دور کے سیاسی اور سماجی نظام پہ ایک طنز ہے۔ مجھے یقین ہے تم اسے بخوبی سمجھ سکو گے آخر تم میرے KINDRED SPIRIT ہو، جن دنوں میں نے یہ کتاب لکھی تھی میں ایک غصیلا جوان آدمی (ANGRY YOUNGMAN) تھا۔ تمہیں ۲۰۱۱ میں کئی ٹکڑے ایسے ملیں گے۔ جو زہر میں بجھے ہوئے ہیں۔ کسی نے کہا کہ ہم کبھی نہیں بدلتے۔ ممکن ہے اب بھی میری رگوں میں یہ زہر زدہ لہو حرکت کرتا ہو۔ میں یہی یقین کرنا چاہتا ہوں کہ عمر کے ساتھ مجھ میں سلامت روی اور ایک قسم کی ملائمت آ گئی ہے مگر ہم میں سے بیشتر وہ نہیں ہوتے جو وہ خود کو سمجھتے ہیں۔ میں نے اپنے متعلق بہت سی بے ربط اور غیر ضروری باتیں لکھ ڈالی ہیں اور کیا میں اب تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ تم کیا کرتے ہو، یا منٹو کے الفاظ میں تم .... تم انور محمود خالد، تم کیا ہو (لیکن کیا تمہارا خط ہی مجھے نہیں بتا رہا کہ تم کیا ہو) کیا تم ایک کالج میں طالب علم ہو۔ تمہاری عمر کیا ہے؟ تم کیا کرتے ہو (کیسا بےہودہ سوال) اور تمہیں کتابیں پڑھنے کی لت کیسے پڑی۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری زندگی ذہنی طور پر امیر ہے۔ اسے دیوتاؤں کا انعام سمجھو۔ ہم میں سے کتنے ہی زندگی کی اس پر بہار شاہراہ پہ سے آنکھیں موند کر چلتے ہیں۔ کتابیں ..... صرف اچھی عظیم کتابیں ہی ہمیں خود آگاہی دے سکتی ہیں اور ہمارے دکھوں اور مایوسیوں کا مداوا ہو سکتی ہیں۔ کون کون سے مصنف تمہیں محبوب ہیں اور کیا تم خود بھی لکھتے ہو؟ اپنے بارے میں مجھے ضرور بتاؤ اور اگر تم کبھی لاہور آ نکلو تو تم سے مل کر مجھے خوشی ہو گی۔ اتنے اچھے خط کے لیے بہت بہت شکریہ

تمہارا خالد

سن اکہتر کا شہر آشوب

فتح محمد ملک

سقوطِ ڈھاکہ ہماری قومی تاریخ کا تاریک ترین باب ہے یہ ایک ایسا المیہ ہے جس نے پوری قوم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہم میں سے ہر ایک اپنے دل کو ٹٹول رہا تھا اور ہر ایک امجد اسلام امجد کے اس مصرع کی تصویر بنا ہوا تھا :

اے زمین وطن ہم گنہگار ہیں !

مگر پھر وہی ہوا جو زوال کی طویل صدیوں کے دوران ہم ہمیشہ سے کرتے چلے آئے ہیں ہمارے انحطاط پسند مزاج نے ہمیں بہت جلد اپنے گناہ دوسروں کی گردن پر ڈالنے کا راستہ دکھایا اور یوں سقوط کی سازش میں ملوث انتظامی اور سیاسی عناصر ایک دوسرے کو غدار ثابت کرنے میں مشغول ہو گئے۔ غدار سازی کی اس مہم نے ہمارے اجتماعی تناظر کو کچھ یوں دھندلایا کہ ہمیں اپنی ذات کے سوا ہر کوئی غدار نظر آنے لگا۔ اقتدار کی مسند پر بیٹھے ہوؤں اور راتوں رات حکومت کا تختہ الٹ کر مسندِ اقتدار پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھنے والوں کی طرف سے غدار سازی کی یہ مہم اس لیے خطرناک ثابت ہوئی ہے کہ بہت جلد ہم نیم صد اقتوں جذباتی مفروضوں اور عیارانہ حیلوں کے طلسم میں اسیر ہو کر رہ گئے۔ اور ہم نے اس عظیم المیہ کے عوامل و محرکات اور نتائج و اثرات کے صداقت پسندانہ تجزیئے سے بڑی حد تک گریز کیا۔ اس علمی گریز کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پاکستان کے اندر اور باہر کے سامراج نواز حلقوں نے حکمران طبقوں کی نااہلی، بددیانتی اور قوم فروشی کے جواز مہیا کرنے کی کوشش میں خود پاکستانی عوام ہی کو فاسق و فاجر قرار دینا شروع کر دیا ہے۔

میرے نزدیک یہ المیہ بھی سقوط ڈھاکہ سے کچھ کم المناک نہیں۔

مخصوص مفادات کے ان گماشتوں کی علمی سرگرمیوں سے قطع نظر اگر اپنے ادبی منظر پر نگاہ دوڑائیں تو یہاں ہم ایک مختلف اور حوصلہ افزا صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ براہ راست اس موضوع پر لکھی گئی تخلیقات کے علاوہ ہمیں سن اکہتر کے بعد کے ادب، پر اس المیہ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے جہاں ہمارا ایک نوآموز شاعر سقوطِ ڈھاکہ پر یوں سوچتا ہے :

---

۱ سبط علی صبا

دیوار کیا گری مرے کچے مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

وہاں محمد صفدر میر، بہادر شاہ ظفر اور سراج الدولہ پر اپنے ٹیلی وژن ڈراموں میں ۱۸۵۷ء اور ۱۷۵۷ء کے المیوں اور سقوطِ ڈھاکہ کے المیے میں گہری مماثلت دیکھتا ہے۔ تاریخ اور ذاتی یادداشتوں کے نام پر لکھے جانے والی کتابوں اور تخلیقی ادب میں اندازِ نظر کے اس تضاد کو سمجھنے اور اس سے عبرت حاصل کرنے کے جذبے سے میں نے اس مضمون میں تاریخ و سوانح اور افسانہ و شعر کے سرمائے پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔

(۲)

عظمتِ رفتہ کے نقوش اجاگر کرنا ہماری تاریخ نگاری کا غالب رجحان ہے۔ تاریخ نویسی کا جذباتی اور رومانی اندازِ نظر دورِ غلامی میں شاید ہماری نفسیاتی ضرورت تھا۔ مؤرخ نے اس ضرورت کو اس شان سے پورا کیا کہ تاثر کو تجزیہ کا نعم البدل مان لیا گیا۔ ہر رخصت ہونے والی شخصیت ہیرو ٹھہری اور ماضی کا حصہ بننے والا ہر دورِ زمان سنہری عہد قرار پایا۔ طلوعِ آزادی کے بعد بھی ماضیٔ قریب اور ہم عصر تاریخ کے حقیقت پسندانہ تجزیے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی ہر زماں اپنے عمل کا حساب کرنے کی بجائے ہمارے مؤرخ ماضی کے چوکھٹے میں رنگ بھرنے میں مصروف رہے۔ بڑی سے بڑی تباہی بھی ہمیں خود احتسابی پر مجبور نہ کر سکی۔ اگر ہم چونکے بھی تو صرف اس حد تک کہ ہر تباہی کو غیروں کی تخریب کا شاخسانہ قرار دیا مگر اپنوں کی ضمیر فروشی، نااہلی اور غداری کے تجزیے کی راہ اختیار نہ کی یقیناً ہماری ہر قومی ابتلا و آزمائش میں غیروں کی سازشوں کو دخل ہے مگر ہمیں غیروں سے کہیں زیادہ اپنوں کی اندرونی سازشوں اور غداری سے سبق اندوز ہونے کی ضرورت ہے۔

اندرونی سازشوں اور سیاسی و فکری غداری کی جڑیں ہمارے ماضی میں دور تک پھیلتی چلی گئی ہیں۔ اس لیے محض جذباتی الزام تراشیوں سے ہم اس کی پوری معنویت سمجھ سکتے ہیں نہ اس کا موثر انسداد کر سکتے ہیں اس کے لیے ہمیں گزشتہ تیس برس کی قومی تاریخ کو سائنسی انداز میں سمجھنا اور سمجھانا ہوگا۔ محض اپنی اپنی یادداشتیں قلم بند کر دینے یا تاثرات نگاری سے ماضی کے چوکھٹے میں رنگ بھرنے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں اپنی تاریخ کو خود لکھنا ہوگا۔

اس وقت باہر کی دنیا میں قیامِ پاکستان کے محرکات اور قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک کی تاریخ پر حیرت انگیز حد تک توجہ دی جا رہی ہے۔ روس اور بھارت، برطانیہ اور امریکہ کے مؤرخین اپنے اپنے قومی مفادات کے پیشِ نظر اور اپنے اپنے اندازِ نظر سے ہماری حالیہ تاریخ پر تحقیق و تفتیش میں منہمک ہیں۔ ہمیں ان کی مذمت میں قلم توڑنے کی بجائے اپنے نقطۂ نظر سے اپنی تاریخ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنا ہے۔ اگر ہم اس کام کے آغاز کے لیے ان تمام شخصیتوں کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کا انتظار کرتے رہے جو ہماری اجتماعی محرومیوں اور قومی نامرادیوں کی ذمہ دار ہیں تو ہمارے پاس دوسروں کے نقطۂ نظر سے لکھا ہوا اتنا کچھ اکٹھا ہو جائیگا

کہ ہماری نئی نسل اپنے قومی وجود اور نظریاتی تشخص کو دوسروں کی عینک سے دیکھنے اور اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

۱۹۷۱ء میں پاکستان کی تقسیم ہماری قومی زندگی کا اتنا بڑا المیہ ہے کہ اس کی تفہیم و تفسیر کا عمل ایک طویل عرصہ تک جاری رہے گا۔ اس کے صحیح عوامل و محرکات کے بے نقاب ہونے میں ابھی وقت درکار ہے مگر جتنا مواد اس وقت تک منظر عام پر آچکا ہے۔ اس کی بنیاد پر بھی کتابوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ سقوط مشرقی پاکستان کے موضوع پر اس وقت تک جو درجن بھر کتابیں شائع ہو چکی ہوں انہیں ہماری قومی بقا کے خلاف جارحیت کا نام دیا جا سکتا ہے ان میں سے بیشتر کتابیں بھارتی مصنفین کی کاوش ہیں۔ بھارتی صحافی، مؤرخین اور ماہرین سیاسیات پاکستان کی تقسیم کی کہانی سناتے وقت تاریخی حقائق کو یوں مسخ کر کے پیش کرتے ہیں گویا پاکستان کی اساس میں ہماری خرابی کی صورتیں مضمر ہیں۔ ان کے نزدیک جب تک ہم دو قومی نظریے سے دستبردار ہو کر اور اپنے منفرد تہذیبی وجود کو مٹا کر اکھنڈ بھارت کا اٹوٹ انگ بننے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ ہمارے دیدہ و دل کی نجات کی گھڑی دور ہی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ اس انداز نظر کے ساتھ لکھی ہوئی تاریخ نہ تو تاریخ نگاری کے سائنسی تقاضوں پر پوری اتر سکتی ہے اور نہ اس المیے کے حقیقی پس منظر و پیش منظر کو روشن کر سکتی ہے۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ ہماری نئی نسل کے دل و دماغ میں پاکستان کی نظریاتی اساس اور ہمارے تہذیبی وجود کے بارے میں شکوک و شبہات کو جنم دے۔ اور پاکستان سے باہر کی دنیا میں ہمارے قومی تشخص کو الجھائے اس منفی پراپیگنڈہ سرگرمی کے لیے بھارتی مصنفین کو اصل حقائق سے زیادہ افواہیں کام دے سکتی تھیں۔ سو انھوں نے جانتے بوجھتے حقائق کو سیاق و سباق سے کاٹ کر اور غلط رنگ میں پیش کر کے اپنے بھاگوں پاکستان کی نظریاتی اساس کو منہدم کر دیا ہے۔

بھارتی مصنفین کی اس پراپیگنڈہ تاریخ نویسی کے پہلو بہ پہلو دنیائے مغرب میں بعض ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں جو جارحیت کا ایک نیا رنگ پیش کرتی ہیں۔ ان میں بظاہر غیر جذباتی اور سائنسی انداز نظر روا رکھا گیا ہے مگر فی الواقع یہ ہماری قومی تاریخ کے خوب و ناخوب کو اپنے مخصوص سامراجی مفادات کے رنگ میں پیش کرتی ہیں۔ اس انداز کی کامیاب ترین مثالیں جناب جی۔ ڈبلیو چودھری کے ہاں ملتی ہیں۔ ان کتابوں کا اسلوب نگارش تو بلاشبہ تاریخ نویسی کا عمدہ معیار پیش کرتا ہے مگر ان کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ یہ کتابیں ہمارے قومی مشاہیر کو غدار اور رائے عامہ کی نظروں میں غدار شخصیتوں کو قومی ہیرو بنا کر پیش کرتی ہیں یوں ہم ان کتابوں میں کسی ایک شخص یا چند اشخاص کی کردار کشی کے مناظر تو دیکھ سکتے ہیں۔ مگر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے پس پردہ طویل اور پیچ در پیچ سلسلۂ اسباب کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ان کتابوں میں ہماری بصیرت کا سامان ہے نہ عبرت کا۔ یہ فقط ہمارے تاریخی تناظر کو دھندلاتی اور ہماری قومی زندگی میں غلط مفروضوں کو رواج دیتی ہیں۔

جی ڈبلیو چودھری کی کتاب "متحدہ پاکستان کے آخری ایام" لندن میں شائع ہوتے ہی ایک ہفت روزے میں ترجمہ و تلخیص کے روپ میں یوں نمودار ہوئی تھی جیسے پاکستان میں ایک خاص مکتب فکر اس کتاب کی اشاعت

کلبے تابی سے منتظر تھا۔ چودھری صاحب ہمارے ملکی حلقوں میں درباری مورّخ کی سی شہرت کے مالک ہیں۔ سکندر مرزا کی مشرقی پاکستان پر حکومت کے عہد سے لے کر ایوب خان کے دور آخر تک چودھری صاحب نے پاکستان کی سیاست اور تاریخ پر جو چند کتابیں تصنیف کی ہیں اُن کی مشترکہ خصوصیت حاکمِ وقت کی حمد و ثنا اور اس کی پالیسیوں کی ذرا خدلانہ تائید ہے۔ اس سلسلے میں اگر انہیں اپنے ممدوحین پر بعد از وقت الزام تراشی بھی کرنا پڑے تو یہ بھی کر گزرتے ہیں مثلاً ایوب خان کے عہد میں سکندر مرزا کی اُن ہی پالیسیوں کی مذمت کر ڈالیں گے جن کی حمایت میں وہ سکندر مرزا کے دورِ حکومت میں جوش بیان کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ "متحدہ پاکستان کے آخری ایام" میں بھی انہوں نے ایوب خان کی اُن غلط تدابیر کا پول کھولا ہے جو ایوب خان کے عہد میں چودھری صاحب کو حسنِ تدبیر کا نمونہ نظر آتی تھیں۔ مگر یحییٰ خان کے علاوہ چودھری صاحب کو متحدہ پاکستان کے آخری ایام میں چند ایک اور نیک سیرت اور قابل اعتماد اشخاص بھی نظر آئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ سارے کے سارے لوگ خفیہ پولیس سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سب سے بڑا وطن دوست ملٹری انٹلی جنس کا ریٹائرڈ جنرل اکبر ہے۔ ان ذرائع سے حاصل کردہ بیش بہا معلومات کو چودھری صاحب یحییٰ کے چہرے پر ملی ہوئی کالک کو دھونے میں استعمال کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ عوام کے منتخب نمائندے غدار تھے اور یحییٰ خان پاکستان کو عوامی نمائندوں سے "نجات" دلانے میں حق بجانب تھا۔ اگر ہم اس کتاب کو الطاف گوہر کے اس مقالے کی روشنی میں پڑھیں جو گوہر صاحب نے لندن کے رسالہ "تھرڈ ورلڈ کوارٹرلی" (اشاعت بابت جنوری ۱۹۷۹ء) میں شائع کیا ہے تو ہمیں چودھری صاحب کی تضاد بیانی اور علمی بد دیانتی کے علاوہ اس حقیقت کا بھی علم ہو جائے گا کہ بعض نازک مواقع پر چودھری صاحب کی پُراسرار لندن اور نیویارک آمد و رفت کیا معنی رکھتی ہے؟ یحییٰ خان کو گمراہ کرنے میں خود چودھری صاحب کا کتنا حصہ ہے اور وہ یحییٰ خان کے وزیر اور مشیر بن کر یحییٰ خان اور پاکستان کی خدمت میں مصروف تھے یا ان کی خدمات کا دائرہ کچھ بہت ہی زیادہ وسیع ہو کر رہ گیا تھا۔؟ جس زمانے میں وہ وزیر تھے نہ مشیر، نہ سرکاری اہل کار — اس زمانے میں انہیں کس خوشی میں سرکاری خزانے سے پیسے ملتے رہے؟ اور اب "متحدہ پاکستان کے آخری ایام" میں اگر انہوں نے چند نیم صداقتوں کو بیان کیا ہے، بہت سے حقائق پر پردہ ڈالا ہے اور کچھ سوالات سے کترا کر نکل گئے ہیں تو یہ محض اتفاقی امر ہے یا کوئی سوچا سمجھا منصوبہ ہے؟

افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم نے ان کتابوں میں پیش کی گئی سیاق و سباق سے کٹی ہوئی نیم صداقتوں کو سر آنکھوں پر جگہ دی کیوں۔؟ ..... اس لیے کہ ہم خود احتسابی سے زیادہ قربانی کے بکرے کی تلاش میں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کے ٹوٹنے کی ذمہ داری کسی ایک سیاست دان، کسی ایک سیاسی جماعت، قومی زندگی کے کسی ایک شعبے یا پھر کسی ایک طبقے کی گردن پر ڈال کر اسے قربانی کا بکرا ثابت کریں۔ یوں ہم اپنی بداعمالی یا بے عملی کی تلافی اور اپنے سنگین جرائم کا کفارہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اُن پُراسرار محرکات اور پیچ در پیچ عوامل کے اُس سلسلے کے تجزیاتی اور تنقیدی شعور سے کوئی سروکار نہیں جو تقسیمِ پاکستان کا باعث بنے اور موجودہ پاکستان میں ابھی تک سرگرمِ کار ہیں۔ نتیجہ یہ کہ صحافی واقعہ نگاری اور جذباتی نعرہ بازی ہمارے اجتماعی کتھارسس کے بھرپور وسیلے بن کر رہ گئے ہیں۔ لیکن

میں ہمارے چند دانشوروں کی دلسوزی اور حیلہ گری غنیمت ہے۔

صدیق سالک کی کتاب "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا" کی اشاعت سے ایسا مستند مواد سامنے آگیا ہے جس کی بنیاد پر سامراج نواز تاویلات کا پول کھل سکتا ہے۔ جی ڈبلیو چودھری کے سے سامراج نواز مورخین نے تقسیم پاکستان کے ڈرامے میں ولن کو ہیرو ثابت کرنے کی جو کاوش فرمائی ہے۔ اس کتاب میں پیش کی گئی ناقابلِ تردید اور محکم واقعاتی شہادتیں اسے ناکام بنا دیتی ہیں۔ اسی طرح وہ زبان زد عام افسانے جن کے باعث اس سرگزشت کے خوب و ناخوب میں تمیز جاتی رہی ہے۔ صدیق سالک کے بیان کردہ واقعات کی روشنی میں پادر ہوا نظر آنے لگے ہیں۔ سالک نے یہ واقعات اور مشاہدات بڑی جرأت اور چابک دستی سے بیان کئے ہیں۔ "وٹنس ٹو سرنڈر" ڈائری نویسی یا نامہ نگار نہیں تخلیقی فن کاری کی مثال ہے۔ اس کا حسن طول بیانی اور خطابت کا نہیں اشارہ و ایما کا مظہر ہے۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے ان ابواب میں قلم سے زیادہ موقلم استعمال کیا گیا ہے پہلے باب میں سالک نے اشاراتی انداز میں مشرقی اور مغربی پاکستانیوں کے درمیان حائل خلیج کے نفسیاتی، اقتصادی اور سیاسی عوامل کی مصوری کی ہے۔ صرف آٹھ صفحات پر مشتمل اس باب کی آخری سطریں پڑھنے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ خلیج ناقابل عبور ہو چکی ہے۔ پاکستان ٹوٹا پڑا ہے۔ صرف دور سے دیکھنے والے کو ثابت و سالم نظر آتا ہے یہ باب پڑھتے وقت مجھے بیورلی نکلس کی کتاب "ورڈکٹ آن انڈیا" یاد آئی۔ سن چالیس سے شروع ہونے والی دہائی کے ہندوستان میں برپا جس ہندو مسلمان کش مکش کو سیاسی حکیموں کے مقالات حل کرنے کے بجائے مزید الجھانے کا باعث بن رہے تھے اسے افسانہ نگار بیورلی نکلس کی تیز بین نگاہوں نے یوں دیکھا تھا اور اس فنکارانہ صداقت پسندی سے پیش کیا تھا کہ تحریک پاکستان کے بدترین دشمن بھی اسے صحیح تناظر میں دیکھنے پر مجبور ہو گئے تھے سالک نے بھی چیزوں کو دیانت کے مقام نظر سے دیکھا اور صداقت کے اسلوب بیان میں پیش کیا ہے۔ آپ جانیں، دیانت اور صداقت ہمارے ہاں اشتعال انگیز جنس بن کر رہ گئی ہیں۔ چنانچہ یہ کتاب جہاں عام پاکستانیوں کے لیے بصیرت افروز اور عبرت آموز ہے۔ وہاں زیر نظر المیے کے رندہ کرداروں کے لیے اشتعال انگیز بھی ہے۔ یہ اشتعال ایک عام پاکستانی کے لیے بہت مبارک ہے اس لیے کہ جنرل نیازی ہوں یا راؤ فرمان صاحبزادہ یعقوب ہوں یا ٹکا خان.... اس فوجی اور سیاسی المیے کے بہت سے کردار اس کتاب کے مندرجات سے مشتعل ہو کر اپنے اپنے حافظے میں محفوظ یادداشتوں کو قلم بند کرنے پر مجبور ہوں گے اور یوں پاکستانی مورخ اور سیاسی مفکر کو وہ خام مواد ہاتھ آئے گا جس کے بغیر کوئی بھی بے لاگ اور معتبر تاریخی تجزیہ وجود میں نہیں آسکتا۔

صدیق سالک نے ہتھیار ڈالنے کی کہانی بیان کرتے وقت حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ جذبات کی نمائش سے دامن بچایا ہے۔ اس جانگسل واردات کے بیان میں جذباتیت کو قطعاً کوئی دخل نہیں مگر گہرا دکھ بیان کے تار و پود میں زیریں رو کے مانند جاری و ساری ہے اور راوی جاں سے زیادہ تسلیم جاں کے مفہوم پر غور و فکر کرنے لگتا ہے شاید اسی غور و فکر کو غذا فراہم کرنے کے لیے سالک نے ہتھیار ڈالنے سے متعلق اصل دستاویز کو بھی بطور ضمیمہ درج کر دیا

ہے تاکہ کتاب ختم ہونے کے بعد بھی ختم نہ ہو اور قاری زیرِ بحث موضوع پر سوچتا رہے، سوچتا رہے، سوچتا رہے۔

جس شخص نے گہری دردمندی اور سیاسی مورخ کی سی علمی دیانت کے ساتھ ہتھیار پھینکنے کی اس دستاویز پر جرأتِ فکر کا ثبوت دیا ہے اس کا نام ڈاکٹر صفدر محمود ہے۔ صفدر محمود نے پاکستان کی حالیہ تاریخ کے منتشر اوراق کی شیرازہ بندی جس محنت اور محبت کے ساتھ کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی کتاب "مسلم لیگ کا دورِ حکومت" کے بارے میں انتظار حسین نے کیا خوب کہا ہے کہ :

> " پاکستان میں جس تاریخ کو فراموش کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اسی تاریخ کو صفدر محمود نے یاد دلانے کا اہتمام کیا۔ مسلم لیگ کو تحریکِ پاکستان کے طفیل مقدس گائے کا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا مگر صفدر محمود نے بتایا کہ مقدس گائے کو جب پاکستان میں ہری ہری گھاس نظر آئی تو وہ اتنی مقدس نہ رہی۔ اپنے دورِ اقتدار میں مسلم لیگ نے کیا کیا، پارٹی کا کیا نقشہ ابھرا اور لیگی وزراء نے کیا کیا۔ یہ کچا چٹھا انھوں نے بیان کیا "

اسلام کے جن انقلابی تصورات کو اپنا کر مسلم لیگ ایک عوامی تحریک بنی تھی۔ اپنے دورِ اقتدار میں اس نے ان تصورات سے کس طرح غداری کی، صفدر محمود نے اس کا ایک جیتا جاگتا اور حقیقت سے لبریز عکس پیش کر کے ہمیں اپنے بنیادی تصورات سے انحراف کی راہ چھوڑنے کی دعوت دی ہے۔ وہی جماعت جو مظلوموں کو ظلم سے نجات دلا کر ایک جہانِ نو پیدا کرنے کی عزم سے اٹھی تھی جب اسی ظالمانہ نظام کی سب سے بڑی محافظ بن بیٹھی تو اس کا زوال شروع ہو گیا۔ مسلم لیگ نے تحریکِ پاکستان کے دوران سامراجی نظامِ حکومت و معیشت میں انقلابی تبدیلیاں لانے کا عہد کیا تھا مگر قائداعظم کی وفات کے بعد وہ اس عہد سے منحرف ہو گئی۔ پاکستان کی سالمیت اور استحکام کو بیرونی سازشوں سے زیادہ ان تبدیلیوں کو رد کرنے کے عمل نے نقصان پہنچایا ہے۔ اس مسلسل اندرونی جارحیت کی صداقت پسندانہ تاریخ بیان کرنا اس وقت ہماری قومی بقا کا اولین تقاضا ہے اور ڈاکٹر صفدر محمود نے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ صرف سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پر اب تک ان کی دو کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ایک سچے پاکستانی کی دلسوزی کے ساتھ ڈاکٹر صفدر محمود تقسیمِ پاکستان کے المیے کی کہانی مسلم لیگ کے دورِ حکومت ہی سے شروع کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں وہ عوامل اور محرکات جو بالآخر ۱۹۷۱ء میں سقوط پر منتج ہوئے ان کی جڑیں آزادی کے فوراً بعد مسلم لیگی قیادت کی غلط فکری اور بدعملی میں پوشیدہ ہیں۔

ڈاکٹر صفدر محمود کی تازہ کتاب "دی ڈبریٹ ڈی بیکل" اس اعتبار سے ایک فکر انگیز کتاب ہے کہ اس میں تاریخ نگاری کی جی ڈبلیو چودھری کی سی نامنصفانہ اور یک رخی روش کے انسداد کا موثر انتظام موجود ہے۔ صفدر نے غیر جذباتی اور متوازن اندازِ نظر سے کام لے کر اور عہدِ جدید کے تحقیقی معیاروں کی روشنی میں بہت سی غلط فکریوں کا علمی توڑ پیش کیا ہے۔ صفدر سقوطِ مشرقی پاکستان کو نہ تو پاکستان کی فکری اساس میں مضمر کسی موہوم خرابی کا شاخسانہ سمجھتا ہے اور نہ اس کی ساری کی ساری ذمہ داری کسی ایک شخص، ایک پارٹی یا ایک عہد پر ڈالتے ہیں۔ ان کی نظر ان عوامل کی تہ تک پہنچ جاتی ہے۔ جن کی جڑیں ہماری تاریخ، تہذیب اور معاشرت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ پاکستان کی تقسیم میں کلاذریا بیرونی

عوامل سے صرفِ نظر نہیں کرتے مگر کسی ایک طاقت کو اس کا ذمہ دار بھی نہیں ٹھہراتے وہ پاکستان کے اندر کی طاقتیں ہوں یا باہر کی ۔۔۔ جس جس کا جتنا جتنا حصہ ہے وہ اُسے بے نقاب کرتے ہیں مگر اصل ذمہ داری پاکستان کی نظریاتی اساس سے انحراف کرنے والی سیاسی اور تہذیبی قوتوں پر ڈالتے ہیں ۔ پاکستان کی سالمیت اور استحکام کو بیرونی سازشوں سے زیادہ اس انحراف کے عمل نے نقصان پہنچایا ہے چونکہ یہ انحراف قیامِ پاکستان کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے سقوط کا عمل بھی قیامِ پاکستان کے ساتھ ساتھ ہی جنم لینے لگا تھا ۔ ایوب خان کی بعض غلط اندیشیوں اور غلط کاریوں نے اس عمل کو تیز کیا۔ یحییٰ خان نے اس عمل کو روکنے کی بجائے تیز تر کیا۔ چونکہ یحییٰ خان نے اس عمل کو برق رفتاری بخشی اور آخری مرحلے میں اپنی بے مثال بے تدبیری اور میر جعفر اور میر صادق کی سی ہوسِ اقتدار سے پوری قوم کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کر دیا۔ اس لیے اقتدار کی بندر بانٹ میں مصروف سیاست دانوں سے زیادہ یحییٰ خان اور اس کے ساتھی سقوط کے ذمہ دار ہیں۔ ڈاکٹر صفدر محمود قابلِ رشک یکسوئی اور قابلِ تعریف لگن کے ساتھ پاکستان کی تقسیم کے المیے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے اور یوں ہمارے لیے سامانِ عبرت تلاش کرنے میں مصروف ہیں اس موضوع پر ان کی تیسری کتاب "پاکستان ڈیوائیڈڈ" لندن میں طباعت کے مراحل سے گزر رہی ہے ۔۔۔۔ ڈاکٹر صفدر محمود کی اس علمی لگن اور ان کے اس دردِ وطن کی مثال ڈھونڈنے نکلیں تو ہمیں تاریخ نویسی کے دائرے سے باہر نکل کر ادب کے میدان میں آنا ہو گا۔

(۳)

انتظار حسین نے سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پر چند ایک کہانیاں لکھی ہیں ۔ "شہرِ افسوس" ان میں سے ایک ہے، انتہائی فن کارانہ حسن اور بے پناہ شدتِ تاثر کی حامل اس کہانی کے تینوں کردار اس بستی میں اپنوں کے ظلم میں جمع کرتے ہیں جسے انھوں نے ایک مدت پہلے دارالامان جانا تھا۔ یہ دارالامان جب "شہرِ افسوس" کے پہلے، دوسرے اور تیسرے آدمی کو شہرِ خرابی کا روپ دھارتا نظر آتا ہے تو ان میں سے ایک خود سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

"۔۔۔۔ تو ان لوگوں کو ان کے حال پہ چھوڑ اور یہاں سے نکل چل کہ تجھے زندہ رہنا ہے۔

سو، میں نے اس قبیلے کی طرف سے منہ پھیرا اور اپنی جان بچا کر بھاگا مگر میں ایک عجیب میدان میں جا نکلا جہاں خلقت امڈی پڑتی تھی اور فتح کا نقارہ بجتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ لوگو یہ کونسی گھڑی ہے اور یہ کیا مقام ہے۔ ایک شخص نے قریب آ کر کان میں کہا کہ یہ زوال کی گھڑی ہے اور یہ مقامِ عبرت ہے۔

اور اس شخص نے زہر بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہا ۔۔۔ تو اسے نہیں پہچانتا؟

نہیں!

اے بدشکل آدمی یہ تو ہے!

میں ؟ ۔۔۔۔ میں سناٹے میں آ گیا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا اور میری پتلیاں پھیلتی چلی گئیں۔ ۔۔۔یہ تو سچ مچ میں تھا۔۔۔۔
میں نے اپنے آپ کو پہچانا اور مرگیا ۔۔ "

چونکہ مسعود مفتی کا مسلک فنی حقیقت نگاری ہے۔ اس لیے سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پران کے افسانوں کے تازہ مجموعہ ۔۔۔۔ "ریزے" میں زوال کی لپیٹ میں آئی ہوئی اِس بستی کا نام ڈھاکہ ہے۔ اس میدان کا نام پلٹن میدان ہے۔ اور یہ منظر ہتھیار پھینکنے کا منظر ہے اور جس پہلے، دوسرے اور تیسرے آدمی کے مُنہ پر تھوکا گیا ہے وہ میں، آپ اور ہم سب ہیں۔ مسعود مفتی ہم سب کو یہ گھڑی یاد دلانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں اور گزشتہ پندرہ برس سے ہمیں اس مقامِ عبرت کی سیر کرانے میں مصروف ہیں۔ پہلے انھوں نے ہمیں اپنے رپورتاژ "چہرے" میں مشرقی پاکستان کی جانکنی کی داستان سُنائی، سبز ہلالی پرچم کے چاند تاروں کے غروب ہونے اور اس کے بعد کی اتھاہ تاریکی کے منظر دکھاتے ہوئے اپنے دل کی بے چینی اور ذہن کے کرب کو اس نکتۂ بصیرت میں سمیٹا کہ :-

"برعظیم کی تاریخ میں یہ منظر بار بار دیکھنے میں آیا ہے جب بھی مرکز میں نااہل اور بددیانت لوگ آئے تو دُور کے علاقوں میں غداروں نے کمریں کس لیں۔ کسی بیرونی طاقت سے سازش کی اور سلطنت کی کمر میں چھرا گھونپا۔"

پھر انھوں نے قیامِ مشرقی پاکستان اور بعدازاں بنگلہ دیش اور بھارت میں ایامِ اسیری کے واقعات مشاہدات اور تاثرات پر مشتمل کتاب "لمحے" میں بتایا کہ :-

" ۱۹۷۱ء میں بھی میرِ کارواں نے وطن کو بچانے کی کوئی تدبیر نہ کی بہت کیا تو تساہل کو تدبیر کہہ ڈالا اور حماقتوں کو نوشتۂ تقدیر سمجھ لیا۔ رہبروں کی مسلسل خودستائی، رہروں کی مسلسل خودکشی سے قوم اور وطن ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔"

یہ مسعود مفتی ہی کی نہیں اردو افسانے کی خوش بختی ہے کہ تہ در تہ تاریکی کی اس فضا میں انھوں نے قرآن حکیم سے روشنی لینے کے عمل کا آغاز کیا۔ سات مہینے دم توڑتے ہوئے مشرقی پاکستان میں، ایک مہینہ امریکی، روسی اور بھارتی دایئوں کی گود میں کھیلتے ہوئے نوزائیدہ بنگلہ دیش میں اور دو سال جنگی قیدیوں کے بھارتی کیمپ بریلی میں ظلمت و نور کی اس مسلسل کشمکش نے مسعود مفتی کے فکر و نظر کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ قومیت اور تہذیب کے وہ الجھے ہوئے مسائل جنھیں پاکستانی دانشوروں کے مقالات و مباحث مزید الجھاتے چلے آرہے تھے ان کی آن میں یوں سلجھ گئے جیسے تاریک رات میں بجلی کوندجانے سے یک بہ یک فضا روشن ہوجاتی ہے :

" ہمارے دانشور اور ادیب کتابیں لکھ رہے ہیں اور آپس میں بحث کر رہے ہیں کہ پاکستانی کلچر کیا ہے اور پاکستانی قومیت کی تعریف کیا ہے ؟ لیکن ہمارا ہر جنگی قیدی جو نہ دانشور ہے نہ عالم، پاکستانی قومیت اور کلچر کی تعریف خوب سمجھ چکا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کیمپ کے گرد خاردار تاروں کے حصار نہیں تھے۔ بلکہ پاکستانی قومیت کی حد بندی تھی۔ ان تاروں کے اندر ایران،

> دفا پاکستانی کلچر کا سمبل تھے۔ وہاں کوئی فرق نہ تھا کہ کون پنجابی ہے، کون سندھی ہے، کون پٹھان اور کون بلوچ ہے۔ وہ سب اس وجہ سے وہاں تھے کہ وہ پاکستانی تھے۔ ہمارا جنگی قیدی مثبت انداز میں نہیں تو منفی انداز میں سمجھ چکا ہے کہ وہ ہر چیز جیسے ہندو اس برعظیم سے مٹانا چاہتا ہے پاکستانی قومیت اور پاکستانی کلچر کے زمرے میں آتی ہے۔ کیونکہ ہندو اس برعظیم کو کنشک اور ہرش کے زمانے کا اکھنڈ بھارت بنانا چاہتا ہے[۱]"

یہاں یہ بات یاد دلانے کی ضرورت ہے، کہ سقوط ڈھاکہ کے المیہ سے دوچار ہوکر، بھارت کا جنگی قیدی بننے سے پہلے، مسعود مفتی بھی ہمارے اُن ادیبوں میں سے ایک تھے۔ جن پر پاکستانی قومیت اور پاکستان کی جداگانہ تہذیب کا مفہوم واضح نہ تھا۔ مسعود مفتی نے اب سے بیس بائیس برس پیشتر مزاح نگار اور افسانہ نویس کی حیثیت سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ "سر راہے" اور "محدب شیشہ" کا مزاح نگار اور کہانی کار ترقی پسند تحریک کے ادبی اثرات سے شاد کام ہونے میں کوشاں نظر آتا ہے۔ مقصدیت اور حقیقت نگاری کا وہ چلن جو ترقی پسندوں اور جدیدیت پسندوں کا طرۂ امتیاز تھا مسعود مفتی کے ہاں بھی عام ہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں کے مجموعہ "رگ سنگ" میں مسعود مفتی مقصدیت اور حقیقت نگاری کے لیے معنی دریافت کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ مگر اس کتاب میں بھی یہاں وہاں انسان دوستی کے مغربی تصور کا غلبہ نظر آتا ہے۔ جس کے زیر اثر مسلمان دوستی اور انسان دوستی میں تصادم کی کیفیت نمایاں ہے۔ انسان دوستی کے سیکولر تصور اور قوم پرستی کے آدرش کے درمیان یہ کشمکش قیام مشرقی پاکستان کے دوران نکتۂ عروج کو پہنچتی ہے۔ اور بالآخر بریلی کے ایام اسیری میں ختم ہو جاتی ہے۔ اب مسعود مفتی بھارت کے جنگی قیدی مسعود الرحمن مفتی کی واردات سے اکتساب فیض کرتا ہے۔ تو "صدیوں پار" کا سا افسانہ جنم لیتا ہے۔ یہ افسانہ مسعود مفتی کے فنی سفر کو ایک نئے موڑ سے آشنا کرتا ہے۔ یہ نئی سمت تاریکی کے دنوں میں قرآن سے روشنی لینے سے نمودار ہوئی ہے۔ "لمحے" کے آخری مضمون "لمحوں کی سوچ" میں مسعود مفتی ہمیں بتلاتے ہیں کہ ان کے ہاں تاریکی کی تین سطحیں ہیں۔ پہلی سطح ملت اسلامیہ کے اس تاریک ترین دور سے عبارت ہے جب آٹھ سو سال تک حکومت کرنے کے بعد مسلمان ہسپانیہ سے نابود ہو گئے۔ تاریکی کی دوسری سطح برعظیم کے مسلمانوں کے اُس تاریخی المیے سے عبارت ہے جسے سقوطِ ڈھاکہ کہتے ہیں اور جو سقوطِ غرناطہ سے عبرت نہ پکڑنے سے وقوع پذیر ہوا ہے۔ تاریکی کی تیسری سطح پاکستانی قوم کے ماضی و حال کے مصائب کی سطح ہے۔ "صدیوں پار" میں مسعود مفتی نے فن کارانہ چابکدستی اور پاکستانی طرزِ احساس کی بدولت تاریکی کی ان تینوں سطحوں کو یکجا کر دیا ہے۔

"صدیوں پار" میں بیت المکرم اور مسجدِ قرطبہ ..... ڈھاکہ اور غرناطہ .... ایک ہی تصویر کے دو رُخ نظر آتے ہیں اور ملتِ اسلامیہ کی تاریخ کی تہ در تہ تاریکی میں یادوں کی بجلی یوں رہ رہ کر لہراتی ہے کہ زمان و مکان کی حدود مٹ کر رہ جاتی ہیں۔ اور غرناطہ کے مسلمانوں اور ڈھاکہ کے مسلمانوں کی واردات ایک بن کر رہ جاتی ہے۔ یادوں کا ایک

---

[۱] "تہہ بار ے دورخ" کا دیباچہ۔

ورق الٹتا ہے تو "صدیوں پار" کا ۱۹۷۱ء کے المیے میں ۱۹۴۷ء کے فسادات کا عکس دیکھتا ہے :

"اسے یوں لگتا جیسے قرطبہ کی مسجد کا صحن اس پرانے گھر کا صحن ہے جہاں آدھ موئی آگ
اور پھیکی چاندنی میں وہ اپنے گھر والوں کی لاشیں دیکھ رہا ہے"

اور "معاً اسے یوں لگا کہ یہ بیت المکرم کے موذن کی آواز نہیں بلکہ قرطبہ کے موذن کی آواز ہے۔
... اور یہ آج نہیں بلکہ صدیوں بعد کا کل ہے ...."

یوں تو "ریزے" میں مشرقی پاکستان کی وہ تصویر اپنے بیشتر رنگوں کے ساتھ موجود ہے جس میں مشرقی پاکستان زوال اور فنا کے راستے پر تیزی سے گامزن ہے۔ ایک ایسا معاشرہ اپنے آخری سانسوں میں تڑپ رہا ہے جہاں زندگی گراں اور موت ارزاں ہے۔ جہاں کی فضا میں وہم پلتا ہے اور سیدھی سادی زندگیاں نفسیاتی اور جنسی امراض میں مبتلا ہو ہو کر حیوانیت اور بربریت کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ اس مریض اور شدید تشنج میں مبتلا معاشرے کی عکاسی فنی حسن اور گہری دردمندی کے ساتھ کی گئی ہے۔ فنی پختگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ "نیند" میں اگر "سیاہ حاشیے" کا منٹو یاد آتا ہے تو "تشنگی" "ٹھنڈا گوشت" کی یاد دلاتا ہے اور "جال" میں ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد" کا احمد ندیم قاسمی موجود ہے۔ سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی کا ذکر مسعود مفتی کے فنی اعجاز کے ثبوت کے طور پر آیا ہے نہ کہ فنی عجز کے باعث۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسعود مفتی نے اپنے فوری پیشروؤں سے اردو افسانے کی روایت سے وہ سب کچھ سیکھا ہے جو کسی بھی ایسے فن کار کے لیے سیکھنا ضروری ہے جس نے فن کی شاہراہ پر دور تک جانا ہو مگر فنی چابک دستی کے اس سارے قابلِ رشک ساز و سامان کے بعد مجھے "ریزے" کا وہ طرزِ احساس دلفریب معلوم ہوا ہے جو "صدیوں پار" میں اپنی رعنائیوں سمیت جلوہ گر ہے اور جو مسعود مفتی کو آہستہ آہستہ اس طرزِ احساس سے قریب تر لا رہا ہے جو انتظار حسین کی خاص عطا ہے اور جس کی بدولت "صدیوں پار" کے مطالعے کے دوران انتظار حسین کا افسانہ "وہ جو کھوئے گئے" بار بار یاد آتا ہے۔

"تب زخمی سر والا تلخ اور افسردہ ہنسی ہنسی میں اکھڑ چکا ہوں۔ اب میرے لیے یہ یاد رکھنے
سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں غرناطہ سے نکلا ہوں یا جہاں آباد سے نکلا ہوں یا بیت المقدس
سے اور یا کشمیر سے .... کہتے کہتے وہ رکا۔
زخمی سر والے کی اس بات سے سب عجب طرح متاثر ہوئے کہ چپ سے ہو گئے مگر باریش
آدمی آبدیدہ ہوا اور یہ کلام زبان پر لایا کہ ہم اپنا سب کچھ تو چھوڑ آئے ہیں مگر کیا ہم اپنی
یادیں بھی چھوڑ آئے ہیں؟"

(وہ جو کھوئے گئے)

مسعود مفتی بھی ان یادوں کی بازیافت کے سفر پر نکل پڑے ہیں جو ہمیں ڈھاکے اور کشمیر کے مظالم کو دلی اور فلسطین اور غرناطہ کے مظالم سے ملا کر سمجھنے کا طرزِ احساس بخشتی ہیں، جن یادوں کو اپنے خواب و خیال میں بسا کر اسلامیانِ ہند نے تحریکِ پاکستان کا آغاز کیا تھا اور جن یادوں کو گواہ بنا کر بسترِ مرگ پر بے چین اقبال نے قائد اعظم کو لکھا تھا کہ اگر پاکستان نہ

بنا تو برصغیر میں غرناطہ اور فلسطین کی داستان دہرائے جانے کا امکان ہے۔ مسعود مفتی صدیوں پار جھانکتے ہوتے ہم سے پوچھتے ہیں کہ پاکستان بن جانے کے باوجود ۱۹۷۱ء میں ہمارے ہاں غرناطہ کی داستان کیوں دہرائی گئی ــــ؟ . . . . شاید اس لیے کہ پاکستان آتے ہوئے ہم اپنی یادیں برٹش انڈیا ہی میں چھوڑ آئے تھے!

(۴)

سوزِ وطن احمد ندیم قاسمی کی صد رنگ شعری شخصیت کا صرف ایک رنگ ہے۔ یہ رنگ گہری، سچی اور رچی ہوئی پاکستانیت کا رنگ ہے۔ اس رنگ کی چھوٹ شعری شخصیت کے باقی ماندہ رنگوں پر کچھ یوں پڑ رہی ہے جیسے تمام تر رنگ اسی ایک رنگ کے گوناگوں عکس ہوں۔ یہ رنگ ستمبر ۱۹۶۵ء سے مسلسل گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس کے زیرِ اثر ندیم کی شعری شخصیت روز بروز دلنواز سے دلنواز تر ہوتی جا رہی ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کی خونی رات کو یہ رنگ خون کے رنگ میں بدل گیا تھا اور ندیم کی سی صلابتِ کردار کا مالک اور ندیم کی سی توانا رجائیت کا حامل شاعر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا:

آ، میری جلد اتار کے اپنے سارے زخم رفو کر لے
جب تک اے ماں!
اے میرے جیسے کتنے کروڑوں کی باعزت، باعظمت،
باعصمت ماں!
تیرے داماں دریدہ کو میں آبِ سرشکِ غیرت وغم میں دھوتا ہوں
میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن
میں روتا ہوں

یہ نظم ندیم نے ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شب سقوطِ ڈھاکہ کی خبر سنتے ہی کہی اور پھر ایک مدت تک ندیم اپنی ہر نظم اور ہر غزل میں کبھی قائداعظم کو مخاطب کر کے اور کبھی ارضِ پاک کو پکار کر اور کبھی ہم وطنوں کو یاد کر کے روتے رہے۔ "قائداعظم کے نام" "پتلی" "سقوط ڈھاکہ کے بعد" اور "باقی ہے" کے ساتھ ساتھ غزل کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لخت لخت چہروں کو آئینوں میں کیا دیکھیں
آؤ اپنے بارے میں، اپنے ذہن سے سوچیں!
اے جمالِ آزادی، اے غزالِ آزادی!
ہم کہ خاک بر سر ہیں، تیرا ساتھ کیسے دیں!
وہ جو شعلہ پیکر تھے، بجلیوں کے ہم سر تھے
اپنی آگ سے ڈر کر، اپنی راکھ سے کھیلیں!

تاج گر بھی جلتے ہیں، تاج محل بھی جلتے ہیں
تاج ڈھونڈنے والے پہلے اپنے سر ڈھونڈیں!
کیا خبر تھی یہ زمانے بھی ہیں آنے والے
سوتے رہ جائیں گے سوتوں کو جگانے والے
سربرآوردہ ہیں اس وقت ترے ہجو نگار
سر بزانو ہیں قصیدے ترے گانے والے

احمد ندیم قاسمی کے ہاں سقوطِ ڈھاکہ کے المیہ پر غم کی شدت اور اچانک پن کا احساس اس بات کا غماز ہے کہ وہ پاکستان سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔ ورنہ اس المیے کا سایہ تو برسوں پہلے ان کے فکر کی پرچھائیوں میں تحلیل ہونے لگا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے ہاں قومی احساس کے بتدریج زوال کا جیسا جیتا جاگتا شعور ندیم کی شاعری میں کارفرما ہے۔ وہ اور کہیں نظر نہیں آتا۔ ۱۹۵۲ء میں ہی اپنی نظم "غمِ وطن" میں ندیم نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ۔

جس کے دانتوں میں مری قوم کے ریشے ہیں ابھی
وہی سفاک مرے دیس کا ہمدم کیوں ہو؟!

اس کے جواب میں سیاست سے محبت کا چلن مانگنے والے اس شاعر کو تو پابندِ سلاسل کر کے زندان میں ڈال دیا گیا اور ہمدمی کی بجائے مغربی سامراج کی زیردستی اور چاکری کی روش اپنالی گئی۔ چنانچہ ہماری قومی انانت نئے جرکوں سے مجروح ہوتی چلی گئی اور ہمارا قومی احساس تیزی سے زوال کرتا چلا گیا۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارتی جارحیت نے ہمارے قومی وجود کو پھر سے رعنائی بخشی اور ہمارا قومی احساس ماضی کی زندہ قوت کے شعور اور مستقبل کے تابناک امکانات کے ادراک سے از سر نو زندہ ہوا۔ قومی احساس کی بیداری کا یہ وقفہ مختصر اعلان تاشقند پہ تمام ہوا۔ ہمارے حکمران طبقہ نے روسی اور امریکی شرائط پر بھارت کی بالادستی قبول کرنے کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے کے عزم باندھے نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ نے پاکستان اور بھارت کی کنفیڈریشن کی بھارتی اور روسی تجویزوں کی وکالت شروع کر دی پاکستان اور بھارت کے مشترکہ دفاع اور مشترکہ اقتصادی منصوبوں کے سبز باغوں کی خاطر بھارت سے تمام تر اختلافات کو بالائے طاق رکھ دینے کے مشورے لے کر رائے عامہ کے رہنما ہمارے ہاں آنے جانے لگے۔ معرکۂ ستمبر میں مسلح تصادم کی پالیسی کے ناکام ہونے کے بعد تصادم کی بجائے تعاون کا وہ ہاتھ آگے بڑھا، جس کی آستینوں میں چھپے ہوئے خنجر کچھ ایسے چھپے ہوئے بھی نہ تھے۔ جذبۂ تاشقند اور امریکی دباؤ کے زیر اثر بھارت سے تعاون کے فوائد گنوائے جانے لگے۔ یہ فوائد بعینہٖ وہی تھے جو ۱۹۴۷ء سے پہلے متحدہ ہندوستان سے منسوب تھے۔ قیامِ پاکستان سے اسلامیانِ ہند نے جس استدلال کو رد کر دیا تھا۔ اس استدلال کی عمارت ایک مرتبہ پھر بلند ہونے لگی۔ مسلمہ حقائق پھر سے معرضِ شک میں ڈالے گئے۔ اس طرح کے مسائل پر ہنگامہ بحث گرم ہوا کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان میں ایک ریاست کا ذکر تھا یا دو ریاستوں کا۔ مسلمہ اور اساسی اصولوں کو متنازعہ فیہ اور فروعی اصول ثابت کریں گے اس عمل میں پاکستان کے حکمران طبقہ اور اس کے حاشیہ بردار دانشور سرگرم

ہوئے تو احمد ندیم قاسمی نے گہرے دکھ کے ساتھ کہا:

بُتوں کو آج سروں پر سجا کے نکلے لوگ
وہ دن گئے کہ چھپاتے تھے آستینوں میں

صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ
گٹھڑیاں سر پہ اٹھائے ہوئے ایمانوں کی!

بارشیں تو یاروں نے کب کی بیچ ڈالی ہیں
اب تو صرف غیرت کی راکھ ہے ہواؤں میں

بے وقار آزادی ہم غریب ملکوں کی!
سر پہ تاج رکھا ہے، بیڑیاں ہیں پاؤں میں

لوگ جو خاکِ وطن بیچ کے کھا جاتے ہیں
اپنے ہی قتل کا کرتے ہیں تماشا کیسے

خود اپنے ہی ریزے مری جھولی میں دھرے ہیں
اور لب پہ دعا ہے کہ کوئی شیشہ گر آئے!

خدا نہ کردہ کسی قوم پہ یہ وقت آئے!
کہ خواب دفن رہیں شاعروں کے سینے میں

اقبال اور قائدِ اعظم کے خواب پاکستانی عوام کے سینوں میں دفن رہے ہیں اور ہمارا حکمران طبقہ بھارت کے سامنے قدم بہ قدم پسپائی کی راہ پر گامزن رہا۔ نتیجہ یہ کہ قومی احساس کا زوال قومی احساس کے فقدان کا روپ دھار گیا۔ اس کربناک صورتِ حال کی بہترین مصوری ندیم کی نظم "صفر" اور "کھنڈر" میں موجود ہے:

"یہ میری تاریخ کا کھنڈر ہے
یہ میرے راہوارِ برق پیکر کی ہڈیاں ہیں
یہ میری تلوار ہے جو تنکا بنی پڑی ہے

یہ ڈھال ہے جس پہ پاؤں رکھ دو تو خشک پتے کے ٹوٹنے کی پکار سن لو
یہ میرے پرچم کی دھجیاں ہیں
یہ میری قدروں کی کرچیاں ہیں
یہ میرے معیار ہیں جو پتھر بنے پڑے ہیں
یہ میرے افکار ہیں جنہیں عنکبوت غم اپنے تانے بانے کی کھونٹیاں سی بنا لیا ہے۔
یہ ٹوٹتی چھت کو سالہا سال سے سنبھالے ہوئے جو اک ناتواں ستون
ایستادہ ہے
یہ مری انا ہے "

یہ ستمبر ۱۹۶۹ء کی نظم ہے۔ اس کے بعد "عشق کے امتحان" اور "نامناسب" میں طنزیہ لب و لہجہ اپنایا گیا ہے :

نہیں مہر ہو، یہ مناسب نہیں ہے
یہ تہذیب کی ایک ایسی نفی ہے
کہ تہذیبِ آئندہ کے پاس بھی
اس کے اثبات کا کوئی پہلو نہ ہوگا۔۔۔
اصولوں کی لاشوں کو
یوں دھوپ میں چھوڑ کر
آگے بڑھنا مناسب نہیں ہے
یہ ماضی کی سچائیاں ہیں
اگر حال اِن کی صداقت سے منکر ہوا ہے
اگر آج یہ بے حقیقت ہیں
بے مایہ ہیں
بے اثر ہیں
تو کیا تم بزرگوں کی میّت کی ذلّت گوارا کرو گے ؟"

مگر ہم اصولوں کی لاشوں کو دھوپ میں چھوڑ کر آگے بڑھتے چلے گئے اور پھر ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ایک دنیا نے دیکھا کہ ہم نے بزرگوں کی میت کی ذلّت گوارا کر لی۔ تب احمد ندیم قاسمی کے اندر بیٹھا ہوا رجائیت پسند ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ندیم اپنی ذاتی زندگی اور شاعری میں جی بھر کر روئے۔ رونے کے اس تخلیقی عمل نے انہیں اُن کی رجائیت پھر لوٹا دی اور "دوستو آؤ" اور "اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ" کی سی نظموں میں اپنے ہم وطنوں کو اپنے ذہنوں اور صحنوں سے فاتحہ خوانی کی صفیں لپیٹنے

اور ۱۹۷۱ء کی تباہی کے ملبے سے ایک نئے مستقبل کی تعمیر کی دعوت دینے لگے۔ محنت اور لگن سے جینے، باعزت سے مرجانے کی تلقین کرنے لگے۔ خود ندیم نے اسے بھوبل میں چنگاری ڈھونڈنے کے عمل کا نام دیا ہے۔

سقوطِ ڈھاکہ کے المیہ کے ردِ عمل کے طور پر احمد ندیم قاسمی آتشِ رفتہ کے سراغ میں نکلے تو ان کا روئے سخن خلقِ خدا کے ساتھ ساتھ خدا کی طرف بھی ہوگیا اگر انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو یوں مخاطب کیا:

جب سے ہم تقسیم ہوئے ہیں نسلوں اور زبانوں میں
حائل ہیں کتنے آئینے، آپس کی پہچانوں میں!

جب سے ایک چڑیا نے شیر کو پھاڑا ہے
فاختہ کی آنکھوں میں قاتلوں کے تیور ہیں!!

شانِ جمہور تو جب ہے کہ ہر انسان کہے
میرا حاکم مرا ہر حکم بجا لاتا ہے!

تو خدا کی بارگاہ میں یوں دست بدعا ہوئے:

یارب، میرے وطن کو اک ایسی بہار دے
جو سارے ایشیا کی فضا کو نکھار دے
یارب، وہ ابر بخش کہ جو ارضِ پاک کو!
حدِ نظر تک اُڈتے ہوئے سبزہ زار دے
یہ خطۂ زمین معنون ہے تیرے نام
دے اس کو اپنی رحمتیں اور بے شمار دے

وطن دولخت ہوا تو ندیم کی وطن سے محبت میں نئی گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی۔ اب ارضِ وطن کی جگہ ارضِ پاک نے لے لی۔ ارضِ پاک جو سرزمین پاکستان اور تصورِ پاکستان کی یک جائی کا پیکر محسوس ہے جو خطۂ زمین بھی ہے اور ہمارے اجداد کے خوابوں کی سرزمین بھی۔ ان اجداد کے خوابوں کی سرزمین جو عزت کے ساتھ جینے کا فن بھی جانتے تھے اور غیرت کے ساتھ مرجانے کی ادا بھی۔ جنہوں نے تعداد میں کم ہونے اور ہر طرح کی بے سروسامانی کے باوجود اس ہندو اکثریت کے اکھنڈ بھارت کے خواب کو مٹی میں ملا دیا تھا۔ جس کا سب سے بڑا پشت پناہ برطانوی سامراج تھا۔ برطانوی سامراج روسی اشتراکیت کے ممکنہ پھیلاؤ کو روکنے کی خاطر ہندوستان کو متحد رکھنا چاہتا تھا اور مسلمانوں کے مطالبۂ تقسیمِ ہند سے خائف تھا۔ مغربی سامراج اور ہندو اکثریت کی متحدہ طاقت کو ہمارے اجداد نے صرف اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کر کے بے اثر بنا دیا تھا مگر قیامِ پاکستان کے بعد رفتہ رفتہ ہم خود انحصاری کی یہ روش ترک کرتے

چلے گئے ۔ ۱۹۵۴ء میں مغربی طاقتوں کے ساتھ احمقانہ دفاعی معاہدوں میں جکڑے جانے کے بعد ہم نے غیر ملکی امداد و اعانت پر انحصار کرنا شروع کر دیا۔ ہم احمقوں کی اس جنت میں جا بسے جس سے نکلنے کی سب سے پہلی ترغیب چھ ستمبر کی بھارتی جارحیت نے دلائی۔ چھ ستمبر کو ہم پر یہ حقیقت طلوع ہوئی کہ مغربی سامراج ہماری لڑائی لڑنے پر آمادہ نہیں ہے۔ سو اپنے جھگڑے ہمیں خود چکانے ہوں گے۔

خود انحصاری اور خود مختاری کا یہ احساس اعلانِ تاشقند کی بھینٹ چڑھا تو ندیم نے اپنے تخلیقی عمل سے چھ ستمبر کے طرزِ احساس کو زندہ رکھنے کی تابناک جدوجہد جاری رکھی۔ جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کی شکست میں روس کے رویے سے متاثر ہو کر ندیم نے جو نظم کہی ہے وہ ستمبر کے اسی طرزِ احساس کی علمبردار ہے ندیم ان دیدہ وروں کو اس المیے کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو روس اور چین سے انقلاب درآمد کرنے کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں:

"اب کہاں جاؤ گے لے دیدہ ورو ؟
اب تو اُس سمت بھی ظلمت ہے، جہاں شب کے الاؤ میں نہا کر مرے سورج کو نکلنا تھا
گجر بجنے تھے
اب تو مشرق پہ بھی مغرب کا گماں ہوتا ہے
اب تجھے جب ذکر کرو نورِ سحر کا تو بلک اٹھتی ہے دنیا
کہ کہاں ہوتا ہے ؟"

(روشنی کی تلاش)

ندیم کے نزدیک جون کی جنگ میں عربوں کی جدوجہد سے روس کی بے اعتنائی میں جو زریں سبق پوشیدہ ہے وہ خود انحصاری ہی کا سبق ہے:

"صرف اک سمت کے ماتھے پہ لرزتی ہے اجالے کی لکیر
اور یہ سمت گزرتی ہے ہمارے ہی گھروں اور ہمارے ہی دلوں سے
یہ ہے وہ سمت کہ جس پر میرے ٹیپو کے نقوشِ کفِ پا
چاند تاروں کی طرح روشن ہیں
اور اس سمت سفر کرنے کی یہ شرط ہے
ہم ظلمتِ مغرب کو بتا دیں
کہ ہمیں صبح کے وارث ہیں
کہ ہم مشرق ہیں"

(روشنی کی تلاش)

کون نہیں جانتا کہ ٹیپو سلطان کے نقوشِ کفِ پا تو ہم سے غیرت کے ساتھ زندہ رہنے یا پھر عزت کے ساتھ

مرجانے کا تقاضا کرتے ہیں ۔ ؟

" مجھے تلاش کرو" اور "نفی" میں ندیم کا المیہ یہ ہے کہ عزت کی زندگی اور غیرت کی موت کی قدر یہ سے ان کے معاشرے کا ایمان اٹھ چکا ہے :

" ہم اپنے آپ کو جھٹلا رہے ہیں۔
اور سمجھتے ہیں
ہمارے دم سے سچ کا بول بالا ہے
سبھی شمعیں بجھاتے جا رہے ہیں
اور کہتے ہیں
ہمارے بعد اجالا ہی اجالا ہے

(نفی) ۔

ستم بالائے ستم یہ کہ ہم نے اپنے آپ کو جھٹلانے اور اپنی تہذیبی قدروں کو مٹانے کا نام تہذیب رکھ چھوڑا ہے :

مجھے کل مرا ایک ساتھی ملا
جس نے یہ راز کھولا

کہ .... " اب جذبہ و شوق کی وحشتوں کے زمانے گئے۔" پھر وہ آہستہ آہستہ ..... چاروں طرف دیکھتا مجھ سے کہنے لگا :

"اب بساطِ محبت لپیٹو
جہاں سے بھی مل جائے دولت .... سمیٹو
غرض کچھ تو تہذیب سیکھو۔"

(مہذب)

یہ بات معنی خیز ہے کہ یہ نظم ستمبر ۱۹۶۶ء میں کہی گئی تھی اور ستمبر ۱۹۶۶ء تک پہنچتے پہنچتے ہم نے چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کے غازیوں اور شہیدوں کو یاد کرنا ترک کر دیا تھا۔ اس نظم کو ستمبر ۶۶ ۱۹ء ہی کی ایک اور نظم " انفصال " کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو شاعر کا نقطۂ نظر پوری معنویت کے ساتھ آشکار ہو جاتا ہے :

" دوستو !
تم تو کندھوں سے اوپر نظر ہی نہیں آ رہے ہو
چلو
اپنے چہرے ندامت کی الماریوں سے نکالو
انہیں جھاڑ کر گردنوں پر رکھو

تم ادھورے نہیں ہو تو پورے دکھائی تو دو"

یہ ایک منافق، زر پرست اور بے چہرہ معاشرے میں سانس لینے والے غریب و غیور مگر سر بلند شاعر کا نقطۂ نظر ہے ایک ایسے شاعر کا نقطۂ نظر جس کی تخلیقی شخصیت کا جزو اعظم ارضِ پاک کی مٹی کی خوشبو ہے اور جو اپنے بے زبان وطن کی بے بسی اور کربِ مسلسل پا کر خدا سے یوں التجا کرتا ہے :

سلسلے بند بھی کر ہول بھری راتوں کے
گنگ ہونے لگے الفاظ مناجاتوں کے

تو اہل وطن سے یوں مخاطب ہوتا ہے :

برف کے مینار پر بیٹھے ہوئے ہیں رہنما
اور بنیادوں میں جاری ہے پگھلنے کا عمل
اس بلندی پر بھی ہیں سورج سے کتنے بے نیاز
ڈالتا ہے برف کے پیکر میں جو سوزِ خلل
ان بزرگوں کو یہ منظر کیوں نظر آتا نہیں
ایک سیلِ آب میں محصور ہیں دشت و جبل
کھا گئی جب دھوپ بنیادوں کی برفانی سلیں
کون ان کو تھامنے آئے گا جز دستِ اجل

(برفانی چوٹی پر)

"ایک بیل سے" "جی چاہتا ہے کہ مسکراؤں" اور "ایک فرد ایک تاریخ" کی سی نظموں کے ساتھ اس دور کی غزلوں میں بھی ایک انقلابی شعور کے ساتھ سوزِ وطن کی کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے۔ ندیم کے اب تک آخری مجموعۂ کلام "دوام" کا کوئی بھی قاری اس حقیقت سے انکار نہ کر سکے گا کہ ندیم کی خالص عشقیہ شاعری میں بھی سوزِ وطن ایک زیریں رو کی طرح جاری و ساری ہے اور یوں محسوس ہے جیسے پاکستان کی بقا و خوشحالی اور خود مختاری ندیم کی ذاتی بقا اور اپنے جذباتی استحکام ہی کا دوسرا نام ہو جیسے ندیم خود پاکستان ہو اور اس کے اندر اپنی بنیادوں کو پگھلنے سے بچانے کی جنگ برپا ہو۔

ریڈیو پر ایک قیدی (نظم)

مجید امجد

ریڈیو پر اک قیدی مجھ سے کہتا ہے "میں سلامت ہوں، سُنتے ہو،
میں زندہ ہوں!"

بھائی تو یہ کِس سے مخاطب ہے ... ...
ہم کب زندہ ہیں
ہم تو اپنی اس چمکیلی زندگی کے لئے تیری مقدس زندگی کا یوں سودا کر کے
کب کے مر بھی چُکے

ہم اس قبرستان میں ہیں ... .
ہم اب اپنی ان قبروں سے باہر بھی نہیں جھانکتے
ہم کیا جانیں کس حد تک ان پر، باہر، تیری دُکھی پکاروں کے یہ ماتمی
دیئے روشن ہیں
جن کے اُجالوں میں اب دنیا اِن لوحوں پر ہمارے ناموں کی پہچان رہی ہے

تنکے (رپورتاژ)٭

مسعود مفتی

معصوم فضا . . . . اداسس رات . . . . ویران سڑک

ہمارے ٹرک رینگ رہے تھے . جیسے موہوم مقدر کی ان جانی لکیر پہ چلنے سے جھجک رہے ہوں . . . .

یہ جھجک اور ہچکچاہٹ ہر طرف تھی ۔ہم اپنی پابجولان حالت تسلیم کرنے سے جھجک رہے تھے۔ ہماری آنکھیں ردں کی طرف دیکھنے میں جھجک رہی تھیں ۔ ڈھاکہ کے در و دیوار ہمیں پہچاننے سے جھجک رہے تھے ۔ اور وقت اتنا بھاری ہا تھا۔ جیسے ہر لمحہ اگلے لمحے کو جگہ دینے کے لیے سرکنے سے جھجک رہا ہو ۔

قوم کی شکست تیں دن پہلے ہو چکی تھی ۔ فرد کی ریخت اب ہو رہی تھی ۔ تواریخی واقعہ ختم ہو چکا تھا ۔نفسیاتی تے شروع ہو رہے تھے ۔ واردات جاری تھی ۔ مگر اس کا روپ بدلنے لگا تھا ۔

ہم برق سے حاصل تک آ گئے تھے ۔

جب برق گرنے لگی تھی تو ہم نے ہوٹل انٹر کانٹیننٹل کے غیر جانبدار علاقے میں پناہ ڈھونڈی اس کبوتر کی طرح جو بلی کو کر آنکھیں بند کر لیتا ہے ۔ مگر جب آنکھ کھولی تو حاصل یہ تھا کہ ہوٹل کے باہر عناصر کی ترتیب الٹ چکی تھی ہم آزادانہ گئے تھے ۔ اسیرانہ باہر آئے ۔ باہر کی مٹی اب مادر وطن نہ تھی ۔ بلکہ کوچۂ رقیب تھی اس کا ہر ذرہ قتل تیغ آبدار تھا ۔ ا کہ اب پاکستان کا شہر نہ تھا ۔ بلکہ پاکستان کا کتبہ تھا ۔ ہم اب سرکاری کارندے نہ تھے ۔ بلکہ سرکاری ملبے کے خس و خاشاک ۔ جس جان کو بچانے کے لیے ہم نے پناہ ڈھونڈی تھی ۔ وہی جان اب ننگ وجود تھی کیونکہ ایک نئے عہد کے آغاز میں رانے عہد کی تقصیریں بن کر سوئے دار جا رہے تھے ۔

ہمارے ٹرک رینگ رہے تھے ۔

جنگی قیدیوں کے ٹرک . . . . اڑھائی تین سو غیر مسلح شہری ، جن کا جنگ میں کوئی حصہ نہ تھا ۔ سوائے دعاؤں ، روں اور مایوسیوں کے ۔ مگر وہ پھر بھی جنگی قیدی بنا لیے گئے تھے ۔ میدان جنگ کی تعزیرات میں اگر مفتوح کی قضا میں ، کی رضا ہے تو وہی انصاف بن جاتا ہے ۔ تلوار کا قانون قلم کے قانون سے مختلف ہے ۔ قلم کا قانون خطا کار کی خطا کو دیکھتا ۔ تلوار کا قانون فاتح کی انا کو دیکھتا ہے اس انا کی مصلحت یہ تھی کہ غیر فوجیوں ، عورتوں اور بچوں کو جنگی قیدی بنا یا جائے

٭ زیر ترتیب رپورتاژ " تنکے " کے چند اوراق

چنانچہ تین سو کے قریب بچے بوڑھے عورتیں اور جوان اس انصاف کی پلیٹ میں تھے۔ وہ آٹھ دس ٹرکوں میں ٹھسا ٹھ بھرے ہوئے تھے۔ بے سروسامانی کے سامان میں دھنسے ہوئے۔ سوٹ کیسوں میں پاؤں پھنسائے ہوئے۔ صندوقوں ٹیک لگائے ہوئے ٹرک کی جھولتی دیواروں کا سہارا ڈھونڈتے ہوئے۔ ڈولتے جسموں کا توازن سنبھالتے ہوئے۔

مرد خاموش تھے۔ عورتیں سہمی ہوئی تھیں۔ بچے سن تھے۔ . . . ان کے ذہن بے سوچ تھے مگر بے سوال نہ تھے۔ سوچوں کی چڑیاں پگھل کر سوالیہ نشانوں میں ڈھل گئی تھیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ؟؟؟ یہ سوالیہ نشان خاموشیوں میں اس شدت سے پیوست تھا کہ ہم آسمان کے سامنے پھیلے ہوئے کشکول کی طرح مجسم سوال بن گئے تھے

رینگتے ہوئے ٹرکوں میں چہروں کے نقوش بھی رینگ رہے تھے۔ بجلی کا کھمبا قریب آتا تو چہروں پر سائے اور روشنیاں ابھرنے لگتیں۔ بعض حصے جتنے روشن ہوتے۔ دوسرے حصے اتنے ہی تاریک ہوتے۔ اس دھوپ چھاؤں پر سے بھی وہ سوال جھانک رہا ہوتا۔ حتیٰ کہ کھمبا گذر جاتا اور سوال تاریکیوں میں بھٹکنے لگتا۔

سولہ دسمبر کو پاکستان نے ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالے تھے۔ اس وقت ہم ریڈ کراس کے غیر جانبدار علاقے (ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل) میں پناہ گزین تھے۔ دوپہر تک ہندوستانی فوج وہاں پہنچ گئی اور ہم ان کے رحم و کرم پر ہو گئے۔ دو دن بعد بتایا گیا کہ ہم جنگی قیدی ہیں اور آج پو پھٹنے سے پہلے سحری کی تاریکی ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹرک میں ڈالا گیا اور اب چھاؤنی کی طرف جا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد انیس دسمبر کا سورج نکلنے والا تھا۔

آج سے سات ماہ پہلے بھی میں اس سڑک پر سے گزرا تھا۔ . . . مگر کتنے مختلف انداز میں۔ وہ چوبیس مئی ۱۹۷۱ء کا دن تھا۔ جب میں لاہور سے تبدیل ہو کر ڈھاکہ پہنچا۔ اس وقت سنسر شپ کی وجہ سے خبروں کے ذرائع بھی بے خبر تھے۔ خبروں کی خواہش بے بس تھی اور خبروں کا نتیجہ بے یقینی تھا۔ اس نئے ڈھاکہ کا پہلا نظارہ ان تمام خبروں سے زیادہ اہم تھا جو ہمیں لاہور میں ملتی رہتی تھیں۔ وہاں ہم سنتے تھے پچیس مارچ کی فوجی کارروائی کے بعد اور مجیب کی گرفتاری کے بعد حالات معمول پر آ گئے تھے۔ مگر سہ پہر کے وقت سڑک کی ویرانی رنگ دیگر دکھا رہی تھی۔ اور سہمے ہوئے راہگیروں کے محتاط انداز کسی اندرونی خرابی کی چغلی کھا رہے تھے۔

وطن کے اس ٹکڑے پر مشکل وقت پڑا تھا اور مشیت نے مجھے بطور کارکن وہاں بھیجا تھا۔ اپنے کارساز سے کامیابی کی دعا کرتے ہوئے میں تعمیری کام کرنے کی خواہش سے شرابور تھا اس دن اس سڑک پر پہلی دفعہ گزرتے ہوئے میرے ساتھ ہمت بھی تھی۔ دعا بھی اور امید بھی۔

مگر آج سات ماہ بعد جب میں اس سڑک سے آخری بار گذر رہا تھا تو ہمت ریزہ ریزہ تھی ناامیدی گھمبیر تھی۔ دعا مفلوج تھی اور میں پابجولاں قیدی تھا۔ یہ سڑک اب ارض وطن کا حصہ نہ تھی۔ بلکہ اجنبی مٹی تھی اور ہمارے بدترین دشمن کے لیے آغوش مادر کی طرح وا تھی۔

ٹرک آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ رات کے پچھلے پہر میں ان کی گھوں گھوں چاروں طرف گونج رہی تھی۔ ویران ماحول

میں کوئی ذی روح نہ تھا۔گلیوں کے آوارہ کتے بھی نظر نہ آتے تھے۔ ادھیڑ دل اجالوں میں جھانکنے والے اینٹ روڑے پتھر، دکانیں، مکانات خاموش اجنبی بنے تھے۔قافلے کا شور سن کر کوئی کھڑکی نہ کھلی۔ نہ کسی چہرے نے جھانکا۔ نہ کوئی بچہ بھاگ کر گلی سے نکلا۔ بند دریچے، سخت دیواریں، اور ساکت درخت الوداع کہنے سے بھی انکاری تھے۔ ہر شے ہم سے قطع تعلق کیے ہوئے لگتی تھی۔ حتیٰ کہ پچھلی رات کی خنکی بھی گویا قدرت کی سرد مہری تھی۔ ہر چیز مانوس ہوتے ہوئے بھی غیر مانوس سی تھی۔

اس بیگانگی کے ساتھ ساتھ دل میں ایک ٹیس تھی کہ ہم قیدی ہیں۔اس ٹیس کی شدت سے دل اور دماغ مسلے جا رہے تھے۔شعور اور لاشعور دونوں بیک وقت جھنجھنا رہے تھے۔ اسی لیے اس احساس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ زندگی میں غالباً پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جسم کا رواں رواں دل گرفتہ بن جائے اور کسی احساس سے لمحہ بھر کو بھی چھٹکارا نہ پایا جا سکے اس لیے ہم اپنے آپ اس سے کہیں زیادہ بے سہارا اور بے یار و مددگار محسوس کر رہے تھے۔ جتنے کہ فی الحقیقت تھے۔

مگر یہ احساس ایک عجیب تضاد کا شکار تھا۔ پاکستان کی شکست کے بعد ہم بے سہارا تھے۔ اس لیے قیدی بنے۔ مگر قیدی بن کر یہ سہارا ملا۔ کہ مکتی باہنی کے ہاتھوں ذبح ہونے سے بچ گئے۔

خدا شرے برانگیزد کہ خیرے ما دران باشد

قدیم داستانوں میں بعض باریک بین کردار کسی واقعے کو دیکھ کر بیک وقت ہنستے بھی تھے اور روتے بھی تھے۔ کچھ ایسا ہی حال ہمارا بھی تھا۔ کبھی تشکر، کبھی تشویش، مگر تشویش زیادہ اور اس میں سے ابلتے ہوئے لاوے کی طرح احساس ذلت کہ جس دشمن کو ہم نے ہمیشہ حقیر جانا۔ وہ ایک فاتح کی حیثیت سے ہمیں گرفتار کر کے لے جا رہا ہے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہ سہی۔ مگر آگے پیچھے بندوقوں کے حلقے تھے اور دل و دماغ پر شکست کے تازیانے تھے۔ ان دونوں کی ذلت ہتھکڑیوں سے کم نہ تھی۔ ویسے بھی اندر کی ملامت باہر کے دشنام سے زیادہ کاٹ رکھتی ہے۔

ٹرک آگے بڑھے۔ تو میرے اندر تلاطم سے اٹھنے لگے۔ سوچیں اور جذبات اتھل پتھل تھے کیونکہ خاموش اور گنگ در و دیوار اب بولنے لگ گئے ہیں۔ سڑک کے اینٹ، پتھر، روڑے اور عمارتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں سرگوشیاں کرتی تھیں۔ اور سڑکوں کی گھورگھور میں کئی یادوں کی بازگشت گونجنے لگی۔

ماضی کے لمحے چہرے کے تل کی طرح ان دیواروں پر چپکے ہوئے تھے اور پس نظری ان کے وہ رنگ دکھا رہی تھی۔ جو گذشتہ دنوں میں ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔ یہ کئی رنگ تھے۔ حماقت کے رنگ، سازش کے رنگ، غداری کے رنگ بے بسی اور بے چارگی کے رنگ۔ یہ رنگ کہیں انسانی تقصیر نے بھرے تھے۔ کہیں خدائی تقدیر نے۔ جو ان دنوں ہماری قوم کی مجموعی نظر سے اوجھل تھے۔ مگر اب وقت کی بیاض میں ساری قوموں کے لیے عبرت بن کر شامل ہو گئے تھے۔

حال بہت مختصر اور بہت مستور ہوتا ہے۔ وقت کا قطرہ بن کر یہ لمحہ بھر کو آنکھ کی پتلی کے سامنے رہتا ہے اور پھر نیچے ٹپک کر ماضی کے سمندر میں مل جاتا ہے۔ اس فنا کے بعد ہی یہ بے نقاب ہوتا ہے اور حقیقت کا اندازہ تبھی ہوتا ہے۔ جب وہی آنکھ واپس مڑ کر اس کی اصل شکل دیکھتی ہے۔

آج میں اردگرد چھپے ہوئے ماضی کے لمحوں کی اصل شکل دیکھ رہا تھا۔ کل کا مورخ بھی انہیں دیکھے گا، اور سقوط ڈھاکہ کے اسباب کے طور پر اپنی کتابوں میں منتقل کر دے گا۔ مگر اس وقت میں کسی تجزیے کے قابل نہیں اور فی الحال یہ لمحے میرے اندر فقط یادوں کے طوفان اٹھا رہے ہیں ۔

چاروں طرف سناٹا ۔۔۔۔ دشمن کے ٹرکوں کی فاتحانہ گھور گھور ۔۔۔ اور پچھلے آٹھ ماہ کی یادوں کی یلغار ۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ ہوٹل سے تھوڑی ہی دور ہم ایک کوٹھی کے سامنے سے گزرے۔ جس کے آہنی دروازے بند تھے اور گیٹ کے ایک ستون پر ریڈ کراس کا نشان تھا۔ یہ ایک ڈاکٹر کی رہائش گاہ تھی۔ چھوٹے سے قد کا بوڑھا ڈاکٹر بڑا ہی پکا پاکستانی تھا جس نے اپنے ڈرائینگ روم میں قائداعظم کی بڑی سی تصویر بہت نمایاں انداز میں لگائی تھی ۔ وہ جون کے مہینے میں میرے دفتر میں ملا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگا ۔

"میں عام طور پر افسروں سے ملنے نہیں جایا کرتا۔ مگر جب یہ سنا کہ مغربی پاکستان کے افسروں کا ایک گروپ آیا ہے تو اب میں فرداً فرداً ان سے مل رہا ہوں ۔۔۔۔ اپنے فائدے کے لیے نہیں بلکہ ان کو اعتماد دلانے کے لیے کہ یہاں ان کے دوست بھی ہیں میر ــ سے یہ آپ اپنی پوری تسلی کرلیں ۔ پہلے ماضی کی تفتیش کریں اور پھر مستقبل میں مجھے کھلے ذہن سے جانچیں !"

اس کی یہ پیشکش بلا وجہ نہ تھی۔ ان دنوں مشرقی پاکستان تشکوک اور شبہات کی گری تھا ۔ انسانی رشتوں کی مٹھاس ایسے سوکھ گئی تھی ۔ جیسے باسی گلاب جامنوں اور جلیبیوں کا شیرہ سوکھ جاتا ہے۔ ملنے والے ایک دوسرے کا چہرہ پہچاننے کی کوشش کرتے تھے اور پہچان سبا اوقات اپنے وسوسوں کی عینک سے ہوتی تھی جس میں سے بے عیب چہرہ بھی برے رنگوں میں لتھڑا نظر آتا۔ آنکھوں والے اپنی نظر کو بالکل اندھے کی لاٹھی کی طرح گھما کر ٹٹولتے تھے کہ ملنے والا دوست ہے یا دشمن ۔

اس کے باوجود میں ڈاکٹر کی بات میں خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور جب چند دن بعد اس کی دعوت پر اس کے گھر گیا تو یقین ہو گیا کہ وہ پکا محب وطن تھا۔ عام بنگالیوں کی طرح وہ حالات حاضرہ پر بات کرنے سے کتراتا نہ تھا بلکہ مدلل تجزیہ کرتا تھا۔ وہ افسوس سے کہنے لگا ۔

"ہماری بدقسمتی کا آغاز تو اسی دن ہو گیا تھا۔ جب یہ فیصلہ ہوا کہ مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے افسروں کی تعیناتی نہیں ہوگی ۔ اب تو ہم اس فصل کو کاٹ رہے ہیں جو اس فیصلے نے بوئی تھی ۔"

قائداعظم کی تصویر کو بڑی جذباتی وابستگی سے دیکھ کر وہ کہنے لگا۔ "میں نے اس تصویر کو اپنے ڈرائنگ روم میں اس لیے لٹکایا ہے کہ اس لیڈر کی وجہ سے مسلمانوں کو ڈرائنگ روم نصیب ہوئے ورنہ تو ہندوؤں نے ہمیں مسلسل جھونپڑا نشین بنایا ہوا تھا ۔"

میں ڈاکٹر سے ملتا رہا۔ وہ میرے پاس سرکٹ ہاؤس آتا تو دیر تک باتیں کرتا رہتا۔ ہر ملاقات میں گرمجوشی کا دھیما دھیما احساس ہوتا۔ اس احتیاط کی ضرورت کبھی نہ پیش آئی۔ جو عام بنگالیوں سے ملاقات کے دوران دونوں طرف سے ظاہر ہوتی تھی۔ بلکہ ڈاکٹر تو دوسرے بنگالیوں کی موجودگی میں بھی بہت کھل کر پاکستان کی حمایت میں بات کرتا تھا اور اپنے آپ کو پکا پاکستانی ظاہر کرتا تھا اسی وجہ سے ڈاکٹر سے مل کر نہ صرف خوشی ہوتی تھی بلکہ تقویت پہنچتی کہ ایسے بنگالیوں کے

جذبے اور یقین میں پاکستان کی بقا ہے ۔

رات کے سناٹے میں ٹرک دھیرے دھیرے چل رہے تھے اور جب ہمارا ٹرک ڈاکٹر کے مکان کے سامنے سے گزرا ۔ تو وہ مکان میرے ذہن میں ایک علامت بن کر ابھرا ۔ ہماری غلط روی کی علامت ۔ اس طرز عمل کی علامت ۔ جس کی وجہ سے ہم نے ڈاکٹر جیسے بنگالیوں کا اعتماد کھو دیا تھا ۔

خوش قسمتی سے ڈاکٹر جیسے لوگوں کی کمی نہ تھی اور بدقسمتی یہ تھی کہ وہ مسلسل مایوس ہوتے گئے ۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں پاکستانی فوج نے ڈھاکہ میں کارروائی کی اور پھر سارے مشرقی پاکستان میں پھیلنا شروع کیا ۔ کئی جگہ بنگالیوں نے ہنستے ناچتے اور مسرت سے بے تابو ہوتے ہوئے ان کا استقبال کیا ۔ مگر آٹھ ماہ بعد جب دسمبر میں ہندوستانی فوج انہی شہروں میں داخل ہوئی تو انہی لوگوں نے اسی طرح ہنستے ناچتے ہوئے ان کا استقبال کیا ۔

آٹھ نو ماہ میں یہ عظیم تبدیلی کیسے آئی ۔ ؟؟؟؟

اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ پچیس مارچ کی فوجی کارروائی میں شرپسندوں کے لیے گولی کی ضرورت تھی مگر بعدازاں امن پسندوں کے لیے سیاسی اور قانونی کارروائی کی ضرورت تھی ۔ مگر بدقسمتی سے پہلے مرحلے کے بعد دوسرا مرحلہ شروع نہ ہوسکا اور پاکستان کے حامی عناصر اپنا کردار ادا نہ کرسکے ۔

اگست کے مہینے میں ڈاکٹر مجھ سے کہہ رہا تھا ۔ ''میرا واسطہ سبھی قسم کے بنگالیوں سے ہے ۔ ان سے بھی جو حکومت کی مدد کرنا چاہتے ہیں ۔ مگر میں نے ان کو عموماً دل برداشتہ پایا ہے ۔''

اس دن میں نے ڈاکٹر کو مغموم دیکھا ۔ ۔ ۔ ۔ مگر وہ ابھی مایوس نہ تھا ۔

پھر مجھے عید کا دن یاد آیا ۔ بیس نومبر ۱۹۷۱ کی عیدالفطر کا دن ۔ جس دن بھارتی حملے کا خطرہ تھا اور ہماری فوج کو الرٹ (ALERT) کیا گیا تھا ۔ جس مسجد میں میں نماز پڑھنے گیا وہاں صفوں کے درمیان جوتیوں کے ساتھ ساتھ سٹین گن اور برین گن بھی پڑی ہوئی تھیں ۔ شہر بھر میں بے رونقی تھی ۔ جیسے کسی چہرے کا غازہ اڑ گیا ہو اور وہ فرط خوف سے فق ہو رہا ہو آسمان پر جیٹ ہوائی جہاز مسلسل اڑ رہے تھے اور لوگ تین روز پہلے کے کرفیو اور گرفتاریوں سے سہمے ہوئے تھے سرکٹ ہاؤس کے اردگرد جتنی سڑکیں تھیں ان پر نہ تو اجلے رنگین کپڑوں والے خوش و خرم بچے نظر آئے نہ غباروں اور کھلونوں کے خوانچے دکھائی دیئے ۔ میرے قریباً سبھی ساتھی مغربی پاکستان گئے ہوئے تھے اور میں کافی دیر کمرے میں بور ہونے کے بعد ڈاکٹر سے ملنے چلا گیا ۔

ڈاکٹر کے ڈرائینگ روم میں کئی بنگالی مرد اور عورتیں بیٹھے ہوئے تھے ۔ جو عید ملنے آئے تھے ۔ ان میں سے اکثر نے مجھے گھور کر دیکھا ۔ چند ایک نے تیوری چڑھالی اور منہ پھیر لیے ۔ کیونکہ میں شکل سے ہی مغربی پاکستانی نظر آتا تھا ۔ میرے لیے یہ ردّعمل نیا نہ تھا ۔ پچھلے سات ماہ میں مشرقی پاکستان میں قدم قدم پر اس کا مظاہرہ ہوا تھا اور اب یہ ردّیہ اتنا شناسا تھا کہ مجھے اسے نظرانداز کرنے میں کوئی دقت نہ ہوتی تھی ۔

مگر جب میں نے ڈاکٹر کا طرز عمل دیکھا ۔ تو ایک دم بھونچک رہ گیا ۔ اس نے ہاتھ ملایا مگر انگلیوں کے پوروں سے

معانقہ کیا۔ مگر بڑے ہی ڈھیلے طریقے سے۔ عید مبارک کہا۔ مگر بغیر کسی مسکراہٹ کے۔ اس کے انداز میں گرمجوشی کی بجائے مجبوری تھی۔

ہم سب بیٹھ گئے۔ مگر کوئی گفتگو شروع کرنا نہ چاہتا تھا۔ میزبان بھی خاموش تھا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ مگر بچے بھی کمرے میں موجود نہ تھے۔

جنہوں نے مجھے گھور کر دیکھا تھا۔ میں ان سے بات نہ کرنا چاہتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ ان کی موجودگی میں ڈاکٹر مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔

اچانک میری نظر سامنے والی دیوار پر پڑی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہاں قائد اعظم کی تصویر نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مگر تصویر کہیں بھی نہ تھی۔

مجھے کمرے کی فضا انتہائی بوجھل اور بے چین لگنے لگی۔

دو چار بے ربط سے جملے ادھر ادھر چلے۔ اور پھر میں نے دو چار منٹ بعد معذرت چاہی اور اٹھ کر چلا آیا۔

واپسی پر میں دل ہی دل میں ڈاکٹر کے رویے پر غور کرتا رہا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ ڈاکٹر دیگر حاضرین پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس کے مراسم میرے ساتھ زیادہ گہرے نہیں ہیں۔ بلکہ واجبی سے ہیں اور اسے میرے ساتھ کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے اگر ملاقات ہو رہی تھی تو محض اس وجہ سے کہ میں وہاں چلا گیا تھا۔ ورنہ ڈاکٹر ہرگز خواہش مند نہ تھا۔ حاضرین کی نظروں سے مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا، کہ وہ سب پاکستان کے مخالف اور بنگلہ دیش کے حامی ہیں۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ پہلے اس قسم کے لوگوں کی موجودگی میں ڈاکٹر اپنے آپ کو برملا پاکستانی کہا کرتا تھا اور ہماری دوستی کا دم بھرتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر آج کیا ہوا ؟ ؟ ؟ ؟ ؟

دوسرے دن ڈاکٹر میرے پاس آیا۔ آتے ہی بڑی گرمجوشی سے گلے ملا۔ عید مبارک کہا۔ گذشتہ روز میرے وہاں جانے پر شکریہ ادا کیا اور پھر حسب سابق ہنس ہنس کر اپنائیت اور گرمجوشی سے باتیں کرنے لگا۔

میں نے ہنسی ہنسی میں کہہ دیا۔

" ڈاکٹر صاحب یہ آپ عید کے دن اتنے سنجیدہ کیوں تھے ؟"

ڈاکٹر کا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ اس پر خفت اور کرب کے آثار ابھرے اس نے بے چارگی سے ادھر ادھر دیکھا۔ جیسے ۔

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

اور نظریں چراتے ہوئے بولا۔ " دراصل ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے منجدھار میں لا کر ہمیں چھوڑ دیا ہے ۔ اور اب ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ کیا کریں ۔"

پھر جب اس سے باتیں ہوئیں۔ تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اب بے تکلفی سے اپنی رائے کا اظہار نہ کرتا تھا بلکہ

محتاط تھا۔ اور مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ جو پہلے صرف مغموم تھا۔اب مایوس ہوگیا ہے۔ . . . مکمل طور پر مایوس . . . . .
اس کے خیال میں اس جیسے لوگوں کا مناسب استعمال نہ ہونے کی وجہ سے بازی ہاری جا چکی تھی اور اب اس جیسے لوگوں کی بقا اسی میں تھی۔ کہ حکومت سے اور پاکستان کے نظریے سے لاتعلقی ظاہر کریں۔ کیا پتہ کل کو کیا ہونے والا تھا۔

چوبیس گھنٹے بعد اس کے سوال کا جواب مل گیا۔ . . .

اگلے دن بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔

اب قریباً ایک ماہ بعد ہم قیدی بنے ڈاکٹر کے گھر کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

ٹرک رینگتے ہوئے آگے بڑھے۔ چند درخت ہمیں خاموشی سے دیکھا کیے۔ چند کھمبے دم سادھے گزر گئے چند عمارتیں بے جان ہو کر پیچھے رہ گئیں اور ماضی میں شامل ہوتی گئیں۔

پھر ہم ایک عمارت کے سامنے پہنچے جو صوبائی حکومت کے ریسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔

اندھیرے میں ڈوبی ہوئی اس عمارت کے بعض کونوں پر چھپے سے بلب روشنی دینے کی ناکام کوشش کر رہے تھے عمارت کی شکستہ دیواریں جیسے تاریکی میں منہ چھپائے ساکت کھڑی تھیں۔ گویا ان میں گردوپیش کا احساس ختم ہوگیا ہو۔ مگر میں جانتا تھا کہ ان لاتعلق اور بے جان دیواروں کے پیچھے ایک ہستی ایسی بھی ہے جو پاکستان کی شکست پر شاید ہم سے بھی زیادہ افسردہ ہوگی۔ کیونکہ ہمارے پاس تو اب بھی باقی ماندہ پاکستان تھا۔ مگر اس کا پاکستان ہمیشہ کے لیے ڈوب چکا تھا۔ . . .

میرے ذہن میں اس ہستی کی ساری کہانی یادوں کے ریلے نے انڈیل دی۔ . . . .

وہ ایک بنگالی خاتون تھی جو ایک کالج میں بنگالی پڑھاتی تھی۔

میں مشرقی پاکستان میں صوبائی محکمہ تعلیم کا سیکرٹری تھا اور اس خاتون سے ایک فون کے ذریعے متعارف ہوا تھا جو مجھے ریڈیو پاکستان والوں نے کیا تھا۔

ان کا کہنا تھا کہ یہ خاتون ریڈیو پاکستان پر بنگالی کا ایک پروگرام نشر کرتی ہے۔ جس میں ہندوستانی پراپیگنڈے کا جواب دیا جاتا ہے اور بنگالیوں کے ساتھ ان کی منافقت کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندوستان ان کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس پروگرام کی وجہ سے پاکستان کے مخالف عناصر اس لڑکی کو پریشان کر رہے ہیں اور جس کالج میں یہ پڑھاتی ہے۔ وہاں اس کے لیے باعزت طریقے سے کام کرنا مشکل ہو رہا ہے اس لیے اس کو فلاں کالج میں تبدیل کر دیا جائے۔ جہاں کا ماحول نسبتاً بہتر ہو۔

اس فون کے مطابق میں نے اس کا تبادلہ دوسرے کالج میں کر دیا۔

چند دن بعد اس نے فون پر مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ تبادلے کا شکریہ ادا کیا اور ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ وہ صرف بنگالی جانتی تھی۔ انگریزی سے ناواقف تھی اور اردو ٹوٹی پھوٹی بول سکتی تھی۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ روزانہ رات پونے نو بجے کے قریب وہ ریڈیو پر اپنا پروگرام پیش کرتی ہے۔

مشرقی پاکستان میں ریڈیو سننا ہمارے لیے مشغلہ نہ تھا۔ بلکہ نفسیاتی ضرورت تھی۔ مارشل لاء کی وجہ سے ریڈیو پاکستان

اور اخبارات کی خبریں سنسر شدہ ہوتی تھیں جو بتاتی کم اور چھپاتی زیادہ تھیں۔ اس لیے ہم دنیا بھر کے ریڈیو سن کر حقیقت حال جاننے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اس شام میں اتفاق سے ڈھاکہ ریڈیو سن رہا تھا کہ اس خاتون کا پروگرام سننے کا موقع ملا۔ پروگرام ایک تبصرے کی شکل میں تھا جو براہ راست ہندوستان کی حرکات پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ تبصرے کی زبان تیز اور کاٹ دار تھی۔ لڑکی کا لہجہ سخت تھا۔ آواز میں کھنک تھی۔ الفاظ میں یقین کی گونج تھی۔ پروگرام اچھا اور موثر تھا۔

اگلے دن جب وہ خاتون میرے دفتر میں داخل ہوئی تو میں قدرے حیران ہوا۔ بیس پچیس برس کی جوان لڑکی۔ اچھا چہرہ مختصر اور کمزور بدن۔ دھان پان سی شخصیت۔ شرمیلی مسکراہٹ میں لتھڑی ہوئی مخصوص بنگالی نسائیت، گزشتہ رات دار کھنک دار آواز کا نشان بھی نہ تھا۔ اس کے برعکس لہجے میں لجاجت، نرمی اور گھبراہٹ تھی۔ لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ رات ریڈیو پر میں نے ایک مضبوط جذبے کی پرخلوص بلکارسنی تھی اور اب ایک پریشان انسان کی فریاد سن رہا تھا۔ فرق مذاق

لڑکی نے ٹوٹی پھوٹی بے ربط اردو میں بتایا۔ کہ اسے پریشان کیا جا رہا ہے کئی خطوں میں قتل کی دھمکیاں دی گئی ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ ریڈیو پر ہندوستان کے خلاف پروگرام بند کر دو۔ ایک دن کسی نے رات کے وقت اس کے گھر میں مرا ہوا کتا پھینک دیا اور اس کے گلے میں بندھے ہوئے گتے پر لکھا تھا کہ ایک دن تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔ کالج کے دفتر میں بلاوا آتا کہ فون آیا ہے۔ جب وہ فون سننے جاتی۔ تو اسے گمنام لوگ فون پر فحش گالیاں دیتے اور دھمکیاں دیتے کہ تمہیں اغوا کرکے لے جائیں گے۔ اور ایسا ایسا سلوک کریں گے۔ پھر وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گی۔ لڑکی رونے لگی۔

گفتگو کے دوران اس نے بتایا کہ وہ غیر شادی شدہ تھی اور اپنی ملازمت سے اپنی بوڑھی ماں اور چھوٹے بھائیوں کو پالتی تھی۔ اس کا والد مر چکا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ کالج کی تنخواہ سارے گھر کے لیے کافی ہو جاتی ہے اور مالی اعتبار سے اسے ریڈیو پر کام کرنے کی اشد ضرورت نہیں۔ مگر وہ دل سے پاکستانی ہے اور موجودہ حالات برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لیے وہ پانچ منٹ کے پروگرام میں حصہ لیتی ہے۔ کیونکہ زیادہ تر بنگالی مخالفت یا خوف کی وجہ سے حکومت سے تعاون نہیں کرتے مگر ان پانچ منٹوں کی وجہ سے اب اس کے چوبیس گھنٹے نہایت پریشانی کے عالم میں گزرتے ہیں اور سارے کنبے والے بھی پریشان رہتے ہیں۔

"تبادلے کی وجہ سے میرا گھر کالج سے بہت دور ہو گیا ہے اور مجھے سیکنڈ کیپیٹل کے علاقے سے گزر کر آنا پڑتا ہے جو نسبتاً سنسان ہے وہاں مجھے خوف آتا ہے۔"

"خوف کیوں آتا ہے؟"

"میں نے کئی دفعہ محسوس کیا ہے کہ لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔"

"آپ نے متعلقہ افسران کو بتایا ہے؟"

"کئی دفعہ بتایا ہے۔"

"پھر؟"

لڑکی خاموش تھی۔

"کیا وہاں کوئی بات ہوئی ؟"

"بہت لوگوں سے بات ہوئی" اس نے چار پانچ سینیئر عہدہ داروں کا ذکر کیا۔

"پھر ؟"

لڑکی خاموش رہی۔

"کیا انہوں نے آپ کی بات غور سے نہیں سنی ؟"

"نہیں۔ وہ بڑی اچھی طرح میری بات سنتے ہیں اور مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔"

"پھر ؟"

لڑکی ہکلائی "مگر ان ... کی یقین دہانیوں پر ... عمل کوئی نہیں ہوتا ..... میں کئی دفعہ کہہ کر آزما چکی ہوں۔ انہوں نے کئی دفعہ مجھے تسلی دی ہے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلتا اور میری پریشانی ویسی ہی رہتی ہے۔"

"تو پھر مجھے بتائیے۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں ؟"

"مجھے کالج کے قریب ایک مکان دلوا دیجئے۔ تاکہ مجھے سیکنڈ کیبنٹس میں سے نہ گزرنا پڑے اور راستہ بھی چھوٹا ہو جائے ورنہ وہ مجھے راستہ میں اغوا کر لیں گے۔"

مکان دوسرا محکمہ دیتا تھا۔ میں نے لڑکی کی موجودگی میں ایک چٹھی ان کو لکھوا دی۔ پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ اس ملک کو جب بھی نقصان پہنچا ہے تعلیم یافتہ طبقے کے ایک حصے سے پہنچا ہے حالانکہ اسی طبقے سے ہماری ساری توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ تعلیم ہمارے لیے ہدایت کم اور گمراہی زیادہ ثابت ہوئی ہے۔ ہمارے عام شہری جاہل ہیں مگر خلوص کی دولت سے مالا مال ہیں۔ مگر بعض دوسرے گو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ لیکن علم کی اصل دولت اور خلوص کی دولت دونوں سے محروم ہیں۔ علم کی اصل دولت ہے آگاہی بصارت۔ آگاہی بصیرت۔ کبھی تجزیہ، کبھی تزکیہ، کہیں خود بینی۔ کہیں خدا بینی۔ اور کہیں جہاں بینی یہ چیزیں نہ ہوں۔ تو پڑھا لکھا بھی علم سے محروم ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں پڑھے لکھے زیادہ ہیں اور علم والے کم ہیں۔ اسی لیے ہم خود آگہی کی بجائے خود غرضی تک ہی پہنچ پاتے ہیں اور قومی شعور کی بجائے انا کے فتور میں غرق رہتے ہیں۔

اس سنگلاخ حقیقت کا کڑوا احساس ۱۹۷۱ء سے مشرقی پاکستان میں قدم قدم پر ہوتا تھا۔ جاہل بنگالی پاکستان دوست تھا۔ اور مغربی پاکستانیوں کے ساتھ بامروت تھا۔ مگر پڑھے لکھے بنگالیوں کی اکثریت کے دل و دماغ پر پاکستان دشمنی کا دھواں چھایا تھا اور ماتھے پر مغربی پاکستانیوں کے لیے نفرت نمایاں تھی۔ ان کا گڑھ صوبائی حکومت کا سیکرٹریٹ تھا۔ جہاں وہ ہر ممکن طریقے سے قومی اندازِ فکر کی تکمیل میں رکاوٹ ڈالتے اور جس حکم سے کسی مغربی پاکستانی یا ان سے تعاون کرنے والے بنگالی کو تقویت ملتی۔ وہ اس حکم کے اطلاق میں سست دھیمے اور رعونیہ محسوس انداز میں رخنے ڈالتے۔ خوئے بد را بہانہ بسیار والی بات تھی۔ اور وہ ہر اس حیلے بہانے کا استعمال کرتے۔ جو کسی نہ کسی انداز میں قواعد کی زنجیر کی کڑی بن سکتا۔

اس لڑکی کی درخواست بھی اسی بھنور میں پھنس گئی۔

میری چٹھی کا جواب تو اگلے ہی دن آ گیا۔ مگر اس میں اتنے قواعد کی سیڑھیاں بنائی گئی تھیں جن پر چڑھتے چڑھتے کئی

برس گزر جاتے۔ ماحصل تحریر یہ تھا کہ فی الحال مکان ملنے کی کوئی صورت نہیں۔

یہاں سے لکھا گیا۔ کیا کوئی سپیشل کیس بن سکتا ہے۔

جواب یہ تھا کہ اس حالت میں فلاں کمیٹی کے پاس جانا ہوگا۔

پتہ چلا کہ فلاں کمیٹی کا اجلاس کئی ماہ بعد ہوتا ہے۔

پوچھا گیا۔ کوئی اور صورت؟

جواب ملا کوئی صورت نہیں

لڑکی کو اطلاع بھیجی گئی۔ وہ روتی بسورتی پھر آن موجود ہوئی۔ اور بتایا کہ تین چار لوگوں کو حال ہی میں کھڑے کھڑے مکان مل گئے تھے۔ مگر وہ سب بنگلہ دیش کے حامی تھے۔

پھر خط وکتابت چلتی رہی۔ فون کھڑکتے رہے اور کوشش کا طویل سلسلہ جاری رہا۔ مگر مکان نہ ملا۔

مجھے اسلام آباد آنا پڑا۔ ہفتے بعد واپس لوٹا تو معلوم ہوا کہ وہ پچھلے چار پانچ روز سے بڑی بے تابی سے فون کرتی رہی ہے اور دفتر میں بھی چکر لگاتی رہی ہے۔

اگلے ہی دن وہ پھر موجود تھی۔ یہ غالباً اگست کا مہینہ تھا۔

اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ چہرہ بے رونق تھا اور وہ سخت پریشان تھی۔

اس نے بتایا کہ وہ رکشے پر جا رہی تھی کہ سیکنڈ کیپیٹل کے علاقے میں ایک بڑی کار اس کا پیچھا کرتی ہوئی آئی۔ رکشے کے برابر لا کر انہوں نے رکشا والے کو رکنے کو کہا۔ مگر وہ نہ رکا تو انہوں نے سڑک کے آر پار کار کھڑی کر کے راستہ روک دیا۔ کار میں سے دو نوجوان لپک کر نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ اور وہ اس لڑکی کو گھسیٹ کر رکشے سے اتارنے لگے وہ سڑک پر گر گئی۔ انہوں نے اسے کھینچ کر کار میں ڈالنا چاہا۔ مگر وہ رکشے کے پہیے سے لپٹ گئی۔ اتنے میں دور سے ایک فوجی ٹرک آتا دکھائی دیا۔ جسے دیکھ کر وہ بھاگ گئے

وہ بات کرتے کرتے ہانپ رہی تھی۔ دم بھر کو سانس لینے کو رکی اور پھر بولی۔

"میں نے کار کا نمبر نوٹ کیا اور متعلقہ لوگوں کو دیا۔ انہوں نے ملزموں کا پتہ لے لیا ہے۔ ان میں سے ایک ہائیکورٹ کے جج کا لڑکا ہے۔"

"وہ گرفتار ہوا یا نہیں؟"

لڑکی نے گھبراتے ہوئے خشک گلے سے تھوک نگلا اور مایوسی سے کہنے لگی "میں نے کل بھی اسے سڑک پر گھومتے دیکھا ہے اسے ابھی تک کچھ نہیں کہا گیا۔"

وہ رکی۔ اس کی پلکوں پر ایک آنسو لرزا۔

"مجھے کل بھی فون پر کسی نے کہا کہ اس دن تو تم بچ کر نکل گئیں۔ مگر اگلی دفعہ نہیں بچو گی۔ . . . ہم چاہتے تو تمہیں مار سکتے تھے۔ مگر ہم تمہیں قتل نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ اغوا کر کے دوسروں کے لیے عبرت بنائیں گے۔"

پھر وہ کرسی پر پہلو بدل کر سسکیاں لینے لگی۔

میں نے اسے تسلی دی۔ حوصلہ افزائی کے لیے اس کے جذبہ حب الوطنی کی تعریف کی۔ اور یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کی ہر ممکن مدد کی جائے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر میں دل ہی دل میں اپنے خالی اور کھوکھلے الفاظ پر خجالت محسوس کر رہا تھا۔

اب وہ یہ چاہتی تھی کہ جب تک مکان نہ ملے۔ اسے ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت دی جائے جہاں وہ اپنی بوڑھی والدہ اور چھوٹے بھائیوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح گزارا کرے گی اور اس خطرناک راستے سے نجات مل جائے گی۔

میں نے متعلقہ افسروں سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ تو انہوں نے تین چار دن تک جواب دینے کا وعدہ کیا یہ سن کر وہ خاصی مایوس ہوئی۔ مگر اب چار دن انتظار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازے کی طرف چل دی۔ دو قدم چلی۔ پھر رک گئی اور مڑ کر بولی "سر۔ یہ بتائیے۔ کہ جو لوگ ہندوستان کی شہ پر مجھے تنگ کرتے ہیں۔ ان کے خلاف ایکشن کیوں نہیں لیا جاتا۔"

میں اسے کیا جواب دیتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیونکہ یہ سوال محض اس کا سوال نہ تھا۔ بلکہ ان چند سوالوں میں سے تھا۔ جو ان دنوں مشرقی پاکستان کی فضا میں اڑتے رہتے تھے۔ مگر ان کا کوئی جواب نہ ملتا تھا۔

چند دن بعد اسے ریسٹ ہاؤس میں جگہ مل گئی۔

نومبر کے پہلے ہفتے میں مجھے لاہور آنا پڑا۔ دس دن بعد واپس پہنچا تو دفتر والوں نے بتایا کہ میری روانگی سے اگلے دن اس کا فون دو دفعہ آیا تھا اور کہتی تھی کہ میں فوراً ملنا چاہتی ہوں۔ مگر بعد ازاں اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی

جب میں واپس پہنچا تو مشرقی پاکستان کی فضا بالکل بدل چکی تھی۔ جنگ ابھی نہیں آئی تھی مگر جنگ کی قربت کا احساس طوفان نوح کے پہلے پانی کی طرح ہر کونے کھدرے سے ابلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس ماحول میں نہ تو میں اس کا پتہ لے سکا اور نہ ہی اس نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ انتہائی کھچاؤ والی عید گزارنے کے بعد ۲۲ نومبر کو ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ تین دسمبر کو کھلی جنگ شروع ہوئی اور ۱۴ دسمبر کو ہمیں ریڈ کراس کے غیر جانبدار علاقے میں پناہ لینا پڑی۔ ۱۶ دسمبر کو ہتھیار ڈالے جانے کے بعد ہم تین روز وہیں محبوس رہے۔

ان تین دنوں میں ہم نے آپس میں کتنی ہی باتیں کیں۔ پچھلے دنوں کی باتیں۔ نوکدار چبھتی ہوئی باتیں سفاکانہ تجزیے۔ کیا کرنا چاہیئے تھا۔ کیا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ انہی باتوں کے دوران میرے ایک ساتھی نے اس لڑکی کے متعلق بتایا نومبر کے اوائل میں جب میں لاہور میں تھا تو وہ مجھے ڈھونڈتی رہی۔ مگر مجھے غیر حاضر پا کر وہ اس کے پاس چلی گئی۔ ایک تو اس لیے کہ جب وہ میرے دفتر میں مجھے ملنے آئی تھی تو ہمارا یہ ساتھی بھی بیٹھا تھا اور دوسرے اس لیے کہ ریڈیو پاکستان اس کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔

اس نے بتایا "وہ میرے پاس دفتر آئی۔ تو اس کے ساتھ ایک بزرگ سے بزرگ بھی تھے اور میں اس لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کیونکہ ایک دفعہ پہلے اسے تمہارے کمرے میں دیکھ چکا تھا۔ اس کی سخت ابتر حالت تھی۔ جیسے کوئی گہرے صدمے سے ہل جائے۔ اس کے چہرے، حرکات اور بات چیت میں اعصابی ہیجان کی سی کیفیت تھی اس نے مجھے بتایا کہ

دو چار روز پہلے اسے ایک سیاسی خاتون لیڈر نے اپنے گھر بلایا جب یہ وہاں پہنچی تو اس کی بیٹھک میں پچیس تیس لوگ جمع تھے۔ اس عورت نے سب کے سامنے اس لڑکی کے منہ پر طمانچے مارے اور بار بار سر کے بال کھینچے۔ پھر ڈانٹ کر کہا کہ اگر تم نے ریڈیو پر ہندوستان کے خلاف پروپیگنڈا بند نہ کیا تو تمہاری ننگی لاش اس گلی میں پڑی ہوگی۔ یہ تمہیں آخری وارننگ دے رہی ہوں۔ پھر اسے ڈپٹ کر کمرے سے نکل جانے کو کہا۔ یہ ذلت سہنے کے بعد لڑکی واپس آگئی اور اس نے اس واقعے کی شکایت متعلقہ لوگوں تک پہنچا دی مگر اب وہ اس حد تک حوصلہ ہار چکی تھی کہ وہ چاہتی تھی کہ یا تو اس کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ یا اسے ریڈیو کے پروگرام سے نجات دلا دی جائے۔"

اپنے ساتھی کی بات سن کر مجھے احساس ہوا کہ جنگ اور شکست سے بہت پہلے ہی ایک بے لوث جذبہ دم توڑ رہا تھا اور بے باک حوصلہ سرنگوں ہو رہا تھا۔ مگر یہ مخالفوں کا کمال نہ تھا۔ بلکہ اپنوں کی بے داد تھی۔ یہ اس لڑکی کے نظریاتی یقین کی موت نہ تھی۔ بلکہ باہمی اعتماد کی موت تھی۔ اس اعتماد کی موت جس کے سہارے طوفانوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور ظلمتوں کی تیرگی دور کی جاتی ہے۔

اب یہ ساکت و جامد ریسٹ ہاؤس اس پیکرِ عزم و وفا کی پناہ گاہ بنا تھا۔ مگر شکست کے بعد کتنی ہی پناہ گاہیں مقتل بن گئیں۔ . . . . . .

نہ معلوم اس کا کیا بنا ہوگا ؟؟؟؟؟

اگر وہ زندہ ہے تو انتہائی تاریک مستقبل کے خوف سے لرز رہی ہوگی۔ . . . . اگر مر رہی ہے تو ماں کے باہمت آئیڈیلزم کی گود میں سر رکھے سو رہی ہوگی اور قومی غیرت اس پر نثار ہو رہی ہوگی۔ . . . . . یہ بنگلہ دیش سے بھلا دے گا۔ نہ تو جولی نہ کتبہ۔ نہ فاتحہ نہ مزار۔ نہ تو تاریخ میں ذکر ہوگا نہ دلوں میں یاد ہوگی۔ مگر پاکستانی قوم اس کے مثالی جذبہ حب الوطنی کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ نہ ہی ان تمام بنگالیوں کا احسان اتار سکے گی جو انجام کا پورا احساس ہونے کے باوجود غداری کے پوشیدہ اور ظاہری دھاروں کا مقابلہ کرتے رہے۔

نفسیاتی جنگ

صدیق سالک

مجھے افسوس ہے کہ پچھلے صفحات میں میں نے بھارتی تواضع کو دال روٹی تک محدود رکھا۔ دراصل ہمارے میزبان نے اس کے علاوہ بھی ہم پر زرِ کثیر صرف کیا۔ اس نے ہمارے لیے خصوصی اخبار جاری کیا۔ دور و نزدیک سے سرکاری خرچ پر مسلمان اکابرین دعا کے لیے بلوائے۔ بھارت کی منتخب فلمیں دکھائیں، کلچرل شو کا اہتمام کیا۔ کاش ان سب عنایات کا ان صفحات میں احاطہ کیا جا سکتا۔

یہ ساری تواضع ہماری ذہنی تربیت کے لیے تھی تاکہ اسیری کے فارغ دنوں میں ہم بھارت کی عظمت، وہاں کے مسلمانوں کی خوشحالی، سیکولرزم کی ترقی اور بھارت کی امن پسندی کے ساتھ ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ ثقافتی ورثے سے بھی روشناس ہو جائیں۔ ہمارے میزبان کا خیال تھا کہ یہ تربیت رسمی قید و بند ٹوٹنے کے بعد بھی ہمارے بہت کام آئے گی اور جنوبی ایشیا میں "فروغِ امن" کے لیے سودمند ثابت ہو گی۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، اس نفسیاتی جنگ کی ابتدا ڈھاکہ ہی سے ہو گئی تھی۔ بھارت پہنچنے کے بعد اس میں شدت پیدا ہو گئی۔ کلکتہ میں میرے محتسب (INTER R OG ATOR) کی گفتگو کی تان اس بات پر ٹوٹتی کہ "بنگلہ دیش بننے سے نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ بھارت سے محاذ آرائی تو درکنار پاکستان کے لیے اپنا وجود قائم رکھنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ تم تو قیدِ تنہائی میں ہو، ذرا باہر کی جنہیں سنو تو حیران رہ جاؤ کہ دو قومی نظریہ دم توڑ چکا ہے اور پاکستان کے باقی صوبوں میں بھی علیحدگی کی تحریکیں زور پکڑ گئی ہیں۔"

کلکتے سے آگرہ جیل پہنچا تو ایک دن جابی بردار حوالدار میجر کہنے لگا۔ "پاکستان تو ہر چیز باہر سے منگواتا ہے۔ پین، پنسل سے لے کر ٹریکٹر تک۔ ادھر بھارت ہر چیز خود بناتا ہے۔ ٹریکٹر، کاریں، ٹینک، توپیں، طیارے۔ بھارت اور پاکستان کا کیا مقابلہ؟ کبھی مانگے تانگے کی چیزیں بھی کسی کا ساتھ دیتی ہیں؟ مانگے ہوئے بیل سے ایک بار کھیت میں ہل تو چلایا جا سکتا ہے لیکن اس سے زمین تیار کر کے اچھی فصل حاصل نہیں کی جا سکتی۔"

کیمپ ۹۳ کا ایڈجوٹنٹ تو ادھر ادھر کی ہانکنے کے بعد کہنے لگا "پاکستان ہمیشہ غیر ملکی اشیاء پر انحصار کرتا آیا ہے۔ اب درآمدات کے لیے اس کے پاس زرِ مبادلہ کہاں سے آئے گا، بنگلہ دیش کی چائے اور پٹ سن تو گئی۔۔۔"

دارالامراء میں کیمپ کا سیکنڈ ان کمانڈ آیا، تو سیالکوٹ سے اپنا آبائی اور جذباتی رشتہ جتا کر کہنے لگا "واہ، سیالکوٹ کی گلیاں جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا، اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ وہ بڑ کا درخت، رہٹ کا پانی، بارونق بازار۔۔۔

---

[1] صدیق سالک کی کتاب "ہمہ یاراں دوزخ" کا ایک باب۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد بھارتی قید میں گزرے ہوئے

[illegible]

آپ تو سیالکوٹ جاتے رہتے ہوں گے، کیا اب بھی سیالکوٹ اتنا ہی سہانا، اتنا ہی البیلا ہے؟ کاش سیاسی حدیں مٹ جائیں۔ اور میں پھر سیالکوٹ کے کوچہ و بازار میں آزادانہ گھوم پھر سکوں۔۔!"

دارالسلام میں ایک روز کیمپ کمانڈنٹ آیا تو اس نے بھی یہی راگنی چھیڑی "میں علی گڑھ میں پڑھا ہوں، جہاں میرے حلقۂ احباب میں ہندو کم اور مسلمان زیادہ تھے۔ تقسیم تک ان کے ساتھ برادرانہ تعلقات رہے۔ ان کے بچے میری گود میں اور میرے ان کی گود میں پلے بڑھے۔ لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اب ہم آپس میں مل سکتے ہیں۔ ہمارے پچھلے ریس فارٹیز (FORTIES) میں کچھ ایسی وباچلی کہ عقل کی بجائے جذبات فیصلے کرنے لگے۔ صدیوں کا میل جول چند سیاست دانوں کے ذاتی تعصبات کی نذر ہو گیا۔ مانا کہ ہندوؤں سے زیادتیاں بھی ہوئی ہیں۔ لیکن گھر کے کسی فرد کی زیادتی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اب بھی بھارت اور پاکستان کی سرحدیں کھول دی جائیں تو محبت کا رکا ہوا ریلا ساری رنجشوں کو بہا لے جائے گا۔۔!"

ہم یہ باتیں سن کر ہنس پڑتے۔ جونہی کیمپ کا کوئی ادنیٰ یا اعلیٰ کارندہ اپنی گفتگو کے دوران اس موضوع کی طرف پلٹا کھاتا، ہم اسے کھانے کو دوڑتے اور طرح طرح کے سوال کر کے معرکۂ گفتگو کو معرکہ جنگ و جدل میں بدل دیتے اور آخر کار ہماری سوچ کا دھارا بدلنے والا جو دم منہ موڑ کر کھسکنے پہ مجبور ہو جاتا۔

بھارت نے اس نفسیاتی شطرنج میں اپنے مہرے یوں پٹتے دیکھے تو اسے احساس ہوا کہ یہ میدان مارنے کے لیے کیمپ کے چاپلوس حوالدار میجر، نیم خواندہ ایڈجوٹنٹ اور کوتاہ اندیش کمانڈنٹ کی خدمات کافی نہیں۔ کیوں نہ اس خدمت کے لیے ان سولین مسلمانوں کو استعمال میں لایا جائے۔ جنہیں بھاری تنخواہیں دے کر سرکاری ملازمتوں میں پال رکھا ہے۔ بے شک ان کا بنیادی مقصد بھارت میں مسلمانوں کی خوشحالی کا پرچار ہی سہی، لیکن ان سے یہ کار خیر لینے میں کیا حرج ہے؟ اچھا یا گھر کے ہاتھی کو بوقت ضرورت سواری کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اس جنس مخصوص کا جو پہلا نمونہ آیا اس کا نام شہباز تھا مگر وہ شکل و صورت سے ممولہ لگتا تھا۔ اس کا تعارف "آج کل" کے مدیر کی حیثیت سے کرایا گیا۔ ہم نے اسے غور سے دیکھا تو واقعی اس کا منحنی جسم مدیرانہ ساخت کا تھا اور چہرے پر بے بسی بھارتی مسلمانوں کی سی تھی، چنانچہ کسی حد تک اس کے مسلمان ہونے کا یقین آ گیا، لیکن جب اس نے باتیں شروع کیں تو ہمیں اس کے مسلمان کے لباس میں ہندو ہونے کا شک گزرا۔ ایک ساتھی نے آہستہ سے میرے کان میں کہا "تمہارا تعلق کتب و رسائل سے رہا ہے ذرا پرکھ کر بتاؤ کہ کیا "آج کل" کا یہ ایڈیٹر سچ مچ کا مسلمان ہے؟" عرض کیا "شکل سے لگتا ہے، عقل سے نہیں!"

شہباز صاحب کوئی نصف گھنٹہ اپنے محبوب — بھارت — کی شعلہ رخی کی حدیثیں بیان کرتے رہے اور دبے دبے الفاظ میں رقیب روسیاہ — پاکستان — پر بھی نقرے کستے رہے۔ وہ اپنی تقریر کے دوران ہر تیسرے چوتھے فقرے کے بعد کرسیٔ صدارت پر بیٹھے ہوئے سینئر بھارتی افسر کی طرف گردن موڑ کر یوں دیکھتے گویا کہہ رہے ہوں "کیوں، سرکار! ابھی تک جو الفاظ اس نمک خوار کے منہ سے ادا ہوئے وہ اس کی وفاداری کا ثبوت دیتے ہیں؟" اور جب تقریر کرتے وقت ان کا رخ ہماری طرف ہوتا تو چہرہ الفاظ کی زبان سے الگ بولی بولنے لگتا۔ وہ کہتا "بھائیو! میں مجبور ہوں، چار سو کی نوکری کر رہا ہوں، گھر کی کفالت کا بوجھ تنہا مجھ پر ہے۔ مجھے بے بس سمجھو، میں لاکھ الفت و رضا کی بات کروں تم خوئے ستمگر نہ بھولنا۔۔!"

ادھر ہماری یہ حالت تھی کہ "اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے"۔ چنانچہ جونہی شہباز صاحب نے لوکرا چلے کہے۔ سننے والے الٹا انہیں منانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہمیں بھارت میں مسلمانوں کی حالت کا پورا پورا علم ہے، فرقہ وارانہ فسادات اور مسلمانوں کی معاشی بدحالی کی تصویر کرایہ کے مقرروں کی آواز سے کہیں زیادہ اونچی اور موثر ہے۔ ہمیں جمہوریت کا درس دینے والے کشمیر میں استصواب رائے کرا کر کشمیریوں کا حق جمہوریت کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ مشرقی بنگال کی غربت کا طعنہ دینے والے مغربی بنگال کی طرف کیوں نہیں دیکھتے؟" لیکن اس تلخی کے پیچھے شہباز صاحب سے کوئی عداوت نہ تھی۔ بس کچھ اپنی اسیری کا زخم، کچھ ان کی نمک پاشی ہم ضبط نہ کر سکے اور ان پہ بے تحاشا برسے۔

لب پہ ہے تلخیٔ مۓ ایام، ورنہ فیض
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

جب تلخی بڑھی تو کیمپ کمانڈنٹ جو تھانیداری کے فرائض پر مامور تھا۔ امن بحال کرنے اٹھا لیکن، اس کی مداخلت سے لوگ اور مشتعل ہو گئے۔ اس نے ہمارے بڑے نمائندے (SENIOR SPOKESMAN) سے کمک مانگی۔ کرنل سید نے ہاتھ کے اشارے سے ضبط و تحمل کی تلقین کی۔ شور ذرا تھما تو لال پٹی والا بھارتی افسر کرسیٔ صدارت سے اٹھا اور کہنے لگا "بس بس ہم جا رہے ہیں۔ ہمارا یہاں آنے کا مقصد پورا ہو گیا ہے ہم صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ آپ لوگ کن خطوط پر سوچ رہے ہیں۔۔۔" اتنے میں پیچھے سے آواز آئی "اگر سمجھ نہیں آئی، تو ذرا ٹھہر جاؤ، ابھی پوری طرح سمجھائے دیتے ہیں"

بھارتی عملہ، فاضل مقرر اور صدرِ گرامی کو اپنی پناہ میں لے کر باہر نکلا گیا۔

چند ماہ بعد جوہری توانائی کمیشن کے ڈاکٹر رحمٰن بھارت کی توانائی کا پرچار کرنے کے لیے اپنے جوہر دکھانے آئے۔ ہم صبح دس بجے جیل کے احاطے میں جمع ہو گئے۔ لکڑی کی چار کرسیاں اور ایک میز مہمانوں کے لیے رکھ دی گئی۔ ڈاکٹر رحمٰن نے شہباز کی شہبازی سے عبرت حاصل کرتے ہوئے پہلے ہی معذرت کر لی کہ "میں کسی پروپیگنڈے کی خاطر نہیں آیا، میں سیاسیات میں الجھوں گا نہ جذبات میں۔ سیدھی سیدھی خالص سائنسی اور فنی باتیں کروں گا۔"

اس کے بعد انہوں نے ٹکنیکی سائنس کی آڑ میں زہریلے تیر چلانے شروع کیے۔ انہوں نے کہا کہ بھارت اب سائنس کے میدان میں برصغیر کی قیادت سنبھالنے کو تیار ہے اور اگر پاکستان بھی بھارت سے مل جائے تو رفتار اور تیز ہو سکتی ہے اور برصغیر کچھ عرصے بعد بڑی طاقتوں کی کاسہ لیسی ترک کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دبے الفاظ میں اس طرف بھی اشارہ کیا کہ بھارت کے وسائل اتنے وسیع اور یہاں سائنسی تحقیق اتنی ترقی یافتہ ہے کہ اب پاکستان کو دوسروں کے پیچھے دوڑنے کی بجائے بھارت کی برتری اور قیادت قبول کر لینی چاہیے۔

ڈاکٹر رحمٰن پر سوالوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ لوگوں نے بھارت کی بڑائی اور پاکستان کی پسماندگی سے متعلق گفتگو کو پروپیگنڈے سے تعبیر کیا اور حکومت پاکستان کے مؤقف کی روشنی میں ڈاکٹر رحمٰن کو کھری کھری سنائیں۔

تقریر کے بعد جانے سے قبل، ریکوارڈوں کی پلیٹ پر غیر رسمی گفتگو کے دوران ڈاکٹر رحمٰن میرے ہاتھ چڑھ گئے۔

میں نے ان سے صرف دو باتیں پوچھیں۔ ایک یہ کہ بھارت دفاعی اور غیر دفاعی نوعیت کی سائنسی تحقیق پر کس نسبت سے خرچ کرتا ہے؟ جب ڈاکٹر صاحب نے انکشاف کیا کہ "تحقیقی اخراجات کا دس فیصد دفاعی سائنس پر خرچ ہوتا ہے اور نوے فیصد غیر دفاعی سائنس پر" تو میں نے عرض کیا "پھر کیا بات ہے کہ جس شعبے پر آپ دس فیصد خرچ کرتے ہیں، اس نے تو بڑھ کر ایک پڑوسی ملک فتح کر لیا لیکن جس مد پر آپ نوے فیصد خرچ کرتے ہیں اس کے نتائج کا یہ عالم ہے کہ بھارت میں بھوک اور افلاس دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں"۔ وہ اس سوال کے جواب سے پہلو تہی کرنے لگے تو میں نے دوسری بات یہ پوچھی کہ "آپ کا کیا خیال ہے کہ بھارت کی سائنسی اور فنی ترقی سے بھارتی قیادت کے وسعت پسندانہ رجحانات کی حوصلہ افزائی ہوگی؟ یعنی آپ جرمنی کی مثال لے لیں۔ اگر جرمنی ۱۹۳۰ - ۱۹۴۰ء کے عشرے میں سائنسی طور پر اس قدر ترقی یافتہ نہ ہوتا تو شاید ہٹلر کو ساری دنیا کو میدان جنگ بنانے کی ہمت نہ ہوتی"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کہنے لگے۔ "آپ ملٹری سٹرٹیجسٹ ہیں۔ میں اس موضوع پر آپ سے بحث نہیں کر سکتا"۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور لیفٹیننٹ کرنل افضل نے میرے کان میں کہا "لو بھئی، تم جیسے نیم خواندہ اور نیم فوجی کو بھی ملٹری سٹرٹیجسٹ ہونے کا رتبہ مل گیا۔ مبارک ہو چائے پلاؤ، پارٹی دو، تم نے ایک بھارتی ڈاکٹر کو اپنی جہالت سے مرعوب کر لیا"۔

رحمٰن صاحب نے پکوڑے کا ایک "بچہ" تانبے کی پلیٹ سے اٹھایا، منہ میں ڈالا اور جگالی کرتے ہوئے اپنے محافظوں کے جلو میں وداع ہو گئے۔

مقررین کی صف میں مرکزی سیکرٹری اطلاعات اسے جے قدوائی اپنے عہدے اور موضوع گفتگو کے لحاظ سے بڑے اہم تھے۔ یہ پتلے چھریرے جسم کے دفتری آدمی تھے۔ چہرے پر تم ہائے روزگار کے واضح تاثرات تھے۔ لہجے میں ٹھہراؤ اور کینہ تھا اور اپنے افسرانہ وقار کو بحال رکھنے کے لیے تمباکو سے بھرا ہوا پائپ ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے ابتدائے گفتگو میں یہ تاثر دیا کہ

انہیں کے فیض سے بازار عقل روشن ہے

ہمیں اس خود ستائی کا گلہ نہ تھا۔ ہم خاموش ان کی مدح خویش کی حکایتیں سنتے رہے۔ لیکن جلد ہی انہوں نے پرخطر وادی میں قدم رکھا اور کہا "آپ کی حکومت کو آپ کی رہائی میں دلچسپی نہیں، ورنہ بنگلہ دیش کو فوراً تسلیم کر کے آپ کو واپس لے جا سکتی تھی بھارت کو قید طویل کرنے کا شوق نہیں۔ بھارت تو امن پسند ملک ہے۔ ایک کروڑ مہاجرین سے انسانی ہمدردی کی خاطر مداخلت پر مجبور ہو گیا"۔

ابھی آگے بڑھ رہا تھا کہ کئی آدمی اچانک یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے سوئے ہوئے دکھ جاگ اٹھتے ہیں۔ سات آٹھ آدمیوں نے قدوائی صاحب کو لگام دینے کی کوشش کی۔ سینئر افسروں نے پہل کی اور جونیئر یہ دیکھتے رہے کہ کب تیر اندازی تھمے تو ہم بھی اپنی نشانہ بازی کا مظاہرہ کریں، لیکن اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ سینئر افسروں ہی نے اس کا منہ بند کر دیا۔

کرنل لودھی نے کہا "کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پاکستان جب تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرتا، ہم رہا نہیں ہو سکتے؟ گویا پاکستان سو سال تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرے تو آپ ہمیں سو سال یہاں رکھیں گے۔ ہمیں اپنی قید کا گلہ نہیں، بھارت کی بے اصولی کی شکایت ہے . . . ۱۹۴۷ء اور اس سے پہلے کی نسل پہلے ہی ہندو گزیدہ ہے۔ آپ نے نئی نسل کو بھی بھارتی تنگ دلی اور

تنگ نظری کا قائل کر دیا ہے۔ ادھر آپ امن کی بات کرتے ہیں، پتہ نہیں آپ امن کی باتوں سے پاکستان کی کس نسل کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔۔۔؟"

کرنل زیدی برس پڑے "آپ کب تک مہاجرین کا ڈھونگ جاری رکھیں گے۔ اگر مہاجرین کی مدد ہی بھارت کی پالیسی ہے تو ہمیں براہِ کرم ابھی بتا دیجئے کہ آپ کب سندھ (پاکستان) کے ہندوؤں کو بہلا پھسلا کر اپنی طرف بلانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تاکہ آپ انسانی ہمدردی کی خاطر پاکستان پر پندرہ بیس ڈویژن فوج چڑھا سکیں۔"

کرنل وڑائچ بولے "آپ بھارت میں مسلمانوں کی خوشحالی کا ذکر کرتے ہیں۔ ادھر حالت یہ ہے کہ سو سے زیادہ مرکزی سیکرٹریوں میں صرف چار مسلمان ہیں۔ جب کہ بھارت میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بارہ فیصد ہے اور مشرقی پاکستان سے آگرہ جیل تک ہمیں ایک بھی مسلمان فوجی افسر نظر نہیں آیا۔ کیا اسی کا نام مسلمانوں کی خوشحالی ہے؟"

اس یلغار سے بچنے کے لیے قدوائی صاحب اٹھے اور انگوٹھے سے پائپ کا ان جلا تمباکو دباتے ہوئے کیمپ سے باہر نکل گئے۔

اٹھ چلے شیخ جی تم مجلسِ رنداں سے شتاب
ہم سے کچھ خوب مدارات نہ ہونے پائی

پھر ایک روز اطلاع ملی کہ ایک نہایت ہی قابلِ احترام دینی رہنما تشریف لا رہے تھے جو سیاسی چھیڑ خانی کی بجائے ہمیں مذہبی بصیرت عطا فرمائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی ہدایت ہوئی کہ ہم ان سے شہباز، رحمان یا قدوائی والا سلوک نہ کریں، بلکہ نہایت احترام سے مہمان کی باتیں سنیں۔ اگر وہ سوال کرنے کی اجازت دیں تو ایک یا دو افراد مؤدب الفاظ میں مدعائے دل بیان کریں۔ باقی سب خاموشی سے سنیں۔ سوال کرنے والوں میں بندۂ حقیر کا نام بھی تھا۔

بزرگِ دین تقریباً گیارہ بجے تشریف لائے۔ یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے وائس چانسلر پروفیسر مجیب تھے۔ ہم ان سے استفادہ کرنے سب سے بڑی بیرک میں جمع ہوئے۔ پروفیسر مجیب چھوٹے سے قد کے عمر رسیدہ بزرگ تھے ڈاڑھی سے بے نیاز سفید گورا رنگ تھا۔ بادامی رنگ کی ٹھنڈی اچکن اور نہرو فیشن کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے وہ بظاہر قابلِ احترام لگتے تھے۔

پروفیسر مجیب نے پہلے جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر ہند) سے اپنے ذاتی تعلقات کا تذکرہ کیا۔ پھر تقسیم ہند پر آئے اور کہنے لگے کہ میں نہرو یا ذاکر حسین سے کسی ذاتی منفعت کی خاطر بھارت میں نہیں رکا، بلکہ یہ میرا ذاتی فیصلہ تھا کہ اسلام کے پرچار کی ضرورت پاکستان کی نسبت بھارت میں زیادہ ہے۔ اگر ہم سب پاکستان چلے گئے تو اس خطۂ ارضی میں اسلام کی تبلیغ کون کرے گا؟ اس کے بعد انہوں نے بھارت میں فروغِ اسلام کے لیے اپنی خدمات کا مفصل ذکر کیا۔

وہ نہایت حلیم و مؤدب الفاظ میں اپنے دل کی بات کہتے رہے۔ ہم حسبِ حکم خاموشی سے سنتے رہے۔ بعد میں جب انہوں نے سوالوں کا دروازہ کھولا تو ڈاکٹر ہاشمی، میجر مرزا اور میں نے سوالات کیے۔ میرا سوال یہ تھا "جنابِ والا! کیا آپ مجھ جیسے دنیادار کی رہنمائی کے لیے اس مسئلے پر روشنی ڈالیں گے کہ آیا اسلام کے مقاصد میں اسلامی معاشرے کی تشکیل بھی شامل ہے۔ اور اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے، تو براہِ کرم ذرا یہ بھی بتا دیجئے کہ کیا غیر اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ ایسا معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے۔۔۔؟"

پروفیسر صاحب نے جواب دیا "میرے خیال میں اسلام میں اسلامی معاشرے یا اس قسم کی کسی چیز پر زور نہیں دیا گیا۔

دوسرے مذاہب کی طرح اسلام بھی فرد کی اصلاح کے لیے آیا۔ ہاں اگر سب افراد مومن ہو جائیں تو خود بخود مومنوں کا معاشرہ پیدا ہو جائے گا۔۔۔ جہاں تک غیر اسلامی حکومت کی رکاوٹ کا تعلق ہے، میں یہی کہوں گا کہ جو لوگ پاکستان چلے گئے انہوں نے وہاں کونسا اسلامی معاشرہ قائم کر لیا ہے۔۔۔!"

پروفیسر صاحب کے آخری جملے کی تلخی کے جواب میں مَیں کچھ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اپنے ایک بزرگ نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا کہ "سوال پر سوال کرنا علامتِ گستاخی ہے۔ آخر وہ بزرگ دین ہیں، چپ رہو۔" چنانچہ میں چپ ہو گیا۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب کے بصیرت افروز وعظ کا شکریہ ادا کیا گیا اور وہ تشریف لے گئے۔ جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی

ہمارے ذہنی پر نوچنے کے لیے یوں تو کئی اور ممتاز شخصیتیں آئیں، لیکن میں آخر میں صرف ایک کا ذکر کروں گا۔ میری مراد بیرونی تجارت کے مرکزی سیکرٹری مسٹر یونس سے ہے، جن کی ساری برادری پاکستان میں ہے۔ موصوف کے والد بزرگوار پنڈت جواہر لال نہرو کے ہم خیال اور دست راست تھے، چنانچہ قیام پاکستان سے ذرا پہلے نہرو ان کے گھر تشریف لائے تو یونس صاحب کے والد بزرگوار نے یہ بچہ انہیں بھینٹ کیا۔ نہرو نے اس کی سیاسی پرورش اور دیکھ بھال کی۔ برصغیر تقسیم ہوا تو اسے اعلیٰ عہدوں پر آزاد ہندوستان کی خدمت کے مواقع فراہم کیے، چنانچہ یونس صاحب کئی اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں بھارت کے سفیر رہے۔

یونس صاحب کے آنے کی اطلاع ہمیں ان کی آمد سے ایک روز پہلے مل گئی۔ چنانچہ سارے کیمپ نے متفقہ طور پر ایک یادداشت تیار کر کے کیمپ کمانڈنٹ کے حوالے کی کہ خود بھی بصیرت حاصل کرے اور تحفۂ اسیراں کی نقلیں اپنے بڑوں کو بھی بھیج دے۔ یادداشت کی موٹی موٹی باتیں یہ تھیں کہ یونس صاحب کی آمد سر آنکھوں پر، مگر انہیں ذرا ہدایت کر دی جائے کہ مندرجہ ذیل موضوعات کو نہ چھیڑیں، ورنہ ہم نقصِ امن کے ذمہ دار نہ ہوں گے: بنگلہ دیش کی آزادی، بھارت کی امن پسندی، بھارتی مسلمانوں کی خوشحالی، بھارت میں سیکولرزم کا بول بالا، ہماری رہائی اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مسئلہ اور بھارت کی ترقی و عظمت وغیرہ۔ یعنی ان دکھتی رگوں کو چھوڑ کر وہ اگر دلی سے آگرہ تک اپنے سفر کا حال یا موسمی کیفیت سے ہمیں آگاہ کرنا چاہیں، تو ہمارے کان حاضر ہیں۔

یونس صاحب تشریف لائے۔ وہ اپنے آبائی علاقے کی مناسبت سے مضبوط رگ و ریشہ کے پیکر تھے اور بھارت میں پروان چڑھنے کے طفیل بھارتی رنگ میں خوب رنگے تھے۔ وہ انگریزی کے علاوہ اردو، پنجابی اور پشتو بخوبی بولتے تھے۔ انہوں نے "السلام وعلیکم" کے بعد کہا "میں یہاں تقریر کرنے نہیں بلکہ آپ سے ملنے آیا ہوں۔ کاش یہ ملاقات جیل کی دیواروں کے باہر ہوتی! بہر حال یہ دور بھی ختم ہو جائے گا۔"

ان تمہیدی الفاظ کے بعد انہوں نے انگریز کے خلاف جنگ آزادی میں اپنے کردار اور سیاسی اسیری کا ذکر کیا۔ پھر بھارت کی آزادی کے بعد اپنی سفارتی مہم پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ میں جس ملک میں بھی بطور سفیر اترا سب سے پہلے میں نے وہاں پاکستان کے سفیر کا پتہ کیا۔ کیونکہ پاکستانی سفیروں سے گفتگو اور ملاقات میں مجھے بہت لطف آتا ہے، کیوں نہ ہو، ہم ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ ایک ہی طرح کا لباس پہنتے ہیں۔ بود و باش کے طور طریقے ایک سے ہیں۔ اقبال پر ہمارا (بھارت کا) بھی اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کا غالب پر۔ ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی تہذیب کے ہم بھی اتنے ہی وارث ہیں، جتنے آپ۔۔۔۔"

جونہی اس نے موہنجوڈارو کے کھنڈروں میں قدم رکھا ۔ گھات نشینوں نے اسے جالیا ۔ چار پانچ آدمی آداب محفل کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بول پڑے ۔ ان کا جوش وخروش دیکھ کر مجھ سے بھی نہ رہا گیا ۔ میں بھی پانچوں سواروں میں شامل ہو گیا پتہ نہیں، دوسروں کے دلائل کیا تھے ، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، یہ چھوٹی سی تقریر جھاڑ دی : '' اگر ہمارے تہذیبی رشتے اتنے ہی گہرے ہیں تو پھر تقسیم کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ کیا یہ درست نہیں کہ ہندوانہ استحصال کے گھاؤ ان رشتوں سے کہیں گہرے ہیں ؟ کیا یہ درست نہیں کہ بھارت نے خلوص دل سے آج تک پاکستان کو قبول نہیں کیا ؟ بھارت پاکستان کی جارحیت کا بہانہ رکھ کر اپنے وسعت پسندانہ عزائم کی آبیاری کر رہا ہے ۔ بھارت کی سرحدیں ایک طرف کوہ ہمالیہ کے دامن کو چھوتی ہیں اور دوسری طرف بحر ہند کی وسعتوں تک چلی گئی ہیں لیکن اس کے باوجود بھارت کا دل چیونٹی کے دل سے بھی چھوٹا ہے ۔ ننھے سے پاکستان پر بھارت کو ہڑپ کرنے کا الزام لگانا تنگ نظری اور تنگ دلی نہیں تو کیا ہے ۔ ۔ ۔ ''

پتہ نہیں میرے لیکچر کا کون سا حصہ یونس کے کانوں تک پہنچا اور کونسا شور وغل میں ڈوب گیا بس جواباً اتنا سنائی دیا کہ 'میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا ۔ ۔ ۔ ' کسی نے بات کاٹی "بحث میں پڑنا نہیں چاہتے تو یہ ممنوعہ موضوع چھیڑا کیوں ۔ ۔ ۔ ہم ایسے لیکچر سن سن کر تنگ آچکے ہیں، ہم نہیں سنیں گے ، نہیں سنیں گے ۔"

یونس نے ڈپلومیٹک قلا بازی کھائی اور یکدم بے مزہ لطیفوں پر اتر آیا اور جونہی فضا ذرا سازگار ہوئی فوراً پسپا ہو گیا ۔ اس کے بعد ہمارے پاس مشق سخن طرازی کے لیے کوئی نہ آیا ۔

نفسیاتی جنگ کا یہ صرف ایک محاذ تھا ۔ اس کے علاوہ دوسرے دو اور محاذ قابل ذکر ہیں، یعنی بھارتی مطبوعات اور بھارتی فلمیں !

ہفت روزہ "آزادی اور جمہوریت" کا حال تو آپ نے پڑھ ہی لیا کہ یہ پرچہ بہ اہتمام خاص صرف ہمارے لیے سفید چکنے کاغذ پر چھپتا تھا ۔ اس میں بھارت کے ممتاز مسلمانوں مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اس قسم کے اقوال ہوتے کہ 'بھارت میں مذہب کی کوئی تمیز نہیں ۔' '' بھارتی آئین تمام باشندوں کو بلا امتیاز نسل و مذہب آگے بڑھنے کا موقع دیتا ہے ۔'' اقوال کے علاوہ ہر شمارے میں کسی ہندو کی لکھی ہوئی نعت رسولؐ ہوتی جس کی اشاعت کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ رسول اکرمؐ کے عقیدت مند مسلمان ہی نہیں، ہندو بھی ہیں ، پھر کدورت کس بات کی ۔ اس دو ورقی پرچے کے باقی صفحات پر کسی مشہور فلم ایکٹرس کی تصویر کے علاوہ بھارت کی ترقی و خوشحالی کی قلمی تصویر بھی ہوتی ۔ کہیں کہیں ایک آدھ مضمون پاکستان کی اقتصادی بدحالی اور معاشی ابتری کے بارے میں بھی ہوتا ۔

"آزادی اور جمہوریت" کے خیالات ومقالات غیر سرکاری لب ولہجے میں عام بھارتی اخبارات میں بھی جلوہ گر نظر آتے ۔ اردو کے اخبارات "پرتاپ" اور "ملاپ" ہوں یا انگریزی کے انڈین ایکسپریس، ہندوستان ٹائمز اور ٹائمز آف انڈیا ۔ روزنامے ہوں یا ہفت روزے، ماہنامے ہوں یا سالنامے ۔ سب ایک ہی نظریے کا پرچار کرتے ۔ صرف لبادہ، وضع قطع اور رنگ مختلف ہوتا ۔ ان سب کی جان بھارتی حکومت کے ہاتھ میں تھی اور یہ سب اپنے آقا کی آواز (HIS MASTER'S VOICE) بلند سے بلند تر سُر تال میں قارئین تک پہنچاتے ۔

ان اخبارات کی خبروں اور تبصروں کا لب لباب کچھ اس طرح ہو تا کہ بھارت ایک عظیم ملک ہے جس میں جاری صنعتوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے، ٹینکوں اور طیاروں کی تیاری اس رفتار سے چل رہی ہے اور ٹریکٹروں اور ریل کے ڈبوں کی ساخت کا کام اس نہج پر چل رہا ہے، پاکستان نے کھاد اور ٹریکٹر باہر سے منگوائے ہیں اور اتنا زرِ مبادلہ خرچ کیا ہے۔ بھارت کی تمام ریاستوں میں صورتِ حال قابو میں ہے اور پاکستان کے صوبوں میں گوریلا جنگ زوروں پر ہے۔ بین الاقوامی سطح پر ایران اور امریکہ نے پاکستان کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اور چین نے بھارت کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔

اب چلتے چلتے بھارتی فلموں پر بھی ایک نظر ڈالتے جائیے۔

△ "تیری صورت میری آنکھیں": ہندو والدین اپنے نوزائیدہ رو سیاہ بچے (اشوک کمار) کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ تو ڈاکٹر یہ بچہ ایک بے اولاد مسلمان طالب حسین کے حوالے کر دیتا ہے۔ بچہ بڑا ہو کر گلوکار بن جاتا ہے۔ ایک دن یہ اپنے "باپ" طالب حسین سے جدا ہو کر مندر میں گھس جاتا ہے اور مورتیوں کو عقیدت سے دیکھنے لگتا ہے۔ ایک مورتی کو ہاتھ لگاتا ہے تو وہ گر جاتی ہے۔ مندر کے پجاری "چور، چور" پکارتے اسے پکڑ لیتے ہیں اور زدوکوب شروع کر دیتے ہیں۔ اتنے میں طالب حسین آ پہنچتا ہے وہ کہتا ہے "اسے کچھ نہ کہو۔ یہ نہ ہندو ہے نہ مسلمان، اس کا دھرم انسانیت ہے۔ یہ دھرم کی گروہ بندیوں سے ناواقف ہے اسے چھوڑ دو۔"

△ "پالکی": اس فلم میں ہیروئن پالکی میں بیٹھی جا رہی ہوتی ہے۔ ایک چوک سے گزرتے وقت گرجا گھر کی گھنٹیاں بجنے کی صدا آتی ہے۔ اگلے چوک میں اذان کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ایک کردار تبصرہ کرتا ہے۔ "کیا گرجا کی منادی اور کیا مؤذن کی اذان سب کا پیغام ایک ہے سب ایک طرف ہی دعوت دیتے ہیں ــ اصلاح کی دعوت!"

△ "میرا محبوب": دو دوست آپس میں اپنے اپنے معاشقے کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک کی محبوبہ مسلمان ہے دوسرے کی ہندو۔ مسلمان محبوبہ کے عاشق سے اس کا دوست پوچھتا ہے "سناؤ یار! تمہاری اُوئی اللہ کا کیا حال ہے؟" دوسرا کہتا ہے "تم بتاؤ، تمہاری ہائے رام کیسی ہے؟" گویا "اُوئی اللہ" اور "ہائے رام" کے الفاظ مختلف ہیں، دل سب کا ایک جیسا ہے، عشق کی واردات سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ عشق ہندو یا مسلمان میں تمیز نہیں کرتا۔ پھر تفرقہ کس بات کا!

△ "آنند" کا ہنس مکھ ہیرو (راجیش کھنہ) سرطان کا مریض ہونے کے باوجود اپنی زندہ دلی برقرار رکھتا ہے اور جدھر جاتا ہے مسکراہٹیں بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ جس سے ملتا ہے، اس کے دل میں خوشی کے پھول کھلا جاتا ہے۔ جس راہ سے گزرتا ہے، اسے کہکشاں بنا جاتا ہے۔ اس کے مداحوں میں ہندو، مسلمان، عیسائی سبھی شامل ہیں۔ کچھ عرصے بعد جب وہ مرض کے ہاتھوں پٹ کر بستر مرگ پر لیٹ جاتا ہے تو اس کا مسلمان دوست مسجد میں جا کر اس کی صحت یابی کی بھیک مانگتا ہے اس کے ہندو دوست کی بیوی پوجا پاٹ کے بعد بھگوان سے اسے صحت عطا کرنے کی درخواست کرتی ہے۔ ہسپتال کی میٹرن (MATRON) گلے میں صلیب کا نشان ڈالے گرجا میں التجائے مسیحائی میں مصروف ہو جاتی ہے۔ گویا آدمی اچھا ہو تو مذہب کو کوئی نہیں پوچھتا!

یہ موضوع خاصا طویل ہے اور مختلف فلموں کا اس نقطۂ نظر سے یہاں تجزیہ کرنا مشکل ہے۔ بس مشتے نمونہ از خروارے والی بات ہے آئیے، اب آخر میں کلچرل شو کا اجمالی خاکہ دیکھ لیجئے، پھر چھٹی!

۴ مارچ ۱۹۷۳ء کو صبح سویرے ہی چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ بھئی دن کو خوب سو لینا، رات کلچرل شو ہے۔ اس خصوصی عنایت کی غرض و غایت فوری طور پر ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ ایک رجائیت پسند ساتھی نے اندازہ لگایا کہ ہم جلد وطن واپس جا رہے ہیں۔ اس لیے ہمارے آقا نے ہماری روانگی سے قبل اپنے ستم کے سارے داغ دھونے کے لیے اس شو کا اہتمام کیا ہے۔ اس پر ایک محبِ وطن بھڑک اٹھا "اگر یہ بات ہے تو ہمیں اس شو کا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ ہمیں یہ داغ دھونے اور چاک رفو کرانے کی کوئی حاجت نہیں۔ یہی داغ، یہی چاک ہماری اسیری کا سرمایہ ہیں۔ ہمیں یہ نشانات صحیح و سالم لے کر پاکستان جانا چاہیئے۔"

لیکن اس محبِ وطن کے مشورے پر عمل کرنے میں دو باتیں حائل تھیں۔ ایک تو اس پروگرام میں نعتوں اور قوالیوں کا عنصر شامل تھا، جسے نظر انداز کرنا سراسر لذتِ سماع اور تطہیرِ روح سے محروم رہنے کے مترادف تھا۔ دوسرے یہ کہ پروگرام جوانوں کے کیمپ میں ہو رہا تھا۔ پروگرام کے طفیل، ان کو ذرا دیکھ لیں گے۔ میرے لیے اس تواضع کا اضافی پہلو یہ بھی تھا کہ شاید اسی بہانے بھارت کی کوئی نئی ادا دیکھنے کا موقع مل جائے۔

چنانچہ اکثریت کی رائے کے مطابق ہم شام کی نماز اور کھانے کے بعد جوانوں کے کیمپ میں گئے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ تمام جوان بیرکوں سے نکل کر تنگ صحن میں سمٹ آئے تھے۔ ان کے ارد گرد خاردار باڑ تھی۔ ہم نے تار میں سے ہاتھ ڈال کر ان سے ہاتھ ملایا اور خیریت دریافت کی۔ وہ سب زمین پر بیٹھ گئے اور ہم باڑ کے باہر بنچوں پر۔ ہمارے بالمقابل بھارتی افسروں کے لیے کرسیاں لگی تھیں۔ وسط میں اونچی جگہ کلچرل شو کے لیے مخصوص تھی۔ فنکار سٹیج کے پیچھے گارڈ روم میں بیٹھے تھے۔

سٹیج پر دری بچھی تھی اور دو لاؤڈ سپیکر موجود تھے۔ ایک اونچا اور دوسرا نیچا۔ پہلا اعلانات کے لیے اور دوسرا فنکاروں کے استعمال کے لیے۔

اس ثقافتی طائفے کے ارکان ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، پنجابی بھی تھے اور اہلِ زبان بھی، عوامی گویے بھی تھے اور مشاق رقاص بھی۔ ان سب کی باگ ڈور ایک کھاگ سکھ کے ہاتھ میں تھی۔ جس نے آغازِ تقریب میں اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں پرانا آئی، سی، ایس (ICS) ہوں۔ حال ہی میں کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوا ہوں، میرا نام کنور مہندر سنگھ ہے۔ شوقیہ شاعری اور بیدی تخلص کرتا ہوں۔ پچھلے دنوں ایک کیمپ میں جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ قیدیوں کی شامیں بوجھل ہوتی ہیں، لہٰذا میں نے آپ کی تفریحِ طبع کے لیے اس تقریب کا اہتمام کیا ہے۔"

ارادہ بہت نیک تھا۔ الفاظ اور لہجہ بھی میٹھا تھا۔ حیرت ہوئی کہ بھارت میں یہ نوازش، یہ کرم کیا معنی؟ بے اختیار داد دینے کو جی چاہا، لیکن خرد نے دامن تھام کر مشورہ دیا کہ ایسی بھی کیا جلدی، ذرا تیل دیکھ، تیل کی دھار دیکھ۔

بیدی نے ہمارے دل موہنے کے لیے تقریب کا آغاز تلاوتِ قرآنِ پاک سے کرایا اور تلاوت کے دوران خود پیٹ پر ہاتھ باندھے، سر گریبان میں ڈالے، مؤدب بیٹھا سنتا رہا اور وقفے وقفے سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتا رہا۔ ہم اسے ایکٹنگ سمجھے۔ لیکن اس کے بعد اس نے اپنی ہی لکھی ہوئی نعتِ رسول سنائی۔ الفاظ خوب تھے اور ادائیگی خوب تر۔ یا الٰہی یہ سکھ کب مسلمان ہو گیا؟ غالباً ہمارے تعجب کو دور کرنے کے لیے ہی اس نے کہا "رسول اللہ پر مسلمانوں کی اجارہ داری نہیں، وہ کامل انسان تھے اور کامل انسان خواہ کسی بھی مذہب سے ہو، قابلِ تعظیم ہے۔ اس کی تقلید ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ میں نے یہی نہیں، کئی نعتیں خلوصِ دل

ـــ ی ہیں اور سماعوں کو سنا کر داد پائی ہے۔ ذرا سنیئے تو عرض کیا ہے۔۔۔"

ہمارے مذہبی جذبات کو گرما کر اس نے فضا ساز گار کر لی۔ پھر وہ اپنی ذات کے واسطے سے تقسیم سے پہلے کی یادیں دہرانے لگا" میں جب لائلپور میں تھا تو مسلمان دوستوں سمیت گنے کے کھیتوں میں آنکھ مچولی کھیلا کرتا تھا۔ خوبصورت بھینسوں کا منوں دودھ پینے کو ہوتا تھا، پنجاب کی دھرتی کے سینے پر چلنے والے گبرو جب 'شاماں آئی ڈانگ' کندھے پر رکھ کر نکلتے تو سلسلۂ کائنات ان کی زیارت کرنے کے لیے تھم جاتا۔ آئیے نا، ذرا جوگی صاحب اپنی مشہور نظم "میرا سوہنا دیس پنجاب" سنائیے۔"

اس کے بعد ایک غیر پنجابی شکل و صورت کے شخص نے مریضانہ لہجے میں پنجابی مٹیاروں کے الہڑ جوبن، دہشت کی ہوسیقی اور شاداب کھیتوں کی بھرپور جوانی کا ذکر کیا۔ اور شاعرانہ انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر خیالی داد وصول کی اور سٹیج سے اتر گیا۔

بیدی پھر سٹیج پر آیا اور کہنے لگا" ہمارا یہی خوبصورت دیس پنجاب اب سیاسی حدوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ طرح طرح کی پابندیوں نے ہمارے جذبات کے دھاروں کو جکڑ رکھا ہے، لیکن یہ پابندیاں دائمی نہیں، یہ جذبات اور رشتے دائمی ہیں۔ (گویا وہ پھر زہریلا ٹیکہ لگا گیا) لیکن چھوڑیئے ان باتوں کو۔ آئیے ایک نوعمر لڑکے کا رقص دیکھئے۔ یہ لڑکا اور اس کا فن پشاور سے لے کر آگرے تک مقبول ہے۔ کیوں نہ ہو ؟ فن کی کوئی جغرافیائی حدیں نہیں ہوتیں (دوسرا ٹیکہ) ابھی بر خوردار ذرا ہو جائے خٹک ڈانس۔۔۔"

اس کے بعد ایک گورا چٹا لڑکا سٹیج پر آیا اور پھدک پھدک کر ڈانس چلا گیا۔ اس طرح باری باری بیدی نے سامعین کے صوبائی جذبات ابھارے۔ پھر کبھی پنجابی گیت اور کبھی پشتو گانے سے انہیں تسکین بخشی اور جہاں کہیں موقع ملا کوئی نہ کوئی زہریلی گرہ لگا دی جس کا مطلب یہ تھا کہ صوبہ سرحد اور صوبہ پنجاب میں کوئی قدر مشترک نہیں، بلکہ بھارت اور پاکستان میں ثقافتی اشتراک زیادہ ہے۔ شاعری اور رقص کے علاوہ دو تین قوالیاں اور دو ایک نعتیں بھی ہوئیں اور یہ محفل کوئی گھنٹہ بھر جاری رہی۔

پھر کسی اعلان کے بہانے بیدی سٹیج پر آیا تو کہنے لگا" بھارتی مسلمانوں میں سے ایک مرکزی وزیر تعلیم (مولانا ابوالکلام آزاد) اور دوسرا صدر مملکت (ڈاکٹر ذاکر حسین) کے عہدے پر فائز رہا۔ اس کے علاوہ بیشمار مسلمان اعلیٰ ملازمتوں میں ہیں۔ (ایک اور ٹیکہ) لیکن میں یہاں سب کا ذکر کرنے کی بجائے صرف ڈاکٹر ذاکر حسین کا ذکر کروں گا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ ان کے جنازے میں ہندو بھی شامل تھے اور عیسائی بھی۔ وہ بھارت کی ایک مقبول شخصیت تھے۔ وہ تنگ مذہبی نظریوں سے بہت بلند تھے۔ وہ اس رتبے پر پہنچ چکے تھے جہاں انسان کا سوائے انسانیت کے کوئی مذہب نہیں رہ جاتا اور ہم سب کو انسانیت کی اس معراج تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے (ایک اور ٹیکہ)"

---

o خوبصورت سجیلی لاٹھی جس کے بند بند پر چمکدار تیل چڑھا ہوتا ہے۔

ا یہ شاعر کا اصلی نام نہیں۔

جب بیدی سٹیج سے اترتا تو بھارتی افسروں کے پاس کرسی پر بیٹھنے کی بجائے ہمارے پاس بنچ پر آ بیٹھتا اور وہ بھی ایسی یگانگت سے کہ گویا برسوں کی دوستی ہے۔ کبھی بے تکلفی سے وہ کسی کی کمر میں اپنا بازو حمائل کر دیتا اور کبھی کسی کے شانے پر دستِ شفقت رکھ کر اسے زیر کرتا۔ وہ پورا اگھاگ تھا اور گرگ بھی۔ وہ فوراً اپنے مخاطب کی کمزور رگ کی شناخت کرتا اور پھر اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے ایک گھنٹے میں نقصان پہنچانے کی جتنی کوشش کی، باقی مقرر شاید دو سال میں نہ کر پائے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ریگِ دریا کی طرح بے بس پڑے ان کے نقوش قبول کرتے رہے حقیقت یہ ہے۔ کہ آبِ رواں پہ تیر چلانے کی یہ بھارتی کوشش سراسر بے نقش اور بے اثر ثابت ہوئی، کیونکہ ہم اس ساری کارگزاری کی ماہیت سے آگاہ تھے۔ ہمیں احساس تھا کہ ہر شیریں کلام کے پیچھے فلاں تھیم (THEME) ہے۔ اگر ایسی کوششوں نے ہم پر چند نقوش چھوڑے بھی تو وہ نفرت کے نقوش تھے۔ بیزاری اور تعفن کے نقوش۔

کلچرل شو کے بعد بھی لوگ بیدی کے زہر آلود ٹیکوں کا ذکر کرتے رہے تھے اور مطالبہ کرتے تھے کہ ثقافتی شو کا یہ ڈھونگ ختم کیا جائے۔ اگر آئندہ ہمیں ایسی "مے ہوشربا" پلانے کی کوشش کی گئی تو ہم جام و سبو توڑ ڈالیں گے، میکدہ تاراج کر دیں گے۔

اس کے بعد نہ کوئی بیدی ثقافتی طائفہ لے کر ہماری شاموں کا بوجھ ہلکا کرنے آیا اور نہ کوئی بونس حق نمک خواری ادا کرنے پہنچا۔ البتہ بھارتی اخبار اور رسالے آتے رہے، لیکن وہ ہمارے ذہنی حصار میں کوئی شگاف نہ ڈال سکے۔ ان کی یلغار سے ہمارا کوئی طاق ٹوٹا نہ سنگ پھوٹا ــ وہ تیر اندازی کرتے رہے اور ہم اندر قلعہ بند ہو کر ان کی کوشش رائیگاں پہ مسکراتے رہے۔

برآبِ نیل

علی اکبر عباس

مجھے اس بات کے اظہار میں قطعاً تامل نہیں کہ علی اکبر عباس نے اپنے شعری مجموعے "برآبِ نیل" میں تازہ کاری کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے اور شعری تمثالوں کی تخلیق سے لے کر زاویۂ نگاہ کی تعمیر تک ندرت اور انفرادیت کا ایک نیا نقش ابھار دیا ہے۔ نئی اردو شاعری میں علی اکبر عباس کی آواز ان تمام منحنی یا توانا آوازوں سے یکسر مختلف ہے جو پچھلے چند برسوں میں سنائی دی ہیں مگر محض مختلف ہونا کوئی خوبی نہیں اصل بات یہ ہے کہ قاری کو کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا بار بار احساس ہوتا ہے کہ آواز کا یہ آہنگ، اور لہجے کی یہ کھنک اور دیکھنے کا یہ زاویہ آج سے پہلے موجود نہیں تھا یا کم از کم اس انداز سے سامنے نہیں آیا تھا۔

"برآبِ نیل" کا مطالعہ کرتے ہوئے میرا اولین تاثر یہ تھا کہ شاعر نے انسانی زندگی کے آشوب کو اس نوعت کی صورت میں دیکھا اور دکھایا ہے جو ایک عام شہری کی روح اور بدن دونوں کو اپنی جراحت سے لہولہان کر دیتا ہے۔ بیسویں صدی کا سب سے بڑا المیہ ہی یہ ہے کہ ہمہ وقت ایک گہرا خوف آسمان سے بے آواز شبنم کی طرح ٹپک رہا ہے اور زمین سے مرغولوں کی صورت اٹھ رہا ہے اور سب انسان اس کی زلفوں میں اسیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ خوف شخصی سطح کا بھی ہے۔ کیونکہ زندگی کی تیز رفتاری نے حادثات کو ہمہ گیر لگا دی ہے اور ایک انوکھا خطرہ ہر دل میں پھڑکنے لگا ہے کہ نہ جانے اگلے ہی قدم پر اس پر کیا گذر جائے اور اجتماعی سطح کا بھی ہے کیونکہ انسان نے ایسے خوفناک ہتھیار بنا لیے ہیں جو نہ جانے کب انسانی زندگی ہی کو ملیا میٹ کر دیں۔ علی اکبر عباس نے بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے خوف کو اس کی ساری جہتوں سمیت محسوس کیا ہے اور بڑے فنکارانہ انداز میں اس کے جملہ پہلوؤں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انسان خود کو ہر وقت حال کے لمحے کی نوک پر لرزتا ہوا پاتا ہے جب کہ خوف اسے مستقبل کی طرف سے ایک تیز جھونکے کی طرح آتا دکھائی دیتا ہے۔ ماضی خوف کی کمین گاہ نہیں انسانی ذہن کا یہ وصف ہے کہ وہ ماضی کی ہر تلخ بات کو جلد از جلد بھلا دینے کی کوشش کرتا ہے اسی لیے ہر گزرا ہوا زمانہ اچھا لگتا ہے اور انسان اسے سنہری دور کے نام سے موسوم کرتا ہے حالانکہ جب وہ زمانہ گذرا تھا تو اپنی ساری خباثتوں اور جراحتوں اور کدورتوں کے ساتھ گذرا تھا مگر اب کہ وہ گذر چکا تو ذہن نے اس کے تاریک پہلوؤں کو تو بھلا دیا اور صرف اچھی چیزوں کو یاد رکھا یہ میں ایک نارمل آدمی کی بات کر رہا ہوں ایک پاگل کا دکھ اس بات میں ہے کہ وہ ماضی کے کسی ایک نقطے پر مستقلاً رک جاتا ہے اور یہ نقطہ پھیل کر اس کے سارے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اسی طرح ایک نیوراتی شخص ماضی کے کسی واقعہ پر اپنے بند بات کو مرکوز کرکے نود کرکے ہر سی کا پنسکس کی زد میں نے آتا ہے مگر ایک نارمل آدمی ماضی کی اچھی یادوں ہی سے سروکار رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کے

لیے ماضی خطرات کا مسکن ہرگز نہیں مگر وہ مستقبل سے خوف زدہ ہے کیونکہ مستقبل حادثات و واقعات اور ان سے پھوٹنے والی کربناک صورت حال کی آماجگاہ ہے مستقبل تو امکانات کی ایک صورت ہے اور لوگ [illegible] کے بجائے خدشے کے قائل ہیں ان کے لیے مستقبل بطور خاص بہت ڈرانے والی چیز ہے۔ اگلے دنوں میں معاشرہ جڑا ہوا تھا آسمان اور زمین کے درمیان آمد و رفت قائم تھی وقت کے تینوں ابعاد ایک دوسرے سے اس طور منسلک تھے کہ ہونے والا ہر واقعہ یا تو تقدیر تھا یا ماضی میں اس کی جڑیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بیسویں صدی میں جب علوم کے افق کشادہ ہوئے تو یہ سارا مذہبی، مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی نظام پارہ پارہ ہو گیا اور انسان بے دست و پا ہو کر زماں کے لمحے پر آ کھڑا ہوا اور پھر مستقبل بوتل میں سے نکلے ہوئے جن کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ توکل اور رضا کے عمل دخل سے انکار کر کے بیسویں صدی کے انسان نے گویا اپنے آپ کو نہ صرف بالکل تنہا کر لیا بلکہ خود کو مستقبل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندہ رہنے کی صورت حال سے بھی دوچار کر دیا۔ یہی بیسویں صدی کی وہ کربناک صورت حال ہے جو علی اکبر عباس کے ہاں پوری شدت اور معنی خیزی کے ساتھ سامنے آئی ہے مثلاً

سمندر خوف سے جمنے لگا ہے — پہاڑوں کا بھی دم گھٹنے لگا ہے
کسی سورج کا ٹکڑا توڑ لائیں — زمیں کا جسم ٹھنڈا پڑ رہا ہے
جائے پناہ مل نہ سکی بے پناہ کو — اس شہر پر عذاب کئی ٹوٹنے کو ہیں
[illegible] سال [illegible] گردش پہ بھی نہیں قدرت — ہمیں یہ خوف مسلط ہے چند برسوں کا
سامنے [illegible] اور پیچھے [illegible] — دائیں بائیں دشمنوں کی خیمہ گاہ
یہ لوہا [illegible] — کھا گئے [illegible] درختوں کی چھاؤں سے
نہ جانے چہرے [illegible] — [illegible] گئیں سکڑ گئیں
پھیلتا جاتا ہے اک جنگل تیرے جسم میں — [illegible] ہماری نہیں

یا پھر ان کی نظم "آئندہ صدیوں کا انسان" سے یہ ٹکڑا دیکھیے:

میں پیدا ہوا تو
مرے چاروں جانب تھے پھیلے ہوئے
خوف چہرے
ہراساں دہشت زدہ کالی آنکھیں
[illegible] شناساں جسم اور لڑکھڑاتی ہوئی زرد بینائیاں
وہ لب کھیتیاں ایسے بنجر
جہاں اک بھی بالی نہ تھی لفظوں کی شاداب فصلیں
عجب بات تھی ان کے سارے بدن کا گداز
ان کے ہاتھوں میں سمٹا ہوا تھا۔

—— میں جب مسکرایا
ذرہ چیخ اٹھے
ہواؤں سے سرگوشیاں کیں۔
کہ آئندہ صدیوں کا انسان تمہاری صدی میں جنم لے چکا ہے۔
وہ انسان —— وہ جو
زمانے کی تینوں حدیں آنکھ کی پتلیوں میں اتارے گا اور پھر
فنا کی حدیں توڑ دے گا۔

خیال انگیز نکتہ یہ ہے کہ علی اکبر عباس نے نہ صرف بیسویں صدی کے کرب کی تشخیص کی ہے بلکہ نسخہ بھی تجویز کر دیا ہے۔ وہ خوف کو آج کے سارے دکھوں کا کارن سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ خوف انسان کے لخت لخت ہو جانے کے باعث ہے یعنی آسمان اور زمین کے رشتے کے ٹوٹنے اور وقت کی تینوں حدوں کے ایک دوسرے سے الگ ہو جانے کے باعث انسان خوف کی زد میں آ گیا ہے لہٰذا وہ ایسے انسان کی بشارت دیتا ہے جو آئے گا اور وقت کی تینوں حدیں آنکھ کی پتلیوں میں اتار دے گا اور نتیجتاً فنا کی حدیں توڑ دے گا۔

یہ سارا خوف دراصل فنا ہو جانے کا خوف ہے۔ اس کا مداوا محض یہ نہیں کہ خوف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندہ رہا جائے جیسا کہ بیشتر موجودیت پسندوں کا عقیدہ ہے یا خوف کو خوف ہی کے ہتھیار سے شکست دی جائے جیسا کہ خود علی اکبر عباس نے "تلاش گھر" میں "آؤ آج سے ہم بھی ۔ خوف خوف ہو جائیں" کے اعلان سے کیا ہے بلکہ یہ کہ اس خوف کی اصل دریافت کی جائے جو لخت ہونے یعنی جزو کے کل سے کٹ جانے میں مضمر ہے لہٰذا علی اکبر عباس کا رویہ انتہائی صحت مندانہ ہے کہ وہ فرد کی ذات میں چھپے ہوئے وقت کے تینوں ابعاد کو سطح پر لا کر انہیں جوڑ دیتا ہے اور یوں گویا زمین اور آسمان شعور اور لاشعور اور موجود اور ماورا کے درمیان آمد و رفت کے سلسلے کو بحال کرنے کی سعی کرتا ہے۔ یہی علی اکبر عباس کا شعری رویہ ہے جس کی انفرادیت کا نقش شعر کے ہر دانشمند قاری کے لیے قابلِ مطالعہ ہے۔

علی اکبر عباس کے ہاں جوڑنے کا یہ عمل عمودی ہی نہیں افقی حیثیت بھی رکھتا ہے یعنی وہ موجود اور ماورا ہی کو باہم مربوط دیکھنے کا آرزو مند نہیں بلکہ موجود کے اندر پیدا ہونے والے فاصلوں اور خلیجوں کو مٹا دینے کے لیے بھی کوشاں ہے۔ یہ بات میں انسان دوستی کے پیش پا افتادہ نعرے کو علی اکبر عباس کی تحویل میں دینے کے لیے نہیں کہہ رہا بلکہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ علی اکبر عباس کے ہاں موجود کے بطون میں پیدا ہونے والی تفریق ختم ہوئی ہے نیز اس نے زمینی ڈراما اور انسانی ڈراما میں کوئی فاصلہ باقی نہیں رہنے دیا اور طرح زمانے میں جب معاشرے کا اجتماعی لاشعور متحرک ہوا تو نہ صرف آسمان کو زمین کے اوصاف ودیعت کر دیئے گئے یعنی دیوتاؤں کو انسانوں کی صورت عطا کر دی گئی بلکہ انسانوں اور دیوتاؤں میں کئی سطحوں پر رشتے بھی قائم ہو گئے یہ گویا پوری کائنات کو ایک اکائی میں ڈھالنے کی کوشش تھی۔ علی اکبر عباس کے ہاں اسطور سازی کا یہ عمل تو ظاہر نہیں ہوا اور نہ اس کے ہاں کوئی قابلِ ذکر اسطوری تناظر ہی موجود ہے مگر اس نے خالص شعری سطح پر زمین کے معاشرے کی یوں توسیع کی ہے کہ اس میں جملہ آسمانی عناصر اور کردار

بھی شامل ہو گئے ہیں۔ مثلاً علی اکبر عباس کا معاشرہ بنیادی طور پر ایک دیہاتی معاشرہ ہے جس میں کھیتوں کھلیانوں کی فراوانی ہے اور جہاں زمانے کے تینوں سفون آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ اس معاشرے کا مرکز وہ آنگن ہے جس میں انسان اور اس کی نسلیں ہزاروں برس سے ایک خاص وضع کا ڈراما کھیلتی آئی ہیں۔ ایک ایسا ڈراما جو معاشرہ کی بقا کے لیے ناگزیر ہے مگر علی اکبر عباس نے آنگن کے اس ڈراما کی ارد گرد کے ماحول تک توسیع کر دی ہے ۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ارد گرد کا ماحول گھر کے آنگن میں اتر آیا ہے اور اس کے کردار آنگن کے کرداروں کے روپ میں نظر آنے لگے ہیں مثلاً

مائیوں بیٹھی دلہن سرسوں، سہرے دار کماد
جھکے ہیں کیسے ناچیں دلہن کی ہم راد
بیری مائی تسبیح تھامے دانہ دانہ پھینکے
من ہی من میں کبھی جائے کراپنے دن یاد
مست ملنگ کھجور، گلے میں مالا، بال بکھیرے
دید میں آکر جھوم رہے ہیں ہر غم سے آزاد
کوے بھانڈ فقیر کبوتر ٹولی ٹولی آئیں
اور دعائیں مانگیں وہڑہ سدا رہے آباد

یہ مثال ANIMATION کی مثال بھی ہے کہ شاعر نے جانوروں اور درختوں کو انسانی روپ دیدیا ہے مگر علی اکبر عباس نے اس سے بعد ایک اور قدم بھی اٹھایا ہے یعنی گاؤں کے وہڑے کی توسیع اتنی زیادہ کر دی ہے کہ اس میں جملہ زمینی اور آسمانی مظاہر بھی سمٹ آئے ہیں۔ یہ چند مثالیں دیکھئے۔

اپلوں سے پھول منڈیروں پر صحنوں میں بھولی بچ کلیاں
اور چاندکی کی روٹی پر تاروں جیسی مکھن کی ڈلیاں

کلاہ برف گرے گی زمیں کے قدموں پر
پڑی جو دھوپ پہاڑوں کے تاج اتریں گے

اندھیرا جگنوؤں کا سہرا باندھ کر آیا
بچھائی اوس نے مسند گلابوں پر

مچلنے بچے پہاڑوں کی گود میں اشجار
ہے ابر سایہ سپردست مہرباں کی طرح

یا پھر اس قسم کے مصرعے۔

تھال امبر پھیلا رہا کا بھرا ہے کھلی جوار کا

سمندر کی رگوں میں زہر اترا گو سارس کا

سورج گیند زمیں سے کھیل رہا ہے

بوڑھی شام نے بالوں میں مہندی نکھرائی

وہ زمین ہے ماں میری جس کا باپ سورج ہے۔

علی اکبر عباس کے ہاں زمین ایک عورت بلکہ ماں کے روپ میں اور اس کے گھر کا آنگن آسمان تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ زمین ہی کائنات میں سب سے اہم رشتہ ماں اور بچے کا رشتہ قرار پاتا ہے حقیقتاً یہ رشتہ تخلیق کے عمل کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ لہذا اکبر عباس کے ہاں پوری کائنات اپنی تخلیقی سطح پر سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے

ابھی میرے پاس علی اکبر عباس کی شاعری کے بارے میں کہنے کی باتیں بہت ہیں مگر وقت کم ہے انشاءاللہ کسی صحبت میں مزید گزارشات پیش کروں گا۔ فی الحال علی اکبر عباس کے ان چند اشعار پر اختتام کلام ہے جو مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔

ہوا میں لفظ لکھے جا رہے ہیں   کوئی زخمی پرندہ اڑ رہا ہے

محور سے ٹوٹ جائیں ستارے تو راکھ ہیں   ان کا ہی کچھ شمار ہے جن کا مدار ہے

میں صدا جو دیتا ہوں ہونٹ سب کے ہلتے ہیں   روح بن کے میں بے حس پیکروں میں اترا ہوں

کہیں ہے کوئی سرحد بھی آسماں کی طرح   ستارے اس کی غذا وقت آشیاں کی طرح

یہاں کبھی بھی مخالف ہوا نہیں چلتی   کہ ایک سمت ہی اشجار کا جھکاؤ ہے

ڈاکٹر وزیر آغا

مضامین

محمد کاظم

لارڈ میکالے نے ۱۸۳۵ء میں غلام ہندوستان کے لئے نصاب تعلیم وضع کرتے وقت یورپ کی منتخب کتابوں کی ایک المماری کو عربی اور سنسکرت کے سارے کے سارے ادبی اور علمی ذخائر پر بھاری قرار دیا تھا۔ پھر سر سید احمد خان کو اپنے سفر کے دوران معلوم ہوا کہ وہ تمام تر خوبیاں جو خدا کسی قوم کو ودیعت کر سکتا ہے۔ اہل یورپ انگلستان اور خصوصاً انگریزوں میں موجود ہیں اس کے بعد حالی نے مشورہ دیا کہ قوم اور ادب ہر دو کی ترقی کے لئے پیروئ مغرب لازمی ہے۔ تب سے اب تک ہم پیروئ مغرب میں مبتلا ہیں۔ مبتلا کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ ہم مغرب کی پیروی میں جوں جوں آگے بڑھتے گئے اپنے علمی اور ادبی سرچشموں سے دور ہوتے گئے۔ ہم نے میکالے سے پہلے کے زیر اثر عربی زبان و ادب سے شغف کو لاحاصل جانا اور مغربی ادبیات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ مغرب کی پیروی میں ہمارا ادب جدید بنا اور اس نے ترقی کی بہت سی منازل طے کیں مگر اس دھن میں ہم اپنے ان فکری اور تہذیبی سرچشموں سے محروم ہو کر رہ گئے جو عربی اور فارسی ادبیات کی سرزمین سے پھوٹتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ جیسا عربی شاعر تو کیا پیدا ہوتا، کوئی ایسا شخص بھی پیدا نہ ہوا، جو ہمیں یہ بتاتا کہ جب ہمارے علامہ اقبال مسجد قرطبہ میں بیٹھے مسلمانوں کے شاندار ماضی کے حوالے سے کسی اور زمانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ عین اس زمانے میں مصر کے عظیم شاعر احمد شوقی بھی اندلس کے قصر زہرا میں کھڑے اسلاف کا نوحہ کر رہے تھے اور ان کی آنکھیں دمشق کی زبوں حالی پر اشکبار تھیں۔ مژدہ ہو کہ ایسا ایک شخص محمد کاظم کے نام سے ہمارے ادبی افق پر نمودار ہو چکا ہے جو ہم پاکستانیوں اور عربوں کے درد مشترک کا تخلیقی سطح پر اظہار کر سکتا ہے اور مجھے اقبال اور شوقی کے درمیان درد کے گہرے رشتے کا علم انہی کے ایک مضمون سے ہوا ہے۔

سید محمد کاظم پانی اور بجلی کے ترقیاتی ادارے میں چیف انجینئر ہیں مگر خدا جانے واپڈا کو اس کی خبر ہے کہ انہیں کہ ترپن سالہ محمد کاظم گزشتہ ربع صدی سے پاکستان اور دنیائے عرب کے درمیان ایک ایسا پل بنانے میں مصروف ہیں جس پر سے فکر و خیال اور اندیشہ و احساس کی سواریوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔ محمد کاظم اب تک نصف درجن سے زائد دینی کتابوں کو اردو سے عربی میں منتقل کر چکے ہیں۔ فلسطینی شاعری کے وہ نثری تراجم پیش کر چکے ہیں جو امجد اسلام امجد کے خوبصورت شعری مجموعہ "عکس" کی اساس ہیں اور اب عربی شعر و ادب سے متعلق ان کے نو مضامین کا مجموعہ منظر عام پر آیا ہے "مضامین" کے حرف اول" میں محمد کاظم گزشتہ پندرہ برس کے دوران رسالہ "سویرا" میں وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے ان

مقالات کے بارے میں ہمیں بتاتے ہیں کہ ۔

"ان مضامین کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ یہ بجائے عربی ادب پندرہ صدیوں پہ پھیلے ہوئے طویل و عریض کینوس کو یک دم روشن کرنے کے، اس کے بعض چیدہ چیدہ حصوں پر ایک ضیا ئے مرکز ڈالتے ہیں اور اپنے وقت کے کسی اہم شاعر کی شخصیت فن کو اس طرح سامنے لاتے ہیں کہ آج کے جدید ذہن کے لئے نہ صرف اس شاعر کی ذات بلکہ اس کا پورا زمانی و مکانی ماحول بھی اجاگر ہوا اٹھتا ہے اس رخ سے اگر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان مضامین کا دائرہ اتنا محدود بھی نہیں ہے، اس لئے کہ ان میں عربی شعروادب کے جن موضوعات یا جن شخصیات کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے ان کا زمانہ دور جاہلیت سے لے کر آج تک یعنی ان پوری پندرہ صدیوں پہ پھیلا ہوا ہے"۔

ذرا شعرالعجم، تنقید شعرالعجم اور سخندان فارس کو دھیان میں لایئے ان عہد آفریں تصنیفات سے ہوتے ہوئے فارسی زبان وادب پر ڈاکٹر سید عبداللہ کے مقالات تک آجایئے اور پھر عربی ادبیات کی تاریخ و تنقید کے میدان پر نگاہ دوڑایئے تو یہاں آپ کو کوئی شبلی یا محمود شیرانی، آزاد یا سید عبداللہ نظر آئے گا بس لے دے کے رشید احمد صدیقی کی "طنزیات ومضحکات" سید عبداللہ کے مقالہ "مسلمانوں کے ادب میں طنز و مزاح کے تنوعات" اور الف لیلہ پر مظفر علی سید کے تعارفی مضمون میں عربی ادب سے سرسری اعتنا کی چند مثالیں نظر آئیں گی۔ تب آپ کو محمد کاظم کے یہ مضامین اردو ادب میں ایک نئی سرزمین کی دریافت کی بشارت دیں گے۔ "مضامین" میں ہم عربی کے ابوالشعراء امراؤالقیس کے ہمراہ دورجاہلیت کی نقافتوں کی سیر کرتے ہیں، خنساء کے ساتھ دورجاہلیت سے اسلام کے قرن اوّل میں داخل ہوتے ہیں۔ دورعباسی کی شعری روایت کے سب سے بڑے امین اور ترجمان ابونواس کی صحبت میں عرب اور عجم کے تہذیبی لین دین کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ بغداد، بصرہ اور قاہرہ کے قہوہ خانوں میں داستان گوؤں کو قرون وسطیٰ کی زندگی میں رنج و راحت کے بھرپور ڈرامے کو "الف لیلہ" کے قالب میں ڈھالتے دیکھتے ہیں اور پھر کتاب کے آخری پانچ مضامین میں آج کے عرب ذہن سے متعارف ہوتے ہیں۔

محمد کاظم اردو کے ایک معروف سفرنامہ نگار بھی ہیں ان کے سفرنامہ "مغربی جرمنی میں ایک برس" کے چند ابواب رسالہ "فنون" میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان کے مطالعے کے بعد زیرنظر مضامین کی فکری شگفتگی اور تخلیقی نثر کا راز آپ سے آپ معلوم ہوجاتا ہے محمد کاظم محقق اور نقاد سے پہلے ایک تخلیقی نثر نگار ہیں "مضامین" میں تحقیق، تنقید اور تخلیق کا جو حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ اس سے پہلے اردو ادب میں صرف میرا جی کے ان مضامین میں موجود ہے جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء تک رسالہ "ادبی دنیا" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے جنہیں اب سے بیس برس پہلے مولانا صلاح الدین احمد نے "مشرق اور مغرب کے نغمے" کے نام سے کتابی صورت میں یکجا کر دیا تھا۔ محمد کاظم کے "مضامین" اس اعتبار سے "مشرق اور مغرب کے نغمے" کی توسیع بھی ہیں اور تکملہ بھی کہ میرا جی کا مشرق چین، جاپان، ہند چینی اور بھارت تک محدود ہے "خیمے کے آس پاس" میں میرا جی ایران تک پہنچ گئے تھے اور اب محمد کاظم ہمیں خیمے کے اندر لے گئے ہیں۔ زمانی اعتبار سے میرا جی دنیائے مشرق کے قرون وسطیٰ سے آگے نہیں بڑھے اور محمد کاظم ہمیں عہد جدید کے ہنگاموں سے آشنا کر کے عربی شاعری کی موجودہ اور

تازہ ترین صورتِ حال کا شعور بخشتے ہیں۔ جدید اور عصری ادب پر قلم اٹھاتے وقت محمد کاظم نے "یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ آج کے زیادہ سے زیادہ جذباتی و فکری رجحانات کی ایک جھلک نظر آ جائے اور اردو کے قاری کو یہ اندازہ ہو سکے کہ اس کے معاصر عربی شاعر کا نیا احساس کیا ہے؟ اس کے مسائل کیا ہیں اور وہ اس احساس و شعور کے اظہار کے لئے کس قسم کے فنی تجربوں میں سے گزر رہا ہے۔" عربی شاعری کے جدید اور نئے ادوار اور جون ۱۹۶۷ء کی شکست کے بعد کی عربی شاعری اور افسانے پر مضامین کے ساتھ ساتھ فلسطینی شاعر محمود درویش کی خود نوشت اور فلسطینی شاعرہ فدوی طوقان کی ڈائری کے اندراجات کے تراجم کی وساطت سے محمد کاظم نے ہمیں آج کی دنیائے عرب کے قلب و روح میں برپا طوفانوں سے آشنا کر کے یہ احساس دلایا ہے کہ ہم عصر عرب ذہن کو ہم صرف عصری ادب کے ذریعے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ فدوی طوقان کی ڈائری کے دو اندراج ملاحظہ ہوں۔

۱۔ "عرب رجعت پسندی روز بروز قوت پکڑ رہی ہے اس کی وجہ وہ دولت ہے جو ریگزاروں سے ابل کر نکلی ہے اور عرب ترقی پسندی ہنوز عالم طفلی میں ہے اس کی عقل ابھی خام ہے لیکن اس کی زبان کافی دراز ہے ۔ اسے ایک خاص اسلوب کی ضرورت ہے اور "تنظیم کی بھی"۔

۲۔ "عرب ممالک کی عام فضا میں کسی آنے والے شر کے آثار ہیں۔ مجھے نہ سکون قلب میسر ہے اور نہ مستقبل کی طرف سے طمانیت حاصل ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بے یار و مددگار اور ہزیمت اس کا مقدر، میرا اندرونی احساس آج کل یہی ہے"۔

اور اب فلسطین ہی کے ایک شاعر محمود درویش کی سنیے۔

"عرب دنیا میں ادبا اور تنقید نگاروں کے درمیان اکثر یہ بحث چلتی ہے کہ اسرائیل میں عربی کی اس تحریک کو کیا نام دیا جائے۔ جس کی نمائندگی سمیح القاسم، توفیق زیاد، سالم جبران اور میں بہت نمایاں طور پر کرتے ہیں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ "مزاحمانہ شاعری" ہے اور جاہرے ایک معروف نقاد رجا النقاش لکھتے ہیں کہ ہم ایسی شاعری کو مزاحمت کی شاعری کا نام دے سکتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ ان سب شاعروں کا نقطۂ آغاز یہ اعتراف ہے کہ فلسطین میں یہودیوں اور عربوں دونوں کو رہنے کا حق حاصل ہے۔ اس لئے زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ ہم ایسے شاعروں کو شعرائے احتجاج یا شعرائے بحث و جدال کا نام دیں"

ان اقتباسات میں ہم اس طرز فکر و احساس سے دوچار ہوتے ہیں جو مقبوضہ فلسطین کے اندر تخلیق ہونے والی شاعری میں موجزن ہے اور محمود درویش اور سمیح القاسم کی سی حوصلہ مند اور پُرامید آوازیں جس کی بہترین نمائندہ ہیں۔ مقبوضہ فلسطین سے باہر تخلیق ہونے والی شاعری میں عرب نوجوانوں کی برہمی اور نظام ملوکیت کے خلاف نفرت کا اندازہ صلاح عبدالصبور کی نظم "بادشاہ عجیب ابن خصیب کی ڈائری" کے صرف ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے ہو سکتا ہے۔

"میں نے فرمایا۔ والی زور بازو سے نہیں، میراث میں پائی ہے اپنے ستائیسویں جد اعلیٰ سے (اگر حرام کاری نے ہمارے خون میں ملاوٹ نہیں کر دی)

پھر بھی میں اپنے جلد کی اس تصویر سے کتنا مشابہ ہوں جو اس کے مصور نے بنائی تھی!
(اس مصور پر سنا ہے ملکہ عالیہ کی نظر تھی)
اور باوجود نیلگاہ سے نکل گئے کے — میں نے حرا کی بیٹیوں کو جانا پہچانا
ان کی رونڈیاں، جب شام کا اندھیرا چھانے لگتا، میرے پاس چلی آتیں — میرے پہلو میں سو کر لہو و لعب کرتیں۔
مجھے وہ سب کچھ — سرگوشی میں — بتاتیں جو میرے نیلگاہ کا راز تھا"

عربوں سے پرانے دینی و روحانی اور نئے تجارتی و کاروباری رشتوں کے پیش نظر محمد کاظم کے ان "مضامین" کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے اور دل سے دعا نکلتی ہے کہ ان مضامین کے ساتھ عرب سائنس کے جس کام کی ابتدا ہوئی ہے وہ برق رفتاری کے ساتھ پروان چڑھے اس لئے کہ ہمارے ہاں عرب شناسی ہی خود شناسی کا [illegible] ہے۔

فتح محمد ملک

ساتواں در

امجد اسلام امجد

امجد اسلام امجد، اس نسل کا نمائندہ ترین شاعر ہے۔ جو ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد ہمارے ادبی افق پر نمودار ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی کے لفظوں میں ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء ہماری قومی تاریخ کا وہ باب منور ہے جس سے قومی خود شناسی اور اجتماعی احساس کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ ۶ ستمبر کو ہم پر اپنے دوستوں اور دشمنوں کی پہچان ہی طلوع نہیں ہوئی بلکہ خود اپنے خون میں رچی ہوئی روایات کی قوت اور امکانات بھی یک بیک آشکار ہو گئے۔ ادبی اور تہذیبی سطح پر ۶ ستمبر ہمارے ہاں اس طرز احساس کا سرچشمہ ہے جو آزاد خیالی کو اسلامیت سے اور انسان دوستی کو پاکستانیت سے متصادم نہیں بلکہ ہم آہنگ پاتا ہے، جو محمد صفدر میر سے "سیالکوٹ کی فصیل" کی سی نظمیں تخلیق کراتا ہے تو احمد ندیم قاسمی کے ہاں شہیدوں کی طرح زندہ رہنے کا عزم پیدا کرتا ہے۔ یہاں مجھے الطاف گوہر یاد آتے ہیں جنہوں نے تاشقند سے یہ حکم نامہ جاری کیا تھا کہ معرکۂ ستمبر میں کام آنے والوں کو شہید اور کامران ہونے والوں کو غازی نہ کہا جائے اور بھارت کو دشمن کی بجائے ماں جایا ہمسایہ کہا جائے۔ ۶ ستمبر کے ساتھ اعلان تاشقند کی یاد یوں آئی کہ ابھی ہمارے ادیب و شاعر احمد ندیم قاسمی کی نظموں "۶ ستمبر" اور نگار رواں ستاروں کا، محمد صفدر میر کی نظم "سیالکوٹ کی فصیل" اور معرکۂ ستمبر کے محاذوں پر دادِ شجاعت دینے والے جوانوں کے روشن بدن سے مصروف جہاد سبز پوشوں کے ظہور سے برآمد ہونے والی نئی بصیرت کو اپنے تخلیقی شعور کا حصہ بنانے میں کوشاں تھے کہ الطاف گوہر دانشوروں سے سرکاری اجتماعات میں عشق کی بجائے عقل، جنوں کی بجائے مصلحت اور جوش کی بجائے ہوش سے کام لینے کی تبلیغ میں عیاری گفتار کے جوہر دکھانے لگے اور یوں ہمارے ہاں ۶ ستمبر کے باب منور میں شہیدوں کے لہو سے لکھے ہوئے عشق و جنوں کے مقابلے میں اعلان تاشقند سے برآمد ہونے والے عقل و ہوش کی بات چلی تب اسلام امجد نے اعلان کیا ع

میں ہوش والوں کی بدحواسی کا نوحہ گر ہوں

امجد اسلام امجد ان شاعروں کا ممتاز ترین نمائندہ ہے۔ جن کے نزدیک کائنات کی سب سے بڑی مہم پادر عشق و

جنوں ہے، جن کے ہاں پاکستانی قوم کی عظمت، افراد کی تعداد، جغرافیائی حدود، یا مادی ساز و سامان سے نہیں بلکہ تیرہ صدیوں پر محیط ماضی کی زندہ قوت اور ابد تک پھیلے ہوئے فرد کے اعلیٰ خوابوں سے متعین ہوتی ہے اور جو دنیا میں ظالم اور مظلوم کے درمیان برپا جنگ کے ہر محاذ پر پاکستانی مسلمانوں کی حیثیت سے ظالموں کے خلاف صف آرا نظر آتے ہیں۔

میں اب سے دس برس پہلے کی وہ شام کبھی نہیں بھول سکتا جب میں نے محمد حنیف رامے کے رسالہ "نصرت" میں امجد اسلام امجد کی نظم "ہوائے شہر وفا شعاراں" پڑھی تھی۔ میں مسرت اور سرشاری کی وہ کیفیت کبھی نہیں بھول سکتا جس کے ساتھ میں نے یہ نظم بار بار پڑھی تھی اور دوستوں کو یوں سنائی تھی جیسے یہ نظم امجد کی نہیں خود میری تخلیق ہو۔ اس تعارف کے بعد میں امجد اسلام امجد کی نظموں کے انتظار میں رہنے لگا تھا۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب "ضرب" داروں کی مدح سرائی حد سے گزر چکی تھی سنگینوں میں علم کا پرچم کھل چکا تھا جس ماں کھلے سروں سے ابرِ سفل کو بددعا دینے میں مصروف تھیں۔ تو سر بریا میں ابھی چوڑیاں مردوں کو قتل کرتے ہوئے عقل والوں کی تاویلیں جنوں فرما رہی تھیں۔ ہوائے شہر وفا شعاراں کے دامن میں بوئے مصلحت بسی ہوئی تھی اور دریا کا رستہ سروں کی کثرت سے پٹ چکا تھا۔ ایوب آمریت کے خلاف سرفروشی کی ابتدا کا یہ زمانہ امجد اسلام امجد کے فنی سفر کے آغاز کا زمانہ بھی ہے۔ چنانچہ امجد کی فنی شخصیت کی صورت گری میں عوامی جمہوری جدوجہد اور ضمیر کا طرہ احساس ماہ گیر آمیز نظر آتے ہیں جہاں تک سیاسی شعور کا تعلق ہے "برزخ" سے لے کر "ساتواں در" تک امجد گہری دردمندی توانا رجائیت اور مردانہ استقلال کے ساتھ وطن عزیز کے مظلوم و مجبور اور غریب و بے نوا طبقوں سے فکر و احساس کی سطح پر وابستہ نظر آتے ہیں ؂

دیارِ ذہن میں جلتے ہوئے چراغ، سحر
تری ضیاء تو کوئی اور راہ پائے گی
یہ موجِ سیل ہے، رستہ بنا ہی لے گی
مگر یہ شہر سے تاریک بستیاں میری

یہاں چراغ نہیں، سورجوں کی حاجت ہے
ہمارے خوں سے مہکتے ہوئے جواں سورج
زمانے بھر کے غریبوں کے ترجماں سورج
جہاں جہاں ہے اندھیرا وہاں وہاں سورج

میں ایسے لفظ لکھوں گا جو سب کے دل میں ہیں
فقط وہ بات کروں گا جو سب سمجھتے ہیں
اور ایسے رنگ چنوں گا جو میری رگ میں ہیں

(نئے لفظوں کی خوشبو)

عوام دوستی اور گہری اور رچی ہوئی انسانیت کی یہ خوشبو لوک گیت کی سی سادہ پرکاری کے ساتھ ۱۹۷۷ میں شائع ہونے والی نظم "ایک سوال" میں رقصاں ہے ؂

قریہ قریہ پوچھ رہی ہے خلقت ایک سوال
کب ٹوٹے گا سر سے ہمارے لوہے کا یہ جال
لوہے کا یہ جال کہ جس میں
تیس برس سے قید ہیں اپنے سارے خواب و خیال

بحیرہ ماہ و سال

قریہ قریہ پوچھ رہی ہے خلقت ایک سوال
کب تک اس مٹی کے بیٹے ہوں گے یوں بے حال
کب تک ہم کو بننا ہوگا — نیلامی کا مال

(ایک سوال)

ے اور اب آیئے ۶ ستمبر کے طرزِ احساس کی جانب یہاں تو سیاسی شعور اور معاشرتی ذمہ داری کا وہ احساس جس کی ے تشکیل اور پرورش کی گئی ہیں، اسی قومی طرزِ احساس کا مظہر ہیں جو ۶ ستمبر کو ہمارے ہاں بھرپور انداز سے ظاہر ہوا “ اور ۶ ستمبر سے پہلے کی ترقی پسند شاعری میں گہری مماثلت نمایاں ہے۔ اگر کوئی چیز ”ایک سوال“ اور ” کو جداگانہ رنگ و آہنگ بخشتی ہے تو وہ سرزمینِ پاکستان سے سچی محبت ہے جو ”اے وطن کی ہوا“ اور وطن کی مٹی . “ کی سی نظموں میں جلوہ گر ہے اور جو ۱۹۷۱ء میں پاکستان کی تقسیم کے المیے پر ابھرے یہ کہہ کر اعتراف کراتی ہے۔

ہم گنہگار ہیں ....
اے زمین وطن ہم گنہگار ہیں۔

جس وقت سن اکہتر کے المیے کے سیاسی اور انتظامی کردار اپنے چہرے کی کالک دوسروں کے منہ پر ملنے پہ کوشاں تھے ہیں اس وقت ہمارا شاعر اس المیے کی ساری ذمہ داری اپنی گردن پہ لے رہا تھا۔ شکست انا یہ ”فریب خوردہ نسل کا عہد نامہ“ اور ”نئی نسل کا نوحہ“ میں امجد اسلام امجد نے بڑی بہادری کے ساتھ شکست کا تجزیہ کیا ہے۔ امجد نے شکست مانی ہے مگر وہ شکست خوردگی کا شکار نہیں ہوئے۔ احمد ندیم قاسمی کی ایک نظم سے الفاظ مستعار لوں تو امجد نے شکست کو فتح کا رسول بنانے کی ٹھانی ہے اور یہی ہے وہ طرزِ احساس جو معرکۂ ستمبر نے ہمیں دیا اور جس کے زیرِ اثر امجد نے پاکستان کی تقسیم کے المیے کو فلسطین کے المیے اور بالخصوص جون ۶۷ء میں عربوں کی شکست کے المیے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ عکس “کے نام سے فلسطین کی مزاحمتی شاعری کے تراجم کو میں اس اعتبار سے امجد اسلام امجد کی سراسر ذاتی شاعری مانتا ہوں کہ ان تخلیقی تراجم کے ذریعہ امجد نے ہمیں شکست خوردگی سے بچا کر مزاحمت کی راہ پہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے اعلان تاشقند اور پھر معاہدۂ شملہ کی جبریت نے ہمیں ۶ ستمبر کے شہیدوں اور غازیوں کو فراموش کر دینے پر آمادہ کیا اور یوں ہمارے ہاں ۶ ستمبر اور ۲۳ مارچ اجتماعی حافظے کی سرسبزی و شادابی کی جذباتی اور روحانی واردات کی بجائے

فقط قومی پریڈوں کے مظاہرے اور صرف سرکاری عمارتوں پر چراغاں کا نام بن کر رہ گئے ہیں۔ ایسے میں امجد ہی جذبۂ حریت اور جوشِ مزاحمت کی دولتِ نایاب سے مالا مال کر دینے کی فکر میں ہیں۔

یہ طرزِ فکر و احساس اگر ایک طرف "نئے پرانے" کے سلسلۂ معاملات کو جنم دیتا ہے تو دوسری طرف امجد کی عشقیہ شاعری کو بھی عجب رعنائی بخشتا ہے۔ من و تُو کے رشتوں اور ہجر و فراق کی کیفیات کو امجد نے پھول، خوشبو اور ہوا کی علامتوں میں جس دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس کی داد صبا دعا لندھری ہی دے سکتے ہیں۔ جنہیں بجا طور پر امجد کی شاعری میں پھول رُت کا احساس ہوتا ہے۔ امجد اسلام امجد کی شاعری کے سب سے بڑے کردار ہوا کی بہ در تہ معنویتیں ڈاکٹر محمد اجمل کے نفسیاتی تجزیے کی محتاج ہیں تو امجد کی جو ادا اسے نئی نسل کا محبوب ترین شاعر بناتی ہے وہ یہ ہے کہ امجد اسلام امجد تاشقند پیسرٹ کا نہیں لاہور پیسرٹ کا شاعر ہے۔ مزاحمت و سرفروشی کا یہی جذبۂ لاہور وہ "ساتواں در" ہے جسے کھولنے سے ہوش مندوں نے ہمیشہ منع کیا ہے مگر امجد اسلام امجد کہ ہوش والوں کی بدحواسی کے نوحہ گر ہیں۔ اس "ساتویں در" کو کھولنے سے باز نہیں آتے۔

یاد پڑتا ہے کہ اب سے ربع صدی پیشتر، انتظار حسین اور ناصر کاظمی نے بھی ساتواں در کھولنے کا عزم باندھا تھا۔ انتظار حسین اور ناصر کاظمی اس نسل کے اہم ترین نام ہیں جو طلوعِ آزادی کے ساتھ ہمارے ادبی افق پر نمودار ہوئی تھی۔ انتظار اور ناصر کی اہمیت کا راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ ان کے ہاں پاکستان کا قیام صرف ایک سیاسی اور جغرافیائی صداقت ہی نہیں بلکہ ایک جذباتی اور روحانی واردات کا نام ہے۔ اب سے ربع صدی پیشتر، مذہب کے نام پر وجود میں آنے والی ریاست کو اپنا جذباتی مسئلہ بنانا گویا رجعت پرستی اور قدامت پسندی کے الزام کو دعوت دینا تھا۔ انتظار اور ناصر نے ان الزامات کو ٹھکرا دینا جانا اور اپنی تہذیبی اور ادبی روایت کی ان گمشدہ کڑیوں کی بازیافت کے عمل میں سرگرم ہو گئے جنہیں ۴۷ء کے باغیوں نے فرسودہ اور مُردہ قرار دے کر ادبی دنیا میں ترقی پسندی اور جدت پرستی کے سکے رائج کئے تھے۔ آتشِ رفتہ کے سراغ اور کھوئے ہوؤں کی جستجو کے اس عمل کو انتظار اور ناصر نے ساتواں در کھولنے کے عمل سے تعبیر کیا تھا۔ انتظار نے اس عنوان سے ایک افسانہ لکھا تھا اور ناصر نے نوید دی تھی۔

آج کی رات نہ سونا یارو　　　آج ہم ساتواں در کھولیں گے

مگر سانحہ یہ ہوا کہ اپنی جڑوں کی تلاش اور اپنی روایت کو سمجھنے کے اس سفر کے آغاز میں ان لوگوں نے محمد حسن عسکری کے سایۂ عاطفت اور مظفر علی سید کے جوشِ رفاقت کو کافی جانا۔ عسکری صاحب اس زمانے میں پاکستانی ادب کی پائیدار اساس، مغربی ادب میں انسان اور آدمی کی کشمکش میں ڈھونڈ رہے تھے اور مظفر علی سید، ٹی ایس ایلیٹ کے مضمون" روایت اور انفرادی صلاحیت" سے نبرد آزما تھے۔ نتیجہ یہ کہ وہ "ساتواں در" کھولنے نکلے تھے ادب اور تہذیب کی عیسوی روایت کو مشرف بہ اسلام کرنے میں مصروف ہو گئے۔ یوں ہمارے

ادبی منظر پہ ہماری جڑیں کہاں ہیں؟ ہم کون ہیں؟ اور ہماری ادبی اور تہذیبی روایت کیا ہے؟ کیسے سوال ابھرے۔ ان سوالات پہ ہمارا غور و فکر نت نئی الجھنوں کو جنم دیتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ کا وہ لمحہ آپہنچا جس میں یک بہ یک ہم پہ ہماری پہچان ظاہر ہوئی۔ جس سرزمین پہ ہم کھڑے تھے اور جسے اپنی قومی شناخت کی بحثوں میں کوئی مقام دینے سے انکار کرتے چلے آ رہے تھے اچانک ہمارے قدموں کے نیچے سے کھسکنے لگی تب ہم پر اس حقیقت نے ظہور کیا کہ یہ سرزمین نہیں تو ہم بھی نہیں، ہماری تہذیبی روایت بھی نہیں، رفتگاں کی یاد بھی نہیں، سو ہم اس سرزمین کے تحفظ میں سربکف نکلے۔ صاحبو! مزاحمت اور سرفروشی کا یہی جذبہ لاہور وہ سانولا در ہے جس کے کھلنے سے ہم پر خود ہمارے گھر کے دروازے کھلتے ہیں اور ہم اپنی صدیوں پہ پھیلی ہوئی تہذیبی روایت کے عجائبات و طلسمات سے دو چار ہوتے ہیں:۔

میں بے نوا ہوں، صاحبِ عزت بنا مجھے　　اے ارضِ پاک، اپنی جبیں پر سجا مجھے
جس پر رقم ہیں نقشِ کفِ پائے رفتگاں　　اے عہدِ نا تمام، وہ رستہ دکھا مجھے
میں حرف حرف لوحِ زمانہ پہ درج ہوں　　میں کیا ہوں! میرے ہونے کا مطلب سکھا مجھے

جب ارضِ پاک نے امجد اسلام امجد کو اپنی جبیں پر سجا کر صاحبِ عزت بنا دیا تو اپنے ہونے کا مطلب آپ سے آپ ان کی سمجھ میں آگیا:

میرے احساس کے دریا میں روانی تجھ سے　　اے گلِ جاں، میرے ہونے کی نشانی تجھ سے
موسمِ گل بھی ترا، فصلِ خزاں بھی تیری　　میری آواز کے صحراؤں میں پانی تجھ سے
تجھ سے ہی میری تمناؤں نے وسعت پائی　　آنکھ کے رنگ، سماعت کے معانی تجھ سے

یہ امجد کی ایک نعت کے شعر ہیں۔ گویا ہمارے ہونے کا نشان ابولہب سے نہیں محمد مصطفیٰ سے نسبت میں پوشیدہ ہے۔ سو ہمیں ان زمانوں، معاشروں اور قوموں کی تہذیبی روایت میں بھی اپنی شناخت کا کھوج لگانا ہوگا جن میں نسبتِ محمدی توانا، سرسبز اور شاداب رہی ہے۔ اسی شعور کے ساتھ امجد اسلام امجد، اردو کی کلاسیکی روایت کے زندہ عناصر کی تلاش کے سفر پہ نکلے ہیں۔ اس سفر کی سوغات "نئے پرانے" کا سلسلۂ مقالات ہی نہیں بلکہ فلسطین کی مزاحمتی شاعری کے تراجم بھی ہیں۔ ۶ ستمبر کے طرزِ احساس کے زیرِ اثر امجد نے عربوں کی مزاحمتی شاعری میں وہ رجائیت پائی ہے جس نے امجد کو اس نژادِ زیاں سے نفرت کرنا سکھایا ہے جو کشتۂ افسوس ہونے میں مصروف ہے۔ اس کے برعکس امجد کی تمناؤں کی کھیتی نسبتِ محمدی سے ہری ہے۔ چنانچہ "ساتواں در" ہی نہیں بلکہ "برزخ" کا آغاز بھی حمد، نعت اور سلام سے ہوتا ہے۔ یہاں حمد، نعت اور سلام، اپنے گناہوں کے کفارہ کے طور پر موجود نہیں ہیں بلکہ پوری تخلیقی شخصیت کی سرنوشت بن کر جگمگا رہے ہیں۔ یہ بے عملی اور بدعملی کی رسیا شخصیت کا کارِ ثواب نہیں بلکہ اپنے عہد کے یزیدوں کے خلاف دادِ شجاعت دینے والے مجاہد کی برہنہ شمشیریں ہیں۔ امجد کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ ظلم کی بستی میں سانس لے رہے ہیں۔

"مجھے دیکھو میں ایسے شہر میں زندہ ہوں
جس میں زہر نے تریاق کا عہدہ سنبھالا ہے"

اور اسے یہ شعور بھی حاصل ہے کہ ایسے شہر میں رہتے ہوئے حسینؓ پہ سلام بھیجنے کے آداب کیا ہیں؟

میں نوحہ گر ہوں
میں اپنے چاروں طرف بکھرتے ہوئے زمانوں کا نوحہ گر ہوں
میں آنے والی رتوں کے دامن میں عورتوں کی اداس بانہوں کو دیکھتا ہوں
اور ان کے بچوں کی بےرخ چیخوں کو سن رہا ہوں
اور ان کے مردوں کی سرد لاشوں کو گن رہا ہوں
میں اپنے ہاتھوں کے فاصلے پہ فصل دہشت کو چھو رہا ہوں
حسین! میں اپنے ساتھیوں کی سیہ لباسی کا نوحہ گر ہوں
ہمارے آگے بھی کربلا ہے، ہمارے پیچھے بھی کربلا ہے
حسین! میں اپنے کارواں کی جہت شناسی کا نوحہ گر ہوں،
نئے یزیدوں کو مات کرنا ہے کام میرا
ترے سفر کی مسافتوں سے
ملا ہے مجھ کو مقام میرا
حسین، تجھ کو سلام میرا

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اپنی تہذیبی روایت کی گم شدہ کڑیاں ہمیں واپس مل گئی ہوں اور ہمارے دل و دماغ اس حقیقت سے منور ہو گئے ہوں کہ کعبہ اور کربلا، محمدؐ اور حسینؓ ہمارا ماضی بھی ہیں اور مستقبل بھی۔ ہماری نجات اپنے زمانے کو محمدؐ اور حسینؓ کے زمانوں سے ملانے اور محمدؐ اور حسینؓ کے طرزِ فکر و عمل کی پیروی میں پوشیدہ ہے۔

فتح محمد ملک

تہذیب و فن

احمد ندیم قاسمی

"تہذیب و فن" احمد ندیم قاسمی کے ان مضامین کا پہلا انتخاب ہے جو انہوں نے تاریخِ پاکستان کے ایک انتہائی پرآشوب دور ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء تک روزنامہ امروز میں ہفتہ وار لکھے۔ اس جلد کے مضامین پاکستان، پاکستانی قومیت، پاکستانی تہذیب اور پاکستان کی نظریاتی انفرادیت سے متعلق ہیں۔ "تہذیب و فن" کی تمہید میں ندیم نے واضح کر دیا ہے کہ "ان مضامین کا

مطالعہ اس نقطۂ نظر سے مفید رہے گا کہ یہ ایک ایسے تخلیقی فن کار کے تاثرات ہیں جس کا نظریہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے وطن اور ذرا سے محبت نہیں کر سکتا وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتا اور جو محبت نہیں کر سکتا اسے حسن و خیر اور عدل و توازن کا شعور ہی حاصل نہیں ہو سکتا" پھر ایک مضمون میں بھی کہا گیا ہے کہ "اس قسم کی سب تحریروں میں میرا کل سرمایہ میرا احساس ہوتا ہے یا پھر میرا یہ فخر کہ میں پاکستانی ہوں اور ایک ایسی بہادر قوم کا فرد ہوں جسے اپنی آزادی سے عشق ہے" (ص ۹۰)

اپنے وطن اور قوم سے محبت اور اس محبت پر فخر کا یہ بے ساختہ اور دو ٹوک اظہار ندیم کے ذہنی اعتماد اور قلبی سچائی کو ظاہر کرتا ہے۔ "تہذیب و فن" کے یہ مضامین احساس و تاثر کی سطح پر لکھے گئے ہیں اور اس مضمون کا عنوان قائم کیا گیا ہے "تہذیب و فن" کا شعور یوں بظاہر اس اندازِ نظر کا تمہید میں کیے گئے تقاضے سے کوئی رشتہ نہیں بنتا۔ لیکن مضامین کے اندر اس اندازِ نظر سے مطالعہ کا جواز موجود ہے کیونکہ اس احساساتی و تاثراتی اظہار کے زیرِ سطح ان کے فکر و شعور کی لہریں صاف دکھائی دیتی ہیں۔

ندیم کے نزدیک ظہورِ پاکستان کوئی سیاسی بے ایمانی یا ماورائی معجزہ نہیں بلکہ برصغیر کے تاریخی، سماجی تسلسل میں ایک ترقی پسند عمل ہے، مسلمانوں کی صدیوں سے جاری مسلسل جد و جہد کا ثمر ہے۔ ندیم ایسے پاکستان خواہوں میں سے نہیں جنہوں نے آزادی کی ریڈیائی اطلاع پا کر اپنی کوٹھی پر پاکستان کا پرچم لہرا لیا ہو وہ تو تحریکِ پاکستان میں عزم سے تپتے چہروں اور امنگوں سے دھڑکتے دلوں کے ساتھ شریکِ عمل رہے ہیں چنانچہ ان کے لیے پاکستان ارضی اور اجتماعی جغرافیے کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی وجود میں بھی ظہور پذیر ہوا اسی لیے نظریہ پاکستان پر ان کا محکم اور مستقل ایمان ہے اور ان کا احساس و شعور اور ادب و فن اس ایمان کے نور سے منور ہیں۔

اصطلاحِ نظریہ پاکستان کے لفظی اجزائے ترکیبی خواہ کسی بھی دور میں زیرِ استعمال آئے ہوں اور مخصوص مفادات کے تحفظ یا حصول کے لیے اس کی چاہے کیسی ہی غلط تعبیریں دکھائی جائیں اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں کہ نظریہ پاکستان کے معنوی عناصرِ ترکیبی قیامِ پاکستان سے پہلے، بہت پہلے بھی وجود پذیر تھے اور یہ معنوی عناصرِ ترکیبی ایسے نہیں کہ جن پر کسی بھی سچے پاکستانی کو معذرت یا شرمندگی ہو

نظریہ پاکستان کے دو بڑے پہلو ہیں

اولاً پاکستان کی نظریاتی انفرادیت

ثانیاً پاکستان کی جغرافیائی سالمیت

یہ دونوں پہلو ایک دوسرے میں پیوست ہیں اور ان کی یہ باہمی پیوستگی ہماری قومی خود مختاری کا ایک اہم تقاضا ہے نظریۂ پاکستان کے حقیقی خد و خال پہچاننے کے لیے ادھر ادھر بھٹکنے کی بجائے اگر ہم مصورِ پاکستان علامہ اقبال اور بانیِ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح سے رجوع کریں تو حسبِ ذیل نکات نمایاں نظر آتے ہیں

۱) برصغیر میں مسلم قومیت کا دینی اور تہذیبی تحفظ

۲) عرب ملوکیت کی تہذیبی چھاپ سے نجات

۳) بیرونی اور اندرونی معاشی استحصال سے مسلمان عوام کی آزادی

۴) جذبہ حب الوطنی کا فروغ

۵) صوبائیت اور فرقہ واریت سے بلند پاکستانیت کا استحکام

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے مبارک دن کو تصورِ پاکستان ایک ارضی حقیقت

میں ڈھل گیا اور برطانیہ کی محض رسمی نوآبادی رہ گیا۔ نظریہ پاکستان کی ہمہ پہلو عملی تعبیر ابھی زیرِ تکمیل تھی کہ قائدِ اعظم رحلت فرما گئے اور وطنِ عزیز بکھرتے ہوئے بیمار سماجی نظاموں کو آگے بڑھتے ہوئے صحت مند سماجی نظام میں بدلنے کا بنیادی کام کرنا باقی تھا کہ ایشیا اور افریقہ کے دیگر نوآزاد و پس ماندہ ممالک کی طرح ہم بھی جدید نوآبادیاتی نظام میں جکڑے گئے نتیجۃً" ہموار معاشی ارتقا محال ٹھہرا اور سماجی ڈھانچے کی ایسی ناہموار اور پیچیدہ صورت حال میں صرف جذباتیت کے سہارے کامرانی کی خواہش خیالِ خام کے سوا کچھ نہیں ضرورت ہے کہ ہم اپنے مسائل کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھیں اور ان کا ٹھوس حل ڈھونڈیں اور اپنے وسائل کے مطابق محتاط منصوبہ بندی کریں۔ ایسی منصوبہ بندی جس میں روحِ دین، روحِ وطن اور روحِ عصر آپس میں ہم آہنگ رہیں" تہذیب وفن کے مسائل ایسی ہی ہمہ گیر منصوبہ بندی کی ضرورت کا احساس اجاگر کرتے ہیں

دین، ندیم کے خیال میں بنیادی طور پر خیر کی ایک قوت ہے اور بالخصوص دینِ اسلام امن و سلامتی، عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کا دین ہے جس میں جدید انسان دوستی کے سارے خصائص سمٹے ہوئے ہیں انہوں نے صاف صاف کہا ہے کہ ہماری قومیت اور تہذیب کا عنوان اسلامی قومیت اور اسلامی تہذیب ہی ہوگا کہ قیامِ پاکستان پس منظر اور پیشِ منظر میں موجود حقائق کا یہی تقاضا ہے۔ وہ اس امر کے آرزومند ہیں کہ دینِ اسلام میں انسان دوستی اور حریت پسندی کے تصورات اور روایات کو آگے بڑھایا جائے۔ ملوکیت کی کوئی بھی پرانی یا نئی صورت روحِ اسلام سے میل نہیں کھاتی۔ دینِ اسلام کے اساسی عقائد اور اصول و اقدار سے وابستگی میں ہی پاکستانی قومیت اور پاکستانی تہذیب وفن کا غیر مسلم ملکوں سے امتیاز ہے لیکن صرف اور صرف انہی عناصر پر اصرار کیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مسلمان ممالک سے الگ پاکستانی قومیت اور تہذیب وفن کا اپنا تشخص کیا ہے۔؟ اس سوال کا تسلی بخش جواب بہت دشوار ہے لہذا ہمیں دینی عناصر کے اقرار اور پورے احترام کے ساتھ ساتھ کچھ اور کارفرما عناصر کو بھی زیرِ نگاہ لانا پڑے گا اور یہ ہیں پاکستانی قومیت اور تہذیب کے زمینی عناصر اور ان زمینی عناصر کی کارفرمائی کے باعث ہی پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک اشتراکِ عقائد و اقدار کے باوجود اپنی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ اسی کو روحِ وطن کہیں گے۔ ندیم نے اس حوالے سے اسلامی ممالک سے الگ پاکستان کی قومی اور تہذیبی انفرادیت کو بڑی عمدگی سے سمجھا اور سمجھایا ہے۔

ندیم پاکستانی تہذیب وفن کی صورت پذیری میں شریک مخصوص زمینی عناصر کی اہمیت کا شعور اور اس سے متوازن وابستگی رکھتے ہیں ان کی زمین دوستی کسی غلو پر مبنی نہیں، ان کے فکروفن میں یہی زمین سے انسانی وابستگی کا رویہ ابھرا ہے زمین سے نباتاتی پیوستگی کا رجحان نہیں آیا۔ نباتاتی پیوستگی کا رجحان یا فقط زمینی عناصر پر سارا زور صرف کرنے کا اندازِ فکر محلِ نظر ہے کہ ایسے لوگ ایک طرف بالواسطہ طور پر احترامِ انسانیت کی نفی کرتے ہیں اور دوسری طرف برِصغیر میں قبل از اسلام کے تہذیبی ورثے تک محدود رہ کر غیر شعوری طور پر پاک و ہند کی مشترک تہذیب کے دعوے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ پاکستانی تہذیب و قومیت کے منفرد خد و خال دینی اور زمینی دونوں عناصر کی ترکیب و تحلیل سے روشن ہوتے ہیں اور ان کا فروغ روحِ عصر کے مطالبوں کی تکمیل سے ممکن ہے۔

ندیم کو روحِ عصر کے کردار اور مطالبات کا گہرا شعور حاصل ہے اسی لیے قدیم تہذیبی ورثے کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر حقیقت پسندانہ ہے کہ وہ اس کے خلاف نہ تو کوئی تعصب رکھتے ہیں اور نہ اس کے جنون میں مبتلا ہیں ندیم سماجی تہذیبی تاریخ کے سفر اور سمت سے آگاہی رکھتے ہوئے قدیم تہذیبی مظاہر کو اپنے وطن کی تہذیبی تاریخ کا حصہ تسلیم کرتے ہیں کیونکہ قومی تہذیب

دین، دین اور تاریخ کا ہی تسلسل ہوتا ہے اور ان کے نزدیک اس اعتراف سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ قبل از اسلام یہ تہذیبی مظاہر اب بھی ہماری آئندہ منزلیں ہیں اور وہ لوگ ہمارے ہیرو ہیں۔

روحِ عصر کا پھیلاؤ آفاقی ہوتا ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ مختلف ملکوں اور قوموں کے اپنے اپنے سماجی حالات کے تحت اس پھیلاؤ کی عملی صورتیں یکساں نہیں ہیں موجود مختلف عملی صورتوں سے مطلوب ہم آہنگ عملی صورتوں تک واقعتاً رسائی سے پیشتر ہی آفاقی یکسانیت کا وجود فرض کر لینا روحِ عصر اور ملکی و قومی تقاضوں کے منافی ہوگا اس لیے لازم ہے کہ ہم روحِ عصر کے درست فہم کے ساتھ ساتھ اپنے ٹھوس قومی سماجی حالات کا بھی شعور رکھیں ورنہ روحِ عصر کے نام پر اپنے آپ سے بیگانگی کا اندیشہ برقرار رہے گا اور بیگانگی کا یہ رویہ ہمیں قومی تہذیب و فن کے تدریجی ارتقا کے تسلسل سے کاٹ کر خلائی اچھل کود کا تماشا بنا ڈالے گا اور یہ تماشا پاکستان میں فی الواقع ہو بھی چکا ہے ندیم نے اس سلسلے میں بہت راست راہ سجھائی ہے کہ "اپنے عصر کا صحیح ادراک یہ نہیں کہ ہم عالمگیر بننے کی خاطر دوسروں کی نقالی کریں ہم سے روحِ عصر کا مطالبہ تو یہ ہے کہ ان لمحوں کو اپنی گرفت میں لائیں جو ہماری سرزمین سے گزر رہے ہیں۔" (روحِ عصر کے تقاضے ص ۲۱)

"بے شک ہم عالمی حالات اور عالمی تحریکوں اور عالمی خطروں سے قطع نظر کر کے اپنے شعور کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے لیکن روحِ عصر کا تقاضا یہ ہے کہ بین الاقوامیت پس منظر کا کام دے اور پس منظر میں پاکستان رہے اور پاکستان کے حوالے سے وہ تمام نو آزاد معاشرے جو ایشیا اور افریقہ میں صورت پذیر ہو رہے ہیں اور اسی تخلیقی کرب میں سے گزر رہے ہیں جس میں سے پاکستانی معاشرہ گزر رہا ہے۔" (روحِ عصر کے تقاضے ص ۲۴)

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ روحِ عصر کا سائنسی سماجی شعور اور دینِ اسلام کی روح دونوں ہی بین الاقوامی بلکہ بین الانسانی اوصاف سے متصف ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ دونوں میں قومی انفرادیتوں سے انکار نہیں کیا جاتا۔ لیکن ہمارے ہاں یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ہر دو تصورات کے بعض کج نظر پیروکاروں نے وسیع نظری کے نام پر کوتاہ بینی کا مظاہرہ کیا۔ اس میں ایک طرف چند ایسے لوگ ہیں جو جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال کی تحریروں کے من پسند اقتباسات سے ذہنی التباس پھیلانے میں مشغول ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ پان اسلامزم کے نام پر ایسی خلافت قائم کی جائے جس کا آخری نمونہ ترکی سلاطین میں نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے یہ خواہش بالواسطہ طور پر پاکستان کے منفرد قومی وجود کی نفی ہے۔ اسی طرح دوسری طرف کے ذہنوں میں قومی خود مختاری کی قربانی پر تعمیر بین الاقوامیت کا کوئی خواب ہے تو ایسے خواب کو بھی خوش آئند نہیں کہا جا سکتا۔ ندیم کے لیے یہ دونوں زاویہ ہائے نظر خلافِ حقیقت اور ناقابلِ قبول ہیں انہیں قوم دشمن بین الاقوامیت اور بین الاقوامیت دشمن قوم پرستی سے بیک وقت اختلاف ہے وہ قومی اور بین الاقوامی رشتوں میں توازن چاہتے ہیں ایسا توازن جس میں تمام قومیں بھائی چارے، برابری اور باہمی تعاون کے مقام پر ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب قوم ہی نہ رہے تو اس کے لیے بین الاقوامیت کیا معنی؟ قومی آزادی اور خود مختاری کی تکمیل اور تحفظ بہر صورت ضروری ہے۔ یہ بات ان مضامین میں بڑی صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے جو "پاکستانی ادب اور غیر ملکی جارحیت" کے زیرِ عنوان شاملِ کتاب ہیں۔ چنانچہ تنگ نظر قوم پرستی سے بلند اور خیالی بین الاقوامیت سے محفوظ رہتے ہوئے انہوں نے معتدل قوم پرستی اور حقیقی بین الاقوامیت کا مقامِ توازن پہچانا ہے ان کا فکر و فن اپنی پاک سرزمین کی

خوشبو اور اپنے عوام کی حریت پسندانہ تحریکوں کی توانائی لے کر کرہ ارض کی تحریکاتِ آزادی سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

اپنے وطن اور قوم کی جغرافیائی اور نظریاتی سلامتی سے بے شائبہ وابستگی ندیم کے فکر و فن کا اصل الاصول ہے اسی اصل الاصول پر وہ علاقائی اور عالمی رشتوں کو جانچتے ہیں۔ پاکستان میں ذیلی ثقافتوں اور زبانوں کے کردار و علائق کی بابت ان کا نقطۂ نظر متعلقہ مسائل کی تحلیل کا حقیقت پسندانہ اور قابلِ عمل راستہ ہے۔ ہماری ذیلی ثقافتوں کے مابین تھوڑے بہت اختلافات واقعتاً موجود ہیں اور ان اختلافات سے نظریں چرانا حقیقت پسندی کے خلاف ہوگا۔ یہ اختلافات فطری ہیں اور ان سے پاکستانی تہذیب کا تنوع ظاہر ہوتا ہے انہیں خداداد نعمت سمجھنا چاہیئے لیکن المیہ یہ ہے کہ ان دوستانہ فطری اختلافات کو جاگیردارانہ اور جدید نوآبادیاتی مفادات کے لیے معاندانہ مصنوعی تضادات میں ڈھال دیا جاتا ہے اور ایسے تضادات جوں جوں بڑھیں گے پاکستان کی ذیلی ثقافتوں کے مشترکہ مظاہر پس منظر میں گم ہوتے جائیں گے ان مشترکہ مظاہر میں سے جہاں دین اسلام کی "حبلُ المتین" موجود ہے وہاں قومی آزادی کے لیے پاکستان کے تمام عوام کی حریت پسندانہ تحریکیں قومی یک جہتی کو مضبوط کرتی ہیں ندیم نے باہمی اختلافات کا اعتراف کرتے ہوئے پاکستانی تہذیب کے مشترکہ مظاہر کی پہچان اور استحکام پر زور دیا ہے اور اپنی ضمنی وابستگیوں کے باوجود ہمیں پاکستانی ہونے پر زیادہ فخر ہونا چاہیئے انہوں نے اربابِ فکر و نظر کو یاد دلایا ہے کہ یہ مسائل مثبت معاشی تبدیلیوں سے ہی حل ہو سکیں گے اور ان تبدیلیوں کے بغیر ملکی یکسانیت کا پرچار خود فریبی کے سوا کچھ نہیں

پاکستان میں اردو اور علاقائی زبانوں کی آمیزش اور آویزش بھی ایک اہم مسئلہ ہے لسانی مسئلہ تہذیبی مسائل کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور ان سب کی جڑیں موجودہ معیشتی نظام میں ہیں اور جب تک معیشتی نظام تبدیل ہو ہمیں نیک نیتی سے پاکستان اور پاکستانی عوام کے اتحاد کو پیشِ نظر رکھ کر زبانوں کے نشو و ارتقا اور ان کے سماجی کردار کا تجزیہ کرنا چاہیے اور واضح فیصلہ کرنا چاہیے۔ زبان معاشرے کی اجتماعی تخلیق ہوتی ہے۔ قومی رابطے کی زبان اردو کے بارے میں جو جدید ترین تحقیقات سامنے آئی ہیں ان کے مطابق یہ برصغیر کی مختلف مقامی بولیوں بالخصوص پاکستان کی علاقائی زبانوں کا بین القومیتی روپ ہے اس طرح اردو زبان کا علاقائی زبانوں سے تعلق مخالفانہ نہیں دوستانہ ہے اور ہمارے لئے اپنی قومی اور علاقائی زبانوں سے بیک وقت محبت اور ان کے ارتقا میں کوئی تضاد نہیں۔ ندیم نے یہی بات سمجھائی ہے کہ اب اس خطے میں اردو کی زندگی اور ترقی علاقائی زبانوں کے وجود سے منسلک ہے اس سلسلے میں اولین مثبت اور حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر ۱۹۴۹ء میں پیش ہوا تھا ہر چند اس وقت اس نقطۂ نظر پر بڑی لے دے ہوئی مگر سلیم العقل لوگوں میں یہی نقطۂ نظر بتدریج مقبول ہو رہا ہے

زبان کسی قوم کی تہذیب و ثقافت اور اجتماعی امنگوں کا آئینہ ہوتی ہے اور ادب میں انکو خوبصورت اور موثر اظہار ملتا ہے۔ ندیم نے علاقائی ادب سے اخذ و قبول کو پاکستانی اردو ادب کے لیے صحت مندانہ رجحان قرار دیتے ہوئے اس کارِ خیر کو مزید بڑھانے کی آواز اٹھائی ہے ہم دیکھ چکے ہیں کہ یورپی ادبی و فنی تحریکوں کی اندھا دھند تقلید سے خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں ہو سکے اور ایسا ادب تخلیق نہیں ہو سکا جس کی جڑیں اپنی زمین اور اپنے عوام میں گہرائی تک پیوست ہوں اور جو ہمارے قلب و ذہن میں رچ بس کر اجتماعی فکر و احساس کو متاثر کر سکے اس ناکامی کے بعد اب اگر صبح کے بھولے شام کو گھر لوٹ رہے ہیں تو یہ مراجعت یقیناً باعث اطمینان و مسرت ہے۔ اب تخلیقی اور لسانی سطحوں پر مقامی ادبی روایات سے رشتہ بحال کرنے کی مساعی واضح نظر آ رہی ہیں اس تبدیلی پر ہمیں ندیم کا بھی ممنون ہونا چاہیئے۔ جنہوں نے پہلے پہل اس ضرورت کا احساس دلایا ایسا احساس بھی وہی فن کار رکھتا ہے اور

دوسروں کو محسوس کرا سکتا ہے جس کی اپنے وطن اپنی قوم اپنے عوام اپنی ذات اور اپنے ادب و فن سے کمٹ منٹ ہو۔

"آزاد فن کار کمٹ منٹ سے بہت چڑتے ہیں۔ انہوں نے غل مچا رکھا ہے کہ کمٹ منٹ سے ادب و فن محدود ہو جاتا ہے۔ کمیٹڈ ادب و فن تو ادب و فن رہتا ہی نہیں۔ یہ سارا غل غپاڑہ منافقانہ رویہ ہے کیونکہ بقول ندیم "ہر ادیب اور فن کار کسی نہ کسی طریقِ عمل یا نقطۂ نظر یا نظریہ حیات کا ضرور پابند ہوتا ہے اور اگر وہ کومٹ منٹ سے انکار کرتا ہے تو بنتا ہے ہمارے ہاں کومٹ منٹ سے انکار کو برائی سمجھا جانے لگا ہے حالانکہ اس سے زیادہ کوئی شرمناک فرار ہو ہی نہیں سکتا۔"

(کومٹ منٹ کا مسئلہ ص ۵۶)

اس بات میں سیاسی کومٹ منٹ کو بالخصوص زیرِ بحث لایا جاتا ہے ادب برائے سیاست، یقیناً ادب برائے ادب، کی طرح ہی خطرناک ہے لیکن ادب برائے زندگی، کے حوالے سے سیاست بھی زندگی کے کل کا ایک اہم جزو ٹھہرے گا اور ادب و فن کو ساری زندگی پر محیط ہونا چاہیئے یوں سیاسی کمٹ منٹ سے فرار کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا اس موقع پر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ادیب یا فن کار کی کمٹ منٹ اور طریقہ کار سیاست دان کی کمٹ منٹ اور طریقہ کار ایک دوسرے سے جدا جدا انداز رکھتے ہیں "دراصل سیاست سے برگشتگی بھی، ندیم کے الفاظ میں ایک قسم کی سیاست ہی ہے ادب میں یہ سیاست ان سامراجیوں نے پھیلائی ہے جنہیں ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کی خود آگاہی سے خوف آتا ہے ہمارے کتنے ہی ادیب غیر شعوری طور پر اس کالے جادو کے زیر اثر ادب میں سیاست کی مداخلت کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کے شعور کو اس طلسم سامری نے اس حد تک مردہ کر رکھا ہوتا ہے کہ انہیں محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ادب میں سیاست کی تضحیک کر کے وہ ایک خطرناک اور ناپاک سیاست کے آلہ کار کا کردار ادا کر رہے ہیں اہل قلم کا یہ سیاست دشمن طبقہ اس منفی سیاست کا شکار ہے اور اسی کے تحت وہ وطن سے محبت کو غیر مہذب انسان کا ابتدائی یعنی خام جذبہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔"

(وطن دوستی جرم نہیں ہے ص ۲۳۴)

جنگِ ستمبر ۶۵ء اور بعد کے قومی سانحات اور واقعات نے اس بے مہار آزادی کی راہ بہت حد تک روک دی ہے "آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔"

"تہذیب و فن" کے حوالے سے ہماری کامل نظریاتی، جغرافیائی، تہذیبی اور ادبی و فنی آزادی کا استقرار مکمل قومی آزادی اور خود مختاری کے تقاضوں سے مربوط ہے اور قومی آزادی اور خود مختاری اسی وقت تکمیل پائے گی جب ہم بیرونی اور اندرونی اقتصادی غلامی سے نجات پا لیں گے۔ اس نجات کے بغیر تہذیب و فن کا ہمہ گیر اور ہموار ارتقا اور انسان دوستی سے متصف جمالیاتی نکھار بہت حد تک دشوار ہے ایسے میں ادب و فن کو بھی اپنا فریضہ انجام دینا ہے اور وہی ادب بلند تر قومی ادب ہوگا جس میں ان تقاضوں کی حسن کارانہ عکاسی کی جائے گی۔ ادب کے علاوہ اس سلسلے میں کام کی دو سطحیں ہیں ایک تو یہ کہ موجود معیشی معاشرتی نظام میں ایسی بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں جو روحِ دین، روحِ وطن اور روحِ عصر کے مطالبوں سے ہم آہنگ ہوں، دوسری یہ کہ بالائی سطح پر فوری اصلاحات روبہ عمل آئیں ثانی الذکر اصلاح پسندی ہر چند مسئلے کا پائیدار حل نہیں لیکن اس کی وقتی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا بشرطیکہ یہ بنیادی تبدیلیوں کو روکنے یا ٹالنے کا حیلہ نہ ہو۔ ندیم نے ان دونوں سطحوں کو صحیح تناظر میں رکھ کر دیکھا ہے لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں ابھی

تک دونوں سطحوں سے پہلوتہی برتی گئی ہے جس کے نتائج سے کوئی بھی شعورمند پاکستانی بے خبر نہیں۔

"تہذیب و فن" میں رواں فکر و شعور کی نمایاں لہریں ہم نے دیکھ لیں اور فکر و شعور کی یہ لہریں الگ تھلگ نہیں بلکہ احساسات و تاثرات کے اندر رہی ہیں اس سے ندیم کی ایک خوبی سامنے آتی ہے احساس و تاثر کی صداقت ذاتی یا مصنوعی ہوتی ہے اور فکر و شعور کی صداقت اجتماعی یا مفروضی معیار مانگتی ہے ذہنی سطح پر فکری و شعوری صداقت کا عمل اور اظہار دشوار ہونے کے باوجود اس کے حسی اظہار سے نسبتاً سہل ہے کیونکہ ایسا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک شعور کو احساس میں رچا نہ لیا جائے یا احساس شعور کے مطابق نہ بدل جائے۔ شعور و احساس کے اسی باہمی رچاؤ سے شخصیت کی اکائی شکل پذیر ہوتی ہے۔ "تہذیب و فن" کے مطالعہ سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ندیم کی شخصیت اور تحریروں میں شعور و احساس کی وحدت نے کیسا حسین پیرایہ اختیار کیا ہے۔

نثری اظہار کے لیے چاہے کوئی بھی انداز اپنایا جائے وضاحت و صراحت اس کے لیے ہر صورت میں لازمی ہے۔ وضاحت و صراحت کا یہ لازمہ لکھنے والے سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی سوچ اور تحریر دونوں میں بالکل صاف ہو، اسی باعث نثر میں لکھے ہوئے لفظ سے انکار یا انحراف کی بہت کم گنجائش رہ جاتی ہے یہ بڑی حوصلہ آزما صورت حال ہے اس حوصلہ آزما صورت حال میں ندیم کا کردار ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے وہ ایسے خیالات و احساسات میں راسخ ہیں اپنے لفظ لفظ کی صداقت پر ان کا ایمان اور اس کے اظہار پر ایقان ہے اور یہی یہی قومی اور فنی وابستگی کا تقاضا ہے۔

راست فکر و احساس اور فنی وضاحت و صراحت کے ساتھ ساتھ تہذیب و فن کے مضامین کا ایک اور خاص وصف سطر سطر میں رواں گہری درد مندی کی رو ہے یہ درد مندی ذاتی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی احساس میں جذب ہے درد مندی، محبت اور راستی فکر و احساس کی یہ لہریں مل جل کر ایک ایسی متحرک قوت بن گئی ہیں جو دلوں کو دلوں سے جوڑتی ہے اور اپنی زمین اپنے عوام اور اپنے عصر سے ہمارے رشتے کو مضبوط تر کرتی ہے۔

یوسف حسن

(افسانہ)

لفظ لفظ تصویر

منظہر الاسلام

شام اترنے میں ابھی کچھ وقت باقی ہے تھکا ہارا سورج سامنے بڑی عمارت کے اوپر والے فلیٹوں میں دن بھر کی بچی کھچی روشنی سمیٹ رہا ہے۔ ہوائیں جاتی گرمیوں کی ٹھنڈی شام کا ذائقہ رچا ہوا ہے۔ بوڑھا ڈاکیا تیز تیز قدم اٹھاتا گھر لوٹ رہا ہے اس کی پگڑی کے بل ڈھیلے ہو گئے ہیں اور چپل کی گھسی ہوئی ایڑیوں کے کیل زمین سے لگ کر گھسر گھسر کی آوازیں چھوڑ رہے ہیں ڈاکیئے کا ایک کندھا کچھ جھکا ہوا ہے اس لئے کہ اس کے سہارے چمڑے کا بیگ لٹک رہا ہے ایک ہاتھ میں دو تین خط ہیں جو اس کے ہاتھ کا حصّہ معلوم ہوتے ہیں اور یوں احساس ہوتا ہے جیسے وہ پیدا ہوا تو اس وقت بھی یہ خط اس کے ہاتھ میں تھے۔ ڈاکیئے کے قدموں کی گھسر گھسر اب خاصی دور چلی گئی ہے۔ اب لوگ کم اور آوازیں زیادہ ہیں شریر اور معصوم آوازیں کے جنجھنے کانوں کے گرد چہل قدمی کر رہے ہیں۔ ایک لمبی چیخ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر گزر رہی ہے۔ سائیکل کی گھنٹی نے ٹیلی فون کی گھنٹی کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ بچے کی آواز نے ادھیڑ عمر مرد کی آواز کا کرتا چک لیا ہے کار کی آواز ریڑھے کے نیچے آگئی ہے کنڈکٹر کی وسل ڈبل ڈیکر کے پہیوں کے نیچے آگئی ہے اور اس کی آواز مر گئی ہے شہر کو ہچکی لگی ہوئی ہے اور کالے سیاہ گدھ سورج کے سر پر ٹھونگیں مار رہے ہیں۔

سامنے بڑی عمارت کے نیچے والے فلیٹ کی بالکونی میں ایک عورت لمبے بال جھٹک جھٹک کر سوکھا رہی ہے اُسے صبح ہی نہا لینا چاہیئے تھا لیکن وہ اب نہائی ہے اور ابھی تھوڑی دیر بعد پھر نہانے والی ہو جائے گی وہ بالوں میں انگلیاں ڈال کر انہیں جھٹکتی ہے اس کا بھرا بھرا جسم بری طرح تھر تھرایا ہے، جیسے دودھ سے بھرے ہوئے ڈولے کو چھلکا لگا ہو قطرے میرے چہرے پر گرے ہیں میں نے رومال سے منہ صاف کر لیا ہے اب وہ بالوں کی اڑ چنیں کھول رہی ہے اس کا چہرہ پوری طرح نظر نہیں آرہا لیکن اس کے تیز تیز چلتے ہاتھوں کی بے چینی سے انتظار ٹپکتا ہے۔ پیچھے اندھیرے کمرے کی دیوار پر کلاک کی چمکتی سوئیاں تیز تیز حرکت کر رہی ہیں نیچے مینٹل پیس پر کچھ اور چیزیں بھی چمک رہی ہیں جنہیں پہچاننا مشکل ہے۔

ساتھ والے فلیٹ کے دونوں کمروں میں بتی جل رہی ہے۔ ایک بچہ بری طرح رو رہا ہے اور اس کی ماں بلب کے گرد منڈلاتے ہوئے پتنگے دکھا کر اسے بہلانا چاہ رہی ہے۔ ایک لڑکی جو رونے والے بچے کی بہن ہے باورچی خانے میں پکتی ہنڈیا کی مرچیں چکھ رہی ہے۔ ٹیبل پیس پر کپڑے کے دو خرگوش ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے ہیں۔ بچہ ابھی تک رو رہا ہے اس کے رونے کی آواز نے بالکونی سے چھلانگ لگا دی ہے اور کچھ دوسری آوازیں اس کے گرد جمع ہو گئی ہیں۔

اس عمارت میں کئی فلیٹ ہیں، ایک، دو، تین، چار، پانچ، دس، بیس، اکیس، بائیس، تیئس اور ایک آدھا اوپر دوسری منزل کے کونے والے فلیٹ میں ایک لڑکی سامنے کمرے میں تخت پوش پر بیٹھی فریم گھٹنوں پر رکھے پھول کاڑھ رہی ہے۔ اس کی ماں ذرا پرے ہٹ کر بیٹھی کچھ چھیل رہی ہے۔ غور سے دیکھو تو پتہ چلتا ہے آلو ہیں۔ پلنگ پر ایک ادھیڑ عمر آدمی انگریزی اخبار پڑھ رہا ہے۔ اوپر کے فلیٹ سے ایک عورت رسی سے بندھی ٹوکری نیچے لٹکاتی ہے۔ بالکونی میں لہراتی ہوئی ٹوکری دیکھ کر آلو چھیلنے والی عورت آلو چھوڑ کر بالکونی میں آتی ہے۔ تھوڑا سا باہر کی طرف جھکتی ہے اور منہ اوپر اٹھا کر ٹوکری لٹکانے والی عورت کی طرف دیکھتی ہے وہ پیاز مانگ رہی ہے۔ آلو چھیلنے والی عورت اندر جا کر دو پیاز لائی ہے اور اب ٹوکری میں رکھ رہی ہے۔ ٹوکری آہستہ آہستہ اوپر اٹھنا شروع ہو گئی ہے۔

ساتھ والے فلیٹ میں الماریاں کتابوں سے بھری پڑی ہیں اور بے شمار اخبار ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ پنکھا تیز سپیڈ پر ہے اور ٹیوب لائٹ گرد آلود فضا میں لرز رہی ہے۔ کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا۔ سامنے دیوار پر لگی تصویر کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ کسی نے چھپکلی کو فریم کروا لیا ہے۔ یوں بھی اس فلیٹ میں چھپکلیاں بہت ہیں جو لفظوں کو کیڑے سمجھ کر ان کے گرد منڈلا رہی ہیں۔ اس وقت ایک چھپکلی ٹیوب لائٹ کے نیچے کیلنڈر کی کسی "تاریخ کے ہندسے کو اچکنے کے لئے داؤ لگائے بیٹھی ہے۔ ایک الماری پر پھر رہی ہے اور دوسری الماری سے ذرا پرے اپنے جسم کا پچھلا حصہ دیوار کے ساتھ اور اگلا حصہ اوپر اٹھائے کسی "تاک میں ہے۔

ساتھ والے فلیٹ میں بھی ایک بچہ رو پڑا ہے۔ اوپر والے فلیٹ کی بالکونی سے ایک لڑکی خطرناک جسم خطرناک حد تک نیچے لٹکا کر پوچھتی ہے "کیا ہوا منے کو؟" منے کی ماں اپنی بالکونی میں آکر اوپر والی بالکونی پر جھکی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر کہتی ہے "کچھ نہیں۔ چھری سے کھیلتا تھا۔ میں نے سوچا ہاتھ کاٹ لے گا، واپس لی تو بگڑ گیا۔" لڑکی بالکونی سے پرے ہٹ گئی ہے۔ بڑا سجا ہوا فلیٹ ہے۔ کوئی بھی گھر کا سامان دیکھ لے تو اسے اندازہ ہو جائے کہ اللہ کا فضل ہے۔ گھر کی بڑی عورت فریج سے کچھ نکال رہی ہے۔ بڑی محتاط اور کنجوس عورت ہے۔ ابھی دن بھر کا حساب کرے گی اور سونے سے پہلے سب دروازے اور تالے اپنے ہاتھوں سے بند کرے گی۔

درمیان والے فلیٹ میں کافی چہل پہل ہے۔ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ گھر ہر سائز کے مردوں، عورتوں اور بچوں سے بھرا پڑا ہے۔ ایک مہمان عورت زیورات سے لدی ہوئی ہے۔ دوسری عورتیں کبھی کبھی چور نگاہوں سے اس کے گلو بند کو دیکھتی ہیں وہ ہاتھ اٹھا کر باتیں کرتی ہے تو سونے کے کنگن آپس میں بجتے ہیں۔ خاصے بے پرواہ لوگ ہیں اس

گھر کی عورت تو اکثر رات کو دروازہ بند کرنا بھی بھول جاتی ہے۔ چوروں کے لئے یہ گھر بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہے پر جانے کیوں کسی چور کی آج تک اس گھر پہ نظر نہیں پڑی۔ بچوں نے آفت مچا رکھی ہے ایک نے دوسرے کی قمیض پھاڑ دی ہے اور اب دونوں ایک دوسرے کو نیچے گرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک لڑکا اٹھ کر انہیں چھڑانے لگا ہے لیکن وہ تو جیسے ایک دوسرے سے چپک کر رہ گئے ہیں۔

اوپر فلیٹ کی بالکونی میں ایک اونچے قد کی بکری تھوتھنی اٹھائے میری طرف دیکھے جا رہی ہے کمرے میں ایک ٹیوب اور زیادہ طاقت کا بلب بھی روشن ہے۔ چھتی پہ چمچماتے ہوئے برتن سجے ہیں عورت چارپائی پر کھڑی ہو کر چھتی پر رکھے پیالے میں اپنے کانٹے رکھ رہی ہے۔" وہ۔ ارے، اس کا ہاتھ مرلی کنڈے (کد دکش) سے ٹکرایا ہے۔ مرلی کنڈا پرات سے لگا ہے اور دھن، دھڑ، دھڑڑ پرات چارپائی کے پائے پر لگ کر فرش پر دور تک لڑھکتی چلی گئی ہے اور کرسی کے نیچے دو تین پھیرے لے کر زمین سے چپک گئی ہے۔ مرد جلدی سے پرات پکڑنے کے لئے اٹھا ہے۔ اب اس نے پرات اٹھالی ہے اور چارپائی پر چپ کھڑی عورت کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کی گردن اذان دیتے ہوئے مرغ کی طرح اکڑی ہوئی ہے۔

ساتھ والے فلیٹ کی بالکونی میں تین پنجرے لٹکے ہوئے ہیں ایک میں طوطا، دوسرے میں رنگین چڑیاں اور تیسرے میں مُرغے ہیں۔ طوطا چپ ہے مگر چڑیوں کی چوں چوں سارے گھر میں پھدکتی پھر رہی ہے عورت لیٹی ہے اور مرد اس کے کان میں دوائی ڈال رہا ہے۔ اب وہ پیچھے ہٹ گیا ہے۔ عورت نے اٹھ کر دوائی اس کے ہاتھ سے لی ہے۔ اس کی آنکھیں حیرت سے تن گئی ہیں اور اب وہ کان میں انگلی ڈال کر مرد سے جھگڑ رہی ہے۔ مرد نے اس کے کان میں کف سیرپ (COUFH SYRUP) ڈال دیا ہے۔

اسی فلیٹ سے آگے کونے والے فلیٹ کی بالکونی میں چڑیوں اور جنگلی کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ یہاں سے ابابیلوں کا گھونسلا بھی نظر آ رہا ہے۔" لو۔ وہ ایک ابابیل گھونسلے سے نکل کر فضا میں بلند ہو گئی۔ کسی نے کمرے کا پردہ کھینچ دیا ہے۔ لیکن کھڑکی میں سے ایک تصویر صاف نظر آ رہی ہے جلتے بتی بھی بجھ گئی۔ لیکن پردے کے پیچھے حرکت کرتے سائے واضح دکھائی دے رہے ہیں۔

اس فلیٹ اور اس سے اوپر والے فلیٹ کے درمیان دیوار میں ایک پیپل اگا ہوا ہے پیپل کے ساتھ سوراخ ہے جس میں جنگلی کبوتروں کا گھونسلا ہے اس وقت کبوتری گھونسلے میں اور کبوتر پیپل پر بیٹھا ہے چونچ سے پروں میں خارش کر رہا ہے۔

اوپر والے فلیٹ میں گھر کے سب لوگ مل کر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں لیکن سالن تھُڑ گیا ہے اور سب سے چھوٹا بچہ پلیٹ ہاتھ میں پکڑے مزید سالن کے لئے بار بار ماں کے گھٹنے سے ٹکرا رہا ہے۔ باپ آخری بُرکی سے پلیٹ صاف کر رہا ہے۔ ماں نے بچے کو گود میں اٹھا لیا ہے اور چینی کا ڈبہ لینے باورچی خانے میں گئی ہے۔

ساتھ والے فلیٹ میں مینٹل پیس پر ایک تصویر پڑی ہے جس کے قریب ریڈیو رکھا ہے۔ کِلّی پر لبنہ ٹنگا

ہے ۔ آدھا پردہ نیچے لٹک رہا ہے ۔ بوڑھی اماں اپنا بٹوہ گتھلی میں ڈال رہی ہے ۔ بوڑھی اماں نے صندوقوں میں بھی بہت کچھ چھپا کر رکھا ہے ۔ جن کی چابیاں وہ اپنے ازار بند کے ساتھ باندھ کر رکھتی ہے اب وہ نماز پڑھنے کے لئے جا نماز ڈھونڈ رہی ہے ۔

یہ رونے کی آواز اس سے اوپر والے فلیٹ سے آ رہی ہے ۔ رونے والی عورت یہاں سے صاف دکھائی نہیں دیتی ۔ اس نے اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا رکھا ہے گھر میں دوسرا کوئی نظر نہیں آتا ۔ گلدان میں بڑے بڑے سرخ پھول سجے ہیں ۔ جن کی سرخی پورے گھر میں پھیلی ہوئی ہے ۔ یہاں بھی وہی تصویر دیوار پہ لگی ہوئی ہے جو دوسرے فلیٹوں میں بھی تھی ۔

ساتھ والے فلیٹ میں کمرے کی سامنی دیوار پر چیونٹیوں کی قطار چھت کو جا رہی ہے ۔ نئی نئی سفیدی ہوئی ہے اس لئے چیونٹیوں کی قطار گہرے رنگ کی لکیر لگ رہی ہے ۔ بچہ ایک ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا اور دوسرے ہاتھ میں امرود اٹھائے بڑے غور سے چیونٹیوں کی قطار کو تک رہا ہے ۔ اب اس کی ماں بھی آ گئی ہے اور وہ اسے جانگیہ پہنانے کے لئے جھکی باپ ادھر بالکونی میں آ گیا ہے ۔ اور سگریٹ سلگا رہا ہے ۔ ٹیبل پر وہ لمبا ٹیبل لیمپ چمک رہا ہے جو صرف خوبصورتی کے لئے ہوتا ہے اور جس میں مچھلیاں تیرتی ہیں ۔ دیوار پہ لگے کلاک کی ٹک ٹک میرے دل کی دھڑکنوں میں گھونسلا بنا رہی ہے ۔

ساتھ والے فلیٹ میں کتا بالکونی پر اگلی ٹانگیں رکھے لگاتار بھونک رہا ہے اندر ایک نوجوان ٹیبل لیمپ کے قریب جھکا کچھ پڑھ رہا ہے ۔ اس کی بہن دودھ کی پیالی میں میٹھا گھولتی اس کی طرف آ رہی ہے ۔ دیوار پر اخبار سے کاٹی ہوئی چھوٹی بڑی تصویریں بے ترتیب چپکی ہوئی ہیں ۔ اور بڑی خوبصورت لگ رہی ہیں ان میں پہلے والے فلیٹوں والی تصویر بھی ہے کتے کی غراہٹ میری زبان تلے آ گئی ہے ۔

اوپر والا فلیٹ خاصا سجا ہوا ہے ۔ انگیٹھی پر پھول بنا رکھے ہیں جس پر ہاتھی گھوڑے ، شیر ، ببر شیر ، ہرن ، لدھر ، گینڈے اور جانے کیا کیا سجا ہوا ہے ۔ مجھے اپنا آپ ان جانوروں میں گھرا ہوا محسوس ہوتا ہے ۔ میں ٹیبل میں پر ادھر ادھر بھاگتا ہوں ۔ شیر سے جان چھڑاتا ہوں تو سامنے ہاتھی آ جاتا ہے ۔ ہاتھی سے بھاگتا ہوں تو چیتا راہ روک لیتا ہے ۔ میری سانس پھول گئی ہے اور ٹانگیں کھڑے کھڑے کانپنے لگی ہیں ۔

ساتھ والے فلیٹ میں شیر کی کھال اور بوڑھے مرد کی بندوق لٹک رہی ہے جو اب صرف ڈیکوریشن پیس بن کر رہ گئی ہے ۔ ایک نوجوان آرام کرسی پر نیم دراز کچھ سوچ رہا ہے ابھی ایک ادھیڑ عمر مرد ساتھ والے کمرے سے نکلا ہے ۔ اور باتھ روم میں گیا ہے ۔ بیڈ روم کی کھڑکی ادھ کھلی ہے اور اندر ایک عورت بستر کی چادر تبدیل کر رہی ہے ۔

اوپر والے فلیٹ کے سارے کمروں کی بتیاں بجھی ہیں ۔ اندھیرا اندھیرے کی کلائی پکڑے طاقت آزمائی کر رہا ہے ۔ سونے کے کمرے میں ہلکی بتی جل رہی ہے اور وہ دونوں — بتانے کی بات نہیں — بس وہ دونوں — پرندوں کی لڑائی دیکھ رہے ہیں ۔

ساتھ والے فلیٹ والے سو چکے ہیں۔ ہلکی ہلکی روشنی میں بلی چھکے میں رکھا دودھ پی رہی ہے۔ ننھی کی گڑیا اوندھے منہ میز پر پڑی ہے۔ ایک سایہ سونے والے کمرے سے نکل کر بیٹھنے والے کمرے کی طرف گیا ہے۔

اسی ترتیب کے کونے والے فلیٹ میں دادی اماں بچوں کو کہانی سنا رہی ہے۔ دادی اماں کا ہاتھ سب سے چھوٹے بچے کو تھپک رہا ہے۔ پاس بیٹھے نوجوان نے سر اٹھا کر "گھوڑوں کے شہر میں اکیلے آدمی" والی کہانی کے کسی حصے کی وضاحت طلب کی ہے اور دادی کا جواب سن کر پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا ہے۔ بڑا بچہ کان دادی کی طرف لگائے سرہانے پر کڑھے ہوئے طوطے اور شیر کے دھاگوں سے کھیل رہا ہے۔

اوپر والے فلیٹ میں گھپ اندھیرا ہے۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ کیونکہ یہ سب سے اوپر والی ترتیب کا درمیان والا فلیٹ ہے اس لئے اس کی پیشانی پر بلب کے نیچے ۸۶، لکھا ہوا صاف نظر آ رہا ہے۔

ساتھ والے فلیٹ کا کونہ کچھ شکستہ سا نظر آ رہا ہے اور اس کی اینٹیں آگے سے بھر گئی ہیں۔

کونے والے فلیٹ میں مکمل اندھیرا ہے اور ایک طرف سے اس کی کچھ اینٹیں نکلی ہوئی ہیں اور کچھ بھر گئی ہیں۔ کچھ اور جگہوں پہ بھی ایسے ہی نشانات ہیں۔ شاید اس عمارت کو پتھر سٹون کینسر (STONE CANCER) ہو گیا ہے۔ اب ساری عمارت اندھیرے میں ڈوب گئی ہے۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ کلاک کی ٹک ٹک میرے دل کی دھڑکنوں میں گھونسلا بنا رہی ہے۔ میری نظریں ایک اندھیری بالکونی سے دوسری اندھیری بالکونی میں پاؤں رکھتی نیچے اترتی ہیں۔ اندھیرا ــــــ کالا سیاہ اندھیرا ــــ کلاک کی آواز ایک بجاتی ہے۔ عمارت کے عقب سے میرے ساتھی نمودار ہوئے ہیں وہ سامان سے لدے ہوئے ہیں۔ چوری کی واردات بڑی کامیاب رہی ہے۔ لیجئے ہم چلے۔ اب عمارت جانے اور عمارت والے۔

(افسانہ)

دل کا کھوٹ

اعجاز حسین بٹالوی

وہ اتنا ہنسا، اتنا ہنسا کہ اس کے چہرے پر کی لکیریں جن کا رُخ نیچے کی طرف تھا ہنستے ہنستے اُوپر کی طرف اُٹھ گئیں۔ بات کچھ بھی نہ تھی اور اسی لیے صادق علی بساطی حیران ہو رہا تھا کہ آج بہاں غلام دین بٹ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہنستا ہی چلا جا رہا ہے۔ وہ دونوں مسجد سے عصر کی نماز پڑھ کر باہر نکلے تھے۔ چند قدم کے فاصلے پر صادق علی کی دوکان تھی۔ وہ تو تھڑے پر بیٹھ گیا اور غلام دین بٹ کہنے لگا۔ صادق یار کل شام مغرب کے بعد میرے ہاں پہنچ جانا، نیاز دلوار ہا ہوں۔ کھانا بھی ادھر ہی کھا لینا۔ نان حلوے کا ختم دلوار ہا ہوں۔"

صادق نے کہا "معلوم ہوتا ہے پھر اللہ کا فضل ہو گیا تم پر مگر اب کی دفعہ بہت دنوں کے بعد ہوا"

یہ سُن کر بٹ ہنسنے لگا اور ہنستا چلا گیا۔

نام تو اس کا غلام دین تھا مگر محلے میں سب اُسے بٹ صاحب بٹ صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔ غلام دین بٹ محلے کا معزز آدمی تھا۔ نماز روزے کا پابند تھا۔ جوانی اب ڈھلنے والی تھی۔ کنپٹیوں پر بال سفید ہو گئے تھے مگر گینڈے کا مضبوط تھا۔ دراز قد، بھرا بھرا جسم اور بڑے بڑے ہاتھ پاؤں جوانی میں ہتھ چھٹ تھا۔ محلے کے ہر دنگے فساد میں شریک ہوتا۔ ہر لمحہ مار کٹائی پر آمادہ رہتا گلی محلے میں کوئی واردات ہوتی تو تھانیدار اُسے ضرور شاملِ تفتیش کر لیتا۔

جوں جوں جوانی کا بھوت اترنا شروع ہوا طبیعت میں ٹھہراؤ آتا گیا۔ پھر ایک پیر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے صوم وصلوٰۃ میں پختہ کر دیا۔ بٹ کو پیروں فقیروں پر کوئی اعتقاد نہ تھا مگر ایک روز ایک دوست اُسے اپنے پیر صاحب کے ہاں لے گیا۔ پیر صاحب کے ارد گرد عقیدتمند دل کا مجمع تھا۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ کسی پیر صاحب کا امتحان لینا چاہو تو اس کے پیچھے جا بیٹھو اور آہستہ آہستہ درود شریف پڑھنے لگو۔ بٹ نے یہی کیا۔ پیر صاحب کی پُشت پر جا بیٹھا اور دل ہی دل میں درود پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پیر صاحب نے مُڑ کر پیچھے دیکھا اور فرمایا "آپ سامنے تشریف لے آئیے۔" وہ اُٹھا اور پیر صاحب کے قدموں میں جا بیٹھا وہ دن جاتے اور آج کا دن آتے وہ پیر صاحب کا مُرید خاص تھا۔ پیر صاحب حکم دیتے وہ بجا لاتا، پیر صاحب دینداری کی باتیں کرتے وہ غور سے سُنتا

ایک دفعہ رزق کا مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا "پیرجی کشائشِ رزق کا کوئی ذ بتلیئے۔ گھر میں بیوی بچے ہیں۔ دنیاداری کے تقاضے ہیں بڑی مشکل سے گزر ہوتی ہے۔"

پیر صاحب نے فرمایا "رزق کے لیے اللہ کی زمین پر سفر کیا کرو" پھر بولے "اپنی اہلیہ سے چاند کی پہلی جمعرات کو گڑ کے چاول پکائے اور محلے کے بچوں کو گھر میں جمع کر کے کھلا دیا کرے اللہ برکت دے گا۔"

بات یہ تھی کہ رزق کے بارے میں غلام دین بٹ عمر بھر پریشان رہا۔ تعلیم اُس کی بے حا معمولی تھی۔ جوانی میں کوئی پکی ملازمت یا پیشہ اختیار نہ کر سکا۔ گھرداری کے اخراجات وقت کے سا ساتھ بڑھتے رہے۔ لکڑیوں کے ٹال سے دودھ دہی کی دوکان تک ہر جگہ قسمت آزما چکا تھا۔ سینیو کا گیٹ کیپر بھی رہ چکا تھا۔ ایک مرتبہ بڑے ہسپتال میں بائیسکلوں کا ٹھیکہ مل گیا تھا۔ چند ماہ ایک دفتر کی کینٹین کا کاروبار کیا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ دن شہر کی سڑکوں پر تانگہ بھی چلایا تھا۔ ان رنگا رنگ تجربات سے اس کی شخصیت تو پختہ سے پختہ تر ہوئی، مگر رزق کی طرف سے کبھی سکونِ قلب نصیب نہ ہوا۔

ایک دفعہ محلے کے چودھری نے یونیورسٹی گراؤنڈ میں کھیلوں کے انتظام کا ٹھیکہ لے لیا مگر چند ہی روز میں اُسے طرح طرح کی مشکلات پیش آنے لگیں۔ چودھری کا انتظام تو دروازوں تک محدود رہا جہاں ٹکٹ کے ذریعے داخلہ ہوتا تھا، مگر کالجوں کے لڑکے چاروں طرف جگہ جگہ سے، جہاں موقع ملتا، چاقو یا بلیڈ سے قنات میں سوراخ کر لیتے اور وہیں سے میچ کا تماشا کرتے۔ چودھری کو ٹکٹ کا گھاٹا الگ پڑتا اور قنات کا نقصان الگ ہوتا۔ اُس نے شام کو محلے میں بٹ سے مشورہ کیا۔ بٹ نے ۳۰ روپے دہاڑی پر چودھری کی مدد کرنے کا سودا کر لیا۔

اگلے روز بٹ اپنے ایک نائب کو جو محلے کے اکھاڑے میں پہلوانی کے داؤ سیکھتا تھا ساتھ لیکر یونیورسٹی گراؤنڈ پہنچا اور انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے ہاتھ میں بید اور نائب کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ دونوں نے قنات کے گرداگرد دو چکر کاٹ کھائے۔ جہاں کہیں کسی کو اِدھر اُدھر گھومتے دیکھا، ایسے ہی ہوا میں دو چار مُنہ بھر بھر گالیاں چھوڑ دیں۔ پھر کس کی مجال تھی کہ قنات کے قریب بھی پھٹکتا۔ پہلا دن تو خیریت گزر گیا، مگر دو روز بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔ قنات کے عین باہر ایک بڑا سا درخت تھا۔ دو چار نوجوان اس پر چڑھ گئے اور تنوں اور موٹی شاخوں پر بیٹھ کر مزے سے میچ دیکھنے لگے۔ بٹ صاحب نے پہلے تو درخت کے پاس کھڑے ہو کر انھیں نیچے اُترنے کو کہا، پھر جب دوسری طرف سے ان کی دعوت پر کوئی عمل نہ ہوا تو انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں پھکڑ تولنے شروع کئے۔ جب اُوپر سے بھی گالی کا جواب گالی سے آیا تو بٹ سے برداشت نہ ہو سکا۔ قریب ہی دو عدد

ینٹیں پڑی تھیں۔ بٹ نے کہا: "اُٹھ تیری" اور ساتھ ہی یکے بعد دیگرے دونوں اینٹیں درخت کی چوٹی کی طرف ہوا میں اُچھال دیں۔ وزن زیادہ تھا۔ اینٹیں گالی دینے والوں تک کیا پہنچتیں، قنات کو پار کر کے مہمان خصوصی والے پویلین میں جہاں معززینِ شہر اور یونیورسٹی کے پروفیسر لوگ بیٹھے تھے یکے بعد دیگرے دو بزرگوں کے سروں پر جا گریں۔ پویلین میں آناً فاناً کہرام مچ گیا۔ خون دیکھ کر لوگ چیخیں مارنے لگے۔ ایک زخمی بے ہوش ہو گیا۔ کسی نے کہا بلوہ ہو گیا۔ پویلین میں آپا دھاپی پڑ گئی۔ گراؤنڈ میں کھیل ختم ہو گیا۔

پولیس والوں کو یہ تشویش ہوئی کہ یہ اینٹیں آئیں کہاں سے اور کسی فرشتہ غیبی نے بٹ کے کان میں کہا کہ اب یہاں سے بھاگو۔ بٹ وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور سیدھا اپنے محلّہ میں پہنچ گیا۔ اگلے روز اُس نے چودھری سے پیسوں کا تقاضا کیا تو چودھری اُلٹا اُس کے سر ہو گیا کہ بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ بٹ نے کہا میرا کیا قصور، یہ سب تو انتظامات کا حصّہ تھا۔ بات بڑھ گئی تو نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی۔ محلّے والوں نے بیچ بچاؤ کرایا اور چودھری کو تین دن کی دہاڑی ادا کرنی پڑی۔ بٹ نے تین دن کی دہاڑی وصول کی اور صادق علی بساطی سے کہا "یار اللہ کا فضل ہو گیا۔ آج شام کو نیاز دلوا رہا ہوں جلیبیوں کا ختم ہو گا وقت پر پہنچ جانا۔"

محلّے میں اللہ کے فضل کا محاورہ غلام دین بٹ سے مخصوص تھا۔ اُسے جب بھی کہیں سے چار پیسے ملتے وہ اللہ کے فضل اور نیاز کا اعلان کر دیتا۔ ساتھ ہی محلّے میں اپنے واقفوں اور دوستوں کو یہ بھی بتا دیتا کہ ختم کس چیز پر پڑھا جائے گا اور کس چیز کی نیاز بانٹی جائے گی۔ برسوں سے یہی رسم چلی آ رہی تھی کہ جب ختم نیاز کو بہت دن گزر جاتے تو محلّے والوں کو علم ہو جاتا کہ غلام دین کی مالی حالت اچھی نہیں اور جب آئے روز ختم نیاز بٹنے لگتی تو محلّے میں ہر شخص کو پتہ لگ جاتا کہ آج کل بٹ پر اللہ کا فضل ہے۔

پھر ایک وقت وہ آیا کہ مہینوں غلام دین بٹ کے ہاں کوئی نذر نیاز نہ ہوئی۔ نہ جلیبیاں، نہ شکر پارے نہ نان حلوہ نہ پلاؤ کی دیگ نہ پنج تن پاک کا ختم نہ بڑی گیارھویں شریف کی نیاز۔ صادق علی بساطی نے کہا۔

"بٹ جی میری مانو تو تم پاسپورٹ بنواؤ، ویزا لگواؤ اور نکل جاؤ۔"

"مگر نکل کدھر جاؤں؟"

"اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے بٹ صاحب، سعودی عرب جاؤ، کویت جاؤ، قطر جاؤ، ابوظبی جاؤ، جانے کے لئے کوئی ایک ملک تھوڑی ہے۔ دولت کے انبار لگے ہیں ہر طرف۔ یہ خدا کا قہر اور رزق کی مار تو بس ہماری قسمت میں لکھے ہیں۔"

یہ سن کر بٹ کو پیر صاحب کا ارشاد یاد آگیا کہ رزق کے لئے اللہ کی زمین پر سفر کرو۔ اُ
کے بعد وہ پاسپورٹ اور ویزا کے چکر میں پڑ گیا۔ پاسپورٹ تو خیر معمولی بھاگ دوڑ کے بعد بن گ
مگر ویزا حاصل کرنا مشکل ثابت ہوا۔ طرح طرح کے لوگوں سے ملاقات ہوئی اور پیچ در پیچ باتو
کا علم ہوا۔ بٹ اپنے کو بڑا جہاندیدہ اور تجربہ کار سمجھتا تھا۔ لیکن اب اس کی شناسائی ایک او
دُنیا سے ہو رہی تھی جس کے راز پرت پرت اس پر کھل رہے تھے۔

ایک روز ایک ویزا دلال نے اسے الگ لے جا کر کہا "بٹ صاحب آپ ایسے تجربہ کار ا
ایماندار آدمی ہیں آپ اپنے ملک کو چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں؟"

اُس نے کہا "بھائی ملک میں رہیں تو کھائیں کہاں سے۔"

وہ بولا۔ "یہ کیا مشکل بات ہے۔ آپ جیسے آدمی کو تو ہزاروں کام مل سکتے ہیں۔ ذرا سی ہمت
کی ضرورت ہے۔ مجھے اجازت دیں تو میں آپ کے لئے ملازمت کا بندوبست کروں۔"

ویزا دلال کچھ دنوں بعد بٹ کو ساتھ لے کر کراچی چلا گیا۔ کچھ روز کراچی میں ایک بڑھیا قسم کے ہوٹ
میں ٹھہرے۔ بل کس نے ادا کیا اُسے معلوم نہیں۔ پھر سیٹھ سے ملاقات ہوئی اور اُسے کام بھی مل گیا۔
معاملے کی اُونچ نیچ سے اُسے مطلع کر دیا گیا مگر اس جیسے تجربہ کار آدمی کے لئے یہ کام ہی کیا تھا۔
بات تو صرف اتنی تھی کہ سیٹھ کا ایک سوٹ کیس کراچی سے لاہور لے جانا تھا اور واپسی پر کچھ سامان لاہو
سے کراچی لانا تھا۔ مقدر کے کھیل بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اُسے خدا نے وہ کام دلا دیا کہ کویت جانے کی
ضرورت ہی نہ رہی لاہور ایئرپورٹ پر سیٹھ صاحب کا آدمی کار لئے اس کا منتظر تھا۔ سیٹھ صاحب کا
بیگ اُس کے حوالے کیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ایک ہی پھیرے میں اتنی رقم مل گئی کہ دو مہینے کا خرچ نکل
آیا۔ لیکن چند روز بعد سیٹھ کا پیغام آیا کہ کراچی پہنچو۔ اب ایک اور ضروری کام اس سے آپڑا تھا۔ ہوائی
جہاز کا ٹکٹ بھی ساتھ آیا تھا۔ وہ پھر کراچی پہنچا اور اسی بڑھیا قسم کے ہوٹل میں قیام کیا۔ واپسی پر ایک
اور بیگ لا کر سیٹھ صاحب کے حوالے کر دیا۔ پھر تو یہ حال ہو گیا کہ کراچی گویا گھر آنگن تھا اور ہوائی جہاز
کا سفر اس کے لیے تانگے کے سفر سے زیادہ آسان ہو گیا۔

اس کی خوشحالی کو دیکھ کر دوست احباب خود ختم نیاز کی فرمائش کرنے لگے اور پھر تو یہ حال ہو گیا کہ بازار
میں جو میوہ مہنگا ہوتا اس کا نام لے کر تقاضا کرتے۔ صادق علی کہتا "بٹ صاحب میرا خیال اس مرتبہ تو
دسہری آم اور الیچی کی نیاز دلواؤ۔"

اور بٹ کہتا "کیوں نہیں یار صادق علی۔ یہ اللہ کی نعمتیں ہیں۔ اب کے انہیں پر ختم پڑھا جائے گا۔"
معلوم نہیں محلے میں کیسے مشہور ہو گیا تھا کہ غلام دین بٹ کراچی کی ایک پارٹی کے ساتھ مل کر قالینو
کی ایکسپورٹ کا کام کر رہا ہے۔ بٹ نے خود کبھی اس کی تردید کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

ایک روز کراچی میں موسم بے حد خراب تھا۔ حبس تھا اور پسینہ سوکھنے کا نام تک نہ لیتا تھا۔ سیٹھ کو ساتھ لے کر اپنی گاڑی میں سیر کو نکلا۔ ایئر پورٹ کے راستے میں ایک ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل تھا۔ ٹھ نے کہا "یہاں ہمارا ایک دوست ٹھہرا ہے ذرا اس سے ملتے چلیں"۔

وہ دونوں ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ سیٹھ کا دوست کسی ہوائی کمپنی میں ملازم تھا سفید وردی ں بڑا خوبصورت اور رعب داب والا معلوم ہوتا تھا۔ بٹ نے یہ تو دیکھ لیا کہ وہ غیر ملکی ہے اور انگریزی تا ہے مگر اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس ملک کا رہنے والا ہے۔ ہوائی کمپنی کے گورے افسر نے چاء منگوائی ر چاء کے بعد سیٹھ کو سگریٹ پیش کیا۔ پھر سگریٹ کی ڈبیا بٹ کے سامنے بڑھائی۔ بٹ نے بھی ایک گریٹ لے لیا۔ کوئی اعلیٰ کوالٹی کا غیر ملکی سگریٹ تھا۔ سیٹھ نے دو چار کش لیتے ہی سگریٹ کی تعریف روع کر دی "کیوں بٹ صاحب دیکھا آپ نے کیسا اعلیٰ سگریٹ ہے واہ واہ مزا آگیا۔ پاکستان والوں نے کوالٹی کا ستیاناس کر دیا"۔ سیٹھ نے سگریٹ کی اتنی تعریف کی کہ وہ گورا کچھ پریشان اور کچھ خوش ہوا اور بولا ر واقعی آپ کو یہ سگریٹ اتنے پسند ہیں تو میرے پاس ایک بند ڈبیا پڑی ہے۔ آپ کو دیئے دیتا ہوں۔" ورے نے جیب سے ایک بند ڈبیا سگریٹ کی نکالی۔ سیٹھ نے پہلے تو انکار کیا پھر شکریے کے ساتھ ڈبیا لے کر جیب میں ڈال لی۔

پھر سیٹھ اور بٹ ہوائی کمپنی کے افسر کو خدا حافظ کہہ کر واپس ہوئے۔ راستے میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور گھر پہنچ کر جب دونوں سیٹھ کے ٹھنڈے کمرے میں بیٹھ گئے تو سیٹھ نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور اطمینان سے سگریٹ کی ڈبیا کھولی۔ پہلا سگریٹ بٹ کو پیش کیا اور دوسرا سگریٹ خود لے کر ہاتھوں سے مسل ڈالا۔ تمباکو کو الگ کر کے ڈائمنڈ کے چھوٹے چھوٹے "تین چار ٹکڑے" الگ کر لیے۔ اسی طرح سیٹھ نے سب سگرٹوں کو مسل کر دیکھتے دیکھتے کئی ڈائمنڈ الگ کر کے اس کے سامنے رکھ دیئے اور بٹ دیکھنے کا دیکھتا رہ گیا در پھر سیٹھ بٹ کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا "دیکھا غلام دین بٹ اسے کہتے ہیں امپورٹ ایکسپورٹ۔ ر ہے سگریٹ، یہ رہے ڈائمنڈ۔ بنکاک کا مال کراچی میں اور کل کراچی کا مال خدا جانے کہاں ہوگا۔"

بٹ نے کہا "سیٹھ یہ سب کیسے ہوتا ہے" سیٹھ نے کہا۔ سب کچھ تو تمہارے سامنے ہوا۔ میں تو ہاری ٹریننگ کر رہا ہوں تم کام کے آدمی ہو۔ یہ سب گر سیکھ جاؤ تو وارے نیارے کر دوں گا۔ دیکھو ج اُس پائلٹ نے تمہارے سامنے اتنے سارے ہیرے اپنی جیب سے میری جیب میں پہنچا دیئے اور مارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔ یہ ہوتی ہے ہاتھ کی صفائی۔

اگلے روز سیٹھ بٹ کو ساتھ لے کر پھر اسی ہوٹل میں پہنچا اور پائلٹ کو ساتھ لے کر چائے پلانے کسی ر ہوٹل میں لے گیا۔ سیٹھ کے ہاتھ میں انگریزی کے کچھ تصویری رسالے اور میگزین تھے۔ وہ اُس نے بہت لاپروائی سے ایک طرف رکھ دیئے۔ چائے پی کر جب واپس پائلٹ کو چھوڑنے اُس کے ہوٹل پہنچے

... جب ... باہر سے ... چند قدم آگے جا چکا تھا تو سیٹھ نے کہا "یہ اپنے رسالے تو لیتے جائیے۔ میں نے آپ کے لیے کچھ میٹیریل پڑھنے کے لیے جمع کیا تھا" اور بالآخر بٹ شکریہ شکریہ کہہ کر وہ رسالے بغل میں داب کر ساتھ لے گیا۔

بٹ کو یقین ہو گیا تھا کہ ہر چند دیکھنے میں انگریزی رسالوں کا معاملہ سیدھا سادا لگتا تھا، لیکن اس میں کوئی گہری بات ضرور تھی۔ راستے میں اُس نے کہا "سیٹھ ایک بات بتاؤ۔ اِن رسالوں کے اندر کیا تھا؟"

سیٹھ مسکرایا: "ہیروں کی قیمت تھی۔"

"مگر کس شکل میں؟"

سیٹھ نے ہنس کر کہا "ابھی نہیں۔ ابھی کچھ دن اور ٹھہرو، آہستہ آہستہ سب کچھ پتہ چل جائیگا۔"

اگلے روز غلام دین بٹ سیٹھ کا ایک بکس لے کر لاہور روانہ ہو گیا لیکن اس مرتبہ صبح ہی اُسے بتا دیا گیا تھا کہ کسی خاص وجہ سے یہ سفر ہوائی جہاز سے نہیں ریل گاڑی سے ہوگا اور سیٹھ کا آدمی ہوائی اڈے پر نہیں بلکہ ریلوے اسٹیشن کے باہر اُسے ملے گا۔ بٹ نے ایک آدھ مرتبہ سیٹھ سے پوچھا بھی، مگر سیٹھ نے یہ کہہ کر اس کی تسلی کرا دی کہ "جو میں کہتا ہوں وُہی کرو، آہستہ آہستہ خود سمجھ جاؤ گے" اور بٹ سیٹھ کا بکس لے کر ریل گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اُس کی سیٹ پہلے ہی سے بُک ہو چکی تھی۔

محلّے میں صادق علی لباطی نے کہا "بٹ جی، اتنے اتنے دن کہاں غائب رہتے ہو؟" تو بٹ نے کہا "یار کراچی گیا ہوا تھا۔ تم کو تو معلوم ہی ہے ایک پارٹی سے مل کر امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کر رکھا ہے اللہ کا شکر ہے جس نے بچوں کی روزی کا بندوبست کر دیا۔ اور ہاں کہیں سے خالص گھی مل سکے تو دلوا دو۔ سوچا ہے کل تمام حلوے کی نیاز دلوا دوں۔ یہ تمہارے سامنے والا نانبائی اِس وقت دوکان بند کر جاتا ہے اُسے کہنا کہ کل عصر کے بعد بیس پانچ آنا تنانوں کے لگا دے۔"

صادق علی نے کہا "اور سنو غلام دین یہ اپنا امام مسجد ہے نا اسے ضرور بُلا لینا۔ اُس کے ہاں آج کل نعت خوانوں کی ایک بڑی اچھی ٹولی آئی ہوئی ہے۔ ختم سے پہلے دو چار نعتیں ہو جائیں تو سماں بندھ جائے گا۔"

لاہور میں سیٹھ کے کارندوں کو غلام دین بٹ کے گھر کا علم تھا۔ اِن میں سے ایک آیا اور سیٹھ کا پیغام دے گیا کہ جلدی کراچی پہنچ جاؤ۔ بٹ نے کہا اچھا پرسوں چلا جاؤں گا۔

اِس مرتبہ کراچی سے واپسی پر ایک عجیب بات ہوئی کہ لاہور کے ہوائی اڈے پہ جب غلام دین بٹ باقی مسافروں کے ساتھ باہر آیا تو سوٹ کیس تو اس کے ہاتھ میں تھا، لیکن سیٹھ کے آدمی اس کو مقررہ مقام پر نہ ملے اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن جب وہ کہیں نظر نہ آئے تو اُس نے ٹیکسی لی اور گھر پہنچ گیا۔

لی ایکسپورٹ کا کام کر رہا ہے۔ بٹ نے خود بھی اس کی تردید کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

..انے سو بسم اللہ کی نمکین چائے بنی رکھی تھی۔ فوراً گرم کر کے اُوپر ملائی ڈالی اور گرم گرم چائے کا پیالہ اور خطائیوں کی پلیٹ سینی میں رکھ کر لے آئی۔ غلام دین بٹ چائے پیتا جاتا تھا اور گھور گھور کر سوٹ کیس کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ بیوی نے کہا یہ سُوٹ کیس تو آپ لے کر نہیں گئے تھے۔ اُس نے کہا "نہیں یہ کسی کی امانت ہے"۔ بیوی نے محسوس کیا کہ اس کا شوہر اس سوٹ کیس کی موجودگی میں بڑا پریشان نظر آتا تھا۔ بیوی نے بڑھ کر اسے اُٹھانا چاہا تو بٹ کی جیسے چیخ نکل گئی "ناں ناں ناں اسے ہاتھ مت لگانا"۔ بیوی مزید پریشان ہو گئی، مگر ڈر کر پرے ہٹ گئی۔

چائے پی کر بھی بٹ خاموش رہا۔ بیوی نے پھر پوچھا۔ اس وقت نہ جانے بٹ کے جی کیا آئی کہ بٹ نے اُٹھ کر سوٹ کیس کھول ڈالا۔ کپڑوں کے درمیان ایک وزنی سا تھیلا پڑا تھا۔ بٹ نے تھیلے کا منہ کھول کر بیوی کو دکھایا۔ جیسے سُنہری برفی کی ڈلیاں ہوتی ہیں۔ بیوی نے ہاتھ ڈال کر دو ڈلیاں نکال لیں اور ہاتھ میں لے کر خوشی سے تھر تھر کانپنے لگی۔ تھیلے کا تھیلا سونے کی اینٹوں سے بھرا پڑا تھا۔ اتنا سونا اِتنا سونا اور ان کے گھر میں۔ بیوی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بٹ کے ہاتھ میں سونے کا تھیلا تھا بیوی کے ہاتھ میں سونے کی دو اینٹیں تھیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ یوں لگا جیسے ایک عمر گزر گئی۔

پھر بیوی نے کہا "یہ سب ہمارا ہے؟"

بٹ نے کہا۔ "نہیں ہمارا نہیں ہے"۔

"تو کس کا ہے؟"

"کہنے کو تو سیٹھ کا ہے، لیکن سچ پوچھو تو کسی کا بھی نہیں۔ یہ سب چکّر ہے، بہت بڑا چکّر ہے"۔

اب بیوی جیسے خواب کی دنیا سے باہر نکل آئی اور چیخ کر بولی "نہیں ہرگز نہیں۔ یہ اب اِس گھر سے باہر نہیں جا سکتا۔ میں کہتی ہوں اِسے اب ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا، کوئی نہیں لے سکتا۔

یہ کہہ کر اس نے تھیلا بٹ سے چھیننا چاہا مگر بٹ کی گرفت مضبوط تھی۔

پھر بیوی اس کے پاؤں پڑ گئی اور کہنے لگی "دیکھو میری بات مان جاؤ۔ یہ خدا کی دین ہے کوئی بال بھی بیکا نہ کر سکے گا۔ میں تمہیں بچوں کا واسطہ دیتی ہوں۔ یہ وقت پھر نہ آئے گا۔ مان جاؤ، مان جاؤ۔"

باہر دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔ بیوی نے شوہر کے قریب آ کر کہا۔ "دیکھو اب بھی وقت ہے یہ تھیلا لے کر پچھلے دروازے سے نکل جاؤ۔ خدا کے واسطے چلے جاؤ۔"

بٹ کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے بیوی کی طرف غور سے دیکھا اور لمحے بھر کے لئے کسی سوچ میں کھو گیا۔ دروازے پر پھر دستک ہوئی اور ساتھ ہی کسی نے بٹ صاحب بٹ

...ب کی رٹ لگا دی۔ بٹ رُک گیا اور بولا "ٹھہر، کھولتا ہوں" اُس نے آواز پہچان لی تھی۔ یہ سیٹھ کے آدمی تھے۔

بیوی کا رنگ زرد ہو گیا تھا اور وہ بٹ کا راستہ روکے کہہ رہی تھی "دیکھو خدا کے واسطے، رسول کے واسطے اَب بھی میری بات مان جاؤ۔"

یک لخت بٹ غصّے سے پاگل ہو گیا۔ اُس نے ایک زور کا تھپڑ بیوی کے مُنہ پہ رسید کیا اور تھیلے کا مُنہ کھول کر سارا سونا فرش پر ڈھیر کر دیا۔ غصّے سے اُس کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں اور وہ کانپ رہا تھا۔ اُس نے چیخ کر بیوی سے کہا "کھول حرامزادی، کھول اپنا آزار بند" بیوی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور جیسے ہی اُس نے ازار بند کھولنے میں دیر کی اس نے ایک اور دو تھپڑ اس کی پشت پر جڑ دی "کھول آزار بند اور بیٹھ جا اس پلید چیز پر کر پیشاب اِس ڈھیر پہ۔ کر نا کر"

باہر دروازے پر دستک تیز ہوتی جا رہی تھی۔ بٹ غصّے سے بولا "ٹھہر جاؤ بدذاتو" گھر میں پردہ ہے، ابھی کھولتا ہوں دروازہ۔"

پھر بیوی کی طرف آیا اور قریب تھا کہ وہ اسے ایک اور گھونسہ رسید کرتا لیکن اسے مدھم سُروں میں سُرر سُرر کی آواز سُنائی دی تو اس کا دِل ٹھنڈا ہو گیا۔

بیوی اُٹھ بیٹھی تو بٹ نے دروازہ کھول دیا۔ سیٹھ کے دونوں کارندے اندر داخل ہوتے تو بٹ نے خالی تھیلا ان کے منہ پہ دے مارا "اٹھالو اس سوغات کو اور لے جاؤ میرے گھر سے اِس ناپاک چیز کو۔"

سیٹھ کے آدمی حیران تھے کہ آج اِسے کیا ہو گیا ہے۔ اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور زور سے فرش پر تھوک دیا اور کہہ دینا اپنے سیٹھ سے کہ کل سے میں کام پر نہیں آؤں گا" — اور پھر جیسے اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "آج تو میرے دل میں بھی کھوٹ آ گیا تھا۔"

○

...ی ایمپورٹ کا کام کر رہا ہے۔ بٹ نے خود بھی اس کی تردید کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔"

لی ایلسپورٹ کا کام کر رہا ہے۔ بٹ نے خود بھی اس کی تردید کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔